بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾

فتاویٰ دار العلوم زکریا

جلدِ پنجم

”کتاب البیوع ،کتاب العاریة و الأمانة ،کتاب الهبة ،کتاب الإجارة ،
کتاب الوکالة ، کتاب المضاربة ، کتاب الشرکة ، کتاب الشفعة “

افادات

حضرت مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر مفتی دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

زیر اہتمام

حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مدظلہ

مہتمم دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

تہذیب وتحقیق

محمد الیاس بن افضل شیخ، گھلا، سورت

معین دار الافتاء دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجمالی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ عنوانات

فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلدِ پنجم

کتاب البیوع

جائز اور ناجائز خرید وفروخت کے احکام

باب……﴿۱،۲،۳﴾

بیعِ صحیح، فاسد، باطل اور بیعِ مکروہ وغیرہ کے احکام

باب ...... (۴)

مرابحہ اور بینک کے احکام

فصل اول

اسلامی بینک کے مرابحہ کے احکام:

فصل دوم

اسلامی بینک کا طریقہ کار

باب……《۵》

بیع سلم اور استصناع کے احکام

باب……《۶》

بیع کی مختلف قسموں کا بیان

باب……《۷》

بیع الحقوق کا بیان

باب......﴿۸﴾

بیع صرف کا بیان

ابواب الربا

باب......﴿۱﴾

سود کے احکام کا بیان

بابِ دوم

سودی مصارف کا بیان

باب......﴿۳﴾

انشورنس کے احکام کا بیان

باب......﴿۵﴾

قرض اور دیون کے احکام

كتاب العارية والامانة

عاریت اور امانت کے احکام

کتاب الھبۃ

فصل اول

تبرعِ مشروط کے احکام کا بیان

فصل دوم

ہبہ کے احکام کا بیان

کتاب الاجارات

کرایہ داری کے مسائل کا بیان

کتاب الوکالۃ

وکالت کے احکام کا بیان

کتاب المضاربۃ

مضاربت کے احکام کا بیان

کتاب الشرکۃ

كتاب الشفعة

حق شفعہ کے احکام کا بیان

پیش لفظ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الْحمد للّٰہ و کفیٰ وسَلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ أما بعد :

بحمداللہ تعالیٰ فتاویٰ دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ کی پانچویں جلد ناظرین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے یہ جلد کافی تاخیر سے ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے، کچھ تو ہماری مصروفیات موجبِ تاخیر بنیں اور کچھ معاملات کے جومسائل ہمارے پاس پڑے تھے ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

جام می توبہ شکن توبہ مری جام شکن ☆ ہرطرف ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

چونکہ معاملات کے مسائل کچھ تو پیچیدہ ہیں اور کچھ ان میں برصغیر خصوصاً پاکستان میں علماء کے بہت اختلافات رونما ہوئے یہاں تک کہ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اس جلد کوملتوی کرنا چاہئے پھر کافی غوروخوض کے بعد ذہن نے فیصلہ کیا یہ جلد بھی قارئین وناظرین کے سامنے آنی چاہئے۔

اگر بعض مسائل میں محترم ناظرین اور مفتی حضرات کواختلاف ہوتو ہمارے فتاویٰ کومسائل کاایک رخ سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ان مسائل میں اردو فتاویٰ میں جس مفتی کے جواب سے ہمیں اتفاق تھا اپنی تائید میں اس مفتی کافتویٰ لیا گیا ہے اور حوالہ بھی دیا گیا۔

بعض مسائل میں عبارات کی تطویل سے ناظرین کونہیں گھبرانا چاہئے ،اس لیے کہ بعض معرکۃ الآراء مسائل میں ایسا کرنا ناگزیر تھا،اس جلد اور دیگر جلدوں کی تیاری میں حوالوں کی فراہمی کے سلسلہ میں ہمارے دار الافتاء کے طلبہ نے جو محنت کی اس کااعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی،اللہ تعالیٰ ان سب کوعلم وعمل کی راہ نوردی کے لیے قبول فرمائے اور تازیست ان کوخدمتِ دین میں لگنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے،آمین،ان شاءاللہ تعالیٰ

یہ محنت ان کے لیے سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا مفتی محمد الیاس شیخ صاحب بھی قابل صد مبارک باد ہیں کہ وہ بڑی عرق ریزی سے سب حوالوں کو جانچتے ہیں اور کبھی کبھی مزید حوالوں کی نشاندہی فرماتے ہیں، کتاب کی ترتیب وکتابت بھی انہی کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی اپنی ذاتِ عالی کے شایانِ شان اس خدمت کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم دارالعلوم زکریا کے مہتمم مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب حفظہ اللہ کے بھی ممنون ومشکور ہیں کہ وہ دار الافتاء کے لیے ہر طرح کی سہولتوں کو مہیا فرماتے ہیں۔

نوٹ: معاملات میں بندہ کی حقیر رائے یہ ہے کہ حدود میں رہتے ہوئے سہولت والے پہلو کو اختیار کیا جائے تاکہ اِس پُر ازفتن دور میں عوام وخواص سب کے لیے آسانی ہو اور خصوصاً عوام الناس شریعت سے قریب تر ہو جائیں، کیونکہ شدت وسختی کا رویہ اختیار کرنے سے کبھی کبھی لوگ دین وشریعت سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ والعلم عند اللہ۔

(حضرت مفتی) رضاء الحق (صاحب) عفا اللہ عنہ۔

دارالافتاء، دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ

۴/شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله جاعل العلماء أنجماً للاهتداء زاهرةً ، وإعلاماً للاقتداء ظاهرةً ، وحجةً على الحق قاطعةً ، ومحجةً إلى الصدق شارعةً ، وصدوراً للفضائل جامعةً ، وبدوراً في سماء الشريعة طالعةً ، حمداً يدوم دوام جوده الفياض، ويبقى بقاء الجواهر لا الأعراض .

و الصلاة والسلام على صاحب الملة الطاهرة ، المؤيد من عند الله بالمعجزة الظاهرة ، محمد خاتم الرسل وناسخ الملل ، والرضوان على آله أئمة الهدىٰ، وصحبه مصابيح الدجىٰ ، والرحمة على من تبعهم بإحسان ، وعلى علماء الأمة في كل زمان ومكان. أما بعد :

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہاہوں،فتاویٰ کی یہ جلد دین کے اہم شعبہ''معاملات'' سے متعلق ہے۔

ہر مسلمان کو جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا دین صرف عبادات تک محدود نہیں ہے، کہ انسان عبادات،نماز، روزہ، زکوٰۃ، اورحج وغیرہ پرعمل کرکے یہ سمجھ لے کہ دینِ اسلام پرعمل کرنے کا حق ادا کردیا، بلکہ مکمل دین پرعمل پیرا ہونا عنداللہ مامورومطلوب ہے۔اور دینِ اسلام کے مختلف شعبیں ہیں:۔

(۱)اعتقادات۔(۲)عبادات۔(۳)معاشرات،ومناکحات۔(۴)ومعاملات۔(۵)واخلاقیات۔ (۶)وعقوبات وغیرہ۔

ان تمام شعبوں کو اپنی زندگی میں لانا اوربحیثیت اپنے آپ کو مؤمن ومسلم کا قلادہ پہنانے کے اس پر مکمل عمل کرنا لازم اورضروری ہے،جس طرح مساجد میں ام العبادات انجام دی جاتی ہے،اسی طرح بازاروں،محاکموں، دفاتر وغیرہ میں خرید وفروخت اورلین دین کے معاملات انجام پاتے ہیں،اوران تمام کو احکام شریعت کے موافق

بنا کر سعادتِ دارین حاصل کی جاتی ہے۔

امام محمدؒ سے سوال کیا گیا کہ جس طرح آپ نے فقہ کو مدون فرمایا اور اس پر کتابیں لکھیں تو کیا زہد وتصوف سے متعلق کچھ تصنیف نہیں فرمایا؟ تو امام محمدؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس موضوع پر کتاب البیوع لکھ دی ہے۔

حضرت امام محمدؒ کا اس جواب سے مقصد یہ تھا کہ معاملات، حلال وحرام کے وقت انسان کی دینداری کا پتہ چلتا ہے، کہ کس قدر تمیز کرتا ہے، اور اموال وفلوس کے سامنے ہونے کے وقت انسان کے زہد وتقویٰ اور لالچ وطمع کے مابین امتیاز ہوتا ہے۔

صرف پھٹے پرانے کپڑے پہننے اور سوکھی روٹی کھانے اور تسبیح ہاتھ میں لینے ہی کا نام زہد وتقویٰ نہیں ہے، تقویٰ کی اصل عظیم حرام خوری سے اجتناب کرنا اور رزقِ حلال حاصل کرنا ہے۔

لباسِ پارسائی سے بزرگی آ نہیں سکتی ☆ شرافت نفس میں ہوگی تو انساں پارسا ہوگا

حضرت ابو ہریرہؓ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل فرماتے ہیں:

"اتق المحارم تكن أعبد الناس، وارض بما قسم الله لك تكن أغنى الناس". (رواه الترمذي: ۲/۵٦، ابواب الزهد).

یعنی محارم، حرام اشیاء سے پرہیز کرو، اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے عبادت گزاروں میں شمار ہو جاؤ گے، اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں رزق لکھ دیا ہے اس پر راضی اور خوش رہو، لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے غنی بن جاؤ گے۔

حاصل یہ نکلا کہ رزقِ حلال کی تلاش اور حرام سے اجتناب بھی بالواسطہ عبادت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة". (كنز العمال).

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ رزقِ حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے نمبر کا فریضہ ہے۔ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے، لیکن امت نے قبول کیا ہے، یعنی تلقی بالقبول کی وجہ سے لائقِ حجت وقابلِ استدلال ہے۔

اس حدیثِ پاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ طلبِ رزقِ حلال کی کاروائی چاہے وہ تجارت ہو یا زراعت، صناعت ہو یا کاشت کاری، ملازمت ہو یا مزدوری، سب دین میں شامل ہیں، اور دین کا حصہ ہے، نہ صرف جائز

اور مباح بلکہ فرائض کے بعد فریضہ ہے، اگر انسان سستی اور کاہلی کے سبب گھر میں بیٹھا رہے اور نہ اپنے خورد ونوش کا انتظام کرے اور نہ اہل خانہ کا تو وہ شخص گنہ گار اور سخت سزا کا مستحق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس یہ کام انجام دیے ہیں، مکہ مکرمہ کے پہاڑوں پر چند قیراط کے عوض آپ نے بکریاں چرائیں، تجارت کے سلسلہ میں آپ نے ملکِ شام کے دو سفر فرمائے، مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلہ پر آپ نے زراعت کا کام انجام دیا، بلکہ ہر نبی اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنا گزارہ فرماتے تھے، اسی لیے رزقِ حلال کی تلاش میں مؤمن کی دنیا بھی ہے اور دین بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء". (رواه الترمذي).

یعنی فردا بروزِ قیامت سچے امانت دار تاجر کا حشر انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

بصورتِ دیگر جو لوگ شریعتِ اسلامیہ کی باگ ہاتھ سے نکالکر اپنی خواہشات کے مطابق تجارت کرتے ہیں اور خوفِ خدا نہیں لیتے سچائی کا دامن گیر نہیں ہوتے، ان کے بارے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إن التجار يبعثون يوم القيمة فجاراً إلا من اتقىٰ وبر وصدق". (رواه الترمذي).

یعنی قیامت کے دن تاجروں کو فاجروں کی حیثیت سے اٹھایا جائیگا، مگر جو تاجر تقویٰ، نیکی اور سچائی کو اختیار کرے، یعنی وہ ذلتی اور رسوائی سے محفوظ ہوگا۔

جس تاجر کا مقصد محض نفع خوری ہو، حلال حرام میں بالکل تمیز نہ کرتا ہو، تجارت کے سلسلہ میں شریعتِ مطہرہ کے کسی حکم کی پابندی نہ کرتا ہو اور صرف خرید وفروخت میں مگن رہتا ہو، اس کے بارے میں آپ نے "فاجر" فرمایا، نیز فرمایا: بڑا ظالم ہے وہ تاجر جو اپنے سامان تجارت کو چلانے اور رواج دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے، اور دنیا کے معمولی نفع کی خاطر اللہ تعالیٰ کے محترم وبابرکت نام کی بے حرمتی اور توہین کرتا ہے، ایسا تاجر دین و دنیا دونوں کو تباہ وبرباد کرتا ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی ☆ کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

بہر حال معاملات کو شریعتِ مطہرہ کے اصول وقواعد کے مطابق انجام نہ دینا عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

خلاف پیمبر کسے راہ گزید ☆ کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

مپندار سعدی کہ راہِ صفا ☆ تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

نقش قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے ☆ اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

تاہم اللہ تعالیٰ نے انسان کو جہاں شریعتِ مطہرہ کا پابند اور مکلّف بنایا وہیں پر انسان کے ضعف کو بھی تسلیم کیا اور ہر جگہ یسر وسہولت اور آسانی کو ملحوظِ نظر رکھا اور حرج وتنگی اور دقت ومشقت کو دفع کیا، چنانچہ نصوص کثیرہ اس پر شاہد ہیں:

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ما یرید اللّٰہ لیجعل علیکم فی الدین من حرج ، ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم لعلکم تشکرون﴾ (سورۃ المائدۃ،الآیۃ:٦).

وقال تعالیٰ: ﴿ یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر﴾.(سورۃ البقرۃ،الآیۃ:١٨٥).

وقال تعالیٰ: ﴿ یرید اللّٰہ أن یخفف عنکم وخلق الإنسان ضعیفاً﴾. (سورۃ النساء، الآیۃ:٢٨).

وقال تعالیٰ: ﴿ ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ﴾.(سورۃ الحج،الآیۃ:٧٨).

سرورِ کائنات شفیع المذنبین رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" یسروا ولاتعسروا بشروا ولاتنفروا ". (رواہ البخاری).

وقال علیہ الصلاۃ والسلام: " إنما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین ".(رواہ ابوداود، والترمذی، وقال: ھذا حدیث حسن صحیح، وأحمد).

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إنما بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ السھلۃ". (رواہ الطبرانی بسند فیہ ضعف).

محدثِ کبیر حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا:

" إنما العلم عندنا الرخصۃ من ثقۃ ، أما التشدید فیحسنہ کل أحد". (ادب المفتی والمستفتی، ورواہ ابن عبد البر فی جامع بیان العم وفضلہ، والمجموع شرح المھذب).

ابوالفضل بن طاہر عمر بن اسحاق تابعی سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

کان من أدرکت من أصحاب محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم أکثر من مائتین، لم أر قوماً أھون سیرۃ ، ولا أقل تشدیداً منھم. (رواہ البیھقي في شعب الإیمان).

وهـكـذا كـان عـلـماء السلف: إذا شددوا فعلى أنفسهم، أما على الناس فيسرون و يخففون .

عمر بن عثمان مکیؒ امام مزنیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

كان أشد الناس تضييقاً على نفسه في الورع، وأوسعه في ذلك على الناس. (سیراعلام النبلاء، وطبقات الشافعية الكبرى للسبكيؒ).

وكـذا وصـفـوا مـحـمـد بن سيرين: قال تلميذه عون: كان محمد أرجى الناس لهذه الأمة، وأشدهم إزراء على نفسه . (رواه البيهقي في شعب الإيمان).

امام ابوالحسن کرخیؒ معاملات میں آسانی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الأصل : أن أمور المسلمين محمولة على السداد والصلاح حتى يظهر غيره .

الأصـل: أن المتعاقدين إذا صرحا بجهة الصحة صح العقد وإذا صرحا بجهة الفساد فسد وإذا أبهما صرف إلى الصحة .

الاحتياط في حقوق الله تعالىٰ ، لا في حقوق العباد . (رسالة أصول الكرخيؒ).

ان نصوصِ مذکورہ بالا کی بناپر فقہاءِ امت نے مسائل شریعت کو دو خانوں میں تقسیم فرمایا:۔

(۱) وہ مسائل جو کبھی تغیر پذیر نہیں ہوتے، نہ باعتبارِ زمان نہ باعتبارِ مکان، اور نہ اجتہاد ورائے، نہ عرف وعادت کی وجہ سے، یہ واجبات ومحرماتِ منصوصہ اور جرائم پر حدود مقررہ من جانب الشرع وغیرہ ہیں۔

(۲) وہ مسائل جو زمان ومکان، مصلحت اور احوال کے اعتبار سے متغیر ہوتے ہیں۔

اول الذکر مسائل کا تعلق زیادہ تر عبادات سے ہے، کیونکہ عبادات میں احتیاط کا پہلو مدِنظر ہوتا ہے، جیسا کہ فقہاء کے ہاں قاعدہ معروف ومشہور ہے: ”**الصلاة إذا دارت بين الصحة والفساد تعاد احتياطاً**“۔

اور ثانی الذکر زیادہ تر معاملات سے متعلق ہیں، فقہاء نے ان مسائل میں توسع، نرمی اور سہولت سے کام لیا ہے۔

علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں قفیز الطحان کے مسئلہ کے تحت فرمایا ہے کہ عرف کی وجہ سے دلائلِ شرعیہ کی تخصیص جائز ہے یعنی قیاس کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے کمیشن ایجنٹ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جس نص کا مدار عرف پر ہو اور عرف بدل جائے تو موافق عرف فتویٰ دیا جائیگا۔

جیسے حطہ کا کیلی ہونا نص سے معلوم ہوا لیکن فی زمانہ وزنی ہے، اور اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (رد المحتار، فتح القدیر و حاشیہ شرح القواعد الفقہیہ از مصطفیٰ زرقا)۔

بیع مع شرط ناجائز ہے، لیکن شرطِ متعارف جائز ہے۔ جہالت اور غرر مفسدِ عقد ہے لیکن جہالتِ یسیرہ اور غررِ یسیر جو مفضی الی النزاع نہ ہو تو فقہاء کے ہاں اس کی گنجائش ہے۔ ملاحظہ ہو: (جمہرۃ القواعد الفقہیۃ لعلی احمد الندوی)۔

حقوقِ مجردہ کی بیع و شراء متقدمین کے ہاں ناجائز تھی، لیکن متاخرین نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (شروح المجلۃ، وغیرہ)۔

متاخرین کے ہاں عرفِ عام کی وجہ سے ترکِ قیاس اور عرفِ عام یا خاص کی وجہ سے ترکِ ظاہر الروایہ بھی جائز ہے۔ ملاحظہ ہو: (العرف والعادۃ فی رأی الفقہاء، و شرح عقود رسم المفتی)۔

نیز جس حیلہ کی وجہ سے حرام سے خلاصی حاصل ہوتی ہو وہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔ ہندیہ میں ہے:

كل ما يتخلص به عن الحرام ويتوسل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن. (الفتاوی الهندية: ٤/٣٩٣)۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات میں آسانی کا پہلو اختیار فرماتے ہوئے بیع التمر کے بارے میں حیلہ اور تدبیر بتلائی، جو احادیث پڑھنے پڑھانے والوں پر مخفی نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ عبادات کے سلسلہ میں غایتِ ورع و تقویٰ کی وجہ سے بہت محتاط تھے، لیکن معاملات میں عوام الناس پر انتہائی نرمی اور آسانی کا پہلو اختیار فرمایا جس کا اندازہ کتبِ فقہیہ کے ابواب البیوع اور ابواب الاجارات کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

بطورِ ''مشتے نمونہ از خروارے'' چند مثالیں حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

دکان و مکان کا کرایہ دار اگر کوئی ناجائز کام کرے تو کرایہ حرام اور ناجائز نہیں فرمایا، اور جہاں کہیں فاعل مختار کا فعل حائل ہو وہاں پر حرام کا حکم لگانے میں بہت احتیاط برتا ہے۔

مالِ مخلوط جس میں غالب حلال ہو اس سے اجرت لینا جائز ہے۔ اور ہدیہ قبول کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح دعوت کا کھانا بھی جائز ہے۔

کسی بھی چیز کا جائز انتفاع ممکن ہو تو اس کی بیع و شراء حرام نہیں ہے۔ وغیرہ۔

اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی ہمارے اکابرؒ ہے، کہ عبادات میں بہت محتاط، لیکن معاملات میں عوام الناس کے لیے

توسع اور آسانی کو ملحوظ نظر رکھا، یہ بات اکابرؒ کی کتب، شروحاتِ احادیث اور ان کے فتاویٰ کا مطالعہ کرنے والے پر مخفی نہیں ہے۔

بطورِ مشتے نمونہ از خروارے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

حضرت تھانویؒ سے متعلق ایک تحریر بعنوان [معاملات سے متعلق فتوے میں توسع] ماہنامہ ''الفرقان'' میں شائع ہوئی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ایک بصیرت افروز فقہی تحقیق:

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ایک وعظ ''آداب المصاب'' میں رزقِ حلال کی اہمیت بیان فرمائی ـــــــ اسی سلسلہ میں حضرت نے ارشاد فرمایا ''جس میں امت کے لیے یقیناً بڑی وسعت اور سہولت ہے''۔ فرمایا کہ:

''بلکہ اس باب میں میری رائے تو یہ ہے کہ اگر معاملات میں کسی وقت اپنے مذہب میں تنگی ہو اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال میں گنجائش ہو تو عوام کو تنگی میں نہ ڈالا جائے، بلکہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیدیا جائے ...میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے اس رائے کی صریح تائید حاصل کر چکا ہوں''۔ (وعظ آداب المصاب، سلسلہ تبلیغ ج، ص ۱۳۹)۔

اس دور کے بہت سے اصحابِ فتویٰ کے مزاج میں شدت پسندی دیکھی جاتی ہے، بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہدایت اور دین کا مزاج وہی ہے جو حضرت حکیم الامت کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے۔

محمد زکریا ندوی خادم تدریس دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ (ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ، ص ۳۳، اکتوبر ۱۹۸۱ء)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جہالتِ غیر مفضیہ الی المنازعہ کو دیانۃً قابل تحمل بتلایا۔ اور رہبۃ المشاع کے جواز کی طرف میلان ظاہر فرمایا۔ اور غرر کی اقسام اور اس میں قضاء و دیانۃً فرق کی تحریر تو فیض الباری میں چشم کشا ہے۔

محدثِ عصر حضرت علامہ سید یوسف بنوریؒ نے بیع قبل القبض کے جواز کا فتویٰ بہ مذہبِ غیر صادر فرمایا۔ (بینات)۔

حضرت حکیم الامت نے بیع سلم سے متعلق امام شافعیؒ کے مذہب پر فتویٰ صادر فرمایا۔ (امداد الفتاویٰ: ۲۱/۳، ۱۰۶)۔

سابق مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ بیعِ سلم کے بارے میں امام شافعیؒ کے مذہب پر

فتویٰ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: موجودہ دور کی مشکلات کے پیش نظر فقہاء نے کہا کہ اگر ان مسائل میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے تو گنجائش ہے تا کہ لوگوں کے اموال کو حرمت سے بچایا جاسکے۔

فائدہ: دنیا میں ایک عبادات اور دوسرے معاملات کا نظام ہے، عبادات کے لیے نصوص ہونے چاہئیں اور معاملات میں ہر امام آسانی کرتا ہے۔ (درس الہدایہ، ص ۳۲۹، شروط السلم ط: مکتبہ اقرأ)۔

حضرت حکیم الامت نے شرکت فی العروض کے جواز کا فتویٰ امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق تحریر فرمایا۔ (امداد الفتاوی: ۴۹۵، وامداد الاحکام)۔

امداد الفتاویٰ میں حضرت نے ایک جگہ قواعدِ احناف کے خلاف فتویٰ صادر فرمایا۔ ملاحظہ ہو حضرت مسئلہ ''رفع بقرہ بر نصف نماء'' کے تحت فرماتے ہیں:

الجواب: كتب إلى بعض الأصحاب من فتاوى ابن تيمية كتاب الاختيارات مانصه: ولو دفع دابته أو نخله إلى من يقوم له وله جزء من نمائه صح وهو رواية عن أحمدؒ. (ج٤ ص ٨٥)، پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ ناجائز ہے، کما نقل فی السوال عن عالمگیریہ لیکن بنا بر نقل بعض اصحابِ امام احمد کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے، اور جہاں ابتلاء شدید ہو توسع کیا جاسکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۳۴۳، کتاب الاجارہ)۔

حضرت علامہ فتح محمد صاحب لکھنویؒ نے عطرِ ہدایہ میں سو سال سے زیادہ تک کا اجارہ موت احد العاقدین سے منفسخ نہ ہونے کا فتویٰ تحریر فرمایا۔ (حلال وحرام کے احکام المعروف بعطر ہدایہ، ص ۴۲۳۔ وتکملہ عمدۃ الرعایہ حاشیہ علی شرح وقایہ: ۳/۳۱۱، باب فسخ الاجارہ، رقم الحاشیہ: ۴)۔

اس قسم کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسائل ہیں جن میں ہمارے فقہاء اور اکابرؒ نے عرف وعادت کی وجہ سے مذہبِ غیر یا ظاہر الروایہ کے خلاف فتوے صادر فرمائے۔

اسی سلسلۃ الذہب سے منسلک ہمارا دارالافتاء ہے۔ اور انہیں اکابرؒ سے منسلک ہمارے حضرت مفتی رضاء الحق صاحب ''حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ'' ہیں، جو بیک وقت مدرسہ ہذا کے شیخ الحدیث بھی ہے اور صدر مفتی بھی ہے، جو عرصۂ دراز جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں مفتی رہے، معتدل المزاج، اعرف باہل الزمان، عوام الناس کے لیے توسع اور نرمی کا پہلو اختیار کرنے والے، اوفق بالحدیث رائے رکھنے والے، لوگوں کو حرام سے بچانے اور شریعت سے قریب کرنے والے ہیں، محض کتابوں پر جمود ان کے ہاں نہیں پایا، عرف اور مصلحت کو نظر

اندازکرناان کے حاشیہ خیال میں نہیں ہے۔بایں وجہ قارئین وناظرین اس معاملات والی جلدمیں بہت سے مقامات پران اوصاف کاکھلا نظارہ فرمائیں گے۔

بلکہ بہت ساری جگہوں پرہم نے دونوں جانب کے اقوال نقل کیے ہیں،تاکہ احتیاط پرعمل کرنے والے کے لیے راستہ کھلارہےاورحرام سے بچنے والے کے لیے بھی جواز کادائرہ وسیع رہے۔

تاہم خواص کے طبقہ سے ہماری درخواست ہے کہ حتی الامکان احتیاط اورعزیمت کی باگ تھامے رہیں، اوردائرۂ جوازاوررخصتیں عوام الناس کے لیے چھوڑدیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس کتاب میں مذکورہ اقوال کوتعارض نہ سمجھاجائے بلکہ مقصدِ بالاکومدِنظررکھتے ہوئے اس کتاب سے استفادہ کیاجائے۔

وکم من عائب قولاً صحیحاً ☆ وآفته من الفهم السقيم

فالمسئول من كل واحد من إخواني والأعزة البررة أن ينظروا فيه بعين الرضاء دون التعصب والمراء ، وإن وجدوا فيها سقماً عالجوا بالدواء كالرحماء من الأطباء ، ولله در من قال:

وإن تجد عيباً تسد خللا ☆ فجل من لا عيب فيه وعلا

إذا رئيت أثيماً كن ساتراً وحليماً ☆ يا من يقبح أمرى لم لاتمر كريماً

متاب اے پارساروی از گنہگار ☆ بخشایندگی دروے نظرکن

اگرمن ناجوانمردم بکردار ☆ توبرمن چوں جوانمردی گزرکن

تاہم انسان نسیان کاپتلاہےاورغلطیوں سے براءت کادعویٰ کسی کےبس کی بات نہیں ہے،لہذاناظرین سے التماس ہے کہ جواغلاط نظرآئیں توبندہ ناکارہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اطلاع دینے کی زحمت فرمالے، بندہ صمیمِ قلب سے ممنون ومشکورہوگا۔

بندہ عاجزاپنی بے بضاعتی کے ساتھ ساتھ علم وعمل میں تہی دست ہے،بزرگوں اوربڑوں نے حسن ظن کی وجہ سے یہ عظیم المرتبت کام سپردکیاہے۔

کہاں میں اورکہاں یہ نکہت گل ☆ نسیم صبح یہ سب تیری مہربانی

ایں سعادت بزورِ بازونیست ☆ تانہ بخشدخدائے بخشندہ

شکرخدائے کن کہ موفق شدی بخیر ☆ زانعام وفضل او نہ معطل گزاشتت
منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی ☆ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اور یہ سب حضرت ہی کے سایہ عاطفت کا ثمرہ ہے ورنہ اس ناکارہ کو وہاں تک پرواز نہیں، بلکہ علم وعمل میں تہی دست۔

آں تہی مغزراچہ علم وخبر ☆ کہ بروہیزوم است یادفتر
گرقبول افتدز ہےعزوشرف۔

بڑی سخت ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے استاذ مکرم ومہتمم محترم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سالوجی مدظلہ مہتمم مدرسہ ہذا، اور حافظ بشیر احمد صاحب مدظلہ، ناظم مدرسہ ہذا کا ذکر نہ کروں، جن کی شب وروز کی شفقتیں میرے لیے تپتی ہوئی دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور شب و روز کی خدمتوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، آمین۔

اس کتاب کی تصحیح میں تخصص کے جن طلبا نے بندہ کی معاونت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں ترقی عطا فرمائے، اور اپنے دین کی خدمت کے لیے دور اور دیر تک کے لیے قبول فرمائے، آمین۔ یارب العٰلمین.
اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضی.

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العٰلمین .
وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ أجمعین .

راقم الحروف
بندۂ عاجز: محمد الیاس بن افضل شیخ، گھلا، سورت عفی عنہ
معین دارالافتاء، دارالعلوم زکریا، جنوبی افریقہ
مؤرخہ: ۱۳، ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ۹، نومبر ۲۰۱۱ء

﴿فتاویٰ دارالعلوم زکریا پر تعارف وتبصرے﴾

تبصرہ از ماہنامہ ’’الحق‘‘ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک:

فتویٰ اور افتاء کا تاریخی سلسلہ بہت ہی قدیم ہے۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک علماء صالحین اس عظیم منصب پر فائز ہوتے چلے آرہے ہیں۔اور اکثریت کے صادر کردہ فتاویٰ کا مجموعہ کتابی شکل میں اس وقت دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے۔جن سے اربابِ علم وکمال استفادہ کرتے ہیں اور اہل فتویٰ،فتویٰ نویسی میں رہنمائی لیتے ہیں۔فتاویٰ دارالعلوم زکریا بھی اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے،جو حضرت مفتی رضاء الحق شاہ منصوری مدظلہ کے جاری کردہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے،حضرت مفتی صاحب ایک باکمال،جامع صفاتِ علمی شخصیت ہیں اور آپ مدظلہ کا تعلق ضلع صوابی صوبہ سرحد کے ایک مشہور ومعروف گاؤں شاہ منصور کے زہد وتقویٰ،علم وفضل کے پیکر خاندان سے ہے،اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ان فرزندان میں سے ہیں جن پر جامعہ فخر کرتی ہے۔اللہ پاک جزاء دے مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا محمد الیاس شیخ صاحب کو جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کے ان گرانقدر علمی اور تحقیقی فتاویٰ کو جمع کر کے بہترین انداز میں مرتب کیا اور زمزم پبلشرز کراچی نے دیدہ زیب ٹائٹل،عمدہ کتابت اور شاندار طباعت کے ساتھ علماء اور طلباء بلکہ ہر خاص اور عام پر احسان کرتے ہوئے اس گنجینہ علم کی پہلی جلد کو شائع کیا۔فتاویٰ کی یہ پہلی جلد کتاب الایمان والعقائد،کتاب التفسیر والتجوید، کتاب الحدیث والاثار،کتاب السلوک والطریقہ اور کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے۔فتاویٰ میں استفتاء کا ہر جواب انتہائی تدقیق اور تحقیق کے ساتھ دیا گیا،جس کے لئے ہر مذہب کے علماء،محدثین اور فقہاء کی کتابوں کی طرف مراجعت کی گئی ہے اور ہر کتاب کا مکمل حوالہ مع عبارت کے درج ہے،بعض ایسے جوابات بھی ہیں جو دوسرے فتاویٰ میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اجمالی ہے،اس لئے یہ فتاویٰ ہر خاص وعام کی علمی پیاس بجھانے کے لئے انتہائی مفید ہے اور ہر لائبریری کی زیب ہے،کتاب کا مطالعہ کر کے دل سے یہ دعاء نکلتی ہے کہ خدا کرے کہ یہ عظیم فقہی انسائیکلو پیڈیا پایۂ تکمیل تک پہنچ کر شائع ہوجائے۔(ماہنامہ ’’الحق‘‘ دارالعلوم حقانیہ،اکوڑہ خٹک)۔

تبصرہ از ماہنامہ ''البینات'' جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن:

ایک دور تھا جب افریقہ، امریکہ، کنیڈا اور دوسرے یورپی ممالک میں دینی مدارس کا خاطر خواہ نظام نہیں تھا اور وہاں کے متلاشیانِ علم وہنر ہند وپاک کا رخ کرتے تھے اور یہاں کے اربابِ فضل وکمال اور اصحابِ علم وتحقیق کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کر کے علم ومعرفت کے جام لنڈھاتے تھے۔

یہاں سے اکتسابِ فیض کے بعد مختلف ممالک کے مخلصین نے جب ضرورت محسوس کی تو انہوں نے اپنے اپنے علاقوں اور ممالک میں دینی مدارس کا جال بچھانا شروع کر دیا، چنانچہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے نامور فاضل تلامذہ میں سے حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی مدظلہ اور ان کے رفقاء نے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں دارالعلوم زکریا کے نام سے ادارہ قائم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ترقیات کے مدارج طے کئے تو انہون نے اپنی سرپرستی اور اپنے دینی ادارے کی ترقی کے لئے اپنی مادر علمی سے ایک بڑے استاذ ومفتی اور شیخ الحدیث کی درخواست کی، اس پر اربابِ جامعہ علوم اسلامیہ نے اپنے ایک لائق، فائق، عظیم محقق مدرس اور مفتی حضرت مولانا رضاء الحق صاحب کو جنوبی افریقہ بھیج کر ایثار وقربانی کا ثبوت دیا۔ حضرت مولانا مفتی رضاء الحق دامت برکاتہم کی فیض رساں شخصیت نے افریقہ کو تعلیم وتدریس، علم وتحقیق اور فقہ وفتویٰ کے اعتبار سے بجا طور پر مستغنی کر دیا۔

پیش نظر فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی جلد اول انھیں کی علمی تحقیقات کا منہ بولتا ثبوت ہے، جس میں نہایت خوبصورت انداز میں کتاب الایمان، کتاب التفسیر، کتاب الحدیث والآثار، کتاب السلوک والطریقۃ اور کتاب الطہارۃ کو مرتب اور مدون کر کے کتابی شکل دی گئی ہے۔

بلاشبہ فتاویٰ میں درج مسائل واحکام اہل حق اسلاف اور اکابر دیوبند کی تحقیق کی ترجمانی کے علاوہ ان کے ذوق ومزاج کا آئینہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس فتاویٰ کے مرتبین مولانا مفتی عبدالباری اور مولانا مفتی محمد الیاس شیخ کو جزائے خیر عطا فرمائے، جنہوں نے اس اہم خدمت کو سرانجام دیا۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدردانی میں بخل سے کام نہیں لیں گے، خدا کرے کہ فتاویٰ جلد از جلد مکمل ہو کر متلاشیانِ علم وتحقیق کی پیاس کو بجھائے، آمین۔ (ماہنامہ ''بینات'' رجب المرجب ۱۴۲۹ھ، اگست ۲۰۰۸ء)۔

﴿دارالعلوم زکریا پر ایک طائرانہ نظر﴾

۞ ۱۹۸۱ء میں حضرت برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے جنوبی افریقہ تشریف لاکر دعا فرمائی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حضرت ہی کے نام پر دارالعلوم زکریا کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

۞ ۱۹۸۳ء دسمبر میں حضرت قاری عبدالحمید صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب اور ان کے رفقاء کی سرپرستی میں مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا، اور ۱۹۸۵ء تک مہتمم قاری عبدالحمید صاحب رہے۔

۞ قاری عبدالحمید صاحب کے ہندوستان تشریف لے جانے کے بعد مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مہتمم اور حافظ بشیر صاحب ناظمِ مدرسہ مقرر ہوئے، اور تاہنوز خدمت انجام دے رہے ہیں، اور انھیں کی توجہات وشبانہ روز محنت سے دارالعلوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ فجزاهم الله تعالىٰ أحسن الجزاء.

﴿دارالعلوم زکریا کے مختلف شعبے﴾

۞ شعبۂ تحفیظ القرآن: اکابرین کی توجہ اور دعا کی برکت اور اساتذۂ کرام کی محنت سے ماشاء اللہ خوب رو بہ ترقی ہے۔ اساتذۂ درجاتِ حفظ کی تعداد: ۱۳، اور طلبائے عزیز کی تعداد: ۲۱۷، اور درسگاہوں کی تعداد: ۱۰ ہے۔

۞ درسِ نظامی: طلبائے کرام علومِ عالیہ وآلیہ سے تشنگی کی آگ بجھا رہے ہیں۔ اساتذۂ کرام کی تعداد ۲۴ ہے۔ اور طلبائے کرام کی تعداد ۴۴۲ ہے، مقامی ان میں سے ۳۲ فیصد، اور دیگر ۵۷ ممالک کے ۶۸ فیصد طلباء تحصیلِ علم میں مشغول ہیں۔

۞ شعبۂ افتاء واستفتاء: ۱۹۸۷ء سے حضرت مفتی رضاء الحق صاحب کی نگرانی میں رواں دواں ہے

ابتدا میں حضرت بذاتِ خودتحریر فرماتے تھے پھر ۱۹۹۲ء میں مستقل دارالافتاء کا نظام شروع ہوا۔

۞ شعبۂ قراءت وتجوید: ۱۹۸۸ء میں قراءت وتجوید کا مستقل شعبہ شروع ہوا۔

۞ شعبۂ ’’النادی العربی‘‘: طلبائے عزیز کا عربی ادب سے ذوق وشوق بڑھا اور تقریراً وتحریراً اس میں حصہ لیا اور مستقل شعبہ ’’النادی العربی‘‘ کے نام سے شروع ہوا۔

۞ دارالعلوم زکریا کی شاخ: برائے حفظ منتظمین حضرات نے مدرسہ ہذا سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ۲۰۰۰ء میں جناب عبدالرحمٰن میاں صاحب کی درخواست پر ان کی والدہ کی خواہش پر انھیں کی زمین پر ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا ہے جس میں تقریباً ۱۰۱ طلباء اور ۵، اساتذۂ کرام ہیں، اور ۵ درسگاہیں ہیں۔

۞ اللہ تعالیٰ تمام اساتذۂ کرام و منتظمین اور کارکنانِ مدرسہ ہذا کو جزاء خیر عطا فرمائیں۔ نیز دارالعلوم کو اور دیگر علمی اداروں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ فرما کر اپنی رحمتِ خاصہ نازل فرمائیں۔ آمین۔

۞ اکابرین وائمہ اور دیگر مہمانانِ کرام کے قدوم میمنت لزوم سے یہ وادی خوشنما اور دلرُبا بنتی گئی۔ ان میں سے: حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ مفتی دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ۔ حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ۔ حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ۔ حضرت حاجی فاروق صاحبؒ۔ حضرت مولانا عمر صاحب پالنپوریؒ۔ حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ۔ بھائی پاڈیا صاحبؒ۔ حضرت مولانا عمر جی صاحبؒ۔ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب۔ حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحبؒ۔ حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی۔ حضرت مولانا ادریس صاحب میرٹھیؒ۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحبؒ۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس۔ شیخ شریم۔ شیخ صالح بن حمید۔ شیخ عبدالرحمٰن حذیفی۔ شیخ سبیل۔ شیخ صلاح بدیر۔ شیخ محمد علی صابونی۔ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب۔ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا ارشد صاحب مدنی۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف صاحب۔ حضرت مولانا

سیدرابع صاحب۔حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب۔حضرت مولانا سلمان صاحب۔حضرت حکیم اختر صاحب۔حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری۔حضرت مفتی فاروق صاحب میرٹھی۔حضرت مولانا یونس صاحب پونیؒ۔حضرت مولانا ابراہیم صاحب دیولا۔شیخ الحدیث مولانا یونس صاحب۔حضرت مولانا بدیع الزمان صاحبؒ۔حضرت مولانا سالم صاحب۔حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ۔حضرت بھائی طلحہ بن حضرت شیخ الحدیث۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ کشمیری صاحب۔حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی۔والشیخ محمد عوامہ ونجلہ الشیخ الدکتور محی الدین حفظہما اللہ تعالی ورعاہما۔

بندۂ عاجز محمد الیاس بن افضل شیخ عفی عنہ
معین دارالافتاء دارالعلوم زکریا، لینیشیا، جنوبی افریقہ
مؤرخہ: ۱۶/ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ مطابق: ۶/ جولائی ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿یا ایہا الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾

(سورۃ النساء، الآیۃ: ۲۹).

عن المقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ قال:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

" ما أکل أحد طعاماً قط خیراً من أن یأکل من عمل یدیہ وأن نبی اللّٰہ داؤد علیہ السلام کان یأکل من عمل یدیہ".

(رواہ البخاری).

کتاب البیوع

باب ...... ﴿۱، ۲، ۳﴾

جائز اور ناجائز خرید و فروخت کے احکام

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: " الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات لایعلمہن کثیر من الناس فمن اتقی الشبہات استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام... (متفق علیہ)

باب ......۱، ۲، ۳

بیعِ صحیح، فاسد، باطل اور بیعِ مکروہ وغیرہ کے احکام

عقدِ بیع میں طے شدہ ثمن سے زیادہ مطالبہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے گاڑی خریدنے کے متعلق فون پر عقد کیا، دور ودراز کا سفر کرکے جب گاڑی لینے کے لیے گیا تو بائع نے طے شدہ قیمت سے دس ہزار رینڈ زیادہ طلب کئے، اب کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور مشتری کی رضامندی مفقود ہونے پر بیع کا کیا حکم ہے؟

الجواب: عقد مکمل ہوجانے کے بعد مشتری اس گاڑی کا مالک بن گیا، اب بائع مشتری سے طے شدہ قیمت ہی وصول کرنے کا شرعاً حقدار ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، ہاں مشتری اپنی رضامندی سے زیادہ دیدے تو ٹھیک ہے۔ نیز بیع میں طرفین کی رضامندی ضروری ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ ابن نجیم مصریؒ (۹۲۶ھ۔۹۷۰ھ) فرماتے ہیں:

إذا كان الإيجاب من المشتري فقبل البائع بأنقص من الثمن أو كان من البائع فقبل المشتري بأزيد انعقد، فإن قبل البائع الزيادة في المجلس جازت كما في التاتارخانية ... وأما شرائط اللزوم بعد الانعقاد والنفاذ فخلوه من الخيارات الأربعة المشهورة ويزاد خيار الكمية وخيار الغبن إذا كان فيه غرور .... (البحر الرائق: ۵/۲۵۸، ۲۶۱، کتاب البیوع، کوئٹہ).

ہدایہ میں ہے:

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولاخيارلواحد منهما إلا من عيب أوعدم رؤية. (الهداية:۳/۲۰).

ہاں اگر عقد مکمل نہیں ہوا تھا ابھی تک عاقدین آپس میں طے کررہے تھے اور بائع زیادہ ثمن کا مطالبہ کرتا ہے تو مشتری کو خریدنے اور نہ خریدنے کا اختیار ہے اس لیے کہ بیع میں رضامندی ضروری ہے اور یہاں مشتری راضی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾. (سورة النساء،الآية:۲۹).

کنز الدقائق میں ہے:

(البيع) هو مبادلة المال بالمال بالتراضي ويلزم بإيجاب وقبول. (کنزالدقائق: ۲۲۷، امدادیه).

کسی شخص کو دھوکا دینا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف ہے اس سے اجتناب لازم اور ضروری ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مرعلى صبرة من طعام فأدخل يده فيها، فنالت أصابعه بللاً، فقال: يا صاحب الطعام ماهذا ؟ قال: أصابته السماء يا رسول الله ! قال: أفلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس، ثم قال: "من غش فليس منا". قال المحشي: أى ليس من أخلاقنا ولاعلى سنتنا، قال أبوعيسىٰ: والعمل على هذا عند أهل العلم وقالوا: الغش حرام. (ترمذی شریف مع الحاشية:۱/۲۴۵،باب ماجاء فی کراهية الغش فی البيوع). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بائع کی جانب سے بیع میں شرائط لگانے کا حکم:

سوال: کیا بائع کے لیے مندرجہ ذیل شرائط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) کپڑا کاٹ لینے کے بعد کوئی دعویٰ قابل قبول نہ ہوگا۔

(۲) اگر واپس کرنا ہوتو انوائس نمبر ذکر کرنا ضروری ہوگا۔
(۳) کپڑا خریدنے کے بعد صرف سات دن تک واپسی کا اختیار ہوگا۔
(۴) سامان بائع ہی کی ملکیت میں رہے گا جب تک مشتری پورا ثمن ادا نہ کردے۔

الجواب: (۱) شرطِ اول صحیح ہے اوراس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا کاٹ لینے کے بعد ہر عیب سے بری الذمہ ہے۔اور ہر عیب سے براءت کی شرط لگانا صحیح اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

و من باع عبداً و شرط البراءة من كل عيب فليس له أن يرده بعيب وإن لم يسم العيوب بعددها. (الهداية، كتاب البيوع، باب خيار العيب، ٣/٤٨، وكذا في المبسوط للامام السرخسيؒ: ١٢/٩١).

شرح المجلہ میں ہے:

إذا باع ماله بشرط براءة ذمته من دعوى كل عيب فلا يكون للمشتري خيارعيب.

(شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسي، البيوع، الفصل السادس في خيار العيب، ٢/٣٠٥، رشيدية).

(۲) آج کل زمانہ روبہ ترقی ہے ہر چیز کواس کے خاص نمبر کے ساتھ قیمت لگا کر کمپیوٹر میں محفوظ کرلیا جاتا ہے، جس کو باکوڈ کہتے ہیں، جب مشتری خریدتا ہے تو قیمت ادا کرتے وقت وہ خاص نمبر کی رسید (بل، انوائس) اس کو دی جاتی ہے، اس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ سامان واپس کرنے کے لیے اس رسید کا ہونا ضروری ہے، اور یہ عرف میں رائج ہے آسانی کی خاطر اس طرح کرتے ہیں، لہذا یہ صحیح اور درست ہے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ ابن نجیم مصریؒ ''الاشباہ'' میں فرماتے ہیں:

العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط قال في إجارة الظهيرية: والمعروف عرفاً كالمشروط شرطاً. انتهىٰ. (الاشباه والنظائر: القاعدة السادسة، العادة محكمة، ١/٢٧٨).

(۳) تیسری شرط بعینہ شرط اول کی طرح ہے کہ سات دن کے بعد بائع ہر قسم کے عیب سے بری الذمہ ہوگا، اور یہ صحیح اور درست ہے، کما مر آنفاً۔

(۴) عقد مکمل ہونے پر مشتری مبیع کا مالک بن جاتا ہے، لہذا بائع کی ملکیت کی شرط بیع بالتقسیط میں صحیح

نہیں ہے، ہاں عقدِ معجّل میں اس طرح شرط لگا سکتے ہیں کہ جب تک مشتری پورا ثمن ادا نہیں کرے گا وہاں تک مبیع بائع کے قبضہ میں رہے گا۔

شرح مجلّہ میں محمد خالد اتاسی لکھتے ہیں:

لو باع بشرط أن يحبس المبيع إلى أن يقبض الثمن فهذا الشرط لايضر بالبيع بل هو بيان لمقتضى البيع ، فإن للبائع حبس المبيع إلى أن يقبض الثمن ولولم يشترط ذلک في العقد. (شرح المجلة للأتاسي، البيوع، الباب الاول في بيان المسائل المتعلقة بعقدالبيع،الفصل الرابع في حق البيع بشرط :٦١/٢، رشيدية) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

عقدِ بیع میں مفت سروس کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: بہت سی مرتبہ کمپنی والے بتلاتے ہیں کہ ہم مفت سروس کرتے ہیں، لیکن بعد میں سروس کی ضرورت ہوتی ہے تو پوری اجرت لیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ کیا سروس کی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اکابرؒ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مفت سروس کی شرط ایسی ہے جیسے کسی دوکاندار سے چمڑا خریدنا اس شرط پر کہ بائع اس سے جوتا بنادیگا، اور یہ باتفاقِ فقہاء جائز اور درست ہے، لہٰذا اس پر عمل ہونا چاہئے ہاں اگر مشتری اس مشین کے کسی پرزے کو توڑ دے تو بائع یا کمپنی اس کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

شرح مجلّہ میں ہے:

وحاصل ما ذكره الفقهاء في البيع مع الشرط أن الشرط الذي يقترن به البيع إما أن يقتضيه العقد، وإما أن لايقتضيه العقد لكن يلايمه ، وإما أن لايقتضيه العقد ولا يلايمه لكن قد جرى العرف باشتراطه، وإما أن لا يقتضيه العقد ولا يلايمه ولا جرى العرف باشتراطه، لكن لامنفعة فيه لأحد، فالبيع في هذه الوجوه الأربعة صحيح والشرط معتبر في الوجوه الثلاثة الأولىٰ منها، و يلغو في الوجه الرابع. (شرح المجلة لمحمدخالد الاتاسي،٥٩/٢،الفصل الرابع في حق البيع بشرط).

مفتی تقی عثمانی صاحب تکملہ میں فرماتے ہیں:

وخلاصة مذهب الحنفية في ذلک أنه إن كان شرطاً يقتضيه العقد، أويلائم العقد أو

شرطاً جرى به التعامل بين الناس، فهوجائز ولايفسد به البيع...ومثال الشرط الذي جرى به التعامل ما إذا اشترى نعلاً على أن يحذوه البائع أوجراباً على أن يخرزه له خفاً، قال السرخسيؒ في المبسوط : وإن كان شرطاً لايقتضيه العقد، وفيه عرف ظاهر فذلک جائز أيضاً ، كما لو اشترى نعلاً وشراكاً بشرط أن يحذوه البائع ، لأن الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعي، ولأن في النزع عن العادة الظاهرة حرجاً بيناً، وقال الكاساني: في " البدائع:۵/۱۷۲" **والقياس أن لايجوز وهوقول زفرؒ ، وجه القياس أن هذا شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد العاقدين ، وإنه مفسد...ولنا أن الناس تعاملوا هذا الشرط في البيع ،كما تعاملوا الاستصناع فسقط القياس بتعامل الناس،كما سقط في الاستصناع.** (تکملة فتح الملهم:۱/۶۲۹، مسئلة الشرط فی البیع).

ہدایہ میں ہے:

ومن اشترى نعلاً على أن يحذوه البائع أويشركه فالبيع فاسد... وفي الاستحسان يجوز للتعامل فيه.(الهداية:۳/۶۱).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

اپنی مصنوعات کوفروغ دینے اورگاہکوں کی ترغیب کے لیےآج کل یہ صورت مروج ہے کہ خریدارکوایک مدت تک سامان کی اصلاح اورمرمت کاتیقن دیاجاتاہے، یہ مسئلہ اس لیےاہم ہے کہ شریعت نے خریدوفروخت میں کسی ایسی اضافی شرط کوجائزقرارنہیں دیاہے، اسی بناپرفقہاء نے ایسی شرطوں کی وجہ سے خریدوفروخت کے معاملےکوفاسدقراردیاہے، اس کاتقاضایہ ہے کہ اس قسم کی گیارنٹی کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائزقرارپائےلیکن فقہاء کےنزدیک شریعت کی اس ممانعت کامنشاامکانی نزاع کادروازہ بندکرناہےاورجوشرطیں معروف ومروج ہوجاتی ہیں وہ نزاع کاباعث نہیں بنتی ہیں،لہذاایسی شرطوں کوجائزاورقابل اعتمادقراردیاگیاہے۔

صاحبِ ہدایہ ایسی شرطوں کومستثنیٰ قراردیتےہوئےفرماتے ہیں:

" **إلا أن يكون متعارفاً** ". (الهداية :۳/۵۹، باب البیع الفاسد).

(ماخوذ از جدید فقہی مسائل:۱/۳۸۷،وکذافی تقریرالترمذی:۱/۱۰۹).

خلاصہ یہ ہے کہ ہرشرط مفسدِعقدنہیں بلکہ جومفضی الی النزاع ہووہ شرط مفسدِعقدہے،ورنہ جومقتضائےعقدکے

موافق ہو اور شرطِ ملائم ہو تو اس کی گنجائش ہے، اور آج اکثر شرائط عرف میں رائج ہیں اور مقتضائے عقد کے موافق بھی ہیں، لہٰذا افسادِ عقد کا حکم نہیں لگایا جائیگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ثم جملة المذهب فيه أن يقال كل شرط يقتضيه العقد كشرط الملك للمشتري لايفسد العقد لثبوته بدون الشرط، وكل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده كشرط أن لايبيع المشترى العبد المبيع لأن فيه زيادة عارية عن العوض فيؤدى إلى الربا أو لأنه يقع بسببه المنازعة فيعرى العقد عن مقصوده إلا أن يكون متعارفاً لأن العرف قاضٍ على القياس... (الهداية:۳/۵۹، باب البيع الفاسد).

کفایہ میں ہے:

وكذا كل شرط لايقتضيه العقد إلا أنه يلائم البيع أى يؤكد موجبه كالبيع بشرط أن يعطي المشترى بالثمن رهناً أو كفيلاً وهو معلوم بالإشارة أو التسمية لايفسد العقد أيضاً... (الكفاية على هامش فتح القدير:۶/۷۷، كتاب البيوع، مكتبه رشيديه).

مبسوط میں ہے:

وإن كان شرطاً لايقتضيه العقد، وفيه عرف ظاهر، فذلك جائز أيضاً، ...لأن الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعي، ولأن في النزع عن العادة الظاهرة حرجاً بيناً. (المبسوط للامام السرخسیؒ:۱۳/۴۱).

وللاستزادة انظر: (الدر المختار مع رد المحتار: ۵/۸۷، ۸۸، مطلب في البيع بشرط فاسد، سعيد، وبدائع الصنائع في ترتيب الشرائع:۵/۱۷۲، كتاب البيوع، سعيد، والفتاوى الهندية:۳/۱۳۳، كتاب البيوع، وحاشية الطحطاوى على الدر المختار:۳/۷۷، كتاب البيوع، كوئته).

بیع بالشرط کے جواز پر اشکال:

اشکال: بیع بالشرط کے جواز پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع بالشرط سے منع فرمایا ہے پھر کیسے آپ نے جائز کہا؟ حدیث ملاحظہ ہو: "**نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط**" اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا عقد ناجائز ہونا چاہئے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث معلول بعلت ہے، یعنی جہاں نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ ہو وہاں عقد فاسد ہوجائیگا، لیکن اگر نزاع کا احتمال نہ ہوتو عقد فاسد نہ ہوگا، گویا حدیث کا مطلب یہ ہوا: **" نهى عن بيع وشرط إذا أدى إلى النزاع "** .

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

فإن قلت : نهى صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط، فيلزم أن يكون العرف قاضياً على الحديث، قلت: ليس بقاضٍ عليه، بل على القياس، لأن الحديث معلول بوقوع النزاع المخرج للعقد عن المقصود به ، وهو قطع المنازعة ، والعرف ينفي النزاع فكان موافقاً لمعنى الحديث، فلم يبق من الموانع إلا القياس والعرف قاضٍ عليه...قلت: وتدل عبارة البزازية والخانية ، وكذا مسألة القبقاب على اعتبار العرف الحادث، ومقتضى هذا أنه لوحدث عرف في شرط غير الشرط فى النعل والثوب والقبقاب أن يكون معتبراً إذا لم يؤد إلى المنازعة. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۵/۸۸، كتاب البيوع،سعيد).

(وكذا في العناية على الهداية على هامش فتح القدير:٦/٤٤٢،دارالفكر-والفقه الحنفى فى ثوبه الجديد:٤/٦٤،الاصل الجامع فى بيان الشرط الفاسد).

مزید ملاحظہ ہو: (نشرالعرف في بناء بعض الاحكام على العرف ،وعمدة القارى :۳/۵۰۰،باب ذكرالبيع والشراء على المنبرفى المسجد،ط: ملتان).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

وقد كثرت في عهدنا أنواع الشروط فى البيوع والإجارات وغيرها فكل ما جرى به التعامل العام كان جائزاً ، مثل ما تعورف فى العالم كله أن مشترى الثلاجات ، والدافئات، والماكينات الأخرى يشترط على البائع القيام بتصليحها كلما عرضها فساد في حدود مدة معلومة، كالسنة أوالسنتين مثلاً ، فإن هذا الشرط جائز لشيوع التعامل بها. (تكملة فتح الملهم:١/٦٣٥،مسئلة الشرط فى البيع). **والله ﷻ اعلم۔**

حشرات الارض کی تجارت کا حکم:

سوال: کیڑے، سانپ وغیرہ کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ کا اصول یہ ہے کہ قابل انتفاع شئی کی خرید وفروخت جائز ہے، لہذا کیڑے، سانپ وغیرہ کے چمڑے یا جسم کے دیگر اجزاء سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو ان کی خرید وفرخت بھی جائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

ویباع دود القز وبیضه والنحل المحرز وهو دود العسل... بخلاف غيرهما من الهوام إلا السمک وماجاز الانتفاع بجلده أوعظمه ...والحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع . وفي الشامية: فی الحاوی الزاهدي : يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية وماجاز الانتفاع بجلده أوعظمه أی من حيوانات البحر أوغيرها. (الدرالمختارمع فتاوی الشامی: ٥/٦٨، مطلب فی بیع دودة القرمز).

شرح عنایہ میں ہے:

قوله ولايجوز بيع دود القز وبيضه...وجاز عند محمدؒ لكونه منتفعاً به لمكان الضرورة في بيعه قيل: وعليه الفتوىٰ . (شرح العناية : ٦/ ٤٢٠ .و كذا فی البحرالرائق :٦/ ٧٨، باب البيع الفاسد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وفي النوازل ويجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها في الأدوية وإن كان لاينتفع بها لايجوز والصحيح أنه يجوز بيع كل شيء ينتفع به كذا في التتارخانية. (الفتاوی الهندية:٣/١١٤، فصل فی بیع الحیوانات) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

پس افگندۂ شیر کی تجارت کا حکم:

سوال: بعض ملکوں میں بلیوں کو دفع کرنے کے لیے گھروں کے سامنے شیر کا پاخانہ ڈالتے ہیں اس پاخانہ کو بازار سے خریدنا پڑتا ہے، تو کیا اس کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شیر کا پاخانہ اگر مٹی یا دوائی وغیرہ سے مخلوط ہو تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور ایک قول کے مطابق بغیر ملاوٹ کے بھی درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

لایکره بل یصح بیع السرقین أی الزبل وصح بیعها مخلوطة بتراب أو رماد غلب علیها فی الصحیح کما صح الانتفاع بمخلوطها...وفی الشامیة : قوله الزبل وفی الشرنبلالیة هو رجیع ماسوی الإنسان، قوله غلب علیها کذا قیده في موضع من المحیط والکافي والظهیریة ، وأطلقه فی الهدایة والاختیار والمحیط فإما أن یحمل المطلق علی المقید أو یحمل علی الروایتین ، أوعلی الرخصة والاستحسان .(الدرالمختار مع فتاوی الشامی: ٦/ ٣٨٥، فصل فی البیع).

وفي تقریرات الرافعي : قوله أوعلی الرخصة والاستحسان أی المطلق علی الرخصة والمقید علی الاستحسان .(تقریرات الرافعی :٦/ ٣٠٨).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

ویجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع بهما. (الفتاوی الهندیة:٣/ ١١٦، فصل فی بیع المحرمات).

وفی البحر الرائق: کره بیع العذرة لا السرقین لأن المسلمین یتمولون السرقین وانتفعوا به في سائر البلاد والأمصار من غیر نکیر . (البحر الرائق:٨/ ١٩٩، کوئٹه).

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاوی:٦/ ٥٢١).

کتاب الفتاوی میں ہے:

ایسی چیزیں جو ناپاک ہوں، لیکن ان سے نفع اٹھایا جاسکتا ہو، انہیں خریدنا اور بیچنا درست ہے، اسی لیے فقہاء نے خالص گوبر اور لید فروخت کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ جانور کا فضلہ بے آمیز ہو تب بھی ان سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے۔(کتاب الفتاوی: ٥/ ٢٧٢، تجارت سے متعلق). واللہ ﷻ اعلم۔

جانوروں کو تول کر بیچنے کا حکم:

سوال: جانوروں کو تول کر بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ کبھی اپنے آپ کو ثقیل اور کبھی خفیف کرتے ہیں جس سے مکمل وزن دریافت کرنا مشکل ہے جب کہ عرف عام میں مروج ہے، لہذا حکم شرعی سے مطلع فرما کر

اجر عظیم کے مستحق ہو۔

الجواب: حیوانات کو تول کر فروخت کرنے کے سلسلہ میں صاحبِ ہدایہ کی ایک عبارت سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے: **قال في الهداية: لأن الحيوان لايوزن عادة ولايمكن معرفة ثقله بالوزن لأنه يخفف نفسه مرة ويثقل أخرى.** (الهداية: ۳/۸۳،باب الربوا).

یعنی عرف عام میں حیوانات کو تول کر فروخت نہیں کرتے، اور تولنے سے جانور کی ضخامت بھی معلوم نہیں ہوسکتی، کیونکہ جانور کبھی اپنے آپ کو ہلکا کر لیتا ہے اور کبھی بوجھل بنا دیتا ہے۔

لیکن عصر حاضر میں جانوروں کو تول کر فروخت کرنے کا عام عرف ہے، اور صحیح ضخامت کا معلوم نہ ہونا جہالتِ یسیرہ ہے اور تجارت میں جہالتِ یسیرہ جو "مفضية إلى النزاع" نہ ہو قابلِ تحمل ہے، مفسدِ عقد نہیں ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہالت جو "مفضية إلى النزاع" نہ ہو مفسدِ عقد نہیں ہے۔

شاہ صاحب (۱۳۵۲ھ) کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

قلت: إن الناس يعاملون في أشياء تكون جائزة فيما بينهم على طريق المروءة والإغماض، فإذا رفعت إلى القضاء يحكم عليها بعدم الجواز وذلك لأن العقود على نوعين:۔ نحو: يكون معصية في نفسه، وذا لايجوز مطلقاً، ونحو آخر: لايكون معصية وإنما يحكم عليه بعدم الجواز لافضاءه إلى المنازعة فإذا لم تقع فيه منازعة جاز. (فيض الباري: ۳/۲۸۹، كتاب الوكالة).

علامہ اکمل الدین بابرتیؒ (۷۸۶ھ) فرماتے ہیں کہ اموالِ ربویہ میں مقدار کی جہالت مفسد ہے احتمال ربا کی بنا پر، غیر اموالِ ربویہ میں مفسد نہیں ہے۔

قال في العناية: وهذا إنما يستقيم إذا لم تكن الأعراض ربوية، أما إذا كانت ربوية فجهالة المقدار تمنع الصحة لاحتمال الربا. (شرح العناية على هامش فتح القدير: ۶/۲۶۰، دار الفكر).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اگر خریدار اور فروخت کنندہ جانور کو وزن کر کے خرید وفروخت پر راضی ہوں تو جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیر جنس کے ذریعہ خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ جانور کا فی کلو حساب سے نرخ طے کرلیا گیا ہو،

نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کر لی گئی ہو، جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً: ایک بکرے کی ضرورت ہے تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرا منتخب کر لیتا ہے اور تاجر اس کو بتا دیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتا دیتا ہے کہ مثلاً: یہ بیس کلو ہے اب اگر خریدار اس کو قبول کر لے تو بیع منعقد ہو جائے گی اور اس طرح کی گئی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔

(جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/ ۱۱۸، از مفتی احسان اللہ صاحب)۔

سابق مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ (۱۴۱۵ھ) فرماتے ہیں:

موجودہ دور میں امام محمدؒ کی رائے زیادہ بہتر ہے کیونکہ آج کل حیوانات بھی موزونی ہو گئے ہیں مرغیوں وغیرہ کی بیع وزن سے ہوتی ہے، کیونکہ اصل وزن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجہول چیز کی بیع نہ ہو اور بیع کے وقت وزن معلوم ہو جائے۔ (درس الہدایہ: ۲۸۳)۔

مفتی نظام الدین صاحب فرماتے ہیں:

اگر مرغیوں کو اس طرح بیچنے میں (تو لکر) بیچنا، خریدنا مرغیوں کا مقصود ہو یعنی مبیع مرغیاں قرار دی جائیں محض ان کا گوشت ہی مبیع قرار نہ ہو تو چونکہ اصل مبیع (مرغیاں) معلوم متعین اور شاہد ہوں گی اس لیے یہ بیع جائز رہے گی۔ (منتخبات نظام الفتاوی: ۱/ ۲۴۵)۔

مفتی رشید صاحب لدھیانویؒ (۱۴۲۱ھ) فرماتے ہیں:

مرغی کے سانس کی وجہ سے اس کے وزن میں کوئی معتد بہ فرق نہیں آتا، لہذا یہ جہالت یسیرہ ہے جو مفضیہ الی المنازعہ نہیں، مرغی کی اس طرح بیع کے عرف عام ہو جانے کی وجہ سے اس میں نزاع کا احتمال نہیں، اس لیے یہ بیع جائز ہے۔ (احسن الفتاوی: ۶/ ۴۹۷)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

مچھلی، مرغ، بکرے، بھینس وغیرہ کو زندہ حالت میں تول کر روپیہ پیسہ کے عوض میں خرید وفروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ مستفاد از اوجز المسالک: ۵/ ۱۰۵، (ایضاح المسائل، ص ۱۵۸)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جانوروں کو تول کر بیچنے کے سلسلہ میں تین اشکالات وارد ہوتے ہیں:

اشکال (۱): حیوانات موزونی نہیں بلکہ عددی ہیں۔

الجواب: (۱) سلف کے زمانہ میں موزونی نہیں تھے فی زماننا موزونی بن گئے ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا فتاوی

کی عبارات سے واضح ہوا۔

اشکال (۲): کبھی اپنے آپ کو خفیف اور کبھی ثقیل بنا لیتے ہیں؟

الجواب (۲): اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جہالتِ یسیرہ ہے جو "مفضية إلى النزاع" نہیں ہے، ہاں اموال ربویہ میں ایسی جہالت مضر ہے، اور یہاں بیع الجنس بالجنس نہیں ہے۔

اشکال (۳): وزن مجہول ہے؟

الجواب: (۳) عاقدین کی مجلس میں وزن کرنے سے یہ جہالت ختم ہو جاتی ہے اور اس سے نزاع رفع ہو جاتا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتاویٰ عثمانی مع الحاشیہ: ۹۸/۳-۱۰۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غرر اور مبیع کی جہالت کے مابین فرق:

سوال: فقہاء نے بعض بیوع اور معاملات کو غرر کی وجہ سے ناجائز فرمایا ہے، آپ بتلا دیں کہ غرر اور مبیع کی جہالت میں کیا فرق ہے؟

الجواب: بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غرر میں مبیع کا وجود ہی مشکوک ہوتا ہے کہ مبیع موجود ہے یا نہیں، ہاتھ میں آئے گی یا نہیں، اور جہالت میں مبیع تو موجود ہے لیکن اس کی کسی صفت میں جہالت ہے یا تعیین میں جہالت ہے، مثلاً بیع السمک فی الماء میں غرر ہے کہ معلوم نہیں سمک پر دسترس حاصل ہوگی یا نہیں اور بیع واحد من عبدین میں جہالت ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار مع فتاوی شامی میں ہے:

وبيع الحمل أي الجنين ... لنهيه صلى الله عليه وسلم عن المضامين والملاقيح وحبل الحبلة ولما فيه من الغرر...وهو الشک في وجوده ...ولؤلؤ في صدف للغرر لأنه لايعلم وجوده . (الدر المختار مع فتاوى الشامي: ٦٢/٥، باب البيع الفاسد، سعيد).

وفي الدر المختار: وبيع ثوب من ثوبين أوعبد من عبدين لجهالة المبيع. (الدر المختار: ٦٦/٥، سعيد).

شرح العنایہ میں ہے:

ولايجوز بيع الحبل ... لأن فيه غرراً وهوما طوى عنك علمه ، قال المغرب : في الحديث :" نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر" وهو الخطر الذي لايدرى أيكون أم لا كبيع السمك في الماء والطيرفي الهواء. (شرح العناية:٦/٤١١،دارالفكر).

بدائع الصنائع میں ہے:

الغرر هو الخطر الذي استوى فيه طرف الوجود والعدم بمنزلة الشك . (بدائع الصنائع: ١٦٣/٥، سعيد).

جمہرۃ القواعد الفقہیہ میں ہے:

كل بيع كان المقصود منه مجهولاً غيرمعلوم ، ومعجوزاً عنه غيرمقدور عليه فهو غرر، وذلك مثل أن يبيعه سمكاً في الماء ، أوطيراً في الهواء ، أولؤلؤاً في البحر، أوعبداً آبقاً ، أوجملاً شارداً ، أوثوباً في جراب لم يره ولم ينشره ، أوطعاماً في بيت لم يفتحه، أو ولد بهيمة لم يولد، أوثمرشجرة لم تثمرفي نحوها من الأمور التي لاتعلم ، ولايدري هل تكون أم لا ، فإن البيع مفسوخ فيها .(جمهرة القواعدالفقهية: ٣٠٩/١).

مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

جانور کے تھنوں میں جو دودھ ہے اسے نکالنے سے پہلے نہیں بیچ سکتا، اس میں غرر ہے کیونکہ بعض دفعہ ہوا بھری ہوتی ہے اور دودھ نکالنے پر بائع اور مشتری کا نزاع ہوسکتا ہے، جوئے کی وجہِ حرمت بھی یہی ہے کہ اس میں غرر ہوتا ہے جس کو خطر کہتے ہیں کہ جس کے وجود یا عدم کا تعین نہ ہو۔(درس الهدايه : ١٦٩، باب البيع الفاسد) .

واللہ ﷻ اعلم۔

جہالتِ یسیرہ کا حکم:

سوال: اگر مبیع مجہول ہو یا کام مجہول ہو لیکن جہالت غیر مفضیہ الی النزاع ہو تو معاملہ جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: تجارت میں وہ جہالت مفسدِ عقد ہے جو " مفضية إلى المنازعة "ہو، لیکن جو " مفضية إلى المنازعة " نہ ہو اور عرفِ عام میں مروج ہو وہ قابلِ تحمل ہے اور مفسدِ عقد نہیں ہے۔

صاحبِ ہدایہؒ (۵۹۳ھ) فرماتے ہیں:

والأثمان المطلقة لاتصح إلا أن تكون معروفة القدر والصفة لأن التسليم والتسلم واجب بالعقد وهذه الجهالة مفضية إلى المنازعة فيمنع التسليم والتسلم، وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل. (الهداية: ٣/ ٢٠).

صاحبِ ہدایہ کی عبارت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہر جہالت مفسدِ عقد نہیں ہے، بلکہ وہ جہالت جو نزاع پیدا کردے وہی خاص طور پر مفسدِ عقد ہے۔

شرح المجلہ میں ہے:

وفي الهندية(٣/ ١٢٢): جهالة المبيع أو الثمن مانعة لجواز البيع إذا كان يتعذر معها التسليم وإن كان لايتعذر لايفسد العقد كما لو باع صبرة معينة ولم يعرف قدر كيلها أو باع أثواباً معينة ولم يعرف عددها، وإنما يفسد البيع بالجهالة الفاحشة إذا كان محتاجاً إلى تسليم المبيع وإلا فلا يفسد. (شرح المجلة،لسليم رستم باز،١/ ١٠٢،دارالكتب العلمية).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله معرفة قدر هو في المصنف منون يشمل قدر المبيع والثمن قال في البحر: وأشار بالمعرفة إلى أن الشرط العلم بهما دون ذكرهما كما في الإيضاح فلو كان المبيع مجهولاً جهالة فاحشة ولم يجربها العرف لايصح البيع. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ٣/ ١٢،كوئٹه).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

فإن كان مجهولاً جهالة مفضية إلى المنازعة يمنع صحة العقد، وإلا، فلا. (الفتاوى الهندية: ٤/ ٤١١، كتاب الاجارة).

فتاوی شامی میں ہے:

قوله وشرط صحته معرفة قدر مبيع وثمن ككر حنطة وخمسة دراهم أو أكرار حنطة فخرج مالو كان قدر المبيع مجهولاً أي جهالة فاحشة، فإنه لايصح وقيدنا بالفاحشة لما قالوه لو باعه جميع ما في هذه القرية أو هذه الدار والمشتري لايعلم ما فيها لايصح لفحش الجهالة، أما لو باعه جميع ما في هذا البيت أو الصندوق أو الجوالق فإنه يصح لأن الجهالة يسيرة. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢٩، كتاب البيوع،سعيد).

علامہ عینیؒ (٧٦٢۔٨٥٥ھ) فرماتے ہیں:

وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز أي جواز العقد هذا أي كون الجهالة المفضية إلى المنازعة مانعة هو الأصل أي في كتاب البيوع بالإجماع لأن شرعية المعاملات لقطع المنازعات المفضية إلى الفساد. (البناية فی شرح الهداية:١٥/٣).

شاہ صاحبؒ (١٣٥٢ھ) فیض الباری میں فرماتے ہیں:

قلت: إن الناس يعاملون في أشياء تكون جائزة فيما بينهم على طريق المروءة والإغماض، فإذا رفعت إلى القضاء يحكم عليها بعدم الجواز وذلک لأن العقود على نحوين:۔ نحو: يكون معصية في نفسه، وذا لايجوز مطلقاً، ونحو آخر: لايكون معصية وإنما يحكم عليه بعدم الجواز لافضائه إلى المنازعة فإذا لم تقع فيه منازعة جاز. (فيض الباری: ٢٨٩/٣، كتاب الوكالة).

علی احمد الندوی "جمہرۃ القواعد الفقہیۃ" میں فرماتے ہیں:

الجهالة ليست بمانعة لذاتها، بل لكونها مفضية إلى النزاع، وهذا أصل مهم ينبغي التعويل عليه في الأحكام، فإن به حل كثير من المشكلات، وليعلم أن أحكام المعاملات الشرعية مبنية على أصلين عادلين:

الأول: منع كل ما فيه ظلم وأكل لأموال الناس بالباطل.

الثاني: منع ما يؤدي إلى الاختلاف والنزاع بسبب الجهالة، فإذا انتفى ما يؤدي إلى الظلم والنزاع بسبب الجهالة، صح التعامل، والعرف أصل عظيم يرجع إليه في ذلک بعد الشرع. (جمهرة القواعد الفقهية فی المعاملات المالية: ٣١٩/١، تحت القاعدة: الجهالة انما توجب الفساد اذا كانت مفضية الى النزاع المشكل).

حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو جہالت نزاع کا سبب ہو وہ منع ہے اور جو جہالت نزاع کا سبب نہیں بنتی وہ منع نہیں ہے۔(درس الهدايه: الجزء الثالث،ص٢٩)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

تین دن سے زائد خیار شرط کا حکم:

سوال: اگر بائع نے ایجاب فیکس (Fax) کے ذریعہ ارسال کیا اور لکھا کہ فیکس بھیجنے کے وقت سے پانچ دن تک میرے لیے خیار رہے گا، اگر مشتری نے پڑھا تو کیا پانچ دن تک اختیار رہے گا یا صرف مشتری تک پہنچنے کی مجلس تک؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بائع نے مشتری کو فیکس بھیجا اور اپنے لیے خیار شرط رکھا تو مشتری کو جب وصول ہو جائے اور مشتری قبول کرلے تو بائع کو اپنے خیار شرط کی بنا پر تین دن تک عقد فسخ کرنے کا اختیار رہے گا، ہاں اگر ضرورت کی وجہ سے ۵ دن کا خیار رکھے تو عام کتابوں میں تین دن سے زائد خیار شرط کو فاسد قرار دیا ہے، البتہ شرح نقایہ میں ملا علی قاریؒ (۹۳۰ھ۔۱۰۱۴ھ) نے ان اشیاء میں تین دن سے زائد کو جائز قرار دیا ہے جن کی صفات کا علم تین دن میں نہیں ہوسکتا۔

ملاحظہ فرمائیں شرح نقایہ میں ہے:

وإن كان فيه صفة لايمكن الوقوف عليها في ثلاثة أيام يجوز أن يشترط فيه أكثرمن ثلاثة أيام لأنه شرع للحاجة إلى التأمل وهي تندفع بذلک. (شرح النقاية:۲/۱۲، كتاب البيوع).

مجلۃ الاحکام العدلیہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تین دن سے زائد بھی خیار رکھ سکتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں مجلّہ اور شرح مجلّہ میں ہے:

المادة : ۳۰۰ : يجوز أن يشترط الخيار بفسخ البيع أو إجازته مدة معلومة لكل من البائع والمشتري...قوله مدة معلومة أعم من أن تكون مدة الخيار ثلاثه أيام أو أكثر وهذا اختيار من المجلة لقول الإمامين، وبه قال أحمدؒ، لأنه شرع نظراً للمتعاقدين للاحتراز عن الغبن وقد لايحصل ذلک في الثلاث فيكون مفوضاً إليهما. (عينى على الكنز:۲/۱۱).(شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسى، ۲/۲۳٤). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایک مشتری کو مبیع دکھا کر دوسرے کو فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے خریدار کو ایک فریز رفروخت کیا وہ فریز ر بطورِ نمونہ رکھا ہوا تھا چونکہ مشتری نے قیمت ادا نہیں کی اس لیے فریز نہیں لے گیا، بائع نے وہ فریز ر دوسرے شخص کو فروخت کر دیا یہ سوچ کر کہ جب مشتری

آجائیگا تو اس کو گودام سے دوسرا فریز ردیدوں گا، کیا اسطرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر مشتری نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہی فریز ر پسند ہے دوسرا نہیں لوں گا تو پھر بائع اس کو نہیں بیچ سکتا، مگر مشتری کے آنے سے مایوس ہوجائے تو یک طرفہ عقد فسخ کر کے اس کی قیمت وصول کر لے، اور اگر بائع نے صرف نمونہ دکھایا تھا اصل مبیع کو نہیں دکھایا تھا تو یہ بیع نہیں وعدۂ بیع ہے، اور اگر عقد بھی کرلیا تھا تو جب مشتری آجائے تو اس کو دوسرا فریز ردیدے، ہاں غیر مرئی چیز کی بیع کی وجہ سے مشتری کو خیارِ رویت حاصل ہوگا، اور بطورِ نمونہ دکھائے جانے والے فریزر کی بیع نہیں ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

قال ومن اشترى عبداً فغاب والعبد في يد البائع وأقام البائع البينة أنه باعه إياه فإن كانت غيبته معروفة لم يبع في دين البائع لأنه يمكن إيصال البائع إلى حقه بدون البيع وفيه إبطال حق المشتري وإن لم يدر أين هو بيع العبد وأوفى الثمن لأن ملك المشتري ظهر بإقراره فيظهرعلى الوجه الذي أقر به مشغولاً بحقه وإذا تعذر استيفاؤه من المشتري يبيعه القاضي فيه كالراهن إذا مات والمشتري إذا مات مفلساً والمبيع لم يقبض. (الهداية:۳/۱۰۳).

وفي الهندية: من اشترى شيئاً لم يره فله الخيار إذا رآه إن شاء أخذه بجميع ثمنه وإن شاء رده سواء رآه على الصفة التي وصفت له أوعلى خلافها كذا في فتح القدير وهوخيار يثبت حكماً لا بالشرط كذا في الجوهرة النيرة. (الفتاوى الهندية:۳/۵۷،۵۸).

تنبیہ: یک طرفہ طور پر فسخ کرنے کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اصلی کہہ کر جعلی چیز دینے کا حکم:

سوال: ایک عورت نے سیل فون کی بیٹری خریدی اس نے بائع سے کہا کہ اسکو اصلی چاہئے (یعنی جو زیادہ موٹی نہ ہو یہ اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے) بائع نے اس کو ایک (نقلی) بیٹری دیدی اور اعلیٰ کی قیمت وصول کرلی، چھ ماہ بعد عورت نے دوسرے دوکاندار سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ اصلی نہیں تھی بلکہ نقلی تھی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ عورت بائع سے کچھ وصول کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بائع نے اصلی اور جید بیٹری کی قیمت وصول کر کے نقلی اور جعلی بیٹری دیدی

لہذا عورت کا حق اصلی بیٹری میں ہے اب قاعدہ کے مطابق نقلی واپس کردے اور اصلی وصول کرلے، لیکن اگر نقلی بیٹری قریب الاختتام ہو اور اس کی طاقت ختم ہونے والی ہو یا بہت استعمال ہو چکی ہو تو پھر یہ عورت اصلی اور نقلی کے درمیان جو فرق ہے اس کو وصول کرلے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن له على آخر عشرة دراهم جياد فقضاه زيوفاً وهو لايعلم فأنفقها أو هلكت فهو قضاء عند أبي حنيفةؒ ومحمدؒ وقال أبويوسفؒ يرد مثل زيوفه ويرجع بدراهمه. (الهداية:۳/۱۰۳).

وفي فتح القدير: وذكر فخر الإسلام وغيره أن قولهما قياس وقول أبي يوسفؒ هو الاستحسان. (فتح القدير: ۷/۱۳۰).

درمختار میں ہے:

ولو قبض زيفاً بدل جيد كان له على آخر جاهلاً به...فلو قائماً رده اتفاقاً. (الدر المختار:۵/۲۳۳،سعيد).

وفي الهداية: وإذا حدث عند المشتري عيب واطلع على عيب كان عند البائع فله أن يرجع بالنقصان ولايرد المبيع لأن في الرد إضراراً بالبائع لأنه خرج عن ملكه سالماً ويعود معيباً فامتنع ولابد من دفع الضرر عنه فتعين الرجوع بالنقصان. (الهداية:۳/۴۱،باب خيار العيب).

واللہ ﷻ اعلم۔

عیب پوشیدہ رکھ کر فروخت کرنے کا حکم:

سوال: سعید موٹر سائیکل خریدنا چاہتا ہے احمد کے پاس ایک موٹر سائیکل ہے اور وہ بہت کم قیمت کی ہے، سعید نے پوچھا کہ اس میں کوئی خرابی ہے؟ احمد نے بتایا کوئی خرابی نہیں ہے اور اس کی خوبیاں بیان کی سعید نے احمد پر اعتماد کر کے کم قیمت میں خرید لی پھر اس میں خرابی پائی، نیز سعید نے میکینک سے دریافت کیا اس نے بتایا کے احمد کو معلوم تھا، ٹھیک کرانے کی کوشش بھی کی لیکن نہ ہو سکی، اب سوال یہ ہے کہ پوچھنے کے باوجود مبیع کے عیب کو نہ بتانا درست ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کیا فرمایا؟

الجواب: مبیع کے عیب کو چھپانا ناجائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جو ہم کو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں، لہذا احمد کے لیے ایسا کرنا ناجائز ہے، اب سعید کو اختیار ہے اگر راضی نہیں ہے تو واپس کردے، ہاں اگر سعید نے عیب پر رضامندی ظاہر کی ہے تو اب واپس نہیں کرسکتا۔

ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم مرعلى صبرة من طعام فأدخل يده فيها، فنالت أصابعه بللاً، فقال: يا صاحب الطعام ماهذا ؟ قال: أصابته السماء يا رسول اللّٰه ! قال: أفلاجعلته فوق الطعام حتى يراه الناس، ثم قال: "من غش فليس منا". قال المحشي: أى ليس من أخلاقنا ولاعلى سنتنا، قال أبوعيسىٰ: والعمل على هذا عند أهل العلم كرهوا الغش وقالوا: الغش حرام . (ترمذی شریف مع الحاشیة:۱/۲۴۵،باب ماجاء فی کراهیة الغش فی البیوع).

وفى الدرالمختار: لايحل كتمان العيب في مبيع أوثمن لأن الغش حرام . (الدرالمختار:۵/۴۷،سعید).

وقال فى المبسوط: قال: اشتره فإنه لاعيب به ثم وجد به عيباً كان له أن يخاصم فيه بائعه. (المبسوط للامام السرخسیؒ:۱۳/۹۲،باب العیوب فی البیوع، ادارة القرآن).

ہدایہ میں ہے:

وإذا اطلع المشتري على عيب فى المبيع فهو بالخيار إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء رده . (الهداية: ۳/۴۰،باب خيار العيب).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

دکان میں کوئی عیب دار چیز ہو تو گاہک کو عیب پر مطلع کیے بغیر فروخت کرنا سخت گناہ ہے۔

لقوله عليه السلام: من باع معيباً لم ينبه لم يزل في لعنت اللّٰه ويلعنه الملائكة .

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس نے گاہک کو بتائے بغیر عیب دار چیز فروخت کردی وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت میں گرفتار رہیگا، ایسا شخص فاسق ہوجاتا ہے بعد میں عیب پر مطلع ہونے کی صورت میں خریدار کو مال واپس کرنے کا حق ہوگا۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۸۷۔وکذافی عطرالہدایہ ص ۱۰۵).

احسن الفتاوی میں ہے:

مبیع کا عیب چھپانا حرام ہے۔(احسن الفتاوی:۶/۴۹۳) . واللہ ﷻ اعلم۔

تمام عیوب سے براءت کا حکم:

سوال: اگر بائع یہ کہدے کہ اس چیز کو واپس نہیں کرسکتے جو عیب اس میں ہے، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بائع کا مبیع کے جملہ عیوب سے براءت کرنا صحیح اور درست ہے، اور اگر یہ کہا کہ عیب کا میں ذمہ دار ہوں لیکن بغیر عیب کے واپس نہیں لوں گا، تو یہ اقالہ سے انکار ہے اس کی بھی گنجائش ہے اگر چہ خلافِ اولیٰ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ومن باع عبداً وشرط البراءة من كل عيب فليس له أن يرده بعيب وإن لم يسم العيوب بعددها. (الهداية، كتاب البيوع، باب خيار العيب، ۳/۴۸، وكذا في المبسوط للامام السرخسيؒ:۱۲/۹۱).

شرح المجلہ میں ہے:

إذا باع ماله بشرط براءة ذمته من دعوى كل عيب فلا يكون للمشتري خيار عيب.

(شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسي، البيوع، الفصل السادس في خيار العيب، ۲/۳۰۵، رشيدية) . واللہ ﷻ اعلم۔

خیارِ غبن کی تحقیق اور اس کا حکم:

سوال: خیارِ غبن کسے کہتے ہیں اور اس کا کیا حکم ہے؟ کیا واپس کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: غبن کے معنی دھوکہ کے ہیں، فقہاء کے یہاں کسی چیز کی مناسب قیمت سے زیادہ قیمت کو ''غبن'' کہتے ہیں، غبن کی دو قسمیں ہیں: (۱) غبن یسیر اس سے مراد ایسی قیمت ہے جو قیمت لگانے والوں کے اندازہ کے دائرہ میں آسکے، جیسے کوئی شئی دس روپے میں خرید کی گئی اور اس کی قیمت کوئی آٹھ کوئی نو کوئی دس روپے لگاتا ہے تو یہ غبن یسیر ہوگا۔

(۲) غبن فاحش وہ ہے جو قیمت لگانے والوں کے اندازہ سے باہر ہو، جیسے کوئی چیز دس روپے میں خرید کی گئی، لیکن اس کی قیمت سات آٹھ روپے لگائی جاتی ہے، سات آٹھ روپے سے زیادہ کوئی نہیں لگاتا، تو یہ غبن فاحش۔

بعض حضرات نے عددی تحدید اس طرح کی ہے: کہ منقول اشیاء میں مناسب قیمت سے پانچ فیصد زیادتی، جانوروں میں دس فیصد اور زمین و مکانات وغیرہ میں بیس فیصد غبن فاحش اور اس سے کم غبن یسیر۔

اب اگر کسی کو بیع میں دھوکہ ہوا تو واپس کرنے کا حق ہوگا یا نہیں، تو صحیح اور مفتیٰ بہ قول کے مطابق اگر غبن میں دھوکہ پایا گیا تو واپس کرنا صحیح اور درست ہے اور اگر دھوکہ نہیں ہوا تو واپس نہیں کرنا چاہئے علامہ شامیؒ نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

الغبن الفاحش هو ما لايدخل تحت تقويم المقومين هو الصحيح كما في البحر و ذلك كما لو وقع البيع بعشرة مثلاً ثم أن بعض المقومين يقول إنه يساوي خمسة وبعضهم ستة وبعضهم سبعة ، فهذا غبن فاحش لأنه لم يدخل تحت تقويم أحد بخلاف ما إذا قال بعضهم ثمانية وبعضهم تسعة وبعضهم عشرة ، فهذا غبن يسير.

إذا وجد غبن فاحش في البيع ولم يوجد تغرير فليس للمغبون أن يفسخ البيع ...إذا غر أحد المتبايعين وتحقق أن في البيع غبناً فاحشاً فللمغبون أن يفسخ البيع حينئذٍ. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی، ۲/ ۳۳۵، ۳۳۷، الفصل السابع فی الغبن و التغرير).

وفي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: قال : ثم حدد المتأخرون من الفقهاء الغبن الفاحش للتيسير في الفتوىٰ والقضاء والتطبيق أنه ما بلغ خمس القيمة في العقار وعشرها في الحيوان ونصف العشر في العروض وسائر المنقولات. (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ٤/ ١٩٣، خيار التغرير).

قال في رد المحتار: قوله لا رد بغبن فاحش...وبه أفتى بعضهم مطلقاً، أي سواء كان الغبن بسبب التغرير أو بدونه لكن هذا الإطلاق لم يذكره في القنية وإنما حكى في القنية الأقوال الثلاثة ، فيفهم منه أن هذا غير مقيد بالتغرير أو بدونه ، ولكن نقل في الفتح أن الإمام علاء الدين السمرقندي ذكر في تحفة الفقهاء أن أصحابنا يقولون في المغبون أنه لا يرد

لكن هذا في مغبون لم يغر أما في مغبون غر يكون له حق الرد استدلالاً بمسئلة المرابحة... قلت: ويؤيده أيضاً عدم التصريح بالإطلاق في القولين الأولين ، وحيث كان ظاهر الرواية محمولاً على هذا القول المفصل ، يكون هو ظاهر الرواية إذ لم يذكروا أن ظاهر الرواية عدم الرد مطلقاً، حتى ينافي التفصيل فلذا جزم في التحفة بحمله على التفصيل وحينئذ لم يبق لنا إلا قول واحد هو المصرح بانه ظاهر الرواية ، وبأنه المذهب وبأنه المفتىٰ به وبأنه الصحيح فمن أفتى في زماننا بالرد مطلقاً فقد أخطأ خطأً فاحشاً لماعلمت من أن التفصيل هو المصحح المفتىٰ به، ولاسيما بعد التوفيق المذكور، وقد أوضحت ذلك بمالا مزيد عليه في رسالة سميتها "تحبير التحرير في إبطال القضاء بالغبن الفاحش بلا تغرير". (فتاوى الشامي:۵/۱۴۳، مطلب في الكلام على الرد بالغبن الفاحش، سعيد) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

دھوکا ہونے کی صورت میں بیع فسخ کرنے کا حکم:

سوال: اگر زید نے عمر کے ہاتھ ایک چیز فروخت کی لیکن اس میں دھوکہ دیا، اعلیٰ کی بجائے ادنیٰ چیز دیدی یا قیمت میں دھوکہ دیا کہ اس کی قیمت بازار میں ایک ہزار رینڈ ہے آپ نوسو میں لے لو، حالانکہ بازار میں اس کی قیمت فقط سات سو رینڈ ہے تو ان دونوں صورتوں میں مشتری کو عقد فسخ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اعلیٰ کی بجائے ادنیٰ دینے کی وجہ سے مشتری کو دھوکہ ہوا اور چونکہ اعلیٰ اور ادنیٰ یہ مبیع کا وصف ہے اور وصف کے مقابلہ میں ثمن نہیں ہوتا لہذا قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں البتہ وصف مرغوب فوت ہونے کی وجہ سے مشتری کو اختیار ہے اگر چاہے تو پورے ثمن میں رکھلے ورنہ واپس کردے۔ دوسری صورت میں بھی مشتری کو دھوکا ہوا کہ زیادہ قیمت وصول کرلی یہ جھوٹ اور دھوکا ہے، لہذا مشتری کو اختیار ہے چاہے تو رکھلے یا واپس کردے لیکن قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ومن اشترى ثوباً على أنه عشرة أذرع بعشرة دراهم، أو أرضاً على أنها مائة ذراع بمائة درهم فوجدها أقل فالمشتري بالخيار إن شاء أخذها بجملة الثمن وإن شاء ترك لأن الذراع وصف في الثوب ألا ترى أنه عبارة عن الطول والعرض والوصف لايقابله شيء من

الثمن كأطراف الحيوان، فلهذا يأخذه بكل الثمن...إلا أنه يتخير لفوات الوصف المذكور لتغير المعقود عليه فيختل الرضا. (الهداية:۳/۲۳).

نیز مذکور ہے:

فإن اطلع المشتري على خيانة في المرابحة فهو بالخيار عند أبي حنيفةؒ إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء تركه...والتولية والمرابحة ترويج وترغيب فيكون وصفاً مرغوباً فيه كوصف السلامة فيتخير بفواته. (الهداية:۳/۷۱،۷۲).

وفي شرح العناية: قال لأن مطلق العقد يقتضي وصف السلامة أى سلامة المعقود عليه عن العيب لماروي أن رسول الله صلى الله عليه وسلم اشترى من عداء بن خالدبن هوذة عبداً و كتب في عهدته "هذا ما اشترى محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم من العداء بن خالد بن هوذة عبداً لا داء ولاغائلة ولاخبثة، بيع المسلم من المسلم"...وفي هذا تنصيص على أن البيع يقتضي سلامة المبيع عن العيب، ووصف السلامة يفوت لوجود العيب، فعند فواته يتخير لأن الرضا داخل في حقيقة البيع، وعند فواته ينفى الرضا فيتضرر بلزوم مالايرضى به. (شرح العناية على هامش فتح القدير: ٦/٣٥٤،دارالفكر).

فیض الباری میں ہے:

في فتح القدير ـ في باب الإقالة أن الغرر، إما قولي أوفعلي، فإن كان الغرر قولياً، فالإقالة واجبة بحكم القاضي، وإن كان الثاني تجب عليه الإقالة ديانة، ولايدخل في القضاء كيف! وأن الخدعات أشياء مستورة، ليس إلى علمها سبيل، فلا يمكن أن تدخل تحت القضاء. (فيض الباری:۳/۲۳۱،كتاب البيوع). واللہ ﷻ اعلم۔

ثمن ادا نہ کرنے پر مبیع واپس لینے کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے قسطوں پر ایک مشین خریدی کہ ماہانہ ۵سو رینڈ ادا کریگا کچھ مدت تک قسطیں ادا کرتا رہا پھر بعد میں ادا کرنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے بائع نے مشین واپس لے لی، اب کیا مشتری سے وصول کی ہوئی قیمت واپس کریگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اولاً مشتری اس مشین کا مالک ہے لہذا اس سے مشین لینا جائز اور درست نہیں تھا، اس کے باوجود اگر بائع نے مشین مشتری کی مرضی سے واپس لے لی تو یہ اقالہ کے حکم میں ہے اور اقالہ میں مبیع واپس کرنے پر ثمن بھی واپس کرنا لازم اور ضروری ہے، ورنہ بدلین کا ایک شخص کی ملک میں جمع ہونا لازم آئیگا جو کہ شرعی قانون کے خلاف ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شرح المجلہ میں ہے:

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح .أى و التأجيل لازم ، فليس للبائع حبس المبيع حتى يقبضه و لا المطالبة به قبل حلول الأجل .(شرح المجلة لمحمدخالد الاتاسی،۲/۱۶۶).

معلوم ہوا کہ بیع بالتقسیط میں مشتری مبیع کا مالک ہے، لہذا بائع اس پر قبضہ نہیں کرسکتا، لیکن اگر واپس لے لی تو اقالہ کے حکم میں ہوگا اور مشتری کا ادا کیا ہوا ثمن واپس کرنا لازم ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول...فإن شرطا أكثر منه أو أقل فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول . (الهداية:۳/۶۹).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق ہونا منع نہیں، مگر قسطیں متعین ہوجائیں، اور پھر یہ نہ ہو کہ کسی قسط کے وقتِ متعین پر وصول نہ ہونے سے مزید اضافہ قیمت میں کیا جائے، یا وصول شدہ رقوم ہی ضبط ہوجائے اور موٹر سائیکل بھی ہاتھ سے چلی جائے، ایسی صورت ہو تو شرعاً یہ معاملہ درست نہیں، بلکہ اس میں سود اور جوا ہوگا، ان دونوں کی ممانعت نصوص میں مذکور ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۴۶،مبوب و مرتب).

آپ کے مسائل میں مذکور ہے:

یہ شرط کہ اگر کسی وجہ سے وہ تین ماہ کی قسطیں ادا نہ کرسکا تو بائع گاڑی اپنے قبضہ میں لے لے گا اور اس کی اداشدہ قسطیں سوختہ ہوجائیں گی، یہ شرعاً غلط ہے، بائع کو یہ حق ہے کہ اپنی قسطیں قانونی ذرائع سے وصول کرلے، لیکن وہ گاڑی کو اپنے قبضہ میں لینے کا مجاز نہیں اور نہ اداشدہ قسطوں کو ہضم کرنے کا مجاز ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل:۶/۱۵۴).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

ادھار کی وجہ سے قیمت لینا جائز ہے، مگر تمام اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں مبیع کی واپسی اور ادا کردہ اقساط ضبط کرنے کی شرط فاسد ہے، اس لیے یہ معاملہ جائز نہیں۔ (احسن الفتاوی:۶/۵۱۹) .

ہاں بعض علماء کا قول ہے کہ جب مشتری ثمن ادا نہ کرے تو بائع یک طرفہ عقد فسخ کر کے مبیع کو واپس لے سکتا ہے موجودہ زمانہ میں یہ آسان قول ہے اس پر فتویٰ دینا زیادہ مناسب ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن قال لآخر اشتريت مني هذه الجارية فأنكر الآخر إن أجمع البائع على ترك الخصومة وسعه أن يطأها لأن المشتري لما جحد كان فسخاً من جهته إذا الفسخ يثبت به كما إذا تجاحدا فإذا عزم البائع على ترك الخصومة تم الفسخ وبمجرد العزم وإن كان لايثبت الفسخ فقد اقترن بالفعل وهو إمساك الجارية ونقلها وما يضاهيه ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضاء البائع فيستبد بفسخه. (الهداية،٣/١٤٦،باب التحكيم).

لیکن ہدایہ کی دوسری عبارت اس کے خلاف معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

قال: ومن اشترى عبداً فغاب والعبد في يد البائع وأقام البائع البينة أنه باعه إياه فإن كانت غيبته معروفة لم يبع في دين البائع لأنه يمكن إيصال البائع إلى حقه بدون البيع.

(الهداية:٣/١٠٣، مسائل منثورة).

یعنی مشتری ثمن ادا کرنے سے پہلے غائب ہو گیا اور اس کا ٹھکانہ معلوم ہے تو مبیع بیچ کر ثمن وصول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بائع (قاضی کی معرفت) اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر ثمن وصول کرنا ممکن ہے کیونکہ قاضی کے پاس مقدمہ دائر کر کے ثمن وصول کرنا آسان ہے۔ جب کہ موجودہ دور میں یہ صورت ممکن نہیں ہے اگر مقدمہ دائر کریں گے تو کئی سال انتظار کرنا پڑیگا پھر اس کی وجہ سے مقدمہ کے اخراجات وغیرہ عائد ہوں گے۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ پہلی عبارت کی بنا پر یک طرفہ عقد فسخ کر کے مبیع واپس لے لے۔

حضرت مفتی ولی حسن صاحب بھی اسی پر فتویٰ دیتے تھے۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل آنے والے مسئلہ تحت بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ثمن ادا نہ کرنے پر بائع کا یک طرفہ فسخ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی قیمتی زمین کسی مشتری کو متعین ثمن پر فروخت کردی مشتری نے چھ ماہ بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا اور ثمن کا کچھ حصہ بطورِ ڈپازٹ ادا کردیا، چھ ماہ بعد اس سے کئی مرتبہ ثمن کا مطالبہ ہوا لیکن وہ نہیں دے رہا ہے اور اقالہ بھی نہیں کررہا ہے، کافی مدت کے بعد بائع نے عقد فسخ کرکے کسی اور کے ہاتھ اس زمین کو فروخت کردی کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: ہمارے حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ اور مفتی رشید احمد لدھیانویؒ اس قسم کے واقعہ میں یک طرفہ طور پر بیع فسخ کرنے کا فتویٰ دیا کرتے تھے جب مشتری اقالہ بھی نہیں کرتا اور ثمن بھی نہیں دیتا تو بائع یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرسکتا ہے، ایک مرتبہ بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء میں حضرت حکیم اختر صاحب دام مجدہ کی وساطت سے ایک استفتاء آیا جس میں سوال مذکور میں جو صورت ہے اس سے ملتی جلتی صورت تھی، مستفتی کا نام کنایات میں لکھا تھا حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ نے مختصر جواب بغیر حوالہ کے لکھا کہ یک طرفہ طور پر بائع فسخ کرسکتا ہے، ایک دو دن کے بعد پھر سوال آیا کہ چونکہ زید خود مفتی ہے اس لیے اس کو حوالہ درکار ہے۔ حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ نے ہدایہ ثالث کی درج ذیل عبارت تحریر فرمائی:۔

ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضاالبائع فيستبد بفسخه. (الهدايه: ۱۴۷/۳، كتاب ادب القاضي، مسائل شتىٰ من كتاب القضاء).

اس کے بعد کوئی سوال نہیں آیا، یہ سوال حضرت مفتی رشید صاحبؒ کی طرف سے تھا اور انہوں نے اس جواب سے اتفاق فرما کر یہی مسئلہ احسن الفتاویٰ:۶/۵۰۶، میں تحریر فرمایا۔

اس عبارت کو اگرچہ صاحبِ ہدایہ نے ایک خاص مسئلہ کے ذیل میں نقل کیا ہے لیکن یہ ایک اصول کا درجہ رکھتی ہے۔

اشکال اور جواب:

اشکال: لیکن اس پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ جس مسئلہ میں یک طرفہ طور پر فسخ کا ذکر ہے، اس میں مشتری بیع سے منکر ہے اس لیے بائع یک طرفہ فسخ کرسکتا ہے، کیونکہ مشتری کی طرف سے تو بیع ختم ہوگئی۔ جب کہ صاحبِ ہدایہ نے اسی صفحہ پر تحریر فرمایا: **لأن أحد المتعاقدين لايتفرد بالفسخ.** (الهداية:۱۴۷/۳، مسائل شتىٰ من كتاب القضاء).

اسی طرح شرح مجلّہ للا تاسی میں :۲/ ۲۵۸ پر لکھا ہے جہاں دوسرا فریق عقد کا اقراری ہو لیکن ثمن ادا نہیں کرتا ہے تو فریق آخر فسخ نہیں کرسکتا ہے۔

نیز بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

ونوع لايرتفع إلا بالإقالة وهو حكم كل بيع لازم وهو البيع الصحيح الخالي عن الخيار. (بدائع الصنائع: ۵/۳۰٦،سعيد).

محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب نے بھی اس کے موافق تحریر فرمایا ہے،یعنی یک طرفہ فسخ نہیں ہوسکتا۔(فتاویٰ عثمانی:۳/۶۲۱).

الجواب: لیکن اگر ہدایہ کی عبارت پر غور کیا جائے اور محشی حضرات کے کلام کی روشنی میں اس کو ملاحظہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائیگی کہ اصل مدار ثمن کی وصول یابی پر ہے جب ثمن کی وصول یابی ممکن نہ ہو یا انتہائی درجہ مشکل ہو تو یک طرفہ فسخ کی اجازت ہوگی۔

عنایہ میں ہے:

لما تعذر استيفاء الثمن يستبد وههنا لما أقر المشتري في مكانه بالشراء لم يتعذر الاستيفاء فلا يستبد بالفسخ. (العناية على هامش فتح القدير:۷/۳۳٤ ، دار الفكر).

یعنی مشتری ثمن کا اقرار کرتا ہے تو ثمن کی وصولی ممکن ہے اس لیے بیع کو یک طرفہ طور پر فسخ نہیں کر سکتے ہیں، چونکہ پرانے زمانہ میں اسلامی قضا کا نظام موجود تھا اور مظلوم کی دادرسی بآسانی ہوسکتی تھی تو ثمن وصول ہوسکتا تھا لیکن موجودہ دور میں ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے ثمن کی وصول یابی ناممکن کی طرح ہے اور عدالت میں جانا ندامت کے سوا کچھ نہیں،اور سالہا سال اپنے آپ کو پریشان کرنے کے مترادف ہے۔

نیز بدائع کی عبارت میں جو بیع لازم میں فسخ کی صورت صرف اقالہ لکھی ہے یہ عام حالات میں تو قابل عمل ہے لیکن جہاں ثمن یا مبیع کی وصولی ممکن نہ ہو وہاں یک طرفہ فسخ ہوسکتا ہے،اگر بیع میں غلام مشتری کے قبضہ سے پہلے بھاگ جائے تو عقد مکمل ہونے کے باوجود قاضی عقد کو فسخ کرسکتا ہے۔کمافی الدر مع الرد:(۴/۲۹۲،سعید).

حضرت مفتی محمد تقی صاحب دام فضلہ نے اس مذکورہ بالا مسئلہ میں یک طرفہ طور پر فسخ کو درست نہیں سمجھا لیکن حضرت کی دوسری کتاب میں گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ملاحظہ ہو تکملہ فتح الملہم میں ہے:

فإن الخادع يجب عليه ديانة أن يفسخ البيع أو يقيل المخدوع إذا طلب منه الإقالة وقد صرح به في الدر المختار و الشامي. (تکملة فتح الملهم:۱/۳۳۳).

حضرت نے تقریر ترمذی میں فرمایا ہے: لیکن متاخرین حنفیہ مالکیہ کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں اس لیے آج کل دھوکہ فریب عام ہے...لہذا دھوکا دیکر کوئی شخص اگر کم دام میں خرید لے یا زیادہ دام میں فروخت کر لے تو جس شخص نے دھوکا کھایا ہے اس کو خیارِ فسخ ملنا چاہئے جیسا کہ امام مالکؒ کا مذہب ہے چنانچہ آج کل فتویٰ اسی پر ہے لہذا دھوکا کھانے والے کو خیارِ مغبون حاصل ہوگا۔ (تقریر ترمذی:۱/۱۶۹).

فیض الباری میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

إن الغرر إما قولي أو فعلي فإن كان الغرر قولياً فالإقالة واجبة بحكم القاضي وإن كان الثاني تجب عليه الإقالة ديانة،... وهكذا أقول فيما إذا اشترى سلعة، فلم يؤد ثمنها حتى أفلس، أنه يكون فيه أسوة للغرماء عندنا قضاءً، ويجب عليه أن يرد المبيع إلى البائع خفيةً ديانةً ، فإنه أحق به ، لكنه حكم الديانة دون القضاء . (فیض الباری:۳/۲۳۲).واللہ ﷻ اعلم۔

قبضہ سے پہلے مبیع کے ہلاک ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کوئی چیز خریدی پہنچنے سے قبل راستہ ہی میں ہلاک ہوگئی تو تاوان کس پر آئیگا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب تک مشتری کو عرفاً قبضہ حاصل نہ ہوجائے بائع ہی کی ملکیت قرار دی جائیگی اور ہلاک ہونے کی صورت میں بائع پر تاوان لازم ہوگا، ہاں اگر عرفاً قبضہ حاصل ہوگیا تھا پھر ہلاک ہوئی تو مشتری اس کا ذمہ دار ہوگا۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

تفيد الملک بالقبض أي يثبت بالبيع أوبالشراء .(فتاوی الشامی: ۶/۱۳۰،کتاب الاکراہ).

یعنی قبضہ سے ملکیت مکمل ہوتی ہے، بغیر قبضہ کے ہلاک ہوجائے تو بائع کی ملک میں ہلاک ہوگی۔

شرح مجلّہ میں ہے:

المبيع إذا هلک في يد البائع قبل أن يقبضه المشتري يكون من مال البائع ولاشيء على المشتري... وإذا هلک المبيع بعد القبض هلک من مال المشتري ولاشيء على

البائع. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی،۲/۲۲۳،۲۲۵).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

قرآن وسنت میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت نہیں بتائی گئی ہے، بلکہ احادیث میں قبضہ کی مختلف کیفیات کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت میں مقام خریداری سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ تجار خرید کردہ مال کو اپنے کجاوے میں منتقل کرلیں، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ناپ تول کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، اسی لیے فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس بابت لوگوں کا عرف ہی معیار ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائیگا۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

ولایشترط القبض بالبراجم، لأن معنی القبض هو التمکین والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادة حقیقة. (بدائع الصنائع:۵/۱۴۸،سعید۔الفتاوی الهندیة:۳/۱۶۔(جدید فقهی مباحث:۱۵/۱۲).

فقہی مقالات میں ہے:

اسلامی شریعت کا حکم یہ ہے کہ صرف بیع ہوجانے اور ملکیت منتقل ہونے سے رسک (ضمان، خطرہ) منتقل نہیں ہوتا، جب تک اس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوجائے، لہٰذا جب مبیع پر مشتری یا اس کا وکیل یا نمائندہ قبضہ نہ کرلے چاہے وہ قبضہ حقیقی ہو یا عرفی ہو اس وقت تک اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوگا۔ (فقہی مقالات،۳/۷۳).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

بائع نے تخلیہ کردیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ یہ تمہارا گندم میرے گودام میں رکھا ہے تم جب چاہو اس کو اٹھا کے لے جاؤ، آج کے بعد میں اس کا ذمہ دار نہیں، اگر یہ گندم تباہ ہوجائے یا خراب ہوجائے تو تمہاری ذمہ داری ہے، اس صورت میں اگرچہ مشتری نے حسی طور پر قبضہ نہیں کیا لیکن چونکہ وہ مشتری کے ضمان میں آگیا ہے، اس لیے اب اس کا نقصان مشتری کے ذمہ ہوگا...امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ حسی قبضہ ضروری نہیں بلکہ تخلیہ کافی ہے، تخلیہ کے معنی یہ ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دیدی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کرلے جب قبضہ کرنے میں کوئی مانع باقی نہیں رہے تو سمجھیں گے کہ تخلیہ ہوگیا، مثلاً کوئی بکس ہے، اس کے اندر کئی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، اس کی چابی اس کے حوالہ کردی، تو جب چابی حوالے کردی اب چاہے وہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، قبضہ متحقق

ہوگیا، امام بخاریؒ نے یہاں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اختیار کیا ہے اور حضرت جابرؓ کا واقعہ موصولاً روایت کیا ہے کہ حضرت جابرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ خریدا اور پھر حضرت جابرؓ نے اسی اونٹ پر مدینہ منورہ تک سفر کیا، حضرت جابرؓ اس سے نہیں اترے لیکن تخلیہ متحقق ہوگیا تھا، امام بخاریؒ یہ کہتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ تخلیہ سے قبضہ ہوگیا۔ (اسلام اور معاشی مسائل، ۲/ ۹۸، ۱۰۰)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عطر ہدایہ، ص ۸۸، ۹۱۔ وجدید معاملات کے شرعی احکام، ۱/ ۴۰، ۴۲۔ وقاموس الفقہ، ۴/ ۴۶۶، ۴۶۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد مشتری کے ضمان میں داخل ہونے کی وجہ سے مشتری ذمہ دار ہوگا، اور قبضہ سے پہلے بائع ذمہ دار ہے، اور قبضہ کی حقیقت عرف پر مبنی ہے، نیز اشیاء کے اعتبار سے بھی فرق ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ کی زمین فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر ولی نے نابالغ کی زمین کسی وجہ سے فروخت کردی تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر ولی کی شفقت نابالغ پر معروف ومشہور ہو یا مستور الحال ہو اور فروخت کرنے میں مصلحت پیش نظر ہو تو فروخت کرنا جائز ہے۔

درمختار میں ہے:

ولو البائع أباً فإن محموداً عند الناس أو مستور الحال يجوز، ابن كمال، وقال في الشامية: قوله يجوز فليس للصغير نقضه بعد بلوغه إذ للأب شفقة كاملة ولم يعارض هذا المعنى معنى آخر فكان هذا البيع نظراً للصغير وإن كان الأب فاسداً لم يجز بيعه العقار فله نقضه بعد بلوغه هو المختار إلا إذا باعه بضعف القيمة إذ عارض ذلك المعنى معنى آخر، تنبيه: ظاهر كلامهم هنا أنه لايفتقر بيع الأب عقار ولده إلى المسوغات المذكورة في الوصي ونقل الحموي في حواشي الأشباه من الوصايا أن الأب كالوصي لايجوز له بيع العقار إلا في المسائل المذكورة كما أفتى به الحانوتي. ثم رأيت في مجموعة شيخ مشايخنا منلا على التركماني قد نقل عبارة الحموى المذكورة ثم قال مانصه: وهومخالف

لإطلاق ما في الفصول وغيره ولم يستند الحانوتي في ذلك إلى نقل صحيح ولكن إذا صارت المسوغات في بيع الأب أيضاً كما في الوصي صار حسناً مفيداً أيضاً لأن الأخذ بالاتفاق أوفق هكذا أفادنيه شيخنا الشيخ محمد مراد السقاميني رحمه اللّٰه تعالىٰ. (فتاوى الشامي: ٦/ ٧١١، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز بيع الوصي ولا شراؤه إلا بما يتغابن الناس في مثله لأنه لا نظر في الغبن الفاحش بخلاف اليسير لأنه لايمكن التحرز عنه ففي اعتباره انسداد بابه. (الهداية: ٤/ ٦٩٨، باب الوصي ومايملكه).

وفي الشامي: قوله ولو مصلحاً إنما ذكره لأنهم صرحوا بأن شرط بيع الأب عقار الصغير بمثل القيمة كونه محموداً أومستوراً فلوكان مفسداً لايجوز إلا بضعف القيمة.
(فتاوى الشامي: ٥/ ٤٢٦، سعيد).

وفيه أيضاً: قوله وعلى قول المتأخرين أى في وصي اليتيم أنه ليس له بيع العقار إلا في المسائل السبع الآتية وهو المفتىٰ به وعند المتقدمين له البيع مطلقاً، واختاره الاسبيجابي وصاحب المجمع وكثير كما في التحفة المرضية قوله سبع مسائل ونصه وجاز بيعه عقار صغير من أجنبي لا من نفسه بضعف قيمته أولنفقة الصغير أودين الميت أووصية مرسلة لا إنفاذ لها إلا منه أوتكون غلته لاتزيد على مؤنته أوخوف خرابه أونقصانه أو كونه في يد متغلب. (فتاوى الشامي: ٤/ ١٨٣، باب العشر والخراج، سعيد).

وللاستزادة انظر: الفتاوى الخانية على هامش الهندية: ٣/ ٥١٧۔ وشرح العناية: ١٠/ ٥٨٨۔).

حضرت حکیم الامتؒ شامی کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اس روایت سے ثابت ہوا کہ ماں کا بیع کرنا جائدادِ صغیر کو فی نفسہ جائز نہیں، بلکہ حاجت کے وقت حاکم مسلم کی طرف رجوع کیا جاوے اور حاکم مسلم کے نہ ہونے کے وقت کے متعلق جزئی نظر سے نہیں گزری لیکن چونکہ حاجت متحقق ہے اور حرج مدفوع ہے لہذا بضرورت جائز معلوم ہوتا ہے۔ (امداد الفتاوی: ۳/ ۲۵). واللّٰہ ﷻ اعلم۔

گریٹینگس کارڈ (greetings card) کی تجارت کا حکم:

سوال: عید کارڈ کی طرح سال گیرہ اور مادھرس ڈے وغیرہ میں عیسائی لوگ کارڈ استعمال کرتے ہیں جس کو گریٹینگس کارڈ سے موسوم کرتے ہیں، کیا مسلمان اس کی تجارت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جب کہ اس کارڈ میں چھوٹی تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس قسم کے کارڈ کی تجارت جائز اور درست ہے، کیونکہ اس میں تصویر مقصود نہیں ہوتی بلکہ تابع ہوتی ہے جیسا کہ موجودہ دور میں اکثر اشیاء کے لیبل پر تصویریں ہوتی ہیں، فقہاء نے اس قسم کی تجارت کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے، البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ دکان یا مکان میں تصویر والی اشیاء کو چھپا کر رکھیں تا کہ ظاہر حدیث کی خلاف ورزی سے سبک دوش ہو جائیں۔

قال في ردالمختار: لكن في الخزانة إن كانت الصورة مقدارطير يكره وإن كانت أصغر فلا. (ردالمحتار: ١/٦٤٨، سعيد).

فقہاء کے ہاں قاعدہ مشہور ہے: **" الأمور بمقاصدها "**. (الاشباه والنظائر: ١/١٠٢).

اس قاعدے کے پیش نظر چونکہ کارڈ کی تجارت مقصود ہے نہ کہ تصویر کی لہذا ناجائز نہیں ہے۔

اسی طرح فقہاء نے بیع العصیر کے بارے میں فرمایا:

وذكر قاضيخان في " فتاواه " أن بيع العصيرممن يتخذ خمراً إن قصد به التجارة فلايحرم وإن قصد به لأجل التخمير حرم. (الاشباه والنظائر: ١/١٠٢).

کفایت المفتی میں ہے:

تصویروں کا خریدنا بیچنا ناجائز ہے خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی اور بچوں کے کھیلنے کی ہوں یا کسی اور غرض کے لیے البتہ ایسی اشیاء جن میں تصویر کا بیچنا خریدنا مقصود نہ ہو جیسے دیا سلائی کے بکس کہ ان پر تصویر بنی ہوتی ہے مگر تصویر کی بیع وشراء مقصود نہیں ہوتی تو ایسی چیزوں کا خریدنا بیچنا مباح ہوسکتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/۲۳۵).

دوسری جگہ مذکور ہے:

سوال: کپڑے کے تھان کہ جس پر کارخانہ کے رجسٹر وچھاپ کا لیبل چسپا ہوتا ہے جو جاندار کی تصویر ہو یا بکس کہ جس پر تصویر جاندار ہو اور اس میں اشیائے فروخت بند ہوتی ہیں اس کا دوکان میں رکھنا تصویر رکھنے کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اس میں چونکہ تصویر کی بیع وشراء مقصود نہیں ہوتی اس لیے ضرورۃً گنجائش ہے۔(کفایت المفتی:۹/۲۴۱).

عطر ہدایہ میں ہے:

...اگر ایسی تصویریں کسی کتاب یا برتن وغیرہ پر ہیں اور ان کی وجہ سے قیمت یا رغبت میں اضافہ ہو تو مکروہ ہے۔ اگر ان کی وجہ سے رغبت نہ بھی ہو تب بھی کراہت سے خالی نہیں ہے، ہاں البتہ ان سے بچنا مشکل ہو جیسے روپیہ، کاغذ، ٹکٹ، کارڈ وغیرہ جن پر تصویریں چھپی ہوتی ہیں۔ تو چھاپنے والے تو گنہگار ہوں گے عام لوگوں کو گناہ نہیں ہوگا۔ (عطر ہدایہ ص ۱۵۳، ۱۵۴، تصاویر کے احکام).

آپ کے مسائل میں ہے:

سوال: تصویروں والے اخبارات کو گھروں میں کس طرح لانا چاہئے؟

الجواب: بعض اکابر کا معمول تو یہ تھا کہ اخبار پڑھنے سے پہلے تصویریں مٹا دیا کرتے تھے، بعض تصویروں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے، ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ اخبار پڑھ کر تصویریں بند کر کے رکھ دیں۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل:۷/۶۸).

کتاب الفتاوی میں ہے:

بدقسمتی کی بات ہے کہ آج کل ایسی چیزوں پر بھی تصویروں کا لیبل لگایا جاتا ہے، جن سے تصویر کا کوئی تعلق نہیں... لیبل کے خرچ دینے سے سامان کا صحیح ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے اور ان کو فروخت کرنے میں تصویر مقصود نہیں، بلکہ اصل شئی مقصود ہوتی ہے، اس لیے موجودہ حالات میں ان اشیاء کی خرید و فروخت درست ہوگی، البتہ مسلمان صنعت کاروں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کو ایسے اوچھے ذریعوں سے پرکشش نہ بنائیں بلکہ معیار اور صلاحیت کے ذریعہ لوگوں کے لیے توجہ کا مرکز بنائیں۔(کتاب الفتاوی:۵/۲۰۹) . واللہ ﷻ اعلم۔

ذی روح کی تصویر والے کپڑے کی تجارت کا حکم:

سوال: ذی روح کی تصویر والے کپڑے غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے تصویر و مجسمہ سازی اور ان کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا ہے لہذا مجسموں کی خرید و فروخت ناجائز ہے اسی طرح تصویر جو مقصود ہو اس کی خرید و فروخت بھی ناجائز ہے، البتہ کپڑے اور اشیاء کے لیبل وغیرہ پر جو تصویریں ہوتی ہیں عام طور پر وہ مقصود نہیں ہوتیں، اصلاً کپڑا یا وہ شئی مقصود ہوتی ہے

لہذا اس کاروبار کو ناجائز نہیں کہیں گے، مزید براں غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کرنے میں اورزیادہ خفت پیدا ہوگی، کیونکہ غیر مسلم مخاطب بالفروع نہیں ہے، ہاں بڑی تصویروں والے کپڑے جو بطورِ فیشن تصویر کو مقصود بنا کر بیچے اور پہنے جاتے ہیں ان کی خرید وفروخت سے احتراز کرنا چاہئے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصورة في البيت ونهى أن يصنع ذلک، حديث جابر رضی اللہ عنہ حديث حسن صحيح . (رواه الترمذي في باب ماجاء في الصورة: ۱/۳۰۵).

عطرِ ہدایہ میں ہے:

کسی بھی جاندار کی تصویر بنانے والے پر حدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں کتے اور تصویریں ہوں اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ (مشکوٰۃ) اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو تخلیق میں میری مشابہت اختیار کرے وہ ایک ذرہ (چیونٹی) تو پیدا کرے ایک دانہ جو کا پیدا کر کے دکھلائیں۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری ومسلم).

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں کوئی تصویر والی چیز نہیں چھوڑتے تھے۔ (بخاری ومسلم).

مسئلہ: تصویر بنانا، بنوانا، خریدنا، فروخت کرنا، قلمی ہو یا عکسی، مجسم ہو یا منقش صرف چہرہ ہو یا پوری، یہ بڑا گناہ کا کام ہے حرام ہے۔...

اگر ایسی تصویریں کسی کتاب یا برتن وغیرہ پر ہیں اور ان کی وجہ سے قیمت یا رغبت میں اضافہ ہو تو مکروہ ہے۔ اگر ان کی وجہ سے رغبت نہ بھی ہو تب بھی کراہت سے خالی نہیں ہے، ہاں البتہ ان سے بچنا مشکل ہو جیسے روپیہ، کاغذ، ٹکٹ، کارڈ وغیرہ جن پر تصویریں چھپی ہوتی ہیں۔ تو چھاپنے والے تو گنہگار رہوں گے عام لوگوں کو گناہ نہیں ہوگا۔ (عطرِ ہدایہ ص۱۵۳، ۱۵۴، تصاویر کے احکام).

بعض حضرات نے ترمذی شریف کی درج ذیل روایت سے استدلال کیا ہے:

وعن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة أنه دخل على أبي طلحة الأنصاري رضی اللہ عنہ يعوده فوجد عنده سهل بن حنيف رضی اللہ عنہ قال: فدعا أبو طلحة رضی اللہ عنہ إنساناً ينزع نمطاً تحته فقال له سهل لم تنزعه، قال: لأن فيها تصاوير وقال فيه النبي صلى الله عليه وسلم ما قد علمت، قال

سهل ﷺ: أولم يقل إلا ما كان رقماً في ثوب قال: بلى ولكنه أطيب لنفسي ، هذا حديث حسن صحيح .(رواه الترمذي: ١/٣٠٥).

قال ابن بطال: اختلف العلماء في الصور فكره ابن شهاب مانصب منها وما بسط كان رقماً أولم يكن، على حديث نافع عن القاسم عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها،وقال طائفة : إنما يكره من التصاوير ما كان في حيطان البيوت، وأما ما كان رقماً في ثوب فهو جائز على حديث زيد بن خالد عن أبي طلحة ﷺ ، وسواء كان الثوب منصوباً أومبسوطاً وبه قال القاسم . (شرح صحيح البخاری لابن بطال:٩/١٧٩، کتاب اللباس ، باب من کره القعود على الصور).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

جن رسالوں کو ذی روح کی تصویر کی وجہ سے خریدا جاتا ہے ان کا خریدنا جائز نہیں " لأن الأمور بمقاصدها" اگر مقصود مضامین صحیحہ کا پڑھنا ہے تو خریدنا درست ہے، تصاویر تابع ہیں ان کو محو کر دیا جائے ۔(فتاوی محمودیہ:٥/١٠٧،غیر مبوب) .

تصویر کے شرعی احکام میں ہے:

بیع وشراء میں اگر تصاویر خود مقصود نہ ہوں بلکہ دوسری چیزوں کے تابع ہو کر آجائیں جیسے اکثر کپڑوں میں مورتیں لگی ہوتی ہیں یا برتنوں اور دوسری مصنوعاتِ جدیدہ میں اس کا رواج عام ہے، تو اس کی خرید وفروخت تبعاً جائز ہے، **كما يستفاد من بلوغ القصد والمرام معزياً للهيثمي** (بلوغ المرام:ص ١٨) **ولما هو من القواعد المسلمة من فقه الأحناف أن كثيراً من الأفعال لايجوز قصداً ويجوز تبعاً كما صرحوا في جواز بيع الحقوق تبعاً للدار ولا إصالة وقصداً**۔

لیکن جب کہ خود تصاویر ہی کی بیع وشراء مقصود ہو تو خریدنا اور فروخت کرنا دونوں ناجائز ہیں، اور اگر تصویر مٹی کی بنی ہو تو شرعاً اس کی کچھ قیمت کسی کے ذمہ واجب نہیں ہوتی، البتہ اگر کسی دھات یا لکڑی وغیرہ کی ہو تو اتنی قیمت واجب ہوتی ہے جس قدر اس لکڑی یا دھات کی قیمت تصویر سے قطع نظر کر کے ہو سکتی ہے۔(تصویر کے شرعی احکام،ص٨٨،از مفتی محمد شفیع صاحبؒ).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاوی:٥/٢٦٥،وامداد الاحکام:٣/٣٨٤،وجواہر الفتاوی:٣/٢١٠۔٢٢٧،از مفتی محمد عبدالسلام صاحب چاٹگامیؒ،وتصویر کے شرعی احکام، رسالہ از مفتی محمد شفیع صاحبؒ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

افیون کی تجارت کا حکم:

سوال: افیون کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ افیون کی تجارت جائز ودرست ہے یہ بعینہٖ شراب کے حکم میں نہیں ہے اور اس میں منافع ہیں کہ دواوغیرہ میں استعمال ہوتی ہے، اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کا جائز استعمال ممکن ہو اس کی تجارت جائز اور درست ہے۔ ہاں جس شخص کے بارے میں غالب گمان ہو کہ وہ ناجائز طور پر استعمال کریگا تو اس کے ہاتھ بیچنا مکروہ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وصح بيع غير الخمر ومفاده صحة بيع الحشيشة والأفيون. وفي الشامية: قوله وصح بيع غير الخمر أي عنده خلافاً لهما في البيع والضمان ، لكن الفتوىٰ على قوله في البيع . (الدر المختار مع فتاوى الشامي: ٦/٤٥٤، كتاب الاشربة، سعيد).

وفي حاشية الطحطاوي على الدر: ويجوز بيعها ويضمن متلفها قيمتها عنده وقالا : لايجوز البيع ولايضمن المتلف وعن أبي يوسفؒ يجوز بيعها إذا طبخ فذهب أكثر من النصف وأقل من الثلثين والفتوىٰ على قوله في البيع. (حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ٤/٢٢٥، كوئته).

کفایت المفتی میں ہے:

افیون کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے گو قانون وقت اس کو لائسنس کے ساتھ جائز رکھتا ہے مگر شرع میں یہ قید نہیں ہے اس کی قیمت کے پیسے جائز اور حلال ہیں۔ (کفایت المفتی: ۹/۱۲۴، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

احسن الفتاوی میں ہے:

زمان سابق میں افیون تداوی میں بکثرت استعمال نہیں ہوتی تھی بلکہ عموماً تلہی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، اس لیے بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی بیع کو مکروہ تحریر فرمایا ہے، مگر آج کل افیون دواء کے طور پر کثرت سے استعمال ہونے لگی ہے اور علاج میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل کر چکی ہے، بلکہ ضرورتِ شدیدہ کی حد تک پہنچ گئی ہے، لہذا اس کی بیع بلا کراہت جائز ہے، البتہ جس شخص کے بارے میں ظن غالب ہو کہ وہ تلہی کے

طور پر استعمال کریگا اس کے ہاتھ بیچنا مکروہِ تحریمی ہے۔(احسن الفتاوی:۶/۴۹۴).

مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

بیع کے بارے میں یہ اصول ہے کہ جس شئی کا کوئی جائز استعمال ممکن ہو اس کی بیع جائز ہے چاہے وہ چیز عام طور سے ناجائز کام میں استعمال ہوتی ہو۔یعنی اب یہ مشتری کا کام ہے کہ اس کو جائز مقصد کے لیے استعمال کرے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۷).

دوسری جگہ رقمطراز ہے:

افیون نشہ آور ہے اور عام حالات میں اس کا استعمال جائز نہیں ہے،لیکن اس کی بیع جائز ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ افیون کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، یعنی دواؤں کے اندر، علاج میں، بیرونی استعمال میں، لیپ وغیرہ کرنے کے لیے اس کا استعمال ممکن ہے،لہذا اس کی بیع جائز ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۳).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاوی محمودیہ:۱۶/۱۲۳،مبوب ومرتب)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بعض مبیع اپنے لیے مخصوص کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص دوسرے سے شاپنگ مول(shopping complex)خریدے، اور بائع بوقتِ عقد یہ شرط لگادے کہ اس مول میں مجھے ایک دکان بغیر کرایہ کے ملے گی، کیا ایسی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانا مفسدِ عقد ہے،لہذا مذکورہ بالا عقد صحیح نہیں ہوا۔ہاں جواز کی صورت یہ ہے کہ پورے کمپلیکس کی بیع میں ایک مخصوص دکان کو مستثنیٰ قرار دے وہ دکان بائع کی ہوگی اور باقی دکانیں مشتری کی ہوں گی، پھر وہ دکان بائع اپنی ملکیت کے طور پر استعمال کرتا ہے،اس کا کرایہ بھی نہیں ہوگا۔ جیسے پھلوں کا ڈھیر بیچتے وقت ان میں سے دس کلو اپنے لیے مستثنیٰ کردے تو یہ جائز ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولایجوز أن یبیع ثمرة و یستثني منها أرطالاً معلومة خلافاً لمالکؒ لأن الباقي بعد الاستثناء مجهول بخلاف ما إذا باع و استثنیٰ نخلاً معیناً لأن الباقي معلوم بالمشاهدة قال: قالوا: هذه روایة الحسنؒ وهو قول الطحاويؒ، أما علی ظاهر الروایة ینبغي أن یجوز لأن الأصل أن ما یجوز إیراد العقد علیه بانفراده یجوز استثناؤه من العقد وبیع قفیز من صبرة

جائزة فكذا استثناؤه. (الهداية:۳/۲۷، كتاب البيوع).

وللاستزادة: انظر فتاوى الشامي:۴/۵۵۸، ۵۵۹، سعيد۔ والقول الراجح: ۲: ۱۰)۔

جواز کی ایک اور صورت علامہ شامیؒ نے جامع الفصولین سے نقل فرمائی ہے وہ یہ ہے:

عقد مکمل ہو جانے کے بعد بائع مشتری سے وعدہ کرلے کہ تم مجھے ایک دکان بلا کرایہ دو گے، اگر مشتری منظور کرلے گا تو پھر دکان دینا اس پر لازم ہو جائیگا، اس لیے کہ ایسا وعدہ واجب الوفا ہوتا ہے۔

وقال في شرح المجلة: فلو ألحق الشرط الفاسد بالعقد، قيل: يلتحق عند الإمام وقيل: لا، وهو الصحيح ...نقل (ابن عابدينؒ)عن جامع الفصولين أيضاً أنه لو ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكر الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة، فيجعل لازماً لحاجة الناس، ويظهر لي أنه متى وقع الشرط بعد العقد لايكون إلا على وجه العدة، وحكمه أنه يجب الوفاء به. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسي، فصل في حق البيع بشرط:۲/۶۰)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مبیع کی قیمت بڑھ جانے پر فسخ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے بوقتِ حاجتِ شدیدہ اپنا ایک مکان اپنی بہن اور بہنوئی کو دوسرے تین بھائیوں اور اپنی بیوی کی موجودگی میں دو لاکھ بیس ہزار معجّل قیمت پر بیچا، پھر البرکہ بینک کے پاس معاملہ پہنچا بینک نے کاغذات طلب کیے لیکن مکان کے کاغذات نہ ہونے کی وجہ سے پوری رقم ادا نہ ہو سکی اور البرکہ بینک نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا، تو بائع اور مشتری دونوں نے آپس میں معاملہ طے کر لیا اور مشتری نے ۵۰ ہزار رینڈ نقد ادا کر دیئے اور باقی قسطوں پر کر دیئے گئے ہر ماہ کی قسط متعین نہ تھی بلکہ مشتری کی صوابدید پر موقوف تھی، اب بائع نے اپریل ۲۰۰۸ میں قیمت لینے سے منع کیا لیکن بعد میں مشتری نے ۲۵ اپریل کو بینک کے واسطہ سے چیک بھیجا تو بائع نے وصول کر لیا اور اس کا کہنا ہے کہ قیمت بہت کم ہے مکان کی ویلیو زیادہ ہے لہذا میں اس قیمت پر راضی نہیں ہوں۔ جب کہ مشتری پانچ قسطیں ادا کر چکا ہے اور صرف ۴۰ ہزار باقی رہ گئے ہیں۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں اس مکان کا مالک کون ہے؟ کیا بائع کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں جانبین سے رضامندی کے ساتھ ایجاب وقبول ہوگیا، لہذا بیع تام ہوگئی اور مشتری مکان کا مالک بن گیا اب بائع کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور جو قیمت معجّل تھی وہ بائع نے خود اپنی رضامندی سے قسطوں پر کردی کیونکہ البرکہ بینک نے مکان کے کاغذات طلب کیے اور بائع کے پاس موجود نہ تھے لہذا پوری قیمت وصول نہ ہوسکی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جائداد مثلاً مکانات، زمین، دیگر اشیاء اور ضرورت کی چیزیں بلکہ اشیائے خوردنی میں بھی روز بروز ترقی ہوتی ہے اور کافی مہنگی ہورہی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قیمت کے بڑھنے کی وجہ سے فروخت شدہ مکان واپس طلب کرے بلکہ جو قیمت طے ہوئی ہے اسی پر عقد برقرار رہیگا یہاں تک کہ پوری قیمت ادا کردی جائے۔

(۳) نیز خرید وفروخت میں عاقدین کے عقد کے وقت بازاری قیمت کا اعتبار ہوتا ہے عقد ہوجانے کے بعد قیمت بڑھ جائے یا کم ہوجائے اس سے عقد پر کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ عاقدین آپس میں جو بھی ثمن طے کرلیں اسی کا اعتبار ہوگا اگرچہ بازاری قیمت اس سے کم ہو یا زیادہ، قسطیں بھی طے شدہ ثمن کے مطابق ہی ادا کردی جائیں گی اس میں تبدیلی نہیں ہوگی مگر مشتری اپنی طرف سے کچھ زیادہ دیدے تو اس کا احسان ہے اور یہ جائز ہے ورنہ بائع کو طے شدہ ثمن سے زیادہ وصول کرنے کا حق نہیں ہے۔

(۴) جب بائع نے قسطوں کو مشتری کی صوابدید پر چھوڑ دیا کوئی وقت متعین نہیں کیا تب بھی عقد صحیح اور درست ہے اور مشتری کو اختیار رہیگا کہ وہ ماہانہ جتنا ادا کرنا چاہے ادا کردے، لیکن کچھ نہ کچھ ادا کرنا ضروری ہوگا، ہاں پوری قیمت عقد کے وقت متعین ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں کل قیمت دولاکھ ۲۰ ہزار متعین ہے تو یہ عقد بالکل صحیح ہے۔

(۵) پانچ قسطیں وصول کرنے کے بعد صرف ۴۰ ہزار رہ گئے اب یہ کہنا کہ میں راضی نہیں ہوں، صحیح نہیں ہے اور اس سے عقد پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں، قرآن کریم میں ہے:

﴿یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم﴾. (سورة النساء، الآیة: ۲۹).

بخاری شریف میں ہے:

حدثنا أبو النعمان قال حدثنا حماد بن زيد قال حدثنا أيوب عن نافع عن ابن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما قال قال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: " البيعان بالخيار مالم يتفرقا أويقول أحدهما لصاحبه اختر وربما قال: أويكون بيع خيار. (صحیح البخاری: ۱/۲۸۳، باب من لم یوقت الخیار هل یجوز البیع، کتاب البیوع).

عمدۃ القاری میں ہے:

أی بخيار البيعين مالم يتفرقا، قال عبداللّٰه بن عمربن الخطاب ﷺ وقد مضى أن ابن عمر ﷺ كان اذا اشترى شيئاً يعجبه فارق صاحبه، وروى الترمذي من طريق ابن فضيل عن يحيى بن سعيد: وكان ابن عمر ﷺ إذا ابتاع بيعاً وهو قاعد قام ليجب له، وقد ذكرنا عن مسلم نحوه. (عمدۃ القاری: ۸/۳۸۵، کتاب البیوع، دار الحدیث، ملتان).

ترمذی شریف میں ہے:

ومعنى قول النبي صلى اللّٰه عليه وسلم إلا بيع الخيارمعناه أن يخير البائع المشتري بعد إيجاب البيع فإذا خيره فاختار البيع فليس له خيار بعد ذلك في فسخ البيع وإن لم يتفرقا هكذا فسره الشافعي وغيره. (ترمذی شریف: ۱/۱۵۰، باب ماجاء البیعان بالخیار مالم یتفرقا).

مذکورہ بالا روایت اور اس کی شرح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں رضامندی سے عقد کرلینے کے بعد کسی کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولاخيار لواحد منهما إلا من عيب أوعدم رؤية. (الهداية: ۳/۲۰، کتاب البیوع).

ہدایہ میں ہے:

ولايجوز البيع إلى قدوم الحاج وكذلك إلى الحصاد والدياس...إلى قوله بخلاف ما إذا باع مطلقاً ثم أجل الثمن إلى هذه الأوقات حيث جازلأن هذا تأجيل فى الدين وهذه الجهالة فيه متحملة. (الهداية: ۳/۶۱، باب البیع الفاسد).

شرح مجلّہ میں ہے:

وفي جامع الفصولين : الرواية المحفوظة أنه لوباع مطلقاً ثم أجل الثمن إلى حصاد ودياس لايفسد ويصح الأجل ، ووجهوه بأن التأخير بعد البيع تبرع فيقبل التأجيل إلى الوقت المجهول. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی،۲/۱۶۸، الفصل الثانی فی بیان المسائل المتعلقة بالبیع بالنسیئة و التأجیل، کوئٹہ).

فقہی مقالات میں ہے:

قسطوں پر بیع کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دیدے، لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادانہ کرے، بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کی قیمت ادا کرے، لہذا جس بیع میں مذکورہ بالاصورت پائی جائے اس کو ''بیع بالتقسیط'' کہیں گے، چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم یا زیادہ۔ (فقہی مقالات،۱/۸۲،میمن اسلامک پبلشرز).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

ادھار قیمت قسطوار بھی ہوسکتی ہے اور ایک مشت بھی، صرف اس قدر ضروری ہے کہ اجل (مدتِ ادائیگی) اور ثمن (قیمت) اس درجہ متعین ہوجائے کہ نزاع کا اندیشہ نہ رہے، آج کل بالاقساط خرید وفروخت کا رواج جس درجہ بڑھ گیا ہے، غالباً گزشتہ ادوار میں اتنا زیادہ اس کا رواج نہیں تھا، پھر بھی فقہاء کے یہاں قسطوں میں قیمت کی ادائیگی کا ذکر ملتا ہے، شامی نے ایسے ہی ایک معاملہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

" و من باع سلعة بثمن ... على أن تعطيني كل يوم درهماً و كل يوم درهمين". (منحة الخالق،۵/۲۸۰).

شامی نے اس طرح کے بعض اور معاملات کا بھی ذکر کیا ہے:

خود امام شافعیؒ (۱۵۰۔۲۰۴ھ) رقم طراز ہیں:

" و من كانت عليه دنانير منجمة أو دراهم فأراد أن يقبضها جملة فذلک له. (کتاب الام،۳/۳۳).

غرض قسط وار قیمت میں خرید وفروخت شریعت کے عام اصول وقواعد کی روشنی میں بلاشبہ جائز ہے اور بظاہر اس میں فقہاء کا اختلاف بھی نظر نہیں آتا۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۲۵۶) . واللہ ﷻ اعلم۔

خودرو گھاس فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کی زمین یا فارم ہے اس میں گھاس خود بخود اگتی ہے، دوسرے شخص کو اس کی ضرورت ہے وہ اس کو خریدنا چاہتا ہے، کیا زمین کے اندر ہوتے ہوئے خودرو گھاس کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ خودرو گھاس کی بیع جائز نہیں ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے " الناس شركاء في ثلث فى الماء والكلأ والنار "تمام لوگ تین چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں شریک ہیں پانی، گھاس اور آگ، لیکن اگر فارم کو پانی دیتا رہتا ہے یا وہ فارم گھاس ہی کے لیے مہیا کیا تھا تو پھر اس کی بیع جائز ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں بلوغ المرام میں ہے:

وعن رجل من الصحابةؓ قال: غزوت مع النبي صلى الله عليه وسلم فسمعته يقول: الناس شركاء في ثلاث: فى الكلأ والماء والنار". رواه أحمد وأبوداود ورجاله ثقات. (بلوغ المرام، ص۲۷۲، باب احياء الموات).

مجمع الانہر میں ہے:

ولا يجوز بيع المراعي... المراد بالمرعى الكلأ النابت في أرض غير مملوكة أو في أرض البائع بدون تسبب منه، قيدنا به لأنه لو تسبب في ذلك بأن سقى الأرض أوهيأها للإنبات جاز له بيع كلئها لأنه ملكه . (مجمع الانهر:۲/۵۷).

ہدایہ میں ہے:

ولايجوز بيع المراعي ولا إجارتها، والمراد الكلأ أما البيع فلأنه ورد على ما لايملكه لاشتراك الناس فيه بالحديث. (الهداية:۳/۵٤).

ہدایہ کے حاشیہ میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ (۱۲۶۴ـ۱۳۰۴ھ) فرماتے ہیں:

أما الحشيش الذي أنبته صاحب الأرض بأن سقى أرضه وكربها فأنبت الحشيش فيها لدوابه فهو أحق بذلك وليس لأحد أن ينتفع به إلا برضاه لأنه حصل بكسبه والكسب للمكتسب. (حاشية الهداية:٤/٤٨٥، رقم الحاشية : ٥).

وللاستزادة انظر: الفتاوى الهندية : ۳/۱۰۹ـ والمحيط البرهاني: ۷/۲۹۱ـ وتبيين الحقائق:

۳۷۱/٤۔ والبحر الرائق: ٦/ ١٢٧، رشيديه۔ وفتح القدير:٦/ ٥٦،دار الفكر).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (۱۳۱۴۔۱۳۹۶ھ) فرماتے ہیں:

جو گھاس آسمانی پانی سے خود بخود پیدا ہوتی ہے وہ کاٹنے سے پہلے مالک زمین کی ملک نہیں اور اس کو جائز نہیں کہ لوگوں کو اس کے کاٹنے سے منع کرے یا کسی نوکر کے ذریعہ اس کی حفاظت کرائے اور کاٹنے سے روکے اور جب اس کی ملک نہیں تو بیع بھی جائز نہیں، البتہ کاٹنے کے بعد بیع کرسکتا ہے اور یہ صورت بھی کرسکتا ہے کہ زمین ہی کو خیمہ لگانے یا اور کسی کام کے لیے اجارہ پر دیدے اور جس قدر قیمت گھاس کی یہ لینا چاہتا ہے اسی قدر بطورِ اجرت زمین کے وصول کرے، قال في الدر المختار في البيوع الفاسدة ...ثم قال وحيلته أن يستأجر الأرض لضرب فسطاطه أو لإيقاف دوابه أو لمنفعة أخرى. (امداد المفتین: جلد دوم،٦٩٠).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

جو گھاس خودرو ہو اس کو بغیر کاٹے ہوئے فروخت کرنا مثلاً اس طرح کہ گائے وغیرہ کو وہاں چھوڑ دیا جائے وہ خود ہی چرلیں اور اس کا معاوضہ لے لیا جائے، یہ معاملہ شرعاً درست نہیں۔ (فتاوی محمودیہ:١٦/ ١٠٧،مبوب ومرتب).

واللہ ﷻ اعلم۔

خیارِ وصف کا حکم:

سوال: اگر کسی نے طوطا خریدا اس شرط پر کہ یہ باتیں کرتا ہے اور وہ ایسا نہیں تھا تو کیا مشتری اس کو واپس کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر مشتری قیمت کم کرانا چاہے تو درست ہے یا نہیں؟

الجواب: مبیع میں وصفِ مرغوب فوت ہونے پر مشتری کو اختیار ہے چاہے تو پوری قیمت میں مبیع رکھلے ورنہ واپس کردے، لیکن قیمت کم کرانے کا اختیار نہیں، کیونکہ وصف کے مقابلہ میں ثمن نہیں ہوتا۔

ملاحظہ فرمائیں صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

و من باع عبداً على أنه خباز أو كاتب و كان بخلافه فالمشتري بالخيار إن شاء أخذه بجميع الثمن وإن شاء ترك لأن هذا وصف مرغوب فيه فيستحق في العقد بالشرط ثم فواته يوجب التخيير...وإذا أخذه أخذه بجميع الثمن لأن الأوصاف لايقابلها شيء من الثمن. (الهداية: ٣/ ٣٥).

شرح مجلّہ میں ہے:

إذا باع مالاً بوصف مرغوب فيه فظهر المبيع خالياً عن ذلک الوصف كان المشتري مخيراً إن شاء فسخ البيع وإن شاء أخذه بجميع الثمن المسمى ويسمى هذا الخيار خيار الوصف، مثلاً: لو باع بقرة على أنها حلوب فظهرت غير حلوب يكون المشتري مخيراً و كذا لو باع فصاً ليلاً على أنه ياقوت أحمر فظهر أصفر يخير المشتري. (شرح المجلة لمحمدخالد الاتاسي،في بيان خيار الوصف،۲/۲۵۳).

و للاستزادة انظر : (الدر المختار مع رد المحتار : ۵۸۷/٤ ، سعيد ـ و شرح العناية على هامش فتح القدير:۵۲۸/۵).

عطر ہدایہ میں ہے:

خیارِ وصف کا معنی یہ ہے کہ بائع نے مال کے جو اوصاف بیان کئے تھے وہ غلط نکلیں تو خریدار کو اختیار ہوگا چاہے تو پوری قیمت ادا کر کے خرید لے چاہے تو واپس کر دے۔ (عطر ہدایہ:۱۰۱) . واللہ ﷻ اعلم۔

شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑے کی بیع کا حکم:

سوال: شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑوں کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑوں کی بیع بلا کراہت جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ويباع دود القز أي الإبريسم وبيضه أي بزره وهو بزر الفيلق الذي فيه الدود والنحل المحرز وهو دود العسل، وهذا عند محمدؒ وبه قالت الثلاثة ، وبه يفتىٰ عيني وابن ملک وخلاصة وغيرها، قوله المحرز قال في البحر: و هو معنى ما في الذخيرة إذا كان مجموعاً لأنه حيوان منتفع به حقيقة وشرعاً فيجوز بيعه ، وإن كان لايؤكل كالبغل والحمار.

(الدر المختار مع رد المحتار:٦٨/٥،مطلب في بيع القرمز،سعيد).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

بيع النحل يجوز عند محمدؒ وعليه الفتوىٰ ، كذا في الغياثية...وبيع دود القز وهو دود الفيلق يجوز عند محمدؒ أيضاً وعليه الفتوىٰ كذا في الواقعات. (الفتاوى

الهندية:۳/ ۱۱٤،الفصل الرابع فی بیع الحیوانات) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

بائع کوکسی چیز کے خریدنے پرمجبورکرنے کاحکم:

سوال: ہم ایک کمپنی سے روشنائی خریدتے ہیں، اور ہمارے یہاں بنی ہوئی بالٹیوں پر لکھنے کے لیے ہم وہ روشنائی استعمال کرتے ہیں، ہم نے ان کوکہا کہ ہم آپ سے روشنائی خریدتے ہیں، لہذا آپ ہم سے بالٹیاں خریدیں گے، انہوں نے منظور کرلیا اور خریدنے کا وعدہ بھی کرلیا لیکن پھر بھی نہیں خریدیں، ہم نے ان کوخط لکھا کہ اگر آپ ہم سے بالٹیاں نہیں خریدیں گے تو ہم آپ سے روشنائی خریدنا موقوف کردیں گے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس طرح ان کوخریدنے پرمجبور کرنا درست ہے یانہیں؟ اور کیا یہ جائز ہے کہ ہم ان سے روشنائی خریدنا صرف اس وجہ سے موقوف کردیں کہ انہوں نے ہماری بالٹیاں نہیں خریدیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے تجارت میں عاقدین کی رضامندی کو بڑی اہمیت دی ہے، لہذا بلا رضامندی کے تجارت ومعاملات کوصحیح اور درست قرار نہیں دیا، بایں وجہ کسی کوخریدنے پرمجبور نہیں کرسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یا أیها الذین آمنوا لاتأکلوآ أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم﴾. (سورة النساء،الآیة:۲۹).

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن مباح طور پر مثلاً کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔ (معارف القرآن:۲/۳۷۷).

اگر تجارت یعنی مبادلہ اموال تو ہولیکن اس میں فریقین کی رضامندی نہ ہو وہ بھی بیع فاسد اور ناجائز ہے۔ (معارف القرآن:۲/۳۸۰).

لہذا آپ کسی کواپنی بالٹیاں خریدنے پرمجبور نہیں کرسکتے ہیں۔ اور یہ شرط لگانا کہ اگر آپ بالٹیاں نہیں خریدیں گے تو ہم آپ سے روشنائی بھی نہیں خریدیں گے یہ درست نہیں ہے۔

حدیث میں ہے:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم نهی عن بیع وشرط. (المعجم الاوسط للطبرانی:٤/ ۳۳٥،القاهرة).

شرح مجلّہ میں ہے:

وأما أن لايقتضيه العقد ولايلايمه ولاجرى العرف باشتراطه وفيه نفع لأحد العاقدين أولغيرهما من أهل الاستحقاق، فالبيع في هذه الصورة فاسد، قال في النهر: وإنما فسد البيع بهذا الشرط لأنهما إذا قصدا المقابلة بين المبيع والثمن فقدخلا الشرط عن العوض وقد وجب البيع بالشرط فكان الشرط زيادة مستحقة بعقد المعاوضة خالية عن العوض فيكون ربا، وكل عقد بشرط الربا يكون فاسداً. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی، فصل فی حق البیع بشرط: ۲/۶۰۔ وکذافی الھدایہ: ۳/۵۹).

ہاں اگرانہوں نے وعدہ کیاہواور پھر کسی وجہ سے پورانہ کرسکیں توان پرکوئی گناہ نہیں ہوگا۔اور جہاں تک روشنائی خریدنے کا مسئلہ ہےتو آپ جس سے خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں آپ پرکوئی پابندی نہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم.

ثمن مجہول ہونے پر بیع کا حکم:

سوال: آج کل ایک طریقہ جاری ہے کہ اگرکسی کے پاس زمین ہے مگراس کے پاس پیسے نہیں ہے کہ اس پرتعمیر کرسکے،حکومت کاایک ادارہ اس جیسے لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے کہ اس زمین پر مثلاً ایک بلڈنگ بنادی جس میں چند دکانیں ہیں،ان میں سے ایک دکان مالک زمین کوبطورِ ثمن دیدیتا ہےاور باقی دکانیں اپنے قبضہ میں رکھ لیتا ہے،کیایہ معاملہ جائز ہے یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ صحیح اوردرست نہیں ہے،اس لیے کہ ثمن یعنی دکان ابھی معدوم ہے اوراس میں جہالتِ فاحشہ ہے جومفضیہ الی المنازعہ ہے،کیونکہ دکان کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد مالک زمین کوپسند آئیگی یانہیں،پورے اہتمام سے تعمیر ہوگی یانہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں جھگڑا پیدا کرنے والی ہیں،اگرچہ نقشہ کے ذریعہ معلوم ہوسکتا ہے لیکن پوری تفصیل کا معلوم ہونا مشکل ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شرح مجلّہ میں ہے:

يلزم أن يكون الثمن معلوماً، أى بالإشارة إليه أو ببيان مقداره ووصفه لأن التسلم والتسليم واجب بالعقد وجهالة ما ذكر مفضية للمنازعة فيمتنع التسلم والتسليم وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز. (شرح المجلة لمحمدخالدالاتاسی،الباب الثالث،۲/۱۵۸۔وکذا فی شرح

المجلة لسليم رستم باز،۱/ ۱۲۲).

وفي حاشية الطحطاوي: وكذا لايصح البيع إذاكان الثمن مجهولاً كما إذا با ع شيئاً بقيمته. (حاشية الطحطاوى على الدرالمختار:۳/ ۱۳، كوئته).

وفي فتاوى الشامي: وخرج أيضاً ما لوكان الثمن مجهولاً كالبيع بقيمته أوبرأس ماله أوبما اشتراه أو بمثل ما اشتراه فلان، فإن علم المشتري بالقدر في المجلس جازو منه أيضاً مالو باعه بمثل مايبيع الناس إلا أن يكون شيئاً لايتفاوت ، نهر. قوله ووصف ثمن لأنه إذا كان مجهول الوصف تتحقق المنازعة فالمشتري يريد دفع الأدون والبائع يطلب الأرفع فلايحصل مقصود شرعية العقد، نهر. (فتاوى الشامى:٤/ ٥٢٩،سعيد).

ہاں اس معاملہ کے جواز کی آسان صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ثمن مؤجل کردے اور ثمن کے لیے پیسے مقرر کرلے، پھر جب دکانیں تیار ہوجائیں تو پیسے کے بدلے ایک دکان بھی دے سکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیع مؤجل میں تعجیل ثمن پر رعایت دینے کا حکم:

سوال: ایک دکان میں کپڑے کا کاروبار ہوتا ہے جس میں کپڑوں کو مؤجل فروخت کرتے ہیں لیکن اجل کی تصریح نہیں ہوتی ،مشتری کو ایک رسید دی جاتی ہے جس میں مرقوم ہوتا ہے کہ اگر آپ ایک ماہ میں ادا کردیں گے تو آپ کو اتنی رعایت اور دو ماہ میں ادا کردیں گے تو اتنی رعایت ہوگی، یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) اس معاملہ میں ثمن کے ساتھ آخری تاریخ لکھنا ضروری ہے یعنی یہ ثمن ہے اور مثلاً تین ماہ تک ادا کردے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط ، لأن جهالته تفضي إلى النزاع فالبائع يطالب في مدة قريبة، والمشتري يأباها، فيفسد البيع (بحر). (شرح المجلة لمحمدخالدالاتاسی،۲/ ۱٦۷).

(۲) درمیان میں ادائیگی کے لیے جو رعایتیں دی گئی ہیں وہ بطورِ وعدہ ہوں کہ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ وعدہ

کرتے ہیں کہ ایک ماہ کی ادائیگی پراتنی رعایت اوردوماہ کی ادائیگی پراتنی رعایت دیں گے،اور چونکہ رسید پر مشتری کے دستخط نہیں ہوتے،لہذا یہ ایک جانب سے وعدہ ہے صلح نہیں ہے۔

صلح کی تعریف یہ ہے:

" عقد يرفع النزاع ". (الدر المختار:۸/۲۱٦،سعيد).

یہاں عقد نہیں پایا گیا اس لیے کہ مشتری نے کچھ نہیں کہا اور نہ لکھا بلکہ ایک جانب سے وعدہ ہے۔

(۳) اگر اس کو صلح قرار دیں تو مؤجل سے معجّل کے ساتھ صلح کرنا اور دین میں کمی کرنے کو شرح کافی للاسبیجابی میں جائز لکھا ہے۔

وذكر في شرح الكافي للاسبيجابي: جواز هذا الصلح مطلقاً على قياس قول أبي يوسفؒ لأنه إحسان من المديون في القضاء بالتعجيل وإحسان من صاحب الدين في الاقتضاء بحط بعض حقه. (تكملة ردالمحتار،لمحمدعلاء الدين الشامي،۸/۲٥۳،فصل في دعوى الدين).

یعنی شرح الکافی میں اس صلح کو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق جائز کہا ہے کیونکہ مدیون نے جلدی دینے کا احسان کیا اور دائن نے وصولی میں اپنا بعض حق معاف کر کے احسان کیا۔

شرح عقود رسم المفتی میں مذکور ہے کہ قضا والے معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہونا چاہئے، کیونکہ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے معاملات کا تجربہ رکھتے تھے۔(شرح عقود رسم المفتی،ص۲۹).

نیز دین ادا کرتے اور وصول کرتے وقت احسان کرنے کی فضیلت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے، ملاحظہ ہو،مشکوٰۃ شریف میں ہے:...**قال: وخياركم من إذا كان عليه الدين أحسن القضاء وإن كان له أجمل في الطلب.** (مشكوٰة شريف:۲/٤۳۷،باب الامربالمعروف) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

لے بائے (lay buy) کا حکم:

سوال: موجودہ دور میں مروجہ بیوعات میں سے ایک مشہور بیع "لے بائے" ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً مشتری کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے جس کی قیمت ۵۰۰ رینڈ ہے لیکن فی الحال مشتری کے پاس ۵۰۰ رینڈ نہیں ہیں،تو مشتری صرف ۱۰۰ رینڈ ادا کرتا ہے اور ۴۰۰ رینڈ قسطوار طے ہوتے ہیں،یا جب اس کے پاس ۴۰۰ رینڈ ہوں تو ادا کر کے اپنی چیز وصول کرلے،فی الحال مبیع بائع کے قبضہ میں رہیگی،اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسا

عقد جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ثمن کی وصولیابی کے لیے مبیع روکنا بیع بالتقسیط میں جائز نہیں ہے، اس لیے کہ بیع بالتقسیط بیع موَجل ہے اور بائع کو ثمن کے استیفاء کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے، ادھار میں یہ حق بائع کو نہیں ملتا۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح .أى والتأجيل لازم ، فليس للبائع حبس المبيع حتى يقبضه ولا المطالبة به قبل حلول الأجل ...وفيه (البحر) عن المحيط : وإذا رضي البائع بالتأجيل فقد أسقط حقه في حبس المبيع فلوحل الأجل قبل قبضه فللمشتري قبضه قبل نقد الثمن . (شرح المجلة لمحمدخالد الاتاسی،۲/۱۶۶).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

قال أصحابنا للبائع حق يحبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان حالاً ، كذا فى المحيط، وإن كان مؤجلاً فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده كذا فى المبسوط، ولو كان بعض الثمن حالاً وبعضه مؤجلاً فله حبسه حتى يستوفى الحال ولوبقي من الثمن شيء قليل(فى البيع المعجل) كان له حبس جميع المبيع كذا فى الذخيرة. (الفتاوى الهندية:۳/۱۵،الباب الرابع،كتاب البيوع).

ہاں ثمن کے عوض میں مبیع کو روکنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مشتری پہلے مبیع پر قبضہ کرلے پھر بطورِ رہن بائع کے پاس رکھدے، اکثر فقہاء کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، چنانچہ امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

ومن اشترى ثوباً بدرهم ، فقال للبائع : أمسك هذا الثوب حتى أعطيك الثمن فالثوب رهن. (الجامع الصغير، كتاب الرهن ،ص ۴۸۸ ـو كذافى الفتاوى البزازية على هامش الهندية:۶/۵۵).

کفایہ شرح الہدایہ میں ہے:

قال: لأن الثوب لما اشتراه وقبضه كان هو وسائر الأعيان المملوكة سواء في صحة الرهن. (الكفاية على هامش فتح القدير:۹/۹۹،رشيدية).

درمختار میں ہے:

ولو كان ذلك الشيء الذي قال له المشتري: أمسك هو المبيع الذي اشتراه بعينه لو بعد قبضه ، لأنه حينئذٍ يصلح أن يكون رهناً بثمنه ولو قبله لايكون رهناً ، لأنه محبوس بالثمن، وقال في رد المحتار: قوله لأنه حينئذٍ يصلح ، أی لتعين ملكه فيه حتی لوهلك يهلك على المشتري ولاينفسخ العقد. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/٤٩٧،كتاب الرهن).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مسائل:۴/۲۶۵۔۲۶۸۔وفقہی مقالات:۱/۸۸۔۹۰).

واللہ ﷻ اعلم۔

غررفعلی کا حکم:

سوال: اگرکسی نے بکری بیچ دی پھر مشتری نے کہا کہ تم نے اس کے تھنوں میں دودھ روکا تھا جس سے مجھے دھوکہ ہوا، بائع نے اقرار کیا کہ میں نے ایسا کیا تھا تو قاضی اس کو واپس کرے گا یا نہیں؟ نیز غرر کی کیا تحقیق ہے اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اگر معاملات میں غرر پایا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ تصریہ غرر فعلی ہے اور غرر فعلی میں صرف دیانۃً واپس کرسکتا ہے، قضاءً واپس نہیں کرسکتا اگر چہ بائع نے اقرار کیا ہو تب بھی قاضی واپس نہیں کریگا، بلکہ مفتی فتویٰ کی رو سے دیانۃً واپس کرسکتا ہے، ہاں اگر زبانی کہا ہو کہ دو لٹر دودھ دیتی ہے، حالانکہ دھوکہ تھا تو پھر قضاءً بھی واپس ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

والحاصل كما فی الحقائق أنه إذا اشتراها فحلبها فوجدها قليلة اللبن ليس له أن يردها عندنا. (ردالمحتار:٥/٤٤،مطلب فی مسألة المصراة، سعيد).

مبسوط میں ہے:

وأما إذا اشتراها بغير شرط خيار فليس له أن يردها بسبب التحفيل عندنا... والتصرية ليست بعيب عندنا. (المبسوط للامام السرخسیؒ:١٣/٣٨، باب الخيار فی البيع).

تكملة فتح الملهم میں ہے:

وخالفهم أبوحنيفةؒ ومحمدؒ فقالا: التصرية ليست بعيب عندنا حتى يجوز الرد، وإنما يجوز للمشتري أن يرجع بنقصان قيمة المبيع ، ولاخيار له فی الرد. (تكملة فتح

الملهم:۱/ ۳٤۰).

فیض الباری میں ہے:

والجواب عندي أن الحديث محمول على الديانة دون القضاء لما في فتح القدير- في باب الإقالة أن الغرر، إما قولي أوفعلي ، فإن كان الغرر قولياً ، فالإقالة واجبة بحكم القاضي، وإن كان الثاني تجب عليه الإقالة ديانة ، ولايدخل في القضاء كيف! وأن الخدعات أشياء مستورة ، ليس إلى علمها سبيل ، فلا يمكن أن تدخل تحت القضاء فالتصرية أيضاً خديعة ، ويجب فيها على البايع أن يقيل المشتري ديانة وإن لم يجب قضاءً وحينئذٍ فالحديث متأت على مسائلنا أيضاً ولم أر أحداً منهم كتب أنه موافق لنا، وادعيت من عند نفسي أن الحديث لايخالف مسائلنا أصلاً ، لأن التصرية غرر فعلي وفيه الرد ديانة على نص فتح القدير. (فيض الباري:۳/ ۲۳۱،كتاب البيوع).

فالحاصل : أنه لوباع المصراة ولم يرض بها المشترى يردها ويرد معها صاعاً من تمر عندالائمة الثلاثة خلافاً للاحناف والاحناف يقولون ان شاء المشترى ردهامع صاع من تمر فلوردهايجب على البائع قبولها ديانةً وإن لم يجب قضاءً لأن هذا لايدخل في دائرة القضاء غالباً إذ للبائع ان يقول كانت عندي كثيرة اللبن وصارت عندک قليلة اللبن لأجل تبدل المكان أولأجل ترک المراقبة نعم يجب عليه أن يقبلها فيمابينه وبين الله تعالىٰ وإن شاء المشترى أخذ النقصان.

غرر کی تحقیق اوراس کا حکم:

علماء نے غرر کی مختلف تعریفات بیان کی ہے۔جن میں سے چند حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: **الغرر ما يكون مستور العاقبة.** (المبسوط:۱۲/ ۱۹٤،ادارة القرآن).

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

الغرر وهو في الأصل الخطر، والخطرهو الذي لايدرى أيكون أم لا، وقال ابن عرفة: الغرر هو ما كان ظاهره يغر وباطنه مجهول، قال والغرور ما رأيت له ظاهراً تحبه وباطنه مكروه أومجهول ، وقال الأزهري: بيع الغرر ما يكون على غيرعهدة ولاثقة، وقال صاحب

المشارق: بيع الغرر بيع المخاطرة، وهو الجهل بالثمن أو المثمن أو سلامته أو أجله. (عمدة القاری:۸/۴۳۵،ملتان).

وقال في إكمال المعلم: فأما الغرر فما تردد بين السلامة و العطب أو ما في معنى ذلك، و ذلك أنه يلحق بمعنى إضاعة المال، لأنه قد لايحصل المبيع ويكون بذل ماله باطلاً. (اكمال المعلم:۵/۱۳۳، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذى فيه الغرر).

وقال ابن العربي في القبس: فأما الغرر فهو كل أمر خفيت علانيته و انطوى أمره. (القبس:۲/۷۹۲).

وقال ملك العلماء: الغرر هو الخطر الذي استوى فيه طرف الوجود و العدم بمنزلة الشك. (بدائع الصنائع:۵/۱۶۳،سعيد).

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ غرر ایسی غیر یقینی حالت کا نام ہے جس میں وجود وعدم برابر ہوں، شک کے درجہ میں ہو۔

غرر کی ممانعت میں بکثرت نصوص وارد ہوئی ہیں:

قال العلامة العينيؒ: وقد وردت أحاديث كثيرة في النهي عن بيع الغرر: منها: رواه مسلم في صحيحه من حديث أبي هريرةؓ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة، وعن بيع الغرر، وأخرجه الأربعة أيضاً، ومنها: حديث ابن عمرؓ رواه البيهقي من حديث نافع عنه، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه و سلم عن بيع الغرر. ومنها حديث ابن عباسؓ أخرجه ابن ماجة من حديث عطاء عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر، ومنها حديث أبي سعيد أخرجه ابن ماجة أيضاً من حديث شهر بن حوشب عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شراء ما في بطون الأنعام حتى تضع، وعما في ضروعها إلا بكيل، وعن شراء العبد وهو آبق وعن شراء المغانم حتى تقسم وعن شراء الصدقات حتى تقبض، وعن ضربة القانص. ومنها حديث عليؓ أخرجه أبو داود وفيه: قد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع المضطر وبيع الغرر...ومنها: حديث ابن مسعودؓ أخرجه أحمد عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

لاتشتروا السمک فی الماء فإنه غرر ومنها: حديث عمران بن الحصين ﷺ أخرجه ابن أبي عاصم في كتاب البيوع: أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع ما في ضروع الماشية قبل أن تحلب وعن بيع الجنين في بطون الأنعام، وعن بيع السمک فی الماء وعن المضامين والملاقيح وحبل الحبلة وعن بيع الغرر. (عمدة القاري: ٤٣٦/٨،باب بيع الغرر).

تمام نصوص بالا کا خلاصہ اور ماحصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید وفروخت کے ایسے معاملات سے منع فرمایا ہے جس میں غرر ہو، اسلام سے پہلے بہت سے معاملات مروج تھے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر ہی کی بنا پر منع فرمایا تھا، جیسے: " **بيع حبل الحبله، بيع المضامين، بيع الملاقيح، بيع الملامسه، بيع المنابذه، بيع الحصاة، بيع عسب الفحل،بيع الثمرقبل بدو صلاحه، بيع السمک فی الماء الكثير، بيع الطيرفی الهواء، بيع اللبن فی الضرع، بيع ضربة الغائص وغيرها من البياعات التي تتضمن الغرر الفاحش المؤدي إلى النزاع المشكل بين العاقدين.**

عام طور پر غرر وجہالت پیدا ہونے کے چند اسباب ہیں۔

(۱) مبیع کا وجود ہی یقینی نہ ہو۔ جیسے بھاگا ہوا غلام۔

(۲) مبیع کا وجود معلوم ہو لیکن حصول غیر یقینی ہو، جیسے فضاء میں پرندہ۔ مچھلی پانی میں۔

(۳) مبیع کی جنس ہی معلوم نہ ہو۔

(۴) جنس تو معلوم ہے لیکن سامان کی نوع معلوم نہیں ہے۔

(۵) مقدار معلوم ومتعین نہ ہو۔

(۶) بقاء یقینی نہ ہو، جیسے ظاہر ہونے سے پہلے پھل کی بیع۔

(۷) اجل مجہول ہو۔

غرر کی اقسام:

غرر کی دو قسمیں ہیں (۱) غررِ کثیر، فاحش (۲) غررِ یسیر، قلیل، حقیر۔

غرر کا حکم:

فقہاء اور محدثین کی عبارات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر غرر مفسد ومبطل بیع نہیں ہے، بلکہ غرر کثیر ممنوع اور مفسد ہے، اور غررِ یسیر معاف ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حضرت شیخ اوجز المسالک میں نقل فرماتے ہیں:

وقال الباجي: هو ماكثر فيه الغرر، وغلب عليه حتى صار البيع يوصف ببيع الغرر، فهذا الذي لاخلاف في المنع منه، وأما يسير الغرر، فإنه لايؤثر في فساد عقد بيع فإنه لايكاد يخلو عقد منه. (اوجزالمسالك ،باب بيع الغرر،١٣/ ٨٨،دمشق).

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وروى الطبري عن ابن سيرين بإسناد صحيح، قال: لا أعلم ببيع الغرر بأساً، وقال ابن بطال: لعله لم يبلغه النهي، وإلا فكل مايمكن أن يوجد وأن لايوجد لم يصح وكذلك إذا كان لايصح غالباً، فإن كان يصح غالباً كالثمرة في أول بدو صلاحها أوكان يسيراً تبعاً كالحمل مع الحامل جاز لقلة الغرر، ولعل هذا هو الذي أراد ابن سيرينؒ. (عمدة القارى،باب بيع الغرروحبل الحبلة:٨/ ٤٣٨ ،ملتان).

جمہرۃ القواعد الفقہیۃ میں ہے:

وهذا النهي الوارد منصب على الغرر الكثير الفاحش إذ اليسير منه معفو عنه باتفاق العلماء، إذ هو من قبيل مالايستطاع الاحتراز منه في المعاملات، فهناك نصوص فقهية كثيرة تطرقت إلى هذا المفهوم. (جمهرة القواعدالفقهية:١/ ٣٠٩).

زادالمعاد میں ہے:

...ليس كل غرر سبباً للتحريم، والغرر إذاكان يسيراً أولايمكن الاحتراز منه لم يكن مانعاً من صحة العقد.(زادالمعاد: ٥/ ٨٢٠، بيع المغيبات).

الموافقات میں امام شاطبی فرماتے ہیں:

أصل البيع ضروري، ومنع الغرر والجهالة مكمل، فلواشترط نفي الغرر جملة لانحسم باب البيع. (الموفقات:٢/ ٧،كتاب المقاصد، المسألة الثالثة،دارالفكر).

وقال الإمام النوويؒ في شرح مسلم: أجمع المسلمون على جواز أشياء فيها غرر حقير. (شرح مسلم :٢/ ٢،كتاب البيوع)

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

فأما الغرر بمعنى جهالة المبيع فربما يحتمل إذا كان يسيراً دعت الحاجة إليه، ولم يكن مفضياً إلى المنازعة في العرف،...قال العبد الضعيف عفا الله عنه : ويخرج على هذا كثير من المسائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة أنهم يضعون أنواعاً من الأطعمة في قدور كبيرة، ويخيرون المشتري في أكل ماشاء بقدر ماشاء ، ويأخذون ثمناً واحداً معيناً من كل أحد، فالقياس أن لا يجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها، ولكنه يجوز لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع ، وقد جرى بها العرف والتعامل...(تكملة فتح الملهم:۱/۳۲۰۔وكذا في جمهرة القواعد الفقهية:۱/۳۲۰).

اکمال المعلم میں ہے:

ولما رأيناهم أجمعوا على جواز المسائل التي عددناها، قلنا:ليس ذلک إلا لأن الغرر فيها نزر يسيرغير مقصود، وتدعو الضرورة إلى العفو عنه. (اكمال المعلم شرح صحيح مسلم للقاضي عياض، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذى فيه غرر،۵/۱۳۴،دارالوفاء).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

غرر کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے فقہاء نے غرر کے بھی درجات مقرر کیے ہیں،غرر کثیر معاملہ کے درست ہونے میں مانع ہے اور یسیر غرر مانع نہیں ہے۔(جدید فقہی مسائل:۴/۲۰۹)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:مالی معاملات پر غرر کے اثرات از ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب،ط:ادارۃ المعارف کراچی۔وغرر کی صورتیں،منہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

متعین وزن والی اشیاء کو بلا وزن فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر مشتری ثانی مشتری اول سے ۱۰ کلو چاول خرید لے تو فقہاء کے قول کی روشنی میں دو مرتبہ اس کو تولنا ضروری ہے، مشتری اول اس کو اپنے لیے تولے پھر جب مشتری ثانی کے ہاتھ فروخت کرے تو مشتری ثانی دوبارہ تولے، ہاں اگر مشتری اول نے مشتری ثانی کو فروخت کرنے کے بعد مشتری ثانی کی موجودگی میں اپنے لیے تولا ہے تو یہ ایک تول کافی ہے، سوال یہ ہے کہ ہم دکانوں سے وزنی اشیاء کے بند ڈبے یا پیکٹ خریدتے ہیں، ان کو نہ مشتری اول (دکاندار) تولتا ہے اور نہ مشتری ثانی تولتا ہے تو کیا لاکھوں آدمیوں کی خرید و فروخت

ناجائز ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ متعین وزن والی اشیاء جن کا وزن متعین ومعلوم ہے ان میں دوبارہ وزن کی ضرورت نہیں ہے، بلاوزن فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ کیونکہ ہر ظرف اصطلاحی وزن کا آلہ ہے۔

نیز متعین وزن والی اشیاء عددِ متقاربہ کے درجہ میں آگئی ہیں، اور وزن کے بارے میں دھوکہ کا امکان بہت کم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ فی زمانہ ناپ تول مشینی آلات کے ذریعہ فیکٹریوں میں ہوتا ہے اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی، اور موجودہ دور میں مشینی آلات پر لوگوں کا اعتماد بھی بہت زیادہ ہے، لہذا کسی وجہ سے بھی معاملہ مشکوک نہیں ہوتا۔

اصل اس مسئلہ کی بنیاد ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الطعام حتى يجري فيه الصاعان صاع البائع وصاع المشتري. (رواه ابن ماجة:١/١٦١).

صاحبِ ہدایہ نے حدیث شریف میں ممانعت کی علت یہ بیان فرمائی ہے کہ زیادتی کا احتمال ہے اور زیادتی بائع کی ہے اور غیر کے مال میں تصرف کرنا حرام ہے۔

قال في الهداية: ولأنه يحتمل أن يزيد على المشروط وذلك للبائع والتصرف في مال الغير حرام فيجب التحرز عنه. (الهداية:٣/٧٥، باب المرابحة والتولية).

جیسا کہ بیہقی سنن کبریٰ کی روایت میں مذکور ہے:

"فيكون للبائع الزيادة وعليه النقصان". (السنن الكبرى:٥/٣١٦، دار المعرفة، بيروت).

لیکن فی زمانہ یہ احتمال مشکل ہے اس لیے کہ عام طور پر لکھے ہوئے وزن سے کم یا زیادہ نہیں ہوتا، بعض شراح نے فرمایا کہ کیل و وزن کے اعادہ کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ مبیع مجہول نہ رہے۔

قال في الكفاية: وإنما شرط ذلك لأن المبيع يتناول مايحويه الكيل أو الوزن وهو مجهول فربما يزيد وينقص فما لم يكل لنفسه أولم يزن لايمتاز المبيع عن غيره فكان المبيع مجهولاً. (الكفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٦/١٤١، رشيدية).

وفي شرح العناية: ومعناه أن المانع من التصرف هو احتمال الزيادة...وأنه معلول باحتمال الزيادة على المشروط وذلك بما يتصور إذا بيع مكايلة فلم يتناول ماعداه...وفيه

ذكر جريان الصاعين وليس ذلك إلا لتعيين المقدار وتعيين المقدار إنما يحتاج إليه عند توهم زيادة أو نقصان فكان في النص مايدل على أنه معلول بذلك. (شرح العناية على هامش فتح القدير:٦/٥١٦،٥١٧، دار الفكر).

وفي فتح القدير: قال عامتهم كفاه ذلك حتى يحل للمشترى التصرف فيه قبل كيله ووزنه إذا قبضه، وعند البعض لابد من الكيل أو الوزن مرتين احتجاجاً بظاهر الحديث، والصحيح قول العامة لأن الغرض من الكيل والوزن صيرورة المبيع معلوماً وقد حصل بذلك الكيل واتصل به القبض، ومحمل ظاهر الحديث إذا وجد عقدان بشرط الكيل بأن يشترى المسلم إليه من رجل كراً لأجل رب السلم وأمر رب السلم بقبضه اقتضاء عن سلمه فإن في ذلك يشترط صاعان: صاع للمسلم إليه، وصاع لرب السلم فيكيله للمسلم إليه، ثم يكيله لنفسه. (فتح القدير:٦/٥١٧،دار الفكر).

اعلاء السنن میں ہے:

نقول إن البائع إذا كال الطعام بعد البيع بحضرة المشتري يكون ذلك الصاع هو صاع المشتري... فعندنا قوله "حتى يجري فيه الصاعان" أعم من أن يكون جريان الصاعين حقيقة أو حكماً ويرشد إليه قوله: ... "فيكون لصاحبه الزيادة وعليه النقصان" لأنه يدل أن العلة في النهي... إنما هو امتياز حق البائع عن حق المشتري. (اعلاء السنن:١٤/٢٣٩).

مذکورہ بالاتمام عباراتِ فقہیہ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں اصل ممانعت کی علت مبیع کا مجہول ہونا اور غیر کے حق کے ساتھ مختلط ہونا ہے، جب کہ موجودہ زمانہ میں متعین وزن مبیع کے اوپر لکھ دیا جاتا ہے جو کہ بعد والوں کے لیے حکمی وزن کا درجہ رکھتا ہے جس کی وجہ سے جہالتِ مبیع کا کوئی شبہ نہیں، اور حدیث کا منشاو مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

باقی رہا ظاہر حدیث پر عمل کرنے والوں کے لیے جواب وہ یہ ہے کہ اصل بیع میں یہ ہے کہ مبیع مجہول نہ ہو لیکن مشتری کی موجودگی میں کیل بائع سے جہالت رفع ہوگئی اور اس کو علم ہوگیا، باقی حدیث کا محمل کتاب السلم میں آئے گا۔ (درس الہدایۃ:۲۵۲)۔

تبیین الحقائق کے حاشیہ میں ہے:

قال الاتقاني :وصورة المسئلة فی الجامع الصغیرمحمد عن یعقوب عن أبي حنیفةؒ قال إذا اشتریت شیئاً مما یکال أویوزن أویعد فاشتریت مایکال کیلاً أومایوزن وزناً أومایعدعداً فلاتبعه حتی تکیله أوتزنه أوتعده فإن بعته قبل أن تفعل وقد قبضته فالبیع فاسد...وإن کاله أووزنه بعد العقد بحضرة المشتري مرة فیه اختلاف المشایخ قال عامتهم کفاه ذلک حتی یحل للمشتری التصرف فیه قبل الکیل و الوزن ثانیاً...والصحیح قول العامة لأن الغرض من الکیل أوالوزن إعلام المبیع وإفرازه وذلک یحصل بالواحد فلاحاجة إلی الإعادة قالوا: الحدیث ورد فیما إذا وجد عقدان بشرط الکیل . (حاشية الشيخ الشلبي على تبيين الحقائق:٤/٨١، امدادية ملتان).

علامہ رافعی فرماتے ہیں:

ثم لما کانت الدراهم والدنانیر لازیادة فیها عن مقدارها المعلوم بین الناس جوزوا التصرف فیهابعد القبض قبل الوزن لعدم احتمال الزیادة في وزنها المانع من التصرف في غیرها . (تقريرات الرافعي على هامش الفتاوى الشامي:٥/١٥٨، سعيد).

معلوم ہوا کہ لوگوں کے عرف میں وزن معلوم ومتعین ہوتو پھر وزن کیے بغیر اس میں تصرف کرنے کی گنجائش ہے جیسے دراہم ودنانیر اس زمانہ میں لوگوں کے درمیان معروف ومتعین مقدار والے تھے اس لیے وزن کی شرط نہیں لگائی۔ فی زمانہ کمپنی کی پیکینگ لوگوں کے درمیان معروف ومشہور ہے اس وجہ سے وزن کی شرط کو ترک کر دیا گیا۔

اشکال اور جواب:

اشکال: بعض فقہاء نے فرمایا کہ اعادۂ وزن وکیل تمام قبضہ میں سے ہے اس لیے ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو، اعلاء السنن میں ہے:

والدلیل علی أن الکیل والوزن ...من تمام القبض أن القدرفی المکیل والموزون معقود علیه...ولایعرف القدرفیهما إلا بالکیل أوالوزن . (اعلاء السنن: ١٤/٢٤٣).

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ لکھے ہوئے وزن سے مقدار معلوم ہو جاتی ہے جس سے تمام قبضہ حاصل

ہو جاتا ہے۔اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

البتہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں تکملہ فتح الملہم میں مذکور ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ابن ماجہ کی روایت کو استحباب پر محمول کیا ہے۔(تکملہ فتح الملہم:۱/۳۵۹).

چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک نہ ایک صفقہ میں تعدد کیل ضروری ہے اور نہ دو صفقوں میں۔ملاحظہ ہو فیض الباری میں فرماتے ہیں:

لو اعتبرنا مثل هذه الاحتمالات لزم أن لايجوز التصرف فيما إذا كان بحضرته أيضاً فإن الاحتمال لاينقطع...فالذي تبين أن المشتري إن اعتمد على كيل البائع جازله أكله بدون إعادة الكيل سواء كان بحضرته أوبغيبته...إذاكان هناك ثالث يشاهد الكيل (يعني كيل البائع الأول) فاشتراه كفاه عن إعادة الكيل عندي لأن المطلوب كون المبيع معلوماً وقد حصل نعم إن كاله يستحب له ذلك فلاحاجة إلى تعدد الكيل في الصفقتين أيضاً .

(فيض الباري:۳/ ۲۲۰).

پس حضرت شاہ صاحبؒ کا قول لیا جائے تب تو بظاہر ہمارے زمانے کے معاملات میں کوئی خلجان ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ کمپنی کے وزن پر تمام لوگوں کا اعتماد ہوتا ہے،اور حضرت شاہ صاحب کے نزدیک مشتری کا وزن کے وقت حاضر ہونا بھی ضروری نہیں ہے نیز حضرت کے نزدیک تعدد صفقہ میں بھی جب مبیع معلوم ہو وزن وکیل ضروری نہیں،اور اس قول کی تائید صاحب عنایہ علامہ اکمل الدین بابرتی کی درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

قال: وإذا نظرنا إلى التعليل وهو قوله ولأنه يحتمل أن يزيد على المشروط وذلك للبائع يقتضي أن يكتفى بالكيل الواحد في أول المسألة أيضاً كما ذكرنا ولوثبت أن وجوب الكيلين عزيمة والاكتفاء بالكيل الواحدرخصة أوقياس أواستحسان لكان ذلك مدفعاً جارياً على القوانين لكن لم أظفر بذلك .(شرح العناية:٦/٥١٨).

اور حضرت عطاء بن رباحؒ کا بھی یہی قول تھا کہ اعادۂ کیل کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔اعلاء السنن میں ہے:

وقال عطاء يجوز بيعه بالكيل الأول مطلقاً .(اعلاء السنن:١٤/٢٣٨، ادارة القرآن).

نیز ان تمام تشریحات کا مدار اس پر ہے کہ جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ موجودہ دور میں معاملات وزن وکیل کی شرط کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں،حالانکہ یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے۔

وفسر إمام الحرمين البيع مكايلة بأن يقول بعتك هذه الصبرة كل صاع بدرهم... ومنها أن يقول بعتكها على أنها عشرة آصع ومنها أن يقول بعتك عشرة آصع. (اعلاء السنن:۱٤/۲٤٥).

لیکن آج کل مقدار کی شرط کے ساتھ معاملات وقوع پذیر نہیں ہوتے، بلکہ جو مبیع پر لکھا ہوا وزن ہے وہ صفت کا درجہ رکھتا ہے " **كالذرع في الثوب**". **وقال في الهداية: وبخلاف ما إذا باع مزارعة لأن الزيادة له إذ الزرع وصف في الثوب.** (الهداية:۳/۷٥).

قال في العناية: ولواشترى المعدود عداً فهو كالمذروع فيما يروى عن أبي يوسفؒ ومحمدؒ وهو رواية عن أبي حنيفةؒ لأنه ليس بمال الربا، ولهذا جاز بيع الواحد بالاثنين فكان كالمذروع، وحكمه أنه لايحتاج إلى إعادة الذرع إذا باع مذارعة. (شرح العناية:٦/٥١٨).

الغرض فی زمانہ عموم بلویٰ اور ضرورت کی بنا پر اس روایت پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

احسن الفتاوی میں ہے:

بائع ومشتری دونوں کا مقصود وہ خاص ڈبہ اور لفافہ ہوتا ہے اس پر لکھا ہوا وزن بیع میں مشروط نہیں ہوتا، اس لیے بدون وزن کیے اس میں تصرف جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ:٦/٤٩٩).

مولانا فتح محمد صاحب لکھنویؒ نے عطر ہدایہ میں لکھا ہے:

ایسے برتن یا بوریاں (ڈبے) جن کا وزن متعین اور معلوم ہے ان میں دوبارہ وزن کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر ظرف (برتن) اصطلاحی کیل ہے۔

یعنی ہزار من گندم کو دولاکھ روپے میں خریدا اور فی بوری دومن گندم ہے تو پانچ سو بوریاں گن لینا کافی ہے یوں سمجھا جائیگا کہ فی بوری کی قیمت ٤۰۰ روپے ہے۔ (عطر ہدایہ:۱۷۹).

نیز فی زمانہ اکثر خرید وفروخت بالتعاطی ہوتی ہے، ایجاب وقبول کا نام ونشان نہیں ہوتا۔

درمختار میں ہے:

(غير الدراهم والدنانير) لجواز التصرف فيهما بعد القبض قبل الوزن كبيع التعاطي فإنه لايحتاج في الموزونات إلى وزن المشتري ثانياً لأنه صار بيعاً بالقبض بعد الوزن، قنية. وقال ابن عابدينؒ: عبارة البحر وهذا كله في غير بيع التعاطي... وظاهر قوله وهذا كله أنه

لایتقید بالموزونات بل التعاطی فی المکیلات والمعدودات کذلک. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۵/ ۱۵۰).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ایک دودھ والے سے ہمیشہ دودھ متعین مقدار میں لیا جاتا ہے ...مگر ہمارے روبرو وزن نہیں کرتا بلکہ وزن کر کے لاتا ہے اور ہمارے برتن میں ڈال جاتا ہے ہمیں اس کے وزن پر اعتماد ہے ...دوسرا سوال: آج کل شہری لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ دکاندار کو فون پر کہد یا کہ فلاں فلاں اشیاء اتنی اتنی مقدار میں تول کر رکھو پھر کسی ذریعہ سے وہ تلی ہوئی اشیاء منگواتے ہیں...؟

الجواب: ان دونوں صورتوں میں بیع بالتعاطی ہے اس لیے خریدار پر دوبارہ وزن کرنا ضروری نہیں...

(احسن الفتاویٰ:۶/ ۴۹۸).

خلاصہ یہ ہے کہ متعین وزن والی اشیاء کو بلاوزن فروخت کرنا درج ذیل وجوہات کی بنا پر جائز اور درست ہے:

☆ مشینی آلات سے ناپ تول ہونے کی وجہ سے جہالت اور کمی بیشی کا امکان بہت کم ہے۔

☆ موجودہ دور میں اکثر معاملات بلاشرطِ وزن وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

☆ بیع تعاطی کی وجہ سے گنجائش ہے۔

☆ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اعادۂ وزن فقط مستحب ہے۔

☆ ہر پیکٹ وظرف اصطلاحی وزن کا آلہ ہے۔

☆ متعین وزن والی اشیاء تقریباً عددِ متقارب کے درجہ میں آ گئی ہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیع بالتعاطی میں اعادۂ وزن کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک دکان سے تین کیلو آٹا دو سو روپے میں خریدا، دکاندار سے کہا تم تول کر گھر بھیج دو اس نے بھیج دیا مشتری یا اس کے وکیل کے سامنے نہیں تولا تو بظاہر فقہاء کے ہاں یہ ناجائز ہے، لیکن اس کا عام رواج ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ومن اشتری مکیلاً مکایلة أوموزوناً موازنة فاکتاله أواتزنه ثم باعه مکایلة أوموازنة لم یجزللمشتری منه أن یبیعه ولا أن یأکله حتی یعید الکیل والوزن.

(الهداية:٣/٧٥).

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیع بالتعاطی ہونے کی وجہ سے جائز اور درست ہے، اعادۂ وزن کی ضرورت نہیں ہے، نیز محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں فرمایا کہ عام فقہاء کے نزدیک بائع کا وزن کافی ہے مشتری کے لیے اعادۂ وزن کی ضرورت نہیں ہے۔

فتح القدیر میں ہے:

قال عامتهم كفاه ذلك حتى يحل للمشترى التصرف فيه قبل كيله ووزنه إذا قبضه ... والصحيح قول العامة لأن الغرض من الكيل والوزن صيرورة المبيع معلوماً وقد حصل بذلك الكيل واتصل به القبض. (فتح القدير:٦/٥١٧،دار الفكر).

فیض الباری میں ہے:

فالذي يتبين أن المشتري إن اعتمد على كيل البائع جاز له أكله بدون إعادة الكيل سواء كان بحضرته أوبغيبته. (فيض البارى:٣/٢٢٠).

شرح عنایہ میں ہے:

قال: وإذا نظرنا إلى التعليل وهوقوله ولأنه يحتمل أن يزيد على المشروط وذلك للبائع يقتضي أن يكتفى بالكيل الواحد في أول المسئلة أيضاً كما ذكرنا ولوثبت أن وجوب الكيلين عزيمة والاكتفاء بالكيل الواحد رخصة أوقياس أواستحسان لكان ذلك مدفعاً جارياً على القوانين لكن لم أظفر بذلك. (شرح العناية على هامش فتح القدير:٦/٥١٨،دار الفكر).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: آج کل شہری لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ دکاندار کو فون پر کہہ دیا کہ فلاں فلاں اشیاء اتنی اتنی مقدار میں تول کر رکھو پھر کسی ذریعہ سے تلی ہوئی اشیاء منگواتے ہیں، یا دکاندار خود پہنچادیتا ہے اور مشتری دوبارہ وزن کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا یہ طریقہ شرعاً درست ہے؟

الجواب: اس صورت میں بیع بالتعاطی ہے اس لیے خریدار پر دوبارہ وزن کرنا ضروری نہیں۔ (احسن الفتاویٰ:٦/٤٩٧). واللہ ﷻ اعلم۔

بیع قبل القبض کا حکم:

سوال: بعض تاجر سامان باہر سے منگواتے ہیں، باہر والوں کے ساتھ جب معاملہ طے ہوجاتا ہے تو وہ تاجر سامان کے آنے سے پہلے ہی دکانداروں کے پاس جاتے ہیں اور آرڈر لیکر پیسہ بھی وصول کرتے ہیں حالانکہ ابھی تک سامان ان کے قبضے میں نہیں آیا، اور بعض مرتبہ صرف آرڈر لیتے ہیں پیسہ وصول نہیں کرتے، تو اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ بیع قبل القبض کے قبیل سے ہے شریعتِ مطہرہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بیع قبل القبض میں احتمال غرر، ربح مالم یضمن، احتمال ربا النسیہ ہے ان بنیادی وجوہات کی بناپر اس قسم کے معاملات سے احتراز لازم اور ضروری ہے۔

البتہ اس قسم کے معاملہ کے جواز کی چند صورتیں مفتی رشید احمد لدھیانویؒ نے احسن الفتاوی میں تحریر فرمائی ہے:

ملاحظہ ہو احسن الفتاوی میں ہے:

مال پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع جائز نہیں، لہذا یہ منافع بھی حلال نہیں اس کی تصحیح کی دو صورتیں ہیں:

(۱) جہاں مال خریدا ہے وہاں کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنادے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے۔

(۲) مال پہنچنے سے قبل بیع نہ کرے بلکہ وعدۂ بیع کرے، بیع مال پہنچنے کے بعد کرے، اس صورت میں جانبین میں سے کوئی انکار کردے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ (ہاں اگر ہلاک ہوجائے تو مشتری کا مال ہلاک نہیں ہوگا بلکہ بائع کا مال ہلاک ہوگا)۔

اگر مال پہنچانے کا کرایہ خریدار ادا کرتا ہے تو اس کے اذن سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دیدینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہے۔ (اگر ہلاک ہوگا تو مشتری کا مال ہلاک ہوگا)۔ (احسن الفتاوی:۶/۵۲۵)۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس ﷺ أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: من ابتاع طعاماً فلايبعه حتى يستوفيه قال ابن عباس ﷺ وأحسب كل شيء مثله. (رواه مسلم:۲/۵، باب بطلان بيع المبيع قبل

القبض).

ایک دوسری روایت میں ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: كنا في زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم نبتاع الطعام فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه إلى مكان سواه قبل أن نبيعه. (رواه مسلم:۲/۵، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض).

احناف کے نزدیک ان احادیث میں ممانعت کی علت غررِ انفساخِ عقد ہے، علامہ ابن الہمامؒ (۸۶۱م) فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

ومن اشترى شيئاً مما ينقل ويحول لم يجزله بيعه حتى يقبضه، لأنه عليه السلام نهى عن بيع مالم يقبض ولأن فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك...ثم علل الحديث (لأن فيه غرر انفساخ العقد) على اعتبار هلاك المبيع قبل القبض فيتبين حينئذٍ أنه باع ملك الغير بغير إذنه وذلك مفسد للعقد، وفى الصحاح أنه صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع الغرر. (فتح القدير:٦/٥١٠،٥١٢، دار الفكر).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

إن العلة فى النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح مالم يضمن وإنما يضمن الإنسان مايخاف فيه الهلاك وأما العقارفلا يخشى فيه ذلك إلا نادراً حتى لو كان العقار على شط البحرأو كان المبيع علواً لايجوز بيعه قبل القبض. (تكملة فتح الملهم:١/٣٥٣).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

بیع قبل القبض کی ممانعت متعدد احادیث میں وارد ہوئی ہے، ائمہ مجتہدین نے ان احادیث کو معلول بالعلۃ قرار دیا ہے، اگر علت پائی جائیگی تو ممانعت کا حکم باقی رہیگا، ورنہ نہیں، ائمہ مجتہدین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل القبض بیع کی ممانعت کی تین علتیں ہیں: (۱) احتمال غرر۔ (۲) ربح مالم یضمن۔ (۳) احتمال ربا النسیہ۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۵/۱۴۱)۔

اہم فقہی فیصلے میں مذکور ہے:

دورِ حاضر میں خرید وفروخت کی بہت سی ایسی صورتیں مروج ہیں جن میں فروخت شدہ شئی پر قبضہ کے بغیر

خریدار دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع قبل القبض سے منع فرمایا ہے، اسی پس منظر میں ایسے مروجہ معاملات کی بابت اسلامک فقہ اکیڈمی کے نویں سمینار منعقدہ جامعۃ الہدایہ جے پور میں درج ذیل باتیں طے پائیں:

اصولی طور پر قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر قبضہ سے پہلے بیع کر دی جائے تو یہ بیع فاسد ہوگی نہ کہ باطل اور قبضہ کے بعد مفیدِ ملک ہوگی۔ (اہم فقہی فیصلے، ص ۱۰۰).

نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے میں مذکور ہے:

بیع قبل القبض کی ممانعت ''غررِ انفساخ'' کی علت پر مبنی ہے، یعنی جب تک مبیع خریدارِ اول کے ہاتھ نہ آجائے اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ مبیع اس کے قبضہ میں آ ہی نہ پائے اور وہ خریدارِ دوم کو مبیع کی حوالگی پر قادر نہ رہے۔ (نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے، ص ۱۰۶).

فقہی مقالات میں ہے:

شرعی احکام کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو آپ فروخت کر رہے ہیں وہ وجود میں آچکی ہو، اور وہ چیز آپ کی ملکیت میں ہو، اور آپ کے قبضہ میں بھی ہو، البتہ چاہے اس پر حقیقی قبضہ ہو یا حکمی وعرفی قبضہ ہو، اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک چیز ہمارے پاس موجود نہیں ہے، اور اس چیز کا آرڈر ہمارے پاس آیا ہے، تو اس صورت میں ہم اس آرڈر دینے والے کے ساتھ بیع کا معاملہ نہیں کریں گے، بلکہ وعدۂ بیع کا معاملہ کریں گے۔ (فقہی مقالات: ۳/۷۶).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

بیع فاسد کے سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اگر بیع میں فساد حق شرع کی بنا پر پیدا ہوا ہو اور وہ کسی کارِ گناہ پر مشتمل ہو تو یہ بہر حال باعثِ گناہ ہے، اگر نزاع کے اندیشہ سے ہوا ہو اور عملاً نزاع نہ پیدا ہو تو گو قضاءً بیع فاسد ہوگی، لیکن دیانۃً درست وصحیح ہو جائیگی، اس سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحبؒ کی یہ تحریر چشم کشا ہے:

إن من البيوع الفاسدة ما لو أتى بها أحد جازت ديانة وإن كانت فاسدة قضاءً وذلك لأن الفساد قد يكون لحق الشرع بأن اشتمل العقد على مآثم فلايجوز بحال وقد يكون الفساد لمخالفة التنازع ولايكون فيه شيء آخر يوجب الإثم فذلك إن لم يقع فيه التنازع

جاز عندي ديانة وإن بقي فاسداً قضاءً لارتفاع علة الفساد وهي المنازعة ويدل عليه مسائلهم في باب المضاربة والشركة فإنها ربما تكون فاسدة مع أن الربح يكون طيباً وراجع "الهداية" ونبه الحافظ ابن تيميةؒ(۷۲۸م) في رسالته على أن من البيوع مالايقع فيه النزاع فتكون تلك جائزة فإذا أدخلتها في الفقه وجدتها محظورة لأن أكثر أحكام الفقه تكون من باب القضاء والديانات فيها قليلة وإنما يصار إلى القضاء بعد النزاع فإذا لم يقع النزاع ولم يرفع الأمر إلى القاضي نزل حكم الديانة لامحالة فيبقى الجواز. (فيض الباري:۳/۲۵۸).

اس لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ ''بیع قبل القبض'' کی ممانعت حق عبد کی بنا پر ہے نہ کہ حق شرع کی بنا پر اور اس کا فساد قضاءً ہے نہ کہ دیانۃً۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۲۱۳-۲۱۴). واللہ تعالیٰ اعلم۔

غیر مطعومات میں بیع قبل القبض کی تحقیق:

سوال: بعض مرتبہ تاجر حضرات بعض چیزیں باہر سے منگواتے ہیں اور پہنچنے سے پہلے ان کو فروخت کر دیتے ہیں، کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک منقولی چیزوں کی بیع قبضہ سے پہلے ناجائز ہے، ہاں اگر مشتری کے ساتھ وعدہ کر لیا جائے اور پہنچنے کے بعد فروخت کر لے تو درست ہے یا مال منگوانے والا دوسرے ملک میں کسی کو وکیل بالقبض بنادے تو وکیل کے قبضہ کے بعد اس کو آگے فروخت کر سکتا ہے، لیکن مشتری کے لیے خیارِ رؤیت ہوگا۔

البتہ امام مالکؒ وامام احمدؒ کے نزدیک غیر مطعومات میں بیع قبل القبض جائز اور درست ہے، اگر ابتلائے عام ہو تو اس قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے عصر حاضر کے اکابرؒ نے فسخ نکاح کی مشکلات کو اسی طرح حل کیا ہے اور متاخرین حنفیہ نے مسئلہ مفقود الخبر میں بھی ایسا ہی کیا ہے البتہ تلفیق سے احتراز کرنا ضروری ہوگا اور تتبع رخص کو مقصد نہ بنایا جائیگا مثلاً مسائل معاملات میں بیع قبل القبض ہے کہ آج کل تمام تاجر طبقہ اس میں مبتلا ہے اب اس کی صورت حال پر غور

کر کے پوری طرح جائزہ لیا جائے کہ یہ ابتلاء اگر واقعی ہے اور موجودہ معاشرہ مضطر ہے اور بغیر اس کے چارۂ کار نہیں تو مذہب مالکیہ پر فتویٰ دیا جائیگا، کہ عدم جواز بیع قبل القبض مطعومات کے ساتھ مخصوص ہے اس مسئلہ میں مذہب حنبلی بھی مذہب مالکی جیسا ہے اور حدیث میں صراحۃً طعام ہی کا ذکر ہے" نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الطعام قبل أن يستوفيه ".(سنن) ۔امام ابوحنیفہؒ وامام شافعیؒ نے طعام پر بقیہ چیزوں کو قیاس کر کے منع کر دیا۔ (بینات، ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ/ستمبر ۱۹۶۳ء، بعنوان فکر ونظر ص ۴، ۵۔ بحوالہ غیر سودی بینکاری از حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب، ص ۲۹۱).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

بیع فاسد کے سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اگر بیع میں فساد حق شرع کی بنا پر پیدا ہوا ہو اور وہ کسی کارِ گناہ پر مشتمل ہو تو یہ بہر حال باعث گناہ ہے، اگر نزاع کے اندیشہ سے ہوا ہو اور عملاً نزاع نہ پیدا ہو تو گو قضاءً بیع فاسد ہوگی، لیکن دیانۃً درست وصحیح ہو جائیگی، اس سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحب کی یہ تحریر چشم کشا ہے:

إن من البيوع الفاسدة ما لو أتى بها أحد جازت ديانة وإن كانت فاسدة قضاءً وذلك لأن الفساد قد يكون لحق الشرع بأن اشتمل العقد على مآثم فلايجوز بحال وقد يكون الفساد لمخالفة التنازع ولايكون فيه شيء آخر يوجب الإثم فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندي ديانة وإن بقي فاسداً قضاءً لارتفاع علة الفساد وهي المنازعة ويدل عليه مسائلهم في باب المضاربة والشركة فإنها ربما تكون فاسدة مع أن الربح يكون طيباً وراجع "الهداية" ونبه الحافظ ابن تيميةؒ في رسالته على أن من البيوع مالايقع فيه النزاع فتكون تلك جائزة فإذا أدخلتها في الفقه وجدتها محظورة لأن أكثر أحكام الفقه تكون من باب القضاء والديانات فيها قليلة وإنما يصار إلى القضاء بعد النزاع فإذا لم يقع النزاع ولم يرفع الأمر إلى القاضي نزل حكم الديانة لامحالة فيبقى الجواز. (فيض الباري:۳/۲۵۸).

اس لیے راقم الحروف کا خیال ہے کہ "بیع قبل القبض" کی ممانعت حق عبد کی بنا پر ہے نہ کہ حق شرع کی بنا پر اور اس کا فساد قضاءً ہے نہ کہ دیانۃً ۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۲۱۳-۲۱۴). واللہ تعالیٰ اعلم۔

حکومت کے نیلام کردہ اموال خریدنے کا حکم:

سوال: اگر حکومتِ وقت نے مدیون کے اموال کو نیلام کر کے فروخت کرنے کا حکم دیا جب کہ مدیون ناراض ہے تو کیا ان اموال کو خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ صاحبینؒ کے نزدیک دین کی ادائیگی کے لیے مدیون کے مال کو بیچنا جائز اور درست ہے، لہٰذا اس کا خریدنا بھی جائز اور درست ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ولوله عقار يحبسه أى ليبيعه ويقضى الدين الذي عليه ولوبثمن قليل بزازية،...قال المصنفؒ والشارحؒ هناك والقاضي يحبس الحر المديون ليبيع ماله لدينه وقضى دراهم دينه من دراهمه يعني بلا أمره وكذا لوكانا دنانيروباع دنانيره بدراهم دينه وبالعكس استحساناً لاتحادهما فى الثمنية لايبيع القاضي عرضه ولاعقاره للدين خلافاً لهما وبه أى بقولهما يبيعهما للدين يفتىٰ (اختيار) وصححه في تصحيح القدوري ويبيع كل مالايحتاجه للحال. وحاصله أنه إذا امتنع عن البيع يبيع عليه القاضي عرضه وعقاره وغيرهماوفى البزازية وفرع على صحة الحجر أنه يترك له دست من الثياب ويباع الباقي وتباع الحسنة ويشترى له الكفاية ويباع كانون الحديد ويشترى له من طين ويباع فى الصيف مايحتاجه للشتاء وعكسه. (الدر المختار مع فتاوى الشامي: ۵/۳۸۷،فصل فى الحبس).

وفى التصحيح والترجيح: ووقع فى الاختيار ولايبيع يعنى القاضى العروض ولا العقار لأنه حجرعليه، وهذا تجارة لاعن تراض،وقالا: يبيع ، وعليه الفتوىٰ. وقال أبويوسفؒ ومحمدؒ: إذا طلب غرماء المفلس الحجرعليه حجر القاضى عليه، وبيع ماله إن امتنع المديون من بيعه. وقال القاضي: (اى قاضيخان)ولايبيع مال المديون في قول أبي حنيفةؒ، وفي قول صاحبيهؒ يبيع منقوله ولايبيع عقاره عندهما...وفى رواية يبيع كمايبيع المنقول وهو الصحيح. (التصحيح والترجيح،للعلامة قاسم بن قطلوبغا،ص ۲٤٤،وكذا فى الاختيار لتعليل المختار:۲/۱۰٦، كتاب الحجر،بيروت).

امداد الاحکام میں ہے:

سوال: اگر زید نے روپیہ ادا نہ کیا اس کی جائیداد (بیل وغیرہ یا زرعی زمین) عدالت سے پیادہ آکر علانیہ نیلام کر کے اس کی قیمت سے زید کا قرض ادا کر دیتا ہے، عدالت کو یہ حق ہے یا نہیں؟ عدالت زید کی جو چیز فروخت کرے عمر اس کو خرید سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قال في البدائع في دليل مسئلة الاستيلاء ولنا أنهم استولوا على مال مباح غير مملوک ومن استولى على مال مباح غيرمملوک يملكه كمن استولى على الحطب والحشيش والصيد ودلالة أن هذا الاستيلاء على مال مباح غيرمملوک ان ملک المالک يزول بعد الإحراز بدارالحرب فتزول العصمة ضرورة بزوال الملک والدليل على زوال الملک أن الملک هوالاختصاص بالمحل في حق التصرف أوشرع للتمكن من التصرف في المحل وقد زال ذلک بالإحراز بالدارلأن المالک لايمكنه الانتفاع به إلا بعد الدخول (بدارالحرب) ولايمكنه الدخول بنفسه لمافيه من مخاطرة الروح وغيرها وقد لا يوافقه غيره ولو وافقه فقد لايظفربه ولو ظفر به قلما يمكنهم الاسترداد فإذا زال معنى الملک أوماشرع له الملک يزول الملک ضرورة، الخ. (بدائع الصنائع: ۱۲۸/۷).

قلت: وإذا أمر المالک الحربي أونائبه ببيع مال أحد من المسلمين بيع من يزيد لايقدر المالک على الامتناع منه لمافيه من مقابلة السلطان وفيه مخاطرة بالروح وإذا كان كذلک فقد زال ملكه وثبت الاستيلاء عليه لقوة السلطان .

صورتِ مسئولہ میں بظاہر استیلاء کا تحقق ہے اس لیے نیلام کا خریدنا جائز ہے۔

ولايعارضه ما في شرح السيرالكبيرفي غصب مسلم مال مسلم في دارالحرب وترافعهما إلى ملک تلک الديار وتمليک الغاصب حيث قال لايحل للغاصب وإذا ظهرنا عليهم أخذه المغصوب منه بلاقيمة فإن هذا الحكم مخصوص بالغصب وغصب المسلم مسلماً ليس من الاستيلاء وتمكين الملک لم يكن إلا تأييداً لغصبه بظهوريده عليه وماكان حراماً ابتداءً لاينقلب حلالاً بخلاف مااذا كان الاستيلاء ابتداءً فإنه يزيل ملک المالک عنه۔ (امدادالاحکام، جلد سوم، ۳۸۲، ۳۸۳).

مزید ملاحظہ ہو: (البحرالرائق: ۸۳/۸، كتاب الحجر، وفتاوى قاضيخان: ۶۳۴/۳، كتاب الحجر،

والدرالمختار مع فتاوی الشامی:٦/١٥٠-والفتاوی الهندية:٤١٩/٣-وامدادالاحکام: ٤٠١/٤، والبدائع: ١٢٩/٧، وفتاوی محمودیه:١٤٨/١٦-وامدادالفتاوی:١٢٢/٣). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ری پوزیسٹ کے اموال خریدنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے غیر مسلم بینک سے گاڑی خریدنے کے لیے رقم حاصل کی، بینک نے یہ شرط لگائی کہ اتنی مدت تک ادا نہیں کروگے تو گاڑی ضبط کرلی جائے گی، پھر شرطِ مذکور کی بنا پر بینک نے گاڑی ضبط کرلی اب وہ گاڑی بینک سے خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ جس کو عرف میں ری پوزیسٹ (Repossessed) کہا جاتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر غیر مسلم بینک نے مشتری کے ساتھ یہ معاہدہ کیا ہو کہ اتنے اقساط ادا نہ کرنے کی صورت میں ہم گاڑی ضبط کریں گے، تو یہ تعزیر بالمال کی طرح ہے اور اس کی گنجائش بعض علماء کے نزدیک موجود ہے، اور اس صورت میں بینک یا کوئی ادارہ اس گاڑی کا مالک بن گیا اس سے خریدنا درست ہوگا، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے حکومت کے استیلاء کو سببِ ملک قرار دیا ہے، جس کی تفصیل دوسری جگہ گزر چکی ہے، نیز تعزیر بالمال کا مسئلہ بھی فتاویٰ دار العلوم زکریا کی جلد چہارم میں گزر چکا ہے۔

لیکن اگر بینک کسی قرض کے نادہندہ پر کچھ ماہ قسط ادا نہ کرنے کی وجہ سے جرمانہ لاگو کرے تو یہ ناجائز اور سود ہے، اس لیے کہ جاہلیت میں قرض نادہندہ پر قرض کی تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لگاتے تھے اور اسی کو ربا قرآنی کہتے ہیں یعنی " زيادة القرض لزيادة الأجل۔

مذکورہ بالا سوال میں ایک شکل یہ ہے کہ بینک یا کوئی دوسرا ادارہ گاڑی کو واپس لے کر اصل ثمن واپس کردے، بعض مشائخ کے قول سے اس کے جواز پر بھی روشنی پڑتی ہے حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ رقمطراز ہیں:

مشتری ثمن ادا نہ کرے اور نہ ہی اقالہ کرے تو بائع کو فسخ بیع کا اختیار ہے، مشتری کی طرف سے عدم ادا ثمن کو عدم رضا اور فسخ سمجھا جائے گا، لہذا فسخ بائع سے جانبین کی طرف سے فسخ متحقق ہوجائیگا۔ (احسن الفتاویٰ: ٥٠٦/٦).

البحر الرائق وہدایہ میں ہے:

لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع فيستقل بفسخه. (البحر

الرائق:۷/۳٦، کوئٹہ۔و کذا فی الهداية:۳/۱٤۷). **واللہ ﷻ اعلم۔**

Television فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ذاتی ٹی وی بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے حاصل ہونے والی رقم حلال ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے آلاتِ لہوولعب، گانا بجانا، اور آلاتِ موسیقی وغیرہ کے استعمال کو باعثِ گناہ قرار دیا ہے اور ٹی وی کا غالب استعمال اسی میں ہوتا ہے، لہذا ٹی وی کا گھر میں رکھنا درست نہیں، لیکن اس کی بیع سے حاصل ہونے والی رقم حلال ہوگی، نیز اس کی مرمت سے حاصل شدہ رقم بھی حلال ہے، لیکن اگر ٹی وی بیچنی ہو تو کسی غیر مسلم کو بیچنا چاہئے، کیونکہ بعض علماء نے ٹی وی کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں مولانا مجیب اللہ ندوی فرماتے ہیں:

جو آلات ابتداءً لہوولعب کے لیے یا گانے بجانے کے لیے ہی بنائے گئے ہوں، مثلاً طبلہ، ستار، ہارمونیم وغیرہ یہ تو ناجائز ہیں، اور ان کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہے، البتہ ٹیپ ریکارڈ، ریڈیو سے کام گانے بجانے کا لیا جاتا ہے، مگر فی نفسہ وہ اس کے لیے نہیں، البتہ ٹی وی اور ویڈیو کی ساخت اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ تقریر کرنے والے کو یا گانے والے یا کھیلنے والوں کی تصویریں بھی دیکھ لیں، ظاہر ہے کہ اس میں نامحرم عورتوں کی تصویریں بھی دیکھی اور دکھائی جاتی ہیں، اس لیے اس کا رکھنا خریدنا اور بیچنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا چاہے وہ کتنا عام کیوں نہ ہوجاوے۔ **ولو أمسک في بيته شيئاً من المعازف والملاهي کره ويأثم وإن کان لايستعملها۔**

(اسلامی فقہ:۲/۳۸۸)۔

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ احسن الفتاوی میں فرماتے ہیں:

پس ان کی پوری مشابہت جاریہ مغنیہ سے ہے بلکہ یہ ہیں ہی جواری مغنیہ، لہذا ویڈیو اور ٹیلیویژن کی بیع اور مرمت قولِ راجح کے مطابق مکروہِ تحریمی ہے اور اگر کراہتِ تنزیہیہ کا مرجوح قول بھی لیا جائے تو بھی یہ پیشہ اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ (احسن الفتاوی:٦/۵۴۳)۔

دوسرے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ٹی وی فروخت کرنا جائز ہے اور اس کی آمدنی بھی حلال ہے، البتہ اس کا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں ہے۔ اور ان حضرات کا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شامی میں ہے:

قوله معزياً للنهرقال فيه من باب البُغاةِ وعلم من هذا أنه لايكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف وأما في بيوع الخانية من أنه يكره بيع الأمرد من فاسق يعلم أنه يعصي به مشكل. (فتاوى الشامي:٦/٣٩١،فصل في البيع،سعيد).

حضرت مولانا مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

یہ ایئرپورٹ پر جو لگے ہوتے ہیں وہ ٹی وی ہی ہوتے ہیں لیکن وہ مانیٹر (Monitor) یا کلوز سرکٹ (Close Circuit) کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، تو یہ اس کا جائز استعمال ہے، اس لیے فی نفسہ ٹی وی کی بیع حرام نہیں ہے، لیکن کسی کو اس کی بیع کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا کہ آپ اس کی بیع کریں، جیسے آپ نے کسب الحجام کے بارے میں پڑھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ "کسب الحجام خبيث"، لیکن ناجائز نہیں کہا، یہ شرعاً جائز ہے، ساتھ یہ فرمایا کہ یہ پیشہ اچھا نہیں ہے۔ چونکہ ٹی وی کا زیادہ تر استعمال ناجائز کاموں میں ہورہا ہے اس واسطے اس کی بیع کا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں ہے۔ اور کسی مسلمان کو اس کا مشورہ نہیں دینا چاہئے، لیکن بالکل حرام کہنا کہ اس کے نتیجے میں آمدنی حرام ہوگئی ہے یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۴).

فقہ المعاملات میں ہے:

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ٹی وی کا غالب استعمال چونکہ ناجائز طریقوں سے ہورہا ہے اور وہ اس وقت بے شمار دینی اور دنیاوی خرابیوں اور مفاسد پر مشتمل ہے اس لیے اصل حکم تو یہی ہے کہ ٹی وی نہ گھر میں رکھنا جائز ہے اور نہ اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ تاہم موجودہ دور میں اس کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، مثلاً یہ کہ اس کو غیر جاندار اشیاء جیسے عمارتوں، مقامات، پارکوں، سمندروں وغیرہ کی نقل وحرکت یا طلوع وغروب وغیرہ کے مناظر اور تصاویر دیکھنے کے لیے استعمال کیا جائے یا سامان وغیرہ کی چیکنگ اور ہوائی جہاز وغیرہ کے نظام الاوقات بتلانے اور اعلانات کے لیے استعمال کیا جائے یا دیگر سیکورٹی وغیرہ کے انتظامات میں استعمال کیا جائے لہٰذا اگر مذکورہ بالا جائز مقاصد کے لیے خریدنے والے شخص کو ٹی وی فروخت کیا جائے تو بیع جائز ہے اور اس کی قیمت بلاشبہ حلال ہے البتہ ٹی وی اگر ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جس کے متعلق غالب گمان یہ ہو کہ خریدنے والا اسے ناجائز کاموں میں استعمال کریگا، تو اس کو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں گناہ ہے کیونکہ اس میں

گناہ کے کاموں میں اعانت ہے اوراس صورت میں فروخت شدہ قیمت کراہت کے ساتھ حلال ہے۔" في خلاصة الفتاوى(۳/ ۱۰۰): وبيع الغلام الأمرد ممن يعلم أنه ممن يعصى الله يكره لأنه إعانة على معصية "

نیز ٹی وی فروخت کرنے کی ایک جائز صورت یہ بھی ہے کہ اس کے تمام پرزے الگ کر لیے جائیں اوران پرزوں کوفروخت کردیا جائے تو یہ طریقہ بھی درست ہے۔(فقہ المعاملات:۱/ ۷۶)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مسائل:۱/ ۲۳۷۔فتاوی محمودیہ:۱۶/ ۱۲۹،مبوب ومرتب۔تقریر ترمذی، جلداول، ۲۲۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مرتد کے ساتھ تجارت کا حکم:

سوال: کیا مرتد کے ساتھ خرید وفروخت کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟اور جو شخص کفریہ کلمات کہتا ہو اوراپنے آپ کو مسلمان بھی ظاہر کرتا ہو اس کے ساتھ بیع کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ صاحبینؒ کے نزدیک بیع نافذ ہوجائیگی،اوراسی پرفتویٰ ہے۔اور جو شخص کفریہ کلمات کہتا ہو وہ بھی مرتد کے حکم میں ہے اگرچہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی شامی میں ہے:

وبيع المرتد فإنه موقوف عند الإمام على الإسلام ولايوقف عندهما. (فتاوى الشامي:٥/ ١١١،فصل في الفضولي،سعيد۔ وكذا في حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ٣/ ٨٧،كوئته).

وفي الشامية: (اعلم أن تصرفات المرتد على أربعة أقسام)...(ويتوقف منه عند الإمام) بناء على زوام الملك (وينفذعندهماكل ماكان مبادلة مال بمال أوعقد تبرع) إلا أنه عند أبي يوسفؒ تصح كماتصح من الصحيح لأن الظاهرعوده إلى الإسلام وعند محمدؒ كما تصح من المريض لأنها تفضي إلى القتل ظاهراً،ط عن البحر. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:٤/ ٢٤٩، ٢٥٠،مطلب حمله من لايقبل اذا ارتد).

البحرالرائق میں ہے:

وأما البيع الجائزالذي لانهي فيه فثلاثة: نافذ لازم ونافذ ليس بلازم وموقوف...وبيع المرتد عند الإمام أي موقوف. (البحرالرائق:٦/ ٦٩،باب البيع الفاسد).

فتاویٰ شامی میں ہے:

ثم قال في البحر والحاصل: أن من تكلم بكلمة الكفر هازلاً أو لاعباً كفر عند الكل ولا اعتبار باعتقاده كما صرح به في الخانية ومن تكلم بها مخطئاً أو مكرهاً لايكفر عند الكل ومن تكلم بها عامداً عالماً كفر عند الكل. (فتاوى الشامي: ٤/٢٢٤، مطلب مايشك في انه ردة لايحكم بها، سعيد).

امداد الاحکام میں ہے:

...شراء وبیع ان کے ساتھ جائز ہے البتہ ان کی دعوت وضیافت نہ قبول کی جائے نہ ان کے ساتھ مدارات و ملاطفت کی جائے، مگر یہ کہ تالیفِ قلب سے یہ امید ہو کہ اسلام کی طرف عود کر آئے گا۔ واللہ اعلم۔ (امداد الاحکام: ۳۹۳/۴، بعنوان مرتد سے معاملاتِ تجارت رکھنے کا حکم)۔

احسن الفتاوی میں ہے:

البتہ صاحبینؒ کے ہاں عدمِ جواز کے باوجود عقد نافذ ہو جائیگا، بوقتِ ابتلاء عام وضرورتِ شدیدہ اس قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔... **قال العلامة السيد محمد أبو السعود المصري الحنفي**: (**قوله هذا عند أبي حنيفة**) **اعلم أن تصرفات المرتد يتوقف في الكسبين جميعاً وهو الصحيح وقال بعض المشايخ إن تصرفه في كسب الردة نافذ في ظاهر الرواية وموقوف في رواية الحسن والأول أصح وهذا كله عند الإمام وأما عندهما فتصرفاته نافذة في الكسبين قهستاني.** (فتح المعين ٢/٤٦٤). (ملخص از احسن الفتاوی: ۲۵۰/۸، ۲۵۲). واللہ ﷻ اعلم۔

بیع السرطان کا حکم:

سوال: علامہ شامیؒ نے فتاوی شامی میں بیع فاسد کے باب میں فرمایا ہے کہ تمام حیوانات کی بیع جائز ہے سوائے خنزیر کے، اس سے معلوم ہوا کہ سرطان (کیکڑے) کی بیع بھی احناف کے نزدیک جائز ہے، پس اگر جائز ہے تو یہ احناف کے اصول کے خلاف ہے کیونکہ کیکڑا غیر ماکول ہے تو مالِ متقوم کیسے بنا کہ اس کی بیع جائز قرار دی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذہبِ احناف میں خرید وفروخت کے جواز وعدمِ جواز کا مدار ماکول اللحم ہونے پر نہیں ہے،

بلکہ اصل علت قابل انتفاع ہونا ہے، اگر وہ شئی قابل انتفاع ہے اور نجس العین بھی نہیں ہے تو اس کی بیع جائز ہے اگر چہ وہ غیر ماکولات میں سے ہے، اور فقہاء کے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ سابقہ میں یہ چیزیں یعنی ھوام الارض، مثلاً حیات، سرطان، ضفدع وغیرہ اکثر نا قابل انتفاع تھے، لیکن آج کل قابل انتفاع ہیں، دوائیوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے، نیز دوا کے علاوہ دوسری چیزوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں، لہذا منتفع بہ ہونے کی وجہ سے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ولايجوز بيع النحل وهذا عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ وقال محمدؒ يجوز إذاكان محرزاً وهوقول الشافعيؒ لأنه حيوان منتفع به حقيقة وشرعاً فيجوز بيعه وإن كان لايوكل كالبغل والحمار. وفي شرح العناية : قال لأنه حيوان منتفع به حقيقة باستيفاء مايحدث منه، وشرعاً لعدم مايمنع عنه شرعاً، وكل ما هوكذلک يجوزبيعه وكونه غيرماكول اللحم لاينافيه كالبغل والحمار... (الهداية مع شرح العناية على هامش فتح القدير:٦/٤١٩،باب البيع الفاسد،دار الفكر).

وفي فتح القدير: والوجه قول محمدؒ للعادة الضرورية وقد ضمن محمدؒ متلف كل من النحل ودود القز، وفى الخلاصة في بيعهما قال : الفتوىٰ على قول محمدؒ. (فتح القدير: ٦/٤٢٠،دارالفكر).

وفى الدرالمختار: بخلاف غيرهمامن الهوام فلايجوز اتفاقاً كحيات وضب ومافى بحركسرطان إلاالسمک وما جاز الانتفاع بجلده أوعظمه والحاصل أن جوازالبيع يدور مع حل الانتفاع مجتبىٰ واعتمده المصنفؒ،وفى الفتاوى الشامية: قوله كحيات فى الحاوى الزاهدي: يجوز بيع الحيات إذاكان ينتفع بها للأدوية، وما جاز الانتفاع بجلده أوعظمه أى من حيوانات البحر أوغيرها...ونقل السائحاني عن الهندية: ويجوزبيع سائرالحيوانات سوى الخنزيز وهوالمختار، وعليه مشى فى الهداية وغيرها من باب المتفرقات. (الدرالمختار مع فتاوى الشامي:٥/٦٨،مطلب فى بيع دودة القرمز،سعيد)

وفي تقريرات الرافعي: (يجوزبيع الحيات) هي وإن كان فيها نفع إلا أنه يحرم أكلها

فليحرر حموی ، سندی.(التحرير المختار:۱٤۱/٥،سعيد).

وللاستزادة انظر : (فتح القدير: ۱۱۸/۷،مسائل منثورة ، دارالفكر-والفتاوى الهندية:۱۱٤/۳).

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

جس جگہ مینڈک اور کیکڑے کی قیمت ہو اسی طرح جو دریائی جانور بازار میں عام طور سے قیمتی شمار ہوتے ہیں وہاں ان کی بیع جائز ہے اور ثمن حلال ہے۔(امدادالاحکام:۳/۲۷۷).

اشکال اور جواب:

اشکال: لیکن بیع السرطان پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع السرطان سے منع فرمایا۔اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: حافظ ابن حجرؒ نے حدیث مذکور کے بارے میں فرمایا: "**لم أجده**". (الدراية :٤/٤٤٢، كتاب الذبائح). اور علامہ زیلعیؒ نے نصب الرایہ (٤/٢٠١) میں فرمایا: "**غريب جداً**" لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بذریعہ انٹرنیٹ تجارت کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص بذریعہ انٹرنیٹ کاروبار کرتا ہو اور ثمن اس کے نام پر درج ہو گیا تو یہ قبضہ تسلیم کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب ثمن بائع کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو گیا اور بائع کو بذریعہ SMS اطلاع مل گئی تو یہ قبضہ شمار ہوگا، کیونکہ قبضہ بالبراجم شرط نہیں ہے تخلیہ بھی کافی ہے اس لیے کہ قبضہ کہتے ہیں دوسرے کی اجازت سے کسی چیز میں تصرف پر قدرت کا حاصل ہونا۔

ملاحظہ فرمائیں ردالمحتار میں ہے:

إن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلک يختلف بحسب حال المبيع ،ففي نحو حنطة في بيت مثلاً فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أى بأن تكون فى البلد فيما يظهر ، وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب ، فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض

وفي نحوفرس أوطيرفي بيت إمكان أخذه منه بلامعين قبض. (ردالمحتار،٤/٥٦٢، مطلب فی شروط التخلية، سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع، والمشتري قابضاً له،وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع. (بدائع الصنائع:٥/٢٤٤، فی حکم البيع، كتاب البيوع،سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

ولو وهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل ودفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً وإن كان الصندوق مفتوحاً كان قبضاً لأنه يمكنه القبض كذا في المحيط. (البحرالرائق:٧/٢٨٦، كتاب الهبة،کوئٹہ۔وكذا فی محيط البرهانی:٧/١٦٩، الفصل الثانی فيمايجوزفی الهبة ومالايجوز).

وفي الدر المختار: والتمكن من القبض كالقبض فلووهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل... الخ. (الدرالمختار: ٥/٦٩٠، كتاب الهبة، سعيد).

معاییر شرعیہ نامی کتاب جس کوستائیس محققین اربابِ فتویٰ نے مرتب کیا ہےاس میں مرقوم ہے:

إن كيفية قبض الأشياء تختلف بحسب حالها واختلاف الأعراف فيما يكون قبضاً لها، فكما يكون القبض حسياً في حالة الأخذ باليد أو النقل أو التحويل إلى حوزة القابض أو وكيله يتحقق أيضاً اعتباراً وحكماً بالتخلية مع التمكين من التصرف، ولولم يوجد القبض حسياً، فقبض العقار يكون بالتخلية وتمكين اليد من التصرف، فإن لم يتمكن المشتري من المبيع فلاتعتبر التخلية قبضاً، أماالمنقول فقبضه بحسب طبيعته. (المعاييرالشرعيه،ص١٢٢).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی کے کھاتے میں رقم کا اس طرح منتقل کردینا کہ وہ اس میں تجارت کرسکتا ہو قبضہ حکمی ہے۔

عطر ہدایہ میں ہے:

قبضہ: یعنی دوسرے کی اجازت سے کسی چیز میں تصرف پر قدرت کا حاصل ہونا۔اب اگر یہ قدرت مالک

کی اجازت سے ہے یا شرعی حق کی وجہ سے تو اس کو قبضہ جائز کہا جاتا ہے۔(عطر ہدایہ:ص۸۸).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ حسی قبضہ ضروری نہیں بلکہ تخلیہ کافی ہے، تخلیہ کے معنی یہ ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دیدی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کرلے جب قبضہ کرنے میں کوئی مانع باقی نہیں رہے تو سمجھیں گے کہ تخلیہ ہو گیا، مثلاً کوئی بکس ہے، اس کے اندر کئی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، اس کی چابی اس کے حوالہ کردی، تو جب چابی حوالے کردی اب چاہے وہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، قبضہ متحقق ہو گیا، امام بخاریؒ نے یہاں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک اختیار کیا ہے اور حضرت جابرؓ کا واقعہ موصولاً روایت کیا ہے کہ حضرت جابرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ خریدا اور پھر حضرت جابرؓ نے اسی اونٹ پر مدینہ منورہ تک سفر کیا، حضرت جابرؓ اس سے نہیں اترے لیکن تخلیہ متحقق ہو گیا تھا، امام بخاریؒ یہ کہتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ تخلیہ سے قبضہ ہو گیا۔(اسلام اور معاشی مسائل ۲/۹۹،۱۰۰).

اہم فقہی فیصلے میں ہے:

الف:۔انٹرنیٹ پر بھی اگر بیک وقت عاقدین موجود ہوں اور ایجاب کے بعد فوراً دوسرے کی طرف سے قبول ظاہر ہو جائے تو بیع منعقد ہو جائے گی، اور ان صورتوں میں عاقدین کو متحد المجلس تصور کیا جائے گا۔

ب:۔اگر انٹرنیٹ پر ایک شخص نے بیع کی پیشکش کی، اور دوسرا شخص اس وقت انٹرنیٹ پر موجود نہیں تھا، بعد کو اس نے اس پیشکش کرنے والے کا پیغام حاصل کیا، یہ صورت تحریر و کتابت کے ذریعہ بیع کی ہوگی، اور جس وقت دوسرا شخص اس پیشکش کو پڑھے اسی وقت اس کی جانب سے قبولیت کا اظہار ضروری ہوگا۔(اہم فقہی فیصلے ص ۱۵۸، جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عقود و معاملات کا شرعی حکم).

مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاوی:۵/۲۰۱۔و نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے،ص۹۷). واللہ ﷻ اعلم۔

عقدِ RCS کا حکم:

سوال: RCS کا عقد درست ہے یا نہیں؟ RCS عقد کی حقیقت درج ذیل ہے:

مشتری ادھار سامان خریدنا چاہتا ہے، بائع اس کو کہتا ہے کہ ایک کمپنی RCS آپ کے لیے سامان خریدے گی، چنانچہ دکاندار ایک فارم مشتری کو دیتا ہے اور مشتری اس کو بھرنے کے بعد RCS کمپنی کو فیکس

کردیتا ہے، اگر درخواست منظور ہوگئی تو RCS کمپنی ایک کارڈ مشتری کو دیتی ہے اس کارڈ کے ذریعہ مشتری سامان خریدیگا، کمپنی براہِ راست دکاندار کو پیسہ ادا کردیتی ہے، اور مشتری سے تین ماہ تک کوئی سودی رقم وصول نہیں کرتی، اور مشتری کمپنی کو پیسہ ادا کریگا، اب سوال یہ ہے کہ دکاندار کے لیے ایسی سروس کا انتظام کرنا درست ہے یانہیں؟

الجواب: اگر اس معاملہ کی حقیقت یوں ہے کہ کمپنی کسی چیز کو دکاندار سے خرید لیتی ہے اور وہی چیز ضرورت مند کو زائد قیمت پر فروخت کرتی ہے یعنی کمپنی ادھار کے ساتھ زیادہ قیمت پر بیچ دیتی ہے تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہے۔ لیکن اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کمپنی کا مالک یا منیجر اس چیز پر قبضہ نہیں کرتا تو قبضہ سے پہلے اس کو فروخت کرنا کیسے جائز ہوگا؟

الجواب: اس کے جواز کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) پہلی صورت یہ ہے کہ کمپنی دکاندار ہی کو اپنی طرف سے وکیل بالقبض بنادے یعنی مالک کہدے کہ جو چیز میں نے آپ سے خرید لی آپ میری طرف سے قابض ہیں اور اب آگے وہی چیز حاجتمند کو اتنی قیمت پر فروخت کردیں۔

ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع میں ہے:

ولو اشترى من إنسان كراً بعينه و دفع غرائره و أمره بأن يكيل فيهافعفل صار قابضاً سواء كان المشتري حاضراً أو غائباً لأن المعقو دعليه معين وقد ملكه المشتري بنفس العقد فصح أمر المشتري لأنه تناول عيناً هوملكه فصح أمره وصار البائع وكيلاً له وصارت يده يد المشتري. (بدائع الصنائع:۵/ ۲۴۷،فصل فی حکم البیع،سعید)۔

اس پر یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ ایک شخص بائع اور مشتری نہیں ہوسکتا اس لیے کہ دکاندار مشتری یا وکیل بالشراء نہیں بلکہ وکیل بالقبض ہے۔

(۲) جواز کی دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری کو کمپنی کی طرف سے وکیل بالقبض بنادیا جائے اس میں یہ اشکال ہے کہ مشتری کا پہلا وکالت والا قبضہ قبض امانت ہے اور اس کے بعد قبض شراء ہے جو قبض معاوضہ اور قبض ضمان بھی کہلاتا ہے اور فقہاء کے ہاں قبض امانت قبض ضمان کا قائم مقام نہیں ہوسکتا؟

الجواب: قبض امانت کا قبض ضمان کا قائم مقام ہونا کوئی حرام کام نہیں، بلکہ فقہاء کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ اگر تصرف کرنے سے پہلے وہ چیز ہلاک ہوگی تو مشتری پر تاوان نہیں بلکہ کمپنی کا نقصان ہوگا، ہاں تصرف کرنے

کے بعد قبض امانت خود بخود قبض ضمان بن جائیگا اور مشتری ذمہ دار ہوگا۔

پھر یہ شرط لگانا کہ تین ماہ میں قرض ادا نہیں کیا تو اتنی فیصد رقم زائد وصول کی جائے گی، یہ سودی معاملہ ہے اور قرض شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو" البحر الرائق" میں ہے:

وما لايبطل بالشرط الفاسد القرض...بأن قال أقرضتک هذه المائة بشرط أن تخدمني شهراً مثلاً فإنه لايبطل بهذا الشرط، وذلک لأن الشروط الفاسدة من باب الربا وأنه يختص بالمبادلة المالية ، وهذه العقود كلها ليست بمعاوضة مالية فلا تؤثر فيها الشروط الفاسدة ، ذكره العيني...وفي البزازية: وتعليق القرض حرام والشرط لا يلزم .

(البحر الرائق:١٨٧/٦، باب المتفرقات من كتاب البيوع،كوئته).

وكذا في تبيين الحقائق:١٣٣/٤ـ والفتاوى البزازية على هامش الفتاوى الهندية:٤٢٦/٤).

لہذا تین ماہ کے اندر ادائیگی کی کوشش کرے اگر تین ماہ میں ادا نہ کرے تو اس پر سود دینے کا سخت گناہ ہوگا۔لیکن غلطی سے ایسا معاہدہ کرلیا تو مشتری کو سود سے بچنا لازم ہے اور تین ماہ میں رقم ادا کرنا ضروری ہے یعنی دکاندار کو چاہئے کہ سودی رقم کی وصولی سے احتراز کرے اور مشتری اور کمپنی کے درمیان اگر سودی معاملہ ہو تو دکاندار اس کی وصولی سے بالکل الگ رہے۔

نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کمپنی بائع اور مشتری کے علاوہ کسی اور کو وکیل بالقبض بنادے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سیاہ خضاب کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک شخص سیاہ خضاب بنا کر بیچتا ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

الجواب: تجارت کے جواز وعدم جواز کے متعلق شریعتِ مطہرہ کا اصول یہ ہے کہ جس چیز کا جائز استعمال ممکن ہو اس کی خرید وفروخت جائز ہے اور جس چیز کا جائز استعمال ممکن ہی نہ ہو صرف اور صرف معصیت ہی میں استعمال ہوتی ہو تو اس کی تجارت ممنوع اور ناجائز ہے، بنابریں واضح ہوا کہ سیاہ خضاب کا استعمال جائز مواقع میں بھی ممکن ہے مثلاً جہاد میں کفار پر رعب ڈالنے کے لیے غازی استعمال کرسکتا ہے، اسی طرح وہ بوڑھا

شخص جس کی بیوی جوان ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے، نیز کسی نوجوان شخص کے بال کسی عارضہ کی وجہ سے قبل از وقت سفید ہو گئے ہوں تو ازالہ عیب کی خاطر سیاہ خضاب کا استعمال جائز ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

تجارت کے لیے سیاہ خضاب بنانا اور فروخت کرنا جائز ہے۔ لأن الحرمة ليست بقائمة بعينه وإنما الحرمة في الاستعمال إذا استعمله خادعاً ومن شاب قبل أوان المشيب أو خضب لارهاب العدو في الحرب يجوز له الخضاب بالسواد كما صرح به في الهندية وغيرها. (امداد الاحکام:۳/۳۷۶).

محیط برہانی میں ہے:

وأما الخضاب بالسواد: فمن فعل ذلک من الغزاة ليكون أهيب في عين العدو فهو محمود منه، اتفق عليه المشايخ، ومن فعل ذلک ليزين نفسه للنساء، وليحبب نفسه إليهن فذلک مكروه عليه عامة المشايخ، وبنحوه ورد الأثر عن عمر ﷺ، وبعضهم جوزوا ذلک من غير كراهية، روي عن أبي يوسفؒ أنه قال: كما يعجبني أن تتزين لي يعجبها أن أتزين لها، هذه الجملة من شرح "السير الكبير". (المحيط البرهاني:٦/١٢٢، فصل في الزينة، رشيدية).

وفي فتاوى الشامي: قوله ويكره بالسواد، أى لغير الحرب، قال في الذخيرة: أما الخضاب بالسواد للغزو، ليكون أهيب في عين العدو فهو محمود بالاتفاق ...الخ. (فتاوى الشامي:٦/٤٢٢، كتاب الكراهية، سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

سیاہ خضاب تیار کرنا اور فروخت کرنا جائز ہے، اس لیے کہ ایک محل اس کے جواز کا بھی موجود ہے یعنی دشمن پر ہیبت بٹھانے کے لیے، لہٰذا بنانا اور بیچنا خلافِ اولیٰ ہے، مگر ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں جس کے متعلق یقین ہو کہ ناجائز طور پر استعمال کرے گا، کما فی ردالمحتار وغیرہ۔ (احسن الفتاوی:۸/۳۷۵).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

بیع کے بارے میں یہ اصول ہے کہ جس شئی کا کوئی جائز استعمال ممکن ہو اس کی بیع جائز ہے چاہے وہ چیز عام طور سے ناجائز کام میں استعمال ہوتی ہو، یعنی اب یہ مشتری کا کام ہے کہ اس کو جائز مقصد کے لیے استعمال

کرے، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تصویر والا کپڑا خریدا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دیکھ کر ناگواری کا اظہار فرمایا، لیکن بیع فسخ کرنے کا حکم نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ بیع ناجائز نہیں، بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پر اس کپڑے کا گدا بنالیا تھا اور گدے میں اس کو استعمال کیا۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عقد تام ہونے کے لیے سرکاری کاغذات کا حکم:

سوال: ایک سال پہلے کسی نے اپنی زمین دوسرے کے ہاتھ فروخت کردی، ایک سال گزرنے کے بعد اب تک زمین سرکاری کاغذات میں مشتری کے نام پر منتقل نہیں ہوئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قانوناً یہ زمین ابھی تک بائع کی سمجھی جائیگی، شرعاً اس زمین کا مالک کون ہے؟ نیز سال کے اخراجات بجلی پانی وغیرہ کس پر لازم ہوں گے؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں طرفین کی رضامندی سے ایجاب وقبول ہوجانے پر عقد بیع تام ہوجاتا ہے اور مشتری قبضہ کر لینے سے مبیع کے تمام مالہ وماعلیہا کا ذمہ دار بن جاتا ہے، سرکاری کاغذات میں جس کا نام درج ہو اس کا اعتبار نہیں۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

البيع ينعقد بالإيجاب والقبول...وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع.

(الهداية:۳/ ۲۰).

بدائع الصنائع میں ہے:

المبيع إنما يدخل في ضمان المشتري بالقبض...لأن المبيع خرج عن ضمان البائع بقبض المشتري فتقرر عليه الثمن. (بدائع الصنائع:۵/ ۲۴۰،۲۴۱، سعيد).

شرح المجلہ میں ہے:

الغرم بالغنم أي من ينال نفع شيء يتحمل ضرره. (شرح المجلة للبناني،۱/ ۵۸، المادة:۸۷).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما تفسير التسليم والقبض هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين

المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلماً للمبيع و المشتري قابضاً له...ولهذا يدخل المبيع في ضمان المشتري بالتخلية نفسها بلاخلاف. (بدائع الصنائع:٥/٢٤٤،سعید).

امداد المفتین میں ہے:

کاغذات سرکاری میں کسی کا نام درج ہو جانے سے شرعاً اس کی ملک ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ مالک اپنی رضاء سے اس کو مالک نہ بنائے اور قبضہ نہ کرائے۔(امداد المفتین:۲/۸۹۰). واللہ ﷻ اعلم۔

سگریٹ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص دکان میں سامانِ تجارت کے ساتھ سگریٹ بھی فروخت کرتا ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور آمدنی حلال ہوگی یا نہیں؟ نیز سگریٹ نوشی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: عصر حاضر میں اطباء کا اتفاق ہے کہ سگریٹ نوشی جسم کے لیے ضرر رساں ہے اس لیے قدیم زمانہ میں بھی علمائے کرام نے سگریٹ نوشی کو مکروہ قرار دیا تھا، بایں وجہ اس کی تجارت بھی مکروہ ہے اس لیے اجتناب کرنا چاہئے، ہاں اس کی آمدنی کو حرام نہیں کہا جائیگا، سگریٹ نوشی کی کراہت پر علماء نے کافی دلائل بیان کیے ہیں منجملہ چند حسبِ ذیل درج ہیں:

(۱) اس میں تضییع المال ہے، کیونکہ نہ تو یہ ماکولات میں سے ہے اور نہ مشروبات میں سے، اور نہ جسم کا کوئی فائدہ اس سے وابستہ ہے بلکہ نقصان دہ ہے۔ اور اسراف وفضول خرچی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كلوا واشربوا ولاتسرفوا﴾۔(سورة الاعراف،الآية:٣١).

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ولاتبذر تبذيراً إن المبذرين كانوا إخوان الشيطين وكان الشيطان لربه كفوراً﴾۔(سورة بنى اسرائيل،الآية:٢٦،٢٧).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: " إن الله حرم عليكم عقوق الأمهات ومنعاً وهات ووأد البنات وكره لكم قيل وقال وكثرة السوال وإضاعة المال . (صحيح البخارى:٢/٨٨٤،باب عقوق الوالدين).

(۲) دوسری خرابی صحتِ جسمانی کو برباد کرنا ہے، آج کل اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صحت کے لیے

مضر ہے۔ چند مضرات حسبِ ذیل ملاحظہ ہو:

گجراتی اخبار ''سندیش'' کے بیان کے مطابق سگریٹ اور بیڑی کے ایک کش کے ساتھ دس لاکھ بیکٹریاں بدن میں داخل ہو جاتے ہیں اور انسان کے پھیپھڑے، غذا کی نالی، اور انتڑیوں پر قابض ہو جاتے ہیں، اور اس پر مہلک اثرات ڈالنا شروع کر دیتے ہیں، اور عام طور پر تمباکو میں پائے جانے والے زہریلی مادے کی وجہ سے کینسر کا مرض لاحق ہوتا ہے، صرف کینسر ہی نہیں بلکہ خون کی کئی بیماریاں بھی اس سے جنم لیتی ہیں، اس طرح السر، دمہ ایسی ڈی ٹی، پیٹ کی بیماری بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ بیڑی سگریٹ وغیرہ پینا گویا اپنے آپ کو موت کی طرف لے جانا ہے، یا کم از کم بیماریوں میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ (سندیش ص ۷، بتاریخ ۲۵/۱/۲۰۱۰ء)۔

التقدم العلمی نے عالمی ادارۂ صحت .W.H.O کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ دنیا میں ہر سال کم از کم چالیس لاکھ افراد محض سگریٹ نوشی اور بیڑی نوشی سے موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

دنیا کی بڑی بڑی لیباٹریوں نے تحقیقات و تجربات کے بعد واضح کیا ہے کہ سگریٹ وغیرہ میں جو ۴۷۰۰ مہلک اجزاء پائے جاتے ہیں ان میں سے ۱۴۳ اجزاء ایسے ہیں جو سو فیصد کینسر کا سبب بنتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) نیکوٹین: اس سے دمے کی بیماری دماغ اور قلب میں ضعف طاری ہوتا ہے۔

(۲) اکسید کربون: جو انتہائی مفاسد کا حامل ہے۔

(۳) زرنیخ: جو حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو مارنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۴) کادمیون: زہر آلود ہوتا ہے، جو عام طور پر بیڑیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۵) فوزمالوہید: مردہ لاشوں کو تعفن سے بچانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۶) .D.D.T کیڑے ماردوا۔

(۷) امونیا: زمین اور فرش اور ٹائلس وغیرہ صاف کرنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔

(۸) استیون: ناخون پالش ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۹) تولوین: فیکٹریوں میں مشین کی صفائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱۰) میٹاتول: پٹاخوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱۱) سیائیدھیڈ روجن: انتہائی زہریلہ مادہ ہوتا ہے۔ (التقدم العلمی)۔

ان مذکورہ بالا مہلک اجزاء سے صرف سگریٹ اور بیڑی پینے والے ہی کو نقصان نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اطراف میں موجود لوگوں کو بھی شدید نقصان پہنچاتے ہیں، خاص طور پر حاملہ کے پیٹ میں موجود جنین کے لیے تو انتہائی خطرناک ہوتے ہیں، بلکہ بعض سگریٹ کے دھوؤں سے تو حمل بھی گر جاتا ہے، بعض مرتبہ جنین مر بھی جاتا ہے یا اس کا وزن کم ہو جاتا ہے، بگڑی ہوئی صورت وہیئت والا بچہ پیدا ہوتا ہے، یا جنین مہلک بیماریوں کا شکار ہو کر پیدا ہوتا ہے، بہرحال جنین اور صغار یعنی دودھ پیتے بچے اور کم عمر بچوں پر تو اس کے اثرات انتہائی ہلاکت خیز ہوتے ہیں۔ (التقدم العلمی، عدد ۶۸، فروری، ۲۰۱۰ء)۔

یہ ہے سگریٹ نوشی وغیرہ کے نقصانات۔ (ماخوذ از ماہنامہ الفاروق ص ۵۶، ۵۷، ذوالحجہ ۱۴۳۱ھ، طب وصحت، سگریٹ نوشی موت کی طرف پیش قدمی، از مولانا حذیفہ وستانوی)۔

حدیث شریف میں ہے:" **لا ضرر ولا ضرار**". (رواه ابن ماجة والدارقطني عن ابي سعيد الخدري، وابن عباس و عبادة بن الصامت ﷺ مسنداً ومالك في المؤطا مرسلاً) جس کے ایک معنی یہ ہے: **لاضرر ابتداءً ولا ضرر للغير انتقاماً وانتصاراً، فمن ذبح شاتك فلا تذبح شاته بل خذ منه القيمة**۔ اور دوسرے معنی یہ ہے: **لاضرر أي لاتنقص حق الغير ولاضرار أي لاتدخل ضرراً زائداً في المجازات**. اور تیسرے معنی یہ ہے: **لاضرر لنفسك ولاضرار للغير**. یہ تیسرے معنی یہاں مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**ولاتقتلوا أنفسكم**﴾۔ (سورة النساء، الآية: ۲۹)۔ اپنے آپ کو قتل مت کرو، معلوم ہوا ہلاکت کے اسباب اختیار کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿ **ولاتلقوا بأيديكم إلى التهلكة**﴾۔ (سورة البقرة، الآية: ۱۹۵)۔

(۳) تیسری خرابی یہ ہے کہ اس کی بدبو مضر اور قابل نفرت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ **ويحرم عليهم الخبائث**﴾ (سورة الاعراف، الآية: ۱۵۷)۔ اس کا خبیث ہونا چونکہ یقینی نہیں ہے اس لیے حرام تو نہیں لیکن کراہت سے خالی بھی نہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مسکر یا مفتر ہے اس لیے ناجائز ہے لیکن محققین علماء کو اس کے مسکر اور مفتر ہونے میں شبہ ہے وہ فرماتے ہیں: " **الإسكار غيبوبة العقل مع حركة الأعضاء والتخدير غيبوبة العقل مع فتور الأعضاء** " اسکار عقل کا خراب ہونا جب کہ اعضاء حرکت کرتے ہوں اور تخدیر عقل کا غائب

ہونا جب کہ اعضاء سست اور ساکت و بھاری ہوں، لیکن ڈاکٹروں نے اس کو سانس کی نالیوں، معدہ اور پھیپھڑوں کے کینسر کا سبب قرار دیا ہے گردے اور کلیجے کے لیے نقصان دہ اور دل کے امراض اور بینائی کی کمزوری کا سبب بتایا ہے، جیسا کہ گزر گیا۔

حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحبؒ لکھتے ہیں: کراہت تحریمی ہو یا تنزیہی بہرحال قابل ترک ہے اس کی عادت نہ ہونی چاہئے، اس کی کثرت اسراف و موجب گناہ ہے جو لوگ ہر وقت اس کے عادی ہیں، ان کے منہ ہمیشہ بدبودار رہتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت نفرت تھی۔ (فتاوی رحیمیہ، کتاب الحظر والاباحہ، ۲/۲۴۲)۔

حضرت مولانا عبد الوحید مکی نے سگریٹ کی ممانعت میں رسالہ لکھا ہے اس کے آخر میں حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری مدنی سابق مفتی دار العلوم کراچی کی تقریظ کے بعض الفاظ یہ ہیں:

لیکن حالاتِ حاضرہ میں جب کہ سگریٹ کی مضرتیں واضح ہو چکی ہیں ڈاکٹروں نے ان کا اقرار کیا ہے ان مضرتوں کے ہوتے ہوئے اور جانتے ہوئے اب تو اصحابِ افتاء حرمت کا فتویٰ دینے کی ہمت کر سکتے ہیں، امت کو اس کی بدبو سے اور مضرتوں سے اور اس سلسلے میں اسراف وتبذیر سے بچانا لازمی ہے، تمام حضرات غور فرمالیں، سگریٹ نوشی کے اضرار کی وجہ سے اب تو حرمت کا فتویٰ دینے میں تامل نہیں رہا، انتہی۔

حضرت مولانا کا حرمت کا فتویٰ تو بندہ فقیر کی سمجھ میں نہیں آتا تاہم میرے خیال میں کراہت کا فتویٰ مناسب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تجارت مکروہ ہے، تاہم آمدنی حلال ہے۔ ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وصح بيع غير الخمر ومفاده صحة بيع الحشيشة والأفيون. وفي الشامية: قوله وصح بيع غير الخمر أي عنده خلافاً لهمافي البيع والضمان، لكن الفتوىٰ على قوله في البيع وعلى قولهما في الضمان... قوله ومفاده أي مفاد التقييد بغير الخمر ولاشک في ذلک لأنهما دون الخمر وليسافوق الأشربة المحرمة فصحة بيعهايفيدصحة بيعهما فافهم. (الدر المختار مع ردالمحتار: ٦/٤٥٤، كتاب الأشربة، سعيد).

وفي الشامية: نظمه الشرنبلالي في شرحه على الوهبانية بقوله ويمنع من بيع الدخان وشربه وشاربه في الصوم لاشک يفطر. (فتاوى الشامي: ٢/٣٩٥، باب مايفسد الصوم

ومالایفسده،سعید).

وفي الدرالمختار: قال شيخناالنجم: والتتن الذي حدث وكان حدوثه بدمشق في سنة خمسة عشر بعد الألف يدعي شاربه أنه لا يسكر وإن سلم له فإنه مفتر، وفي الشامية:قوله والتتن، أقول: قد اضطربت آراء العلماء فيه فبعضهم قال بكراهته، وبعضهم قال بحرمته، وبعضهم بإباحته، وأفردوه بالتاليف، وفي شرح الوهبانية للشرنبلالي: ويمنع من بيع الدخان وشربه... (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/٤٥٩،كتاب الاشربة۔وكذافي حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح،ص٦٦٥،قدیمی).

کفایت المفتی میں ہے:

سگریٹ اور تمباکو کی تجارت جائز ہے اوراس کا نفع استعمال میں لانا حلال ہے۔(کفایت المفتی:۹/۱۴۸).

احسن الفتاوی میں ہے:

سگریٹ کی تجارت جائز ہے۔(احسن الفتاویٰ:۶/۴۹۵).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

سگریٹ، بیڑی گٹکا صحت کے لیے مضر ہے،اس لیے کم از کم کراہت سے خالی نہیں۔(کتاب الفتاویٰ: ۵/۲۰۲). واللہ ﷻ اعلم۔

تابوت(Coffin) کی بیع کا حکم:

سوال: تابوت کی تجارت جائز ہے یانہیں؟اورغیرمسلم کوفروخت کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: تابوت کا استعمال اگرچہ عام حالات میں مسلمان میت کے لیے مکروہ اور نامناسب ہے اور بوقتِ ضرورت جائز ودرست ہے،لیکن کفار چونکہ مکلّف بالفروع نہیں ہیں اس لیے کافروں کے ہاتھ فروخت کرنے کی گنجائش ہے اوراس کی تجارت جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہومبسوط میں ہے:

وكان الشيخ الإمام أبوبكرمحمد بن الفضل يقول: لابأس به في ديارنا لرخاوة الأرض وكان يجوز استعمال رفوف الخشب واتخاذ التابوت للميت حتى قالوا لو اتخذوا

تابوتاً من حديد لم أربه بأساً في هذه الديار. (المبسوط للامام السرخسیؒ،۲/٦٢،باب غسل الميت۔وكذا فی بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع:١/٣١٨،فصل فی الدفن،سعيد).

وفي تبيين الحقائق: وإذاكانت الأرض رخوة فلا بأس بالشق واتخاذ التابوت من حجر أوحديد ويفرش فيه التراب. (تبيين الحقائق:١/٢٤٥،باب الجنائز، ملتان).

وفي الدرالمختار: ولابأس باتخاذ تابوت ولومن حجرأوحديد له عند الحاجة كرخاوة الأرض.وفي الشامية: قال في الحلية عن الغاية: ويكون التابوت من رأس المال إذا كانت الأرض رخوة أو ندية مع كون التابوت في غيرها مكروهاً في قول العلماء قاطبة ... (قوله له) أي للميت كما في البحرأوللرجل، ومفهومه أنه لابأس به للمرأة مطلقاً، وبه صرح في شرح المنية فقال: وفي المحيط واستحسن مشايخنااتخاذ التابوت للنساء يعني ولولم تكن الأرض رخوة فإنه أقرب إلى السترو التحرزعن مسهاعندالوضع في القبر. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٢/٢٣٤،مطلب في دفن الميت،سعيد).

وفي الدرالمختار: والحاصل أن جوازالبيع يدور مع حل الانتفاع. (الدرالمختار: ٥/٦٩، سعيد).

حلال وحرام میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

خرید وفروخت کے جائز ہونے اور نہ ہونے کا خاص تعلق کسی چیز کے قابل انتفاع ہونے اور نہ ہونے سے بھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی خرید وفروخت کی ممانعت کتاب وسنت سے صراحۃً نہ ثابت ہو اور وہ کسی دور میں اس لائق ہو جائے کہ اس سے نفع اٹھایا جا سکے تو فقہاء اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ (حلال وحرام،ص ۳۵۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ٹائی فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ٹائی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کا کیا حکم ہے؟

الجواب: ٹائی کفار وفساق کے استعمال کی چیز ہے، اس کی تجارت مکروہ ہے، اس کے فروخت کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے، البتہ حاصل شدہ آمدنی کو حرام نہیں کہا جائیگا۔

ملاحظہ ہو ردالمحتار میں ہے:

وفي المحيط : لايكره بيع الزنانيرمن النصراني والقلنسوة من المجوسي لأن ذلك إذلال لهما وبيع المكعب المفضض للرجل إن ليلبسه يكره، لأنه إعانة على لبس الحرام وإن كان إسكافاً أمره إنسان أن يتخذ له خفاً على زي المجوس أو الفسقة أوخياطاً أمره أن يتخذ له ثوباً على زي الفساق يكره له أن يفعل لأنه سبب التشبه بالمجوس و الفسقة.

(ردالمحتار:٦/٣٩٢،فصل في البيع،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ٹائی ایک وقت میں نصاریٰ کا شعار تھا، اس وقت اس کا حکم بھی سخت تھا، اب غیر نصاریٰ بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں، اب اس کے حکم میں تخفیف ہے، اس کو شرک یا حرام نہیں کہا جائیگا، کراہت سے اب بھی خالی نہیں، کہیں کراہت شدید ہوگی، کہیں ہلکی، جہاں اس کا استعمال عام ہوجائے وہاں اس کے منع پر زور نہیں دیا جائیگا۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۹/۲۸۹،مبوب ومرتب)۔

البتہ بعض حضرات نے عیسائیوں کا مذہبی شعار بتلا کر اسے ناجائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ محمودیہ کی تعلیق وحاشیہ میں مرقوم ہے:

ٹائی کا استعمال اگرچہ مسلمانوں میں بھی عام ہوگیا ہے مگر اس کے باوجود انگریزی لباس کا حصہ ہی ہے، اگر انگریزی لباس تصور نہ کیا جائے، لیکن فساق وفجار کا لباس تو بہر حال ہے، لہذا تشبہ بالفساق کی وجہ سے ممنوع قرار دیا جائیگا، دوسری بات یہ ہے کہ اہل صلاح اس لباس کو پسند بھی نہیں کرتے، کیونکہ یہ علماء وصلحاء کے لباس کے خلاف ہے، تیسری بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ ٹائی میں ایک اور خرابی یہ بھی ہے کہ عیسائی اس سے اپنے عقیدہ ''صلیب عیسیٰ علیہ السلام'' یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ نص قرآنی کے خلاف ہے، لہذا تشبہ بالکفار کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے مذہبی یادگار اور مذہبی شعار ہونے کی وجہ سے بھی پہننا جائز نہیں: (البتہ بعض علماء کو اس کے صلیبی نشانی اور مذہبی شعار ہونے میں کلام ہے۔)

وعن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''من تشبه بقوم'' أي من شبه نفسه بالكفار مثلاً في اللباس وغيره أوبالفساق أو الفجار أوبأهل التصوف والصلحاء الأبرار، ''فهومنهم'' في الإثم والخير، قال الطيبيّ : هذا عام في الخَلق

والخُلق والشعار ولما كان الشعار أظهر في التشبه... (مرقاة المفاتيح، كتاب اللباس، ۱۵۵/۷، رشيدية).

(مستفاد از حاشیہ فتاوی محمودیہ: ۲۸۹/۱۹، مبوب ومرتب).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

سوال: ہندوؤں کا ایک تہوار ''رکھشا بندھن'' آتا ہے، جس میں بہن اپنے بھائی کو راکھی باندھتی ہے تو اس تہوار کے موقعہ پر راکھی بیچنا کیسا ہے؟

راکھی بیچنا گویا کافروں کی مذہبی رسم میں تعاون کرنا ہے اس سے بچنا ہی چاہئے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۲۰۶/۹).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

شریعتِ اسلامیہ کے نزدیک یہ کفار کا شعار کچھ اعزاز کی چیز نہیں، بلکہ وضع کے اعتبار سے اس میں ان کی تذلیل ہے، تاہم ایسی تجارت سے اجتناب واحتیاط بہتر ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۳۸/۱۶، مبوب ومرتب).

خلاصہ یہ ہے کہ ٹائی کی تجارت کراہت سے خالی نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، تاہم اس سے حاصل شدہ آمدنی حرام نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گڑیوں (dolls) کی تجارت کا حکم:

سوال: گڑیوں کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: گڑیوں کی خرید وفرخت کرنا جب کہ ان میں سر، آنکھ، کان، ناک وغیرہ اعضاء واضح موجود ہوں جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

اشترى ثوراً أوفرساً من خزف لأجل استئناس الصبي لايصح ولاقيمة له.

(الدر المختار: ۲۲۶/۵، سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

اشترى ثوراً أوفرساً من خزف لاستئناس الصبي لايصح ولاقيمة له ولايضمن متلفه كذا في القنية. (الفتاوى الهندية: ۱۱۵/۳).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

گڑیا کی یا کسی اور کھلونے کی شکل وصورت جاندار کی نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، جاندار کی صورت بنانا اور گھر میں رکھنا منع ہے بچوں کے لیے بھی نہ رکھیں ایسی صورتوں کی تجارت بھی نہ کریں۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۹/۵۰۳، مبوب و مرتب)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

مٹی، کپڑے، پلاسٹک وغیرہ سے گڑیا بنانا اور اس کی خرید وفروخت کرنا جب کہ اس میں سر آنکھ کان ناک وغیرہ موجود ہو سب ناجائز ہے۔ (ایضاح المسائل، ص ۱۵۷، نعیمیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاوی رحیمیہ: ۹/۲۰۴)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

موجودہ زمانے کی (تصویری) گڑیوں کے جواز پر حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (جو مشکوٰۃ المصابیح جلد دوم، ۲۸۰ پر ہے) سے استدلال کرنا درست نہیں، کیونکہ اس میں کئی احتمالات ہیں، چنانچہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: **ويحتمل أن يكون مخصوصاً من أحاديث النهي عن اتخاذ الصور، لما ذكر من المصلحة ويحتمل أن يكون قضية عائشة رضي الله تعالىٰ عنها هذه في أول الهجرة قبل تحريم الصورة.** (مرقاة المفاتيح: ٦/٢٠٦، امدادیہ)۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۹/۵۰۱، مبوب ومرتب)۔

مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں ہے:

والمراد ههنا ما يلعب به الصبية من الخرق والرقع ولم يكن لها صور مشخصة كالتصاوير المحرمة. (حاشية مشكوٰة شريف: ٢/٢٨٢، باب عشرة النساء)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ کے گڑیا سے کھیلنے کا جو ذکر حدیث شریف میں آیا ہے وہ جاندار کی تصویر اور مجسمہ کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، جب حرمت کا حکم نازل ہوگیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے گڑیوں کو ختم کردیا تھا، نیز ان کی گڑیا میں سر بھی نہیں تھا، اور حرمت کا حکم سر ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (ایضاح المسائل، ص ۱۵۷، نعیمیہ)۔

عمدۃ القاری میں ہے:

وجزم ابن الجوزي بأن الرخصة لعائشة رضي الله تعالىٰ عنها في ذلك كان قبل

التحريم. (عمدة القاري:١٥/٢٦٤،باب الانبساط الى الناس، ملتان). **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر شرعی لباس کی تجارت کا حکم:

سوال: عورتوں کے غیر شرعی لباس جس میں بازو وغیرہ کھلے ہوں ان کی تجارت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسے لباس کی تجارت جائز اور درست ہے، البتہ اجتناب اولیٰ اور بہتر ہے۔

ملاحظہ ہو رد المحتار میں ہے:

وفي المحيط : لايكره بيع الزنانيرمن النصراني والقلنسوة من المجوسي لأن ذلك إذلال لهما وبيع المكعب المفضض للرجل إن ليلبسه يكره، لأنه إعانة على لبس الحرام وإن كان إسكافاً أمره إنسان أن يتخذ له خفاً على زي المجوس أو الفسقة أوخياطاً أمره أن يتخذ له ثوباً على زي الفساق يكره له أن يفعل لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة.

(ردالمحتار:٦/٣٩٢،فصل في البيع،سعيد).

عالمگیری میں ہے:

بيع الزنار من النصارى والقلنسوة من المجوس لايكره. (الفتاوى الهندية:٣/٢١٠).

فقہی مقالات میں ہے:

اگر کوئی چیز یا لباس ایسا ہے جس کا جائز استعمال بھی ہوسکتا ہے، اور ناجائز استعمال بھی ہوسکتا ہے تو ایسے لباس اور ایسی چیز کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے، اب اگر کوئی اس کو خرید کر اس کا ناجائز استعمال کرتا ہے تو یہ اس کا گناہ اس خریدار پر ہوگا۔ (فقہی مقالات:۳/۱۰۰).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

ایسا کپڑا فروخت کرنا درست ہے...تاہم ایسی تجارت سے اجتناب واحتیاط بہتر ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۶/۱۳۸،مبوب ومرتب).

محمود الفتاوی میں ہے:

سوال: اگر کوئی مسلمان درزی، ہندوؤں کے غیر شرعی کپڑے بناتا ہے تو ایسے کپڑے سینے کی اجرت لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: درست ہے البتہ احتیاط اولیٰ ہے۔ (محمود الفتاوی: ۸۲/۳).

کتاب الفتاوی میں ہے:

اس طرح کے ملبوسات کا غیر محرم کے سامنے استعمال کرنا جائز نہیں، لیکن بعض ملبوسات جن میں آستین پوری نہیں ہوتی محرم کے سامنے استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اور شوہر کے ساتھ خلوت میں ہر طرح کا لباس استعمال کیا جا سکتا ہے، لہٰذا چونکہ فروخت کنندہ ایسے مقصد یا تلقین کے ساتھ نہیں فروخت کرتا کہ غیر محرموں کے سامنے بے حجابی روا رکھتے ہوئے ان کا استعمال کیا جائے اور فی الجملہ بعض حالات میں خواتین کے لیے ان کے استعمال کی گنجائش ہے، اس لیے اس کا اس طرح کے ملبوسات فروخت کرنا جائز ہوگا، البتہ نادرست ارادہ سے خرید کرنے والے اور خرید کر استعمال کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ (کتاب الفتاوی: ۲۷۱/۵). واللہ ﷻ اعلم۔

تمباکو کی کاشت اور اس کی تجارت کا حکم:

سوال: تمباکو کی کاشت اور اس کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تمباکو کی کاشت اور اس کی تجارت جائز ہے، اگر چہ تمباکو سگریٹ میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن سگریٹ کی حرمت مسلم نہیں ہے، نیز غیر مسلم زیادہ پیتے ہیں، البتہ اجتناب اولیٰ اور بہتر ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

قلت: فيفهم منه " القاعدة: الأصل الإباحة "حكم النبات الذي شاع في زماننا المسمى بالتتن ، فتنبه، وقد كرهه شيخنا العمادي في هديته إلحاقاً له بالثوم والبصل بالأولىٰ فتدبر، وفي ردالمحتار: قوله فيفهم منه حكم النبات "وهو الإباحة على المختارأو التوقف وفيه إشارة إلى عدم تسليم إسكاره وتفتيره وإضراره ، وإلا لم يصح إدخاله تحت القاعدة المذكورة و لذا أمر بالتنبه. قوله وقد كرهه شيخنا العمادي في هديته ، أقول: ظاهر كلام العمادي أنه مكروه تحريماً ويفسق متعاطيه...ورد عليه سيدنا عبدالغني في شرح الهدية..فقول الشارح إلحاقاً له بالثوم والبصل فيه نظر، إذ لايناسب كلام العمادي، نعم إلحاقه بما ذكر هوالإنصاف، قال أبوالسعود: فتكون الكراهة تنزيهية، والمكروه تنزيهاً يجامع الإباحة، وقال ط: ويوخذ منه كراهة التحريم في المسجد للنهي الوارد في الثوم

والبصل وهو ملحق بهما، والظاهر كراهة تعاطيه حال القراءة لما فيه من الإخلال بتعظيم كتاب الله تعالىٰ. (الدر المختار مع رد المحتار:٦/ ٤٦٠، ٤٦١، كتاب الاشربة، سعيد).

وفي الدر المختار: وصح بيع غير الخمر ومفاده صحة بيع الحشيشة والأفيون، وفي الشامية: قوله ومفاده أي مفاد التقييد بغير الخمر، ولاشک في ذلک لأنهما دون الخمر وليسا فوق الأشربة المحرمة، فصحة بيعهايفيد صحة بيعهما فافهم. (الدر المختار مع رد المحتار:٦/ ٤٥٤، كتاب الاشربة، سعيد).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

تمبا کو خوردنی اور نوشیدنی کی تجارت جائز ہے مگر اولیٰ نہیں ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ:۴۰۱).

کفایت المفتی میں ہے:

تمبا کو کی تجارت جائز ہے اور اس کا نفع استعمال میں لانا حلال ہے۔ (کفایت المفتی:۹/ ۱۴۸).

کتاب الفتاوی میں ہے:

تمبا کو کے سلسلہ میں معتدل اور درست رائے یہ ہے کہ اس کا کھانا مکروہ ہے اور جو چیز خود مکروہ ہو اس کو فروخت کرنا بھی مکروہ ہے، اس لیے تمبا کو فروشی حرام تو نہیں ہے لیکن کراہت سے بھی خالی نہیں ہے۔ (کتاب الفتاوی:۵/ ۲۰۳).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

تمبا کو کی کاشت بھی جائز ہے، تجارت بھی جائز ہے استعمال بھی جائز ہے، الا یہ کہ وہ نشہ آور ہو تب منع کیا جائیگا، مسجد میں جانے کے لیے منہ صاف کر کے اس کی بدبو کو زائل کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ (فتاوی محمودیہ: ۲۴/ ۱۶۲، مکتبہ محمودیہ).

معلم الفقہ میں ہے:

سوال: کھانے اور پینے کی تمبا کو کی تجارت بغرض حصول منفعت وفراغت معاش کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: درست ہے علامہ ابراہیم بن حسین رحمہما اللہ تعالیٰ الشہیر بہ بیری زادہ حنفی مکی اپنے رسالہ "دفع الالتباک في حكم تعاطي شجرة التنباک" میں لکھتے ہیں: "**أما بيعها وشراؤها فيجوز لإمكان الانتفاع بها في غير الشرب بدليل تقييد الأصحاب عدم الجواز في مثلها بما لاينتفع به**"۔ یعنی تمبا کو کی بیع وشراء

جائز ہے کیونکہ پینے کے علاوہ دوسرے منافع بھی اس سے حاصل کیے جاتے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ عدم جواز کے واسطے یہ قید ہے کہ اس چیز سے نفع نہ اٹھایا جا سکے۔(معلم الفقہ ترجمہ اردو مجموعۃ الفتاوی:۲/۱۴۲).

دوسری جگہ مرقوم ہے: تمباکو کی تجارت درست ہے مگر چونکہ حقہ کے جواز میں اختلاف ہے اور اکثر اس کو مکروہ کہتے ہیں اس لیے پینے کی تمباکو کی تجارت سے پرہیز چاہئے۔(معلم الفقہ:۲/۱۴۰).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

بیع کے بارے میں اصول یہ ہے کہ جس شئی کا کوئی جائز استعمال ممکن ہو اس کی بیع جائز ہے چاہے وہ چیز عام طور سے ناجائز کام میں استعمال ہوتی ہو۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل،۴/۱۷). واللہ ﷻ اعلم۔

بلیک مارکیٹ کرنے کا حکم:

سوال: حکومت سے چوری چھپے بیرون ممالک کا سامان بیچنا جس کو ہمارے یہاں ''اسمگلنگ'' اور بلیک مارکیٹ (دونمبر کا دھندا) کہتے ہیں، ایسی تجارت جائز ہے نہیں؟ اور ایسے لوگوں کے ساتھ خرید وفروخت کا معاملہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: ہر مسلمان کے لیے عزت نفس سب سے مقدم چیز ہے اور خلافِ قانون مال بیچنے میں حکومت کی طرف سے ذلتی کا اندیشہ ہے اس وجہ سے اس قسم کی تجارت سے پرہیز کرنا چاہئے اگرچہ فی نفسہ تجارت مع الکراہت جائز ہے، ہاں اگر اس میں دھوکہ اور جھوٹ بھی شامل ہو تو پھر بالکل ناجائز ہوگی۔

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

اگر وہ مال نجس، ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے خریدا ہو تو اس کی تجارت فی نفسہ حلال ہے، لیکن چونکہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے اس لیے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے۔(فتاوی رحیمیہ:۹/۲۲۲).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جو شخص جو سامان خریدے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اس کو اپنے سامان کا حق ہو جاتا ہے کہ خود استعمال کرے یا کسی کو ہبہ کردے یا فروخت کرے، اور پھر اس سے خریدنے والے کو اس کا استعمال جائز ہوتا ہے، کیونکہ وہ مالک ہو گیا، لیکن آدمی جب کسی حکومت کے ماتحت رہتا ہے تو اس کے قانون کی پابندی قانوناً لازم ہوتی ہے،

اس کے خلاف کرنا قانونی چوری ہے، جس سے عزت و مال دونوں کا خطرہ ہوتا ہے، اپنی عزت و مال کو خطرہ میں ڈالنا دانشمندی نہیں ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۱۴۸، مبوب و مرتب).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

سمگلنگ کے معاملہ کی حقیقت یہی ہے کہ باہر ممالک سے مال لے کر آنا یا باہر ممالک مال لے کر جانا حلال مال ہو شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے، اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، رشوت دینی پڑتی ہے، جان مال یا عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، جس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا گیا ہے اور بسا اوقات جسمانی تکلیف اور قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس لیے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہئے اور ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہئے تاہم اسمگل ہو کر آنے والی حلال و مباح چیزوں کی خرید و فروخت جائز ہے اور ان کو اپنے استعمال میں لانا درست ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۰۵).

واللہ ﷻ اعلم۔

پٹاخوں (fireworks) کی تجارت کا حکم:

سوال: پٹاخوں کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ مشتری اس کو خرید کر اسراف و ضیاع مال کرے گا، اور فضول خرچی و اسراف از روئے شرع حرام اور ناجائز ہے۔ بینوا بالتفصیل توجروا باجر جزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اسراف اور فضول خرچی حرام اور گناہِ کبیرہ ہے اس سے بچنا اور توبہ کرنا لازم اور ضروری ہے، اور پٹاخوں کی تجارت مکروہ ہے نفس تجارت میں تضییع مال اور اسراف نہیں ہے بلکہ مشتری خرید کر اس کا استعمال غلط کرے گا، اور شریعتِ مطہرہ کا اصول و قاعدہ یہ ہے کہ حکم کی نسبت مباشر کی طرف ہوتی ہے متسبب کی طرف نہیں ہوتی، اور تاجر صرف سبب کے درجہ میں ہے، لہذا معصیت کا بار مشتری مباشر پر ہوگا، نیز خریدار بھی عام طور پر غیر مسلم ہندو ہوتے ہیں جو کہ فروعی احکام کے مخاطب نہیں ہیں، اس لیے اس قسم کی تجارت کو حرام یا ناجائز نہیں کہہ سکتے، تاہم اجتناب اولیٰ اور بہتر ہے۔

لیکن پٹاخوں کی تجارت میں آج کل بہت مفاسد اور خرابیاں ہیں:۔ مثلاً:

(۱) بے فائدہ مال ضائع کرنا اور مال ضائع کرنے میں مسلم وغیر مسلم سب شریک ہیں پاکستان میں عیدین کے موقع پر مسلمان یہ کام کرتے ہیں، اور ہندوستان میں ہندوؤں کے تہوار کے موقع پر ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمان یہ کام کرتے ہیں، جواورزیادہ خطرناک ہے۔

(۲) پوری فضا بارود کی بدبواور برے اثرات سے ملوث ہوجاتی ہے۔

(۳) اکثر حکومتیں اس کی اجازت بھی نہیں دیتیں، اکثر جگہوں میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کرنی پڑتی ہے، اور پولس کے ساتھ سازباز رکھنا پڑتا ہے۔

(۴) پٹاخون سے لوگوں کا آرام اور نیند حرام ہوجاتی ہے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اس لیے اس کی تجارت سے بالکل اجتناب کرنا چاہئے اگرچہ اس کی آمدنی کو حرام نہیں کہا جاسکتا۔

(۵) جانوروں کو بھی سخت تکلیف ہوتی ہے، کبھی کبھی پاگل بھی ہوجاتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں شرح مجلّہ میں ہے:

قد علمت أن من شروط ضمان المتسبب أن لايحل بين السبب والتلف فعل فاعل مختار، واشترط محمدٌ أن يكون ذا عقل.

لوفعل أحد فعلاً يكون سبباً لتلف شيء ثم حال بين ذلک الفعل وبين التلف فعل اختياري يعني لو باشر إتلاف ذلک الشيء شخص آخريكون ذلک الفاعل المباشرالذي هو صاحب الفعل الاختياري ضامناً .

إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضيف الحكم إلى الباشر. (شرح المجلة للاتاسی، المادة:۹۲۲، ۹۲۵، ۱/۴۶۷_۴۷۴).

شرح القواعد الفقہیہ میں ہے:

إن الفاعل هو العلة المؤثرة ، والأصل فى الأحكام أن تضاف إلى عللها المؤثرة لا إلى أسبابها الموصلة ، لأن تلک أقوىٰ وأقرب، إذ المتسبب هوالذي يتخلل بين فعله والأثرالمترتب عليه، من تلف أوغيره فعل فاعل مختاروالمباشرهوالذي يحصل الأثربفعله من غير أن يتخلل بينهمافعل فاعل مختار، فكان أقرب لإضافة الحكم إليه من المتسبب، قال الرملي في حاشيته على جامع الفصولين (فی الفصل ۳۳صفحة۱۲۴) **: إذا اجتمع المباشر**

والمتسبب فالمباشر مقدم كالعلة ، وعلة العلة والحكم يضاف إلى العلة لا إلى علة العلة.
(شرح القواعد الفقهية: ٤٤٧، المادة، ٩٠، دمشق).

شمس الدین قاضی زادہ صاحب ہدایہ کی عبارت "من آجر بيتاً ليتخذ فيه بيت نار أو يباع فيه الخمر" کے تحت فرماتے ہیں: إنما صحت عند أبي حنيفة لتخلل فعل فاعل مختار ولأن خطاب التحريم غير نازل في حقه. (نتائج الافكار، تكملة فتح القدير: ١٠/ ٦٠، دار الفكر).

علامہ شامی فرماتے ہیں:

وعلم من هذا أنه لايكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف. (فتاوی شامی: ٦/ ٣٩١، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع، سعيد).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

شریعت کے فروعی احکام کے مخاطب مسلمان ہیں نہ کہ غیر مسلم اوران اشیاء کوزیادہ تر غیر مسلم حضرات ہی خریدتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کے لیے پٹاخوں کے کاروبار کی گنجائش ہے، لیکن بچنا بہتر ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲۰۴/۵).

مزید ملاحظہ ہو: (امداد الفتاویٰ: ۳۲۲/۴، بعنوان "اعانت علی المعصیۃ کی چند جزئیات"۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

چوری کا مال خریدنے کا حکم:

سوال: کسی دکان کے بارے میں یقین یا ظن غالب ہے کہ وہاں چوری کا مال بکتا ہے تو ایسی دکان سے مال خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ یا کسی شخص کے پاس چوری کا مال ہو تو اس کو دوسرا شخص خرید سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر یقین یا ظن غالب ہے کہ چوری کا مال فروخت کرتے ہیں تو ان سے خریدنا ناجائز ہے، کیونکہ ایسا مال اصل مالک کو لوٹانا لازم اور ضروری ہے۔

ملاحظہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

حدثنا وكيع قال: حدثنا سفيان،عن مصعب بن محمد،عن رجل من أهل المدينة قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: ”من اشترى سرقة،وهو يعلم أنها سرقة فقد شرك في عارها وإثمها.

قال الشيخ محمد عوامة: مصعب بن محمد بن عبد الرحمن العبدري،لابأس به، روى عن أمامة وغيره، لكن شيخه لم يسم ، فالإسناد ضعيف به، والحديث عزاه في المطالب العالية (١٣٤٦) واتحاف الخيرة(٣٦٤٢) إلى ابن عمر ﷺ بمثل إسناد المصنفؒ، وإلى أحمد بن منيع، عن قبيصة عن سفيان، عن مصعب بن ميناء ، عن شيخ من الأنصار وزاد البوصيري في مختصر اتحاف السادة المهرة (٣٢٤٨) عزوه إلى الطبراني أي: مرسلاً، قلت : ذكرذلک البيهقي في سننه الكبرى (٣٣٦/٥) ورواه الحاكم (٣٥/٢) وعنه البيهقي (٣٣٥/٥) من طريق مسلم بن خالد الزنجي، عن مصعب بن محمد المدني، عن شرحبيل و قال المنذرى فى ”الترغيب“(٥٤٨/٢) بعد ماعزاه للبيهقي فقط”إسناده محتمل للتحسين ويشبه أن يكون موقوفاً“ وهو عند البيهقي في ”الشعب“ (٥٥٠٠-٥١١٢) من وجه آخرعن الزنجي به. (مصنف ابن ابی شیبۃ مع التعلیق،١١/٣٣٧،رقم الحدیث ٢٢٤٩٥،باب من کرہ شراء السرقة، المجلس العلمی)۔

حدیث بالا کا ترجمہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جانتے ہوئے چوری شدہ مال خریدا وہ بھی چور کے ساتھ اس کے گناہ اور عار میں شریک ہوگا۔

اگر کسی شخص نے غلط فہمی میں مال خریدا تو حقیقت واضح ہونے کے بعد وہ مال اصل مالک کو واپس کیا جائے اور ادا کردہ قیمت بائع (چور، غاصب) سے واپس لی جائے۔

قال في ردالمحتار: لوظهرغيرحلال أی مسروقاً أومغصوباً يرجع عليه المشتري.

(ردالمحتار:٥/٤٢،مطلب باعه على انه كوم تراب،سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو باع السارق المسروق من إنسان أوملک منه بوجه من الوجوه فإن كان قائماً فلصاحبه أن يأخذه لأنه عين ملكه وللمأخوذ منه أن يرجع على السارق. (بدائع الصنائع:٧/٨٥، فصل فی حكم السرقة،سعيد).

درمختار میں ہے:

الحرام ينتقل، فلودخل بأمان وأخذ مال حربي بلا رضاه وأخرجه إلينا ملكه وصح بيعه لكن لايطيب له ولا للمشتري منه. وفي حاشية ابن عابدين: قوله ولا للمشتري منه. فيكون بشرائه منه مسيئاً لأنه ملكه بكسب خبيث وفي شرائطه تقرير للخبث ويؤمر بما كان يؤمر به البائع من رده على الحربي لأن وجوب الرد على البائع، إنما كان لمراعاة ملک الحربي ولأجل غدر الأمان، وهذا المعنى قائم في ملک المشتري كما في ملک البائع الذي أخرجه. (الدر المختار مع ردالمحتار:٥/٩٨، باب البيع الفاسد، سعيد).

الحلال والحرام میں یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

لم يحل للمسلم أن يشتري شيئاً يعلم أنه مغصوب أومسروق أومأخوذ من صاحبه بغير حق، قال عليه السلام من اشترى سرقة أی مسروقاً وهو يعلم أنها سرقة، فقد اشترک في ثمنها وعارها. (الحلال والحرام فی الاسلام ليوسف القرضاوی،فصل فی المعاملات،ص٢١٦).

فقہاء کے یہاں ظن غالب ملحق بالیقین ہے۔

الاشباہ والنظائر میں علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وغالب الظن عندهم ملحق باليقين وهو الذي يبتنى عليه الأحكام يعرف ذلک من تصفح كلامهم في الأبواب. (الاشباه والنظائر:٦٣، الفائدة الثانية۔ وكذا فی حاشية الطحطاوی على مراقی

الفلاح ص ٦٧٥، باب مایفسد الصوم ویوجب القضاء،قدیمی).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

سوال: چوری کا مال خریدنا درست ہے یا نہیں؟

جواب: جب چوری کا مال یقیناً معلوم ہے تو اس کا خریدنا ناجائز ہے۔(تالیفاتِ رشیدیہ،ص ۴۰۷).

کفایت المفتی میں ہے:

مشتری کو یہ علم تھا (کہ بائع چرا کر مال فروخت کرتا ہے) تو اس کو خریدنا بھی حرام تھا اور بیع وشراء دونوں ناجائز واقع ہوئیں اور مشتری کی صلاحیت اس فعل سے خراب ہوگئی اور اس مال کا نفع بھی اس کے لیے حلال نہیں۔ (کفایت المفتی:۸/۴۳).

فتاوی محمودیہ میں ہے:

جس شئی کے متعلق قرائن سے غالب خیال یہ ہو کہ یہ چوری کی ہے اس کو خریدنا درست نہیں، اگر خرید چکا ہے تو واپس کر دے، اگر مالک کا علم ہو جائے تو اس کے حوالہ کر دے پھر چاہے تو اس سے معاملہ کر کے خرید لے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۸۶،مبوب ومرتب).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

کسی مال کے متعلق قرائن سے معلوم ہو جائے کہ یہ چوری کا مال ہے یا غصب شدہ مال ہے، اس کو خریدنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اور گناہ کے کام میں تعاون کرنا شرعاً ناجائز ہے۔قولہ تعالیٰ:

﴿ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان﴾. (سورۃ المائدۃ:۲).

گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون مت کرو۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۸۲،دارالاشاعت).

جواہر الفتاویٰ میں ہے:

مال اگر موجود ہے تو اصل مالک کی طرف لوٹا دیا جائے اور اگر مال ہلاک یا ضائع ہو گیا ہے تو اس کا ضمان اور قیمت ادا کرے جب کہ وہ صاحب استطاعت ہے۔لیکن بعض دفعہ اصل مالک یا اس کے کسی وارث کا پتہ نہیں ہوتا نہ ہی کسی طرح پتہ لگانا ممکن ہوتا ہے تو ایسے موقع پر اس مال حرام کو اصل مالک کی نیت سے اور اس کی جانب سے صدقہ کر دینا واجب ہے۔(جواہر الفتاویٰ:۳/۲۸۶). واللہ ﷻ اعلم۔

بالوں کی تجارت کا حکم:

سوال: بالوں کی تجارت کا کیا حکم ہے؟ انسانی بال اور جانور کے بال میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

الجواب: انسان کے بالوں سے انتفاع ممنوع اور ناجائز ہے، کیونکہ انسان تمام اجزاء کے ساتھ مکرم ہے، لہذا انسانی بالوں کی تجارت ممنوع اور ناجائز ہے، البتہ جانور کے بالوں کی خرید وفروخت جائز ہے نیز پلاسٹک وغیرہ کے بالوں کی تجارت بھی جائز ہے، ہاں مصنوعی بال جو غیر مسلم یا فاسق فاجر مرد یا عورتیں استعمال کرتی ہیں ان کی تجارت سے اجتناب کرنا چاہئے، اسی طرح خنزیر کے بالوں کی بیع بھی ناجائز ہے، کیونکہ وہ نجس العین ہے، لہذا اہانت کی وجہ سے اس کی بیع صحیح نہیں۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولایجوز بیع شعور الإنسان ولا الانتفاع به لأن الآدمي مكرم لامبتذل فلا يجوز أن يكون شيء من أجزائه مهاناً مبتذلاً وقد قال عليه السلام لعن الله الواصلة والمستوصلة، الحديث، وإنما يرخص فيما يتخذ من الوبر فيزيد في قرون النساء وذوائبهن...قال ولايجوز بيع شعر الخنزير لأنه نجس العين فلا يجوز بيعه إهانة له. (الهداية:۳/۵۵، باب البيع الفاسد۔ وكذا في البحر الرائق: ٦/٨١، كوئٹة۔ وتبيين الحقائق: ٤/٥١، ملتان).

وفي شرح العناية : ولا بأس باتخاذ القراميل وهي مايتخذ من الوبر ليزيد في قرون النساء، أى في أصول شعرهن بالتكثير وفي ذوائبهن بالتطويل . (شرح العناية على هامش فتح القدير: ٦/٤٢٦، دار الفكر۔ وكذا فى فتح القدير: ٦/٤٢٦).

وفى الجامع الصغير: ولايجوز بيع شعر الإنسان. وفى الشرح: لأن الإنسان مكرم فلايجوز أن يكون منه شيء مبتذل وهو طاهر عندنا على الصحيح. (الجامع الصغير مع النافع الكبير، ص ٣٢٩، بيروت).

وكذا في حاشية الطحطاوي: قال والآدمى مكرم شرعاً وإن كان كافراً فايراد العقد عليه وابتذاله به وإلحاقه بالجمادات إذلال له وهو غير جائز. (حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ٣/٦٦، كوئٹه). وكذافى ردالمحتار: ٥/٥٨، مطلب ان الآدمى مكرم شرعاً ولو كافراً، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۸۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جانوروں کی خوراک کی تجارت کا حکم:

سوال: آج کل اکثر جانوروں کی خوراک ایک خاص طریقے پر تیار کی جاتی ہے اور بازاروں میں فروخت ہوتی ہے، جس میں مردہ کیڑے مکوڑے وغیرہ بھی ملائے جاتے ہیں، بظاہر یہ میتہ کی بیع ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ کھلانے کے بارے میں بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ میتہ کتے کے پاس لے جانا منع ہے لیکن کتوں کو میتہ پر چھوڑنا جائز ہے، ممنوع نہیں ہے اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں تجارت اور خرید وفروخت کا اصول یہ ہے کہ جس شئی سے انتفاع ممکن ہو اس شئی کی تجارت جائز ہے، اور جس شئی سے انتفاع ممکن نہ ہو اس کی تجارت جائز نہیں ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جانوروں کی خوراک میں جو کیڑے مکوڑے استعمال کیے جاتے ہیں، وہ دوسری اشیاء کے ساتھ ملا کر جانوروں کے کھانے کے کام آتے ہیں اس وجہ سے اس کی تجارت کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

لم يذكروا حكم دودة القرمز أما إذا كانت حية فينبغي جريان الخلاف الآتي في دود القز وبزره وبيضه وأما إذا كانت ميتة وهو الغالب فإنها على ما بلغنا تخنق في الكلس أو الخل فمقتضى ما مر بطلان بيعها بالدراهم لأنها ميتة، وقد ذكر سيدي عبد الغنى النابلسي في رسالته أن بيعها باطل، وأنه لا يضمن متلفها لأنها غير مال قلت: وفيه أنها من أعز الأموال اليوم، ويصدق عليها تعريف المال المتقدم ويحتاج إليها الناس كثيراً فى الصباغ وغيره، فينبغي جواز بيعها كبيع السرقين والعذرة المختلطة بالتراب مع أن هذه الدودة إن لم يكن لها نفس سائلة تكون ميتتها طاهرة كالذباب والبعوض وإن لم يجز أكلها وسياتي أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع، وأنه يجوز بيع العلق للحاجة مع أنه من الهوام، وبيعها باطل، وكذا بيع الحيات للتداوي، وفى القنية وبيع غير السمک من دواب البحر لو له ثمن كالسقنقور وجلود الخز ونحوها يجوز وإلا فلا، وجمل الماء قيل يجوز حياً لا ميتاً والحسن أطلق الجواز. (ردالمحتار: ۵/۵۱، باب البيع الفاسد، سعيد).

بہشتی زیور میں ہے:

مردہ ان جانوروں کی بیع درست ہے جو پاک ہیں جیسے دریائی جانور یا حشرات الارض، کیڑے مکوڑے جن میں بہتا ہوا خون نہیں۔ (بہشتی زیور، نواں حصہ ص۱۰۳، المکتبۃ المدینۃ)۔

فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مردار کو بلی، کتے کے پاس نہیں لے جانا چاہئے، بلکہ بلی، کتے کو مردار پر چھوڑنا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

ولایحمل الجیفة إلی الهرة ویحمل الهرة إلی الجیفة. (الفتاوی البزازیۃعلی هامش الهندیة: ۸۲/٤، فصل فی حکم المسجد)۔

نفع المفتی و السائل میں ہے:

ثم إن کان لابد من سقي الخمرفرساً لایشربه بل یضع الخمر بین یدیه لیشربه، کما أن لاینبغي أن یؤکل المیتة الکلب إلا بأن یضع المیتة بین یدی الکلب، فیأکله بنفسه کما فی مطالب المؤمنین. (نفع المفتی و السائل، باب مایتعلق بالحیوانات، ص٤٧٢، بیروت)۔

المحیط البرهانی میں ہے:

رجل له امرأة ذمیة أوأب ذمي لیس له أن یقوده إلی البیعة، وله أن یقوده من البیعة إلی منزله، لأن الذهاب إلی البیعة معصیة وإلی المنزل لا، ولایحمل الخمرإلی الخل ولکن یحمل الخل إلیها، وکذلک لایحمل الجیفة إلی الهرة ویحمل الهرة إلی الجیفة. (المحیط البرهانی: ۱۰۳/٦، فصل فی معاملة اهل الذمة، کتاب الاستحسان، رشیدیة)۔

لیکن بعض فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناپاک پانی جانوروں کو پلا سکتے ہیں۔

البحر الرائق میں ہے:

وفی الذخیرة: ولا بأس برش الماء النجس فی الطریق ولایسقی للبهائم وفي خزانة الفتاوی: ولا بأس بأن یسقی الماء النجس للبقر والإبل والغنم. (البحر الرائق: ۱۲۵/۱، کوئٹه)۔

ضرورت کی وجہ سے دوسرے قول پر فتویٰ دے سکتے ہیں پہلا قول کراہت یعنی خلاف اولیٰ پر محمول ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

تولیدی جوہر کی تجارت کا حکم:

سوال: موجودہ زمانے میں اچھی نسلوں والے نر جانوروں کا مادۂ منویہ بازار میں فروخت ہوتا ہے لوگ اس کو خریدتے ہیں، اور اپنے مادہ جانوروں میں مخصوص طریقہ سے پہنچاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اچھی نسل والا جانور حاصل ہوتا ہے، کیا اس طرح مادۂ منویہ کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے بنی نوع انسانی کو نسب کے شرف سے نوازا ہے اور اس کو بڑی اہمیت بخشی ہے، اختلاط نسب سے مکمل طور پر بچایا ہے، لیکن حیوانات میں نسب کے لحاظ کو اہمیت نہیں دی، بایں وجہ جانوروں کی حلت وحرمت کے مسئلہ میں ماں کو اصل قرار دیا ہے، بنابریں تولیدی جوہر مادہ جانور کے رحم میں پہنچا کر جودۃ نسل اور افزائش نسل کے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا فی نفسہ مباح اور ایک جائز انتفاع ہے اور ایک گونہ اس کی حاجت بھی ہے، نیز اس کا عرف ہوگیا ہے آج کل وسیع پیمانے پر اس کی خرید وفروخت ہوتی ہے، لہٰذا مال متقوم کی حیثیت اختیار کر لینے کی وجہ سے اس کی تجارت کی گنجائش نکلتی ہے۔

نیز شریعتِ مطہرہ میں تجارت کے لیے مبیع کا مال متقوم اور قابل انتفاع ہونا اولین شرائط میں ہے۔ اور مال متقوم قابل انتفاع ہونے کے لیے پہلی چیز عرف وعادت ہے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

وشرط المعقود عليه ستة، كونه موجوداً، مالاًمتقوماً مملوكاً في نفسه وكون الملك للبائع فيمايبيعه لنفسه وكونه مقدور التسليم. (شرح المجلة للاتاسی، الباب الثانی، ۲/۸۷).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما الذي يرجع إلى المعقود عليه فأنواع منها أن يكون موجوداً فلا ينعقد بيع المعدوم...ومنها أن يكون مالا لأن البيع مبادلة المال بالمال...ومنها أن يكون مملوكاً لأن البيع تمليك فلا ينعقد فيما ليس بمملوك. (بدائع الصنائع: ۵/۱۳۸، سعید).

الفقه الإسلامی میں ہے:

وأما ما يشترط فى المعقود عليه أى المبيع فهو أربعة شروط: (۱) أن يكون المبيع موجوداً (۲) أن يكون المبيع مالامتقوماً (۳) أن يكون مملوكاً في نفسه (۴) أن يكون مقدور التسليم عندالعقد. (الفقه الاسلامی وادلته: ۴/۳۵۷، دارالفکر).

ردالمحتار میں ہے:

المراد بالمال مايميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة ، والمالية تثبت بتمول الناس كافة أوبعضهم ، والتقوم يثبت بهاوبإباحة الانتفاع شرعاً.

(ردالمحتار:۴/۵۰۱،مطلب فی تعریف المال،سعید).

بعض علماء نے فرمایا کہ بیع کے جواز کی اصل علت مبیع کا قابل انتفاع ہونا ہے۔

قال في الدرالمختار : والحاصل أن جوازالبيع يدورمع حل الانتفاع .

(الدر المختار:۵/۶۹،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والصحيح أنه يجوز بيع كل شيء ينتفع به كذا في التتارخانية. (الفتاوی الهندية:۳/۱۱۴).

الفقہ الاسلامی میں ہے:

والضابط عندهم: أن كل ما فيه منفعة تحل شرعاً، فإن بيعه يجوز، لأن الأعيان خلقت لمنفعة الإنسان بدليل قوله تعالىٰ :﴿خلق لكم مافي الأرض جميعاً﴾. (الفقه الاسلامی وادلته:۴/۱۸۲،دار الفکر).

حلال حرام میں ہے:

خرید وفروخت کے جائز ہونے نہ ہونے کا خاص تعلق کسی چیز کے قابل انتفاع ہونے اور نہ ہونے سے بھی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن چیزوں کی خرید وفروخت کی ممانعت کتاب وسنت سے صراحۃً نہ ثابت ہواور وہ کسی دور میں اس لائق ہو جائے کہ اس سے نفع اٹھایا جاسکے تو فقہاء اس کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔(حلال وحرام،ص۳۵۵).

خلاصہ یہ ہے کہ عرفاً مال ہونے کی وجہ سے اس کی تجارت جائز ہونی چاہئے۔

اشکال اور جواب:

اشکال: لیکن اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ مادۂ منویہ ناپاک ہے،اور ناپاک چیز کی تجارت کیسے جائز ہوگی؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع کے جواز کا مدار پاک ہونے

پر ہی نہیں، بلکہ اصل قابل انتفاع ہونا ہے اگر ناپاک چیز قابل انتفاع بن جائے اور لوگوں کی حاجت اس سے وابستہ ہو جائے تو اس کی بیع جائز ہے، مثلاً گوبر وغیرہ ناپاک ہے، لیکن منتفع بہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیع جائز ہے نیز کیڑے مکوڑے کی بیع متقدمین فقہاء کے نزدیک خبائث میں سے ہونے کی وجہ سے ناجائز تھی، لیکن متأخرین فقہاء نے منتفع بہ ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

بخلاف غيرهما من الهوام فلا يجوز اتفاقاً كحيات وضب ومافي بحر كسرطان إلا السمك وماجاز الانتفاع بجلده أوعظمه والحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع مجتبىٰ واعتمده المصنفؒ،وفي الفتاوى الشامية: قوله كحيات في الحاوى الزاهدي: يجوز بيع الحيات إذاكان ينتفع بها للأدوية، وما جاز الانتفاع بجلده أوعظمه أى من حيوانات البحر أوغيرها...ونقل السائحاني عن الهندية: ويجوزبيع سائرالحيوانات سوى الخنزير وهوالمختار، وعليه مشى في الهداية وغيرهامن باب المتفرقات. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:٥/٦٨،مطلب في بيع دودة القرمز،سعيد)

وفي تقريرات الرافعي: يجوزبيع الحيات هو وإن كان فيهانفع إلا أنه يحرم أكلها فليحرر حموى ، سندى. (التحرير المختار:٥/١٤١،سعيد).

محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

قال العلامة ابن الهمامؒ بعد ذكرسوال يرد على المصنفؒ: وهذا السوال ليس فى تقرير المصنفؒ مايرد عليه أولاً ليحتاج إلى الجواب عنه، فإنه ماعلل المنع إلا بعدم الانتفاع به، وإنما يرد على من علل بالنجاسة، ولاينبغي أن يعلل بها بطلان البيع أصلاً، فإن بطلان البيع دائرمع حرمة الانتفاع وهي عدم المالية، فإن بيع السرقين جائز وهونجس العين للانتفاع به كما ذكرنا. (فتح القدير:٦/٤٢٧، دارالفكر).وكذا في حاشية تبيين الحقائق للشيخ شهاب الدين احمدالشلبي:٥/٥١_ملتان).

وفي مجمع الأنهرشرح ملتقى الأبحر:وفي التجنيس أن المختارللفتوىٰ جوازبيع لحم المذبوح من السباع وكذا الكلب والحمارلأنه طاهرينتفع به في إطعام سنورة بخلاف

الخنزير المذبوح لأنه نجس العين وفي التخصيص إشعاربعدم جوازهوام الأرض كالحية والعقرب ودواب البحرغيرالسمک كالضفدع والسرطان لأن جوازالبيع يدورمع حل الانتفاع وحرمة الانتفاع بها،وقال بعضهم ان بيع الحية يجوز إذا انتفع بها للأدوية...وفي القهستاني لكن في البحر وبيع غيرالسمک من دواب البحرإن كان له ثمن كالسقنقور وجلودالخز ونحوها يجوز وإلا فلا. (مجمع الانهر:۳/۱۵۱،بيروت).

محیط برہانی میں ہے:

ولايجوز بيع هوام الأرض كالحية والعقرب والوزغ وماأشبه ذلک، لأن الانتفاع بهذه الأشياء حرام ومحليته يعتمد جواز الانتفاع بها، ولايجوزبيع مايكون في البحركالضفدع والسرطان وغيره إلا السمک، ومايجوزالانتفاع بجلده أوعظمه، والحاصل: أن جوازالبيع يدورمع حل الانتفاع . (المحيط البرهاني:۷/۲۹۹،فصل فيمايجوزبيعه ومالايجوز،رشيدية).

وفيه أيضاً: ويجوزبيع السرقين والبعروالانتفاع بهما، وأماالعذرة فلايجوزالانتفاع بها ما لم يخلط بالتراب، ويكون التراب غالباً، وهذا لأن محلية البيع بالمالية، والمالية بالانتفاع، والناس اعتادوا الانتفاع بالبعروالسرقين من حيث الإلقاء في الأرض لكثرة الريع وأما ما اعتادوا الانتفاع بالعذرة مالم يكن مخلوطاً بالتراب . (المحيط البرهاني:۷/۳۰۲،فصل فيمايجوزبيعه ومالايجوزبيعه).

وفي الهداية: قال : ولاباس ببيع السرقين لأنه منتفع به فكان مالاً والمال محل للبيع. (الهداية:٤/٤٦٨،كتاب الكراهية،فصل في البيع).

وفي تبيين الحقائق: إن المسلمين تمولوا السرقين وانتفعوا به في سائرالبلدان والأمصار من غيرنكير. (تبيين الحقائق:٦/٢٦،فصل في البيع، ملتان).

فقہ السنہ میں ہے:

واستثنىٰ الأحناف والظاهرية كل ما فيه منفعة تحل شرعاً فجوزوا بيعه، فقالوا: يجوز بيع الأرواث والأزبال النجسة التي تدعو الضرورة إلى استعمالها في البساتين، وينتفع بها

وقوداً وسماداً، وكذلك يجوز بيع كل نجس ينتفع به في غير الأكل والشرب. (فقه السنة، لسيدسابق،باب شروط العاقد،۳/٥٤).

مذکورہ بالاعبارات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ خرید وفروخت کامدار مالیت پر ہےاور مالیت انتفاع سے ثابت ہوتی ہے،اورانتفاع کے لیے اصل چیز لوگوں کاتعامل ہے،پس اس میں طہارت کی قید نہیں ہے،اسی وجہ سے فقہاء نے سرقین جو کہ نجس العین ہے قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے اس کی تجارت کو جائز قرار دیا ہے۔بلکہ فقہاء نے اس بات کی بھی تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی پاک چیز کسی وجہ سے منتفع بہ نہ ہوتو اس کی تجارت جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ امام محمدؒ جامع صغیر میں فرماتے ہیں:

ولايجوزبيع شعرالإنسان. وفي الشرح:لأن الإنسان مكرم فلايجوز أن يكون منه شيء مبتذل وهوطاهرعندنا على الصحيح. (الجامع الصغيرمع النافع الكبير،ص۳۲۹،بيروت).

وفي المحيط : وشعرالآدمي طاهرولايجوزالانتفاع به . (المحيط البرهاني:۳۰۲/۷).وكذا في البدائع :١٤٢/٥، سعيد).

خون کی تجارت بھی جائز نہیں ہے لیکن امدادالاحکام میں مرقوم ہے کہ اگر عرفاً قیمت ہوجائے تو بیع وشراء صحیح ہے۔

ملاحظہ ہوامدادالاحکام میں ہے:

ان اقوال کا مقتضایہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی بھی قیمت عرفاً ہوجائے تو اس کی بیع وشراء صحیح ہے۔ (امدادالاحکام:۳/۳۵۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں تولیدی جوہر کے مال متقوم ہونے کی وجہ سے اس کی تجارت کی گنجائش ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مادہ کو بذریعہ انجکشن حاملہ بنانے کا حکم:

آج کل جانوروں کو حاملہ بنانے کے لیے انجکشن لگاتے ہیں اوراس پر اجرت لیتے ہیں،تو یہ اجرت بھی جائز ہونی چاہئے،کیونکہ یہ اجرت تولیدی جوہر کے ساتھ ساتھ انجکشن لگانے کے اخراجات اور سروس کا بدل ہے۔

اشکال: لیکن اس پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں عسب الفحل کی اجرت کی ممانعت

وارد ہوئی ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: حدیث شریف اوراس کی شروحات سے پتہ چلتا ہے کہ اصل ممنوع چیز نرجانورکو مادہ پر کودوانے اور حاملہ کرنے کی اجرت ہے، کیونکہ یقینی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے حاملہ ہوجائے اس میں بہت سے احتمالات ہیں مثلاً ہوسکتا ہے کہ مادہ منویہ برآمد نہ ہواگر برآمد ہوتو باہر رائگاں ہوجائے اگرداخل ہوتو صحیح نشانہ پرنہ پہنچے اور حمل قرار نہ پائے ،وغیرہ ،لہٰذا حمل مشکوک اور مجہول ہوگیااور مجہول ومشکوک چیز کی اجرت لینا ممنوع اورناجائز ہے،حدیث شریف میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،ہاں اس کے باوجود تحفے وغیرہ کی گنجائش ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہوترمذی شریف میں ہے:

عن أنس بن مالکؓ أن رجلاً من کلاب سأل النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن عسب الفحل، فنهاه فقال یارسول اللّٰہ! إنما نطرق الفحل فنکرم فرخص له في الکرامة .قال أبوعیسیٰ :...وقد رخص قوم في قبول الکرامة علی ذلک. (ترمذی شریف:۱/۲۴۰، باب ماجاء فی کراهیة عسب الفحل).

وفي جامع الأصول : قال : والعسب : الکراء الذي یؤخذ علی ضراب الفحل، تقول عسب فحله یعسبه عسباً أی اکراہ، وعسب الفحل أیضاً : ضرابه. (جامع الاصول فی احادیث الرسول:۱۰/۵۹۲/۸۱۷۳،عسب الفحل).

وفي مسندالربیع : قال الربیع: ذکرالعسب وأراد ما یؤخذ علیه من الأجرة والعسب ضراب الفحل. (مسندالربیع،باب فی المحرمات،ص۲۴۹/۶۳۴).

اسی طرح ایک موقوف روایت سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے:

قال أبوهریرةؓ: أربع من السحت :ضراب الفحل...(سنن النسائی ،باب عسب الفحل).

بلوغ المرام میں ہے:

وعن جابر بن عبد اللّٰہؓ قال : نهی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن بیع فضل الماء. رواہ مسلم، وزاد في روایة : وعن بیع ضراب الجمل.قال المحشي : الضراب بالکسر والتخفیف هونزوالذکر من الحیوان علی الأنثی لتلقیحها أی نهی عن کراء ضرابه

وأجرة مائه... والعسب ضراب الفحل ...ومورد النهى فى الحديث الأجرة التي تؤخذ على ضراب الفحل. (بلوغ المرام مع التعليق،ص۲۲۹،کتاب البيوع).

لغات الحدیث میں ہے:

عسب نر کا مادہ پر چڑھنا، اس کا کرایہ دینا" نهى عن عسب الفحل" نر کو مادہ پر کدانے کی اجرت لینے پر منع فرمایا گیا۔ (لغات الحدیث:۳/۱۰۴).

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ اکثر شراح نے عسب الفحل کا معنیٰ ضراب الفحل بیان کیا ہے یعنی نر کو مادہ پر کدانا۔

قال ابن بطال في شرح صحيح البخاري: وذهب الكوفيون والشافعي وأبوثور إلى أنه لايجوزعسب الفحل، واحتجوا بحديث ابن عمر ﷺ، فقالوا: هو شيء مجهول لاندري أينتفع به أم لا؟ وقد لاينزل الفحل،...ومعنى نهيه عليه السلام عن عسب الفحل هو أن يكريه إلى العلوق،لأن ذلك مجهول لايدرى متى يعلق، ولايجوزإجارة المجهول، كما لايجوز بيعه. (شرح صحيح البخارى لابن بطال ،كتاب الاجارات،باب عسب الفحل،٦/٤١٢).

عون المعبود میں ہے:

نهى عنه للغرر لأن الفحل قد يضرب وقد لايضرب وقد لايلقح الأنثى وبه ذهب الأكثرون. (عون المعبود:٩/٢١٣،باب فى عسب الفحل).

درمختار میں ہے:

لا تصح الإجارة لعسب التيس و هو نزوه على الإناث لأنه عمل لا يقدر عليه وهو الإحبال. (الدرالمختار:٦/٥٥،كتاب الاجارة، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۶۵۔۲۷۱). واللہ ﷻ اعلم۔

دہن نجس کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک شخص کی ملکیت میں زیتون کا تیل ہے اس میں چوہے کے گرنے کی وجہ سے وہ تیل ناپاک

ہوگیا، کیا اس کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام صاحبؒ کے نزدیک دہن نجس منتفع بہ ہونے کی وجہ سے اس کی خرید و فروخت جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

الفارة لوماتت فی السمن...وإن کان مائعاً لم یؤکل وینتفع به من غیر جهة الأکل مثل الاستصباح. (الهدایة:۱/۴۵).

البحر الرائق میں ہے:

ویجوز بیع الدهن النجس لأنه ینتفع به للاستصباح فهو کالسرقین. (البحرالرائق:کتاب البیوع، باب المتفرقات،۶/۱۷۲،کوئته).

و کذا فی شرح فتح القدیر: ۷/۱۱۸، مسائل منثورة، دارالفکر۔والموسوعة الفقهیة الکویتیة،باب بیع النجاسات، ۴۰/۱۰۲،الکویت).

وفی المبسوط للإمام السرخسیؒ: أنه لیس من ضرورة حرمة التناول حرمة البیع فإن الدهن النجس لایحل تناوله ویجوزبیعه وکذلک بیع السرقین جائز وإن کان تناوله حراماً والسرقین محرم العین ومع ذلک کان بیعه جائزاً. (المبسوط للامام السرخسیؒ،کتاب الاشربة،۲۴/۲۷).

فقہ السنہ میں ہے:

واستثنیٰ الأحناف والظاهریة کل ما فیه منفعة تحل شرعاً فجوزوا بیعه، فقالوا: یجوز بیع الأرواث والأزبال النجسة التي تدعو الضرورة إلی استعمالها فی البساتین، وینتفع بها وقوداً وسماداً، وکذلک یجوز بیع کل نجس ینتفع به في غیرالأکل والشرب کالزیت النجس یستصبح به ویطلی به. (فقه السنة،لسیدسابق،باب شروط العاقد،۳/۵۴).

البنایہ میں ہے:

وممن أجاز الاستصباح ممایقع فیه الفارة علی وابن عباس وابن عمرؓ قال القرطبی: اختلف في جواز بیع کل محرم نجس فیه منفعة...وأجازه الکوفیون. (البنایة:۸/۵۷۹).

الأبواب والتراجم میں ہے:

ليس كلما حرم تناوله حرم بيعه... نعم المذاب للاستصباح ليس بحرام. (الابواب والتراجم للشيخ زكرياؒ، ١٦٤).

بداية المجتهد میں ہے:

ومن هذا الباب اختلافهم في بيع الزيت النجس... فقال مالك لايجوز بيع الزيت النجس وبه قال الشافعي... وقد قيل إن في المذهب رواية أخرى تمنع الاستصباح به وهو ألزم للأصل... وفي مذهب مالك جواز الاستصباح به. (بداية المجتهد: ٤/٤٨٨).

شامی میں ہے:

وينتفع به للاستصباح لأن الانتفاع به علة جواز البيع... إلا دهن ودك ميتة لأنه عين نجاسة. (فتاوى الشامي: ٥/٢٢٩، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۱۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خنزیر کی کھال سے بنے ہوئے جوتوں کی تجارت کا حکم:

سوال: ہم جوتوں کے پرچون فروش (Retailer) ہیں، یورپ وغیرہ کا سفر کر کے سامان خریدتے ہیں، وہاں پاپوش سازی میں خنزیر کے اجزاء استعمال کرتے ہیں، مثلاً جوتوں میں خنزیر کی کھال کا استر لگاتے ہیں، ہم ان کو بتلا دیتے ہیں کہ خنزیر کے استر دوسرے چمڑوں سے تبدیل کر دے، اور عام طور پر وہ اس طرح کر لیتے ہیں، الغرض ایک تاجر سے مال خریدا اور اس کو بتلا دیا تھا کہ استر بدل کر ہمیں پہنچا دے، ہم نے ثمن پیشگی بذریعہ بینک ادا کر دیا جب سامان ہمیں موصول ہوا اور معاینہ کیا تو تمام جوتے بدستور خنزیر کی کھال کے استر والے تھے، اب سامان واپس کرنا ممکن نہیں ہے، اور ثمن ادا ہو چکا ہے، مزید براں سامان پر واجبی ٹیکس وغیرہ بھی ادا کر دیا، اب ہم جوتوں کے ساتھ کیا کریں؟ برائے مہربانی حکم شرع سے مطلع فرمائیں کہ ہمیں اپنی رقم وصول کرنے کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ خنزیر کے اجزاء سے تیار شدہ پاپوش کی بیع منعقد نہیں ہوئی، بلکہ یہ بیع باطل ہے، کیونکہ خنزیر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ نجس العین ہے، لہذا جوتوں کو واپس کرنا لازم اور واجب ہے، لیکن جب

واپسی ناممکن ہے اور ثمن ادا ہو چکا ہے، تو اب حق وصول کرنے کی ایک شکل فقہاء کے کلام میں یہ دستیاب ہوتی ہے کہ کسی غیر مسلم کو وکیل بالبیع بنادے اور اپنا حق وصول کر کے بقیہ رقم بلانیت ثواب صدقہ کر کے مال حرام سے سبکدوش ہو جائے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ بینات میں ہے:

سوال: ہمارے ملک میں چائنا، اسپین اور دوسرے ممالک سے جوتے اور چمڑے کی مصنوعات آرہی ہے، ان میں سور (خنزیر) کی کھال استعمال ہو رہی ہے... بعض جوتے ریگزین کے بنے ہوئے ہیں مگر ان کے اندر استر سور کی کھال کا ہے اور کچھ مکمل سور کی کھال کے بنے ہوئے ہیں... کیا یہ جوتے پہننا حرام ہے؟ کیا اس کی فروخت حرام ہے؟... جن دکاندار نے بھول سے کروڑوں روپے کا مال خرید لیا ہے، انھیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب باسمہ تعالیٰ: خنزیر کے نجس العین ہونے میں کوئی شک نہیں... فقہاء کرام نے اس کے تمام اجزاء کے استعمال اور ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے، اور وہ اشیاء جن میں خنزیر کے اجزاء اور کھال وغیرہ شامل ہوں، اس کا بھی یہی حکم ہوگا، خنزیر اور اس کے اجزاء سے تیار شدہ اشیاء میں بیع منعقد ہی نہیں ہوتی اور اس کا ثمن (قیمت) بائع کے لیے حرام ہوتا ہے، بلکہ اس کی ملکیت میں بھی داخل نہیں ہوگا... جن لوگوں نے بھول کر ایسی مصنوعات خرید لی ہیں، وہ ان دکانداروں کو واپس کر دیں اور اور دکانداروں کو چاہئے کہ وہ ان کمپنیوں کو مال واپس کر دیں جن سے انہوں نے خریدا ہے، تا کہ وہ ان غیر مسلموں کو یہ مال و مصنوعات واپس کر کے اپنی رقم واپس لے سکیں۔ (فتاویٰ بینات، کتاب الحظر والاباحۃ، جلد چہارم، ص ۴۷۰۔۴۷۱، مکتبہ بینات)۔

اپنا حق وصول کرنے کی نظیر ملاحظہ فرمائیں:

قال الإمام السرخسيؒ: وإذا كان في تركة الذمي خمر وخنزير وغرماؤه مسلمون وليس له وصي فإن القاضي يوكل ببيع ذلك رجلاً من أهل الذمة فيبيعه ويقضي به دين الميت لأن من يأمره القاضي يكون نائباً عن الميت... والميت كافر فيجوز بيع الذمي خمره على سبيل النيابة عنه والغرماء إنما يقبضون الثمن بدينهم لا أن يكون بيع قيم القاضي واقعاً لهم. (المبسوط: ۱۵/۱۳۱، باب قسمة الدار للميت وعليه دين او وصية، بيروت).

وفي العناية شرح الهداية: وإذا أمر المسلم نصرانياً ببيع خمر أو شرائها ففعل جاز عند أبي حنيفةؒ، وقالا: لايجوز على المسلم... وقولهما الموكل لايليه فلا يوليه غيره

منقوض... بالقاضي إذا أمر ذمياً ببيع خمر أو خنزير خلفه ذمي آخر وهو لايلي التصرف بنفسه وبالذمي إذا أوصى لمسلم وقد تركهما فإن الوصي يوكل ذمياً بالبيع والقسمة وهو لايلي ذلك بنفسه. (العناية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٦/٤٣٩،باب البيع الفاسد، دار الفكر). واللہ ﷻ اعلم۔

بیع فاسد میں مشتری کا ثالث کو فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ۲۳ سال قبل اپنے بھائی سے چند پلاٹ خریدے تھے لیکن بائع نے اس میں یہ شرط لگائی تھی کہ ۱۰ سال کے بعد اگر اس پر کوئی تعمیر وغیرہ نہ ہو تو بائع واپس لے لیگا، چنانچہ بیع مکمل ہو چکی تھی اور بائع نے ثمن پر قبضہ بھی کر لیا تھا، اور مشتری نے بائع کی اجازت سے مبیع کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا، اب ۲۳ سال گزرنے کے بعد وہ پلاٹ حکومت خرید کر رقم ادا کرنا چاہتی ہے تو ثمن کون وصول کریگا؟ بائع کے ورثاء چاہتے ہیں کہ ثمن ان کو ملے اس وجہ سے کہ بیع اول فاسد ہو گئی تھی، کیا بیع اول صحیح ہوئی تھی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شرطِ فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہو گئی تھی، لہذا بیع کو فسخ کرنا ضروری تھا، لیکن عاقدین نے بیع فسخ نہیں کی، اور مشتری نے بائع کی اجازت سے مبیع پر قبضہ کر لیا تھا، اور بائع نے بھی ثمن پر قبضہ کر لیا تھا، لہذا مشتری مبیع کا مالک بن گیا تھا، اب ۲۳ سال کے بعد حکومت خرید کر ثمن ادا کر رہی ہے تو ثمن مشتری کو ملے گا، اس لیے کہ مشتری مبیع کا مالک تھا، بائع کے ورثاء کو نہیں ملے گا۔

اس مسئلہ کی وضاحت علامہ ابن نجیم مصریؒ، علامہ شامیؒ اور علامہ سید احمد طحطاویؒ نے فرمائی ہے کہ بیع فاسد میں جب مشتری مبیع کو فروخت کر دے تو ثمن مشتری کو ملے گا۔

ملاحظہ فرمائیں البحر الرائق میں ہے:

قوله قبض المشترى المبيع فى البيع الفاسد بأمر البائع وكل عوضيه مال ملك المبيع بقيمته... لأن ركن البيع صدر من أهله مضافاً إلى محله فوجب القول بانعقاده ولاخفاء فى الأهلية والمحلية وركنه المبادلة المال بالمال... فنفس البيع مشروع وبه تنال نعمة الملك إنما المحظور ما يجوره كما فى البيع وقت النداء.. وفى قوله ملك البيع رد على من قال: إنه إنما ملك التصرف دون العين وهم العراقيون وماذكره قول أهل بلخ وهو المنصوص عليه في كلام محمدؒ وهو الصحيح المختار، فإنه قال: إن المشتري خصم لمن

يدعيه لأنه يملك رقبته كذا في جامع الفصولين... ولوباعه كان الثمن له ولوبيعت دار إلى جنبها فالشفعة للمشتري ولوأعتقه البائع لم يعتق ولوسرقه البائع من المشترى بعد قبضه قطع كما فى الجوهرة، فهذه كلها ثمرات الملك. (البحر الرائق:۶/ ۹۱، ۹۲،فصل فى البيع الفاسد، كوئته).

وفى الهداية: وإذا قبض المشترى المبيع فى البيع الفاسد بأمر البائع وفى العقد عوضان كل واحد منهما مال ملك المبيع ولزمته قيمته... ولكل واحد من المتعاقدين فسخه رفعاً للفساد... فإن باعه المشتري نفذ بيعه لأنه ملكه فملك التصرف فيه وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني ونقض الأول لحق الشرع وحق العبد مقدم لحاجته ولأن الأول مشروع بأصله دون وصفه والثاني مشروع بأصله ووصفه فلا يعارضه مجرد الوصف ولأنه حصل بتسليط من جهة البائع. (الهداية:۳/ ۶۲، ۶۴،فصل فى احكام البيع الفاسد).

وفى الدر المختار: وإذا ملكه تثبت كل أحكام الملك، وفى الشامية: فيكون المشتري خصماً لمن يدعيه لأنه يملك رقبته نص عليه محمدؒ، ولوباعه كان الثمن له.

(الدر المختار مع رد المحتار:۵/ ۹۰،سعيد).

وفي حاشية الطحطاوي: قوله ملكه أى ملك عينه هوقول أئمة بلخ بدليل أن المشتري إذا أعتقه بعد قبضه صح وكان الولاء له ولوباعه كان الثمن له. (حاشية الطحطاوى على الدر المختار:۳/ ۷۸، كوئته۔وكذا فى فتح القدير: ۶/ ۴۵۹، ۴۶۶،فصل فى احكامه، دار الفكر).

البتہ ایک بات قابل اشکال ہے وہ یہ ہے کہ بیع فاسد میں فقہاء نے لکھا ہے کہ مبیع کو دوبارہ فروخت کر کے جو نفع حاصل کیا جائے وہ واجب التصدق ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو اشترى جارية شراءً فاسداً وقبضها وباعها وربح فيها تصدق بالربح ولو اشترى بثمنها شيئاً آخر فربح فيه طاب له الربح. كذا فى السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:۳/ ۱۴۹).

لیکن چونکہ آج کل بیع تعاطی ہوتی ہے اور ایجاب وقبول کا نام ونشان نہیں ہوتا، لہذا شرط صرف کاغذات میں درج تھی اور کاغذات یا تو بیع سے قبل موصول ہوئے یا بعد میں اگر قبل العقد ہے تو وعدہ ہے اور بعد العقد ہے

تب بھی یہ شرط وعدہ کی طرح ہے جس سے عقد فاسد نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قلت: وفي جامع الفصولين أيضاً: لو ذكرا البيع بلا شرط ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس ... (تنبيه) في جامع الفصولين أيضاً: لو شرط شرطاً فاسداً قبل العقد ثم عقدا لم يبطل العقد. (فتاوى الشامي:٥/٨٤،مطلب في الشرط الفاسد...، سعيد).

امداد الاحکام میں ہے:

ایجاب وقبول بیع وشراء کا ہوا اور ایجاب وقبول میں کوئی شرط واپسی وغیرہ کی نہ ہو بلکہ بعد ایجاب وقبول کے شرط ردوغیرہ کی کی جاوے یہ بالاتفاق جائز ہے "**لخلو العقد عن الشرط**" اور جب زبانی ایجاب وقبول میں متصلاً شرط نہ ہو تو بیعانہ میں متصلاً شرط کے لکھنے سے حرمت نہ آئے گی۔ "**لأن الأصل في العقود القول والكتابة وثيقة، والله تعالىٰ أعلم. حرره الأحقر ظفر أحمد عفي عنه، أصل الجواب وكذا تصحيحه صحيحان**"، اشرف علی۔ (امداد الاحکام:۳/۴۳۵). واللہ ﷻ اعلم۔

آلاتِ سحر کی تجارت کا حکم:

سوال: آلاتِ سحر مثلاً ہڈیاں، بال وغیرہ کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر بائع کو یقین ہے کہ یہ چیزیں سحر میں استعمال ہوں گی تو اس کی تجارت مکروہ ہے، کیونکہ اس میں تعاون علی المعصیۃ کا بین ثبوت ہے۔ لیکن انسان کی ہڈیوں اور بالوں کی تجارت جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

قوله وشعر الإنسان والانتفاع به، أي لم يجز بيعه والانتفاع به لأن الآدمي مكرم غير مبتذل فلا يجوز أن يكون شيء من أجزائه مهاناً مبتذلاً، وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: لعن الله الواصلة والمستوصلة. (البحر الرائق:٦/٨١،كوئته).

وكذا في الهداية مع العناية على هامش فتح القدير:٦/٤٢٥،دار الفكر۔ وتبيين الحقائق:١/٢٦).

وفي الهداية: ولابأس ببيع عظام الميتة وعصبها وصوفها وقرنها وشعرها ووبرها والانتفاع بذلك كله لأنها طاهرة لايحلها الموت لعدم الحياة. (الهداية:۳/۵۵، باب البيع الفاسد).

وكذا في الفتاوى الهندية:۳/۱۱۵۔وفتاویٰ قاضيخان:۲/۱۳۳).

تبيين الحقائق میں ہے:

وكره بيع السلاح من أهل الفتنة لأنه أعانة على المعصية، قال الله تعالىٰ: ﴿وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولاتعاونوا على الإثم والعدوان﴾...وإنما يكره بيع نفس السلاح دون مالايقاتل به إلا بصنعة كالحديد لأن المعصية تقع بعين السلاح بخلاف الحديد ألا ترى أن العصير والخشب الذي يتخذ منه المعازف لايكره بيعه لأنه لامعصية في عينها. (تبيين الحقائق:۳/۲۹۶،ملتان).

وكذا في الدر المختار مع رد المحتار:۴/۲۶۸،سعيد۔وبدائع الصنائع:۷/۱۴۲،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

فإن باعها (أي آلات المزامير) ممن يستعملها أو يبيعها هذا المشتري ممن يستعملها لايجوز بيعها قبل الكسر. (الفتاوى الهندية:۳/۱۱۶،فصل في بيع المحرمات).

شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں:

أقول: الإعانة في المعصية وترويجها وتقريب الناس إليها معصية وفساد في الأرض. (حجة الله البالغة:۲/۱۹۲،البيوع المنهي عنها،قديمي كتب خانه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

لوہے کے بت کی تجارت کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص لوہے کا بنا ہوا بت بیچتا ہے تو یہ تجارت جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہو تو صرف لوہے یا پیتل کا حساب لگا کر فروخت کرے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ لوہے کا بت بیچنا ناجائز ہے، اور صرف لوہے کا حساب لگا کر بیچنے سے بھی احتراز کرنا چاہئے، اس لیے کہ مشتری اس کو غالباً معصیت میں استعمال کرے گا، اگر چہ لوہا پیتل دوسری چیزوں

میں بھی استعمال ہوتا ہے، ہاں اس کو شکستہ کر کے فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن جابر بن عبد اللہ ﷺ أنہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عام الفتح وھو بمکۃ: "إن اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والأصنام. (رواہ البخاری، باب بیع المیتۃ والاصنام، ۱/۲۹۸).

عمدۃ القاری میں ہے:

لایجوز بیع المیتۃ والأصنام لأنہ لایحل الانتفاع بھا ووضع الثمن فیھا إضاعۃ المال، وقد نھی الشارع عن إضاعتہ، قلت: علی ھذا التعلیل إذا کسرت الأصنام وأمکن الانتفاع برضاضھا جاز بیعھا عند بعض الشافعیۃ وبعض الحنفیۃ. (عمدۃ القاری: ۸/۵۶۹، باب بیع المیتۃ والاصنام، ملتان).

وفي سبل السلام: وأما علۃ تحریم بیع الأصنام فقیل لأنھا لامنفعۃ فیھا مباحۃ، وقیل إن کانت بحیث إذا کسرت تنفع بأکسارھا جاز بیعھا والأولیٰ أن یقال: لایجوز بیعھا وھي أصنام للنھي ویجوز بیع کسرھا إذ ھي لیست بأصنام ولا وجہ لمنع بیع الأکسار أصلاً. (سبل السلام: ۳/۵، کتاب البیوع، لمحمد بن اسمعیل الصنعانی).

وفي شرح السنۃ للإمام البغويؒ: وفي تحریم بیع الأصنام دلیل علی تحریم بیع جمیع الصور المتخذۃ من الخشب والحدید والذھب والفضۃ وغیرھا، وعلی تحریم بیع جمیع آلات اللھو والباطل مثل الطنبور والمزمار والمعازف کلھا، فإذا طمست الصور، وغیرت آلات اللھو عن حالتھا، فیجوز بیع جواھرھا وأصولھا، فضۃ کانت أوحدیداً أوخشباً أوغیرھا. (شرح السنۃ للامام البغوی: ۸/۲۸، المکتب الاسلامی).

درمختار میں ہے:

قال اشتری ثوراً أوفرساً من خزف لأجل استئناس الصبي لایصح، وفی الشامیۃ: قولہ من خزف أی طین قال ط: قید بہ لأنھا لو کانت من خشب أوصفر جاز اتفاقاً فیما یظھر لإمکان الانتفاع بھا وحررہ. وھو ظاھر. (الدرالمختار مع فتاوی الشامی: ۵/۲۲۶، باب المتفرقات، سعید).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

مورتیاں بنانا اوران کا بیچنا دونوں ہی حرام ہیں اوران سے حاصل ہونے والی آمدنی ناجائز ہے۔(کتاب الفتاوی:۵/۲۶۸)۔

جواہر الفتاویٰ میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بت سازی اور بتوں کی خرید وفروخت اوراس کے دام استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے اس لیے مختلف شکلوں کے مجسمے اور مورتی بنانا...ناجائز اور حرام ہے...اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت جائز ہے خواہ مجسمے سونے چاندی کے ہوں یا تانبا پیتل کے ہوں یا پتھر اور پلاسٹک کے یا کسی دوسری دھات کے۔(جواہر الفتاویٰ: جلد سوم،۲۱۰)۔

ایضاح المسائل میں ہے:

تانبا، پیتل، اسٹیل وغیرہ دھات یا لکڑی کے مجسموں کو بنانا تو بالکل حرام ہے، مگر اس کی تجارت میں اگر مقصود مالیت ہی ہوتا ہے، اور شکل وصورت اصل مالیت کے تابع ہوتی ہے، اور لین دین کا سارا معاملہ وزن اور تول سے ہوا کرتا ہے، ایسی صورت میں اس تجارت کا پیسہ بالکل حرام تو نہیں ہوگا، مگر تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ اور مشکوک پیسہ ہوگا، اس لیے ان اشیاء کا کاروبار ایک تاجر دوسرے سے لیکر بھی نہ کرے، اور اگر مقصد مالیت نہیں بلکہ تصویر اور شکلیں ہیں تو تجارت اور پیسہ سب حرام ہیں۔(ایضاح المسائل،ص۱۵۶)۔

مزید ملاحظہ ہو: (ایضاح النوادر: حصہ اول،ص۷۹-۸۴)۔　واللہ ﷻ اعلم۔

مشتری سے مقدمہ کے اخراجات وصول کرنے کا حکم:

سوال: عمرو نے زید کے پاس سے کوئی چیز خریدی، اور ثمن متعینہ تاریخ پر طے ہوا، تاریخ گزرنے کے بعد بھی عمرو نے ثمن ادا نہیں کیا، زید نے مقدمہ دائر کردیا، اب سوال یہ ہے کہ زید مقدمہ کے اخراجات عمرو یعنی مشتری سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مقدمہ کے اخراجات مشتری سے وصول کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض علماء جیسے حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ مشتری سے مقدمہ کے اخراجات وصول کرنا جائز نہیں ہے، اور دوسرے بعض علماء، جیسے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ مشتری سے مقدمہ کے

اخراجات وصول کرنا جائز اور درست ہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں دونوں اقوال نقل کرنے اور تفصیلی کلام فرمانے کے بعد فرمایا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی رائے اس وجہ سے قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ادائے حقوق میں بہت کمی ہوگئی بلکہ اس زمانہ سے پہلے سے یہ مرض عام ہو چکا ہے اسی بناء پر فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ صاحب حق اگر بقدر اپنے حق کے من علیہ الحق کے مال سے چاہے جس طرح ہو سکے لے لے اگر چہ اپنے حق کی جنس سے نہ ہو۔(عزیز الفتاویٰ، جلد اول، ص ۶۲۷، دار الاشاعت، کراچی).

بنابریں صورتِ مسئولہ میں مشتری باوجود استطاعت کے ادا کرنے میں تساہل وانکار کرتا ہے اور بائع بمجبوری نالش کر کے قرض وصول کرتا ہے تو اس حالت میں مشتری متمرد سے خرچہ عدالت لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ میں ہے:

اگر کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لیے یہ مجبوری نالش "مقدمہ دائر کرنا" کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف بالکل مخاصمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑیں تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ بہت سے علماء کے نزدیک ومنہم مولانا رشید احمد صاحبؒ جائز ہے۔(امداد الفتاویٰ:۳/۱۲۳).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (عزیز الفتاویٰ، جلد اول، ص ۶۲۶۔۶۲۸، دار الاشاعت۔ وفتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۴۶۰، مبوب ومرتب۔ وامداد الاحکام:۳/۴۶۰).

اشکال اور جواب:

اشکال: لیکن اس پر بعض حضرات نے یہ اشکال ظاہر فرمایا ہے کہ مشتری صرف متسبب ہے اور بائع مباشر ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ تاوان مباشر پر ہوتا ہے نہ کہ متسبب پر، اس وجہ سے مشتری متسبب سے اخراجاتِ مقدمہ وصول کرنا ناجائز ہے، اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء نے جہاں یہ قاعدہ بیان کیا ہے وہاں مستثنیات بھی بیان کیے ہیں، مثلاً علامہ ابن نجیم مصریؒ نے الاشباہ والنظائر میں فرمایا: "تضمین الساعی" اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے، اگر چہ سعایہ محض سبب ہے، لیکن متاخرین علماء نے موجب ضمان بتلایا ہے۔

ملاحظہ ہو "الاشباہ والنظائر" میں ہے:

القاعدة التاسعة عشر: إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضيف الحكم إلى المباشر... وخرجت عنها مسائل... الخامسة: الإفتاء بتضمين الساعي وهو قول المتأخرين لغلبة السعاية. (الاشباه والنظائر:١/٤٠٥،الفن الاول فی القواعدالكلية).

وفي مجمع الضمانات: وضمن عندمحمدؒ وبه يفتیٰ لغلبة السعاية في زماننا. (مجمع الضمانات:١/٣٦٢).

وللاستزادة انظر: (معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الاحكام:١٥٦، فی بيان القضاء بانواع الضمانات الواجبة، وكيفيتها۔ومجمع الضمانات:١/٣٦٠۔٣٦٢۔وخلاصة الفتاویٰ: ٤/٢٦٠، الجنس السادس فی السعاية، المكتبة الرشيدية). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بشرطِ اقراض شیئرز کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک کمپنی کے ممبروں کو شیئرز بیچے جائیں گے، اور ہر شیئرز خریدنے والے پر لازم ہے کہ شیئرز کے بدلہ میں کمپنی کو ۳۲۰ رینڈ قرضہ ادا کرے، اور کمپنی اپنے ممبروں کو قرضے کے ساتھ رقم کا پانچ فیصد بطورِ نفع کے مزید ادا کریگی، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں:

الجواب: اس معاملہ میں پہلی خرابی یہ ہے کہ اس میں شرط فاسد لگائی گئی ہے یعنی ہر شیئرز خریدنے والے پر ۳۲۰ رینڈ قرض دینا لازم ہوگا، اس کو فقہاء نے ممنوع لکھا ہے، دوسری خرابی یہ ہے کہ جو لوگ رقم جمع کراتے ہوں ان کو رقم کا فیصد ملیگا، یہ طریقہ بھی ناجائز ہے کیونکہ مضاربت میں منافع کا حصہ ملنا چاہئے نہ کہ رقم کا حصہ، اگر یہ کہدیں کہ مضاربین کو منافع میں سے ۴۰ فیصد ملیگا تو یہ جائز ہے پھر جو منافع مل جائے اس کا ۴۰ فیصد سب مضاربین پر ان کے حصے کے حساب سے تقسیم کیا جائیگا، یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس کمپنی کے شیئرز بیچے جارہے ہوں اس کمپنی کی ملکیت میں کچھ اثاثے یا جائیداد ہو مثلاً ایک شخص مکان خریدلے اور اس کے شیئرز دوسرے لوگوں کو بیچ دے، اگر فی الحال کچھ بھی موجود نہیں اور لوگوں کو شیئرز بیچے جارہے ہوں تو یہ درست نہیں، ہاں اگر لوگوں سے برابر رقم لے لی جائے اور اس سے مکان خریدلیا جائے اور سب لوگ اس مکان میں برابر کے شریک ہوں تو یہ درست ہے، لیکن یہ شیئرز کی بیع نہیں بلکہ مکان میں سب کو شریک کرنا ہے۔

ملاحظہ ہو الدرالمختار میں ہے:

ولا بیع بشرط لایقتضیه العقد ولایلا ئمه وفیه نفع لأحدهما. (الدرالمختار: ۵/۸۵،سعید).

ردالمحتار میں ہے:

قوله مثال لما فیه نفع للبائع، ومنه ما لوشرط البائع أن یهبه المشتری شیئاً أو یقرضه.

(ردالمحتار:۵/۸۵،مطلب فی الشرط الفاسد، سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو باع شیئاً علی أن یهب له المشتري أویتصدق علیه أویبیع منه شیئاً أویقرضه کان فاسداً. (الفتاوی الهندیة:۳/۱۳٤،الباب العاشرفی الشروط التی تفسد البیع).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

ولوکان فی الشرط منفعة لأحد المتعاقدین بأن شرط البائع أن یقرض المشتري أوعلی القلب یفسد العقد. (خلاصة الفتاوی:۳/۵۰،الفصل الخامس فی البیع).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها أن یکون الربح جزءاً شائعاً فی الجملة لا معیناً فإن عینا عشرة أومائة أو نحو ذلک کانت الشرکة فاسدة لأن العقد یقتضي تحقق الشرکة فی الربح و التعیین یقطع الشرکة لجوازأن لایحصل من الربح إلا القدرالمعین لأحدهما فلا یتحقق الشرکة فی الربح. (بدائع الصنائع:٦/٥٩، کتاب الشرکة ،فصل فی الشرائط العامة،سعید).

(و کذا فی الدرالمختارمع ردالمحتار:٤/٣٠٥، کتاب الشرکة،سعید).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

آج کے دور میں شرکت کی ایک صورت یہ بھی چل نکلی ہے کہ ایک چلتی دکان یا فیکٹری وغیرہ کا مالک اپنے رشتہ داروں یا جاننے والوں سے کہتا ہے کہ تم کاروبار میں اتنی رقم شامل کرو تو ہر مہینہ تمھیں اتنا فیصد نفع ملے گا، وہ رقم شامل کرتا ہے اور ہر ماہ اس کو نفع کی مقررہ مقدار مل جاتی ہے اس کو عام طور پر لوگ جائز کاروبار سمجھتے ہیں حالانکہ شرعی نقطہ نگاہ سے اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) کسی بھی کاروبار میں سرمایہ پر نفع متعین کر کے دینا یہ قرض دے کر سود وصول کرنے کے حکم میں داخل ہے جو صریح حرام ہے۔

(۲) اس میں رقم شامل کرنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت نہیں کرتا، وہ دکاندار کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے، جب کہ شرعاً شرکت کے لیے ضروری ہے کہ نفع نقصان دونوں میں شرکت ہو، لہذا یہ شرکت فاسدہ ہوئی، شرکت کی یہ صورت ناجائز ہے، لہذا اس سے اجتناب لازم ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۲/۲۶)

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

ہر شریک کے نفع کی شرح کاروبار میں حقیقتاً ہونے والے نفع کی نسبت سے طے ہونی چاہئے، اس کی طرف سے کی جانے والی سرمایہ کاری کی نسبت سے نہیں، یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شریک کے لیے کوئی لگی بندھی مقدار مقرر کرلی جائے یا نفع کی ایک شرح طے کرلی جائے جو اس کی طرف سے لگائے گئے سرمائے سے منسلک ہو (یعنی کسی شریک کے بارے میں یہ طے کرنے کے بجائے کہ حقیقی منافع کا اتنا فیصد ملے گا یہ طے کرلینا کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقم کا اتنا فیصد لے گا جائز نہیں ہے)۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/۳۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صیغۂ استقبال سے بیع منعقد ہونے کا حکم:

سوال: زید نے عمرو سے کہا کہ یہ مال میں آپ کو ایک مہینہ کے بعد بیچوں گا، اور اگر میں نہ بیچوں تو آپ میری طرف سے وکیل بالبیع ہوں گے۔ اس عقد کا کیا حکم ہے؟ کیا بیع ہوئی یا نہیں؟ اور نہ ہونے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زید کا یہ کہنا کہ یہ مال ایک مہینہ کے بعد بیچوں گا یہ عقدِ بیع نہیں ہے، بلکہ وعدۂ بیع ہے، اس کی وجہ سے بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اور اس طرح وعدہ کرنا صحیح ہے، پھر اگر کسی وجہ سے زید نے وعدہ پورا نہیں کیا، اور زید نے عمرو کو بتلا دیا کہ اب بیع کا ارادہ نہیں، تم وکیل بالبیع بن جاؤ اور عمرو نے قبول کرلیا تو عمرو وکیل بالبیع بن گیا۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

صيغة الاستقبال التي هي بمعنى الوعد المجرد مثل سأبيع وسأشتري، لاينعقد بهما البيع. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسي، المادة: ۱۷۱، ۱/۷۸).

شرح العنایہ میں ہے:

ولاينعقد بلفظين أحدهما الماضي والآخر بلفظ المستقبل، وإنما لاينعقد بذلك

لأن النبي صلى الله عليه وسلم استعمل فيه لفظ الماضي الذي يدل على تحقق وجوده، فكان الانعقاد مقتصراً عليه، ولأن لفظ المستقبل إن كان من جانب البائع كان عدة لا بيعاً.

(شرح العناية على هامش فتح القدير:۶/۲۴۹،دارالفکر).

ہاں زید نے جب بیع کا وعدہ کیا تو اس کو پورا کرنا چاہئے ،لیکن اگر کسی وجہ سے پورا نہ کرسکا تو گنہگار نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

وقال العلماء: يستحب الوفاء بالوعد بالهبة وغيرها استحباباً مؤكداً، ويكره إخلافه كراهة تنزيه،لاتحريم. (عمدة القاري:۱/۳۲۹،ملتان).

قال في الهداية :كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكل به غيره، لأن الإنسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعتبار بعض الأحوال، فيحتاج إلى أن يوكل به غيره، فيكون بسبيل منه دفعاً للحاجة، وقدصح أن النبي صلى الله عليه وسلم وكل بالشراء حكيم بن حزامرضی اللہ عنہ. (الهداية:۳/۱۷۷،كتاب الوكالة). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بند ڈبوں میں مجہول مبیع کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک کمپنی بند ڈبوں میں برتن فروخت کرتی ہے ،مشتری ان بند ڈبوں کو بڑے شوق سے خریدتے ہیں،ان ڈبوں میں اتنا تو معلوم ہے کہ برتن ہیں،لیکن یہ معلوم نہیں کہ برتن بڑے ہیں یا چھوٹے ،اعلیٰ کوالٹی کے ہیں یا ادنیٰ ،جیسے بھی ہو مشتری کی قسمت ہے،ہاں اگر ان میں سے کوئی عیب دار برتن ہو یا ٹوٹا ہوا ہو تو وہ واپس ہوسکتا ہے،اس عقد میں بظاہر خیارِ رؤیت ہونا چاہئے کیونکہ مشتری نے چھپی ہوئی چیز کو خریدا لیکن اس میں خیارِ رؤیت نہیں ،ہاں خیارِ عیب ہے۔شرعاً اس عقد کا کیا حکم ہے؟اور اگر نا جائز ہو تو اس کی تصحیح کی کوئی شکل نکل سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ بالا عقد میں دو خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے عقد فاسد ہوگا۔(۱) ایک یہ کہ مبیع مجہول ہے۔(۲) غیر مرئی چیز کے خریدنے کے بعد خیارِ رؤیت ملنا چاہئے جو یہاں نہیں ،اگر دیکھنے سے پہلے مشتری ”رضیت“ کہدے پھر بھی خیارِ رؤیت ساقط نہیں ہوتا،جب کہ یہاں خیارِ رؤیت کا سوال ہی نہیں۔

(۱) فسادِ عقد کی پہلی خرابی مبیع کی جہالت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تجارت میں وہ جہالت مفسدِ عقد ہے جو"

مفضية إلى المنازعة "ہو، لیکن جو" مفضية إلى المنازعة "نہ ہو اور عرفِ عام میں مروج ہو وہ قابل تحمل ہے اور مفسدِ عقد نہیں ہے۔

صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

والأثمان المطلقة لاتصح إلا أن تكون معروفة القدر والصفة لأن التسليم والتسلم واجب بالعقد وهذه الجهالة مفضية إلى المنازعة فيمنع التسليم والتسلم، وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل. (الهداية: ٣/ ٢٠).

صاحبِ ہدایہ کی عبارت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہر جہالت مفسدِ عقد نہیں ہے، بلکہ وہ جہالت جو نزاع پیدا کردے وہی خاص طور پر مفسدِ عقد ہے۔

شرح المجلہ میں ہے:

وفي الهندية جهالة المبيع أو الثمن مانعة لجواز البيع إذا كان يتعذر معها التسليم وإن كان لايتعذر لايفسد العقد كما لو باع صبرة معينة ولم يعرف قدر كيلها أو باع أثواباً معينة ولم يعرف عددها، وإنما يفسد البيع بالجهالة الفاحشة إذا كان محتاجاً إلى تسليم المبيع وإلا فلا يفسد. (شرح المجلة لسليم رستم باز، ١/ ١٠٢، دار الكتب العلمية).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله معرفة قدر هو في المصنف منون يشمل قدر المبيع والثمن قال في البحر: وأشار بالمعرفة إلى أن الشرط العلم بهما دون ذكرهما كما في الإيضاح فلو كان المبيع مجهولاً جهالة فاحشة ولم يجربها العرف لايصح البيع. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ٣/ ١٢، كوئته).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

فإن كان مجهولاً جهالة مفضية إلى المنازعة يمنع صحة العقد، وإلا، فلا. (الفتاوى الهندية: ٤/ ٤١١، كتاب الاجارة).

فتاوی شامی میں ہے:

قوله وشرط لصحته معرفة قدر مبيع وثمن ككر حنطة وخمسة دراهم أو أكرار حنطة فخرج مالو كان قدر المبيع مجهولاً أي جهالة فاحشة، فإنه لايصح وقيدنا بالفاحشة لما

قالوه لوباعه جميع ما في هذه القرية أوهذه الدار والمشتري لايعلم ما فيها لايصح لفحش الجهالة ، أما لوباعه جميع ما في هذا البيت أو الصندوق أو الجوالق فإنه يصح لأن الجهالة يسيرة . (فتاوی الشامی:۵۲۹/٤،کتاب البیوع،سعید).

علامہ عینیؒ (۷٦۲۔۸۵۵م) فرماتے ہیں:

وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز أى جواز العقد هذا أى كون الجهالة المفضية إلى المنازعة مانعة هو الأصل أى في كتاب البيوع بالإجماع لأن شرعية المعاملات لقطع المنازعات المفضية إلى الفساد. (البنایة فی شرح الهدایة:۱۵/۳).

شاہ صاحب (۱۳۵۲م) فیض الباری میں فرماتے ہیں:

قلت: إن الناس يعاملون في أشياء تكون جائزة فيما بينهم على طريق المروءة والإغماض، فإذا رفعت إلى القضاء يحكم عليها بعدم الجواز...وذلک لأن العقود على نحوين:۔ نحو: يكون معصية في نفسه ، وذا لايجوز مطلقاً ، ونحو آخر: لايكون معصية وإنما يحكم عليه بعدم الجواز لافضاءه إلى المنازعة فإذا لم تقع فيه منازعة جاز .(فیض الباری: ۲۸۹/۳، کتاب الوکالة).

علی احمد الندوی "جمہرة القواعد الفقهية" میں فرماتے ہیں:

الجهالة ليست بمانعة لذاتها، بل لكونها مفضية إلى النزاع، وهذا أصل مهم ينبغي التعويل عليه في الأحكام، فإن به حل كثير من المشكلات، وليعلم أن أحكام المعاملات الشرعية مبنية على أصلين عادلين :

الأول : منع كل ما فيه ظلم وأكل لأموال الناس بالباطل .

الثاني: منع ما يؤدي إلى الاختلاف والنزاع بسبب الجهالة ، فإذا انتفى ما يؤدي إلى الظلم والنزاع بسبب الجهالة ، صح التعامل ، والعرف أصل عظيم يرجع إليه في ذلک بعد الشرع . (جمهرة القواعد الفقهية في المعاملات المالية : ۳۱۹/۱ ، تحت القاعدة : الجهالة انما توجب الفساد اذا كانت مفضية الى النزاع المشكل).

حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو جہالت نزاع کا سبب ہو وہ منع ہے اور جو جہالت نزاع کا سبب نہیں بنتی وہ منع نہیں ہے۔(درس الهداية: الجزء الثالث،ص ۲۹) .

(۲) فسادِ عقد کی دوسری خرابی رؤیت کا نہ ہونا ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ آج کل دکانوں میں تجارت بیع تعاطی کے طور پر ہوتی ہے جس میں ایجاب وقبول کا نام ونشان تک نہیں ہوتا، یعنی عقد میں خیارِ رویت کی نفی شامل نہیں ہوگی، بایں وجہ اگر بند ڈبوں کی خریداری بیع تعاطی کے ساتھ ہو اور مشتری نے لینے سے پہلے یا بعد میں وعدہ کیا ہو کہ میں دیکھنے کے بعد واپس نہیں کروں گا تو مشتری کو اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھنا چاہئے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

لو ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكر الشرط على وجه العدة، جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس. (شرح المجلة، فصل في حق البيع بشرط،۲/ ٦١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیع مطلق میں تاجیل ثمن کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے ایک کتاب ۵۰ ریند میں فروخت کی اور مشتری نے کہا ثمن بعد میں دیدوں گا تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اگر بائع نے کہا کہ مبیع اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ قیمت جنوری یا فروری میں دیدیں، تو کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر بیع کی تکمیل کے بعد یہ الفاظ کہے تو کوئی حرج نہیں بیع مطلق ہوئی اور بعد میں مدت میں جہالت ہو تو یہ مضر نہیں اور اگر ادھار کی شرط پر خریدی اور وقت مجہول ہو تو ناجائز ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بیع مؤجل میں اجل کی تعیین ضروری ہے اور بیع مطلق میں اجل کی جہالت مضر نہیں۔

ہدایہ میں ہے:

بخلاف ما إذا باع مطلقاً ثم أجل الثمن إلى هذه الأوقات أي إلى الحصاد وغيره حيث جاز لأن هذا تأجيل في الدين وهذه الجهالة فيه متحملة. (الهداية:۳/ ٦١).

شرح مجلّہ میں ہے:

وفي جامع الفصولين: الرواية محفوظة أنه لو باع مطلقاً ثم أجل الثمن إلى حصاد ودياس لايفسد ويصح الأجل. ووجهوه بأن التأخير بعد البيع تبرع فيقبل التأجيل إلى الوقت المجهول. (شرح المجلة للاتاسي،المادة: ۲۴۸، ۲/۱۶۸،الفصل الثانی ۔وکذا فی الدرالمختارمع ردالمحتار: ۴/۵۳۲،مطلب فی التاجیل الی اجل مجهول،سعید۔و ۵/۸۲،باب البیع الفاسد،سعید)۔

(۲) دوسری صورت درست نہیں،ہاں ایک تاریخ متعین کرلے اور بعد میں بائع سے مزید مہلت مانگ لے تو یہ درست ہے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

يلزم أن تكون المدة معلومة فى البيع بالتأجيل والتقسيط ، لأن جهالته تفضي إلى النزاع ، فالبائع يطالب في مدة قريبة، والمشتري يأباها ، فيفسد البيع ، بحر. (شرح المجلة للاتاسي، المادة: ۲۴۶، ۲/۱۶۷)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مبیع پر قبضہ کے بارے میں اختلاف کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے درخت خریدا اب مشتری اس کو اکھاڑنا چاہتا ہے اور بائع زمین کے اوپر کاٹنے کو کہتا ہے،کس کی بات مانی جائیگی؟

الجواب: بوقتِ شراء درخت کا سودا بلاکسی شرط کے ہوا تھا تو مشتری جڑ سے کاٹ سکتا ہے،اور اس صورت میں قریبی کنویں یا دیوار وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو،ورنہ سطح زمین سے کاٹنا ہی لازم ہوگا،اور اگر سطح زمین سے کاٹنے کی شرط کے ساتھ خریدا ہے تو اسی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوگا۔اور اگر کوئی شرط نہ ہو تو عرف پر مدار ہوگا۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

و فيها إذا اشترى شجرة للقلع فإنه يؤمر بقلعها بعروقها و ليس له حفر الأرض إلى انتهاء العروق بل يقلعها على العادة إلا إن شرط للبائع القلع على وجه الأرض أويكون فى القلع من الأصل مضرة على البائع كما إذاكانت بقرب حائط أوبئر لأنه فإنه يقطعهاعلى وجه الأرض. (البحرالرائق:۵/۲۹۴، کتاب البیع ،فصل یدخل البناء والمفاتیح فی بیع الدار)۔

ردالمحتار میں ہے:

اشتری شجرة للقلع يؤمر بقلعها بعروقها وليس له حفر الأرض إلى انتهاء العروق بل يقلعها على العادة إلا إن شرط البائع القطع على وجه الأرض أو يكون في القلع من الأصل مضرة للبائع ككونها بقرب حائط أو بئرفيقطعها على وجه الأرض . (ردالمحتار:۴/۵۵۴،کتاب البیوع ، مطلب فی بیع الثمرو الزرع و الشجرمقصوداً،سعید).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

ولو اشترى الشجرمطلقاً له أن يقطع من الأصل .(خلاصة الفتاویٰ :۳/۲۸،کتاب البیوع،الفصل الثالث فیمایجوزبیعه وفیمالایجوز).

قاضیخان میں ہے:

رجل اشترى شجرة بشرط أن يقلعها تكلموا في جوازه و الصحيح أنه يجوز و للمشتري أن يقلعها من أصلها، وإن اشترى بشرط القلع...وله أن يقطعها من وجه الأرض فأما عروقها في الأرض لا تكون له إلا بالشرط. (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندیة:۲/۲۴۵،کتاب البیوع).

وللاستزادة : انظر: (الفتاوی الهندية:۳/۳۵،کتاب البیوع ، باب مایجوزبیعه ومالایجوز۔فتاوی حقانیه:۶/۶۰،کتاب البیوع ،باب مایجوزبیعه ومالایجوز).

عطرِہدایہ میں ہے:

اگراس علاقہ کا عرف درختوں کواوپر سے کاٹ لینے کا ہو یاایک گز تک کھودکرتنہ نکالنے کا ہوتو عرف کے مطابق ہی عمل کیاجائیگا،اطراف وجوانب سے جڑیں نہیں نکالی جائیں گی،مگر یہ عقد کےوقت صراحت کے ساتھ طےہوجائے کہ دائیں بائیں سےبھی جڑیں نکالی جائیں گی۔

مسئلہ: جب جڑوں کے قریب کھودنے سے بائع کا نقصان ظاہرہوتاہوتومشتری کوکھودنے سے روکاجائیگاجیسےکوئی دیواریاکنواں۔(عطرہدایہ،ص۱۸۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بشرطِ حمل گائے کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک شخص نے گائے خریدی اس شرط پر کہ گابھن ہے لیکن وہ گابھن نہیں تھی، اب اس کو واپس کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کے ہاں حمل کی شرط کے ساتھ عقد فاسد ہے اور عقد فاسد واجب الرد ہے لہٰذا عقد کو فسخ کر کے دوبارہ عقد کرلے اور اس میں یہ شرط نہ لگائے، بلکہ بغیر اس شرط کے خریدلے، ہاں اگر بائع یہ وعدہ کرے کہ یہ گائے یا بکری حاملہ ہے اور بیع میں شرط نہ لگائے اور کہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر حمل نہ ہو تو واپس لے لوں گا، تو پھر حسب وعدہ اس کو واپس کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

فعلى هذا يتفرع ما لو باع ناقة أو شاة على أنها حامل أوتحلب كذا فسدالبيع. (فتح القدير:٦/٥٢٨،دار الفكر).

درمختار میں ہے:

بخلاف شراءه شاة على أنها حامل أوتحلب كذا رطلاً...فسد لأنه شرط فاسد لا وصف. وفي الشامية: قوله لأنه شرط فاسد، لأنه شرط زيادة مجهولة لعدم العلم بها...لأن ما فى البطن والضرع لاتعلم حقيقته. (الدر المختارمع ردالمحتار:٤/٥٨٨،سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

ولو باع شاة على أنها حامل فسد البيع لأن الولد زيادة مرغوبة وأنها موهومة لايدرى وجودها فلا يجوز. (شرح المجلة:٢/٦٧،لمحمدخالدالاتاسی).

شرح مجلّہ میں ہے: **لو ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكر الشرط على وجه العدة، جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس.** (شرح المجلة للاتاسی، فصل فی حق البيع بشرط،٢/٦١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مبیع کم ہونے پر ثمن کم کرانے کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے تین ایکڑ (۴۸۴۰ مربع گز کا رقبہ) زمین تین لاکھ میں خریدی ہر ایکڑ ایک لاکھ

میں بعد میں زمین کم نکلی تو قیمت کم کرا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زمین کا جتنا حصہ کم ہے اس کے مطابق ثمن کم کرانے کا اختیار ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ولو قال بعتكها على أنها مائة ذراع بمائة درهم كل ذراع بدرهم فوجدها ناقصة فالمشتري بالخيار إن شاء أخذها بحصتها من الثمن وإن شاء ترك لأن الوصف وإن كان تابعاً لكنه صار أصلاً بإفراده بذكر الثمن. (الهداية:۳/۲۳، كتاب البيوع).

تبیین الحقائق میں ہے:

ولو قال كل ذراع بكذا ونقص أخذه بحصته أوترك وإن زاد أخذ كله كل ذراع بكذا أوفسخ. معناه أنه إذا قال بعتكه على أنه عشرة أذرع كل ذراع بدرهم مثلاً فوجده ناقصاً فهو بالخيار إن شاء أخذه بحصته وإن شاء تركه وإن وجده زائداً أخذه كله كل ذراع بدرهم أوفسخ لأن الذراع وإن كان وصفاً يصلح أن يكون أصلاً لأنه عين ينتفع به بانفراده فاذا سمى لكل ذراع ثمناً جعل أصلاً وإلا فهو وصف فإذا صار أصلاً فإن وجده ناقصاً أخذه بحصته ويثبت له الخيار لتفرق الصفقة عليه. (تبيين الحقائق:٤/٦،كتاب البيوع، ملتان).

وللاستزادة انظر: (منحة الخالق على هامش البحر الرائق:٥/٢٩١،كوئته). **واللہ ﷻ اعلم۔**

چاول کے ڈھیر کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس چاول کا ڈھیر ہے وہ کہتا ہے کہ ہر کیلو۱۰ رینڈ میں تو کیا یہ بیع صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ بیع صاحبینؒ کے نزدیک جائز اور درست ہے اور فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن باع صبرة طعام كل قفيز بدرهم جاز البيع في قفيز واحد عند أبي حنيفةؒ إلا أن يسمى جملة قفزانها وقالا: يجوزفي الوجهين. (الهداية:۳/۲۲،كتاب البيوع).

البحر الرائق میں ہے:

وظاهر ما فی الهداية ترجيح قولهما لتأخير دليلهما كما هو عادته وقد صرح فی الخلاصة في نظيره بأن الفتویٰ علی قولهما...قال الفقيه أبو الليث والفتویٰ علی قولهما تيسيراً للأمر علی المسلمين. وعلی هامشه (قوله وقدصرح فی الخلاصة فی نظيره) قال فی النهر وفي عيون المذاهب به يفتیٰ لا لضعف دليل الإمام بل تيسيراً علی الناس...وعزا فی الدر المختار مثل ما فی النهر إلی الشرنبلالية عن البرهان والقهستاني عن المحيط وغيره.

(البحرالرائق مع منحة الخالق: ۲۸۵/۵، کتاب البيع، کوئٹة).

حاشیۃ الشرنبلالیہ میں ہے:

قوله وقالا: يجوز مطلقاً قال وفی البرهان وبه يفتیٰ وذكروجهه. (حاشية الشرنبلالية علی الدرر: ۱۴۷/۲).

وللاستزادة انظر: (خلاصة الفتاویٰ: ۳۲/۳۔وردالمحتار: ۵۴۰/۴ سعيد۔وحاشية الطحطاوی علی الدر المختار: ۷/۳، کوئٹة۔والبناية: ۳۸/۷). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بیعانہ ضبط کرنے کی شرط کے ساتھ تجارت کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے کار خریدنے کی بات شروع کی اور عمر کو بیعانہ دے دیا کہ اگر میں نہ خریدوں تو بیعانہ ضبط کیجئے پھر زید نے کسی وجہ سے نہیں خریدا تو بیعانہ ضبط کرنا جائز ہے یا نہیں؟ خریدنے کی صورت میں شرط فاسد کی وجہ سے عقد فاسد ہوا یا نہیں؟

الجواب: بیعانہ ضبط کرنا جائز نہیں ہے۔

بیعانہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ جائیداد کی خریداری میں بیع نامہ یا اقرارنامہ تحریر میں لاکر لین دین کا معاملہ مکمل کرنے سے پہلے خریدار کی جانب سے کچھ پیشگی رقم دیجاتی ہے اور پھر پوری ادا کر کے حساب بیباق کرتے وقت اس کو قیمت میں وضع کرلیا جاتا ہے تو اس طرح کا بیعانہ دینا جائز اور درست ہے، لیکن آج کل لوگوں میں دستور ہوگیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے خریدار طے شدہ جائیداد لینے سے مجبور ہوجائے تو خریدار کو بیعانہ کی رقم واپس نہیں دی جاتی ہے، بلکہ وہ رقم بائع اپنی ملکیت میں شامل کرلیتا ہے، تو شرعی طور پر بائع کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے، نیز اس طرح کا معاملہ قمار اور جوا کے مشابہ بھی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح پیشگی دی

ہوئی رقم ضبط کرنے کو قمار کے مترادف قرار دیا ہے۔

قال : ونهى عن بيع العربان أن يقدم المشتري إلى البائع شيء من الثمن، فإن اشترى حسب من الثمن، وإلا فهوله مجاناً، وفيه معنى الميسر. (حجة الله البالغة:۲/۱۹۱،البيوع المنهى عنها،قديمي كتب خانه).

حدیث شریف میں ہے:

مالک من الثقة عنده عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم نهى عن بيع العربان . (رواه مالك في الموطا،ص۵۶۸، ماجاء في بيع العربان۔ وابوداود:۲/۴۹۴۔وابن ماجة:۱۵۸،باب بيع العربان۔والبيهقي في سننه الكبرى:۵/۳۴۲).

قال أبو عبد اللّٰه : العربان أن يشترى الرجل دابة بمائة دينارفيعطيه دينارين عربوناً فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لک. (سنن ابن ماجة،باب بيع العربان،ص۱۵۸).

حدیث شریف کا ترجمہ:

حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعانہ کی رقم دیکر نہ لینے کی شرط سے منع فرمایا ہے، ابوعبداللہ ابن ماجہؒ فرماتے ہیں کہ عربان کی شکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص مثلاً سو دینار میں ایک جانور خرید لے پھر دو دینار یہ کہہ کر پیشگی دیدے کہ اگر میں جانور نہ خرید سکا تو دونوں دینار تمہارے لیے ہیں۔

بدایۃ المجتہد میں ہے:

جمهور علماء الأمصارعلى أن بيع العربان غيرجائز...وإنما صار الجمهور إلى منعه لأنه من باب الغرر والمخاطرة وأكل المال بغيرعوض. (بداية المجتهد:۵/۸).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

بیع نامہ دینا اس طرح کہ اگر بیع ہوئی تو منجملہ ثمن میں ہووے گا ورنہ ضبط ہو جائے گا نا جائز ہے،" لأن النبي عليه السلام نهى بيع العربان" مگر جو یہ ٹھہر جائے کہ درصورت عدم بیع کے بیعانہ واپس ہو جاوے گا درست ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ،ص۴۰۵).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

امام مالک، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ تینوں بزرگوں کے نزدیک یہ شرط لگانا جائز نہیں کہ اگر بیع تام نہ ہوئی

تو بائع یہ پیسے ضبط کرلے گا کیونکہ یہ پیسے بغیر کسی عوض کے بائع کے پاس چلے گئے، امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں بیع العربون جائز ہے لہذا وہ کہتے ہیں کہ بائع جو پیسے ضبط کر رہا ہے اس کا یہ پیسے ضبط کرنا درست ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۵۹)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ:۲۴/۲۰۱، مکتبہ محمودیہ۔ وفتاویٰ حقانیہ:۶/۹۹۔ غرر کی صورتیں، ص۱۳۰۔۱۵۸)۔

خریدنے کی صورت میں چونکہ شرطِ فاسد عقد سے پہلے لگائی تھی لہذا اس سے عقد فاسد نہیں ہوگا۔

شرح مجلّہ میں ہے:

بقي ما إذا ذكر الشرط قبل العقد ثم عقد خالياً عن الشرط، وقد ذكره في الثامن عشر من جامع الفصولين حيث قال: شرطا شرطاً فاسداً قبل العقد، ثم عقدا، لم يبطل العقد. (شرح المجلة للاتاسی، فصل فی حق البیع بالشرط،۲/۶۱).

وكذا ذكره ابن عابدينؒ فی حاشيته علی الدر المختار:۵/۸۴،مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذكر بعد العقداوقبله،سعيد).

اشکال اور جواب:

اشکال: مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت میں بیع عربان کا جواز منقول ہے، اسی روایت پر امام احمد بن حنبلؒ نے مذہب کی بنیاد رکھ کر جائز قرار دیا ہے اس کا کیا جواب ہے؟

قال في التلخيص الحبير: قال عبد الرزاق في مصنفه: أنا الأسلمي عن زيد بن أسلم سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن العربان في البيع فأحله وهذا ضعيف مع إرساله والأسلمي هو إبراهيم بن محمد بن أبي يحيىٰ. (التلخيص الحبير:۳/۴۰).

وفي نيل الأوطار: أخرج عبدالرزاق في مصنفه عن زيد بن أسلم...إلى قوله وهو مرسل وفي إسناده إبراهيم بن أبي يحيىٰ وهو ضعيف. (نيل الاوطار:۵/۱۶۲).

امام احمد بن حنبلؒ بخاری شریف میں مذکور ایک واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں:

واشترى نافع بن عبد الحارث داراً للسجن بمكة من صفوان بن أمية على أن عمر ﷺ رضي بالبيع فالبيع بيعه وإن لم يرض عمر ﷺ فلصفوان أربع مائة دينار وسجن ابن الزبير ﷺ بمكة. (بخاری شريف:۱/۳۲۷، باب الربط والحبس فی الحرم۔ واخرجه عبدالرزاق فی مصنفه:۵/۱۴۷،باب الكراء فی الحرم).

اس قصہ میں چار سو دینار بطورِ بیعانہ کے دیئے تھے۔

الجواب: علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کا جواب دیا ہے۔ملاحظہ ہو:

عمدۃ القاری میں ہے:

وأجيب بأنه لم يكن داخلاً في نفس العقد بل هو وعد أو هو مما يقتضيه العقد أو كان بيعاً بشرط الخيار لعمر ﷺ أو إنه كان وكيلاً لعمر ﷺ وللوكيل أن يأخذ لنفسه إذا رده الموكل بالعيب ونحوه. (عمدة القاري:۹/۱۵۱).

فتح الباری میں ہے:

وأما كون نافع شرط لصفوان أربع مائة إن لم يرض عمر ﷺ فيحتمل أن يكون جعلها في مقابلة انتفاعه بتلك الدار إلى أن يعود الجواب من عمر ﷺ. (فتح الباري :۵/۷۶).

بہر حال مسئلہ مجتہد فیہا ہے اور مسئلہ کے مختلف فیہ ہونے اور ضرورت کی وجہ سے امام احمدؒ کے مسلک پر حضرت مفتی تقی عثمانی دام فضلہ نے فتویٰ دیا ہے۔ملاحظہ ہو اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

چونکہ معاملہ مجتہد فیہ ہے اس لیے عربون کو بالکلیہ باطل نہیں کہہ سکتے اور بسا اوقات اس قسم کے معاملہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے، بالخصوص ہمارے زمانے میں جہاں ایک ملک سے دوسرے ملک بین الاقوامی تجارت ہوتی ہے وہاں یداً بید معاملہ نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے۔اور اگر کوئی شخص دوسرے سے معاملہ کرلے کہ میں تم سے سامان منگوا رہا ہوں بائع نے اس کے لیے سامان اکٹھا کیا، سب کچھ کیا، لاکھوں روپے خرچ کیے بعد میں وہ مکر جائے کہ میں بیع نہیں کرتا تو اس صورت میں بائع کا بڑا سخت نقصان ہوتا ہے، ایسی صورت میں بائع اگر عربون کی شرط لگالے تاکہ مشتری پابند ہوجائے تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت میں امام احمد بن حنبلؒ کے قول پر عمل کیا جائے، باقی جہاں ضرورت نہ ہو ویسے ہی لوگوں نے پیسے کمانے کا ذریعہ بنالیا تو وہ جائز نہیں۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۶۱، ادارۂ اسلامیات)۔

اور اپنے والد صاحب حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے نقل فرمایا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ نے معاملات میں بوقتِ ضرورت یا ابتلائے عام دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کی اجازت حضرت گنگوہیؒ سے لی تھی۔(غیر سودی بینکاری، از مفتی تقی، ص ۲۸۸)۔

جہاں تک سنن ابن ماجہ کی روایت ہے تو یہ روایت ضعیف ہے۔

دکتور بشار عواد سنن ابن ماجہ کی تعلیق میں فرماتے ہیں:

إسناده ضعيف، لانقطاعه، فقد رواه مالك بلاغاً عن عمرو بن شعيب أخرجه مالك في المؤطا (۳۷۷) **وأحمد** (۲/۱۸۳) **وأبو داود** (۳۵۰۲) **وانظر: تحفة الأشراف** (۶/۳۴۲/۸۸۲۰) **وتهذيب الكمال** (۳۵/۱۰۰) **ومصباح الزجاجة**(ص۱۳۸) **والمسند الجامع** (۱۱/۱۱۵/۸۴۶۹) **وضعيف ابن ماجة للألباني**(۴۷۵) **وهو مكرر ما بعده. وعن مالك بن أنس قال: حدثنا عبد الله بن عامر الأسلمي عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده.... وإسناده ضعيف، لضعف عبد الله بن عامر الأسلمي.** (سنن ابن ماجه بتعليق الدكتور بشار عواد: ۳/۵۴۳).

وفي حاشية السندي على ابن ماجة: وروى عن ابن عمر ﷺ أنه أجاز هذا البيع ويروى عن عمر ﷺ ومال أحمد إلى القول بإجازته وضعف الحديث فيه لأنه منقطع يقال: رواه مالك عن ابن شعيب بلاغاً. (حاشية السندي على سنن ابن ماجة: ۴/۴۱۵). **واللہ ﷻ اعلم۔**

تالاب میں مچھلی کی تجارت کا حکم:

سوال: میں مچھلی فروش ہوں اور مختلف جگہ سے مچھلیاں خریدتا ہوں ان میں کونسی صورتیں جائز ہیں؟

(۱) تالاب سے نکالنے کے بعد مچھلیاں خریدتا ہوں۔

(۲) تالاب کے اندر مچھلیوں کو خریدتا ہوں اس لیے کہ تالاب مچھلیوں ہی کے لیے بنایا گیا ہے، اور تالاب کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان کا پکڑنا آسان ہے، اور تالاب کی زمین مالک کی ملکیت ہے۔

(۳) اگر تالاب کے بڑے ہونے کی وجہ سے مچھلیوں کا پکڑنا محنت طلب ہے تو اب خریدنے کا کیا حکم ہے؟

(۴) تالاب کسی کی ملکیت میں نہیں لیکن بعض لوگ اس پر مسلط ہیں اور وہ تالاب کی مچھلیوں کے پکڑنے کی اجازت دیتے ہیں اور اپنا بھتا وصول کرتے ہیں۔

(۵) تالاب مملوک نہیں لیکن اس تک پانی لانے کی تدبیر کی ہے۔ (ان سب کے احکام مختصراً بیان کیجئے؟)

الجواب: (۱) تالاب سے نکالنے کے بعد مچھلیاں خریدنا جائز ہے، جب کہ بہ آسانی مچھلیوں کے پکڑنے پر قادر ہو۔

الدرالمختار میں ہے:

وفسد بيع سمک لم يصد أو صيد ثم ألقي في مكان لايؤخذ منه إلا بحيلة وإن أخذ بدونها صح. (الدرالمختار:٥/ ٦٠،سعيد).

وفي حاشية ابن عابدين: وأنه (السمک) يملک بالقبض. (فتاوى الشامي:٥/ ٦٠،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: اگر مچھلی نکال کر ملاح کے ہاتھ فروخت کردی جائے تو کوئی شرعی قباحت ورکاوٹ تو نہیں؟

الجواب: خود مچھلی نکال کر ملاح کے ہاتھ فروخت کردینا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۲۴/۳۳،مکتبہ محمودیہ).

(۲) جائز ہے۔

ہدایہ میں ہے:

ولو كان يؤخذ بغير حيلة اصطياد جاز. (الهداية:٣/ ٥١ـ وكذا فى الفتاوى الهندية:٣/ ١١٣ـ وكذا فى فتاوى الشامى:٥/ ٦٠،سعيد).

(۳) جب بہ آسانی پکڑنا ممکن نہ ہو تو غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے اس کا خریدنا جائز نہیں ہے۔

درمختار میں ہے:

وفسد بيع سمک لم يصد أوصيد ثم ألقي في مكان لايؤخذ منه إلا بحيلة .وفى الشامية : قوله فلو سده ملكه أى فيصح بيعه إن أمكن أخذه بلا حيلة وإلا فلا ، لعدم القدرة على التسليم. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ٥/ ٦٠،مطلب فى البيع الفاسد، سعيد).

وفى ردالمحتار: او بحيلة لم يجز لانه وان كان مملوكاً فليس مقدور التسليم. (ردالمحتار: ٥/٦١، مطلب فى البيع الفاسد، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

ولا في حظيرة إذا كان لايؤخذ إلا بصيده لأنه غير مقدور التسليم . (الهداية:٣/ ٥١).

(۴) کسی چیز کو فروخت کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ جو چیز بیچی جارہی ہے وہ بیچنے والے کی ملکیت ہو، دوسرے یہ ہے کہ اس کی حوالگی اور سپردگی ممکن ہو۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

مچھلی کے مالک ہونے کی تین صورتیں ہیں، (۱) کسی نے مچھلی ہی کے لیے تالاب کھدوایا ہو اور اس میں مچھلی آگئی ہو۔ (۲) اس مقصد کے لیے زمین تیار تو نہ کی گئی ہو لیکن پانی کے ساتھ مچھلی آنے کے بعد واپسی کا راستہ بند کردیا گیا ہو۔ (۳) خود اس نے پانی میں مچھلیاں ڈالی ہوں تاکہ ان کی افزائش ہو ان ہر سہ صورتوں میں اس وقت مچھلی کو مقدور التسلیم تصور کیا جائیگا کہ بلا شکار مچھلی کا حصول ممکن ہو۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۳۰۶).

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں جولوگ تالاب پر مسلط ہیں اگر وہ ان مذکورہ بالا تین صورتوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مچھلی کے مالک ہیں ان سے خریدنا جائز اور درست ہے۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

تالاب وغیرہ میں موجود مچھلیوں کے نکالے بغیر خریدنا بیچنا درست نہیں، سوائے اس کے کہ مچھلیاں اس قدر کثیر تعداد میں ہوں کہ ان کے حصول میں شکار کی حاجت نہ ہو۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۳۱۶).

(۵) اگر تالاب تک پانی لانے کی تدبیر اس مقصد سے کی ہے کہ مچھلی حاصل کی جائے اور مچھلی آنے کے بعد واپسی کا راستہ بند کردیا جائے تو مچھلی اس شخص کی مملوک ہوگی پھر اگر مچھلی کا حصول بہ آسانی ممکن ہو تو اس کی خرید وفروخت بھی جائز ہوگی۔

فتح القدیر میں ہے:

وإن لم يكن أعدها لذلك لايملك مايدخل فيها فلايجوز بيعه لعدم الملك إلا أن يسد الحظيرة إذا دخل فحينئذٍ يملكه ثم ينظر إن كان يؤخذ بلاحيلة جاز بيعه وإلا لايجوز.

(فتح القدير:٦/ ٤١٠، دارالفكر، وكذا في فتاوى الشامي:٥/ ٦١، سعيد).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (امداد الفتاویٰ:۳/۴۶-۵۰۔ واحسن الفتاویٰ:۶/۴۸۰۔ وامداد الاحکام: ۳/۳۶۵۔ وجدید فقہی مسائل:۴/۳۰۱-۳۱۶). واللہ ﷻ اعلم۔

مباح الاصل اشیاء کو جمع کر کے فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنی بستی کے قریب پہاڑوں سے درخت کاٹتا ہے اور بیچتا ہے کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر میونسپل کمیٹی یا حکومت نے وہاں درخت کاٹنے سے منع کیا ہو تو پھر کاٹنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: مباح الاصل اشیاء کو جمع کر کے فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ لہٰذا پہاڑوں سے

درخت کاٹنا اوراس کوفروخت کرنا جائز اور درست ہے،لیکن اگر حکومت یا میونسپل کمیٹی نے منع کیا ہوتو پھر اس کا کاٹنا جائز نہیں، جب کہ ان کا منع کرنا معقول ہو مثلاً آج کل لوگوں کومنع نہ کیا جائے تو جنگلات اور پہاڑوں کے درختوں کو لوگ ختم کردیں گے،جن کو باقی رکھنے میں بہت سارے فوائد ہیں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے حسن وجمال کو باقی رکھنے کے لیے وہاں کے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا تھا۔

شرح مجلّہ میں ہے:

يسوغ الاحتطاب من أشجار الجبال المباحة لكل أحد كايناً من كان وبمجرد الاحتطاب يعني بجمعها يصير مالكاً لها والربط ليس بشرط. عبارة الهندية: عن القنية: المحتطب يملك الحطب بنفس الاحتطاب ولايحتاج إلى أن يشده ويجمعه حتى يثبت له الملك. (شرح المجلة لمحمدخالد الاتاسی،٤/١٨٨،فصل فی بيان كيفية استملاك الاشياء المباحة).

فتاوی شامی میں ہے:

والحطب في ملك رجل ليس لأحد أن يحتطبه بغير إذنه، وإن كان غيرملك فلا بأس به، ولايضر نسبته إلى قرية أوجماعة مالم يعلم أن ذلك ملك لهم...ويملك المحتطب الحطب بمجرد الاحتطاب وإن لم يشده ولم يجمعه. (فتاوی الشامی:٦/٤٤٠،فصل الشرب،سعيد).

وللاستزادة : انظر: (البحرالرائق: ٥/١٨٣،فصل فی الشركة الفاسدة،كوئته۔والمبسوط للامام السرخسی:٩/١٥٣).

عطر ہدایہ میں ہے:

مباح اصلی: یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ اور رحمتِ تامہ نے عام مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا ہے تاکہ ہر کمزور وقوی فقیر ومالدار، بلکہ درندے اور پرندے بھی ان سے فائدہ حاصل کرسکیں پس مباح چیزیں عقل مندوں کے لیے کافی ہیں کمانے اور مصائب سے بچنے کے لیے، جیسے دریا، جنگلات، پہاڑ اور ان تینوں کی چیزیں جنگلی حلال جانوروں کا گوشت، کھالیں، بارش کا پانی سب کے لیے مباح ہیں، کھانا، لباس اور سکونت کے لیے کافی ہیں۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

ہر مباح چیز قبضہ سے ملک میں داخل ہوجاتی ہے اور جب تک باقاعدہ ملک سے نہ نکالی جائی ملک سے باہر نہیں ہوتی۔لہذا موتی مونگا، جواہر، لکڑی، پھل پھول گھاس، پانی، جانور، مچھلیاں، کنکر، پتھر، اور جملہ معدنیات قبضہ کے بعد مملوک ہوجاتی ہیں، اور کسی کے قبضہ میں آنے سے پہلے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس پر قبضہ کرلے۔

نیز مذکور ہے:

حکومت کے لیے جائز نہیں کہ مباح چیزوں پر قبضہ کرکے اللہ تعالیٰ کے حکمت بالغہ کو مٹانے کے درپے ہو...البتہ انتظامی طور پر کسی راستہ کو بند کرنا، یا کسی جنگل کو کاٹ دینا یا جنگل کی گھاس کی پرورش کرنا، اور کسی کو دخل دینے کا اختیار نہ دینا جائز ہے۔(عطر ہدایہ ص۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، باب چہارم مباحات کا بیان)۔

مسلم شریف میں ہے:

عن عامر بن سعيد عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إني أحرم مابين لابتي المدينة أن يقطع عضاها أو يقتل صيدها. (مسلم شريف:١/ ٤٤٠).

شرح معانی الآثار میں ہے:

عن نافع عن ابن عمر ﷺ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن آطام المدينة أن تهدم وقال: إنها من زينة المدينة. (شرح معاني الآثار:٤/ ١٩٣، ١٩٤، باب صيدالمدينة، بيروت).

قال الطحاوي: يحتمل أن يكون سبب النهي عن صيد المدينة وقطع شجرها كون الهجرة إليها واجبة فكان يفعله بقاءً لزينتها ليتطيبوها ويألفوها لأن بقاء ذلک مما يزيد في زينتها ويدعو اليها كما روي عن ابن عمر ﷺ نهى عن هدم آطام المدينة فإنها من زينتها.

(مرقات: ٦/ ٢٠۔ وتحفة الاحوذی: ١٠/ ٢٩٢، باب فی فضل المدینة۔وفتح الباری: ٤/ ٨٣، باب حرم المدینة۔والتمهید لابن عبدالبر:٦/ ٣١٠).

مذکورہ بالا احادیث اور شرح سے معلوم ہوا کہ امام المسلمین یا کسی بستی کا منتظم کسی جگہ کے درختوں کے کاٹنے کو کسی مصلحت کی وجہ سے منع کرسکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشرک کی عبادت گاہ کی اشیاء فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی مشرک اپنی عبادت گاہ کے لیے سامان خریدنا چاہے، تو کیا اس کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے البتہ صاحبینؒ کے نزدیک ممنوع ہے، لہٰذا اجتناب اولیٰ اور بہتر ہے، تاہم آمدنی حلال ہے۔

درمختار میں ہے:

قلت: وقدمنا ثمة معزياً للنهر أن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً وإلا فتنزيهاً فليحفظ توفيقاً، وجاز تعمير كنيسة ...وقالا: لاينبغي ذلك لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة، زيلعي. وفي الشامية: قوله وجازتعمير كنيسة، قال في الخانية: ولوآجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به لأنه لا معصية في عين العمل. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/ ٣٩١،فصل في البيع،سعيد).

عالمگیری میں ہے:

ولو استاجر الذمي مسلماً ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية:٤/ ٤٥٠).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: کفار مشرک اگر اپنی عبادت گاہ کی تعمیر کے واسطے یا بتوں کی پرستش کے لیے کوئی چیز کسی مسلمان سے خریدیں یا کسی مسلمان کو اجرت پر رکھیں تو اس چیز کا ان کے ہاتھ فروخت کرنا یا اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہے، صاحبینؒ کے نزدیک ممنوع ہے، لہٰذا احتیاط بہتر ہے، اور جو کوئی غریب مبتلا ہو اس پر دارو گیر نہ کرے۔ (امداد الفتاویٰ:٣/ ١١١).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جواہر الفقہ میں اعانت علی المعصیۃ کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مختصراً درج کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

ثم السبب على قسمين قريب وبعيد ثم القريب على قسمين:۔ سبب محرك للمعصية بحيث لولاه لما أقدم الفاعل على هذه للمعصية كسب آلهة الكفار بحيث يكون

سبباً مفضياً لسب الله سبحانه وتعالىٰ ومثله نهي أمهات المؤمنين عن الخضوع في الكلام للاجانب ... وسبب ليس كذلك ولكنه يعين لمريد المعصية ويوصله إلى ما يهواه كإحضار الخمر لمن يريد شربه...فالقسم الأول من السبب القريب حرام بنص القرآن ... والقسم الثاني من السبب القريب أعني مالم يكن محركاً وباعثاً بل موصلاً محضاً فحرمته و إن لم تكن منصوصة ولكنه داخل فيه باشتراك العلة وهي الإفضاء إلى الشر والمعصية ولهذا أطلق الفقهاء عليها لفظ كراهة التحريم لا الحرمة...وأما السبب البعيد كبيع الحديد من أهل الفتنة...وبيع الآجر والحطب ممن يتخذها كنيسة أو بيعة...إذا علم فتكره تنزيهاً . (جواہر الفقہ:۲/۴۴۹-۴۵۲،اقسام السبب واحکامہ،مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اور سب ممنوع نہیں ہیں، بلکہ:

(۱) سببِ قریب محرک مثلاً معبودانِ باطلہ کو برا بھلا کہنا، یہ نص قرآنی سے حرام ہے۔

(۲) سببِ قریب غیر محرک مثلاً اہل فتنہ وفساد کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا۔ یہ مکروہ تحریمی ہے۔

(۳) سبب بعید مثلاً کفار کی عبادت گاہ کے لیے ان کے ہاتھ ملبا وغیرہ فروخت کرنا یہ مکرہ تنزیہی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

مال پہنچنے سے قبل ضائع ہونے پر تاوان کا حکم:

سوال: زید نے عمرو سے کافی سارا مال خریدا اور عمرو سے کہا کہ کسی ٹرک کے حوالہ کردو، عمرو نے ایسا ہی کیا، راستہ میں چوروں نے مال لوٹ لیا، تو تاوان بائع پر لازم ہوگا یا مشتری اس کا ذمہ دار ہے؟

الجواب: شریعت اسلامیہ میں صرف بیع ہوجانے اور ملکیت ثابت ہوجانے سے ضمان منتقل نہیں ہوتا، جب تک خریدار کا اس پر قبضہ نہ ہوجائے، اور قبضہ کی حقیقت اور خاص صورت قرآن وحدیث میں مقرر نہیں لہذا اس کا مدار عرف پر ہوگا، بنابریں جب تک مشتری کو عرفاً قبضہ حاصل نہ ہوجائے بائع ہی کی ملکیت قرار دی جائیگی اور ہلاک ہونے کی صورت میں بائع ذمہ دار ہوگا، ہاں اگر عرفاً قبضہ حاصل ہوگیا تھا پھر ہلاک ہوا تو مشتری اس کا ذمہ دار ہے۔

چنانچہ صورتِ مسئولہ میں ترسیل کا عمل مشتری کے حکم سے ہوا اور اس کا خرچہ بھی مشتری نے ادا کیا تو یہ عرفی

قبضہ سمجھا جائیگا اور ضائع ہونے کی صورت میں مشتری اس کا ذمہ ہوگا، اور اگر ترسیل اور روانہ کرنے کا حکم تو مشتری نے دیا تھا لیکن خرچہ وغیرہ بائع نے ادا کیا تو اس صورت میں بھی قبضہ متحقق ہوجائیگا اور ہلاک ہونے پر مشتری ہی ذمہ دار ہوگا، اور اگر بائع نے از خود ارسال کیا نہ مشتری نے حکم دیا اور نہ مشتری نے خرچہ وغیرہ ادا کیا، اس صورت میں ہلاک ہونے پر بائع ذمہ دار ہوگا، کیونکہ قبضہ متحقق نہیں ہوا۔

ملاحظہ ہو رد المحتار میں ہے:

وحاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع،...قال أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضاً...اشترى وعاء لبن خاثر في السوق فأمر البائع بنقله إلى منزله فسقط في الطريق فعلى البائع إن لم يقبضه المشتري،...إلا أن يقول(المشترى): ادفعه إلى الغلام لأنه توكيل للغلام والدفع إليه كالدفع إلى المشتري. (ردالمحتار:٤/٥٦٢،٥٦٣،مطلب في شروط التخلية،سعيد۔وكذا في الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٤/٤٩٩۔ والفتاوى الهندية:٣/١٩).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولايشترط القبض بالبراجم، لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفاً وعادةً حقيقةً. (بدائع الصنائع:٥/١٤٨،سعيد).

وفيه أيضاً: وكذلك لو فعل البائع شيئاً من ذلك بأمر المشترى لأن فعله بأمر المشتري بمنزلة فعل المشتري بنفسه. (بدائع الصنائع:٥/٢٤٦).

المغنی میں ہے:

لأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف. (المغني لابن قدامة الحنبلي،٤/٢٢٠).

عطر ہدایہ میں ہے:

جو مال ریل یا ڈاک وغیرہ کے ذریعہ بھیجا جائے تو وہ روانہ کرتے ہی مشتری کے قبضہ میں سمجھا جائے گا، جس نے منگوایا ہے، اگر خریدار نے لکھا ہے کہ فلاں مال ریل یا ڈاک کے ذریعہ پارسل کردو، اور مالک نے اس کے مطابق روانہ کیا اگر راستہ میں ضائع ہوگیا تو بائع ذمہ دار نہیں کیونکہ بائع نے مشتری کے وکیل (یعنی ریل یا

ڈاک) کے حوالہ کردیا اور اگر مشتری نے نہیں منگوایا بلکہ بائع نے خود بھیجا تو یہ پارسل کرنا مشتری کا قبضہ نہیں ہے اب اگر مشتری تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہوگیا تو مشتری اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ (عطر ہدایہ ص ۱۸۷، پارسل کے احکام)۔

وللاستزادة انظر : (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی:۲/۲۰۲،۲۰۴۔ واسلام اور جدید معاشی مسائل:۳/۲۰۰،۲۰۴۔ وجدید فقہی مسائل:۴/۱۹۶،۲۰۰۔ وجدید فقہی مباحث:۱۵/۱۲۔۱۶،۸۷،۱۰۹،۱۲۱،۲۵۴)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بائع کا مشتری سے کم قیمت پر خریدنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی ٹائلس (Tiles) خریدتا ہے کبھی ضرورت سے زائد خرید لیتا ہے، پھر زائد کو واپس کرنا چاہتا ہے تو بائع کہتا ہے کہ ۲۰ فیصد کم پیسہ ادا کریگا، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟ کیا یہ شراء ما باع باقل مما باع میں داخل ہے یا نہیں؟ اعلاء السنن میں ہے: فإن كان البيع الأول مشروطاً بالبيع الثاني فهو غير جائز أيضاً لعدم جواز البيعتين في بيعة وإن لم يكن مشروطاً فهو مكروه لأنه مضطر. الخ. (اعلاء السنن:۱۴/۱۷۸)۔ کراہت کی علت بیع مضطر فرمایا ہے، تو یہ بیع مضطر ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیع اول میں بائع نے مکمل ثمن پر قبضہ کرلیا تھا پھر مشتری سے کم قیمت پر خریدا تو بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ اور شراء ما باع باقل مما باع جو فقہاء کے ہاں ممنوع ہے وہ ثمن اول ادا کرنے سے پہلے ربح مالم یضمن کی وجہ سے ممنوع ہے، یہاں یہ صورت نہیں ہے، اور اعلاء السنن کی عبارت کا تعلق بیع عینہ سے ہے اور بیع عینہ کا تعلق مقرض ومستقرض کے ساتھ ہے، صورتِ مسئولہ اس سے مختلف ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

وفسد شراء ما باع بنفسه أو بوكيله من الذي اشتراه ولو حكماً كوارثه بالأقل من قدر الثمن الأول قبل نقد كل الثمن الأول...ولابد لعدم الجواز من اتحاد جنس الثمن وكون المبيع بحاله فإن اخلتف جنس الثمن أوتعيب المبيع جاز مطلقاً كما لو شراه بأزيد أو بعد النقد. وفي الشامية:قوله قبل نقد كل الثمن الأول. قيد به لأن بعده لا فساد، ولايجوز قبل النقد وإن بقي درهم...والحاصل أن نقد كل الثمن شرط لصحة الشراء لا لفساده لأنه

يفسد قبل نقد الكل أو البعض، فتأمل. (الدر المختار معرد المحتار:٥/٧٣، ٧٤، سعيد).

وفي فتح القدير: وقيد بقوله قبل نقد الثمن لأن مابعده يجوز بالإجماع بأقل من الثمن. (فتح القدير:٦/٤٣٣، دار الفكر).

نیز اعلاء السنن میں بیع عینہ کو بیع مضطر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ لکھی ہے:

لأن المشتري لا حاجة له في الحريرة وإنما حاجته في الدراهم، والبائع لا يرضى بالإقراض، وإنما يرضى بالبيع كذلک، فهو مضطر إلى الشراء فيكون مكروهاً، والوجه فيه أن فيه بخلاً مذموماً وتركاً للمبرة والإحسان الذين هما من مكارم الأخلاق. (اعلاء السنن:١٤/١٧٨).

وللاستزادة انظر: (فتح باب العناية في شرح كتاب النقاية:٣/٢٤٢، بيروت-بيوع العينة والآجال، من منشورات مدرسة عائشة الصديقة للبنات، كراتشي، باكستان- **وجدید معاملات کے شرعی احکام**:١/٥٧).

واللہ ﷻ اعلم۔

شراب کی تجارت والے کے ہاتھ سودا سلف فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک مسلمان شراب ہی کا کاروبار کرتا ہے یہی اس کی آمدنی ہے، کیا اس کے ہاتھ سودا سلف بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر وہ شخص شراب شرابیوں کے پینے کے لیے بیچتا ہے تو اس کی آمدنی ناجائز ہے، اس کے ہاتھ کسی چیز کو فروخت نہ کرے، اور اگر ضرورت کی وجہ سے فروخت کرتا ہے جیسے الکحل وغیرہ کہ بہت ساری ادویات اور رنگوں میں استعمال ہوتا ہے، ایسی آمدنی والے شخص کو سامان فروخت کر سکتے ہیں، ہاں جو شراب اشربہ اربعہ محرمہ میں سے ہو یعنی انگور کی کچی یا پکی ہوئی شراب کھجور اور معقہ کی شراب ان شرابوں کی تجارت کی بالکل گنجائش نہیں ہے، اور ایسے شخص کے ہاتھ سامان فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

وسقط تقومها في حق المسلم حتى لايضمنها متلفها وغاصبها ولايجوز بيعها، لأن اللّٰه تعالىٰ لما نجسها فقد أهانها، والتقوم يشعر بعزتها، وقال عليه الصلاة والسلام: "إن الذي حرم شربها حرم بيعها وأكل ثمنها". (فتاوى الشامي:٦/٤٤٩، كتاب الاشربة، سعيد).

وفي ردالمختار: قوله وصح بيع غير الخمر أى عنده خلافاً لهما فى البيع والضمان، لكن الفتوىٰ على قوله فى البيع، وعلى قولهما فى الضمان. (فتاوى الشامى:٦/٤٥٤،كتاب الاشربة،سعيد).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

والقسم الثالث: الأشربة المسكرة الأخرى، غير الأقسام الأربعة المذكورة، مثل نبيذ التمر أو الزبيب المطبوخ أدنى طبخة، أوعصير العنب المطبوخ الذي ذهب ثلثاه، وكذلك نبيذ العسل، والتين، والحنطة، والشعير، والحبوب الأخرى، وحكم هذا القسم عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ: أنه لايحرم منه شرب القليل الذي لايسكر، وإنمايحرم منه القدر المسكر...وأفتى كثير من الحنفية بقول الجمهورفي حق الحرمة، وبقول أبي حنيفةؒ في جواز بيع غير الخمروعدم وجوب الحد منه إلا إذا أسكر، وقد صرح ابن عابدينؒ فى الأشربة من ردالمحتار: ٥/٣٢٣، بأن الفتوىٰ على قول أبي حنيفةؒ في جوازالبيع مع الكراهة والظاهر أن الكراهة إنما تثبت إذا تعاطاه الرجل لغرض غيرمشروع، وأما إذا تعاطاه لغرض مشروع، كالدواء والضماد وغيره فيما يجوزاستعماله فيه، فالظاهرانتفاء الكراهة حينئذٍ...وبهذا يتبين حكم الكحول المسكرة (ALCOHOLS) التي عمت بهاالبلوى اليوم، فإنها تستعمل في كثير من الأدوية والعطوروالمركبات الأخرى، فإنها إن اتخذت من العنب أوالتمر فلا سبيل إلى حلتها أوطهارتها، وإن اتخذت من غيرهما فالأمرفيها سهل على مذهب أبي حنيفةؒ، ولايحرم استعمالها للتداوي أولأغراض مباحة أخرى مالم تبلغ حد الإسكار، لأنها إنما تستعمل مركبة مع المواد الأخرى، ولايحكم بنجاسها أخذاً بقول أبي حنيفةؒ، وإن معظم الكحول التي تستعمل اليوم فى الأدوية والعطوروغيرها لاتتخذ من العنب أوالتمر، إنما تتخذ من الحبوب أوالقشور أوالبترول وغيره، وحينئذٍ هناك فسحة فى الأخذ بقول أبي حنيفةؒ عند عموم البلوىٰ، واللّٰه سبحانه أعلم. (تكملة فتح الملهم:٣/٦٠٠،٦٠٨،كتاب الاشربة، مكتبة دارالعلوم كراتشى).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اشربہ اربعہ کے علاوہ جب شراب دیگر اناج و اشیاء سے بنائی گئی ہو تو بصورتِ شرعی مجبوری استعمال کرنا جائز ہے، تو اس کی تجارت کی بھی گنجائش موجود ہے، موجودہ الکحول (جو شراب ہی کی ایک قسم ہے) چونکہ پٹرول، جو، مکئی وغیرہ اشیاء سے بنائی جاتی ہے اور ضرورۃً بہت ساری ادویات، رنگوں کے علاوہ دیگر کیمیکلز میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، اس لیے بنا بر قول امام ابو حنیفہؒ اس کی خرید و فروخت جائز ہے، موجودہ دور میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ ہے۔ (فتاویٰ حقانیہ: ۶/۱۰۳). واللہ ﷻ اعلم۔

پھلوں کی تجارت کا حکم:

سوال: یہاں پھلوں کے باغات کی خریداری کے مختلف طریقے رائج ہیں، ان میں سے کونسے جائز اور کونسے ناجائز ہیں؟

(۱) پھلوں کو پکنے کے بعد خریدتے ہیں لیکن فی الفور نہیں توڑتے بلکہ وقتاً فوقتاً توڑتے ہیں اور بیع مکمل ہونے کے بعد یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ مہینہ یا دو مہینے پھلوں کو باقی رکھا جائیگا۔

(۲) عقد ہی میں شرط لگائی جاتی ہے کہ کچھ مدت پھلوں کو باقی رکھا جائیگا۔

(۳) شرط نہ عقد سے پہلے لگائی جاتی ہے اور نہ بعد میں لیکن عرفاً پھلوں کو رکھا جاتا ہے۔

(۴) کچھ پھل پکے ہوتے ہیں اور کچھ خام یا سب خام ہوتے ہیں، اور عقد بشرط الابقاء یا بعرف الابقاء کیا جاتا ہے۔

(۵) ابھی تک پھل کا وجود نہیں، صرف پھول ہوتے ہیں اور پھلوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔

مزید کچھ مشورہ دینا ہو تو ہمارے لیے مفید ہوگا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ پھلوں کی تجارت کی پہلی چار صورتیں جائز ہیں، اور آخری صورت جس میں پھل معدوم ہیں، صرف پھول ہی پھول ہیں، تو یہ ناجائز ہے، کیونکہ یہ بیع المعدوم ہے اور عام طور پر پھول کے وقت لوگ بیع نہیں کرتے، پھل آنے کے بعد بیع کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں فتح القدیر میں ہے:

لاخلاف في عدم جواز بيع الثمار قبل أن تظهر، ولا في عدم جوازه بعد الظهور قبل بدو الصلاح بشرط الترك، ولا في جوازه قبل بدو الصلاح بشرط القطع فيما ينتفع به،

ولافی الجوازبعد بدوالصلاح۔۔۔والخلاف إنما هو في بيعها قبل بدو الصلاح على الخلاف في معناه، لابشرط القطع، فعند مالكؒ والشافعيؒ وأحمدؒ لايجوز وعندنا إن كان بحال لاينتفع به في الأكل ولا في علف الدواب خلاف بين المشايخ قيل لايجوز ونسبه قاضيخان لعامة مشايخنا، والصحيح أنه يجوز لأنه مال منتفع به في ثانى الحال إن لم يكن منتفعاً به في الحال وقد أشار محمدؒ في كتاب الزكاة إلى جوازه...وإن كان بحيث ينتفع به ولوعلفاً للدواب فالبيع جائز باتفاق أهل المذهب إذا باع بشرط القطع أومطلقاً...فإن باعه بشرط الترك فإن لم يكن تناهي عظمه فالبيع فاسد عند الكل وإن كان قد تناهي عظمه فهو فاسد عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ، وهو القياس، ويجوزعند محمدؒ استحساناً، وهو قول الأئمة الثلاثة، واختاره الطحاوي لعموم البلوىٰ...وجه قول محمدؒ فى المتناهى الاستحسان بالتعامل لأنهم تعارفوا التعامل...ومحمدؒ يقول بمنعه فيه (أى فيما لم يتناه عظمه) لما فيه من اشتراط الجزء المعدوم وهوالأجزاء التي تزيد بمعنى من الأرض والشجر إلى أن يتناهي العظم، ولايخفى أن الوجه لايتم فى الفرق لمحمدؒ إلا بادعاء عدم العرف فيمالم يتناه عظمه اذ القياس عدم الصحة للشرط الذي لايقتضيه العقد فى المتناهى وغيره خرج منه المتناهى للتعامل، فكون مالم يتناه على أصل القياس إنما يكون لعدم التعامل فيه. (فتح القدير:٦/٢٨٧،٢٨٨،دارالفکر).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

قال العبد الضعيف عفاالله عنه، ويظهر من كلام ابن همامؒ فى الفتح أن العرف إذا جرى ببيع الثمار بعد بدوصلاحها بشرط الترك واشتدت إليه الحاجة كان قياس قول محمدؒ الجواز وإن لم يتناه عظم الثمار،لأنه أجاز شرط الترك بعد ما تناهى عظمها للعرف و الضرورة ، قلت: و كذلك أجاز محمدؒ بيع الثمارفي حين ظهربعضها ولم يظهر بعضها للضرورة و العرف... فكان قياس قول محمدؒ الجواز عند الضرورة وإن لم يتناه عظمها.

(تكملة فتح الملهم:١/٣٩٥).

شرح مجلّہ میں ہے:

فقد اتضح مما ذكرناه وضوح الشمس بحيث لم يبق ريب ولا لبس أنه لو جرى التعامل المستفيض في بيع الثمار قبل بدو صلاحها بشرط تركها حتى تنضج، يصح البيع عند محمدؒ...فاشتراط ترک الثمار البارزة حتى تنضج وإن كان شرطاً لايقتضيه العقد ولايلائمه وفيه نفع لأحد المتعاقدين لكن حيث جرى به العرف الشايع في بلادنا واستفاض بين الخاص والعام، فيكون معتبراً...وعليه يكون صحة بيع الثمار البارزة بشرط تركها حتى تنضج اتفاقية، فليحفظ هذا فإنه من مفردات هذا الكتاب. (شرح المجلة لمحمدالاتاسی،۲/۹۵،۹۶).

وفي فتح القدير: (ولواثمرت بعد القبض يشتركان فيه للاختلاط...)وكان الحلوانی يفتي بجوازه فی الكل، وزعم أنه مروي عن أصحابنا، وكذا حكى عن الأمام الفضلي وكان يقول: الموجود وقت العقد أصل ومايحدث تبع نقله شمس الأئمة عنه ولم يقيده عنه بكون الموجود وقت العقد يكون أكثر بل قال عنه: اجعل الموجود أصلاً فی العقد ومايحدث بعدذلک تبعاً. وقال: استحسن فيه لتعامل الناس، فإنهم تعاملوا بيع ثمارالكرم بهذه الصفة، ولهم في ذلک عادة ظاهرة وفي نزع الناس من عادتهم حرج، وقد رأيت رواية في نحوهذا عن محمدؒ وهو بيع الورد على الأشجارفإن الورد متلاحق، ثم جوزالبيع فی الكل بهذا الطريق وهوقول مالکؒ. (فتح القدير:٦/٢٩١،دارالفکر).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قلت: لكن لايخفى تحقق الضرورة في زماننا ولاسيما في مثل دمشق الشام كثيرة الأشجار والثمار فإنه لغلبة الجهل على الناس لايمكن إلزامهم بالتخلص بأحد الطرق المذكورة، وإن أمكن ذلک بالنسبة إلى بعض أفراد الناس لايمكن بالنسبة إلى عامتهم وفي نزعهم عن عادتهم حرج كماعلمت، ويلزم تحريم أكل الثمار في هذه البلدان إذ لاتباع إلا كذلک والنبي صلى الله عليه وسلم إنما رخص فی السلم للضرورة مع أنه بيع المعدوم، فحيث تحققت الضرورة هنا أيضاً أمكن إلحاقه بالسلم بطريق الدلالة، فلم يكن مصادماً للنص، فلذا جعلوه من الاستحسان، لأن القياس عدم الجواز، وظاهر كلام الفتح الميل إلى

الجواز ولذا أورد له الرواية عن محمدؒ بل تقدم أن الحلواني رواه عن أصحابنا وما ضاق الأمر إلا اتسع. (فتاوى الشامي: ٤/٥٥٥،مطلب في بيع الثمر،سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ:٦/٤٨٦، ٤٨٩، ٤٩٢۔وجدید معاملات کے شرعی احکام:١/٥٠).

اشکال اور جواب:

اشکال: پھلوں کی تجارت کی تمام شکلوں کوتعامل کی وجہ سے جائز اور درست قرار دیا جائے تو حدیث شریف کا محمل کچھ باقی نہیں رہیگا،حدیث شریف میں آتا ہے: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. نیز تعامل کی وجہ سے نص کا بالکلیہ ترک لازم آتا ہے جوکہ جائز نہیں ہے، تعامل کی وجہ سے تخصیص النص جائز ہے،ابطال النص جائز نہیں ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس کے دو جواب دیئے ہیں:۔

(۱)النهي محمول على المشورة ۔جیسا کہ بخاری شریف میں زید بن ثابتؓ کے الفاظ اس پر دال ہیں:"كالمشورة يشير بها لكثرة خصومتهم" حدیث شریف کا معنی یہ ہوگا کہ شرعاً اس کی بیع درست ہے،البتہ مشورہ یہ ہے کہ اس طرح نہ بیچا جائے ،اور مشورہ واجب القبول نہیں ہوتا، بلکہ مندوب القبول ہوتا ہے۔

(۲)محمول على السلم۔بیع سلم میں حنفیہ کے نزدیک عقد کے وقت سے لیکر سپرد کرنے کے وقت تک مبیع کا موجود ہونا ضروری ہے،لہذا پھلوں میں بدو صلاح سے پہلے سلم ممنوع ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قسط ادا نہ کرنے پر کل ثمن معجّل کرنے کا حکم:

سوال: اگر زید ایک مشین کو دو لاکھ رینڈ مؤجل پر بیچ دے اور دس ماہ تک اقساط مقرر کردے کہ ہر ماہ بیس ہزار ادا کرلیا کرے اور اگر کسی مہینے کی قسط ادا نہیں کی تو بقیہ اقساط فی الفور ادا کرنی ہوں گی، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کسی مہینے کی قسط ادا نہ کرنے پر تمام اقساط فی الفور ادا کرنے کی شرط لگانا صحیح اور درست ہے،اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائے خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

ولو قال كلما دخل نجم ولم تؤد فالمال حال صح ويصير المال حالاً. (خلاصة

الفتاویٰ:۳/ ٥٤، کتاب البیوع).

(وکذا فی البحرالرائق: ١٢٢/٦، فصل فی بیان التصرف فی المبیع والثمن، کوئٹہ).

وفي البحر الرائق: قال في البزازية (على هامش الهندية:٤٢٦/٤) **: وإبطال الأجل يبطل بالشرط الفاسد بأن قال: كلما حل نجم ولم تؤد فالمال حال صح وصار حالاً. وعبارة الخلاصة: وإبطال الأجل يبطل بالشرط الفاسد ولوقال كلما دخل نجم ولم تؤد فالمال حال صح ويصير المال حالاً. فجعلهمامسئلتين وهوالصواب وأما قوله في البزازية: بأن قال تصوير للأولى فسهو ظاهر لأنه لوكان كذلك لبقي الأجل فكيف يقول صح فيلتأمل.**

(البحرالرائق: ١٨٧/٦،باب المتفرقات،کوئٹہ).

وأيضاً نقله العلامة الشامي عن البحر، وزاد بقوله: وذكر العلامة المقدسي أن العبارتين مشكلتان، وأن الظاهر أن المراد أن الأجل يبطل، وأنه إذا علق على شرط فاسد كعدم أداء نجم في المثال المذكور وحاصله أن لفظ إبطال في عبارتي البزازية والخلاصة زائد وأنه لامدخل لذكره في هذا القسم أصلاً. (فتاوى الشامي:٢٤٨/٥،مايبطل بالشرط الفاسد،سعيد).

اسلام اورجدید معاشی مسائل میں ہے:

قسطوں پر بیع کے بعض اگریمنٹ میں اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ اگر مشتری مقررہ وقت پر کوئی قسط ادانہ کرسکا تو اس صورت میں آئندہ کی باقی اقساط بھی فوراً ادا کرنا ضروری ہوگا، اور بائع کے لیے فی الحال تمام اقساط کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا۔ (اسلام اورجدید معاشی مسائل:۱۲۱/۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خون کی تجارت کا حکم:

سوال: خون کی بیع جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: خون مال متقوم نہیں، لہذا اس کی بیع ناجائز ہے۔ ہاں اضطرار کی صورت میں صرف خریدنے کی گنجائش ہے جب کہ مجاناً دستیاب نہ ہو سکے، ہاں مسلمانوں کو چاہئے کہ بلڈ بینک قائم کر کے خون مفت فراہم کرنے کا انتظام کریں، تاکہ خون کی خرید وفروخت سے حتی الامکان اجتناب کیا جا سکے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإذا كان أحد العوضين أو كلاهما محرماً فالبيع فاسد كالبيع بالميتة والدم.

(الهداية:٣/ ٤٩، باب البيع الفاسد).

تبيين الحقائق میں ہے:

لم يجز بيع الميتة والدم والخنزير...لعدم ركن البيع وهومبادلة المال بالمال وبيع هذه الأشياء باطل. (تبيين الحقائق:٤/ ٣٦٢).

درمختار میں ہے:

بطل بيع ماليس بمال والمال ما يميل إليه الطبع ويجري فيه البخل والمنع فخرج تراب ونحوه كالدم المسفوح. (الدر المختار:٥/ ٥٠،سعيد).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

دم مسفوح کی بیع وشراء حرام ہے۔(احسن الفتاویٰ:٦/ ۵۲۲).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

علماء نے ضرورۃً خون چڑھانے کے لیے اجازت دی ہے لیکن فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی۔

(جدید فقہی مسائل:١/ ۳۳۵).

امدادالاحکام میں ہے:

ان اقوال کا مقتضایہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی بھی قیمت عرفاً ہوجائے تو اس کی بیع وشراء صحیح ہے۔

(امدادالاحکام:۳/ ۳۵۵)۔

جواہرالفقہ میں ہے:

خون کی بیع تو جائز نہیں، لیکن جن حالات میں جن شرائط کے ساتھ مریض کو خون دینا جائز قرار دیا ہے۔ ان حالات میں اگر کسی کو خون بلا قیمت نہ ملے تو اس کے لیے قیمت دے کر خون حاصل کرنا بھی جائز ہے، مگر خون دینے والے کے لیے اس کی قیمت لینا درست نہیں۔(جواہرالفقہ:۷/ ۴۷)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

حلال جانوروں کا وہ خون جو ذبح کے وقت نکلتا ہے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، اگر کسی نے فروخت

کر دیا تو اس سے ملنے والی رقم کا استعمال جائز نہیں، اسی طرح انسانی خون فروخت کرنا اور اس کی قیمت کا استعمال کرنا بھی حرام ہے، البتہ خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔یعنی جس طرح بوقتِ ضرورت دوسرے کی اولاد کو دودھ پلانا جائز ہے، اسی طرح ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دے کر جان بچانا بھی جائز ہے، بلکہ بعض اوقات حالات کے لحاظ سے ضروری بھی ہو جاتا ہے۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۴۸)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (جواہر الفقہ:۷/۴۴۔۵۰)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مبیع کا وزن مع ظرف محسوب کرنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے دس کیلو چاول یا کھاد ایک ڈبے میں خریدا لیکن اس میں ایک کیلو ڈبہ کا وزن ہے تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ ظرف بھی سامان کی طرح محسوب ہوا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ چونکہ لکھا ہوا وزن مشروط نہیں ہوتا اور اکثر عاقدین کی رضامندی سے بیع تعاطی ہوتی ہے اس وجہ سے جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ینعقد بالتعاطي في النفیس والخسیس وهو الصحیح لتحقق المراضاة.(الهدایة:۳/۱۹).

احسن الفتاوی میں ہے:

بائع ومشتری دونوں کا مقصود وہ خاص ڈبہ اور لفافہ ہوتا ہے اس پر لکھا ہوا وزن بیع میں مشروط نہیں ہوتا اس لیے بدون وزن کیے اس میں تصرف جائز ہے۔(احسن الفتاویٰ:۶/۴۹۹).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: دوکاندار چینی لفافہ میں تول کر دیتا ہے جب کہ لفافہ کی قیمت بھی ہے اور اس کا کچھ وزن بھی ہے، اسی وزن کی چینی گاہک کو کم ملتی ہے کیا یہ لینا دینا درست ہے؟

الجواب: لینے والا اور دینے والا راضی ہوں تو درست ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۲۴/۴۰، مکتبہ محمودیہ).

محمود الفتاویٰ میں ہے:

عرف کی وجہ سے یہی سمجھا جائیگا کہ اس مبیع موزون کا وزن مع ظرف اتنا ہوگا، اس لیے درست ہے۔

(محمود الفتاویٰ:۲/۴۰۵).　واللہ ﷻ اعلم۔

مزارات کے چڑھاوے مجاور سے خریدنے کا حکم:

سوال: بعض لوگ قبروں پر چادر اور کپڑے چڑھاتے ہیں پھر اس قبر کا مجاور ومتولی اس کو فروخت کرتا ہے، اس کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قبروں پر چادریں ڈالنا اور دیگر اشیاء کا چڑھانا ناجائز اور حرام ہے، اور مجاور ان اشیاء کا مالک نہیں بنتا، لہذا ان اشیاء کی بیع جائز نہیں، اور ان کے خریدنے سے مشتری کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔

ہاں اگر مالک نے توبہ کرلی اور غلط نیت سے باز آگیا پھر اپنی چیز کو بیچ دیا تو یہ جائز اور درست ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وماأهل لغیر اللّٰه به﴾.

(سورة المائدة:الآية،٣).

التحریر والتنویر میں ہے:

قوله سبحانه تعالیٰ: ﴿وما أهل به لغیر اللّٰه﴾ أی ماأعلن به أونودی علیه بغیر اسم اللّٰه تعالیٰ وهو مأخوذ من أهل إذا رفع صوته بالکلام فأهل فی الآیة مبنی للمجهول، ضمن أهل معنی تقرب فعدی لمتعلقه بالباء وباللام مثل تقرب،...وفائدة هذا التضمین تحریم ماتقرب به لغیر اللّٰه تعالیٰ. (التحریر والتنویر للعلامة محمدطاهربن عاشور،١١٩/٢).

عطر ہدایہ میں ہے:

خلاصۃ التفاسیر جلد اول سورہ مائدہ میں ہے وما اہل عام ہے عام نہ ہو مختص بالذبح ہوتب بھی بوجہ اشتراک علت حکم عام۔(عطر ہدایہ،ص۴۷۴).

البحر الرائق میں ہے:

وأما النذر الذي ینذره أکثر العوام علی ما هومشاهد کأن یکون لإنسان غائب أومریض أو له حاجة ضروریة فیأتي بعض الصلحاء فیجعل ستره علی رأسه فیقول یاسیدي فلان إن رد غائبي أوعوفي مریضي أو قضیت حاجتي فلک من الذهب کذا أومن الفضة کذا أومن الطعام کذا أو من الشمع کذا أومن الزیت کذا فهذا النذر باطل بالإجماع لوجوه منها أنه نذر مخلوق والنذر للمخلوق لایجوز لأنه عبادة والعبادة لاتکون للمخلوق...ومنها إن ظن

أن الميت يتصرف في الأمور دون الله تعالىٰ واعتقاده ذلك كفر...ولاتشتغل الذمة به ولأنه حرام بل سحت ولايجوز لخادم الشيخ أخذه ولا أكله ولا التصرف فيه بوجه من الوجوه...فإذا علمت هذا فمايؤخذ من الدراهم والشمع والزيت وغيرهاوينقل إلى ضرائح الأولياء تقرباً إليهم فحرام بإجماع المسلمين مالم يقصدوا بصرفها للفقراء الأحياء قولاً واحداً. (البحر الرائق:۲/۲۹۸،كوئته۔وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص۶۹۳۔والدرالمختارمع ردالمحتار:۲/۴۳۹،سعيد).

وفي الدرالمختار: الحرمة تتعدد مع العلم بها. (الدرالمختار:۵/۹۸،سعيد).

وفي ردالمحتار:(تتمة) في الأحكام عن الحجة: تكره الستور على القبور. (فتاوى الشامي:۲/۲۳۸،سعيد).

کفایت المفتی میں ہے:

مزارات پر پھول چڑھانا، چراغ جلانا، چادر چڑھانا ناجائز ہے۔ (کفایت المفتی:۱/۳۴۸).

(وکذا فی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند از مفتی محمد شفیع صاحبؒ:۲/۱۶۶).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

منذور لغیر اللہ غیر حیوان بھی بعلت تقرب الی غیر اللہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے یعنی حرمتِ حیوان بلاواسطہ مدلول نص ہے اور حرمتِ غیر حیوان مدلول نص بواسطہ قیاس ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۵/۴۹۱ وکذا فی امداد الفتاویٰ:۲/۵۵۴۔ومعارف القرآن از مفتی محمد شفیع صاحبؒ:۱/۴۲۴).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: سانڈ کا کھانا حلال ہے یا حرام، چونکہ اس میں مقلدین وغیر مقلدین میں اختلاف ہے، لہٰذا مفصل تحریر فرمایئے، اور تفسیر احمدی ملاجیونؒ ملاحظہ فرمالیجئے اور **ماجعل الله من بحيرة ولاسائبة الخ**، کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: اس میں تفصیل ہے، ایک صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے غیر اللہ کے نامزد کوئی جانور کردیا، اور اسی نیت سے اس کو ذبح کیا، گو وقتِ ذبح بسم اللہ بھی کہے یہ تو حرام، قرآن مجید میں اس کی حرمت منصوص ہے، اور کتبِ فقہ درمختار وغیرہ میں تصریحاً مذکور ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کے نام محض تعبیر وعنوان میں ہے نیت میں ان کا تقرب وترضی مقصود نہیں، جیسے حدیث میں عقیقہ کے وقت یہ کہنا وارد ہے: "هـذا عقيقة فلان" یہ بلاشبہ حلال ہے، اور صاحبِ تفسیر احمدی اسی کو حلال کہتے ہیں، چنانچہ ان کا منہیہ اس کا شاہد ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے بہ نیت وعقیدہ فاسدہ اس کو چھوڑا، اور حاکم وقت نے کسی وجہ سے اس کو پکڑ کر نیلام کر دیا، اور کسی نے خرید کر اس کو ذبح کیا، یہ حلال ہے، کیونکہ استیلاء موجبِ ملک ہے، جب مالک وہ پہلا شخص نہ رہا اس فسادِ نیت قابل اعتبار نہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے اسے نیتِ بد سے چھوڑ دیا تھا، دوسرے شخص نے چرا چھپا کر ذبح کیا، یہ حرام ہے دو وجہ سے، اول فسادِ نیتِ مالک سے کیونکہ سائبہ کرنے سے خارج عن الملک نہیں ہوتا، دوسرے غصب وسرقہ کی وجہ سے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ مالک نے اپنی نیتِ فاسد سے توبہ کر لی اور اس حیوان کو ذبح کیا یہ حلال ہے، ارتفاعِ علۃ النہی، اور وما جعل اللہ الخ کا مطلب اس فعل کی نفی ہے جو مزعوم کفار تھا، یعنی حرمتِ انتفاع بوجہ تعظیم واحترام، واللہ اعلم۔ (امداد الفتاویٰ: ۴/ ۹۹، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

امداد الفتاویٰ میں ہے:

اس اہلال بغیر اللہ سے اس میں حرمت مثل میتہ کے آگئی، پس جس طرح میتہ کا خریدنا جائز نہیں اسی طرح اس کا بھی۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۵۶۲۔ وفتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۷۰، چڑھاوا کی بیع، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گھنٹی کی خرید وفروخت کا حکم:

سوال: بعض لوگ جانوروں کے گلے میں گھنٹی ڈالتے ہیں اس گھنٹی کی بیع جائز ہے یا مکروہ ہے؟

الجواب: علماء نے لکھا ہے کہ بغرض صحیح جانوروں کے گلے میں گھنٹی ڈالنا جائز اور درست ہے، اسی طرح بغرضِ صحیح گھنٹی کا استعمال جائز اور درست ہے، چنانچہ مدارسِ دینیہ اسلامیہ میں طلبہ کے اوقات اور گھنٹوں کی تبدیلی اور دیگر امور کے لیے بجانا غرضِ صحیح میں داخل ہے۔ جیسے آلہ مکبر الصوت مساجد وغیرہ میں محض آواز پہنچانے کی خاطر برابر استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں گھنٹی کی تجارت بھی جائز اور درست ہوگی۔

اور حدیث میں ممانعت آئی ہے، علماء نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبی هريرةؓ قال : إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لاتصحب الملائكة رفقة فيها كلب ولاجرس . وفي رواية له عن أبي هريرة ؓ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الجرس مزامير الشيطان. (رواهمامسلم:۲/۲۰۲).

مفتی محمد تقی صاحب فرماتے ہیں:

وقال شيخ مشايخنا السهارنبوریؒ فی بذل المجهود: (۱۲/۵۳) "وهذا (أى كراهة الكلب والجرس) إذا خليا عن المنفعة وأما ما احتيج إليه منهما فمرخص فيه" والذي يظهر لهذا العبد الضعيف عفا الله عنه أن الكراهة المذكورة فی الحديث إنما تنصرف إلى كلب وجرس قصد منهما اللهو والغنا كماكان يعتاده بعض أهل القوافل ويدل عليه قوله عليه الصلاة والسلام فی الرواية الآتية " الجرس مزاميرالشيطان " أماالكلب إذا كان للحراسة والتحرز من اللصوص فهومرخص فيه ككلب زرع وماشية وكذلک الجرس إذاكان لمقصود مباح فلا بأس به. (تكملة فتح الملهم:٤/١٧٩).

عالمگیری میں ہے:

اختلف العلماء في كراهة تعليق الجرس على الدواب فمنهم من قال بكراهته فی الأسفاركلها الغزو وغيره في ذلک سواء...قال محمدؒ: فأما ماكان فيه منفعة لصاحب الراحلة فلا بأس به، قال وفی الجرس منافع جمة منها: إذا ضل واحد من القافلة يلحق بها بصوت الجرس ومنها: أن صوت الجرس يبعد هوام الليل عن القافلة كالذئب وغيره ومنها: أن صوت الجرس يزيد في نشاط الدواب فهو نظيرالحداء كذا فی المحيط. (الفتاوی الهندية:٥/٣٥٤).

نفع المفتی والسائل میں ہے:

وفی الجرس منافع :

منها: إذا ضل واحد من القافلة يلتحق بصوت الجرس .

ومنها: أن صوت الجرس يبعد هوام الليل .

ومنها: أنه يزيد في نشاط الدواب. كذا في "متفرقات استحسان المحيط"

وان جعل الأجراس في غير الإبل، والحمار الذى يحمل عليه الأثقال لا أحب أن يفعل ذلك ؛ لمكان النهي.

سئل علي بن أحمد عن القلادة التي فيها الأجراس تجعل على عنق الفرس، هل يجوز، كما هو العادة في بلادنا؟

قال: نعم ؛ كذا أجاب أبو حامد . (نفع المفتي والسائل،(فتاوى اللكنوى)ص ٤٩١،٤٩٢، بيروت).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

گھونگرو ٹالی وغیرہ کا استعمال اگر بغرض اظہارِ شان وشوکت ہو تو ناجائز ہے، اور اگر اس کے باندھنے سے جانور کو چلنے میں نشاط اور آسانی ہوتی ہو یا راہ چلنے والوں کی اطلاع کی غرض سے کہ وہ سامنے سے ہٹ جاویں باندھا جاوے تو جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ:۳/۱۱۰). واللہ تعالیٰ اعلم۔

فروخت شدہ زمین کی فصل کا حکم:

سوال: زید نے خالد کو زمین فروخت کی اس زمین میں فصل ہے، اب یہ فصل مشتری یعنی خالد کی ہوگی یا بائع زید کی رہے گی؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ فروخت کرتے وقت زید نے فصل کا بھی تذکرہ کیا تھا تو زمین اور فصل دونوں مشتری کو ملیں گی، لیکن اگر بوقت فروخت کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا تو فصل بائع ہی کی ملک میں رہے گی، اور بائع فصل کو فی الفور کاٹ لیگا، الا یہ کہ فصل پکنے تک مشتری سے زمین کرایہ پر لے لے۔

ملاحظہ فرمائے ہدایہ میں ہے:

ولا يدخل الزرع في بيع الأرض إلا بالتسمية لأنه متصل به للفصل فشابه المتاع الذي فيه... ويقال للبائع اقطعها وسلم المبيع وكذا إذا كان فيها زرع لأن ملك المشتري مشغول بملك البائع فكان عليه تفريغه وتسليمه كما إذا كان فيه متاع. (الهداية:٣/٢٥، كتاب البيوع).

عالمگیری میں ہے:

والزرع والثمر لایدخلان فی البیع استحساناً إلا أن یشترط المبتاع. (الفتاوی الهندیة:۳/۳۳، کتاب البیوع۔والهدایة:۳/۲۵).

وکذا فی بدائع الصنائع:۵/۱٦٤،سعید۔وفتح القدیر:۵/٤٨٦،دارالفکر۔وتبیین الحقائق:٤/١١،ملتان).

النہر الفائق میں ہے:

با ع أرضاً بدون الزرع فهو للبائع بأجرمثلها، استشکله بأن یجب علی البائع قطعه وتسلیمه الأرض فارغة، وجوابه أنه محمول علی ما إذا کان برضی المشتري. (النهر الفائق:۳/۳۵۸، کتاب البیوع).

وفي رد المحتار:قوله ویؤمر البائع بقطعها، أی فیما إذا باع أرضاً فیهازرع أوشجر علیه ثمرلم یشترطه حتی بقی الزرع والثمرعلی ملک البائع...لأن ملک المشتري مشغول بملک البائع فیجبر علی تسلیمه فارغاً...قوله وما فی الفصولین باع أرضاً بدون الزرع فهو للبائع بأجر مثلها محمول علی ما إذا رضی المشتري أی رضي بإبقاء الزرع بأجر مثل الأرض وإلا أمر البائع بالقلع توفیقاً بین کلامهم . (ردالمحتار:٤/٥٥٤،کتاب البیوع،سعید).

وفی " الفقه الحنفی في ثوبه الجدید": وإن رضي المشتري بإبقاء الزرع بأجر مثل الأرض صح. (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:٤/٩١،مایدخل فی البیع ومالایدخل، بیروت).

وللاستزادة انظر: (جامع الفصولین:۲/۹۰۔وغمزعیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر:۳/۱٦۹).

واللہ ﷻ اعلم۔

بلی کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک آدمی کے پاس بہترین نسل کی بلی ہے وہ بہت مہنگی ہے، کیا بلی کی خرید وفروخت جائز ہے؟ نیز کتے کی خرید وفروخت کا حکم بھی بتلادیں؟

الجواب: کتے اور بلی کی خرید وفروخت جائز ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

بيع الكلب المعلم عندنا جائز وكذلك بيع السنور وسباع الوحش والطير جائز...
ويجوز بيع جميع الحيوانات سوى الخنزير هو المختار. (الفتاوى الهندية:۳/۱۱٤). واللہ ﷻ اعلم۔

مبیع کے ساتھ انعامی کوپن کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص کسی کمپنی یا دکان سے خریداری کرے اور مبیع کی قیمت ادا کردے، تو بعض مرتبہ مبیع کے ساتھ خریداروں کی ترغیب کے لیے ایک ٹکٹ ملتا ہے، جس کا نمبر نکلتا ہے اس کو انعام ملتا ہے، تو کیا انعام حاصل کرنے کی غرض سے اس کمپنی یا دکان سے سامان خریدنا اور انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر دکاندار سامان کی وہی قیمت لیتا ہے جو عام طور پر بازار میں ہوتی ہے تو پھر انعام لینے کی نیت سے اس سے سامان خریدنا درست ہے اور انعامی کوپن پر جو انعام ملتا ہے اس کا لینا بھی جائز ہے، اور یہ انعام دکاندار کی طرف سے تبرع ہے، کسی چیز کا عوض نہیں ہے، اور اگر خریدی ہوئی اشیاء انعامی کوپن کی وجہ سے بازاری قیمت سے زیادہ پر فروخت کی جارہی ہوں تو اس صورت میں متوقع انعامات حاصل کرنے کی جستجو کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ ایسی صورت میں یہ قمار میں داخل ہوجائے گا جو شرعاً حرام ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الاحکام میں ہے:

یہ معاہدہ جائز ہے اور بائع کی طرف سے تبرع ہے اور تبرع کو کسی شرط سے مشروط کرنا جائز ہے۔
(امداد الاحکام:۳/۳۸٦).

حلال اور حرام میں ہے:

قریب قریب یہی نوعیت معمہ کی بھی ہے اس میں بھی معمہ پُر کر کے بھیجنے والا فیس ادا کرتا ہے، حل صحیح نکل آیا تو زیادہ رقم ملتی ہے ورنہ اصل پیسے بھی واپس نہیں ہوتے، ہاں اگر معمہ بھیجنے والوں سے کوئی فیس نہ لی جائے تو یہ صورت درست ہوگی اور اس رقم کی حیثیت خالص انعام کی قرار پائے گی۔ (حلال وحرام، ص ۳۸۱).

ہبہ کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله والهبة والصدقة كوهبتك هذه المأة أوتصدقت عليك بها على أن تخدمني

سنة،...وفي جامع الفصولين: ويصح تعليق الهبة بشرط ملائم كوهبتك على أن تعوضني كذا. (فتاوی الشامی:۵/۲۴۹،باب مايبطل بالشرط الفاسد، سعيد).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اگر کوئی شخص مشروط طور پر ہبہ کرے تو ہبہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ اور شرط دونوں صحیح ہیں اور اگر کوئی غیر مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۸۷، ہبہ میں شرط لگانے کا حکم)۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۲۶،انعامی کوپن یا کارڈ پر اشیاء خریدنا)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حج میں تجارت کا حکم:

سوال: اگر کوئی تجارت اور حج دونوں کو جمع کر کے حرمین چلا جائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر اصل مقصد حج ہے اور تجارت تبعاً ہے تو پورا ثواب ہے اور اگر دونوں مقصود ہیں تو حج کا ثواب کم ہے، اور تجارت ہی مقصود ہے تو حج کا ثواب نہیں لیکن اگر فرض حج ہے تو فریضہ ادا ہو جائیگا۔

ملاحظہ ہو: **قال الله تعالىٰ: ﴿ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلاً من ربكم﴾.** (سورة البقرة:الآية:۱۹۸)۔

قال الإمام القرطبيؒ: في الآية دليل على جواز التجارة في الحج للحاج مع أداء العبادة و أن القصد إلى ذلك لا يكون شركاً و لا يخرج به المكلف عن رسم الإخلاص المفترض عليه، أما إن الحج دون تجارة أفضل، لعُرُوّها عن شوائب الدنيا وتعلق القلب بغيرها. (الجامع لاحكام القرآن، للقرطبی:۲/۲۷۴۔وكذا في الماوردی:۱/۱۹۸)۔

وفي تفسير الماوردي في تفسيرقوله تعالىٰ: ﴿ليشهدوا منافع لهم﴾. المنافع: إنها التجارة في الدنيا والآخرة وهذا قول مجاهد. (تفسيرالماوردی:۴/۱۹)۔

قوله تعالىٰ: ﴿وأتموا الحج والعمرة لله﴾. قال الماوردي: اختلفوا في تاويل إتمامها، منها أن تخرج من دويرة أهلك لأجلهما لاتريدغيرهما، من تجارة ولامكسب وهذا قول سفيان الثوري. (تفسيرالماوردی:۱/۱۹۶)۔

بدائع الصنائع میں ہے:

و التجارة و الإجارة لا يمنعان جواز الحج ، و يجوز حج التاجر والأجير والمكاري لقول الله عزوجل: ﴿ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلاً من ربكم﴾، قيل الفضل التجارة، ولأن التجارة والإجارة لايمنعان من أركان الحج وشرائطهما فلا يمنعان من الجواز. (بدائع الصنائع: ۲/۲۱٦، کتاب الحج، سعید).

قال في البحر: وتجريد السفرعن التجارة أحسن ولو اتجرلاينقص ثوابه كالغازي إذا اتجركما ذكره الشارح في السير. (البحرالرائق:۲/۳۰۹).

وفي حاشية الطحطاوي : وهذا محمول على ما إذا لم تحمله التجارة على السفر. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۱/٤۸۹).

مزید ملاحظہ ہو: (الفتاوی الهندية:۱/۲۲۱-وفتح القدير:۲/٤۰۷، و٥/٤۸۳،دارالفکر).

عن مجاهد قال بينا عمربن الخطاب ﷺ جالس بين الصفا والمروة إذ قدم ركب فأناخوا عند باب المسجد ، فطافوا بالبيت وعمر ﷺ ينظر اليهم، ثم خرجوا فسعوابين الصفاوالمروة فلما فرغوا قال:عليّ بهم فأتي بهم، فقال: ممن أنتم قالوا: من أهل العراق، قال: فما أقدمكم، قالوا:حُجّاج، قال: ما قدمتم في تجارة، ولاميراث، ولا طلب دين، قالوا: لا، قال: أدبرتم ؟ قالوا: نعم، قال: أنصبتم قالوا: نعم، قال: أحفيتم، قالوا: نعم، قال: فأتنفوا. (اخرجه عبدالرزاق:٥/٦/۸۸۰٦، باب فضل الحج).

وفي المرقاة : قال ابن حجرؒ يؤخذ من قول الشافعيؒ وأصحابه من حج بنية التجارة كان ثوابه دون ثواب المتخلي عنها أن القصد المصاحب للعبادة إن كان محرماً كالرياء أسقطها مطلقاً...أوغير محرم أثيب بقدرقصده الآخرة أخذاً بعموم قوله تعالىٰ: ﴿فمن يعمل مثقال ذرة خيراً يره﴾.وهو تفصيل حسن وتعليل مستحسن. (مرقاة المفاتيح:۱/٤٦، ملتان).

وفي أحكام القرآن: قال بعضهم: إذا كان الداعي للخروج إلى الحج هوالتجارة (أو الإكراء كما هوحال أكثرالجمالين) أوكانت جزأ العلة أضرذلک بالحج لأنه ينافي الإخلاص لله تعالىٰ به. (احکام القرآن للعلامۃظفراحمدالتھانوی:۱/۳٥۲).

اشرف الاحکام میں ہے:

فرمایا: اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت کا سامان بھی نہ ہوتا تب بھی حج کو ضرور جاتا تو اس صورت میں ثوابِ حج کم نہ ہوگا اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے تو اس حالت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حج کے ساتھ ایک فعل مباح کو تو منظم کیا فعل حرام کو منظم نہیں کیا۔

اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص ریا کار ہوگا، کیوں کہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا تو ہے تجارت کے لیے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں۔

اگر اصل مقصود حج ہو اور زادِ راہ بقدرِ کفایت موجود ہو تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے، اگر اصل مقصود حج ہو اور زادِ راہ صرف بقدرِ ضرورت ہو اور نیت تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت واعانت ہوگی، مالِ تجارت لے جانا اس کے لیے موجبِ ثواب ہے۔ (اشرف الاحکام، ص ۱۴۸، بحوالہ کمالاتِ اشرفیہ، ص ۱۰۵)۔

وللاستزادة انظر: (ردالمحتار: ۱/۴۳۸، سعید۔وجامع العلوم والحكم: ۱/۴۰۔وفتاوی محموديه: ۱۰/۴۵۲۔وفتاوی رحيميه: ۷/۳۴۔شرح الاربعين للامام النوویؒ: ۱/۹، لعطية بن محمد سالم)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

زائد مبیع برآمد ہونے پر واپسی کا حکم:

سوال: زید سنار کے پاس گیا کہ مجھے زیور فروخت کرنا ہے، سنار نے بتایا کہ اس زیور میں دو اونس سونا ہے باقی کھوٹ ہے دو اونس کی قیمت ۱۰ ہزار رینڈ ہے ایک اونس ۵ ہزار کا ہے، گلانے کے بعد پتہ چلا کہ اس میں خالص سونا ڈھائی اونس ہے، اب زائد سونے کی قیمت مالک کو پہونچانا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زائد سونے کی قیمت کا مالک کو پہونچانا ضروری ہے، ہاں اگر زیور تولنے کے بعد سنار نے یہ کہا کہ اس زیور میں جتنا بھی سونا ہو اس کی قیمت دس ہزار رینڈ ہے تو پھر زائد قیمت کا پہونچانا ضروری نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

و من ابتاع صبرة طعام على أنها مائة قفيز بمائة درهم...وإن وجدها أكثر فالزيادة للبائع . (الهداية: ۳/۲۲)۔

وقال بعتكها على أنها مائة ذراع بمائة دراهم كل ذراع بدرهم ... وإن وجدها زائدة فهو بالخيار إن شاء أخذ الجميع كل ذراع بدرهم وإن شاء فسخ البيع ، لأنه إن حصل له الزيادة في الذراع تلزمه زيادة الثمن. (الهداية:۳/۲۳).

موسوعة الفقهية الكويتية میں ہے:

إذا ظهر نقص أوزيادة فيما بيع مقدراً بكيل أو وزن أو ذراع أو عد فإن كان الثمن مفصلاً ، كما لوقال: كل ذراع بدرهم، فالزيادة للبائع. (الموسوعة الفقهية:۹/۲٤).

وإذا باع البيع جزافاً فلا أثر لظهور النقص أو الزيادة عما توقعه المشتري أو البائع. (الموسوعة:۹/۲٤). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیع بالتقسیط میں ثمن کے عوض مبیع کو محبوس کرنے کا حکم:

سوال: زید نے بکر سے تین لاکھ رینڈ میں تین ماہ کی قسطوں پر ایک مشین خریدی ، ماہانہ ایک لاکھ رینڈ ادا کریگا، اب بکر یہ شرط لگاتا ہے کہ جب تک پوری رقم ادا نہ کردی جائے مشین زید کے قبضہ میں نہیں دی جائیگی، کیا یہ شرط جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عقدِ بیع مکمل ہونے کے بعد زید مشین کا مالک بن گیا، اب بکر یعنی بائع کو بیع بالتقسیط میں مبیع محبوس کرنے کا اختیار نہیں، ہاں بطورِ رہن اپنے پاس رکھنے کی گنجائش ہے، اور یہ دو طریقوں سے ممکن ہے:

(۱) زید اس مشین پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی بکر کے پاس بطورِ رہن چھوڑ دے، یہ ناجائز ہے اس لیے کہ بیعِ مؤجل میں حصولِ ثمن کے لیے حبس مبیع کی اجازت نہیں ہے۔

(۲) زید اس مشین پر قبضہ کرلے پھر بائع کے پاس بطورِ رہن رکھدے، یہ صورت جائز ہے، جب زید مکمل قیمت ادا کردیگا تو بکر مشین زید کے حوالہ کردیگا۔

ملاحظہ ہو فرمائیں فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

قال أصحابنا: للبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان حالاً كذا في المحيط ، وإن كان مؤجلاً فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولا بعده كذا في

المبسوط. (الفتاوى الهندية:۳/۱۵، الباب الرابع فى حبس المبيع بالثمن).

محیط برہانی میں ہے:

قال أصحابنا: وللبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إذا كان الثمن حالاً، لأن البايع عين حق المشتري في المبيع، فيجب على المشتري تعيين حق البائع في الثمن تحقيقاً للتساوي بينهما...وإن كان الثمن مؤجلاً لم يكن له حق الحبس، لأن حق الحبس إنما يثبت للبائع تحقيقاً للتسوية بينهما، وقد سقط حق البائع في المساواة بحكم التأجيل فيسقط حقه في الحبس ضرورة. (المحيط البرهاني:۷/۲۲۲، مكتبه رشيديه).

مبسوط میں ہے:

ويبقى حق البائع في الحبس إلا أن يكون الثمن مؤجلاً فحينئذٍ ليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلول الأجل ولابعده لأن قبل حلول الأجل ليس له أن يطالب بالثمن وإنما يحبس المبيع بماله أن يطالبه من الثمن وأما بعد حلول الأجل فلأن حق الحبس لم يثبت له بأصل العقد فلا يثبت بعد ذلك تبعاً بهذا الحق ماكان له من استحقاق اليد قبل البيع فإذا لم يبق ذلك بعد العقد لايثبت ابتداء بحلول الأجل. (المبسوط للامام السرخسيؒ:۱۳/۱۹۲، ادارة القرآن).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها ثبوت حق الحبس للمبيع لاستيفاء الثمن وهذا عندنا...أما شرط ثبوته فشيئان أحدهما أن يكون أحد البدلين عيناً والآخر ديناً فإن كانا عينين أو دينين فلا يثبت حق الحبس بل يسلمان معاً ... والثاني أن يكون الثمن حالاً فإن كان مؤجلاً لايثبت حق الحبس لأن ولاية الحبس تثبت حقاً للبائع لطلبه المساواة عادة...ولما باع بثمن مؤجل فقد أسقط حق نفسه فبطلت الولاية. (بدائع الصنائع:۵/۲۴۹،سعيد).

وللاستزادة انظر: (الهداية: ۴/۵۳۳،والكفاية على هامش فتح القدير:۹/۹۹،رشيدية،والفتاوى البزازية:۶/۵۵،والدر المختار:۶/۴۹۷،سعيد، واسلام اور جدید معاشی:۳/۹۶،۹۸،وجدید مسائل:۴/۲۶۵). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بیع میں دھوکا دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس جعلی پانچ رینڈ کا سکہ آیا اس کو معلوم ہوا کہ یہ جعلی اور بناوٹی ہے، کیا یہ شخص اس سکے کو چلا سکتا ہے یا نہیں؟ یا اس کو پھینکنا ضروری ہے یعنی دھوکہ کھایا ہوا شخص دوسرے کو دھوکہ دے سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ ممکن ہے کہ دوسرا آدمی بھی اس کو چلائیگا کیونکہ اس کی پہچان مشکل ہوتی ہے۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ پانچ رینڈ کا جعلی سکہ چلانا جائز اور درست نہیں اس میں دھوکہ دہی ہے، ہاں اگر کوئی ایسا ادارہ ہے مثلاً بینک جو آج کل جعلی سکوں کو جمع کرتا ہے تاکہ ختم ہوجائے، تو اس کو آگاہ کر کے دینا جائز ہوگا۔ حدیث شریف میں دھوکہ دہی کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں روایت ہے:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر على صبرة من طعام فأدخل يده فيها فنالت أصابعه بللاً، فقال: يا صاحب الطعام ما هذا؟ قال: أصابته السماء يارسول الله! قال: أفلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس ثم قال: من غش فليس منا. (رواه الترمذي: ١/ ٢٤٥، باب ماجاء في كراهية الغش في البيوع).

درمختار میں ہے:

لا يحل كتمان العيب في مبيع أوثمن لأن الغش حرام. وفي الشامية قوله لأن الغش حرام؛ ذكرفي البحر أول الباب بعد ذلك عن البزازية عن الفتاوى: إذا باع سلعة معيبة عليه البيان، وإن لم يبين قال بعض مشايخنا يفسق وترد شهادته، قال الصدر: لا نأخذ به، قال في النهر: أي لانأخذ بكونه يفسق بمجرد هذا لأنه صغيرة، قلت: وفيه نظر لأن الغش من أكل أموال الناس بالباطل فكيف يكون صغيرة، بل الظاهر في تعليل كلام الصدر إن فعل ذلك مرة بلا إعلان لا يصير به مردود الشهادة و إن كان كبيرة. (الدر المختار مع رد المحتار: ٥/ ٤٧، سعيد).

درمختار میں ہے:

(ولو قبض زيفاً بدل جيد) كان له على آخر (جاهلاً به) فلو علم وأنفقه كان قضاء اتفاقاً (ونفق أو أنفقه) فلوقائماً رده اتفاقاً (فهوقضاء) لحقه وقال أبويوسفؒ: إذا لم يعلم يرد

مثل زيفه ويرجع بجيده استحساناً كما لو كانت ستوقة أو نبهرجة، واختاره للفتوىٰ ابن كمال قلت: ورجحه فى البحر والنهر والشرنبلالية فبه يفتىٰ. (الدر المختار: ٥/٢٣٣، سعيد).

وفي تقريرات الرافعي: قول الشارح كما لو كانت ستوقة أو نبهرجة أى فإنه يرجع بالجياد اتفاقاً. (التحرير المختار: ٥/١٧١، سعيد).

وفي ردالمحتار: والنبهرجة: مايرده التجار، والستوقة: أن يكون الطاق الأعلى فضة والأسفل كذلك وبينهما صفر وليس لها حكم الدراهم. (ردالمحتار: ٥/٢٣٣، سعيد).

امداد المفتین میں ہے:

سوال: ایک نوٹ میرے پاس ایسا آ گیا ہے جس میں تیل کا اثر ہے، معلوم ہوا کہ ایسے نوٹ کا حکم یہ ہے کہ دفتر کرنسی میں بھیجد یا جائے یا نوٹ اسی نمبر کا چھاپ کر بھیجد یا جائے اور چھپائی لے لی جائیگی، اگر بازار میں ہم اس نوٹ کو چلاویں تو کسی قسم کا گناہ تو نہیں؟

الجواب:... نوٹ لینے والے کا اس میں ضرر ہے کہ اس کو چھپائی کی اجرت دینی پڑے گی، اس لیے بغیر اس کی اطلاع و رضا کے دینا جائز نہیں۔ (امداد المفتین، جلد دوم، ص۱۰۲۶، بعنوان ''خراب نوٹ چلانا'').

نیز دھوکہ کھایا ہوا شخص دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکتا ہے، ہاں حتی الامکان اپنے آپ سے ضرر و ظلم کو دفع کر سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو قواعد الفقہ میں ہے:

المظلوم له أن يدفع الظلم عن نفسه بما قدر عليه لكن ليس له أن يظلم غيره. (قواعد الفقه، ص١٢٤، بحواله السير الكبير مع شرحه: ٤/٢٢٢). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مبیع میں نقص ہونے پر رجوع بالنقصان کا حکم:

سوال: ایک شخص نے بکری کا گوشت خرید ا گھر لانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بچھڑے کا گوشت ہے تو واپس کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر گوشت کھانے کے بعد معلوم ہوا تو واپس کرنے کی کیا صورت ہے؟

الجواب: اگر استعمال کرنے سے قبل معلوم ہوا تو گوشت واپس کر سکتا ہے، اور اگر کھانے کے بعد معلوم ہوا ہو تو مفتی بہ قول کے مطابق رجوع بالنقصان کر سکتا ہے۔ یعنی اگر بکرے کا گوشت ایک کلو بیس رینڈ میں

خریدا ہے جب کہ بچھڑے کا ایک کلو گوشت پندرہ رینڈ میں دستیاب ہوتا ہے تو پانچ رینڈ بائع سے وصول کرسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

...أولحم معز فكان لحم ضأن، وعلى عكسه ونحو ذلك، فله الخيار...وفي العيني عن الهداية: ولو امتنع الرد بسبب من الأسباب رجع المشتري على البائع بحصته من الثمن فيقوم العبد كاتباً وغير كاتب وينظر إلى تفاوت ما بين ذلك فإن بمقدار العشر مثلاً رجع بعشر الثمن، ومثله في البحروغيره، وقال الطحطاوي في حاشيته على الدر: يعني يعتبر التفاوت من الثمن، فإن هذا البيع صحيح لا نظر فيه إلى القيمة. (شرح المجلة لمحمد الاتاسي:۲/۲۵۳،۲۵۵،الفصل الثاني في بيان خيار الوصف).

فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے:

رجل اشترى طعاماً فوجد به عيباً وقد أكل بعضه يرجع بنقصان عيب ما أكل، ويرد ما بقي بحصته لأن بالأكل تقرر العقد فتتقرر أحكامه وهذا قول محمدؒ وبه كان يفتي الشيخ الفقيه أبوجعفر الهندوانيؒ وبه أخذ الفقيه أبو الليثؒ فإن باع نصفه يرد ما بقي عند محمدؒ وعليه الفتوىٰ. (الفتاوى الولوالجية:۳/۲۵۳).

شرح نقایہ میں ہے:

وأما أكل الكل ولبس الثوب فالمذكور هنا قول أبي حنيفةؒ والقياس أن يرجع بالنقصان وهو قولهما ومذهب الشافعيؒ وأحمدؒ وبه أخذ الطحاويؒ وفي الخلاصة عليه الفتوىٰ. (فتح باب العناية :۳/۲۲۸).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

ولو اشترى سمناً ذائباً فأكله ثم أقر البائع أن الفارة وقعت فيها وماتت له أن يرجع بنقصان العيب، عند أبي يوسفؒ ومحمدؒ وعليه الفتوىٰ. (خلاصة الفتاوىٰ:۳/۶۹). واللہ ﷻ اعلم۔

نفع کی تعیین کا حکم:

سوال: شریعت میں نفع کی حد مقرر ہے یا نہیں؟ یعنی بائع کتنا نفع لے سکتا ہے، کیا سو فیصد نفع لینا

جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں نفع کے بارے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ اس کو فطری اتار چڑھاؤ پر رکھا ہے، ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ طلب و رسد میں تناسب وتوازن قائم رہے تاکہ قیمت میں بھی توازن برقرار رہے، البتہ کسی سامان پر اتنا زیادہ نفع حاصل کرنا جو غبن فاحش کے زمرہ میں آتا ہو کراہت سے خالی نہیں، اور غبن فاحش یہ ہے کہ سامان کی قیمت مقرر کرنے والوں کے دائرۂ تخمین سے بھی زیادہ ہو۔

وقال في " الفقه الحنفي في ثوبه الجديد": وعرف الفقهاء الحنفية الغبن الفاحش بأنه ما لا يدخل تحت تقويم المقومين من أهل الخبرة، فلوقوم السلعة أحدهم بمائة درهم وقومها الثاني بخمسة وتسعين وقومها الثالث بتسعين مثلاً ، فبيعها بما بين التسعين و المائة فيه غبن يسير ، وبالتسعين فما دونها غبن فاحش بالبائع، وبالمائة فما فوقها غبن فاحش بالمشترى .

ثم حدد المتأخرون من الفقهاء الغبن الفاحش للتيسير في الفتوىٰ والقضاء والتطبيق ، أنه ما بلغ خمس القيمة في العقار وعشرها في الحيوان ونصف العشر في العروض وسائر المنقولات ، وبهذا أخذت مجلة الأحكام العدلية في المادة :١٦٥ منها. (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد:٤/١٩٣).

(وكذا في شرح المجلة لمحمد الاتاسي : ٢/٢٦،المادة:١٦٥).

ہدایہ میں ہے:

قال: ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه الصلاة والسلام : لا تسعروا فإن اللّٰه هو المسعر القابض الباسط الرازق ولأن الثمن حق العاقد فإليه تقديره...إلا إذا تعلق به دفع الضرر العامة...فإن كان أرباب الطعام يتحكمون ويتعدون عن القيمة تعدياً فاحشاً وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسعيرفحينئذٍ لا بأس به بمشورة من أهل الراي والبصيرة. (الهداية:٤/٤٧٢، كتاب الكراهية، فصل في البيع).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال میں منافع حاصل کرنے کی کوئی خاص حد متعین نہیں کی کہ کوئی مال خرید کر آپ صرف اتنے فیصد نفع لے کر فروخت کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں، بلکہ اس کو عاقدین پر چھوڑ دیا کہ وہ باہمی رضامندی سے جس طرح چاہیں معاملہ طے کر لیں، البتہ اس حد تک منافع لینا جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو یا لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا خلافِ مروت ہے، اس لیے حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

ہاں البتہ مال کی بے جا تعریف کرنا یا عیب چھپانا یا نقلی اور جعلی مال کو اصلی ظاہر کر کے دھوکہ دے کر زیادہ رقم وصول کرنا یہ گناہِ عظیم ہے۔ **قال العلامة علي حيدر رحمه الله: وجاء تعريف البيع في كثير من الكتب الفقهية بأنه مبادلة المال بالمال بالرضاء.** (درر الحكام شرح مجلة الاحكام: ۱/ ۱۰۶)۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/ ۸۶).

کتاب الفتاوی میں ہے:

شریعت میں نفع کے لیے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تاجرین کے عرف و رواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آجائے مکروہ ہے، غبن فاحش یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زیادہ سے زیادہ قیمت لگائی جاتی ہو، اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۲۱۳). واللہ ﷻ اعلم۔

کمپنی کی جانب سے انعام کا حکم:

سوال: بعض کمپنیاں اپنی مصنوعات کی ترقی کے لیے دکانداروں کو کچھ انعام دیتی ہیں، مثلاً کمپنی کی جانب سے دکاندار کو سال کے مخصوص ایام میں یہ اطلاع کی جاتی ہے کہ ہماری کمپنی کا جو سامان آپ فروخت کریں اس کے بل کو محفوظ رکھنا اور ہمیں بتلانا ہم ہر چیز پر ایک رقم بطورِ انعام دیں گے۔

اب یہ انعامی رقم کس کو ملے گی دکان کے مالکان کا کہنا ہے کہ یہ رقم ہمیں ملنی چاہئے، کیونکہ دکان میں ہمارا سامان فروخت ہوتا ہے، اور عملہ کو ان کی تنخواہ ملتی ہے، لیکن عملہ کی جانب سے یہ مطالبہ ہے کہ یہ انعامی رقم ہمیں ملنی چاہئے کیونکہ کمپنی نے خود کہا ہے کہ ہم عملہ کے لیے دیتے ہیں۔

اور اس کی دلیل میں کمپنی کی جانب سے ایک خط بھی پیش کیا جس میں مرقوم ہے کہ یہ انعام آپ کے

یہاں کام کرنے والوں کو دیا جائیگا۔اب آپ حکم شریعت سے مطلع فرمادیں کہ اس انعام کو لینے کا حقدار کون ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عام عرف اور دستور کے موافق کمپنی یا بائع کی جانب سے جو انعام یا سامان کی خریداری میں رعایت ملتی ہے وہ خریدار یعنی مالکِ دکان کو ملتی ہے، کیونکہ وہ سامان کی خریداری کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔

امداد الاحکام میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ خریدار کو سال تمام پر جو کمیشن ہر سیکڑہ پر دیا جاتا ہے وہ بائع کی طرف سے تبرع ہے...(امداد الاحکام:۳/۳۸۶).

کتاب الفتاوی میں ہے:

اگر خریدی ہوئی چیزوں کے ساتھ ہر خریدار کو انعام کے طور پر مزید کوئی چیز دی جاتی ہے، تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہ فروخت کرنے والے کی طرف سے ایک طرح کا اضافہ ہے، اور فقہاء نے مبیع میں اضافہ کو جائز قرار دیا ہے۔(کتاب الفتاوی:۵/۲۴۹،بعنوان''خریدار کو انعام'').

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۲۶).

لیکن صورتِ مسئولہ میں خود کمپنی نے کئی مرتبہ اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ یہ انعام آپ کے عملہ کے لیے ہے۔لہذا شرعاً اس انعام کے حقدار دکان کے کام کرنے والے ہوں گے۔واللہ ﷻ اعلم۔

مبیع میں استحقاق کا حکم:

سوال: بعض حضرات نے ایک زمین خریدی، پھر اس پر دیوار بنائی، لیکن شاہراہ کی جانب حکومت کا کچھ حصہ بھی شامل تھا، پھر اسی جانب کا حصہ فروخت کردیا، فروخت کرنے سے قبل ہی میونسپلٹی کا ایک خط آیا تھا کہ شاہراہ کی جانب والا حصہ حکومت کی ملک میں ہے لہذا اسے توڑ کر اپنی حدود میں دیوار بنالیجئے، لیکن مالکان نے توجہ نہیں دی، اور بیع کے وقت اس سے متعلق گفتگو کرنا بھی بھول گئے، اب مشتری کو دو اعتبار سے نقصان ہوا(۱) دیوار توڑ دی گئی اور دوسری مرتبہ بنانے میں کافی خرچہ ہوگا۔(۲) مزید براں ایک ہزار مربع میٹر زمین بھی چلی گئی جس کی قیمت ادا کی تھی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مشتری بائع سے دیوار بنانے کا خرچہ وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ نیز ہزار مربع میٹر زمین کی قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (۱) بائع منقوضہ دیوار کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ مشتری اپنی حفاظت کے لیے اپنے خرچہ سے دیوار بنالے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ دیوار بیع میں شامل نہیں تھی، کیونکہ بیع فقط زمین کی ہوئی تھی، دیوار مقصود نہیں تھی بلکہ زمین کے تابع تھی، اور ثمن اصل کے مقابل ہوتا ہے۔ **والثمن يكون في مقابلة الأصل، لا في مقابلة الوصف والتابع۔** ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن اشترى ثوباً على أنه عشرة أذرع بعشرة أو أرضاً على أنها مأة ذراع بمأة، فوجدها أقل، فالمشتري بالخيار: إن شاء أخذها بجملة الثمن، وإن شاء ترك لأن الذراع وصف في الثوب، ألا ترى أنه عبارة عن الطول والعرض والوصف لايقابله شيء من الثمن كأطراف الحيوان فلهذا يأخذه بكل الثمن. (الهداية:۲۳/۳). **ثم أشار فيما بعد أن الوصف هو التابع۔**

وفي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: قال: الوصف مايدخل تحت البيع بلاذكر كالشجار والبناء في الأرض، والأطراف في الحيوان والجودة في الكيلي والوزني. (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد:۱۰٦/٤، ط:دمشق).

(۲) ایک ہزار میٹرز مین جو حکومت نے لے لی مشتری بائع سے اس کی قیمت واپس لے سکتا ہے، اور بائع بھی پہلے بائع پر رجوع کر سکتا ہے۔

ہدایہ میں ہے:

ولو تداولته الأيدي ثم قطع في يد الأخير، رجع الباعة بعضهم على بعض عنده كما في الاستحقاق...وقوله في الكتاب: ولم يعلم به المشترى يفيد على مذهبهما، لأن العلم بالعيب رضاء به، ولايفيد على قوله في الصحيح، لأن العلم بالاستحقاق لايمنع الرجوع.

(الهداية:٤٨/٣، باب خيار العيب).

وفي شرح المجلة نقلاً عن جامع الفصولين: شراه عالماً بأنه ليس لبائعه ثم استحق، رجع بثمنه. (شرح المجلة للاتاسي:٤٦٢/١).

وفي الموسوعة الفقهية الكويتية: يحرم شراء الشيء المستحق عند العلم بالاستحقاق، فإن حصل البيع مع علم المشتري بالاستحقاق فللمشترى الرجوع بالثمن

علی البائع عند الاستحقاق إذا ثبت بالبینة. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ٤/٨٧). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شیئرز کی خرید وفروخت کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درجِ ذیل مسئلہ کے بارے میں: ۔آج کل شیئرز کی خرید و فروخت کثرت سے ہوتی ہے، تو کیا شیئرز کی تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی کوئی شخص کچھ شیئرز خریدے کہ قیمت بڑھنے کی صورت میں نفع کے ساتھ فروخت کردے گا تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: موجودہ دور میں شیئرز کی خرید وفروخت ایک اہم اور مالی اعتبار سے نفع آور کاروبار بن گیا ہے، حصص کبھی تو براہِ راست کمپنی سے خریدے جاتے ہیں، کبھی ایجنسیوں کے واسطے سے لیے جاتے ہیں اور کبھی شخصی طور پر لوگ اپنا خرید کیا ہوا حصہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں، یہ تینوں ہی صورتیں جائز اور درست ہیں، ان تمام صورتوں میں شیئرز کے مالکان یا تو خود شیئرز پر قبضہ کر چکے ہیں یا کمپنی کے مینجر اور منتظمین نے وکالۃً اس کی طرف سے شیئرز کی اصل ملکیت پر قبضہ کیا ہے۔

اور کسی چیز کی خرید وفروخت کے لیے ضروری ہے کہ فروخت کنندہ یا تو خود اس کا مالک ہو یا مالک کی طرف سے وکیل بالبیع ہو یہ دونوں باتیں یہاں متحقق ہیں۔

پھر یہ خرید وفروخت اس روپیئے کی خرید وفروخت نہیں ہے، جس کی دستاویز خریدارانِ حصص کو حاصل ہوئی ہے، بلکہ یہ سامان کا وثیقہ اور اس سامان کی خرید وفروخت ہے جس کی ابتدائی قیمت کمپنی نے مقرر کی تھی، تو اب کسی قدر فرق کے ساتھ بھی فروخت کیا جائے اور اصل قیمت میں کتنی ہی کمی بیشی کے ساتھ بیچا جائے، سود کا تحقق نہیں ہوگا۔

اور جب اصولی طور پر شیئرز کی خرید وفروخت جائز ٹھہری تو اب حکم کا مدار کمپنی کی نوعیت پر ہوگا، اگر کمپنی جائز کاروبار کرتی ہو تو اس کا شیئر خریدنا جائز ہوگا، کمپنی کے اصل مالکان مسلم ہوں یا غیر مسلم، اور اگر وہ ناجائز اور غیر شرعی کاروبار کرتی ہو جیسے شراب سازی مجسمہ سازی وغیرہ تو اس کے شیئرز خریدنا جائز نہ ہوگا۔

شیئرز کی تجارت میں چند ضروری باتوں کی نشاندہی:

(۱) شیئرز سرٹیفکٹ پر قبضہ ہو چکا ہو، یا کسی بھی طرح یقینی طور پر شیئر ہولڈر کی بقدر حصص ملکیت کمپنی میں

ثابت ہو چکی ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ کمپنی کو اگر بالفرض نقصان ہو تو اس نقصان کا ضمان قانوناً شیئر ہولڈر پر بھی آتا ہو، چنانچہ شیئرز پر حقیقۃً قبضہ کے بغیر یا یقینی طور پر ملکیت ثابت ہوئے بغیر انہیں آگے بیچنا جائز نہیں۔

تنبیہ: فی زماننا شیئرز کی تجارت اکثر انٹرنیٹ کے ذریعہ ہوتی ہے، اور شیئرز خریدنے کے بعد فوراً خریدار کے اکاؤنٹ سے رقم کٹ جاتی ہے اور شیئرز کی ملکیت کی خبر بذریعہ ای میل اس کو موصول ہو جاتی ہے، خریدار اس کے بعد شیئرز کی خریداری کی رسید بھی نکال سکتا ہے جو کہ حکمی قبضہ کے مترادف ہے، نیز بائع کے سرٹیفکٹ اسی وقت سے معطل سمجھے جاتے ہیں، لہذا اب آگے فروخت کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے، اگر چہ سرٹیفکٹ اب تک موصول نہیں ہوئے۔

بذریعہ انٹرنیٹ اکاؤنٹ میں منتقلی کو معاییر شرعیہ میں قبضہ حکمی قرار دیا۔

معاییر شرعیہ نامی کتاب جس کو ستائیس محققین اربابِ فتویٰ نے مرتب کیا ہے اس میں مرقوم ہے:

إن كيفية قبض الأشياء تختلف بحسب حالها واختلاف الأعراف فيما يكون قبضاً لها، فكما يكون القبض حسياً في حالة الأخذ باليد أو النقل أو التحويل إلى حوزة القابض أو وكيله يتحقق أيضاً اعتباراً وحكماً بالتخلية مع التمكين من التصرف، ولولم يوجد القبض حسياً، فقبض العقار يكون بالتخلية وتمكين اليد من التصرف، فإن لم يتمكن المشتري من المبيع فلاتعتبر التخلية قبضاً، أما المنقول فقبضه بحسب طبيعته. (المعايير الشرعية، ص ۱۲۲).

(۲) بعض حضرات کا شیئرز کی خرید و فروخت میں درحقیقت خریدنا اور بیچنا مقصود ہی نہیں ہوتا، (مبیع وثمن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے) ان کے پیش نظر سرٹیفکٹ وصول کرنا ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی یہ حضرات سرٹیفکٹ وصول کرتے ہیں، بلکہ محض زبانی کلامی اس پوری کاروائی سے مقصد انتہا اور نتیجہ کے اعتبار سے فرق برابر کرنا ہوتا ہے تو یہ صورت بھی جوا اور سٹہ بازی ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

(۳) حاضر سودے جائز ہیں، خواہ سرمایہ کاری کی نیت سے ہو، چاہے شیئرز بیچ کر نفع کمانے کی نیت سے ہو۔

(۴) شارٹ سیل، یعنی بیع غیر مملوک جائز نہیں ہے، اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں، اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ ''بیع مالا یملک'' ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہوگی۔

(۵) اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری (ادائیگی) بھی لے چکا ہے، اور آئندہ

کی تاریخ کے لیے آج ہی ایجاب وقبول کے ذریعے بیع کی تکمیل کررہا ہے، جسے فارورڈ سیل (Forward sale) ’’البیع المضاف الی المستقبل‘‘ کہا جاتا ہے، یعنی وہ آئندہ کی تاریخ کے لیے ہے اس وجہ سے یہ ناجائز ہے۔

(۶) فیوچر سیل بھی ناجائز ہے۔ یہ سٹہ ہی ہے، اس کا ذکر (۲) کے تحت گزرا، یعنی شیئرز کی ایسی بیع وشراء کہ شیئرز لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع ونقصان برابر کرکے نفع کمانا مقصود ہو، تو یہ بھی ناجائز ہے۔

(۷) ایک اہم قابل توجہ بات اس میں یہ ہے کہ شیئر ہولڈر اگر شرکت ختم کرنا چاہے اور کمپنی سے نکلنا چاہے تو کسی دوسرے کو فروخت کیے بغیر نکل نہیں سکتا ہے۔ لیکن کمپنی کا پہلے سے یہ معاہدہ ہوتا ہے اور معاہدہ کی پابندی ضروری ہے، اس وجہ سے اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

(۸) اگر کمپنی کچھ سودی لین دین میں ملوث ہو تو اس کے سالانہ اجلاس میں آواز اٹھائی جائے۔

(۹) جب منافع تقسیم ہو تو اس وقت جتنا نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو، اس کو صدقہ کردیا جائے۔

(۱۰) بعض حضرات کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ قیمتِ اسمیہ سے کم وبیش پر بیچنے کے لیے کمپنی کے اثاثے صرف نقد کی شکل میں نہ ہوں۔

(۱۱) کمپنی کے قواعد میں یہ بات شامل ہوتی ہے کمپنی مختلف بینکوں سے سودی قرضہ حاصل کریگی۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو یہ ناجائز ہے اس کی وجہ سے سب شرکاء سود لینے کے گناہ میں ملوث ہوں گے۔

لیکن چونکہ یہ سودی معاملہ معمولی اور قلیل مقدار میں ہوتا ہے اور بذاتِ خود مقصود بھی نہیں ہوتا بلکہ ضمناً اور تبعاً ہوتا ہے، نیز بسا اوقات بڑی کمپنیوں کو حکومتی قوانین کی بنا پر یا دفع ضرر (مثلاً ظالمانہ ٹیکس میں تخفیف وغیرہ) کے لیے مجبوراً لینا پڑتا ہے لہذا اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، پھر غیر مسلموں کی کمپنی ہو تو اس میں مزید تخفیف ہوگی۔ جیسا کہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے امداد الاحکام (۴/۳۹۷-۴۴۰) میں تفصیلی بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غالب کا اعتبار کرتے ہوئے گنجائش ہے۔ البتہ کمپنی کی آمدنی میں جو معمولی مقدار سود کی ہو تو مالکانِ حصص کو حاصل شدہ منافع میں سے بقدرِ رقم صدقہ کردینا چاہیے۔

(۱۲) کمپنی کا مینجر (manager) تنخواہ کے ساتھ جو ’’الاونس‘‘ لیتا ہے وہ مجہول ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ فیصد کے اعتبار سے معلوم ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مسائل: جلد اول، وجلد چہارم۔ واسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص ۱۰۳۔۱۱۲۔ جدید فقہی مباحث: ج ۱۶، ادارۃ القرآن۔ وفتاویٰ عثمانی، جلد سوم۔ والیضاح النوارد، حصہ اول۔ وامداد الفتاویٰ، جلد سوم۔ وامداد الاحکام: ۳۹۹/۴۔ ونئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے، ص ۱۱۱، واہم فقہی فیصلے، ۱۰۹، وعصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اوران کا حل: ۲۳۵/۲، وجدید معاملات کے شرعی احکام، جلد اول)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شارٹ سیل کا حکم:

سوال: کیا شارٹ سیل جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شارٹ سیل درحقیقت بیع غیر مملوک کا نام ہے یعنی بائع ایسے شیئرز فروخت کرتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہیں، لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز خریدار کو دیدوں گا۔ لہٰذا شارٹ سیل جائز نہیں ہے۔

جامع ترمذی میں ہے:

حدثنا قتيبة ثنا هشيم عن أبي بشرعن يوسف بن مالك عن حكيم بن حزام ﷺ قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: يأتيني الرجل فيسألني من البيع ماليس عندي أبتاع له من السوق ثم أبيعه قال: لا تبع ماليس عندك. (ترمذی شریف: ۲۳۳/۱، باب ماجاء فی کراہیۃ بیع مالیس عندہ)۔

اس مسئلہ کی مختصر وضاحت شیئرز کی خرید وفروخت والے مسئلہ کے تحت گزر چکی ہے۔

ہاں اگر صرف بیع کا وعدہ کرلیا جائے، حقیقۃً بیع نہ کی جائے، سامان یا شیئرز حاصل ہونے کے بعد بیع منعقد کی جائے تو یہ صورت جائز اور درست ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میت کی طرف سے کفالہ کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوا اس کے پاس جائیداد و مال نہیں تھا، اس پر ایک لاکھ رینڈ کا قرضہ تھا اس کے دو بیٹوں کو مقروض قرض خواہ تنگ کرنے لگے محلّہ کے ایک آدمی نے اس کے قرض کی ذمہ داری قبول کی تاکہ وارثوں کی جان چھوٹ جائے کچھ مدت کے بعد قرض خواہ نے اس ضامن سے قرض کا مطالبہ کیا ضامن نے

کہا میں نے تو صرف ورثہ کی جان چھڑانے کے لیے یہ ذمہ داری لی اور کہا کہ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ میت کی طرف سے کفالہ نہیں ہوتا الا یہ کہ میت کا مال ہو یا زندگی کی حالت کا کفیل ہو، اب قرض خواہ اور کفیل میں جھگڑا ہے، آپ فتویٰ صادر فرمایئے کہ کفیل کو قرض دینے پر مجبور کیا جائیگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسئلہ مذکورہ بالا میں فقہائے احناف کے مابین اختلاف ہے، حضرت امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ کفالہ صحیح نہیں ہے، اور اربابِ متون نے اسی قول کو اختیار فرما کر ترجیح دی ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک یہ کفالہ صحیح اور درست ہے، مجلّہ اور شرحِ مجلّہ نے قولِ صاحبینؒ کو مختار کہا ہے، لہٰذا قولِ صاحبینؒ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رقم کی ذمہ داری کفیل پر آئیگی اور کفیل اپنے وعدہ کو پورا کریگا۔ ہاں اگر کوئی میت کی طرف سے تبرعاً ادا کردے تو بالاتفاق جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں ہے:

وكذا تصح الكفالة بعد موته مفلساً...أما لومات مفلساً وعليه دين لحقه في حياته لاكفيل به ولارهن فكفله إنسان فعند أبي حنيفةؒ لاتصح الكفالة به...وعندهما تصح لأن الدين لماكان ثابتاً في حياته لايسقط إلا بالأداء أو الإبراء...لكن ظاهرهذه المادة أن جمعية المجلة قد اختارت قول الإمامينؒ الموافق لما قال به الأئمة الثلاثة وأكثر أهل العلم كما في فتح القدير لأنها أطلقت صحة الكفالة عن المفلس ولم تقيدها بكون المفلس حياً ولوكان مرادها التقييد بذلک لما سكتت عن بيان حكم الكفالة بدين من مات مفلساً وإذا كانت جمعية المجلة قد اختارت قولهما يجب العمل به . (شرح المجلة لمحمدالاتاسی:۳/۳۲، المادة:۶۳۳۔ وكذافی شرح المجلة لعلی حيدر:۳/۶۵۰).

فتح القدیر میں ہے:

وقال أبويوسفؒ ومحمدؒ والأئمة الثلاثة وأكثر أهل العم تصح لأنه كفل بدين ثابت لعموم قوله صلى الله عليه وسلم "الزعيم غارم" ولماروي أنه صلى الله عليه وسلم أتي بجنازة...الخ، فلو لم تصح عن الميت المفلس لما صلى عليه بعد الكفالة ولأنه كفل بدين ثابت . (فتح القدير:۷/۳۰۴،دارالفكر).

علامہ عینیؒ شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

الكفالة من الميت... فقال ابن أبي ليلىؒ ومحمدؒ وأبويوسفؒ و الشافعيؒ: الكفالة جائزة عنه وإن لم يترك الميت شيئاً ولارجوع له في الميت إن ثاب للميت مال. (عمدة القاري:٨/ ٦٥٠،ملتان).

وللاستزادة انظر: البحر الرائق: ٦/٢٣٢،العناية :٧/ ٢٠٤،شرح المجلة لرستم باز:١/ ٢٣٥،البناية: ٢٤٧/٣، تبيين الحقائق:٤/ ١٥٩، بدائع الصنائع:٦/ ٦،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

اسرائیل کے معاون غیر مسلم کے ساتھ کاروبار کرنے کا حکم:

سوال: ایک ادارہ ہے جو اسرائیلی فوج کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور اس کی معاونت کرتا ہے، اور اسرائیلی فوج فلسطین کے مسلمانوں پر کھلم کھلا ظلم اور زیادتی کرنے میں مشہور ہیں، اور ''ٹیلاویو'' جو اسرائیل کے مشہور شہر کے اسٹاک ایکسچینج میں اس کا شمار ہے، کیا ایسے ادارہ کے ساتھ مل کر ایک ٹی وی چینل کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ یقینی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ اس معاملہ کے ساتھ اسرائیلی فوج کا نفع وابستہ ہے۔

نیز یہ بھی واضح فرمائے کہ اس شخص کا کیا حکم ہے جو ان سب باتوں کو جانتے ہوئے ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا ہے یا ان کے معاملات میں شامل ہوتا ہے؟

برائے مہربانی جوابات قرآن وسنت کی روشنی میں دئے جائیں کیونکہ جو لوگ اس میں ملوث ہیں وہ دلائل طلب کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے اور کوئی فتاویٰ آپ کے یہاں موجود ہوں تو وہ بھی ساتھ ارسال کردیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں میں بہترین بدل عنایت فرمائیں۔

الجواب واللہ الموفق للصواب:

عام حالات میں یہود ونصاریٰ اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرنا جب کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار نہ ہوں شرعاً جائز اور درست ہے، قرآن اور حدیث سے یہ ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لا ينهٰكم اللّٰه عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم

...الخ﴾. (سورة الممتحنة،الآية: ٨).

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہود ونصاریٰ کے ساتھ معاملات فرمائے تھے۔ملاحظہ فرمائیں بخاری شریف میں ہے:

"عن عائشة رضي اللّٰه تعالیٰ عنها أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم اشتریٰ طعاماً من رجل یهودي إلی أجل و رهنه درعاً من حدید. (رواہ البخاری:١/٢٧٧).

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودِ خیبر کے ساتھ مزارعت کا معاملہ فرمایا تھا۔

"قام عمر رضی اللہ عنہ خطیباً فقال: إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان عامل یهود خیبر علی أموالهم وقال: نقرکم ما أقرکم اللّٰه. (رواہ البخاری:١/٣٧٧).

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کرتے تھے:

عن جابر بن عبد اللّٰه رضی اللہ عنہ قال: کان بالمدینة یهودي وکان یسلفني في تمري إلی الجذاذ. (رواہ البخاری، کتاب الاطعمة، ٢/٨١٨).

وعنه أنه أخبره أن أباه توفي وترک علیه ثلاثین وسقاً لرجل من الیهود. (رواہ البخاری: کتاب الاستقراض، ١/٣٢٢).

لیکن وہ کفار جو مسلمانوں کے جانی دشمن بنے ہوئے ہوں اور برسر پیکار ہوں، مسلمانوں پر ظلم وستم میں کوئی دقیقہ وسانحہ نہیں چھوڑتے ہوں، شب وروز مسلمانوں کا خون بہانا ان کی طبعیتِ ثانیہ بن چکا ہو، جیسا کہ اس زمانے میں اسرائیلی فوج کا کردار ہے، ایسے ظالموں کے ساتھ یا ان ظالموں کے معاون فوجی اداروں کے ساتھ تعاون کے معاملات کرنا قرآن وحدیث اور فقہاء کی عبارات کی روشنی میں جائز اور درست نہیں ہے۔ کیونکہ مومن کے خلاف ظلم کرنے والے کے ساتھ کسی قسم کی معاونت کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ جب کہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ یہ ادارہ اسرائیلی فوج کی امداد کرتا ہے۔

کتاب وسنت سے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إنما ینهٰکم اللّٰه عن الذین قٰتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظٰهروا علی إخراجکم ...الخ﴾. (سورة الممتحنة،الآية:٩).

وقال تعالیٰ: ﴿ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان، واتقوا اللّٰه، إن اللّٰه شدید العقاب﴾.

(سورة المائدة،الآية: ۲).

قال العلامة الآلوسی البغدادیؒ: فيعم النهي كل ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام. (روح المعانی:۶/۵۷).

وقال الإمام القرطبي: وأن يكون المسلمون متظاهرين كاليد الواحدة (المؤمنون تتكافأ دماؤهم ويسعى بذمتهم أدناهم وهم يد على من سواهم، ويجب الإعراض عن المتعدي وترك النصرة له ورده عما هو عليه، ثم نهى فقال: ﴿ولاتعاونوا على الإثم والعدوان﴾ وهو الحكم اللاحق عن الجرائم، وعن العدوان وهو ظلم الناس. (الجامع لاحكام القرآن:۳/۳۳).

وفي الدر المنثور في التفسير الماثور: وأخرج ابن ماجة عن أبي هريرة ﷺ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من أعان على قتل مؤمن ولو بشطر كلمة، لقي الله مكتوب بين عينيه آيس من رحمة الله".

وأخرج الطبراني في الأوسط والحاكم عن ابن عباس ﷺ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " من أعان ظالماً بباطل ليدحض به حقاً فقد برئ من ذمة الله ورسوله".

وأخرج البخاري في تاريخه والطبراني والبيهقي في شعب الإيمان عن أوس بن شرحبيل ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من مشى مع ظالم ليعينه وهو يعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام".

وأخرج الحاكم وصححه والبيهقي عن عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود ﷺ عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من أعان قوماً على ظلم فهو كالبعير المتردى فهو ينزع بذنبه". (الدر المنثور:۶/۱۲).

معارف القرآن میں ہے:

اثم وعدوان کو سخت جرم قرار دیا، اس پر تعاون کرنے سے روکا...عدوان کے لفظی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم وجور ہے...اور ابن کثیر نے بروایتِ طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لیے چلا وہ اسلام سے نکل گیا، اسی پر سلف صالحین نے

ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے، کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد واعانت ہے۔ تفسیر روح المعانی میں آیتِ کریمہ ﴿فلن أكون ظهيراً للمجرمين﴾ کے تحت میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو درست کیا ہے، وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔ (معارف القرآن:۳/۲۵).

مسلمانوں کو تو چاہئے کہ اپنی جان و مال سے فلسطینی مسلمانوں کی امداد واعانت کریں اور ظالموں کو ظلم سے روکے، اسلامی اخوت ہمیں بہت ہی نرالا سبق دیتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

"عن سالم عن أبيه، عبد الله بن عمر رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم لايظلمه ولايسلمه ومن كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله بها كربة من كرب يوم القيامة ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة. (رواه مسلم:۲/۳۲۰).

ترجمہ: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگے گا، اللہ تعالیٰ اس کی حاجتوں کو پورا کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی مصیبت دور کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت قیامت کی مصیبتوں میں سے دور کریگا، اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضاً. (رواه البخاري:۲/۸۹۰).

مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے، ایک دوسرے کو مضبوط رکھتا ہے۔

عن النعمان بن بشير رضي الله عنه مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل جسد إن اشتكى عضو منه تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى. (صحیح مسلم:۲/۳۲۱).

مسلمانوں کی مثال آپس میں دوستی، باہمی ترحم اور آپس میں شفقت کے لحاظ سے ایک جسم کے مانند ہے، اگر اس کا ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو بدن کے تمام اعضاء بخار اور بے خوابی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں: ہدایہ میں ہے:

قال ویکرہ بیع السلاح في أیام الفتنة معناہ ممن یعرف أنه من أهل الفتنة لأنه تسبیب إلی المعصیة وقد بیناہ فی السیر. (الهدایة:۳/۴۷۲۔وکذا فی ردالمحتار:۶/۳۹۱، کتاب الکراهیة،سعید).

ہدایہ مع فتح القدیر میں ہے:

ولاینبغي أن یباع السلاح من أهل الحرب ولایجهز إلیهم لأن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم نهی عن بیع السلاح من أهل الحرب وحمله إلیهم، ولأن فیه تقویتهم علی قتال المسلمین فیمنع من ذلک وکذا الکراع لما بینا وکذلک الحدید لأنه أصل السلاح وکذا بعد الموادعة لأنها علی شرف النقض أو الانقضاء فکانوا حرباً علینا. (قوله ولایجهز إلیهم)مع التجار إلی دارالحرب . وفی العنایة : قوله (ولایجهز الیهم)أی لایبعث التجار إلیهم بالجهاز وهوفاخر المتاع ، والمراد به هاهنا السلاح والکراع والحدید. (الهدایة مع فتح القدیروالعنایة:۵/۴۶۰، کتاب السیر، دارالفکر).

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مذبوح غیر مدبوغ کھالوں کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک کارخانہ ہے اس میں کھالیں آتی ہیں جو مذبوح ہوتی ہیں لیکن کون ذبح کرتا ہے مجوسی یا اہل کتاب یا مسلمان کچھ علم نہیں ہے ،اور یہ کھالیں غیر مدبوغ ہوتی ہیں ،کیا ان کھالوں کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟یعنی غیر شرعی ذبح کھال کو پاک کردیتا ہے یا نہیں؟

(۲)نیز اگر کوئی شخص اہل کتاب وغیرہ کے مذبوحہ جانوروں کا گوشت کتوں اور بلیوں اور شیر وغیرہ کے لیے فروخت کرتا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟بینوا بالتفصیل توجروا بأجرجزیل.

الجواب: (۲)غیر شرعی طریقہ پر جانوروں کو ذبح کیا جائے تو ان کا گوشت پاک ہوگا یا نہیں ،اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے،اکثر مشائخ نے فرمایا کہ پاک نہیں ہوگا ناپاک ہی رہے گا،لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پاک ہوجائے گا،ملاعلی قاریؒ شرح نقایہ میں (غیر ماکول جانور جو شرعی طور پر ذبح کئے گئے ہوں ان کے گوشت کے متعلق) فرماتے ہیں کہ پاک ہونے والے قول کو امام کرخیؒ،صاحب ہدایہ،صاحب تحفہ،صاحب محیط، صاحبِ بدائع وغیرہ چوٹی کے علماء نے مختار کہا ہے۔لہذا اس قول کی بنا پر مذکورہ بالا جانوروں کے مذبوحہ گوشت کی

تجارت جائز اور درست ہونی چاہیئے۔ ملاحظہ فرمائیں شرح نقایہ میں ہے:

قوله وكذا (أي طهر) لحمه وإن لم يؤكل)لأن الجلد يطهر بالذكاة اتفاقاً، واللحم متصل به فلايكون نجساً، وهو مختار الكرخيؒ،وصاحب الهداية والتحفة وفي المحيط: وهو الصحيح من المذهب، وفي البدائع: وهو أقرب إلى الصواب، لأن النجاسة بالدم المسفوح وقد زال بالذكاة ، وقال كثير من المشايخ : يطهر جلده بها ولايطهر لحمه. (فتح باب العناية: ۸۳/۱، احكام الدباغة،بيروت).

علامہ عینیؒ بنایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

(وكذلک يطهر لحمه) أي لحم ماذكي حتى اذاصلي ومعه من لحم الثعلب المذبوح أونحوه أكثر من قدر الدرهم جازت صلاته (هو الصحيح) أي الحكم بطهارة لحمه هو الصحيح ، واحترز به قال في الأسرار وغيره أنه نجس قلت: وقد اختلف أصحابنا في طهارة لحمه وشحمه، فقال الكرخيؒ:كل حيوان يطهرجلده بالدباغ يطهر بالذكاة فهذا يدل على أنه يطهرشحمه ولحمه وسائر أجزاءه، وقال بعض مشائخنا: يطهرجلده لاغير منهم نصربن يحيى والفقيه أبوجعفر والأول أقرب إلى الصواب، وقال في المفيد هو الصحيح ...(البناية فى شرح الهداية: ۲۳۳/۱،ط: فيصل آباد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وفي فتاوىٰ أهل سمرقند: إذا ذبح كلبه وباع لحمه جاز، وكذا إذا ذبح حماراً وباع لحمه وهذا فصل اختلف المشايخ فيه بناء على اختلافهم في طهارة هذا اللحم بعد الذبح واختيار الصدر الشهيد على طهارته...ويجوز بيع لحوم السباع والحمر المذبوحة في الرواية الصحيحة، ولايجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا في محيط السرخسيؒ. (الفتاوى الهندية:۱۱۵/۳).

فتاویٰ شامی میں ہے:قوله والسباع وكذا يجوزبيع لحمها بعدالتذكية لإطعام الكلب أوسنور بخلاف لحم الخنزير لأنه لايجوز إطعامه محيط. (فتاوى شامی:۲۲٦/۵،سعيد).

حضرت حکیم الامتؒ بہشتی زیور میں فرماتے ہیں:

مردہ ان حیوانات کی بیع درست ہے جو پاک ہیں، جیسے دریائی جانور یا حشرات غیر ذی دم یا ذی دم جانور بعد ذبح، کیونکہ ذبح سے ہر جانور پاک ہوجاتا ہے سوائے سور کے۔ (بہشتی زیور، نواں حصہ، ص ۱۰۳).

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

سوائے خنزیر کے تمام وہ جانور جن میں دم سائل ہو خواہ ان کا گوشت کھانا حلال ہو یا حرام با قاعدہ ذبح کرنے سے سب پاک ہوجاتے ہیں، یعنی تمام اجزاان کے گوشت، چربی، آنتیں، اوجھ، سنگدانہ، پتہ، اعصاب سب طاہر ہوجاتے ہیں، سوائے خون کے یعنی دم مسفوح کے، نتیجہ یہ ہے کہ خارجی استعمال ان کا ہر طرح درست ہوجاتا ہے، جیسے سر پر باندھنا وغیرہ، ہاں کھانا درست نہیں سوائے حلال جانوروں کے۔ (نواں حصہ، ص ۱۰۵).

حضرتؒ کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ خنزیر کے سوا تمام جانور ذبح سے پاک ہوجاتے ہیں اور ان کی بیع درست ہے، ہاں سوائے حلال جانوروں کے ان کا کھانا درست نہیں۔

علامہ اکمل الدین بابرتیؒ اور علامہ عینیؒ نے قولِ مخالف کے جوابات بھی دیئے ہیں، تفصیل کے لیے، ملاحظہ فرمائیں:

(شرح العناية على الهداية بهامش فتح القدير مع الفتح: ۱/۹۵. ۹۶، دار الفكر. والبناية في شرح الهداية: ۱/۲۳۳. وفتاویٰ شامی: ۱/۲۰۵، سعید. ومجمع النهر شرح ملتقى الابحر: ۱/۲۱، تحت الماء المستعمل. وحاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۱۲۹. وخلاصة الفتاوىٰ: ۱/۴۳، احکام الدباغة، و الجوهرة النيرة: ۱/۱۷، ملتان. والفتاوى الولوالجية: ۱/۴۶، الفصل الثاني، بيروت. وامداد الفتاح، ص ۱۷۰، بيروت).

یہاں پر مزید ایک بات قابل غور یہ ہے کہ کیا ذبح سے مراد شرعی ذبح ضروری ہے یا مجوسی وغیرہ کا ذبیحہ بھی پاک ہے، نیز غیر شرعی طریقہ پر ذبح کیا گیا اور دم مسفوح مکمل طور پر بہہ گیا تو گوشت پاک ہوا یا نہیں؟

اس مسئلہ میں بھی فقہاء کے دو قول ہیں اور دونوں کی تصحیح کی گئی ہے، چونکہ مسئلہ تجارت سے متعلق ہے اس وجہ سے بیع کی گنجائش ہوگی۔ نیز اس کی نظیر سرطان ہے کہ غیر ماکول ہے اور اس کی بیع جائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

قوله الشرعية، نقل في البحر من كتاب الطهارة عن الدراية والمجتبى والقنية أن ذبح المجوسي، وتارك التسمية عمداً يوجب الطهارة على الأصح وإن لم يؤكل، وأفاد في التنوير أن اشتراط الذكاة الشرعية هو الأظهر وإن صحح المقابل. (حاشية الطحطاوی علی مراقی

الفلاح،ص۱۶۹،کتاب الطهارة،قديمى).

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وفي القنية : قال الكرابيسي والقاضي عبد الجبار : مجوسي ذبح حماراً قيل لايطهر والصحيح أنه يطهر. (البناية:۱/۲۳۳).

درمختار میں ہے:

(وهل يشترط كون ذكاته شرعية) بأن تكون من الأهل في المحل بالتسمية (قيل نعم، وقيل لا، والأول أظهر)، لأن ذبح المجوسي وتارك التسمية عمداً كلا ذبح (وإن صحح الثاني)صححه الزاهدي في القنية والمجتبى، وأقره في البحر. وفي رد المحتار: قوله وأقره في البحر، حيث ذكر أنه في المعراج نقل عن المجتبى والقنية تصحيح الثاني، ثم قال: وصاحب القنية هوصاحب المجتبى، وهوالإمام الزاهدى المشهورعلمه وفقهه، ويدل على أن هذا هوالأصح أن صاحب النهاية ذكرهذا الشرط أى كون الذكاة شرعية بصيغة قيل معزياً إلى الخانية. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۱/۲۰۵،سعيد۔وكذا في حاشية الطحطاوى على الدرالمختار:۱/۱۱۳،باب المياه،كوئته).

مسئلہ مذکورہ بالا کے چند نظائر حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

(۱)شافعی کے متروک التسمیہ عمداً کو ہلاک کرنے پر بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ ضائع کرنے والے پر تاوان نہیں، لیکن محققین علماء نے تاوان کو لازم کہا ہے، ملاحظہ ہو: فتاویٰ دار العلوم زکریا:۴/۶۱۸،۶۲۰،اور تاوان بیع کے حکم میں ہے، ہمارے فقہاء نے کلبِ معلّم کی بیع پر اس کے ہلاک کرنے پر تاوان لینے سے استدلال فرمایا۔

ملاحظہ فرمائیے علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

الكلاب التي ينتفع بها يجوز بيعها ويباح أثمانها...ثم عندنا لافرق بين المعلم وغير المعلم في رواية الأصول، فيجوز بيعه كيف ماكان، وروي عن أبي يوسفؒ أنه قال: لايجوز بيع الكلب العقور، كماروي عن أبي حنيفةؒ فيه، ثم على أصلهم يجب قيمته على قاتله، واحتجوا بماروي عن عثمان بن عفان ﷺ أنه أغرم رجلاً ثمن كلب قتله عشرين بعيراً، وبما روي عن عمرو بن العاص ﷺ أنه قضى في كلب صيد قتله رجل بأربعين درهماً، وقضى في

كلب ماشية بكبش. (عمدة القاري:٨/٥٧٤،ط:ملتان).

(۲) فقہاء کی عبارات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مردار، بلی کتے کو نہیں کھلا سکتے، لیکن مردار پر بلی، کتے کو چھوڑ سکتے ہیں تا کہ وہ از خود کھالے۔

قال في الفتاوى البزازية: ولا يحمل الجيفة إلى الهرة ويحمل الهرة إلى الجيفة. (الفتاوى البزازية:٤/٨٢).

نفع المفتی میں ہے:

ثم إن كان لابد من سقي الخمرفرساً لايشربه بل يضع الخمر بين يديه ليشربه، كما أن لاينبغي أن يؤكل الميتة الكلب إلا بأن يضع الميتة بين يدى الكلب، فيأكله بنفسه كما في مطالب المؤمنين. (نفع المفتي والسائل،باب مايتعلق بالحيوانات،ص٤٧٢،بيروت).

المحيط البرهاني میں ہے:

رجل له امرأة ذمية أوأب ذمي ليس له أن يقوده إلى البيعة، وله أن يقوده من البيعة إلى منزله، لأن الذهاب إلى البيعة معصية وإلى المنزل لا، ولايحمل الخمرإلى الخل ولكن يحمل الخل إليها، وكذلك لايحمل الجيفة إلى الهرة ويحمل الهرة إلى الجيفة. (المحيط البرهاني:٦/١٠٣،فصل في معاملة اهل الذمة،كتاب الاستحسان،رشيدية).

لیکن بعض فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناپاک پانی جانوروں کو پلا سکتے ہیں۔

البحر الرائق میں ہے:

وفي الذخيرة: ولا بأس برش الماء النجس في الطريق ولايسقى للبهائم وفي خزانة الفتاوىٰ: ولا بأس بأن يسقى الماء النجس للبقر والإبل والغنم. (البحر الرائق:١/١٢٥، کوئٹہ).

ضرورت کی وجہ سے دوسرے قول پر فتویٰ دے سکتے ہیں پہلا قول کراہت یعنی خلاف اولیٰ پر محمول ہوگا۔

جب کہ دوسرا قول مؤید بالحدیث ہے۔ملاحظہ ہو:

(الف) بخاری شریف کی رایت میں ہے کہ حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم قوم ثمود کی جگہ پہونچے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے کنویں کے پانی سے آٹا گوندھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آٹا اونٹوں کو کھلانے کا حکم فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ کسی دور جگہ رکھدو اونٹ اس کی طرف خود آئیں گے۔

عن ابن عمر رضي الله عنه أن الناس نزلوا مع رسول الله صلى الله عليه أرض ثمود الحجر فاستقوا من بئرها واعتجنوا به، فأمرهم رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يهريقوا ما استقوا من بئرها وأن يعلفوا الإبل العجين... الخ. (رواه البخاري:۱/۴۷۸).

(ب) ایک اور حدیث میں ہے: ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عورت نے دعوتِ طعام پیش کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے لیے تشریف لے گئے، لقمہ بار بار چبانے لگے لیکن چبایا نہیں گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ گوشت مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہے، تب اس عورت نے واقعہ سنایا کہ پڑوسی کی بکری اس کی اجازت کے بغیر ذبح کی تھی اور ثمن اس کے گھر بھیجا لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**أطعميه الأسارى**" ۔یعنی یہ گوشت فقراء کو کھلا دو۔ (رواه ابوداود: ۲/۱۱۷، باب اجتناب الشبهات).

(۳) نیز مالِ حرام کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر مالک معلوم نہیں ہے تو فقراء پر صدقہ کر دیا جائے، معلوم ہوا جس مال میں خبث ہو وہ مال فقراء کو دے سکتے ہیں۔

علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں:

لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (فتاوى الشامي:۶/۳۸۵، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

جواب (۱): غیر شرعی ذبح کے کھال اور گوشت کو پاک کرنے سے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے جس کی تفصیل مسئلہ بالا کے تحت گزر چکی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اصح قول کے مطابق ذبح شرعی ضروری نہیں ہے، بلکہ علامہ شامیؒ نے نقل فرمایا کہ ذبح شرعی کی قید قیل سے منقول ہے جس کا ضعف واضح ہے۔لہذا مسئلہ مذکورہ بالا میں مذبوحہ غیر مدبوغہ کھالوں کی تجارت کی گنجائش ہے۔

وقال الشيخ الشلبيؒ في حاشية التبيين: وفي القنية قال الكرابيسي والقاضي عبدالجبار مجوسي ذبح حماراً قيل لايطهر والصحيح أنه يطهر. (حاشية تبيين الحقائق:۱/۲۶، ط:ملتان).

علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

قوله وأقره في البحر، حيث ذكر أنه في المعراج نقل عن المجتبى والقنية تصحيح

الثاني، ثم قال: وصاحب القنية هو صاحب المجتبى، وهو الإمام الزاهدى المشهور علمه وفقهه، ويدل على أن هذا هو الأصح أن صاحب النهاية ذكر هذا الشرط أى كون الذكاة شرعية بصيغة قيل معزياً إلى فتاوى قاضيخان. (حاشية الطحطاوى على الدرالمختار:۱/۱۱۳،باب المياه،کوئٹہ۔والدرالمختارمع ردالمحتار:۱/۲۰۵،سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سانپ کی کھال سے بنی ہوئی زین کی تجارت کا حکم:

سوال: فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دباغت دینے سے سانپ کی کھال پاک نہیں ہوتی ہے،اس لیے کہ وہ متحمل دباغت نہیں ہے،لیکن اگرموجودہ زمانہ میں دواؤں (chemicals) کے ذریعہ دباغت دی جائے تو کیاوہ پاک ہوگی یانہیں؟اور کیااس سے بنی ہوئی زین کی تجارت اوراس کا استعمال جائز ہوگایانہیں؟

جدید کیمیکل کے ذریعہ دباغت کا طریقہ ملاحظہ ہو:

فی زمانناسانپ کی کھال کوعام طورپر(saddle) زین بنانے کے لیےاستعمال کیاجاتاہےاس کاطریقہ یہ لکھاہے کہ اس میں دوائیں (chemicals) ڈال کراس کو(tan) سکھایاجاتاہے،پھراس میں مزیددوائیں ڈال کراس کوپگلایااورنرم کیاجاتاہے،جس کی وجہ سےاس کھال کی تمام رطوبات ختم ہوجاتی ہیں،پھراگراس کودوبارہ پانی میں ڈالا جائے تو اس رطوبت کاکوئی اثر ظاہرنہیں ہوتا،یعنی تمام رطوبتیں اس دوائی کی وجہ سےزائل ہوجاتی ہے۔بینواتوجروا۔

الجواب: فقہاءسانپ کی کھال کوبذریعہ دباغت بھی پاک نہ ہونے کابیان کرتے وقت یہ علت بیان کرتے ہیں کہ دباغت کی متحمل نہیں ہے،لیکن اگردوائیوں (chemicals) کے ذریعہ جدیدطریقہ پردباغت حاصل ہوجائے توحدیث شریف کےعموم کی وجہ سےپاک ہونے کاحکم لگایاجائیگا۔لہذااس سے بنی ہوئی اشیاء کی تجارت اوراس کااستعمال بھی جائزاوردرست ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

"كل اهاب دبغ فقدطهر".

البحرالرائق میں ہے: **وقوله كل إهاب يتناول كل جلد يحتمل الدباغة.** (البحرالرائق:۱/۹۹،کوئٹہ)۔

فتح القدیرمیں ہے:

وكل إهاب دبغ فقد طهر يتناول كل جلد يحتمل الدباغة لا مالا يحتمله. (فتح

القدیر: ۱/ ۹۲، دار الفکر)۔

قاموس الفقہ میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں:

حنفیہ نے عام طور پر سانپ اور چوہے وغیرہ کے چمڑے کو بھی نا قابل انتفاع قرار دیا ہے کیونکہ ان کی دباغت ممکن نہیں، مگر موجودہ زمانہ میں چوں کہ حشرات الارض کے چمڑوں کو بھی دباغت دینا ممکن ہو گیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ بھی دباغت کے بعد قابل انتفاع ہوں گے، چنانچہ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر مردار بکری کے مثانہ کو دباغت دے کر قابل استعمال بنایا جاسکے تو وہ بھی پاک ہو جائیگا۔ (قاموس الفقہ: ۳/۴۰۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حرام کاروبار والے غیر مسلم کے ساتھ معاملات کا حکم:

سوال: ایک آدمی ایک غیر مسلم (ہندو، یا عیسائی) کے ساتھ معاملات لین دین کرتا ہے یا اس کا ہدیہ قبول کرتا ہے یا اس کے ہاں کبھی کبھی کوئی دعوت کھاتا ہے اور وہ غیر مسلم ایسا کام کرتا ہے جو مسلمانوں کے لیے شرعاً جائز نہیں، مثلاً:

(۱) بیع فاسد کا مرتکب ہے باہر سے اشیاء کو خریدتا ہے اور قبضہ سے پہلے فروخت کرتا ہے۔

(۲) شراب فروخت کرتا ہے اور اس کی غالب کمائی یہی ہے۔

(۳) جاندار کی تصویر والے کپڑے فروخت کرتا ہے اور یہی کمائی ہے۔

(۴) حلاق ہے اور لوگوں کے غیر شرعی بال بناتا ہے اور ڈاڑھیاں مونڈتا ہے۔

(۵) سٹہ یا قمار ''جوئے'' میں مبتلا ہے۔

(۶) گانے بجانے کے آلات اور کیسٹیں فروخت کرتا ہے وغیرہ، تو اگر کوئی مسلمان اس غیر مسلم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرے اور قیمت لے یا ہدیہ وغیرہ لے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ غیر مسلم ممالک میں اکثر ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: جس غیر مسلم کی کمائی سوال میں درج شدہ معاملات کی ہو اس کے ساتھ مسلمان کا صحیح لین دین جائز ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی بیع قبل القبض کے بارے میں فرماتے ہیں:

اگر خریدار کافر ہو تو اسے اس طرح کی بیع کرنے کا مضائقہ نہیں۔ (امداد الاحکام: ۳/۴۱۰)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

کفار کو آلاتِ مزامیر بیچنے میں کوئی حرج نہیں، **وفي بيعه أي المزمار مع الكفار لم تقم الحرمة بالعين ولا بالفعل فإن الكفار ليسوا مخاطبين بحرمة الغناء ولا هو حرام في الأديان كلها ۔**

(امداد الاحکام: ۳/۳۸۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عیب کی وجہ سے مبیع کی واپسی کے خرچہ کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو ایک بھاری مشین فروخت کردی، فروخت کرنے کے بعد مشین میں ایک ایسا عیب ظاہر ہوا جس کی وجہ سے مشین کو واپس کرنا پڑا اب مشین کی واپسی کا خرچہ عمر مشتری پر ہوگا یا بائع زید پر؟ برائے کرم حکم شرعی سے مطلع فرما کر اجر عظیم کے مستحق ہوں۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مشتری اگر پرانے عیب پر مطلع ہوا اور واپس کرنا چاہتا ہے تو واپسی کا خرچہ مشتری عمر کے ذمہ لازم ہوگا۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

تنبيهات مهمة: الأول: وجد بالمبيع الذي له حمل ومؤنة عيباً ورده فمؤنة الرد على المشتري . (البحر الرائق: ٦/ ٣٧، كوئته).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

وجد بالمبيع الذي له حمل ومؤنة عيباً ورده فمؤنة الرد على المشتري. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٤/ ٤٤٧).

وفي المحيط البرهاني: وفي المنتقى: اشترى من آخر تمراً بالري وحمله إلى الكوفة ثم اطلع على عيب هناك فإن أراد أن يرده قال محمدٌ: ليس له ذلك حتى يرده إلى ذلك الموضع علل فقال: لأن لحمله مؤنة . (المحيط البرهاني: ٨/ ٣٠، فصل في العيوب، رشيدية).

المحیط البرہانی کی عبارت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مبیع کو بائع کے پاس پہنچانا جب مشتری کے ذمہ ہے تو اس کی بار برداری کی مشقت وخرچہ بھی مشتری کے ذمہ ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشتری ثانی سے کل قیمت کے مطالبہ کا حکم:

سوال: دو آدمیوں نے ایک مشین خریدی جس کا ثمن ایک ماہ کے لیے مؤجل ہے ایک مشتری غائب ہو کر کہیں چلا گیا، اب مدت ختم ہونے کے بعد بائع پوری قیمت طلب کرتا ہے، تو مشتری ثانی مشین کیسے وصول کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب بائع پورا ثمن وصول کیے بغیر مشین دینے پر راضی نہیں ہے تو مشتری ثانی کو چاہئے کہ پوری قیمت ادا کردے اور مشین پر قبضہ کرلے پھر جب مشتری اول آجائے تو اس سے نصف قیمت وصول کرنے بعد اس کا حصہ سپرد کرے۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

وإن اشترى اثنان شيئاً وغاب واحد منهما فللحاضر دفع كل ثمنه ويجبر البائع على قبول الكل ودفع الكل للحاضر وله قبضه وحبسه عن شريكه إذا حضر حتى ينقد شريكه الثمن بخلاف المستاجرين. (الدر المختار:٥/٢٣١، سعيد).

تبیین الحقائق میں ہے:

ولو غاب أحد الشريكين للحاضر دفع كل الثمن وقبضه وحبسه حتى ينقد شريكه يعني إذا اشترى رجلان فغاب أحدهما قبل القبض يكون للحاضر دفع كل الثمن وقبضه كله ثم إذا حضر شريكه فله أن يحبسه عنه حتى ينقده. (تبيين الحقائق:٤/١٢٩، ملتان).

مزید ملاحظہ ہو: (شرح العناية:٧/١٢٧، والبحر الرائق:٦/١٧٠، وفتح القدير:٧/١٢٧، والبناية:٣/٢١١).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

غیر مسلم کے ساتھ شرط فاسد لگانے سے بیع کا حکم:

سوال: ایک صاحب نے بچیوں کے مدرسہ کے لیے ایک گرجہ خریدا۔ اس میں بعض شرائط لگائی گئیں مثلاً ایک شرط یہ لگائی کہ اس گرجہ میں اندر جو تبدیلیاں چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن باہر سے اس کی شکل جوں کی توں رہنی چاہئے، اس لیے کہ بہت پرانا گرجہ ہے، آثارِ قدیمہ ہونے کی وجہ سے اس کی باہر والی شکل میں تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ نیز یہ شرط بھی لگائی گئی کہ اس کے احاطہ میں اس کے بانی کی قبر کے اردگرد اونچی دیوار بنا سکتے ہیں

تا کہ اندر کچھ نظر نہ آئے اس گرجے کی اہمیت کی وجہ سے خریدار نے ان شرائط کوقبول کیا تا کہ بیت الکفر بیت الاسلام بن جائے ،اس گرجے کی اہمیت اور بعض مسیحی جماعتوں کے اعتراض کی وجہ سے یہ معاملہ بعض اخبارات کی زینت بنا،اس پر ایک مفتی صاحب نے فتویٰ جاری فرمایا کہ شرائط فاسدہ کی وجہ سے عقد فاسد ہے اور واجب الرد ہے،اس مسئلہ میں آپ کے دار الافتاء کا فتویٰ درکار ہے؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ کا قانون یہی ہے کہ شرائط فاسدہ کی وجہ سے عقد فاسد ہوجاتا ہے،لیکن یہ قانون مسلمانوں کے آپس میں لین دین کا ہے،اگر غیر مسلم کے ساتھ عقد ہوتو اس کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے امداد الاحکام میں بیع قبل القبض سے متعلق استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا کہ بیع قبل القبض ناجائز ہے کیونکہ بیع معدوم ہے یا بیع مالم یقبض ہے اور دونوں فاسد ہیں، ہاں اگر خریدار کافر ہوتو اس سے اس طرح بیع کرنے کا مضائقہ نہیں مسلمان کے ساتھ اس طرح معاملہ نہ کیا جائے۔(امداد الاحکام:۳/۴۱۰)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: کفار کوآلاتِ مزامیر بیچنے میں کوئی حرج نہیں، وفي بيعه أي المزمار مع الكفار لم تقم الحرمة بالعين ولا بالفعل فإن الكفار ليسوا مخاطبين بحرمة الغناء ولا هو حرام في الأديان كلها۔(امداد الاحکام:۳/۳۸۴). واللہ ﷻ اعلم۔

موٹر سائیکل اور عمرہ ویلفیئر اسکیم کا حکم:

سوال: ایک کمپنی کی طرف سے سوال کے ساتھ منسلک اشتہار شائع ہوا،اس اشتہار کا خلاصہ یہ ہے کہ موٹر سائیکل فروخت کرنے والی کمپنی نے یہ اسکیم بنائی کہ خریدار موٹر سائیکل بالاقساط خریدیں گے ، درمیان میں قرعہ اندازی ہوگی ،جس شخص کا قرعہ نکلے گا اس کو جمع شدہ اقساط کے عوض موٹر سائیکل ملے گی اور بقیہ اقساط معاف ہونگی اور قرعہ اندازی میں بعض کو عمرے کا ٹکٹ بھی ملیگا ،اس معاملے کو بعض مفتی حضرات ناجائز کہتے ہیں، ناجائز ہونے کے کچھ اسباب یوں بیان کرتے ہیں:

(۱) اگر یہ بیع سلم ہے تو اس میں پورا ثمن پہلے دینا چاہئے جب کہ یہاں ثمن بالاقساط ادا کیا جاتا ہے۔

(۲) ثمن مجہول ہے کسی کے لیے کچھ ہے اور کسی کے لیے کچھ ہے۔

(۳) اگر دی ہوئی قیمت ثمن نہ ہو، امانت ہو اور کمپنی کو تصرف کی اجازت ہو تو یہ قرض بن گیا اور پھر اس کی

وجہ سے قرعہ اندازی کی صورت میں مشتری مقرض کو قیمت میں چھوٹ مل گئی، یہ ”کل قرض جر نفعاً فھو ربا“ کے ذیل میں آ گیا، آپ کا فتویٰ اس سلسلہ میں کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسمہ سبحانہ و تعالیٰ :

بصورتِ مسئولہ بندہ عاجز کے نزدیک یہ اسکیم جائز ہے اور اس کے صحیح ہونے کے دو طریقے ہیں:

(۱) ایک یہ ہے کہ ثمن کی اقساط بطورِ امانت دیں اور تصرف کی بھی اجازت دے دیں، تو یہ قرض بن جائے گا اور قرعہ اندازی کی صورت میں یہی قسطیں ثمن بن جائیں گی، اور ” کل قرض جر نفعاً فھو ربا “ کا جواب یہ ہے کہ جو نفع قرض میں ہر ایک کے لیے مشروط و معلوم ہو وہ ممنوع ہے اور جو نفع موہوم ہو وہ ممنوع نہیں ہے، اور یہاں ہر ایک کے لیے نفع موہوم ہے معلوم نہیں ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ صدر مفتی دار العلوم دیوبند نظام الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ یہاں پر ڈاک خانہ میں ایک اسکیم جاری ہے کہ وہاں ایک پونڈ پانچ پونڈ جمع کرتے ہیں اور وہ جمع کیے جانے کی رسید دیتے ہیں، جس وقت وہ پیسے نکالنا ہو رسید دے کر نکال سکتے ہیں، لیکن ہر ماہ اخبارات میں کچھ نمبرات نکلتے ہیں ایک پونڈ کا سو پونڈ ملتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طریقہ سے روپیہ رکھ کر جو زیادہ رقم ملے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:...حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کو جائز فرمایا ہے۔ ہم جواب کا صرف ایک حصہ نقل کرتے ہیں:
پھر جب اس زیادتی کے ملنے کا یقین بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کا مطالبہ ہی ہوتا ہے اور نہ سب کو یہ زیادتی مل ہی جاتی ہے، بلکہ محکمہ اپنی صوابدید اور محض اپنے ضابطہ کے مطابق کچھ نمبرات کے لیے زائد رقم دینے کا اعلان کرتا ہے، جن کا نام نکلتا ہے صرف ان کو دیتا ہے اور کسی شخص کو اس زائد رقم کے مطالبہ کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا ہے، پھر آگے حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ زائد رقم تو اس کو ملتی ہے جو قرض دیتا ہے لہذا اس زیادتی کو اس قرض نے کھینچا ہے اور ” کل قرض جر نفعاً فھو ربا “ کے تحت داخل ہو کر یہ زیادتی ربا ہو گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہر قرض دینے والے کو یہ زائد رقم نہیں ملتی، محکمہ جس کو چاہتا ہے صرف اس کو ملتی ہے حتی کہ اگر کوئی شخص قرض دینے والوں میں سے جس کا نام نہ نکلا ہو وہ اس زیادتی کا مطالبہ کرے تو اس کو سابق

عقد معاملہ کی بنیاد پر حق مطالبہ نہیں ہوگا، تو یہ زیادتی جر نفعاً کا مصداق نہیں ہوئی کیونکہ " كل قرض جر نفعاً "
کے تحت شامی (۴/۱۷۴) میں ہے:

إذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر و من الخلاصة وفي الذخيرة : إن لم يكن النفع مشروطاً في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به ۔ پھر آگے جر اور انجرار کا فرق بتلایا ہے۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/۱۹۴و۱۹۵)۔

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ احسن الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

آج کل ایک موٹر سائیکل کمپنی اپنی مشہوری کے لیے ایک طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے کہ اقساط پر موٹر سائیکلیں فروخت کر رہی ہے اکیس اقساط مقرر کی گئیں اور ہر قسط ۵۵۰ روپے ماہوار ادا کرنا ہوتی ہے، اگر اقساط پوری کرنے سے پہلے درمیان میں کسی خریدار کا نام قرعہ اندازی میں نکل آیا، ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے، تو موٹر سائیکل اسے دیدی جاتی ہے اور بقیہ تمام اقساط معاف کر دی جاتی ہیں، اگر ۲۰ ماہ تک قرعہ اندازی میں خریدار کا نام نہ نکلے تو ۲۱ ماہ کے بعد موٹر سائیکل اسے دیدی جاتی ہے اور یہ اکیس اقساط کی رقم موٹر سائیکل کی وہ قیمت ہے جو مارکیٹ میں چل رہی ہے زیادہ نہیں، خرید و فروخت کا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب :

یہ قیمت میں کمپنی کی طرف سے رعایت ہے اور کسی خریدار کو رعایت دی جائے اس کا انتخاب وہ بذریعہ قرعہ اندازی کرتی ہے اس میں کسی کا کوئی نقصان نہیں، لہذا یہ خرید و فروخت جائز ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔
(احسن الفتاویٰ: ۶/۵۱۸)۔

اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں پوری قیمت مجہول نہیں بلکہ معلوم ہے ہاں بذریعہ قرعہ اندازی بعض لوگوں کو بقیہ ثمن معاف کر دیا جاتا ہے، اس لیے اشتہار میں پوری قیمت بتلانا چاہئے، ہاں بذریعہ قرعہ اندازی بعض کے لیے کچھ قیمت معاف ہو جاتی ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ سے یہ سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنی تجارت کے فروغ کے لیے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ ایک گھڑی کی بازاری قیمت سو روپے ہے اس کے واسطے ۵۰ ممبر بنائے گئے جو ہر ماہ دس

دس دیں گے یہ اسکیم دس ماہ چلائی جائیگی، پہلے مہینہ جس کا نام قرعہ اندازی میں نکلے گا اس کو دس روپے میں گھڑی ملے گی، اسی طرح نو ماہ تک جس کا نام نکلتا رہے گا اس کو گھڑی ملتی رہے گی، دسویں مہینہ جو ۱۴۱ اشخاص بچ گئے ان کو ایک ایک گھڑی دے کر اسکیم ختم کر دی جائے گی، کیا یہ جائز ہے؟

الجواب: حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے اس اسکیم کو جائز فرمایا بشرطیکہ اگر گاہک گھڑی ملنے سے قبل مرجائے تو اس کی قسطیں واپس دی جاتی ہوں، ہم نے یہ سوال و جواب کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔ (نظام الفتاویٰ: ۳۱۹/۲)۔

مفتی خالد سیف اللہ صاحب نے بھی ایسی شکل کو ابتداءً فاسد اور آخر میں جائز فرمایا ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مسائل: ۱۶۶/۴) لیکن ابتداءً فاسد کہنے کی وجہ ثمن کی جہالت کو بتلایا جب کہ یہاں اصل ثمن مجہول نہیں، ہاں بعد میں قرعہ اندازی کی وجہ سے بقیہ ثمن معاف کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں نفع ہر عاقد کے لیے مشروط نہیں بلکہ قرعہ نکلنے پر موقوف ہے اور اس کو تبرعِ مشروط کہتے ہیں یعنی اگر قرعہ نکلا تو بقیہ اقساط معاف ہوں گی اور تبرعِ مشروط جائز ہے، جس کی شریعت میں بہت مثالیں ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عازبؓ سے اونٹ کا پالان خریدا اور عازبؓ سے فرمایا کہ اپنے بیٹے براءؓ سے کہدیں کہ یہ پالان میرے ساتھ لیجائیں، عازبؓ نے کہا کہ اس شرط پر لے جائیں گے کہ آپ ہجرت کا قصہ سنائیں، حضرت عازبؓ نے پالان اٹھانے کے احسان کو قصہ سنانے کے ساتھ مشروط کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے قصہ سنانے کی شرط کو منظور کر لیا۔

امداد الاحکام میں ہے: مدارس میں داخلہ کی فیس اور ماہواری فیس یہ اجرت نہیں چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے۔ (امداد الاحکام: ۶۲۳/۳، کتاب الاجارہ)۔

اس مسئلہ کی تفصیل کتاب الھبہ، تبرع مشروط کے تحت ملاحظہ کیجئے۔

تبرعِ مشروط کی آسان تعبیر: احسان میں شرط لگانا ہے جیسے اسقاط ثمن کے لیے قرعہ اندازی اور نام نکلنے کی شرط لگائی جائے۔

(۲) مذکورہ بالا عقد کی تصحیح کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کو سلم نہیں بلکہ استصناع قرار دیا جائے اور اشتہار میں

اس کی صراحت کی جائے، سلم نہ قرار دینے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سلم میں رأس المال کا دینا ضروری ہے اور اجل کا ذکر بھی ضروری ہے اور یہاں رأس المال بالاقساط دیا جاتا ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

أما الذي يرجع إلى رأس المال...ومنها: أن يكون مقبوضاً في مجلس السلم لأن المسلم فيه دين والافتراق لا عن قبض رأس المال يكون افتراقاً عن دين بدين... ولأن مأخذ هذا العقد دليل على هذا الشرط فإنه يسمى سلماً وسلفاً...والسلف ينبئى عن التقدم فيقتضي لزوم تسليم رأس المال . (بدائع الصنائع: ۲۰۲/۵، سعيد).

تبيين الحقائق میں ہے: **فإن أسلم في مائتي درهم في كر بر مائة دين عليه ومائة نقد فالسلم فى الدين باطل أى في حصة الدين لأنه دين بدين .** (تبيين الحقائق : ١١٨/٤ ،امداديه).

لیکن استصناع میں فی الفور ثمن کی ادائیگی ضروری نہیں، مجلّہ میں مذکور ہے: **لا يلزم فى الاستصناع دفع الثمن حالاً لأن هذا بيع والمستصنع مشترٍ والمشترى لا يلزمه دفع الثمن قبل إحضار المبيع .** (مجلة وشرح المجلة لمحمد خالد الاتاسى : ٤٠٥/٢، باب الاستصناع).

استصناع کا آسان ترجمہ کسی چیز کا آرڈر دینا یا بک کروانا ہے، استصناع میں یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز بعد میں بنادی جائے بلکہ پہلے سے بنی ہوئی چیز میں سے بھی آرڈر دینے والے کو دے سکتے ہیں۔ کذا فی کتب الفقہ۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿وابتغوا من فضل اللّٰہ﴾

(سورۃ الجمعۃ،الآیۃ: ۱۰).

وقال عز وجل:

﴿لیس علیکم جناح أن تبتغوا فضلاً من ربکم﴾

(سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۱۹۸).

باب......﴿٤﴾

مرابحہ اور بینک سے متعلق احکام کا بیان

فصل اول

اسلامی بینک کے مرابحہ کے احکام

اسلامی بینک کے عقدِ مرابحہ پر اشکال اور جواب:

سوال: ہمارے ہاں بعض غیر سودی بینک ہیں جو مرابحہ کے طریقہ پر کام کرتے ہیں جس کی صورت کچھ یوں ہے کہ: زید کو سامان کی ضرورت ہے مگر قیمت ندارد تو بینک کو درخواست دیتا ہے کہ میرے ساتھ مرابحہ کا معاملہ کیا جائے بینک تحقیقات کے بعد اگریمنٹ کا کاغذ دیتا ہے طریقہ یہ ہے کہ زید کسی دکان یا فیکٹری جاتا ہے اور مطلوبہ سامان بینک کا کوئی وکیل یا زید بینک کے لیے ایک لاکھ رینڈ میں خریدتا ہے پھر یہی سامان زید بینک سے ایک لاکھ ۳۰ ہزار میں ثمن مؤجل کے ساتھ خریدتا ہے کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض علماء کرام اس پر اشکالات کرتے ہیں جن میں سے دو اشکال قابل توجہ ہیں:۔

(۱) ایک یہ ہے کہ اگر بینک کے وکیل نے بینک کے لیے خریدا تو پھر بظاہر کوئی بڑا اشکال وارد نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خود زید بینک کا وکیل بالشراء بن جائے اور پھر خود خریدار بن جائے تو اس کا پہلا قبضہ بحیثیت وکیل وامین کے قبض امانت ہے اور پھر اپنے لیے قبضہ قبض ضمان یا قبض معاوضہ ہے اور قبض امانت یعنی قبض سابق قبض معاوضہ جو قبض لاحق ہے اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا؟

(۲) دوسرا اشکال یہ ہے کہ اگر زید خود وکیل بالشراء بھی ہو اور خود وکیل بالبیع بن کر پھر مشتری بھی ہو تو ایک آدمی بائع اور مشتری بن جائیگا، جب کہ یہ فقہاء کے کلام کی روشنی میں ممنوع ہے یا یوں کہدیں کہ زید اصیل بھی

ہے یعنی مشتری اور وکیل بھی ہے یعنی وکیل بالبیع ، بالفاظ دیگر زید مطالبِ ثمن اور مطلوب بالثمن بھی ہے یہ دونوں حیثیتیں کیسے جمع ہوئیں؟

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

الوکیل بالبیع لایملک شراء ہ لنفسه لأن الواحد لایکون مشتریاً و بائعاً فیبیعه من غیرہ ثم یشتریه منه. (فتاوی الشامی:۵/۵۲۱،سعید).

الجواب: (۱) بصورتِ مسئولہ قبضہ امانت قبضہ ضمان کا قائم مقام نہیں ہوسکتا اس لیے کہ قبضہ امانت ضعیف اور کمزور ہے جب کہ قبضہ ضمان قوی اور مضبوط ہے اور ضعیف اور کمزور چیز قوی اور مضبوط کے قائم مقام نہیں ہوسکتی ہاں قبض امانت میں تصرف کرنے سے خود بخود قبض ضمان بن جاتا ہے، اور ہلاک ہوجانے پر مشتری ہی کے ذمہ تاوان آجائیگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تصرف کرنے کی صورت میں قبض امانت خود بخود قبض ضمان بن گیا، ہاں اگر قبض امانت قبض ضمان نہ بنتا تو ہلاک ہونے کی صورت میں بینک جو بائع ہے اس پر تاوان آتا، لیکن تصرف کرنے یا منتقل کرنے کی صورت میں مشتری پر تاوان آئیگا، یعنی قبض امانت قبض ضمان کا قائم مقام نہ بننے کے مسئلے کا تعلق ضمان سے ہے کہ ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان کس پر آئیگا، یہ کوئی حلال حرام کا مسئلہ نہیں ہے۔ہاں مشتری بینک کے ساتھ ایگریمنٹ کرلے یا زبانی بتلادے کہ اگر میرے تصرف سے قبل ہلاک ہوجائے تو بینک ذمہ دار ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں شرح القواعد الفقہیہ میں ہے:

بخلاف ما لو باع الأمانة ممن هي عنده فإنه لاینوب قبض الأمانة عن قبض البیع لأن قبض البیع قبض الضمان وقبض الأمانة دونه فلاینوب عنه بل لابد من تجدید القبض بأن یخلی بین نفسه وبین الأمانة المبیعة بعد العقد. (شرح القواعد الفقهیة للشیخ احمد بن الشیخ محمد الزرقا، ص ۳۰۱).

ہدایہ میں ہے:

وإن کان له مال في ید أجنبي فأنفق علیهما بغیر إذن القاضي ضمن لأنه تصرف في مال الغیر بغیر ولایة لأنه نائب في الحفظ لاغیر، بخلاف ما إذا أمره القاضي لأن أمره ملزم لعموم ولایته، وإذا ضمن لایرجع علی القابض لأنه ملکه بالضمان فظهر أنه کان متبرعاً به.

(الهداية، باب النفقة،۲/۴٤۸).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

پہلا قبضہ جوکہ وکالت ہے، امانت کی حیثیت سے ہے اور دوسرا قبضہ اپنے حساب میں اور قبضۂ ضمان ہے، اور ایسا دوسرا قبضہ وہیں معتبر ہوتا ہے جہاں کہ پہلا بھی اسی قسم کا ہو، جیسے کہ کسی نے کوئی مال غصب کر رکھا ہو تو قبضہ ضمان ہوتا ہے، لیکن اس کی تصریح موجود ہے کہ امانتی قبضہ کی صورت میں بیع کا معاملہ کر لینے کے بعد اگر آدمی اس مال تک پہونچ جاتا ہے یا اس میں کوئی مالکانہ تصرف کرتا ہے تو اب اس سامان پر اس کا اپنے حساب کا قبضہ ہوجائیگا اور وہ مسئلہ جوکہ موجب اشکال ہے اس کی اصل یہ نکلتی کہ اگر پہلا قبضہ امانتی ہے تو نفس بیع کی وجہ سے وہ قبضہ اپنے ضمانتی قبضہ سے نہیں بدلے گا اور اگر پہلا قبضہ بھی ضمانتی ہے تو نفس بیع کی وجہ سے اپنا قبضہ ہوجائیگا۔ (جدید فقہی مباحث:۳/۴۲۷، ۴۲۸، بحوالہ البحر الرائق ۶/۸۶۔ ورد المحتار ۴/۱۱۲).

قبضہ امان میں تصرف کرنے سے قبضہ ضمان میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں مبسوط میں ہے:

ثم الخلط أنواع ثلاثة خلط يتعذر التمييز بعده كخلط الشيء بجنسه فهذا موجب للضمان لأنه يتعذر به على المالك الوصول إلى عين ملكه...وخلط يتعسر معه التمييز كخلط الحنطة بالشعير فهو موجب للضمان لأنه يتعذر على المالك الوصول إلى عين ملكه إلا بحرج...وإذا كان عند الرجل وديعة دراهم أو دنانير أو شيء من المكيل أو الموزون فأنفق طائفة منهما في حاجته كان ضامناً لما أنفق...فإن جاء بمثل ما أنفق فخلطه بالباقي صار ضامناً لجميعها لأن ما أنفق صار ديناً في ذمته وهو لا ينفرد بقضاء الدين بغير محضر من صاحبه فيكون فعله هذا خلطاً لما بقي بملك نفسه وذلك موجب للضمان عليه. (المبسوط للامام السرخسيؒ، ۱۱/ ۱۱۰، ۱۱۱، كتاب الوديعة، ادارة القرآن).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

امین کو تصرف کرنا درست نہیں...اگر ایسا کرے گا تو ضامن ہوجائیگا۔ (تالیفاتِ رشیدیہ، ص ۴۳۱).

نیز اگر مودع ودیعت والی سواری پر سوار ہوا اور سواری کی حالت میں ہلاک ہوئی تو مودع پر تاوان آئیگا۔

علامہ عینیؒ نے فرمایا:

لأن الضمان وجب عليه بنفس الركوب حتى لو هلك في حالة الاستعمال يضمن بلا

خلاف. (حاشية هداية:۳/۲۷۲) معلوم ہوا کہ ودیعت کے جانور پر سواری یا ودیعت والے کپڑوں کے پہننے سے قبض امانت قبض ضمان بن گیا، اس وجہ سے فقہاء اعارۃ الدراہم للانفاق کو قرض کہتے ہیں۔(الهداية:۳/۲۷۹) اس لیے کہ مستعار دراہم خرچ کرنے سے خود بخود قرض مضمون بن گئے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا:

امانت باذن صرف کردینے سے وہ قرض ہوجاتا ہے گو اس کا قصد نہ ہو۔(امداد الفتاویٰ:۳/۱۴۵).

نیز دوسری جگہ فرماتے ہیں: اور بینکوں میں جو جمع کیا جاتا ہے گو عنوان اس کا ودیعت ہو لیکن اس قواعد میں یہ امر یقینی اور معروف ہے کہ وہاں بعینہٖ یہ ودائع نہیں رکھی جاتی بلکہ ان سے کاروبار کیا جاتا ہے پس بقاعدہ ''المعروف کالمشروط'' اس تصرف کو مودع بکسر الدال کی جانب سے ماذون فیہ کیا جائیگا، اور تصرف کا اذن دینا اقراض ہے۔(امداد الفتاویٰ:۲/۵۷۱، کتاب الوقف).

وللاستزادة انظر: فتاوى الشامي:۵/۶۶۸-۶۷۰، كتاب الايداع، سعيد۔ وحاشية الطحطاوي على الدر المختار:۳/۳۷۹، كوئتة).

اشکال اور جواب:

اشکال: اس مسئلہ پر ایک اشکال واقع ہوتا ہے کہ امانت میں تصرف کرنے سے گنہگار ہوتا ہے پھر تصرف کرنے کی کیوں اجازت دی؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ تصرف کرنے پر مالک راضی ہے لہذا اس مسئلہ میں گناہ نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ علامہ شامیؒ نے ایک قول یہ بھی ذکر فرمایا ہے کہ مؤکل کے حکم سے وکیل خود اپنے لیے خرید لے یعنی بائع اور مشتری بیک وقت بن جائے تو بھی درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی شامی میں ہے:

وإن أمره المؤكل أن يبيعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لايقبل شهادته فباع منهم جاز بزازية كذا في البحر، ولايخفى مابينهما من المخالفة، وذكر مثل مافي السراج في النهاية عن المبسوط، ومثل مافي البزازية في الذخيرة عن الطحاوي، وكأن في المسألة قولين خلافاً لمن ادعى أنه لامخالفة بينهما. (فتاوى الشامي:۵/۵۲۲، سعيد۔ وكذا في البحر الرائق:۷/۱۶۷، كوئته).

لوگوں کو سود کی لعنت سے بچانے کے لیے علامہ شامیؒ کے اس قول پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ ہاں بینک کسی اور کو وکیل بالبیع بنا دے تو نور علیٰ نور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مشتری کے تصرف کرنے سے پہلے مبیع ہلاک ہو جائے تو بینک اس کا ذمہ دار ہے اور اگر مشتری کے تصرف کرنے کے بعد ہلاک ہو جائے تو مشتری پر تاوان آئیگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کے عقدِ مرابحہ پر دوسرا اشکال اور حیلہ کا حکم:

سوال: بینک کے ذریعہ بیع مرابحہ کا اصل مقصد و خلاصہ تو یہ ہے کہ بینک نے زید کو ایک لاکھ رینڈ دئے اور ایک لاکھ پچاس ہزار وصول کریگا جو صریح سود ہے اس کے جواز کے لیے مرابحہ کا سہارا لینا کہاں تک درست ہے؟

الجواب: مشتری زید کا مقصد قرض لینا نہیں بلکہ اس کو کوئی مشین چاہئے لیکن اس کے پاس رقم نہیں تو مشین کے حصول کے دو طریقے ہیں:۔ ایک یہ کہ وہ قرض لیکر زائد رقم ادا کردے اور قرضہ کی رقم سے مشین خرید لے یہ تو صریح سود ہے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ بینک کے ذریعہ سے مشین مرابحہ کے طور پر خرید لے۔ یہ دوسرا طریقہ سود نہیں بلکہ سود سے بچنے کی تدبیر ہے اور معاملات میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تدبیر سکھائی ہے، وہ واقعہ سب کو معلوم ہے کہ ایک صحابی نے دو ادنی صاع کھجور کے عوض ایک صاع عمدہ کھجور خرید لی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سود قرار دیکر مسترد فرمایا اور یہ تدبیر بتلائی کہ دو صاع کھجور درہم کے عوض فروخت کریں اور جو درہم مشتری کے ذمہ لازم ہوا اس کے بدلے ایک صاع عمدہ کھجور خرید لے، دونوں عقود کا خلاصہ ایک ہے لیکن اس تدبیر سے معاملہ جائز ہوا۔

حیلوں کی اقسام اور ان کا حکم:

ہر حیلہ ناجائز نہیں بلکہ جس حیلے کا مقصد کسی حکم شرعی کو باطل کرنا یا کسی کا حق مارنا ہو تو وہ حیلہ شرعاً ناجائز ہے، اگر کوئی زکوٰۃ کے حکم کو باطل کرنے کے لیے حولانِ حول سے کچھ پہلے اپنا مال بیوی کو ہبہ کرے اور پھر بیوی حولانِ حول سے پہلے پوری رقم شوہر کو ہبہ کرے تو اس تدبیر کا مقصد حکم شرعی کو باطل کرنا اور فقراء کے حق پر چھری پھیرنا ہے لہذا یہ ناجائز ہے۔

یا جس طرح بنی اسرائیل کو یوم السبت میں مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا، اس حکم کا مقصد یوم السبت کو شکار کے حصول کا ذریعہ بنانے کی ممانعت تھی، لیکن انہوں نے یوم السبت میں مچھلیوں کو مختلف تالابوں میں جمع کر کے واپسی کا راستہ بند کر دیا اور اتوار کو پکڑنے لگے، یہ شکار کرنے کے جواز کا حیلہ تھا۔ لیکن یہ شرعی حکم کو باطل کرنے کے مترادف تھا، کیونکہ یوم السبت شکار کا ذریعہ بن گیا تھا۔ (بلکہ بعض حضرات کے نزدیک ان کو بند باندھنے سے بھی منع کیا گیا تھا)

یا جیسے کسی کو کسی پر ہاتھ اٹھا کر مارنے سے منع کیا جائے اور وہ اس کو لاتیں مارنا شروع کرے تو اس صورت میں مقصد تو ظاہر ہے فوت ہو گیا۔

یا یہود پر چربی حرام کر دی گئی تھی جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ تو انہوں نے پگلا کر بیچنا شروع کر دیا چونکہ پگلانے سے شئی کی حقیقت نہیں بدلتی بلکہ وہ چربی ہی ہے اس لیے یہ حیلہ ممنوع اور ناجائز ہوا۔

ہاں اس حیلہ میں کوئی حرج نہیں جس میں کسی کو حرام سے بچانا مقصود ہو، جیسے مبسوط سرخسی میں ہے:

" فالحاصل أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أويتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن. (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۲۰۹/۳۰).

اسی طرح صاع والا حیلہ بھی حدیث میں سکھایا گیا، جیسا کہ شیخین کی روایت میں مذکور ہے۔

نیز وہ حیلہ بھی ممنوع نہیں ہے جس میں کسی بے گناہ کو بچانا مقصود ہو جیسے بقول مفسرین حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی کے مارنے کے لیے بجائے کوڑوں کے جھاڑو کو استعمال کیا گیا تاکہ قسم پوری ہو جائے یا کسی کی جان بچانے کی ضرورت ہو یہ بھی ممنوع نہیں ہے، جیسے اس شخص کا قصہ جو نہایت کمزور تھا اور اس سے زنا کا صدور ہوا تھا چونکہ کوڑوں کا تحمل نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کی پٹائی قمچیوں کے ایک گٹھے سے کی گئی تاکہ اس کی جان بچ جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مرابحہ میں فی ماہ نفع کے تعین کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے ایک مشین ایک ہزار میں خریدی، عمر نے اس طرح فروخت کی کہ اصل قیمت ایک ہزار رینڈ ہے، البتہ زید قسطوں میں ثمن ادا کریگا اس لیے فی مہینہ دو سو رینڈ نفع لیگا، مثلاً جنوری سے مئی کے آخر تک پانچ ماہ کی اقساط کے مطابق اس کی قیمت دو ہزار بن گئی، پس دو ہزار مؤجل میں مشین فروخت کی، ساتھ

یہ بھی کہا کہ اگر مشتری دو ماہ کے بعد پوری قیمت ادا کر دے تو اس کی قیمت چودہ سو ہو جائیگی، کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ عقد در حقیقت عقدِ مرابحہ ہے اور بیع مرابحہ میں یہ جائز ہے کہ فی مہینہ دوسو ریند نفع لیا جائے، لہٰذا اگر پانچ ماہ کے بعد ادائیگی ہوئی تو دو ہزار قیمت بن جائیگی، اور اگر دو ماہ کے بعد ادا کر دیا یا مشتری کا انتقال ہو گیا تو چودہ سو ریند بن گئے۔

ملاحظہ ہو اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

اگر بیع مرابحہ ہو جس میں بائع مدت کے مقابلہ میں ثمن میں جو زیادتی کر رہا ہے، اس کو صراحۃً بیان کر دے، اس کے بارے میں متأخرین احناف کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون مدتِ مقررہ سے پہلے اپنا دین ادا کر دے، یا مدتِ مقررہ آنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے، تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کریگا جتنا سابقہ ایام کے مقابل میں ہوگا، اور مقررہ مدت تک جتنے ایام باقی ہیں، اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا ہوگا،...شاید متأخرین حنفیہ کے اس فتوے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگر چہ مدت مستقل طور پر قابل عوض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، لیکن ضمناً و تبعاً اس کے مقابلے میں کچھ ثمن مقرر کرنا جائز ہے، جیسے گائے کے حمل کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں، لیکن اس حمل کی وجہ سے اس گائے کی قیمت میں اضافہ کرنا جائز ہے، چنانچہ کئی چیزوں کی بیع مستقلاً تو جائز نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات تبعاً اس کا عوض لینا جائز ہوتا ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل، ۳/۱۱۸، ۱۲۰، ملخصاً)۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

قضى المديون الدين المؤجل قبل حلول الأجل أومات فحل بموته فأخذ من تركته لايأخذ من المرابحة التي جرت بينهما إلا بقدرمامضى من الأيام، وهو جواب المتأخرين، قنية، وبه أفتى المرحوم أبوالسعود آفندي مفتي الروم، وعلله بالرفق للجانبين. وفي الشامية: قوله لايأخذ من المرابحة، صورته اشترى شيئاً بعشرة نقداً وباعه لآخر بعشرين إلى أجل هو عشرة أشهر، فإذا قضاه بعد تمام خمسة أومات بعدها يأخذ خمسة ويترك خمسة، أقول: والظاهرأن مثله مالو أقرضه وباعه سلعة بثمن معلوم وأجل ذلك، فيحسب له من ثمن السلعة بقدر مامضى فقط تأمل. (الدرالمختار مع فتاوى الشامي: ٦/٧٥٧، قبيل كتاب

الفرائض، سعید).

شامی میں ہے:

(قوله وعلله) أی علله الحانوتي بالتباعد عن شبهة الربا لأنها في باب الربا ملحقة بالحقيقة، ووجهه أن الربح في مقابلة الأجل، لأن الأجل وإن لم يكن مالاً، ولايقابله شيء من الثمن لكن اعتبروه مالاً في المرابحة إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن، فلو أخذ كل الثمن قبل الحلول كان أخذه بلاعوض. (فتاوی الشامی:٦/٧٥٧،قبیل کتاب الفرائض، سعید).

وللاستزادة انظر: (فتح القدیر: ٦/١٣٣، باب المرابحة و التولیة،دار الفکر۔و البحر الرائق: ٦/١٤٤، باب المرابحة و التولیة، کوئٹه۔ و الطحطاوی علی الدر المختار:٤/٣٦٣،کوئٹه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مروجہ اسلامی بینکاری پر اشکال اور جواب:

سوال: بعض حضرات بینک کے درج ذیل معاملہ پر اعتراض کرتے ہیں:

ایک شخص کار خریدنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس پوری رقم موجود نہیں ہے تو غیر سودی بینک گاڑی خود خریدتے ہیں، اور گاہک کو ایک طویل مدت مثلاً تین سال سے پانچ سال تک کے لیے کرایہ پر دیتے ہیں، کرایہ متعین کرتے وقت وہ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ تین سال کی مدت میں انہیں اپنی لاگت کچھ نفع کے ساتھ وصول ہوجائے، اس کے بعد وہ گاڑی کرایہ دار مستاجر کو معمولی قیمت پر بیچ دیتے ہیں، یا بلا قیمت ہدیہ دیدیتے ہیں۔

بعض لوگ اس معاملہ پر کچھ اعتراضات کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ اجارے کے بعد گاڑی مستاجر کو بیچی جاتی ہے، یا ہبہ کی جاتی ہے، اس لیے یہ صفقۃ فی صفقۃ ہے، اور حدیث شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے اس لیے ایسا معاملہ ناجائز ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عرف میں مروج ہونے کی وجہ سے "صفقة في صفقة" کے عقد کی گنجائش نکل سکتی ہے، لوگوں کے تعامل اور عرف کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوگا، کیونکہ تعامل ملحق بالاجماع ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کاغذات میں الگ الگ عقد ہوتا ہے اس وجہ سے جائز ہے۔

"صفقة في صفقة" کی مختلف تعریفیں:

قال الامام الترمذيؒ: وقد فسر بعض أهل العلم قالوا: بيعتين في بيعة:

(١) أن يقول: أبيعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسيئة بعشرين، ولايفارقه على أحد

البيعين، فإذا فارقه على أحدهما، فلابأس، إذا كانت العقدة على واحد منهما، قال الشافعيؒ:
ومن معنى ما نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة :

(۲) أن يقول : أبيعك داري هذه بكذا، على أن تبيعني غلامك بكذا، فإذا وجب لي غلامك وجبت لك داري، وهذا تفارق عن بيع بغير ثمن معلوم ، ولايدري كل واحد منهما على ماوقعت عليه صفقته. (ترمذی شریف:۱/۲۳۳، باب ماجاء فی النهی عن بيعتين فی بيعة).

وفي تحفة الأحوذي: قال: اعلم أنه قد فسر البيعتان في بيعة بتفسير آخر وهو :

(۳) أن يسلفه ديناراً في قفيزحنطة إلى شهر فلما حل الأجل وطالبه بالحنطة قال: بعني القفيز الذي لك علي إلى شهرين بقفيزين فصار ذلك بيعتين في بيعة ، لأن البيع الثاني قد دخل على الأول فيرد إليه أوكسهما وهوالأول، كذا في شرح السنن لابن رسلان؛ فقد فسر حديث أبي هريرة ﷺ المذكور، بلفظ : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة ، بثلاثة تفاسير فاحفظها. (تحفة الاحوذی:۳/۳۲۶).

وللاستزادة انظر: (بذل المجهودفی حل ابی داود:۱۵/۱۳۵،باب فیمن باع بيعتين فی بيعة ـوبداية المجتهد فی نهاية المقتصد:۲/۱۱۵،الفصل الثالث، فی الفرق بين مايباع من الطعام مكيلاً وجزافاً).

مولانا اعجاز احمد صمدانی صاحب نے بیعتان فی بیعۃ وصفقتان فی صفقۃ دونوں کو الگ الگ بیان کیا ہے اور دونوں کے درمیان عموم وخصوص کا فرق واضح کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (غرر کی صورتیں،ص ۶۵ـ ۱۲۹).

ملاحظہ ہو حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

" قال في نور الأنوار: وتعامل الناس ملحق بالإجماع وفيه ثم إجماع من بعدهم أي بعد الصحابة ﷺ من أهل كل عصر". اس سے معلوم ہوا کہ تعامل بھی مثل اجماع کے کسی عصر کے ساتھ خاص نہیں، البتہ جو اجماع کا رکن ہے وہی اس میں بھی ہونا ضروری ہے، یعنی اس وقت کے علماء اس پر نکیر نہ کرتے ہوں، اسی طرح فقہاء نے بہت سے نئے جزئیات کے جواز پر تعامل سے احتجاج کیا ہے۔

كما فى الهداية: فى البيع الفاسد: ومن اشترى نعلاً على أن يحذوه البائع قوله يجوز للتعامل فيه فصار كصبغ الثوب للتعامل جوزنا الاستصناع وفيها فى السلم أن استصنع الى قوله للإجماع الثابت بالتعامل. (فقہ حنفی کے اصول وضوابط،ص ۱۶۱، بحوالہ امداد الفتاوی:۴/۲۶۵).

قال في الكفاية: وجه الاستحسان أن فيه عرفاً ظاهراً وفي النزوع عن العادة حرج بين فصار كصبغ الثوب لأن القياس أن لايجوز لأن الإجارة بيع المنافع والصبغ عين وجوزناها للتعامل وكالاستصناع فإن بيع المعدوم لايجوز وإنما جوزناه للتعامل. (الكفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٦/٨٥،رشيدية).

وقال في العناية: ووجهه ما بيناه أنه شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين وفي الاستحسان يجوز للتعامل والتعامل قاضٍ على القياس لكونه إجماعاً فعلياً كصبغ الثوب. (العناية في شرح الهداية على هامش فتح القدير:٦/٨٥،رشيدية).

وقال في فتح القدير: قوله وفي الاستحسان يجوز البيع ويلزم الشرط للتعامل كذلک ومثله في ديارنا شراء القبقاب على هذا الوجه أي على أن يسمر له سيراً ...ومثله إجارة الظئر مع لزوم استهلاک اللبن جاز للتعامل...قوله وللتعامل جوزنا الاستصناع مع أنه بيع المعدوم ومن أنواعه شراء الصوف المنسوج على أن يجعله البائع قلنسوة بشرط أن يبطن لها البائع بطانة من عنده...وفي المنتقى...قال لو اشترى على أن يهب له ديناراً من الثمن جاز وهو حسن لأن حاصل هذا حطيطة مشترطة ومآلها إلى الشراء بالثمن الأنقص ولو باع رقبة الطريق على أن له حق المرور أو السفل على أن له قرار العلو جاز. (فتح القدير: ٦/٨٥، رشيدية۔وكذا في شرح المجلة: ٢/٦٤۔٧٠المادة ١٨٨۔١٨٩).

(۲) اگر صلاح اثمار کے بعد درخت بیچے تو اس صورت میں پھلوں کو درختوں پر باقی چھوڑنے کے بارے میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا درختوں پر چھوڑے رکھنا جائز ہے، اور اس کی دلیل عرف، عادت اور استحسان ہے۔ ملاحظہ ہو:

وكذا إذا تناهى عظمها عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ لما قلنا واستحسنه محمدؒ للعادة. (الهداية:٣/٢٦).

اور تعامل کی وجہ سے فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے، ملاحظہ ہو:

القول الراجح هو قول محمدؒ قال العلامة ابن الهمام يجوز عند محمدؒ استحساناً وهو قول الائمة الثلاثة واختاره الطحاويؒ لعموم البلوىٰ. وقال العلامة الحصكفي: وبه

یفتیٰ، بحرعن الأسرار...وقال العلامة ابن نجیم وفی الأسرار: الفتویٰ علی قول محمدؒ وبه أخذ الطحاويؒ...قال أستاذنا المفتي غلام قادرالنعماني: والعرف في زماننا يقتضي ترجيح قول محمدؒ. (القول الراجح:۲/۹).

(۳) بیع میں کفالت کی شرط ملائم ومناسب ہونے کی وجہ سے صاحب ہدایہ نے جائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو: قال في الهداية: ومن باع داراً وكفل رجل عنه بالدرک فهو تسليم لأن الكفالة لوكانت مشروطة فی البيع فتمامه بقبوله ثم بالدعویٰ يسعى في نقض ماتم من جهته وإن لم تكن مشروطة فيه فالمراد بها أحكام البيع وترغيب المشتري فيه إذ لايرغب فيه دون الكفالة. (الهداية:۳/۱۲٤).

وفي شرح العناية: قال: إن الكفالة إما أن تكون مشروطة فی البيع أو لا، فإن كان الأول (أی مشروطة) وهو شرط ملائم للعقد. (العناية فی شرح الهداية علی هامش فتح القدير: ۷/۲۱۷، باب الكفالة).

(۴) محیط برہانی میں ہے:

ولوقال: اعتق عبدک عني بألف درهم، فأعتق، فإنه يعتق عن الآمر ويلزمه المال عن الآمر استحساناً. (المحيط البرهانی:٤/۲۸۱، كتاب العتاق،فصل فی المتفرقات،رشيدية).

وفی البدائع: ولوقال لآخر: اعتق عبدک عني علی ألف درهم فأعتق فالولاء للآمر لأن العتق يقع عنه استحساناً...أن الأمر بالفعل أمر بما لا وجود للفعل بدونه كالأمر بصعود السطح يكون أمراً بنصب السلم والأمر بالصلاة يكون أمراً بالطهارة ونحوذلک ولا وجود للعتق عن الآمر بدون ثبوت الملک فكان أمر المالک بإعتاق عبده عنه بالبدل المذكور أمراً بتمليكه منه بذلک البدل ثم بإعتاقه عنه تصحيحاً لتصرفه كأنه صرح بذلک فقال: بعه مني واعتقه عني ففعل...لأن الملک فی البيع الصحيح لايقف علی القبض، بل يثبت بنفس العقد فصارالمامور بائعاً عبده منه بالبدل المذكور ثم معتقاً عنه بأمره وتوكيله. (بدائع الصنائع،كتاب الولاء،٤/۱٦۰،سعيد).

وفی درر الحكام: كأنه قال: بع عبدک عني بألف وكن وكيلي بالإعتاق. (دررالحكام

شرح غرر الاحکام، اکثر مدة الحمل، ۴۳۳/۴).

خلاصہ یہ ہے کہ اس عقد میں یعنی وکالۃ بالاعتاق میں وکالۃ بالبیع شامل ہے جو صفقۃ فی صفقۃ ہے اس کے باوجود فقہاء نے استحسان کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔

(۴) صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

وكذا لو سلطا المرتهن على بيعه لأنه توكيل بالبيع وهما يملكانه. (الهداية: ۵۲۹/۴، كتاب الرهن).

مذکورہ بالا عبارت میں عقدِ رہن میں وکالہ بالبیع ہے جس کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔

(۵) مفت سروس کی شرط کے ساتھ بیع جائز ہے، جو کہ اجارۃ مشروطۃ فی البیع ہے۔ ملاحظہ ہو حضرت مولانا مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

عقدِ بیع میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگائی، لیکن تاجروں کے عرف میں وہ شرط عقد کے اندر داخل شمار ہوتی ہے تو ایسی شرط لگانا بھی جائز ہے، جیسے آج کل بازار میں بہت ساری ایسی چیزیں فروخت ہوتی ہیں جس میں بائع یہ کہتا ہے کہ میں ایک سال تک اس کی مفت سروس کروں گا، اب ظاہر ہے کہ یہ مفت سروس فراہم کرنا مقتضائے عقد کے اندر تو داخل نہیں، لیکن متعارف ہونے کی وجہ سے یہ شرط جائز ہے، لہٰذا اگر مشتری یہ شرط لگادے کہ میں اس شرط پر خریدتا ہوں کہ تم اس کی ایک سال تک مفت سروس کروگے تو اس شرط کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوگا۔ (تقریر ترمذی: ۱۰۸/۱).

"صفقة في صفقة" کے بارے میں حضرت تھانویؒ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

سوال: "نهي عن صفقة في صفقة" کے ظاہری معنی کے لحاظ سے بعض امور ناجائز معلوم ہوتے ہیں حالانکہ بکثرت خاص و عام میں شائع ہیں، مثلاً گھڑی کی مرمت کہ ٹوٹے ہوئے پرزے کو نکال کر صحیح پرزہ لگادے تو اس پرزہ کی تو بیع ہے اور لگانے کا اجارہ۔ (۲) چارپائی بنوانا اور بان اپنے پاس سے نہ دینا اس میں بان کی بیع ہے اور بننے کا اجارہ۔ (۳) سقہ سے پانی لینا کہ جب اس نے کنویں سے پانی نکال کر اپنے ظروف میں لیا تو اس کی ملک ہوگیا سو پانی کی بیع ہوئی اور وہاں سے لانے کا اجارہ نیز بیع مالیس عندہ بھی ہے، (۴) کوئی زیور یا انگوٹھی جڑنے کو دینا کہ نگینوں کی بیع ہے اور لگانے کا اجارہ وغیر ذلک من المعاملات الرائجۃ۔

الجواب: تعامل کی وجہ سے کہ بلانکیر شائع ہے جو ایک نوع کا اجماع ہے یہ سب معاملات جائز ہیں، پس

نص عام مخصوص البعض ہے جیسا کہ فقہاء نے صباغی اور خیاطی میں اس کی اجازت دی ہے کہ صبغ اور خیط صانع کا ہوتا ہے اور اس میں اجارہ بھی ہوتا ہے، وہذا ظاہر جداً فقط، واللہ اعلم۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۶۳، ۶۴).

حضرت مولانا مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

حنفیہ کا مذہب یہ کہ عام حالات میں عقد کے ساتھ کوئی شرط لگانے سے عقد فاسد ہوجاتا ہے، البتہ تین قسم کی شرطیں ہیں جو جائز ہیں، اور عقد کو فاسد نہیں کرتیں، ایک وہ شرط جو مقتضائے عقد کے مطابق ہو، دوسری وہ جو عقد کے ملائم ہو، جیسے رہن رکھنے یا کفالت یا حوالہ کی شرط، اور تیسری وہ شرط جس پر عرف اور تعامل ہوگیا ہو۔

بیع بالوفاء میں وفا کی شرط صلب عقد میں ہو تو اس کو بھی بعض فقہاء حنفیہ نے جائز قرار دیا ہے صاحب نہایہ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، اور علامہ شامیؒ نے علامہ زیلعیؒ سے اس کا مطلب یہ نقل کیا ہے کہ بیع صحیح ہوجائیگی، اور مشتری کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا بھی حلال ہوگا، لیکن چونکہ بیع میں یہ شرط ہے کہ جب کبھی بائع قیمت واپس لوٹائیگا، مشتری کو وہ دوبارہ بیچنی ہوگی، اس لیے کہ مشتری کے لیے اس مبیع کو آگے بیچنا جائز نہیں ہوگا، اور زیلعیؒ نے اسی قول کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے، اور علامہ شامیؒ نہر کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے دیار میں عمل اسی قول پر ہے جیسے زیلعیؒ نے ترجیح دی ہے، پھر فرماتے ہیں کہ شاید یہ جواز کا قول اس بنیاد پر ہے کہ یہ شرط متعارف ہوگئی ہے، البتہ اکثر فقہاء حنفیہ نے اس صورت کو جائز قرار نہیں دیا کہ وفاء کی شرط صلب عقد میں ہو، بعد ازاں مفتی تقی صاحب نے شامی، محیط برہانی، فتاویٰ قاضیخان، جامع الفصولین، شرح مجلّہ وغیرہ کتب فقہ سے دلائل بیان فرمائے ہیں۔

ملاحظہ ہو: (غیر سودی بینکاری، ص ۲۴۲ـ۲۴۷).

”صفقة في صفقة“ کے جواز کی دوسری صورت:

اگر دونوں عقد الگ الگ کردئے جائیں تب بھی معاملہ صحیح ہوجائیگا۔

(یعنی ایک عقد دوسرے عقد کے لیے بمنزلہ شرط کے نہ ہو تو معاملہ درست ہے).

صاحبِ ہدایہ نے چند مثالیں ذکر فرمائی ہیں:

(۱) اگر کسی نے کہا میں پانچ کتابیں دوسو رینڈ میں فروخت کرتا ہوں اور مشتری نے کہا میں نے تین کتابیں ۱۲۰ رینڈ میں خرید لیں تو یہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں ایک مبیع کے لیے بائع کو دو عقد کرنے کی ضرورت ہوگی، لیکن اگر بائع نے کہا کہ میں پانچ کتابیں دوسو رینڈ میں فروخت کرتا ہوں اور ہر کتاب چالیس رینڈ میں بیچتا ہوں اور مشتری نے تین کتابیں خرید لیں تو یہ جائز ہوگا، کیونکہ تکرارِ لفظ پایا گیا۔

ہدایہ میں ہے:

ولیس له أن یقبل في بعض المبیع ولا أن یقبل المشتریٔ ببعض الثمن لعدم رضاء الآخر بتفرق الصفقة إلا إذا بین کل واحد لأنه صفقات معنی. (الهداية:۳/۱۹).

وفي الکفایة :قوله ولیس له أن یقبل في بعض المبیع، وإذا أوجب البائع البیع في شیئین أوثلاثة وأراد المشتري أن یقبل العقد في أحدهمادون الآخرفهذا علی وجهین إن کانت الصفقة واحدة فلیس له ذلک وإن کانت متفرقة فله ذلک وهذا لأن الصفقة إذا کانت واحدة فالمشتري بقبول العقد في أحدهما یرید تفریق الصفقة علی البایع وفي ذلک ضرر بالبائع لأن العادة فیما بین الناس أنهم یضمون الردیٔ إلی الجید فی البیاعات و ینقصون شیئاً عن ثمن الجید لترویج الردیٔ بالجید فلو ثبت خیار قبول العقد في أحدهما فالمشتري یقبل العقد فی الجید ویترک الردیٔ علی البایع فیزول الجید عن ملک البایع بأقل من ثمنه وفیه ضرر بالبایع وقال القدوریؒ: إلا أن یرضی البایع فی المجلس نحوأن یقول بعتک هذا العبد بخمسین فیقول المشتري قبلت في نصفه فیرضی به البایع... ویکون ذلک من المشتري فی الحقیقة استیئناف إیجاب لا قبولاً فإذا رضي به البائع فی المجلس یصح. (الکفاية:۵/٤٦٢،رشيدية).

علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ثمن کی تقسیم اجزاء کے اعتبار سے ہو تو جائز ہے اس لیے کہ اس کا ہر حصہ معلوم ہوگا اور اگر تقسیم قیمت کے اعتبار سے ہو مثلاً عقد کی نسبت غلامین یا ثوبین کی طرف کی تو جہالت کی وجہ سے جائز نہیں اور اگر بائع نے یوں کہا "بعتک هذین العبدین هذا بمائة وهذا بمائة" اور مشتری ان میں سے ایک قبول کرے تو بعض مواقع میں اس کو جائز قرار دیا ہے، اور جامع صغیر میں ہے کہ جواز کے لیے لفظ بیع کا تکرار ضروری ہے، مثلاً "بعتک هذین العبدین بعتک هذا بمائة وبعتک هذا بمائة"۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

...إلا أن یرضی الآخر بذلک بعد قبوله فی البعض ویکون المبیع مما ینقسم الثمن علیه بالأجزاء کعبد واحد أومکیل أو موزون، فإن کان مما لاینقسم إلا بالقیمة کثوبین وعبدین لایجوز وإن قبل الآخر...فلوکان بین ثمن کل منهما فلا یخلو إماأن یکون بلا

تکرار لفظ البیع أو بتکراره، ففیما إذا کرره فلاتفاق علی أنه صفقتان فإذا قبل في أحدهما یصح مثل أن یقول بعتک هذین العبدین بعتک هذا بألف وبعتک هذا بألف أو اشتریت منک هذین العبدین اشتریت هذا بألف واشتریت هذا بألف کذا في موضع .... (فتح القدیر: ٦/ ٢٥٥، ٢٥٧، دار الفکر).

(۲) اگر کسی نے منی چینجر کو ایک درہم دیا اور اس سے کہا کہ اس درہم میں مجھے نصف درہم کے عوض فلوس اور باقی نصف درہم کے عوض نصف درہم الاحبہ دیدو تو صاحبین کے نزدیک پہلے نصف درہم میں عقد جائز ہے اور دوسرے میں ربوا کی وجہ سے ناجائز ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سب میں باطل ہے کیونکہ عقد ایک ہے اور جب بعض باطل ہوا تو فسادِ قوی کی وجہ سے بقیہ بھی فاسد ہوا، اور اگر لفظ اعطاء کو مکرر کیا اور یہ کہا کہ مجھے نصف درہم کے عوض فلوس دیدو اور نصف درہم کے عوض نصف درہم الاحبہ دیدو تو حصہ فلوس میں بالاتفاق اعطاء کے لفظ کے تکرار کی وجہ سے عقد صحیح ہوا۔ یاد رہے کہ حبہ ۱۲۰ ملی گرام ہوتا ہے۔

قال في الهدایة: ومن أعطی صیرفیاً درهماً وقال أعطني بنصفه فلوساً وبنصفه نصفاً إلا حبة جاز البیع في الفلوس وبطل فیما بقي عندهما وعلی قیاس قول أبي حنیفةؒ بطل في الکل ولو کرر لفظ الإعطاء بأن قال: أعطني بنصفه کذا فلساً وأعطني بنصفه الباقي نصفاً إلا حبة فالحکم أن العقد في حصة الفلوس جائز بالإجماع هو الصحیح. (الهدایة مع الحاشیة: ٣/ ١١٠، ١١١).

حدیث شریف کا جواب:

اس حدیث شریف کے تین جوابات ہیں۔ پہلا جواب یہ کہ یہ ممانعت عرف پر مبنی تھی جب عرف بدل گیا تو حکم بھی بدل گیا۔ دوسرا جواب یہ کہ یہ عام مخصوص البعض ہے اور تیسرا یہ کہ یہاں دو عقد کیے جاتے ہیں، ان جوابات میں سے پہلے دو جواب محتاج تشریح ہیں:۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نصوص تین قسم پر ہیں: (۱) **پہلی قسم**: وہ احادیث ہیں جو عرف پر مبنی ہوں ان کا حکم یہ ہے کہ عرف کے بدلنے سے نص کا حکم بدل جاتا ہے، مثلاً: حنطہ اور شعیر کا کیلی ہونا معروف تھا اور کچھ زمانہ پہلے تک یہ عرف تھا اب عرف بدل گیا اور دونوں وزنی بن گئے، لہذا اب وہ وزنی کہلائیں گے۔

اس کی مزید وضاحت علامہ شامیؒ اور شیخ مصطفیٰ الزرقا نے فرمائی ہے عبارات ملاحظہ فرمائیں:

وعن الثاني اعتبار العرف مطلقاً ورجحه الكمال وخرج عليه سعدي أفندي استقراض الدراهم عدداً وبيع الدقيق وزناً في زماننا يعني بمثله وفي الكافي الفتوىٰ على عادة الناس بحر، وأقره المصنف.(قوله مطلقاً) أى وإن كان خلاف النص ، لأن النص على ذلك الكيل في الشيء أوالوزن فيه ماكان في ذلك الوقت إلا لأن العادة إذ ذاك كذلك وقد تبدلت فتبدل الحكم...(قوله ورجحه الكمال)حيث قال عقب ماذكرنا: ولايخفى أن هذا لايلزم أبا يوسفؒ لأن قصاراه أنه كنصه على ذلك وهو يقول: يصار إلى العرف الطارئى بعد النص بناء أن تغير العادة يستلزم تغير النص ، حتى لوكان صلى الله عليه وسلم حياً نص عليه وتمامه فيه،...وملخصه :أن النص معلول بالعرف فيكون المعتبر هو العرف في أى زمن كان ولايخفى أن هذا فيه تقوية لقول أبي يوسفؒ فافهم. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۵/۱۷۶،مطلب فی ان النص اقوی من العرف،سعید۔وفتح القدیر:۷/۱۵،دارالفکر).

وقال مصطفىٰ أحمد الزرقا: خلافاً لأبي يوسفؒ الذي يعتبر المقياس المتعارف فيهما مطلقاً في كل زمن بحسبه ، ويتبدل مقياس التساوي بتغير العرف تبعاً له حيث يعلل النص بالعرف الذي كان قائماً وقت وروده، فلا يكون اتباع العرف عند أبي يوسفؒ مخالفاً للنص، بل يراه هو الموافق للنص، وأن الثبات على المقياس القديم الذي ورد في النص هو المخالف للنص ، فهو يعتبر هذاالنص نصاً عرفياً ، بمعنى أنه ذكرفيه المقياس الذي عينه النص،لأنه كان هو المتعارف حين وروده النص، ولوكان المتعارف مقياساً آخر لورد النص بذلك الآخر، لأن مقاييس الكميات تتبع الأعراف، ولتنظررسالة" نشر العرف فيما بنى من الأحكام على العرف" لابن عابدينؒ. وقد أوضحت هذه المسألة في كتابى المدخل الفقهي العام . (حاشية شرح القواعدالفقهية،ص۲۲۱،تحت القاعدة:" العادة محكمة ").

دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں فرمایا کہ اس کومت

چھیڑو اس کو چھوڑ دو اس کے پاس اپنا مشکیزہ اور جوتا ہے یعنی لقطہ نہ بناؤ۔لیکن امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حدیث اس زمانہ کے عرف پر مبنی ہے بعد والے زمانہ میں عرف بدل گیا اور لوگ اونٹوں کو کھلا نہیں چھوڑتے تھے اس لیے کھلے ہوئے اونٹ کو آدمی حفاظت کے پیش نظر پکڑ سکتا ہے تا کہ مالک تک پہونچائے ،احادیث میں کتاب اللقطہ میں یہ تفصیل کسی طالبِ علم پر مخفی نہیں ہے۔

اس کی تیسری مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی چرواہے کی بھیڑ بکریوں کے پاس پہونچا اور اس کو دودھ کی ضرورت تھی اور چرواہا موجود نہیں تھا تو تین مرتبہ آواز لگادے اگر چرواہے نے جواب نہیں دیا تو حسبِ ضرورت دودھ نکال کر پی لے یا کسی باغ میں پہونچا اور مالک کو نہیں پایا تو تین مرتبہ اعلان کرلے اگر مالک نے جواب نہیں دیا تو پھل توڑ کر کھالے ہاں جھولی میں بھر کر نہ لیجائے۔شارحین حدیث نے اس حدیث کے دیگر جوابات کے علاوہ ایک جواب یہ بھی دیا ہے کہ یہ حدیث اُس زمانہ کے عرف وعادت کی غمازی کرتی ہے،اُس زمانہ میں آنے والا مہمان یہ چیزیں بقدرِ ضرورت لے سکتا تھا۔جیسا کہ علامہ عینیؒ نے فرمایا: **والثالث: أن ذلک محمول علی ما إذا علم طیب نفوس أرباب الأموال بالعادة أو بغیرها.** (عمدة القاری:۹/۱۷٤،دارالحدیث ملتان). مفتی تقی صاحب نے بھی اسی طرح لکھا ہے،ملاحظہ ہو: **أن هذه المسائل تدور علی العرف والعادة وکانت عادة أهل الحجاز والشام المسامحة في مثل هذا ، بخلاف البلاد الأخری.** (تکملة فتح الملهم:۲/٦۲۷). بعد میں عرف بدل گیا اور اب مہمان ان چیزوں کو بغیر اجازت کے نہیں لے سکتا۔

قال العلامة العینیؒ : وقال جمهور العلماء وفقهاء الأمصار، ومنهم الأئمة أبوحنیفةؒ ومالکؒ والشافعيؒ وأصحابهم : لا یجوز لأحد أن یأکل من بستان أحد ولایشرب من لبن غنمه إلا بإذن صاحبه. (عمدة القاری:۹/۱۷٤،دارالحدیث ملتان).

(۲) دوسری قسم: وہ نصوص واحادیث ہیں جن میں کسی چیز کی ممانعت اس چیز کی ذاتی قباحت کی وجہ سے ہو وہ چیز ہر حال میں ممنوع رہے گی جیسے ربا،قمار،غرر اور دھوکا والے عقود اس قبیل سے ہیں۔

(۳) تیسری قسم: وہ احادیث ہیں جن میں کسی چیز کی ممانعت نزاع اور جھگڑے پیدا ہونے کی وجہ سے ہو پھر اگر جھگڑا پیدا نہ ہوتا ہو تو ممانعت نہیں رہے گی ، بلکہ اس کی گنجائش ہوگی۔جس کی ایک مثال بخاری

شریف جلد اول ص ۲۹۲ پر ہے کہ لوگ پکنے سے پہلے پھلوں کو فروخت کرتے تھے پھر کبھی پھلوں کو مختلف قسم کی بیماریاں لگ جاتی تھیں اور مشتری ثمن کے دینے میں لیت ولعل کرتا تھا اور بائع پوری قیمت مانگتا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس قسم کے نزاعات آنے لگے تو فرمایا میرا مشورہ یہ ہے کہ پکنے سے پہلے مت بیچو، معلوم ہوا کہ بیع ثمر بعرف الابقاء کی ممانعت جھگڑے پیدا ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بطورِ مشورہ فرمایا تھا یہ قطعی ممانعت نہیں تھی۔ صحیح بخاری میں ایک روایت یوں مذکور ہے:

واشترى نافع بن الحارث داراً للسجن بمكة من صفوان بن أمية على إن عمر رضي الله عنه رضي بالبيع فالبيع بيعه وإن لم يرض عمر رضي الله عنه فلصفوان أربع مائة دينار. (رواه البخاري: ۱/ ۳۲۷).

یعنی رافع بن الحارث نے مکہ مکرمہ میں ایک مکان جیل بنانے کے لیے صفوان بن امیہ سے خرید البشرطیکہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ راضی ہوں تو بیع وشراان کے لیے اور اگر راضی نہ ہوں تو میرے لیے ہے۔ یہ بیع بشرط ہے اور صفقۃ فی صفقۃ ہے شارحین نے اس کے متعدد جوابات دئے ہیں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ فیض الباری میں فرماتے ہیں:

وقد علمت أن الفساد إذا كان لأجل مخافة النزاع لايسرى إلى العقد إذا لم يرفع أمره إلى القضاء أما إذا كان لكونه معصية فيلزم حينئذٍ والمذكور فى الحديث من النحو الأول. (فيض البارى: ۳/ ۲۲۳).

اس کی تعلیق میں مولانا بدرِ عالم صاحبؒ فرماتے ہیں:

وفى جامع الفصولين: من اشترى حزمة من الحطب له أن يشترط حمله إلى البيت وفى الهداية: أن ما تعارف الناس عليه من الشرائط تتحمل فى البيوع. قلت: لأنه لا تفضي إلى النزاع. (۳/ ۲۲۳).

امام ترمذیؒ نے صفقۃ فی صفقۃ کی تین تفسیریں فرمائی ہیں جن میں سے نمبر ۳ کو میں چھوڑتا ہوں کیونکہ وہ خالص سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے صراحۃً باطل اور حرام ہے۔

پہلی تفسیر یہ ہے کہ زید کہدے کہ یہ چیز نقد پر سو درہم میں اور دو ماہ کے ادھار پر دوسو درہم میں ہے، اور عمر

نے کہا میں نے قبول کیا اور ایک جانب کو متعین نہیں کیا اب یہ معاملہ قابل نزاع ہے مثلاً مشتری کہے گا میں ۲ ماہ کے بعد دوسو دوں گا، بائع کہتا ہے کہ مجھے فی الحال ۱۰۰ درہم چاہئے۔

دوسری تفسیر جو امام شافعیؒ سے مروی ہے اور شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی میں فرمایا: **نقل صاحب المشکاة عن الخطابیؒ تفسیر بیعتین في بیع مثل ما ذکر الترمذیؒ عن الشافعیؒ وھو المختار وھو تفسیر أبي حنیفةؒ فی کتاب الآثار انتھی، ذکرہ فی باب النھی عن بیعتین۔**(العرف الشذی علی ھامش الترمذی: ۱/ ۲۳٤) اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ زید کہدے کہ اے عمر میں آپ کو اپنا فلاں مکان ایک لاکھ رینڈ میں فروخت کرتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے اپنا خاص گھوڑا ۱۰ ۵ ہزار میں بیچدے، عمر نے قبول کیا، اتفاق سے عمر کا گھوڑا مر گیا اب زید کہتا ہے کہ میں اپنا مکان نہیں دوں گا یا ایک لاکھ بیس ہزار میں دوں گا کیونکہ مجھے میرا مرغوب گھوڑا نہیں ملا، ظاہر بات ہے کہ یہ جھگڑا اور نزاع ہے لیکن جن صورتوں میں عرفاً نزاع پیدا نہیں ہوتا یا مذکورہ صورتوں میں نزاع نہ ہو وہاں گنجائش ہوگی۔

اصول اور فقہ کی کتابوں میں: ’’**أعتق عبدک عني بألف درھم**‘‘ وارد ہے اس میں مخاطب سے ایک ہزار میں عبد کی خرید اور پھر وکالت بالاعتاق کا ذکر ہے لیکن چونکہ اس میں کوئی نزاع نہیں اس لیے جائز ہے۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے سائل کے جواب میں جن بعض معاملات کو جائز فرمایا ان میں عرف میں کوئی نزاع واقع نہیں ہوتا اس لیے جائز فرمایا۔ سائل نے لکھا ہے گھڑی کی مرمت کہ ٹوٹے ہوئے پرزے کو نکال کر صحیح پرزہ لگادے اس میں پرزہ کی بیع اور لگانے کی اجرت ہے۔(۲) چارپائی بنوانا اور بان اپنی طرف سے نہ دینا اس میں بان کی بیع ہے اور بننے کا اجارہ۔(۳) سقہ سے پانی لینا کہ جب اس نے کنویں سے پانی نکال کر اپنے ظروف میں لیا تو اس کی ملک ہوگیا سو پانی کی بیع اور وہاں سے لانے کی اجرت، نیز **بیع مالیس عندہ** بھی ہے۔(۴) کوئی زیور یا انگوٹھی جڑنے کو دینا کہ نگینوں کی بیع ہے اور لگانے کا جارہ وغیر ذلک من المعاملات الرائجۃ۔ حضرت تھانویؒ نے تعامل کی وجہ سے ان صورتوں کو جائز فرمایا۔(امداد الفتاویٰ:۳/ ۶۴، ۶۵)۔

اگر اس پر کوئی اشکال کرے کہ جب قانون یہ ہے کہ صفقۃ فی صفقۃ ممنوع ہے تو اس میں سے بعض افراد کا نکالنا عرف کی وجہ سے اس طرح ہے جیسے سود کی حرمت کے قانون سے بینک کے سود کو لوگوں کے تعامل کی وجہ سے

نکال دے تو یہ کہاں درست ہے؟ ہاں تعامل کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ سکتے ہیں مثلاً قفیز الطحان کے تمام افراد ناجائز ہوں لیکن ان پر کمیشن ایجنٹ کی اجرت کو قیاساً ناجائز نہ کہیں بلکہ تعامل کی وجہ سے اس کو جائز کہدیں تو صحیح ہے۔

تو جواب میں یہی کہا جائے گا صفقۃ فی صفقۃ کی حدیث میں ممانعت نزاع پر مبنی ہے اور تعامل اور عرف کی وجہ سے جن صورتوں میں جھگڑا نہ ہو وہ نہی سے مستثنیٰ ہوں گی، اور آج کل تو بہت زیادہ ایسے معاملات مروج ہیں جن میں بیع فی بیع یا بیع میں شرط معروف ہوتی ہے جیسے کسی مشین کو خریدنے پر ایک سال مفت سروس یا رنگریز کو خواتین کپڑا دیتی ہیں اور خاص قیمت طے ہوتی ہے جس میں رنگ کی بیع اور لگانے کی اجرت یعنی اجارہ ہوتا ہے یا مختلف مشینیں اور گاڑی میکینک کو دی جاتی ہیں وہ درست پرزے بھی لگاتا ہے اور لگانے کی اجرت بھی لیتا ہے، اگر کسی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور میکینک کے پاس گاڑی رکھدے اور وہ کہدے کہ اس میں فلاں فلاں نئے پرزے لگانے پڑیں گے اور گاڑی کی مرمت ہوگی تو کیا یہ بیع واجارہ کا مجموعہ نہیں ہے؟ بالکل ہے لیکن عرف میں چلتا رہتا ہے بلکہ یہ روزمرہ کے معمول کی طرح ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو شرط معروف بن جائے یا صفقۃ فی صفقۃ باعثِ نزاع نہ ہو وہ قابل برداشت ہے۔ چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ثم اعلم أن العرف قسمان عام وخاص فالعام يثبت به الحكم العام ويصلح مخصصاً للقياس والأثر بخلاف الخاص... قال في الذخيرة في الفصل الثامن من الإجارات في مسألة ما لو دفع إلى حائك غزلاً لينسجه بالثلث ومشايخ بلخ كنصيربن يحيى ومحمدبن سلمة وغيرهما كانوا يجيزون هذه الإجارة في الثياب لتعامل أهل بلدهم في الثياب والتعامل حجة يترك به القياس ويخص به الأثر وتجويزهذه الإجارة في الثياب للتعامل بمعنى تخصيص النص الذي ورد في قفيز الطحان لأن النص ورد في قفيز الطحان لا في الحائك إلا أن الحائك نظيره فيكون وارداً فيه دلالة فمتى تركنا العمل بدلالة هذاالنص في الحائك وعملنا بالنص في قفيز الطحان كان تخصيصاً لا تركاً أصلاً وتخصيص النص بالتعامل جائز ألاترى أنا جوزنا الاستصناع للتعامل والاستصناع بيع ماليس عنده وإنه منهي عنه وتجويز الاستصناع بالتعامل تخصيص منا للنص الذي ورد في النهي عن بيع ماليس عند الإنسان

لاترک للنص أصلاً لأنا عملنا بالنص في غير الاستصناع . (شرح عقود رسم المفتی،ص ۴۱۔و کذافی رسالة " نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف" المندرجة فی رسائل ابن عابدینؒ ۲/۱۱۴،سهیل).

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں:

...والاستصناع فيما فيه تعامل الناس مثل أن يأمر إنساناً بأن يخرز له خفاً بكذا ويبين صفته ومقداره ولم يذكر له أجلاً والقياس يقتضي أن لايجوز لأنه بيع معدوم لكنهم استحسنوا تركه بالإجماع لتعامل الناس فيه ... (منار مع شرحه لعبد اللطیف ابن الملك،۲/۸۱۲).

صفقۃ فی صفقۃ کی دیگر مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے: فقہاء لکھتے ہیں کہ عقدِ استصناع میں ثمن کی تعجیل ضروری نہیں بعد میں بھی دے سکتے ہیں اس پر اشکال ہے کہ پھر تو بیع الدین بالدین بن گئی، کیونکہ مصنوع بھی مافی الذمہ ہے اور ثمن بھی مؤجل بنا تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس میں عقد اجارہ اور بیع دونوں کی مشابہت ہے تو بیع کی مشابہت کی وجہ سے ثمن مؤجل ہوسکتا ہے اور اجارہ کی مشابہت کی وجہ سے گویا صانع اجرت پر کام کر رہا ہے اور اجرت بعد میں ملے گی، جیسے دیوار بنانے والے کو اجرت بعد میں مل جائے گویا اس میں بیع اور اجارہ دونوں جمع ہیں۔ **و ينعقد الاستصناع إجارة ابتداء وبيعاً انتهاء .** (الكفاية علی الهداية:۶/۲۴۳، باب السلم، مكتبه رشيديه). واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کے توسط سے مکان خریدنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی بینک کے ذریعہ مکان خریدتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ بینک سے سودی قرضہ لے کر مکان خرید لے، دوسری صورت یہ ہے کہ بینک مکان ۵ لاکھ میں خرید کر ضرورت مند آدمی کو ۶ لاکھ مؤجل میں فروخت کردے، دونوں صورتوں میں سے کونسی صورت اختیار کرنا چاہئے؟

الجواب: دوسری صورت اختیار کرلے، اس لیے کہ بینک سے سودی قرضہ لینا عام حالات میں جائز نہیں ہے، جب کہ دوسری صورت مرابحہ کی ہے اور مرابحہ میں یہ جائز ہے، بشرطیکہ عقد میں یہ بیان ہو جائے کہ ہر قسط میں اتنی رقم مزید لی جائے گی۔ ملاحظہ ہو ایضاح المسائل میں ہے:

بینک کے توسط سے گاڑی وغیرہ خریدنے کے لیے جواز کی بہترین اور آسان شکل یہ ہے کہ خریدار کے ساتھ بینک اپنے کسی آدمی کو بھیجدے، اور وہی کمپنی سے مثلاً ایک لاکھ میں سودا طے کرلے، تو اب ایک لاکھ کی

گاڑی بینک کی ہوگئی، اور پھر وہیں پر بینک کا بھیجا ہوا آدمی بینک کے ضابطہ کے مطابق ایک لاکھ دس ہزار میں خریدار کے حوالہ کردے، اور بعد میں بینک قسطوار خریدار سے ایک لاکھ دس ہزار وصول کرتا رہیگا، تو شرعی طور پر ایسی شکل جائز ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری:۲/۱۶۰)۔

ایک شکل یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ بینک اپنا آدمی نہ بھیجے بلکہ خریدار کو اپنا وکیل بنا کر بھیجے، اور خریدار ایک لاکھ روپے میں خرید کر بینک کے حوالہ کردے، اس کے بعد پھر بینک اسی وقت ایک لاکھ دس ہزار میں خریدار کے ہاتھ فروخت کردے، اور یہ شخص بینک کے طے شدہ ضابطہ کے مطابق مقرر کردہ مدت کے اندر اندر ایک لاکھ دس ہزار قسطوار ادا کرتا رہے، تو شرعی طور پر ایسا معاملہ جائز اور درست ہے۔ (مستفاد از امداد الفتاویٰ:۳/۱۲۵)۔ (ایضاح المسائل، ص ۱۵۸، بینک کے قرضہ سے گاڑی خریدنا، اضافہ شدہ)۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

علله الحانوتي بالتباعد عن شبهة الربا لأنها في باب الربا ملحقة بالحقيقة، ووجهه أن الربح في مقابلة الأجل، لأن الأجل وإن لم يكن مالاً، ولايقابله شيء من الثمن، لكن اعتبروه مالاً فى المرابحة إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن، فلو أخذ كل الثمن قبل الحلول كان أخذه بلا عوض. (فتاوى الشامي:٦/٧٥٧،قبيل كتاب الفرائض،سعيد۔وكذا ٥/١٤٢، باب المرابحة، سعيد)۔

البحر الرائق میں ہے:

وجوابه أن الأجل في نفسه ليس بمال فلا يقابله شيء حقيقة إذا لم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصداً ويزاد فى الثمن لأجله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصداً فاعتبر مالاً فى المرابحة احترازاً عن شبهة الخيانة. (البحرالرائق:٦/١١٥،باب المرابحة، كوئته)۔

مزید ملاحظہ ہو: (غیر سودی بینکاری:۸۷۔ وکفایت المفتی:۸/۵۴۔ واسلام اور جدید معاشی مسائل:۵/۹۰،۳/۱۱۸)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

فصل دوم

اسلامی بینک کا طریقہ کار

بینک کی تعریف

’’بینک‘‘ ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعت کاروں اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے، آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں، اور اپنے امانت داروں کو کم شرح پر سود دیتے ہیں، اور سود کا درمیانی فرق بینکوں کا نفع ہوتا ہے۔

بینک لوگوں کو اپنی امانتیں جمع کرانے کی دعوت دیتا ہے، (جو فقہی طور پر قرض ہی ہوتا ہے) ان کو اردو میں ’’امانتیں‘‘ عربی میں ’’ودائع‘‘ اور انگریزی میں ’’Deposits‘‘ ڈپازٹ کہتے ہیں، ڈپازٹ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱)’’Current Account‘‘ (کرنٹ اکاؤنٹ) اس کو عربی میں ’’الحساب الجاری‘‘ اور اردو میں ’’مدرواں‘‘ کہتے ہیں، اس میں رکھی ہوئی رقم پر سود نہیں ملتا ہے، اس اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم کسی وقت بھی، جتنی مقدار میں چاہیں بغیر کسی پابندی کے نکلوائی جاسکتی ہے۔

(۲)’’Saving Account‘‘ (سیونگ اکاؤنٹ) جس کو عربی میں ’’حساب التوفیر‘‘ اور اردو میں ’’بچت کھاتہ‘‘ کہتے ہیں، اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں، اس پر بینک سود دیتا ہے۔

(۳)’’Fixed Deposit‘‘ فکس ڈپازٹ جس کو عربی میں ’’ودائع ثابتۃ‘‘ کہتے ہیں، اس میں مقررہ مدت سے پہلے رقم واپس نہیں لی جاسکتی، اس میں بھی بینک سود دیتا ہے، اور سود کی شرح مدت کے مطابق ہوتی ہے، طویل مدت میں شرح زیادہ ہوتی ہے، اور کم مدت پر شرح کم ہوتی ہے۔

بینک کے وظائف:۔

بینک سرمایہ جمع کرنے کے بعد کئی وظائف ادا کرتا ہے، مثلاً تمویل، تخلیق زر، برآمد، درآمد میں واسطہ بننا وغیرہ، جن کی تفصیلات، اسلام اور جدید معیشت وتجارت وغیرہ کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسلامی بینک کا طریقۂ کار:

بینک کی سرگرمیوں کو عام طور پر دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(ا) ذمہ داری والا حصہ:۔

اس حصہ میں سودی بینک اپنے ڈیپازیٹر سے رقوم وصول کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے مختلف طرح کے اکاؤنٹ متعارف کرواتا ہے۔ بنیادی طور پر دو طرح کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں:۔

(الف) غیر نفع بخش اکاؤنٹ، اسے کرنٹ اکاؤنٹ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(ب) نفع بخش اکاؤنٹ، اس میں سیونگ اکاؤنٹ، فکس ڈیپازٹ وغیرہ شامل ہیں۔

(الف) غیر نفع بخش یعنی کرنٹ اکاؤنٹ کا تعارف:

کرنٹ اکاؤنٹ کے طور پر جو رقم اسلامی بینک وصول کرتا ہے، شرعی طور پر وہ بلا سود قرض ہوتا ہے، کیونکہ اکاؤنٹ ہولڈر کو اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ اس کی رقم ضرور واپس ہوگی، اور ہر مضمون رقم قرض کہلاتی ہے، اور اس پر کوئی اضافی رقم بھی نہیں ملتی، فقط اصل رقم واپس ہوتی ہے، لہذا یہ بلا سود قرض کے مترادف ہے۔

(ب) نفع بخش اکاؤنٹ کا تعارف:

کرنٹ اکاؤنٹ کے علاوہ دوسرے اکاؤنٹس مثلاً سیونگ اکاؤنٹ اور فکس ڈیپازٹ وغیرہ کے لیے اسلامی بینک جو رقم وصول کرتا ہے، وہ مضاربہ یا مشارکہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ جس میں ڈیپازیٹر کی حیثیت رب المال ''سرمایہ فراہم کرنے والے افراد'' یا خوابیدہ شریک کی ہوتی ہے، اور اسلامی بینک کی حیثیت مضارب یا عملی شریک کی ہوتی ہے۔

اسلامی بینک اپنے تمویلی طریقوں مثلاً مرابحہ، اجارہ اور مشارکہ وغیرہ کے ذریعہ جو نفع کماتا ہے اس کا متناسب حصہ اپنے ڈیپازیٹر کو دیتا ہے جو پہلے سے طے ہوتا ہے، مثلاً یہ طے ہوتا ہے کہ بینک جو بھی نفع حاصل کرے گا اس کا پچاس فیصد بینک کو اور پچاس فیصد ڈیپازیٹر کو ملے گا۔ اور شرعی اعتبار سے ڈیپازیٹر کی رقم بینک کے پاس بطورِ امانت ہوتی ہے، یعنی اگر بینک کی کسی تعدی اور کوتاہی یا غفلت کے بغیر وہ رقم ہلاک ہوجائے تو بینک اس کا ذمہ دار نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی بینک اپنے ڈیپازیٹر سے سرمایہ لیتے وقت اسے ہر حال میں واپسی کی گارنٹی نہیں دے سکتا، اور نہ ہی شروع میں حتمی طور پر نفع ملنے کی مقدار بتا سکتا ہے۔ بلکہ ڈیپازیٹر سرمایہ کے تناسب سے نسبت متعین کر کے حتمی طور پر بتلانا جائز بھی نہیں ہے۔ اس سے شرکت فاسد ہو جاتی ہے۔ اور اسلامی بینک کو عام طور پر یہ معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس سرمایہ پر کتنا نفع کمائیگا۔

ہاں اپنے کسی ٹرم کے اختتام پر ڈیپازیٹر کو حاصل ہونے والے نفع میں متناسب حصہ دے تو اس حاصل ہونے والے نفع کی اصل رقم سے نسبت معلوم کر کے بیان کرنا شرعاً ناجائز نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی بینک نفع تقسیم کرنے کے بعد اگر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے اس سال اپنے ڈیپازیٹر کو دس فیصد نفع دیا تو یہ طریقہ شرعی اصول سے متصادم نہیں۔ لیکن اگر شروع میں یہ کہدے کہ ہم سرمایہ کا اتنا فیصد نفع دیں گے تو یہ شرعاً ناجائز ہے۔

(۲) دوسرا حصہ، اثاثہ جاتی حصہ ہے:۔

اس حصہ میں بینک اپنے تمویل کار کو مختلف تمویلی سہولیات فراہم کرتا ہے۔

یعنی بینک ان لوگوں کو تمویلی سہولیات فراہم کرتا ہے جو اپنی مختلف مالی ضروریات کے لیے بینک سے رابطہ کرتے ہیں:۔

اسلامی بینک میں کلائنٹ (بینک سے لون لینے والے) کی مختلف ضروریات کے پیش نظر مختلف معاملات انجام دئے جاتے ہیں۔

آج کل عام طور پر تین طرح کے معاملات زیادہ رواج پذیر ہیں:۔

(۱) مرابحہ۔ (۲) اجارہ۔ (۳) مشارکہ متناقصہ۔ ان کے علاوہ بعض اوقات سلم اور استصناع کے ذریعے بھی تمویلی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔

(۱) مرابحہ:۔

مرابحہ دراصل بیع کی ایک قسم ہے جس میں سامان والا شخص خریدار کو یہ بتلاتا ہے کہ یہ سامان مجھے کتنے میں پڑا اور میں اس پر کتنا منافع رکھ کر آپ کو فروخت کر رہا ہوں۔

اسلامی بینکوں میں انجام پانے والا مرابحہ درج ذیل مراحل پر مشتمل ہوتا ہے:

(الف) جامع معاہدہ:۔ پہلے مرحلے میں کلائنٹ اور بینک آپس میں ایک جامع معاہدہ کرتے

ہیں، اسے جنرل ایگریمنٹ کہا جاتا ہے، اس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ کلائنٹ کتنی رقم تک سامان بینک سے خریدیگا، بینک خریدے گئے سامان پر کتنا نفع لیگا، ادائیگی کا طریقۂ کار کیا ہوگا وغیرہ۔

(ب) مطلوبہ سامان کی خریداری: اس کے بعد بینک وہ سامان مارکیٹ سے خریدتا ہے، جسے بعد میں کلائنٹ کو فروخت کرنا ہوتا ہے، عام طور پر اس مقصد کے لیے کلائنٹ کو مطلوبہ سامان کی خریداری کا وکیل بنایا جاتا ہے، لیکن ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔

(ج) خریدے گئے سامان پر قبضہ اور بینک کو اطلاع: اگر خریداری کے لیے کلائنٹ کو وکیل بنایا جائے تو وہ مطلوبہ سامان کی خریداری کے بعد اس پر قبضہ کرتا ہے اور بینک کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ میں نے آپ کے وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ سامان خرید کر اس پر قبضہ کرلیا ہے، چونکہ شرعاً وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے، اس لیے یہ سمجھا جائیگا کہ شرعاً یہ مؤکل یعنی بینک کے قبضہ میں ہے، چنانچہ اس مرحلے پر قبضہ کے سارے احکام جاری ہوتے ہیں، خصوصاً یہ حکم کہ اگر کلائنٹ کی کسی تعدی کے بغیر سامان ہلاک ہوگیا تو یہ نقصان بینک کا ہوگا، کلائنٹ کا نہ ہوگا۔

(د) مرابحہ کا انعقاد: اس کے بعد کلائنٹ بینک کو یہ پیشکش کرتا ہے کہ وہ یہ سامان اسے متعینہ قیمت پر جس میں لاگت اور بینک کا نفع شامل ہو فروخت کردے اور وہ اس کی قیمت کی ادائیگی فوراً یا مخصوص مدت کے بعد کریگا، جب بینک اسے قبول کرلیتا ہے تو مرابحہ وجود میں آجاتا ہے اور کلائنٹ پر اس کی قیمت کی ادائیگی واجب ہوجاتی ہے۔ بینک اس واجب الاداء قیمت کے بدلے کلائنٹ سے کچھ ضمانتیں لیتا ہے۔

(۲) اجارہ:۔

شرعی اصطلاح میں اجارہ کسی چیز یا شخص کی متعین اور جائز منفعت کو متعین اجرت کے بدلے دینے کا نام ہے۔

سودی اور اسلامی بینک کے اجارہ میں فرق:۔

اجارہ کا معاملہ سودی اور اسلامی دونوں بینکوں میں ہوتا ہے، اس لیے یہاں دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق بیان کیے جاتے ہیں۔

اس وقت کنوینشنل بینکوں میں اجارہ کا جو طریقۂ کار رائج ہے، اس میں درجِ ذیل تین خرابیاں پائی جاتی ہیں:

(الف) ایک ہی عقد کے اندر بیع اور اجارہ کے دو معاملے ہوتے ہیں، یعنی جو اقساط کلائنٹ مدت اجارہ

کے دوران ادا کرتا ہے، انہیں ابتداء میں تو اجارہ کی اقساط شمار کیا تا ہے، لیکن جونہی کرایہ داری کی مدت پوری ہوتی ہے تو یہ اقساط قیمت سمجھی جاتی ہیں اور مطلوبہ چیز خود بخود کلائنٹ کی ملکیت میں آجاتی ہے، اسے فقہی اصطلاح میں صفقتان فی صفقۃ'' کہتے ہیں جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

(ب) اجارہ پر دی گئی چیز سے متعلق تمام ذمہ داریاں مستاجر کے ذمہ ہوتی ہیں، حالانکہ شرعاً صرف استعمال سے متعلق ذمہ داریاں مستاجر پر ڈالی جاسکتی ہیں، جیسے گاڑی کی سروس کرانا، آئل تبدیل کرانا وغیرہ جب کہ وہ ذمہ داریاں جن کا تعلق اس چیز کے مالک ہونے سے ہے، وہ مؤجر کے ذمہ ہوتی ہیں، جیسے ٹیکس ادا کرنا، کسی ناگہانی آفت کی وجہ سے وہ تباہ ہوجائے تو اس کی مرمت کرانا وغیرہ۔

(ج) اجارہ پر دی گئی چیز کلائنٹ کے حوالے کرنے سے پہلے ہی اس کا کرایہ لگنا شروع ہوجاتا ہے حالانکہ شرعاً مستاجر سے اس وقت تک کرایہ لینا جائز نہیں جب تک مطلوبہ چیز اس کے حوالہ نہ کردی جائے۔

اس کے برعکس اسلامی بینکوں کے اجارہ میں مذکورہ بالا شرعی خرابیوں کو درجِ ذیل طریقہ پر دور کیا جاتا ہے؛

(الف) ابتداء میں صرف اجارہ کا معاملہ ہوتا ہے، اور اجارہ پر دی گئی چیز بینک ہی کی ملکیت میں رہتی ہے، پھر اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد کلائنٹ کو اختیار ہے کہ اسے متعین قیمت پر خرید لے یا بینک کو واپس کردے، اول الذکر شکل میں بینک مستقل عقد کے ذریعہ وہ چیز کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے، اور بعض مرتبہ ایک مستقل عقد کے ذریعہ بینک وہ چیز کلائنٹ کو ہبہ کردیتا ہے۔ اس سے صفقتان فی صفقۃ والی خرابی لازم نہیں آتی۔

(ب) اسلامی بینکوں کے اجارہ کے معاملات میں یہ بات صراحتاً مذکور ہوتی ہے کہ مستاجر صرف وہ ذمہ داریاں برداشت کریگا جو گاڑی کے استعمال سے متعلق ہیں، اسے ''صیانہ عادیہ'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ گاڑی کے مالک ہونے کی حیثیت سے تمام ذمہ داریاں بینک برداشت کرتا ہے، چنانچہ اس کے ٹیکس ،انشورنس، تکافل اور حادثہ کی صورت میں اگر گاڑی کو کوئی نقصان پہنچے تو اس کا ازالہ بینک کے ذمہ ہوتا ہے۔

(ج) اسلامی بینک جب تک کرایہ داری کا معاملہ کر کے مطلوبہ چیز کلائنٹ کے حوالے نہیں کردیتا، اس وقت تک کرایہ وصول نہیں کرتا۔

(۳) مشارکہ متناقصہ:۔

موجودہ اسلامی بینکوں میں رائج تیسرا بڑا تمویلی طریقہ ''مشارکہ متناقصہ'' کا ہے، جس کے ذریعے عام طور پر مکانات کے لیے تمویل کی جاتی ہے، اس لیے اسے عام طور پر ''ہوم مشارکہ'' بھی کہا جاتا ہے، یہ طریقہ کار

بنیادی طور پر تین مراحل پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) پہلے مرحلے میں اسلامی بینک اور اس کا کلائنٹ مشترکہ طور پر ایک مکان خریدتے ہیں جس میں عام طور پر بینک کا حصہ کلائنٹ کے حصے سے زیادہ ہوتا ہے، مثلاً ایک مکان مشترکہ طور پر اس طرح خریدا گیا کہ اس میں اسی فیصد حصہ بینک کا ہے اور بیس فیصد کلائنٹ کا ہے۔

(۲) بینک کے حصے کو چھوٹے چھوٹے یونٹس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے، مثلاً مذکورہ مثال میں بینک کے مملوکہ حصے کے اسی یونٹس بنائے گئے، کلائنٹ بینک کے مملوکہ یونٹس ایک ایک کرکے خریدتا رہتا ہے جس کے نتیجہ میں کلائنٹ کی ملکیت بڑھتی جاتی ہے جب کہ بینک کی ملکیت کم ہوجاتی ہے۔

(۳) جتنے یونٹس بینک کی ملکیت میں ہوتے ہیں، کلائنٹ کرایہ داری کے معاہدہ کے تحت انہیں اپنے تصرف میں رکھنے اور استعمال کرنے کی وجہ سے انکا کرایہ ادا کرتا رہتا ہے، چونکہ کلائنٹ مستقل طور پر یونٹ خریدرہا ہوتا ہے، اس لیے کرائے کی مقدار میں بھی کمی آتی رہتی ہے، آخرکار جب کلائنٹ بینک کے مملوکہ سارے یونٹس خریدلیتا ہے تو وہ سارے مکان کا مالک بن جاتا ہے۔

گویا اس طریقہ کار میں بنیادی طور پر تین کام ہوئے:

(۱) مشترکہ طور پر مکان کی خریداری۔

(۲) ایک شریک کا دوسرے شریک کے مملوکہ حصے کو کرایہ پر لینا۔

(۳) ایک شریک یعنی کلائنٹ کا دوسرے شریک یعنی بینک کے حصے کو خریدنا۔

اس عقد کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط نہ ہو، چنانچہ مذکورہ طریقہ کار میں کوئی معاملہ دوسرے کے ساتھ مشروط نہیں ہوتا بلکہ کلائنٹ اپنے طور پر یک طرفہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر بینک مطلوبہ مکان خریدلے تو وہ بینک کا حصہ اجارہ پر لے کر اس کا کرایہ ادا کریگا نیز وہ بینک کے حصے کے مختلف یونٹس کو مرحلہ وار خریدلیگا۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل، جلد پنجم، واسلامی بینکاری اور متفقہ فتوے کا تجزیہ، واسلام اور جدید معیشت وتجارت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، قال:
قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینة
وهم یسلفون بالثمر السنتین والثلاث،
فقال: "من أسلف في شيء ففی کیل معلوم
ووزن معلوم إلی أجل معلوم".

(رواہ البخاری).

باب......(۵)

بیع سلم اور استصناع کے احکام کا بیان

وعن أبي حسان، قال: قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما:
أشهد أن السلف المضمون إلی أجل مسمی
قد أحله اللہ تعالیٰ فی الکتاب وأذن فیه،
قال اللہ عز وجل:
﴿یا ایها الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل
مسمی فاکتبوه﴾ الآیة.

(اخرجه الحاکم).

باب ...... (۵)

بیع سلم اور استصناع کا بیان

آم میں بیع سلم کا حکم:

سوال: ایک صاحب کے ہاں دو ماہ بعد اس کے بیٹے کی شادی ہے اور پورے ملک سے قابل قدر مہمان اس میں شرکت کریں گے، چونکہ اس علاقے کے آم مشہور ہیں، اس لیے وہ آم کے کسی تاجر کے ساتھ بیع سلم کا معاملہ کرتا ہے کہ مجھے فلاں قسم کے آم ۱۰۰۰ کلو فلاں تاریخ کو اتنی قیمت میں چاہئے، لیکن اس وقت عام بازار میں آم دستیاب نہیں ہے تو کیا یہ بیع سلم جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بجائے بیع سلم کے اس سے خاص قیمت پر آم فراہم کرنے کا وعدہ لے لے، لیکن اگر سلم ہی کی ضرورت ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بیع سلم نہیں ہوگی، کیونکہ سلم میں اس چیز کا عقد کے وقت سے حوالہ کرنے تک کسی نہ کسی جگہ بازار میں موجود رہنا ضروری ہے، جب کہ آم اس وقت موجود ہی نہیں، ہاں ضرورت کے وقت امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ نے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ میں ہے:

عقدِ سلم میں بیع کا وقت میعاد تک برابر پایا جانا حنفیہ کے نزدیک شرط ہے، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو عقدِ سلم جائز نہ ہوگا، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وقت میعاد پر پایا جانا کافی ہے، کذا فی الهداية، (۹۳/۳) تو اگر

ضرورت میں اس قول پر عمل کرلیا جاوے تو کچھ ملامت نہیں رخصت ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۱۰۶).

دوسری جگہ مرقوم ہے: چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے، لہذا امام شافعیؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۲۱).

درس الہدایہ میں ہے:

موجودہ دور کی مشکلات کے پیش نظر فقہاء نے کہا کہ اگر ان مسائل میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے تو گنجائش ہے تاکہ لوگوں کے اموال کو حرمت سے بچایا جاسکے۔

فائدہ: دنیا میں ایک عبادات اور دوسرے معاملات کا نظام ہے، عبادات کے لیے نصوص ہونے چاہئیں اور معاملات میں ہر امام آسانی کرتا ہے۔ (درس الہدایہ، باب شروط السلم، ص ۳۲۹).

مزید ملاحظہ ہو: (مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص ۳۹۔۴۳). واللہ ﷻ اعلم۔

بیع سلم میں مدت کا حکم:

سوال: کیا بیع سلم میں ایک ماہ سے کم مدت مقرر ہوسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: اکثر فقہاء فرماتے ہیں کہ بیع سلم میں کم از کم ایک ماہ کی مدت ہونی چاہئے اس سے کم میں صحیح نہیں ہے، لیکن امام کرخیؒ نے فرمایا کہ جتنی مدت میں مسلم فیہ حاصل ہوسکتا ہے، اتنی مدت کافی ہے اگرچہ ایک ماہ سے کم ہو لہذا زمانے کی ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے امام کرخیؒ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز السلم إلا مؤجلا... ولا يجوز إلا بأجل معلوم لما روينا ولأن الجهالة فيه مفضية إلى المنازعة كما في البيع، والأجل أدناه شهر وقيل ثلاثة أيام وقيل أكثر من نصف اليوم والأول أصح. (الهداية: ۳/۹٤).

البنایہ میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

و في الذخيرة: عن الكرخيؒ أنه ينظر إلى مقدار المسلم فيه و إلى عرف الناس في التاجيل فيه فإن كان قدراً أجل أحد يؤجل مثله في العرف والعادة يجوز السلم، قوله والأول أصح، وقال الصدر الشهيد في طريقته المطولة والصحيح ما رواه الكرخيؒ أنه مقدار ما

يمكن فيه تحصيل المسلم فيه. (البناية فی شرح الهداية الجزء الثالث،ص۱۸۸).

البحر الرائق میں ہے:

وفى البناية وقال الصدر الشهيد...فقد اختلف التصحيح ...وفي فتح القدير بعد نقل تصحيح الشهيد وهو جدير أن لايصح ... أقول : هو جدير بأن يصحح ويعول عليه فقط. (البحرالرائق:٦/ ١٦٠،باب السلم،كوئته).

محیط برہانی میں ہے:

عن أبى الحسن الكرخيؒ أنه ينظر إلى مقدار المسلم فيه وإلى عرف الناس في تأجيل مثله، فإن شرط أجلاً يؤجل لمثله فى العرف والعادة تجوز السلم وما لا فلا. (المحيط البرهانى:٨/ ١٨٠،فصل فى السلم،مكتبة رشيدية).

حضرت تھانویؒ امداد الفتاویٰ میں رقمطراز ہیں:

بیع سلم میں کم سے کم مہلت ایک ماہ کی ہونی چاہئے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ اجل شرط نہیں، اس لیے یہ معاملہ سلم میں داخل ہوسکتا ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہذا امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ (امداد الفتاویٰ:۳/۲۱).

مالی معاملات پر غرر کے اثرات میں مولانا اعجاز احمد صاحب رقمطراز ہیں:

البتہ بعض معاصر علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ آج کل معاملات میں یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے... لہذا اگر دونوں فریق اپنی مرضی سے کوئی تاریخ مقرر کریں تو اسے ناجائز کہنے کی کوئی دلیل نہیں۔ (مالی معاملات پر غرر کے اثرات،ص۴۷).

وللاستزادة انظر : فتح القدير:٧/٨٧،دارالفكر۔وتبيين الحقائق:٤/ ١١٥،باب السلم،ملتان۔ومجمع الانهرشرح ملتقى الابحر:٢/ ١٠٠۔مالی معاملات پر غرر کے اثرات،ص۴۳۔۴۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

گوشت میں بیع سلم کا حکم:

سوال: میرے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے، شادی سے کچھ دن پہلے میں ایک گوشت فروش کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ فلاں تاریخ آپ مجھے فلاں قسم کا گوشت ۳۰ کیلو فلاں وقت دیں گے، تاکہ ہم بریانی

بنائیں۔ بعض علماء نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ گوشت میں بیع سلم ہے جو ناجائز ہے، آپ شرعی حکم بتلادیں؟

الجواب: جب مکمل طور پر گوشت کی حالت وکیفیت بتلادیں اور جھگڑا پیدا نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ولا خير في السلم في اللحم عند أبي حنيفةؒ وقالا: إذا وصف من اللحم موضعاً معلوماً بصفة معلومة جاز. (الهداية:باب السلم،۳/۹٤).

ہدایہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک گوشت میں بیع سلم ناجائز ہے، لیکن صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح کیفیت وغیرہ بتلادیں جو سببِ نزاع نہ بنے تو جائز ہے۔ اور متاخرین فقہاء میں سے بہت سارے حضرات نے حضراتِ صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ نقل فرمایا ہے:

ملاحظہ ہو علامہ عینیؒ بنایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

وقال: وفي الحقائق والعيون: الفتوىٰ على قولهما، لأن اللحم موزون في عادة الناس مضبوط الوصف ببيان هذه الأشياء. (البناية في شرح الهداية:۳/۱۸٦،ط:فيصل آباد).

ملاعلی قاریؒ شرح نقایہ میں فرماتے ہیں:

ولا يصح السلم في اللحم عند أبي حنيفةؒ ويصح عندهما وبه يفتىٰ. (فتح باب العناية۳/۲۷۸).

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وقالا: يجوز إذا بين جنسه ونوعه وسنه وموضعه وصفته وقدره كشاة خصي ثني سمين من الجنب أو الفخذ مائة رطل،لأنه موزون مضبوط الوصف...وفي الحقائق والعيون الفتوىٰ على قولهما. (البحرالرائق:٦/۱۵۸،كوئته).

وفي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: وجوزه الصاحبان إذا بين وصفه وموضعه، لأنه موزون معلوم، وبه قالت الأئمة الثلاثة، وعليه الفتوىٰ. (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد:٤/۲۸۹،مايجوز السلم فيه ومالايجوز).

علاوہ ازیں فقہائے کرام کی ایک جماعت نے بحوالہ حقائق وعیون صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ نقل کیا ہے۔ مثلاً محقق ابن ہمامؒ نے "فتح القدير:۷/۸٤،دارالفكر" میں، اور علامہ شامیؒ نے "ردالمحتار:۵/۲۱۲،سعيد" میں۔

اور اسی طرح " الفتاوى الهندية:٣/١٨٤ "و" شرح المجلة: ٢/ ٤٠٠ " میں مذکور ہے۔

وقد وجدت في مخطوطة عيون المذاهب للعلامة قوام الدين محمد بن محمد الكاكي،قال: ولا في لحم وعندهما والثلاثة يصح وبه يفتى. (مخطوطة عيون المذاهب،ص ١٠٠٥). واللہ ﷻ اعلم۔

کپڑوں میں استصناع کا حکم:

سوال: ایک شخص نے چین میں ایک فیکٹری کو کپڑے بنانے کا آرڈر دیدیا، لیکن اس میں اجل مقرر نہیں کی، تو اگر یہ بیع استصناع ہے تو بقولِ فقہاء کپڑوں میں استصناع جائز نہیں ہے، اور اگر بیع سلم ہو تو اجل کا ذکر نہیں ہے تو یہ کونسا عقد ہے اور اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ عقد استصناع ہے، اور فقہاء کے ناجائز کہنے کا مدار عرف ہے ان کے زمانے میں کپڑوں میں استصناع کا عرف نہیں تھا، جب کہ فی زمانہ کپڑوں کو آرڈر دیکر تیار کرانے کا عرفِ عام ہے، اس وجہ سے اس کی گنجائش ہونی چاہئے، نیز علامہ فتح محمد صاحب لکھنویؒ نے تکملہ عمدۃ الرعایہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ہر چیز میں استصناع جائز اور درست ہے چاہے اس کا عرف ہو یا نہ ہو۔

ملاحظہ ہو تکملہ عمدۃ الرعایہ میں ہے:

قول مشايخنا إن الاستصناع فيما يتعامل الناس فيه كان في زمانهم أما في زماننا لا كفاية لنا عليه بل لاحاجة إليه، لكن المحتاج إليه أمر لايعتاد الناس به بل لايعرفه كماترى في كثير من الآلات والأشياء التي يخترع ويؤمر به الصناعون وإن نهيناهم عنه يختل الأمر ويفضي إلى مالايسمع فوقها أحد من السامعين فضلاً عن الجاهلين ولذلك إشارة في ما ذكرناها لأن الآية ساكتة (أى آية المداينة) فصارت مطلقة والحديث (أى حديث صناعة المنبر) دال على ما هوحاجتي لأن العرب لايعرفون المنبرحتى قالت امرأة: أجعل لك شيئاً تقعد عليه ووصفته وما ذكرته باسمه المنبر لأنه كان غيرالمعروف وأيضاً الخاتم المستصنع إن كانت مما يتعامل الناس فيه لكن النقش باسمه الشريف كان أمراً جديداً فهذا صريح ممالايتعامل الناس فينبغي أن يجوز في كل ما يمكن ضبطها ووضعها. (تكملة عمدة

الرعاية حاشية شرح الوقاية:۳/۸۳،فصل فی الاستصناع،سعید).

العرف والعادة میں ہے:

فالفقه أن ما جرى العرف به صح استصناعه كالخفاف الأحذية والأواني وأثاث المنزل وعدد الحرب والثياب. وأما تصريح فقهائنا بأنه لايجوز استصناع الثياب فذلك مبني على عرفهم، لأن الناس ماكانوا يتعاملون هذا النوع، وأما الآن فقد فشا هذا التعامل بين التجار والصناع في البلدان. (العرف والعادةفی راي الفقهاء للدكتوراحمدفهمی ابوسنة،ص۱۷۶).

شرح مجلّہ میں ہے:

كل شيء تعومل استصناعه يصح فيه الاستصناع على الإطلاق. (شرح المجلة:۲/۳/۴۰۳،لمحمدالاتاسی).

وفي الفقه الإسلامي: اشترط الحنفية لجواز الاستصناع شروطاً ثلاثةً إذا فاتت أو فات واحد منها فسد العقد...(۱) بيان جنس المصنوع ونوعه وقدره وصفته...(۲) أن يكون المصنوع مما يجري فيه تعامل الناس كالمصنوعات والأحذية...ويصح في عصرنا الحاضر الاستصناع في الثياب لجريان التعامل فيه، والتعامل يختلف بحسب الأزمنة والأمكنة. (الفقه الاسلامی وادلته:۵/۳۰۸، الشروط التی تلحقه ،دارالفکر، الطبعة الرابعة).

علامہ شامیؒ نے فرمایا اجارہ فی الثیاب کو مشائخ بلخؒ نے عرف کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے۔ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

بخلاف الاستصناع كان التعامل به جرى في كل البلاد، وبمثله يترك القياس ويخص الأثر، وفي العناية: فإن قيل لانتركه بل يخص عن الدلالة بعض ما في معنى قفيز الطحان بالعرف كما فعل بعض مشايخ بلخ ؒ في الثياب لجريان عرفهم بذلك. (فتاوی الشامی:۶/۵۹،مطلب یخص القیاس والاثربالعرف العام،سعید).

محیط برہانی میں ہے:

ومشايخ بلخ ؒ كنصيربن يحيىٰ ومحمد بن سلمة وغيرهما كانوا يفتون بجوازهذه الإجارة في الثياب لتعامل أهل بلدهم في الثياب والتعامل حجة يترك به القياس ويخص به

الأثر. (المحیط البرھانی:۹/۱۷۹،رشیدیة).

عطر ہدایہ میں ہے:

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جب استصناع سے بیع لازم ہو جاتی ہے تو اس شئی کے متعارف ہونے کی شرط بے ضرورت ہے بلکہ استصناع سے مانع ہے کیونکہ عام طور پر وہی چیز بنوائی جاتی ہے جو جدید قسم کی یا خاص وضع کی ہوتی ہے اگر ایسی چیزیں استصناع سے خارج ہو جائے تو استصناع کی ضرورت ہی نہیں رہے گی، امام ابو یوسفؒ کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکڑی کا منبر بنوایا حالانکہ اس سے پہلے نہ منبر متعارف تھا نہ مستعمل۔ (عطر ہدایہ،ص ۲۰۷). واللہ ﷻ اعلم۔

نمونہ کے مطابق نہ بنانے پر واپس کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے ایک کمپنی کو مال بنوانے آرڈر دیا اور اس نے وہ مال نمونے کے مطابق نہیں بنایا، تو کیا اس کو واپس کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: آرڈر دے کر مال بنوانے کو شریعت کی اصطلاح میں استصناع کہا جاتا ہے، اور عقد استصناع میں جب نمونہ کے مطابق نہیں بنایا تو واپس کرنا درست ہے۔ہاں نمونے کے مطابق ہو تو پھر واپس نہیں کر سکتا۔

ملاحظہ فرمائیں شرح مجلّہ میں ہے:

إذا انعقد الاستصناع فليس لأحد العاقدين الرجوع وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبينة كان المستصنع مخيراً. (شرح المجلة لمحمدخالدالاتاسی،۲/۴۰٦).

وفي شرح المجلة لسليم رستم باز اللبناني: قال : كان المستصنع مخيراً لفوات الوصف المرغوب فيه. (شرح المجلة ، المادة : ۷۹۲: ۱/۲۲۱).

وفي الموسوعة الفقهية : وذهب أبو يوسفؒ إلى أنه إن تم صنعه ، وكان مطابقاً للأوصاف المتفق عليها، يكون عقداً لازماً، وأما إن كان غير مطابق لها فهو غير لازم عند الجميع لثبوت خيار فوات الوصف...واللجنة ترجح (أي قول أبي يوسفؒ كما اختاره صاحب المجلة) وترى لزوم عقد الاستصناع ، لما يترتب على استقلال أحد الطرفين

بفسخه من المضار إلا إذا جاء على خلاف الوصف المتفق عليه. (الموسوعة الفقهية: ۳/۳۲۹).

مالی معاملات پر غرر کے اثرات میں مولانا اعجاز احمد صاحب لکھتے ہیں:

تیسرا قول امام ابو یوسفؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مطلوبہ صفات کے مطابق سامان تیار ہونے کے بعد کسی کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں...ان کی دلیل یہ ہے کہ مطلوبہ صفات کے مطابق سامان تیار ہونے کے بعد کسی فریق کو عقد فسخ کرنے کا اختیار دینے سے دوسرے کا نقصان ہے...عصر حاضر کے حالات وواقعات کی روشنی میں امام ابو یوسفؒ کا قول زیادہ قابل عمل معلوم ہوتا ہے۔متعدد معاصر علمائے کرام نے بھی امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح دی ہے، چنانچہ ڈاکٹر صدیق محمد الامین الضریر فرماتے ہیں:

والعمل برأي أبي يوسفؒ أولىٰ من العمل بالرأيين الصحيحين في المذهب في نظري لأنه لا ضرر فيه على المتعاقدين وهو أبعد عن الغرر... (الغرر واثره فی العقود، ص۴۶۷).

شیخ مصطفیٰ احمد زرقا فرماتے ہیں:

لزم اختيارقول أبي يوسفؒ في هذا مراعاة لمصلحة الوقت. (مجلة مجمع الفقه الإسلامي).

مجمع الفقہ الاسلامی (اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ) کی طے شدہ قرارداد میں بھی امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کیا گیا ہے۔ (مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص۶۷۔۷۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

فلیٹ بنانے کا آرڈر لینے کے بعد نہ بنانے پر مثل دینے کا حکم:

سوال: ایک بلڈر نے کسی جگہ پلاٹ خریدا اور اس پر ۱۵ منزلہ بلڈنگ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا، زید نے بلڈر سے اسی عمارت کے دسویں منزلہ پر فلیٹ کا سودا کیا، فلیٹ کی سائز وغیرہ تفصیلات کے موافق ۸۰ لاکھ ثمن طے ہوا، زید نے پورا ثمن ادا کر دیا اور تین سال میں بلڈنگ تیار ہونے کا معاہدہ طے پایا، لیکن تین سال گزرنے پر بھی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا، بلڈر نے مزید دو سال کی مہلت طلب کی، زید نے منظور کر لی، اب پانچ سال کے بعد بلڈر کا کہنا ہے کہ بلڈنگ نہیں بنے گی، لہٰذا آپ اپنے ۸۰ لاکھ واپس لے لے، زید راضی نہیں ہے، کیونکہ زمین کی قیمتوں میں آئے دن اضافے ہوتے رہتے ہیں، اب آج کی تاریخ میں اتنی قیمت میں ایسا فلیٹ ملنا مشکل ہے، بلڈر نے کہا آج کی قیمت کے اعتبار سے پیسے لے لو، اس کے باوجود زید اس بات پر مصر رہا کہ مجھے فلیٹ ہی چاہئے، بلڈر نے کہا آپ خود تلاش کر لے میں پوری رقم ادا کر دوں گا چنانچہ زید نے ایک فلیٹ تلاش کیا اس کی

قیمت دو کروڑ تھی بلڈر نے کہا میں صرف ایک کروڑ ادا کروں گا اس سے زائد نہیں۔
اب دریافت طلب امور یہ ہیں: (۱) کیا زید کا بلڈر سے دو کروڑ کا مطالبہ کرنا اور لینا درست ہے؟
(۲) کیا زید کا اس طرح اصرار کرنا درست ہے؟ اور اگر بلڈر ایسا فلیٹ فراہم کردے تو لینا درست ہے؟ اور بلڈر کو مطالبہ کے موافق ایسا فلیٹ دینا شرعاً لازم ہے یا نہیں؟
اکثر حضرات کا خیال ہے یہ عقد استصناع ہے، اور فلیٹ تیار ہونے سے پہلے زید نہ بلڈر کو فروخت کر سکتا ہے نہ کسی اور کو، یہ رقم کی واپسی فسخ واقالہ ہے جو ثمن اول ہی پر درست ہے۔ لہٰذا زید کے لیے دو کروڑ کی رقم لینا جائز نہیں فقط ۸۰ لاکھ ہی لے سکتا ہے۔ اور بلڈر اس قسم کا فتویٰ لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے۔
اس مسئلہ میں حضرت والا کی رہنمائی کی ضرورت ہے برائے کرم حکم شرعی سے مطلع فرما کر اجر عظیم کے مستحق ہوں۔

الجواب: جب کوئی شخص مثلاً: زید کسی کمپنی کو رقم دیکر مکان یا فلیٹ بنوانے کے لیے کہدے اور مکان یا فلیٹ بُک کرا کر معاملہ طے کرلے تو اس معاملہ کو زمانہ حال کے فقہاء نے استصناع میں داخل فرمایا ہے، پھر اس میں تاریخ متعین ہو یا نہ ہو، مختار قول کے مطابق اس سے استصناع میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔
شرح مجلّہ میں شیخ محمد خالد الاتاسی رقمطراز ہیں:

ثـم ما ورد التعامل في استصناعه سواء كان مؤجلاً إلى شهر أو أزيد أو لم يكن مؤجلاً فـالتـأجيـل يحمل على الاستعجال ولا يخرجه عن كونه استصناعاً، وهو قول الإمامين (أي الصاحبين) وعليه مشت هذه المادة لكونه أرفق. (شرح المجلة: ۱/۴۰۳، مكتبة رشيدية، كوئٹه).

پھر جب مدت گزرنے کے بعد صانع نے خاص جگہ پر فلیٹ بنانے سے معذرت کرلی اور روپے واپس لینے کے لیے کہا اور مستصنع روپیوں کے لینے سے انکاری ہے کیونکہ اس کو زبردست نقصان ہے تو مستصنع نے عقد کو فسخ نہیں کیا اور صانع کو یک طرفہ عقد فسخ کرنے کا اختیار نہیں، اب صانع بلڈر اس فلیٹ کا مثل مستصنع کو دیدے۔
بیع سلم کے بارے میں شرح مجلّہ میں لکھا ہے:

ولـو انقطع عن أيدي الناس بعد الحلول قبل أن يوفي المسلم فيه فرب السلم بالخيار إن شـاء فسـخ الـعقد وأخذ رأس ماله وإن شاء انتظر وجوده أي المسلم فيه. (شرح المجلة: ۳۹۸/۲، مكتبة رشيدية).

سلم اور استصناع اکثر احکام میں یکساں ہیں۔ یہاں بھی جب مکان موعود پر وہ فلیٹ نہیں مل سکتا تو صانع اس کو مثل دیدے، اور اس لائن کے ماہرین مثل کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

پس ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ آرڈر دیا ہوا شخص جو بلڈر کہلاتا ہے فلیٹ موعود کا مثل مستصنع زید کو دیدے۔

بلڈر جو لوگوں کو فتویٰ دکھاتا ہے کہ میں زید کو اس جمع کی ہوئی رقم واپس کروں گا یہ اس وقت صحیح ہے جب زید عقد کو فسخ کردے اور اگر زید فلیٹ یا اس کا مثل مانگتا ہے تو پھر بلڈر کو مثل دینا پڑیگا، پھر درحقیقت بلڈر ہی یہ فلیٹ زید کو حسب وعدہ دیگا، اگر قانونی مجبوری کی وجہ سے روپے زید کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں فلیٹ کے مثل دینے کی صورت میں بلڈر فلیٹ خرید لے گا اور شرا کی تکمیل کے بعد فلیٹ زید کو حسبِ وعدہ دینے کا پابند ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن أنس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ
أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم
باع حلساً وقدحاً وقال: من یشتری ھذا الحلس والقدح،
فقال رجل: أخذتھما بدرھم،
فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:
من یزید علی درھم فأعطاہ رجل درھمین فباعھا منہ۔

(رواہ الترمذی)۔

باب......﴿۶﴾

بیع کی مختلف قسموں کا بیان

عن ابن عمرؓ قال:
سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول:
"إذا تبایعتم بالعینة وأخذتم أذناب البقر
ورضیتم بالزرع وترکتم الجھاد
سلط اللّٰہ علیکم ذلاً
لاینزعہ حتی ترجعوا إلی دینکم"۔

(رواہ ابوداود۔والبیھقی فی سننہ الکبری)۔

باب ...... ﴿۶﴾

بیع کی مختلف قسموں کا بیان

بیع بالوفاء کا طریقہ اور اس کا حکم:

سوال: اس ملک میں جب کسی شخص کی بیوی کا انتقال ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر وہ دوسری شادی کرتا ہے کبھی کبھی ۷۰/۷۵ سال کی عمر میں بھی شادی کرتا ہے، اور عام طور پر ۴۰/۴۵ یا ۵۰ سال کی عورت سے شادی کرتا ہے بڑھاپے میں شوہر کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ میرے انتقال کے بعد میری بیوی میرے موجودہ مکان میں نہیں رہ سکے گی، کیونکہ سابقہ بیوی کی اولاد جو اس شوہر سے ہے وہ مکان میں سے اپنا اپنا حصہ لے لیگی، بیوی کا حصہ اس کے رہنے کے لیے ناکافی ہوگا، اگر شوہر بیوی کے لیے وصیتِ سکنی کرتا ہے تو وارث کے لیے وصیت نہیں ہوتی، اور اگر شوہر بیوی کو مکان ہبہ کرتا ہے تو اس میں شوہر اپنی اولاد کی حق تلفی سمجھتا ہے، کیونکہ بیوی کے انتقال کے بعد مکان بیوی کے وارثوں کے پاس جائیگا، اور مرحوم کی اپنی اولاد محروم ہو جائے گی، اس صورت میں احناف کے مذہب پر رہتے ہوئے ایسی کونسی صورت ہو سکتی ہے جس میں بیوہ باعزت مکان میں تاحیات رہے، اور اس کے انتقال کے بعد مکان وغیرہ شوہر کی اولاد کو مل سکے؟ بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزیل.

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیوی کے مکان میں رہنے کی ایک صورت عمریٰ کے مسئلہ پر عمل کرنا ہے، یعنی اگر شوہر یہ کہدے کہ جب تک بیوی زندہ رہے گی، وہ اس مکان سے فائدہ اٹھائے گی، تو امام مالکؒ کے مذہب کے مطابق بیوی کو تاحیات اس مکان میں رہنے کا حق حاصل ہوگا۔

بدایۃ المجتہد میں مرقوم ہے:

والقول الثاني أنه ليس للمعمر فيها إلا المنفعة فإذا مات عادت الرقبة للمعمر أو إلى ورثته وبه قال مالک وأصحابه. (بداية المجتهد:۲/۲٤۸، القول فی انواع الهبات).

المغنی مع الشرح الکبیر میں ہے:

وقال مالکؒ والليثؒ : العمریٰ تمليک المنافع لاتملک بها رقبة المعمر بحال ويكون للمعمر السكنىٰ فيه فإن مات عادت إلى المعمر. (المغنی:٦/۳۰٤۔وکذا فی الشرح الکبیر:٦/۲٦٥،بیروت).

امام قرطبیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا:

وأما العمریٰ فاختلف العلماء فيها على ثلاثة أقوال: أحدها أنها تمليک لمنافع الرقبة حياة المعمر مدة عمره فإن لم يذكر عقباً فمات المعمر رجعت إلى الذي أعطاها أو لورثته، هذا قول القاسم بن محمدؒ ويزيد بن قسيطؒ والليث بن سعدؒ، وهو مشهور مذهب مالکؒ، واحداقوال الشافعيؒ. (الجامع لاحکام القرآن:۹/۳۹،سورۃ ھود).

مذہبِ احناف میں عمریٰ کی کوئی ایسی صورت موجود نہیں جس میں بیوی تاحیات فائدہ اٹھاتی رہے اور اس کی وفات کے بعد پراپرٹی شوہر کے وارثوں کو مل جائے، مذہب احناف کے دائرہ میں رہتے ہوئے عمریٰ پر عمل کرنے کی صورت میں مکان کی واپسی نہیں ہوسکتی۔

ہاں احناف کے ہاں بیع بالوفاء کی صورت ہوسکتی ہے۔

بیع بالوفاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہدے کہ یہ چیز میں آپ کے ہاتھ بیچتا ہوں، خاص متعین وقت پر یا جب بھی میں ثمن واپس کردوں یا میرے ورثاء ثمن واپس کردیں تو آپ مبیع واپس کریں گے، (یہ بیع سے پہلے یا بیع کے بعد وعدہ کی صورت میں ہو، شرط لگانا اچھا نہیں ہے۔) اس صورت میں بیوی کی وفات کے بعد اس کے ورثاء مکان واپس کریں گے، اور شوہر کے ورثاء اس کا ثمن واپس کردیں گے۔

بیع بالوفاء کے جواز اور عدم جواز میں بہت اختلاف ہے لیکن احناف کے ہاں ایک قول جواز کا بھی ہے ان مشکلات کے دور میں بلاتردد اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

معجم لغۃ الفقہاء میں مذکور ہے:

أن يبيع السلعة للمشري بالذي له عليه من الدين على أنه متى قضاه الدين عادت إليه

السلعة . (معجم لغة الفقهاء،ص۱۳۷).

القاموس الفقہی میں ہے:

بيع الوفاء عند الحنفية هو: أن يقول البائع للمشتري: بعت منک هذا الشيء بما لک علي من الدين على أني متى قضيت الدين فهو لي ، وهو: أن يبيعه العين على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين ويسمىٰ أيضاً بيع الطاعة .(القاموس الفقهي،ص۳۸٤، حرف الواو،دمشق).

معجم المصطلحات میں ہے:

بيع الوفاء في اللغة : عرف الحنفية البيع بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري المبيع إليه. ويسمىٰ بيع الثنيا عند المالكية ، والعهدة عند الشافعية والأمانة عند الحنابلة، ويسمىٰ أيضاً بيع الطاعة ، وبيع الجائز، وسمىٰ في بعض كتب الحنفية بيع المعاملة. (معجم المصطلحات:۱/٤۱٦).

شرح مجلّہ میں ہے:

وإذا اتفق المشتري مع البائع على أنه يرد له المبيع إذا رد له مثل الثمن في وقت كذا ثم جاء الوقت وامتنع البائع عن رد مثل الثمن فإنه يؤمر ببيع المبيع وقضاء الثمن من ثمنه فإن أبى باعه الحاكم عليه. (شرح المجلة، ص ۲۲۳، للبناني، فصل فی بیع الوفاء، المادة: ۳۹٦).

فتاویٰ شامی میں ہے:

حتى لم يملک المشتري بيعه من آخر ولا رهنه. (فتاوى الشامی:۵/۲۷۷، مطلب فی بیع الوفاء ، سعید).

تبیین الحقائق میں ہے:

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعاًجائزاً مفيداً بعض أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض وهو البيع ، لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه والقواعد قد تترک بالتعامل وجوز الاستصناع لذلک، وقال صاحب النهاية وعليه الفتوىٰ...وعندهما هذاالبيع عبارة عن بيع غير لازم فكذلک وإن ذكر البيع من غيرشرط ثم ذكر الشرط على

وجه الميعاد جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد لأن المواعيد قد تكون لازمة . (تبيين الحقائق:٥/١٨٣، كتاب الاكراه،ملتان).

ملاعلی قاریؒ شرح النقایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وتلفظا بتلفظ البيع بشرط الوفاء أوبالبيع الجائز...وإن ذكرا البيع من غيرشرط ثم ذكرا الشرط على وجه الميعاد جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد لأن المواعيد قد تكون لازمة، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " العدة دين" فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه...وصورته:أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذه العين بألف درهم على أني لو دفعت إليك ثمنك تدفع العين إلي ثم قال ويسمىٰ هذا بيع الوفاء وهذا البيع موجود في المصر يتعامل به ويسمونه بيع الأمانة. (شرح النقاية:٣/٢٥٣،قبيل فصل الاقالة، بيروت).

علامہ ابن البزاز الکردی فرماتے ہیں:

وفي فوائد البرهان:تبايعا مطلقاً ثم ألحقا الوفاء يلتحق عند الإمام كإثبات الشرط المفسد وإسقاطه إذا لم يكن قوياً...وأجبر على الرد إذا أحضر الدين...وجعلناه كذلك لحاجة الناس إليه فراراً من الربا. (الفتاوى البزازية بهامش الهندية:٤/٤٠٨، نوع فيمايتصل بالبيع الفاسد).

فتاوی قاضیخان میں ہے:

وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكرالشرط على وجه المواعدة جازالبيع ويلزمه الوفاء بالوعد لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس. (فتاوى قاضيخان بهامش الهندية:٢/١٦٥، فصل في الشروط المفسدة).

درمختار میں ہے:

صح بيع الوفاء في العقار استحساناً واختلف في المنقول. وفي الشامية: وصح في العقار باستحسان بعض المتأخرين. (فتاوى الشامي:٥/٢٧٩، سعيد).

پھر اگر عاقدین میں سے ایک کا انتقال ہوجائے تو مبیع کی واپسی میں ان کے ورثاء ان کے قائم مقام ہوتے ہیں۔

شرح مجلّہ میں مرقوم ہے:

إذا مات أحد المتبايعين وفاءً انتقل حق الفسخ للوارث. (شرح المجلة ،للبناني،ص٢٢٦).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

إذا باع باتاً أو وفاءً... فورثته يقومون مقامه في أحكام الوفاء. (الفتاوى البزازية:٤/٤١١).

درمختار میں ہے:

ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد وأفاد في الشرنبلالية أن ورثة كل من البائع والمشتري تقوم مقام مورثها نظراً لجانب الرهن. (الدرالمختار:٥/٢٧٨،سعيد).

فتاوی بزازیہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ بیع بعض احکام میں بیع فاسد کی طرح ہے اور بعض میں بیع صحیح کی طرح ہے۔عبارت ملاحظہ ہو:

هذا البيع فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ وصحيح في حق بعض الأحكام حتى لم يملك الشاري بيعه من آخر ولا رهنه. (الفتاوى البزازية:٤/٤٠٩، نوع فيما يتصل بالبيع الفاسد).

حضرت مولانا مفتی تقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

متاخرین حنفیہ نے بھی چند مسائل میں وعدہ کو قضاءً لازم قرار دیا ہے، جیسے بیع الوفاء کے مسئلہ میں۔(ہاؤس فائننگ کا شرعی طریقہ،ص ۱۷۔وغیر سودی بنکاری،ص ۲۴۲۔۲۵۴،بیع بالوفاء).

خانقاہ تھانہ بھون کے مفتی پاکستان کے شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ امداد الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں:

اور بیع بالوفاء کی ایک صورت یہ ہے کہ ایجاب وقبول بیع وشراء کا ہو اور ایجاب وقبول میں کوئی شرط واپسی وغیرہ کی نہ ہو بلکہ بعد ایجاب وقبول کے شرط رد وغیرہ کی کی جاوے، یہ بالاتفاق جائز ہے، لخلو العقد عن الشرط ،اور جب زبانی ایجاب وقبول میں متصلاً شرط نہ ہو تو بیع نامہ میں متصلاً شرط کے لکھنے سے حرمت نہ آئیگی، لأن الأصل في العقود القول والكتابة وثيقة ، والله أعلم،حرره الأحقر ظفر أحمد عفي عنه ۔ (امداد الاحکام:۳/۴۳۵).

اس فتویٰ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دستخط بھی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس جواب سے معلوم ہوا کہ اگر ایجاب وقبول میں واپسی کی شرط نہ ہو پھر وثیقہ میں لکھا جائے تو یہ بالکل درست ہے،ہاں وثیقہ کی وجہ سے اس کی واپسی لازم ہوگی کیونکہ واپسی کا وعدہ پورا کرنا لازم ہے،لہٰذا اگر شوہر اپنی بیوی کو وہ مکان فروخت کردے اور الفاظ بیع میں واپسی کی شرط نہ ہو، بلکہ تحریر میں

واپسی کی شرط کی جائے تو اس صورت کا جواز بے غبار ہے بیع کی صورت میں عاقدین ثمن کم مقرر کریں اور بیوی کی وفات کے بعد اس کے ورثاء کو ثمن دیدیا جائے۔

حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے سابقہ عبارت میں بیع بالوفاء کی اس شکل کو جائز فرمایا جس کے ایجاب وقبول میں کوئی شرط نہ ہو، دوسری جگہ ضرورت کی وجہ سے بیع بالشرط کو بھی جائز فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الاحکام میں ہے:

بیع بالوفاء کی تعریف یہ ہے کہ اس شرط کیساتھ بیع کرنا کہ مشتری جس وقت زرِ ثمن بائع کو واپس کردے بائع کو مبیع کا واپس کرنا ضروری ہوگا، اس طرح بیع کرنا اصول شرعیہ کے لحاظ سے دراصل ناجائز ہے، **فقد نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط.** (رواه الطبراني بطريق أبي حنيفةؒ وذكره عبد الحق في أحكامه وسكت عنه وأعله ابن القطان بأبي حنيفةؒ كذا في التخريج للزيلعيؒ، قلت: وإعلاله رد عليه فليس مثل أبي حنيفةؒ يعل به).

مگر چونکہ بیع بالشرط کے ناجائز ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض صورتوں میں بیع بالشرط جائز ہے، اور ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ بیع بالشرط جائز ہے اس لیے فقہاءِ متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے بیع بالوفاء کو جائز کر دیا ہے تاکہ اس طرح سود سے تو بچا رہے۔ (امداد الاحکام: ۳/۴۲۸).

خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے ہاتھ مکان کی بیع کردے تو یہ جائز اور درست ہے، پھر اس کی بیع بالوفاء بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) زبانی ایجاب وقبول کے بعد تحریر میں یا زبانی طور پر یہ ظاہر کردے کہ جب مکان کی قیمت واپس کردی جائے پھر اس کی کئی صورتیں ہیں، (الف) وقت متعین کردیا جائے مثلاً ۲۰ سال کے بعد ثمن واپس کردیا جائے تو مکان بھی واپس ہوجائیگا۔ (باء) جب بھی ثمن واپس کردیا جائے تو مکان بھی واپس کردیا جائے یہ صورت ہمارے مذکورہ مسئلہ کا حل نہیں بن سکتی۔ (ج) جب بیوی کا انتقال ہوجائے تو ثمن واپس ہونے کی صورت میں مکان شوہر کے وارثوں کو واپس کردیا جائے، یاد رہے کہ وارثوں میں بیوی بھی شامل ہے۔ لکونہ کالرھن۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ایجاب وقبول ہی کے اندر واپسی کی شرط لگائی جائے اس کو بھی کافی حضرات مشائخ نے ضرورت کی وجہ سے درست قرار دیا ہے، اور بعض حضرات ناجائز کہتے ہیں لہذا اس صورت سے احتراز ہی مناسب ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیع عینہ کا طریقہ اور اس کا حکم:

سوال: عمر زید کے پاس گیا اور اس سے دس ہزار کا قرضہ طلب کیا، زید نے قرض دینے سے انکار کر دیا، ہاں یہ کہا کہ میرے پاس مشین ہے اس کی قیمت دس ہزار ہے، وہ تم ۱۳ ہزار میں خرید لو اور چھ ماہ کے بعد مجھے ثمن ادا کرنا، عمر نے مشین خرید لی اور بازار میں یا پھر واپس زید کو ۱۰ ہزار نقد میں فروخت کی شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اور کیا بینکوں کا مرابحہ بیع عینہ کے قبیل سے ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ عقد بیع عینہ میں داخل ہے اور اس مسئلہ کی مختلف صورتیں ہیں۔(۱) زید عقد میں ہی شرط لگادے کہ مشین واپس مجھے دس ہزار میں فروخت کروگے، یہ صورت دو وجہ سے ناجائز ہے، (الف) شرط کی وجہ سے، (باء) "**شراء ما باع بأقل مما باع قبل نقد الثمن**" کی وجہ سے یعنی بائع نے زیادہ قیمت پر بیچا اور کم قیمت پر خرید اثمن کی ادائیگی سے پہلے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ بغیر شرط کے بیچ دے اور واپس فروخت کرنے کا وعدہ لے یا شرط بعد البیع لگادے۔ یہ صورت بھی ناجائز ہے، کیونکہ اس میں بھی "**شراء ما باع باقل مما باع قبل نقدالثمن**" پایا گیا۔ ہاں ثمن کی ادائیگی کے بعد جائز ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ زید عمر کو وہ چیز ۱۳ ہزار میں بیچ دے پھر عمر اس کو بکر کے ہاتھ فروخت کرے اور بکر اس کو پھر زید کے ہاتھ فروخت کرے اس صورت میں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں:

"**هذا البيع في قلبي كأمثال الجبال ذميم اخترعه أكلة الربا.** (شامی، کتاب الکفالة، ۵/۳۲۶، مطلب بیع العینة، سعید). اور اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو قاضیخانؒ فرماتے ہیں:

ثم أن المستقرض يبيعها من غيره بأقل مما اشترى ثم ذلك الغير يبيعها من المقرض بما اشترى...وهذه الحيلة هي العينة التي ذكرها محمد. (فتاوی قاضیخان بهامش الهندية: ۲/۲۷۹، فصل فيما يكون فراراً من الربا).

امام ابو یوسفؒ کے ہاں جائز ہے بلکہ اس کو قابل اجر فرماتے ہیں، نیز مشائخ بلخ بھی جائز کہتے ہیں۔

فتاوی قاضیخان میں ہے:

وقال مشايخ بلخ بيع العينة في زماننا خير من البيوع التي تجري في أسواقنا وعن أبي يوسف أنه قال العينة جائزة مأجورة وقال أجره لمكان فراره من الحرام. (فتاوی قاضیخان بهامش الهندية:۲/۲۷۹).

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ زید عمر کو مشین فروخت کرے اور عمر اس کو بازار میں بکر کے ہاتھ فروخت کرے اور زید کے پاس واپس ہی نہ آئے، یہ صورت امام محمدؒ کے نزدیک بھی جائز ہے۔

فتح القدیر میں ہے:

ومالم ترجع إليه العين التي خرجت منه لايسمىٰ بيع العينة. (فتح القدير: ۷/۲۱۳، دار الفكر).

بیع عینہ کو اس لیے عینہ کہتے ہیں کہ اس میں بائع نے قرض کو چھوڑ کر عین اور سامان کی طرف آنا پسند کیا یا اس لیے کہ بائع کے پاس واپس عین یعنی وہ چیز آ گئی۔

بیع عینہ کے مانعین درجِ ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

حدثنا حيوة بن شريح عن إسحاق أبي عبد الرحمن قال سليمان عن أبي عبد الرحمن الخراساني أن عطاء الخراساني حدثه أن نافعاً حدثه عن ابن عمر رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " إذا تبايعتم بالعينة وأخذتم أذناب البقر ورضيتم بالزرع وتركتم الجهاد سلط الله عليكم ذلاً لاينزعه حتى ترجعوا إلى دينكم ". (رواه ابوداود:۳/۲۹۱،باب فی النهی عن العينة۔والبيهقی فی سننه الكبرى ،باب ماورد فی كراهية التبايع ،۵/۳۱۶،دائرة المعارف).

وفي الدراية في تخريج أحاديث الهداية: قال: وإسناده ضعيف، وله عند أحمد إسناد آخر أجود وأمثل منه ومن حديث عبدالله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه نحوه عنده بإسناد ضعيف. (باب البيع الفاسد،۲/۱۵۱،بيروت).

وفي نصب الراية: قال رواه أحمد، وأبويعلى الموصلي، والبزار في مسانيدهم، قال البزار: وأبوعبد الرحمن هذا هوعندي إسحاق بن عبد الله بن أبي فروة، وهو لين الحديث انتهىٰ. قال ابن القطان في كتابه : وهذا وهم من البزار، وإنما اسم هذا الرجل إسحاق بن

أسید أبوعبدالرحمن الخراساني، یروي عن عطاء روي عنه حیوة بن شریح ، وهو یروی عنه هذا الخبر ، وبهذا ذکره ابن أبي حاتم ، ولیس هذا بإسحاق بن أبي فروة، ذاک مدني ، ویکنی أباسلمان ، وهذا خراساني ویکنی أباعبدالرحمن ، وأیهماکان فالحدیث من أجله لایصح، ولکن للحدیث طریق أحسن من هذا، رواه أحمد في ’’کتاب الزهد‘‘حدثنا أسود بن عامر ثنا أبوبکربن عیاش عن الأعمش عن عطاء بن أبي رباح عن ابن عمر ﷺ قال: أتی علینا زمان ، وما یری أحدنا أنه أحق بالدیناروالدرهم من أخیه المسلم، ثم أصبح الدیناروالدرهم أحب إلی أحدنا من أخیه المسلم، سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول:’’إذا ضن الناس بالدیناروالدرهم، وتبایعوا بالعینة، وتبعوا أذناب البقر، وترکوا الجهاد في سبیل اللّٰه، أنزل اللّٰه بهم ذلاً ، فلم یرفعه عنهم حتی یراجعوا دینهم‘‘. انتهیٰ.قال وهذا حدیث صحیح، ورجاله ثقات، انتهیٰ. حدیث آخر: رواه أحمد في ’’مسنده‘‘ حدثنا یزید بن هارون عن أبي جناب عن شهر بن حوشب أنه سمع عبد اللّٰه بن عمروعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ، فذکر نحوه. (نصب الرایة لاحادیث الهدایة:۴/۱۷،کتاب البیوع،بیروت).

خلاصہ یہ ہے کہ ابوداود کی سند ضعیف ہے اور مسند احمد کی سند صحیح ہے۔

اگر یہ حدیث صحیح ہو تو اس سے بیع عینہ کی ممانعت ثابت ہوگی، تاہم یہ حدیث نمبر چار صورت کو شامل نہیں۔اور اسی طرح اسلامی بینکوں والا مرابحہ اس حدیث میں شامل نہیں، کیونکہ فروخت شدہ سامان واپس بینک کے پاس نہیں آتا، نیز بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جہاد سے غافل ہو کر دنیا کے کاروبار میں مشغول رہنے کی ممانعت ہے۔اور اس کی تائید میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بعض طرق میں زرع کا لفظ بھی آیا ہے تو پھر زراعت بھی ممنوع ہوگی جب کہ اس کی ممانعت کا کوئی قائل نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ سعدی چلپی فتح القدیر کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

لو صح ذلک تکون الزراعة مذمومة أیضاً. (حاشیة فتح القدیر:۷/۲۱۲،دارالفکر).

و للاستزادة ، انظر: (فتاوی الشامی:۵/۲۷۲۔۲۷۳،۳۲۵،سعید۔وفتح القدیر:۷/۲۱۳، دارالفکر۔اعلاء السنن :۱۴/۱۷۷،ادارة القرآن۔والهدایة:۳/۱۱۳۔والرسالة المسماة بہ’’بیوع العینة والآجال‘‘اعدتها استاذة مدرسة عائشة رضی الله تعالیٰ عنها،ط:کراتشی باکستان). واللہ ﷻ اعلم۔

بیع تلجیہ کا طریقہ اوراس کا حکم:

سوال: بیع تلجیہ کیا ہے اوراس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بیع تلجیہ اس بیع کو کہتے ہیں کہ بائع اور مشتری کسی مصلحت کی وجہ سے ظاہراً تو بیع کر لے لیکن حقیقۃً بیع نہ ہو، اور یہ ہزل اور مذاق کی ایک قسم ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔

قال الجرجاني: هوالعقد الذي يباشره الإنسان عند ضرورة يصير كالمدفوع إليه، وصورته: أن يقول الرجل لغيره: أبيع داري منک بكذا فی الظاهر، ولايكون بيعاً فی الحقيقة ويشهدعلى ذلک وهونوع من الهزل. وفی الإنصاف: عرفه بقوله: هوأن يظهرا بيعاً لم يريداه باطناً بل خوفاً من ظالم ونحوه. ويعرف بعض الحنفية بيع التلجئة بأنه عقد ينشئه لضرورة أمر فيصير من المدفوع إليه. (معجم المصطلحات ۱/۴۰۵).

وفی الفتاوى الهندية: التلجئة هي العقد الذي ينشئه لضرورة أمرفيصير كالمدفوع إليه وأنه على ثلاثة أضرب أحدها أن تكون في نفس المبيع وهو أن يقول لرجل: إني أظهر أني بعت داري منک وليس ببيع فی الحقيقة ويشهد على ذلک ثم يبيع فی الظاهر فالبيع باطل والثاني أن تكون التلجئة فی البدل نحو أن يتفقا فی السر أن الثمن ألف ويتبايعان فی الظاهر بألفين فالثمن هوالمذكور فی السر ويصير كأنهما هزلا فی الزيادة وروى أبويوسفؒ أن الثمن هو المذكورفی الظاهر، والثالث: أن يتفقا فی الباطن أن الثمن ألف درهم ويتبايعان فی الظاهر بمائة دينار، قال محمدؒ القياس أن يبطل العقد وفی الاستحسان يصح بمائة دينار كذا فی الحاوي، وعن أبي حنيفةؒ بيع التلجئة موقوف إن أجازاه جاز، وإن رداه بطل كذا فی التهذيب، ولو اتفقا أن يقرا ببيع لم يكن فأقرا بذلک فهوباطل ولايجوز بإجازتهما كذا فی الحاوي. (الفتاوی الهندية:۳/۲۰۹، باب فی البياعات المكروهة والارباح الفاسدة).

درمختار میں ہے:

وبيع التلجئة وهو أن يظهرا عقداً وهمالايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو وهوليس ببيع فی الحقيقة بل كالهزل كمابسطته في آخرشرحي على المنار. (الدرالمختار:۵/۲۷۳،بيع الفاسد).

وفی الدر المختار : ولم ینعقد مع الهزل لعدم الرضا بحکمه معه، وفی الشامیة: الهزل فی اللغة: اللعب ، وفی الاصطلاح : هو أن یراد بالشيء مالم یوضع له ولا ماصح له اللفظ استعارة . . . فإن تواضعا علی الهزل بأصل البیع : أی توافقا أنهما یتکلمان بلفظ البیع عند الناس ولایریدانه واتفقا علی البناء أی علی أنهما لم یرفعا الهزل ولم یرجعا عنه فالبیع منعقد لصدوره من أهله في محله، لکن یفسد البیع لعدم الرضا بحکمه فصار کالبیع بشرط الخیار أبدا. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۴/۵۰۷،مطلب فی حکم البیع مع الهزل ،سعید).

شرح مجلّہ میں ہے:

البیع الفاسد یفید الحکم عند القبض إلا في أربع بیع الهازل... (شرح المجلة: ۲۰۷،للبنانی).

قاموس الفقہ میں ہے:

فرضی بیع کو ''بیع تلجیہ'' کہتے ہیں،اس سے مراد یہ ہے کہ حقیقت میں تو بیع نہ ہو،مگر کسی مصلحت کے پیش نظر یہ ظاہر کیا جائے کہ میں فلاں سامان اس شخص سے فروخت کررہا ہوں یا یہ کہ درپردہ تو قیمت کم ہو اور بظاہر مصلحتاً قیمت زیادہ بتائی جائے،امام محمدؒ کے یہاں یہ بیع باطل ہوگی اور امام ابوحنیفہؒ کے یہاں طرفین کی اجازت پر موقوف رہے گی،اگر طرفین نے اس ظاہری نمائشی بیع کو باقی رکھا تو بیع ہوجائیگی ورنہ کالعدم ہوگی۔(قاموس الفقہ:۲/۳۷۳، فرضی بیع).

وللاستزادة ، انظر: (البحرالرائق:۶/۹۹،فصل فی البیع الفاسد،بیروت۔والمبسوط للامام السرخسیؒ ،باب التلجئة ،۲۴/۲۲۶۔وفتاوی الشامی،مطلب فی بیع التلجئة،۵/۲۷۳،سعید۔بدائع الصنائع:۵/۱۷۶۔وقاضیخان:۳/۴۹۲).

خلاصہ یہ ہے کہ بیع تلجیہ بیع فاسد ہے ہاں اگر بعد میں بائع اور مشتری رضامندی ظاہر کردیں تو بیع درست ہوجائے گی،کبیع المکرہ۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیع الاستجرار کا طریقہ اور اس کا حکم:

سوال: بعض جگہ بیع کی دو صورتیں رائج ہیں،دونوں کے متعلق حکم شرعی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) بعض جگہ مشتری کی رقم دکاندار کے پاس پڑی رہتی ہے اور دکاندار سے سامان خریدتا رہتا ہے، یہاں تک کہ رقم ختم ہوجاتی ہے، اس صورت میں بظاہر یہ خرابی لازم آتی ہے کہ قیمت یعنی ثمن معلوم نہیں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری دکاندار سے چیزیں لیتا رہتا ہے اور استعمال کرتا رہتا ہے تین ماہ کے بعد یا ہر مہینہ کے آخر میں دکاندار اس کی قیمت بتاتا ہے، یا لکھتا ہے اس میں بظاہر یہ خرابی ہوتی ہے، کہ استعمال کے بعد وہ چیز ختم ہوگئی تو یہ بیع المعدوم ہوئی از روئے شرع ان دونوں صورتوں کا کیا حکم ہے؟

الجواب: پہلی صورت کی دو شکلیں ہیں، (الف) بائع مشتری کو ہر مرتبہ ثمن بتائے، تو یہ بلاخلجان صحیح اور درست ہے۔ (باء) بائع مشتری کو ثمن نہ بتائے لیکن دونوں کے ذہن میں بازاری قیمت ہو، تو یہ بھی مفضی الی النزاع نہ ہونے کی وجہ سے درست ہے۔

(۲) دوسری صورت استحساناً جائز اور درست ہے، کیونکہ لوگوں میں مروج ہے، اور حقیقت میں بیع معدوم بھی نہیں ہے، کیونکہ بوقتِ عقد موجود ہے اور مشتری نے بائع کی اجازت سے استعمال کی ہے، اگر بالفرض معدوم ہونے کے بعد مقرر کیا تب بھی لوگوں کے عرف وعادت کی وجہ سے یہ بیع جائز قرار پائے گی۔

ملاحظہ ہو معجم المصطلحات میں ہے:

واصطلاحاً مایستجره المشترى من البائع شيئاً فشيئاً ثم يدفع ثمن مأخذه بعد ذلك . (معجم المصطلحات والالفاظ الفقهية، لمحمد عبدالرحمن عبدالمنعم، ۱/۴۰۳).

التعریفات الفقہیہ میں ہے:

بيع الاستجرار: هو ما يستجره الإنسان من البياع إذا حاسبه على أثمانها بعد استهلاكها . (التعريفات الفقهية، ص ۲۱۲).

وفي الدر المختار: مايستجره الإنسان من البياع إذا حاسبه على أثمانها بعد استهلاكها جاز استحساناً، وفي الشامية: قوله مايستجره الإنسان...الخ. ذكر في البحر: أن من شرائط المعقود عليه أن يكون موجوداً ، فلم ينعقد بيع المعدوم ثم قال: ومما تسامحوا فيه، وأخرجوه عن هذه القاعدة مافي القنية الأشياء التي توخذ من البياع على وجه الخرج كما هو العادة من غيربيع كالعدس والملح والزيت ونحوهاثم اشتراهابعدماانعدمت صح. فيجوز بيع المعدوم هنا، وقال بعض الفضلاء : ليس هذا بيع معدوم إنما هوضمان

المتلفات بإذن مالكها عرفاً تسهيلاً للأمر ودفعاً للحرج كما هو العادة وفيه أن الضمان بالإذن ممالايعرف في كلام الفقهاء حموي، وفيه أيضاً أن ضمان المثليات بالمثل لابالقيمة والقيميات بالقيمة لا بالثمن .

قلت: كل هذا قياس، وقد علمت أن المسألة استحسان...وخرجها فى النهر على كون المأخوذ من العدس ونحوه بيعاً بالتعاطى، وأنه لايحتاج في مثله إلى بيان الثمن لأنه معلوم...قلت: ما فى النهر مبني على أن الثمن معلوم، لكنه على هذا لايكون من بيع المعدوم بل كلما أخذ شيئاً انعقد بيعاً بثمنه المعلوم قال فى الولو الجية: دفع دراهم إلى خباز، فقال: اشتريت منك مائة من خبز، وجعل يأخذ كل يوم خمسة أمناء فالبيع فاسد وماأكل فهو مكروه ، لأنه اشترى خبزاً غير مشار إليه ، فكان البيع مجهولاً ولو أعطاه الدراهم، وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة أمناء ولم يقل فى الابتداء اشتريت منك يجوز وهذا حلال وإن كان نيته وقت الدفع الشراء لأنه بمجرد النية لاينعقد البيع، وإنما ينعقد الآن بالتعاطي والآن المبيع معلوم فينعقد البيع صحيحاً،قلت: ووجهه أن ثمن الخبز معلوم فإذا انعقد بيعاً بالتعاطي وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله، فكذا إذا تأخر دفع الثمن بالأولىٰ ، وهذا ظاهر فيما كان ثمنه معلوماً وقت الأخذ مثل الخبز واللحم.(فتاوى الشامي:٤/٥١٦،سعيد).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

بیع الاستجرار یہ ہے کہ کوئی شخص دکاندار سے اپنی ضرورت کی اشیاء وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی کر کے لیتا رہے، اور ہر مرتبہ چیز لیتے وقت دونوں کے درمیان نہ تو ایجاب وقبول ہوتا ہے اور نہ ہی بھاؤ تاؤ ہوتا ہے۔

یعنی انسان دکاندار سے تھوڑی تھوڑی چیز لیتا رہے، اوران اشیاء کو استعمال کرنے کے بعد آخر میں ان کی قیمت کا حساب کر کے ادا کردے، جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان دکاندار کے ساتھ یہ سمجھوتہ کرلے کہ جب کبھی اس کے گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہوگی وہ اس کی دکان سے منگوالے گا، چنانچہ جب اس شخص کو اپنے گھر میں کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کی دکان سے منگوالیتا ہے، اور دکاندار اس کی مطلوبہ اشیاء ایجاب وقبول کے بغیر اور کسی بھاؤ تاؤ اور قیمت ذکر کیے بغیر اس کو دے دیتا ہے، اور وہ شخص اس چیز کو اپنی ضرورت میں استعمال کر لیتا ہے، اور پھر ایک ماہ کے اندر جتنی اشیاء وہ دکاندار سے لیتا ہے، مہینے کے آخر میں اس کا حساب ہو جاتا ہے، اور وہ شخص

یک مشت تمام اشیاء کی قیمت ادا کر دیتا ہے... متأخرین حنفیہ نے ''بیع الاستجرار'' کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اگر چہ دکاندار سے سامان لیتے وقت قیمت کا کوئی تذکرہ نہ ہو۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۲۳۳، ۲۳۷، بیع الاستجرار).

وللاستزادة، انظر: (البحر الرائق: ۲۵۹/۵، کوئٹہ۔ اسلام اور جدید معاشی مسائل، از مفتی محمد تقی صاحب، ۲۳۳/۳۔۲۵۱، بیع الاستجرار)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ماہنامہ کی خریداری میں پیشگی رقم ادا کرنے کا حکم:

سوال: میں ایک دینی رسالے کا خریدار ہو، اس کے لیے ایک سال کی پیشگی رقم جمع کرانی پڑتی ہے، بعض حضرات نے میرے دل میں شک ڈالا کہ یہ معدوم کی خرید ہے کیونکہ ابھی تک رسالے موجود نہیں بلکہ آئندہ ہر مہینے کا رسالہ چھپے گا، اس کے جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اگر اس کو بیع سلم قرار دیں تو بیع سلم میں مبیع کا بازار میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہونا ضروری ہے جب کہ آئندہ آنے والا رسالہ کسی جگہ موجود نہیں؟

الجواب: بیع سلم میں عقد کے وقت سے لیکر ادائیگی تک مسلم فیہ کا بازار میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہونا صرف حنفیہ کے نزدیک شرط ہے مذہب شافعیہ میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ مسلم فیہ کا محض وقتِ موعود پر پایا جانا کافی ہے، تو اس معاملہ میں ضرورت کی بنا پر مذہب شافعیہ پر عمل کرنے کی رخصت ہے، جیسا کہ علامہ تھانویؒ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں تصریح فرمائی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ''امداد الفتاویٰ'' میں ہے:

عقدِ سلم میں بیع کا وقت میعاد تک برابر پایا جانا حنفیہ کے نزدیک شرط ہے، اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو عقدِ سلم جائز نہیں ہوگا، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک صرف وقتِ میعاد پر پایا جانا کافی ہے، کذا فی الہدایۃ، تو اگر ضرورت میں اس قول پر عمل کر لیا جاوے تو کچھ ملامت نہیں رخصت ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۱۰۶/۳).

درس الہدایہ میں حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

موجودہ دور کی مشکلات کے پیشِ نظر فقہاء نے کہا کہ اگر ان مسائل میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائے تو گنجائش ہے تاکہ لوگوں کے اموال کو حرمت سے بچایا جا سکے۔ (درس الہدایہ ص ۳۲۹، شروط السلم).

لہذا ان حضرات کے قول کے مطابق صورتِ مسئولہ کو عقدِ سلم کہا جا سکتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ بالا بیع استجرار کے ساتھ مشابہ ہے، بیع استجرار یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوکاندار

سے مختلف اشیاء وزناً لیتا رہے اور استعمال کرتا رہے، پھر آخر میں حساب کر کے معاملہ صاف کر لے یہ جائز ہے، اور اس صورت کو جس میں پیشگی رقم دی گئی ہے اس کو قرض پر محمول کریں گے یعنی یہ اداشدہ رقم مدرسہ کے ذمہ قرض ہے، پھر جو رسالہ آتا رہے گا اس میں بطورِ تعاطی عقد منعقد ہوتا رہے گا۔

ملاحظہ فرمائیں:

وفي الدر المختار: مايستجره الإنسان من البياع إذا حاسبه على أثمانها بعد استهلاكها جاز استحساناً، وفي الشامية: قوله مايستجره الإنسان...الخ. ذكر في البحر: أن من شرائط المعقود عليه أن يكون موجوداً، فلم ينعقد بيع المعدوم ثم قال: ومما تسامحوا فيه، وأخرجوه عن هذه القاعدة مافي القنية الأشياء التي توخذ من البياع على وجه الخرج كما هو العادة من غير بيع كالعدس والملح والزيت ونحوها ثم اشتراها بعدما انعدمت صح. فيجوز بيع المعدوم هنا، وقال بعض الفضلاء: ليس هذا بيع معدوم إنما هو ضمان المتلفات بإذن مالكها عرفاً تسهيلاً للأمر ودفعاً للحرج كما هو العادة وفيه أن الضمان بالإذن ممالايعرف في كلام الفقهاء حموي، وفيه أيضاً أن ضمان المثليات بالمثل لا بالقيمة والقيميات بالقيمة لا بالثمن.

قلت: كل هذا قياس، وقد علمت أن المسألة استحسان...وخرجها في النهر على كون المأخوذ من العدس ونحوه بيعاً بالتعاطي، وأنه لايحتاج في مثله إلى بيان الثمن لأنه معلوم...قلت: ما في النهر مبني على أن الثمن معلوم، لكنه على هذا لايكون من بيع المعدوم بل كلما أخذ شيئاً انعقد بيعاً بثمنه المعلوم قال في الولوالجية: دفع دراهم إلى خباز، فقال: اشتريت منك مائة من خبز، وجعل يأخذ كل يوم خمسة أمناء فالبيع فاسد وماأكل فهو مكروه، لأنه اشترى خبزاً غير مشار إليه، فكان البيع مجهولاً ولو أعطاه الدراهم، وجعل يأخذ منه كل يوم خمسة أمناء ولم يقل في الابتداء اشتريت منك يجوز وهذا حلال وإن كان نيته وقت الدفع الشراء لأنه بمجرد النية لاينعقد البيع، وإنما ينعقد الآن بالتعاطي والآن المبيع معلوم فينعقد البيع صحيحاً،قلت: ووجهه أن ثمن الخبز معلوم فإذا انعقد بيعاً بالتعاطي وقت الأخذ مع دفع الثمن قبله، فكذا إذا تأخر دفع الثمن بالأولىٰ،

وهذا ظاهر فيما كان ثمنه معلوماً وقت الأخذ مثل الخبز واللحم. (فتاوى الشامي:٤/٥١٦،سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

وهذا إذا كان ثمن مايستجره معلوماً لدى المتبايعين بأن بيناه قبل الاستجرار، أو كان معلوماً عند كل الناس كالخبز واللحم، وأما إذا كان مجهولاً فلايصح تخريجه على بيع التعاطي كما لايخفى. (شرح المجلة لمحمدالاتاسی ،مادة ١٧٥، ٢/ ٤٠).

مؤطاامام مالک میں ہے:

ولا بأس بأن يضع الرجل عند الرجل درهماً ثم يأخذه منه بثلث أو بربع أوبكسر معلوم سلعة معلومة... (مؤطاامام مالکؒ ،ص ٥٩٠،باب جامع بيع الطعام).

شرح مجلّہ میں ہے:

ويصح البيع بالتعاطي في الخسيس والنفيس على ماهو المعتمد ويصح أيضاً ولوكان الإعطاء من أحد الجانبين فقط وبه يفتى وصورته أن يتفقا على الثمن ثم يأخذ المشتري المتاع ويذهب برضا صاحبه من غير أن يدفع الثمن أو أن يدفع المشترى الثمن للبائع ويذهب بدون قبض المبيع فإن البيع لازم على الصحيح...وفي الدرالمختار: مايستجره الإنسان من البياع كالزيت والعدس والملح وماشاكل إذا حاسبه على أثمانها بعد استهلاكهاجاز استحساناً. (شرح المجلة، المادة :١٧٥، ١/ ٨٠، لسليم رستم بازاللبنانی).

بحوث في قضايافقهية معاصرة میں ہے:

أما بيع الاستجرار فهو مأخوذ من قولهم: استجرالمال: إذا أخذه شيئاً فشيئاً، وهو في اصطلاح الفقهاء المتأخرين أن يأخذ الرجل من البياع الحاجات المتعددة شيئاً فشيئاً، دون أن يجرى بينهما مساومة أو إيجاب وقبول في كل مرة،

والاستجرار على نوعين : الأول: الاستجرار بثمن مؤخر .

والثاني: الاستجرار بمبلغ مقدم...

وأما النوع الثاني من الاستجرار، فهو أن المشتري يدفع إلى البائع مبلغاً مقدماً، ثم يستجر منه الأشياء، وتقع المحاسبة بعد أخذ مجموعة من الأشياء في نهاية الشهرأوفي نهاية السنة

مثلاً ... ویخرج علی هذا اشتراک المجلات الدوریة فإن العادة في عصرنا أن الناس یدفعون بدل الاشتراک السنوي في بدایة کل سنة إلی أصحاب هذه الدوریات وأنهم یبعثون إلیهم نشرة من المجلة فی کل شهر فبدل الاشتراک قرض مضمون عندهم، ویقع بیع کل عدد من المجلة عند ما تصل المجلة إلی المشتري، فلو انقطعت المجلة في أثناء السنة لزم علی أصحابها رد ما بقي من بدل الاشتراک. (بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة،١/٥٥،٦٦،٦٩،بیع الاستجرار).

(وکذا فی اسلام اور جدید معاشی مسائل:۳/۲۵۰-۲۳۱،وفتاوی عثمانی:۳/۱۱۲).

اس مسئلہ کی نظیر حضرت مولانا تھانویؒ نے امداد الفتاوی میں بھی ذکر فرمائی ہے۔ملاحظہ ہو:(امداد الفتاوی:۳/۱۳۲).

وللاستزادة : انظر: (ردالمحتار: ٤/٥١٦،سعید، والبحر الرائق: ٥/٢٥٩،والفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:٤/٤٧، بیع التعاطی والاستجرار،وغرر کی صورتیں،ص ٢٨٣-٢٩٥). **واللہ ﷻ اعلم۔**

قصائی کو پیشگی رقم دے کر گوشت لینے کا حکم:

سوال: مجھے گائے اور بھینس کے پائے بہت پسند ہیں، میں نے ایک قصائی کو پیشگی ایک ہزار روپے رقم دی کہ آپ مجھے روزانہ دس روپے کے حساب سے گائے یا بھینس کے پائے دیں گے،بعض حضرات اس کو شراء المعدوم کہہ کر ناجائز کہتے ہیں، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: یہ معاملہ جائز ہے حوالوں کی تفصیل سابقہ فتویٰ میں ملاحظہ کیجئے تکرار موجب طوالت ہے۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۲۲). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیع من یزید کا حکم:

سوال: فقہاء کے ہاں بیع من یزید جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جمہور فقہاء کے نزدیک بیع من یزید جائز ہے،البتہ امام اوزاعیؒ اور امام اسحاقؒ نے اس کو صرف مال غنیمت یا میراث کی فروخت میں جائز قرار دیا ہے،اور ابراہیم نخعیؒ نے مکروہ قرار دیا ہے۔نیز اس بیع کو بیع مزایدہ، نیلام، ہراج وغیرہ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن أنس بن مالک ﷺ أن رسـول الله صلى الله عليه و سلم باع حلساً وقدحاً وقال: مـن يشتري هذا الحلس و القدح ، فقال رجل: أخذتهما بدرهم ، فقال رسول الله صلى الله عـليـه وسلم: من يزيد على درهم فأعطاه رجل درهمين فباعها منه، هذا حديث حسن . (رواه الترمذی فی باب ماجاء فی بیع من یزید: ۱/ ۲۳۱).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ کا نیلام لگایا، ایک صاحب ایک درہم دینے کو تیار ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس سے زیادہ میں کون خریدنے کو تیار ہے؟ دوسرے صاحب نے کہا: میں دو درہم دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ان کو دیدیا۔

بدائع الصنائع میں ہے:

روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يستام الرجل على سوم أخيه،... والنهي لـمعنى في غير البيع وهو الإيذاء فكان نفس البيع مشروعاً فيجوز شراؤه ولكنه يكره، وهذا إذا جنـح البائع للبيع بالثمن الذي طلبه المشترى الأول فإن كان لم يجنح له فلا بأس للثاني أن يشتـريـه، لأن هـذا ليـس استيـامـاً على سوم أخيه فلا يدخل تحت النهي، ولانعدام معنى الإيـذاء أيـضاً، بل هو بيع من يزيد وأنه ليس بمكروه، لماروي أن رسول الله صلى الله عليه وسـلـم "بـاع قـدحاً وحلساً له ببيع من يزيد" وما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليبيع بيعاً مكروهاً . (بدائع الصنائع، کتاب البیوع ،فصل فی صفة البیع الذی یحصل به التفریق،۵/ ۲۳۲، سعید).

وللاستزادة انظر: (العنایة فی شرح الهدایة،فصل فیمایکره من البیوع،بهامش فتح القدیر: ۶/ ۴۷۹.وتبیین الحقائق: ۴/ ۶۷ ، دارالکتب الاسلامی، والدر المختار مع ردالمحتار: ۵/ ۱۰۲ ،باب البیع الفاسد،سعید.والمغنی لابن قدامة الحنبلی: ،فصل لایسوم الرجل علی سوم اخیه).

واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها،
عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال:
”من أعمر أرضاً ليست لأحد فهو أحق بها“،
قال عروة: قضى به عمر فی خلافته.
(بخاری شریف).

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:
من سبق إلى شيء لم يسبق إليه مسلم فهو أحق به“.
(ابوداود شریف).

باب......﴿۷﴾

بیع الحقوق کا بیان

باب......﴿۵﴾

بیع الحقوق کا بیان

حق شرب کوفروخت کرنے کا حکم:

سوال: نہر سے کھیت کو سیراب کرنے کے لیے پانی کی فروخت کا کیا حکم ہے؟ عام طور پر لوگ اس کو خریدتے ہیں، جب کی حدیث شریف: ''الناس شرکاء في ثلاث الماء و الکلأ و النار'' کے خلاف ہے؟

الجواب: کھیت وغیرہ میں جو پانی استعمال کیا جاتا ہے وہ عامۃً حکومت کی جانب سے فراہم کیا جاتا ہے اور حکومت اس پانی کو مختلف جگہوں سے جمع کر کے اپنے تالاب (reservoir) میں جمع کرتی ہے اس حوض کی قیمت لاکھوں سے متجاوز ہوتی ہے، پھر اس میں صرف اس صاف پانی کو رکھا جاتا ہے جس کو کیمیکلز (chemical) کے ذریعہ سے صاف کیا جاتا ہے، لہذا ان بنیادی وجوہات کی بنا پر اس پانی کو فروخت کرنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ علماء نے اس کی صراحت فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص پانی کو اپنے حوض میں جمع کرے اور وہ حوض مجصص ہو تو وہ پانی کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کو بیچ سکتا ہے۔

ملاحظہ فرمائے عالمگیری میں ہے:

وأما بيع ماء جمعه الإنسان في حوضه، ذكرشيخ الإسلام المعروف بـ خواهر زاده في شرح كتاب الشرب :إن الحوض إذا كان مجصصاً أوكان الحوض من نحاس أوصفر جازالبيع على كل حال وكأنه جعل صاحب الحوض محرز الماء بجعله في حوضه. (الفتاوى

الهندية،باب بيع الماء،۳/۱۲۱۔و كذافى المحيط البرهانى،فصل فيمايجوزومالايجوز،٦/٣٦٩).

بدائع الصنائع میں ہے:

وكذا السقاءون يبيعون المياه المحروزة في الظروف به جرت العادة فى الأمصار وفي سائر الأعصار من غير نكير فلم يحل لأحد أن يأخذ منه فيشرب من غيرإذنه. (بدائع الصنائع: كتاب الشرب،٦/١٨٨، سعيد).

لیکن جو پانی دریاؤں سے نہروں کی شکل میں نکالا جاتا ہے اس کے لیے کوئی ڈیم نہیں ہوتا جن کی کھودائی اورصفائی کاانتظام حکومت کرتی ہے اس پانی کا بیچنا بھی حکومت کے لیے جائزاوردرست ہے، نیز یہ بیع الشرب کے قبیل سے ہے اس کی بیع جائز ہے جب کے اس کی مقدار معلوم ہواور یہ بھی معلوم ہو کہ اس میں کتنا پانی بہے گا، اورمقدار معلوم نہ ہولیکن مفضی الی النزاع نہیں تو یہ تعامل کی وجہ سے جائز ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله ولابيع مسيل الماء، هذا أيضاً يحتمل بيع رقبة المسيل وبيع حق التسييل... وأما المسيل فمجهول لأنه لايدرى قدرما يشغله من الماء، قال فى الفتح: ومن هنا عرف أن المراد ما إذا لم يبين مقدار الطريق والمسيل، أما لو بين حد ما يسيل فيه الماء أوباع أرض المسيل من نهر أوغيره من غير اعتبارحق التسييل فهوجائزبعد أن يبين حدوده. (فتاوى الشامى:٥/٧٩، مطلب فى بيع المسيل، سعيد۔ وكذا فى فتح القدير:٦/٤٢٩،دارالفكر).

وفى العناية في شرح الهداية: بخلاف الشرب حيث يجوز بيعه تبعاً للأرض باتفاق الروايات، ومفرداً في رواية وهو اختيار مشايخ بلخ لأنه حظ من الماء لوجوب الضمان بالإتلاف فإن من سقى أرض نفسه بماء غيره يضمن، ولأن له حظاً من الثمن ذكره فى كتاب الشرب...وانما لم يجز بيع الشرب وحده في ظاهرالرواية للجهالة لاباعتبار أنه ليس بمال. (شرح العناية بهامش فتح القدير:٦/٤٢٨،دارالفكر).

وقال المحقق ابن همامؒ: جوزه مشايخ بلخؒ...لأن أهل بلخ تعاملوا ذلك لحاجتهم إليه، والقياس يترك بالتعامل كما جوز السلم للضرورة والاستصناع للتعامل. (فتح القدير:٦/٤٢٨،باب البيع الفاسد، دارالفكر).

مبسوط میں ہے:

قال وكان شيخنا الإمام يحكي عن أستاذه أنه كان يفتي بجواز بيع الشرب بدون الأرض ويقول فيه عرف ظاهر في ديارنا بنسف فإنهم يبيعون الماء فللعرف الظاهر كان يفتي بجوازه. (المبسوط للامام السرخسیؒ:١٣٦/١٤،باب الشفعة فی الارضین والانهار،ادارة القرآن۔وکذا فی ١٧١/٢٣).

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

بيع الشرب تبعاً للأرض جائز، مقصوداً كذلك في رواية، وبه أخذ مشايخ بلخؒ.

(الفتاوی السراجية،ص:٤١٥،کتاب البيوع باب مايجوز بيعه ومالا يجوز).

مزید ملاحظہ ہو: (شرح المجلة ،لمحمدخالدالاتاسی،١٢١/٢۔وجدید فقہی مباحث،جلدِسوم).

اشکال اور جواب:

اشکال: لیکن اگر کوئی اشکال کرے کہ تعامل کی وجہ سے تو قیاس چھوڑا جاتا ہے لیکن نص وحدیث نہیں چھوڑی جاتی، یہاں تو ممانعت کی نص موجود ہے اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: اس کے جواب کی طرف صاحبِ ہدایہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ بیع الماء نہیں ہے بلکہ بیع حظ الماء ہے، یعنی پانی کا ایک حصہ الگ کیا جاتا ہے اور اس کے لیے انتظام اور کھودائی کی جاتی ہے اور ایک پائپ لگایا جاتا ہے پھر اس پائپ کا معاوضہ لیا جاتا ہے تو یہ پانی خود بخود جمع نہیں ہوا بلکہ اس کے لیے انتظام کیا گیا ہے تو یہ نہری انتظام کے حق کا عوض لیا گیا ہے جو کہ جائز ہے حدیث شریف سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

گڈوِل اور ٹریڈ مارک فروخت کرنے کا حکم:

سوال: کیا شریعت میں تجارتی نام (Goodwill) اور تجارتی علامت (Trade mark) کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عصرِ حاضر میں تجارتی ترقی کے ساتھ تجارتی نام اور تجارتی علامت کا مسئلہ پیدا ہوا، ایک تاجر یا ایک کمپنی مال تیار کرتی ہے اور تیار کردہ مال پر اپنا نام اور علامت لگاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بازار میں پہچانا جائے کہ یہ فلاں کمپنی کا مال ہے اور اس کی وجہ سے رغبت وشہرت پیدا ہوتی ہے، اور عمدہ مال تیار کرنے کی وجہ

سے رفتہ رفتہ وہ کمپنی ایک مقام حاصل کرلیتی ہے، پھر جب سے عام لوگوں کے دھوکہ کھانے کا مسئلہ پیدا ہوا تو حکومت کی جانب سے ٹریڈ مارک اور گوڈول کا رجسٹریشن ہونے لگا اور تاجروں کو دوسروں کے رجسٹرڈ کرائے ہوئے ناموں اور علامتوں کو استعمال کرنے سے منع کردیا گیا، اگر دوسرے لوگ اس نام کو استعمال کریں تو کاروباری اعتبار سے یہ بہت بڑا اغرار اور خدع ہے اور خریداروں کے ساتھ دھوکہ ہے، شریعتِ مطہرہ کے قانونی معاملات میں ایک اہم قانون یہ ہے کہ ایسا کوئی بھی کام نہ کیا جائے جو دوسروں کے لیے دھوکہ دہی کا باعث ہو، اس لیے رجسٹریشن کرانا عین مطابق شرع ہے، پھر چونکہ یہ ایک حق محفوظ ہے اور اس کی شہرت کی وجہ سے اس سے معاشی مفاد بھی وابستہ ہو گیا ہے، اس لیے اس کو مال کے حکم میں قرار دیتے ہوئے اس کی خرید وفروخت کی اجازت دی جائیگی۔

فقہاء نے مال کی مختلف تعریفات بیان فرمائی ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

المراد بالمال ما يميل إليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة، والمالية تثبت بتمول الناس كافة أوبعضهم والتقوم يثبت بها وبإباحة الانتفاع به شرعاً...وفي البحر عن الحاوي القدسي: المال اسم لغير الآدمي خلق لمصالح الآدمي، وأمكن إحرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار. (فتاوى الشامي: ٤/١٠٥، مطلب في تعريف المال، سعيد).

مجمع الانہر کے حاشیہ میں ہے:

والمراد بالمال عين يجري فيه التنافس والابتذال. (الدرر المنتقى بهامش مجمع الانهر: ٢/٣).

علامہ ابوبکر کاسانیؒ فرماتے ہیں:

منها أن يكون مالاً...وسواء كان المال عيناً أومنفعة عند عامة العلماء. (بدائع الصنائع: ٧/٣٥٢، كتاب الوصايا، سعيد۔و كذا في كتاب الصلح، ٦/٤٢، سعيد).

مذکورہ بالا عبارت میں ملک العلماء علامہ ابوبکر کاسانیؒ نے منفعت کو بھی مال تسلیم کیا ہے۔

شیخ مصطفیٰ زرقا نے مال کی تعریف میں بہت زیادہ تعمیم سے کام لیا ہے۔ملاحظہ ہو:

والتعريف الصحيح يمكن أن يستنبط من مجموع ماذكره الفقهاء عن المال

وخصائصه في مختلف المناسبات، فقد قالوا: إن المال اسم لغير الآدمي...الخ. (المدخل الفقهي العام:۳/ ۱۱۵).

شیخ مصطفیٰ زرقا نے فرمایا: فقہاء کے تمام اقوال کو پیش نظر رکھ کر، نیز مختلف مواقع پر ذکر کردہ اس کی خصوصیات کو مدِنظر رکھ کر مال کی صحیح تعریف کی جائے تو یہ کہا جائیگا کہ: مال نام ہے انسان کے ماسوا تمام چیزوں کا۔

مولانا خالد سیف اللہ فرماتے ہیں کہ مال ہونے کے لیے تین بنیادی عناصر ہیں: (۱) اول یہ ہے وہ شرعاً مباح ہو۔ (۲) دوسرا یہ ہے کہ وہ شئی قابل انتفاع ہو۔ (۳) تیسرا عنصر یہ ہے کہ عرف میں جس شئی کی خرید وفروخت مروج ہوجائے وہ مال ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فقہ کے چاروں دبستان اس پر متفق ہیں۔
(جدید فقہی مسائل:۴/۱۷۱).

حقوق اوران کی خرید وفروخت میں مولانا عمر عابدین قاسمی لکھتے ہیں:

پس اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ: (۱) جمہور کے نزدیک مال کے علاوہ منافع اور حقوق کی بھی خرید وفروخت ہوسکتی ہے۔

(۲) اگر بیع کے لیے مال ہونا ہی ضروری ہو تو فقہاء کی عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مال میں حقوق ومنافع بھی شامل ہیں، یہ نہ صرف ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے، بلکہ حنفیہ کے یہاں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو: (فتح القدير:٦/ ٤٢٩، بيع الطريق وهبته...، دار الفكر۔ والدر المختار:٤/ ١٣٢، سعيد۔ وفتاوى الشامي:٥/ ٨٠، وصح بيع حق المرور...الخ، سعيد۔ والعناية بهامش فتح القدير:٦/ ٤٢٩، دار الفكر۔ والفتاوى الهندية: ٣/ ١٣١، ٦/ ٢٩٤۔ وتبيين الحقائق:٤/ ٥٢، ملتان۔ ومنحة الخالق :٥/ ٢٣٤۔٢٣٥، كوئٹه).

(۳) کسی شئی کے مال ہونے میں عرف ورواج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

(۴) قابل ادخار ہونے کی کوئی ایک ہی صورت متعین نہیں، کسی چیز کا قانونی طور پر محفوظ ہوجانا بھی قابل ادخار ہونے کے لیے کافی ہے۔ (حقوق اوران کی خرید وفروخت، از مولانا عمر عابدین قاسمی، ص ۱۴۱).

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام ''عطرستان'' یا ''گلشن ادب'' رکھ لیا اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہوگیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق

نہیں رہا اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ:۳/۱۲۰)۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

حقوق کی بیع درج ذیل شرطوں کے ساتھ جائز ہونی چاہئے:۔

(۱) وہ حق فی الحال ثابت ہو مستقبل میں متوقع نہ ہو۔

(۲) وہ حق صاحب حق کے لیے اصالۃً ثابت ہو، جیسے قصاص اور میراث، وغیرہ، محض دفع ضرر کے لیے ثابت نہ ہو جیسے حق شفعہ، خیارِ مخیّرہ وغیرہ۔

(۳) وہ حق دوسرے کی طرف منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(۴) قابل تحدید یعنی غرر یا جہالت کو مستلزم نہ ہو۔

(۵) تاجروں کے عرف میں لین دین کے سلسلہ میں اس حق کو اموال واعیان کی حیثیت حاصل ہو۔ (فقہی مقالات:۱/۱۹۲)۔

بعض متاخرین علماء فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ خرید وفروخت کی بجائے دستبرداری پر عوض لے لیا جائے۔ اور انہوں نے اس مسئلہ کو نزول عن الوظائف والے مسئلہ پر قیاس فرمایا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وفي الأشباه : لايجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة كحق الشفعة ، وعلى هذا لايجوز الاعتياض عن الوظائف بالأوقاف، وفيها في آخر بحث تعارض العرف مع اللغة : المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، لكن أفتى كثير باعتباره ، وعليه فيفتى بجواز النزول عن الوظائف بمال. (الدرالمختار:٤/٥١٨، ٥١٩، سعيد۔ وكذا في الاشباه :١/٢٨٦)۔

وفي "الفقه الحنفي في ثوبه الجديد": فالسوال الآن : هل يجوز بيع الاسم التجاري أو العلامة التجارية؟

وظاهر أن الاسم والعلامة ليس عيناً مادياً، وإنما هوعبارة عن حق استعمال هذا الاسم أو العلامة ، وهذا الحق ثبت لصاحبه إصالة بحكم الأسبقية والتسجيل الحكومي، وهو حق ثابت في الحال، وليس متوقعاً في المستقبل ، وهوحق يقبل الانتقال إلى آخر،

ولكنه ليس حقاً ثابتاً في عين قائمة ،فعلى ضوء القواعد التي استخلصناها من كلام الفقهاء ينبغي أن يجوز الاعتياض عنه عن طريق التنازل دون البيع . وبهذا أفتى شيخ مشايخنا العلامة أشرف علي التهانويؒ وقاسه على مسألة النزول عن الوظائف بمال، وحكى فيه عبارة ابن عابدينؒ التي نقلها في مسألة النزول عن الوظائف. (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید: ٤/٣٧، بیع الاسم التجاری و العلامة التجارية،دمشق).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

اور کارخانے کا نام بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ ثابت علی الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کے لیے، اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں، اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس عوض کے دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، گو لینے والے کے لیے خلافِ تقویٰ ہے، مگر ضرورت میں اس کی بھی اجازت ہو جائے گی۔ (امداد الفتاویٰ:۳/۱۱۹)۔

صاحب ہدایہ کی ایک عبارت سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

وإذا أقعد الخياط أو الصباغ في حانوته من يطرح عليه العمل بالنصف فهو جائز لأن هذه شركة الوجوه في الحقيقة فهذا (الخياط أو الصباغ) بوجاهته يقبل (أى العمل من الناس) وهذا (أى من يطرح عليه العمل) بحذاقته يعمل فينتظم بذلک المصلحة فلاتضره الجهالة فيمايحصل. (الهداية:٣/٣١٧، كتاب الاجارة).

یعنی جس طرح وجاہت شہرت اور رغبت کا ذریعہ ہے جس کے عوض میں اجرت یعنی مال لینا جائز ہے، اسی طرح تجارتی علامت و تجارتی نام بھی ایک شہرت اور رغبت کا ذریعہ ہے، لہذا اس کے عوض بھی مال لینا جائز ہونا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی علامت (ٹریڈ مارک) اور تجارتی نام (گوڈول) جب کہ حکومت کی طرف سے باقاعدہ رجسٹرڈ ہو تو اس کی خرید و فروخت یا اس کا عوض لینا دونوں طرح جائز اور درست ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مسائل:۴/ مال کی حقیقت اور حقوق کی خرید و فروخت، از ۱۵۷ تا ۱۹۰۔ وجدید فقہی مباحث: ج۳۔ وفقہی مقالات، حقوق مجردہ کی خرید و فروخت، ۱/۱۵۹ تا ۲۲۸۔ ورسالہ حقوق اور ان کی خرید و فروخت، از مولانا عمر عابدین قاسمی۔ ونظام الفتاویٰ:۲/۳۱۴۔ وفتاویٰ حقانیہ:٦/٦٧)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حق سکنی (پگڑی) کی شرعی حیثیت:

سوال: صاحبِ ہدایہؒ نے بیع حق المرور کو جائز قرار دیا ہے اور بیع حق السکنی یا حق سکنی کے عوض لینے کو ہدایہ کے حاشیہ میں ناجائز کہا ہے، جب کہ آج کل بیع حق السکنی عام ہے، تو کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: پگڑی بھی حقوق ومنافع کی خرید وفروخت کی ایک قسم ہے، اس کا رواج اب تو شہر سے گاؤں تک ہو چکا ہے، خصوصیت سے بڑے اور مرکزی شہروں میں اس کا چلن خوب ہے، بعض علاقوں میں اسے ''سلامی'' بھی کہتے ہیں، عربی زبان میں اس کے لیے ''جلسۃ'' اور زیادہ تر ''خلو'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

کسی مکان یا دوکان کو جب کرایہ پر دیا جاتا ہے تو مالک مکان ودکان کرایہ دار سے ماہانہ اجرت کے سوا کچھ رقم یک مشت حاصل کرتا ہے، اس رقم کی ادائیگی کے بعد کرایہ دار اس بات کا حقدار ہو جاتا ہے کہ وہ تا حیات اس میں رہے۔

کرایہ دار کے لیے بھی ایک دشواری تھی کہ اچانک مکان یا دوکان کو واپس کرنا بعض اوقات اس کے لیے باعث مشقت ہو سکتا تھا، مثلاً کسی نے کرایہ کی عمارت میں دکان لگائی کاروبار جم گیا، اب اگر مالکِ دوکان اسے خالی کرنے کا مطالبہ کرے تو یہ صورتِ حال اس کے لیے بڑی آزمائش بن جاتی ہے اور اس معاشی نقصان کی تلافی شاید ممکن نہ ہو۔

قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ فرماتے ہیں:

اگر عرف کی خاموش زبان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو اس کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس مالک نے کرایہ پر لگاتے وقت پگڑی لی، اس نے گویا اپنا حق مالکانہ برقرار رکھتے ہوئے حق سکونت فروخت کر دیا، اور یہ حق کرایہ دار کا ایسا حق ہے جو اس سے مالک مکان چھین نہیں سکتا، کرایہ دار کے وارثوں میں بھی یہ حق منتقل ہوگا، اور کرایہ دار اس حق کو فروخت بھی کر سکتا ہے۔ (مجلّہ فقہ اسلامی: ۱/۸۲، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ کا نقطہ نظر بھی جواز کی طرف ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ سلطان غوری نے ''غوریہ'' میں ''جملون'' کی دوکانوں کی خود تعمیر کی اور پھر تجار کو حق خلو کے ساتھ سکونت عطا کی اور ہر دوکان کے لیے ایک مقدار مقرر کر دی جس کو سلطان نے ان سے وصول کیا اور وقف کی دستاویز میں اس کو لکھ دیا۔

ملاحظہ ہو ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

والحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، ولكن أفتى كثير من المشايخ

باعتباره، فأقول على اعتباره: ينبغي أن يفتى بأن مايقع في بعض أسواق القاهرة من خلو الحوانيت لازم، ويصير الخلو في الحانوت حقاً له، فلايملك صاحب الحانوت إخراجه منها، ولا إجارتها لغيره، ولو كانت وقفاً وقد وقع في حوانيت الجملون بالغورية أن السلطان الغوري لما بناها أسكنها للتجار بالخلو، وجعل لكل حانوت قدراً أخذه منهم، وكتب ذلك بمكتوب الوقف. (الاشباه و النظائر:۱/۲۸۶-۲۹۱،تحت القاعدة : العادة محكمة،ادارة القرآن-وكذا في فتاوى الشامي:۴/۵۲۱،مطلب في خلو الحوانيت،سعيد).

وفي ردالمحتار: قال البدر القرافي من المالكية : إنه لم يقع في كلام الفقهاء التعرض لهذه المسألة ، وإنمافيها فتيا للعلامة ناصرالدين اللقاني المالكي بناها على العرف وخرجها عليه وهو من أهل الترجيح فيعتبر تخريجه، وإن نوزع فيه وقد انتشرت فتياه في المشارق والمغارب وتلقاها علماء عصره بالقبول...وفي الخيرية (للشيخ الرملي الحنفي ما يفيد أن الخلاف في هذه المسألة معتبر يعني خلاف الذي أفتى به من المالكية وهوالشيخ ناصر الدين اللقاني ومن تابعه) قال: ليقع اليقين بارتفاع الخلاف بالحكم حيث استوفى شرائطه من مالكي يراه أوغيره صح ولزم وارتفع الخلاف خصوصاً فيما للناس إليه ضرورة لاسيما في المدن المشهورة كمصر ومدينة الملك(إستانبول)فإنهم يتعاطونه ولهم فيه نفع كلي ويضر بهم نقضه وإعدامه...ألاترى مافعله الغوري كمامر...وممن أفتى بلزوم الخلو الذي يكون بمقابلة دراهم يدفعها للمتولي أوالمالك العلامة عبد الرحمن آفندي العمادي صاحب هدية ابن العماد، وقال فلا يملك صاحب الحانوت إخراجه ولاإجارتها لغيره مالم يدفع له المبلغ المرقوم، فيفتى بجواز ذلك للضرورة قياساً على بيع الوفاء الذي تعارفه المتاخرون احتيالاً على الربا. (فتاوى الشامي:۴/۵۲۱،۵۲۲،۱۲۳،ملخصاً،سعيد).

چند شبہات اوران کے جوابات:

(۱) بعض فقہاء نے ناجائز قرار دیا ہے،اوراس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ مال نہیں ہے اورغیر مال یعنی حقوق کاعوض لیناجائز نہیں ہے، نیز اس میں منفعت کاحصول بھی ممکن نہیں ہے،اس وجہ سے ناجائز ہے۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ مال ہونے نہ ہونے میں عرف وتعامل کابڑادخل ہے،عرف ہی کی بناپرشی کوتقوم

حاصل ہوتا ہے اور منتفع بہ بنتی ہے، جس کی نظائر کتب فقہ کثیر تعداد میں موجود ہیں، لہٰذا فی زماننا حقوق کو قیمتی سرمایہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، اور اس کے عوض مال لینے کا عام رواج ہے، اس بناپر اس کو مال قرار دیتے ہوئے ان کے مقابلہ میں عوض لینا یا خرید وفروخت کرنا جائز ہوگا۔

شرح مجلّہ میں مرقوم ہے:

إن البيع مبادلة المال بالمال، وليست الحقوق المجردة مالاً متقوماً حتى يصح بيعها، وإنما هو نزول عن ذلك الحق الثابت له للغيربمال معلوم، أفتى بعض المتاخرين من العلماء بجوازه ، فمنهم من استند في جوازه إلى أنه قد تعورف ذلك في بعض البلدان، والعرف الخاص قد اعتبره كثيرمن العلماء ، ومنهم من استند فی ذلک إلی إلحاقه بنظائره المنصوص على جواز أخذ البدل فيها كحق القصاص وحق النكاح وحق الرق فإنه قد جاز أخذ البدل فيها مع أنهما حقوق فألحق بها النزول عن الوظائف. (شرح المجلة:۲/ ۱۲۰،تتمة).

وفی العرف والعادة فی رأي الفقهاء : والذي يشهد له إطلاق أدلة الشرع أن المنافع قسم من المال، ثم ذكربعد أسطر:

والحاصل أن كل مالاينتفع به فليس بمال، أما مايجري فيه البذل والمنع وينتفع به ولوبحسب المآل فإنه يصح بيعه متى قومه الشرع وأباح الانتفاع به، ولهذا جوزوا بيع النحل ودود القز والعلق مع أنها من الهوام للانتفاع بها...ومن هذا يتبين أن مقايس المالية تعارف الناس أن هذا الشيء مرغوب فيه ومنتفع به أوعدم تعارفهم، ذلک ولاريب أن هذا أمر يتجدد على مر العصور واختلاف الأمكنة، فكثير من الأشياء لم تكن له فی القديم فائدة فكان محقراً بين الناس...ثم تموله الناس وقابلوه بالأثمان، وكثيراً مانرى الشيء في مكان تافهاً لاينتفع به ولاقيمة له وفي مكان آخر من العزة والنفاسة بمقدار، ثم أن العرف العام والخاص في تعريف المالية سواء ولهذا قال البخاري في كشف الأسرار: وتثبت المالية بتمول الناس كافة أو بتمويله البعض، وهذا لأن العرف المثبت للمالية من العرف الذي يرجع إليه في تطبيق الأحكام الكلية. (العرف والعادة ،للاستاذ احمدابوسنة،ص ۱۸۰،۱۸۱).

(۲) شفیع حق شفعہ سے دستبرداری کا عوض نہیں لے سکتا، اسی طرح پگڑی کا حکم ہونا چاہئے؟

الجواب: پگڑی کے مسئلہ کو حق شفعہ پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں، بعض وہ ہیں جو صاحب حق کو ضرر ونقصان سے بچانے کے لیے دئے جاتے ہیں، حق شفعہ اس قبیل سے ہے، ایسے حقوق کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ ان سے دستبرداری کا عوض لینا درست نہیں ہے، اور بعض حقوق وہ ہیں جو اصحاب حقوق کو بر وصلہ کے طور پر فراہم کیے جاتے ہیں، ان کا عوض لیا جا سکتا ہے، جیسے حق نکاح کے عوض بدل خلع، اور بدل خلو (پگڑی) بھی اسی قبیل سے ہے۔ (اس کی مزید تفصیل آئندہ مسئلہ میں ذکر کی جائیگی، ان شاء اللہ)۔

(۳) بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ بدل خلو اپنی حقیقت کے اعتبار سے رشوت ہے، جس کا حرام ہونا ظاہر ہے۔

الجواب: لیکن غور کیا جائے تو اس کو رشوت قرار دینا محل نظر معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ رشوت ایسی رقم ہے جو کسی حق کے مقابلہ میں نہ ہو، اور یہاں پگڑی کی رقم خلو کے عوض میں لی جاتی ہے، اس لیے یہ ناحق وصول کی جانے والی رقم نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ تفصیلی کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وهذا كلام وجيه لايخفى على نبيه وبه اندفع ماذكره بعض محشي الاشباه من أن المال الذي يأخذه النازل عن الوظيفة رشوة، وهي حرام بالنص، والعرف لايعارض النص وجه الدفع ماعلمت من أنه صلح عن حق كمافي نظائره والرشوة لاتكون بحق. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢٠، سعيد).

اس سلسلہ میں ایک نظیر سیدنا حضرت حسینؓ کا عمل بھی ہے، کہ انہوں نے اپنے جائز حق خلافت سے حضرت معاویہؓ کے حق میں دستبرداری کا عوض خصوصی وظیفہ کی شکل میں لیا تھا۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

واستدل بعضهم للجواز بنزول سيدنا الحسن بن سيدناعلي رضي الله تعالىٰ عنهما عن الخلافة لمعاوية رضي الله تعالىٰ عنه على عوض، وهوظاهر أيضاً وهذا أولىٰ من عدم الجواز. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢٠، سعيد).

مذکورہ بالا عبارات کی بنا پر اس کو رشوت کہنا درست نہیں۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ الشامی: ۴/ ۵۱۹، ۵۲۰، سعید۔ وحقوق اور ان کی خرید وفروخت، ص ۱۹۴-۲۰۳)۔

(۴) بعض حضرات یہ اشکال کرتے ہیں کہ جب یک مشت رقم حاصل کرلی اور یہ رقم حق سکونت وحق انتفاع کے عوض ہے تو پھر ماہانہ کرایہ کس چیز کا وصول کیا جاتا ہے، اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: مالکِ دکان بحثیت مالک ہونے کہ اپنی دکان کبھی بھی واپس لے سکتا ہے، لیکن یک مشت رقم حاصل کرلینے کی وجہ سے واپس لینے کا حق دائماً یا موقتاً ختم ہوگیا، پھر چونکہ زمین اور دکان اس کی ملکیت میں ہے اس وجہ سے اپنی ملکیت سے انتفاع کا کرایہ حاصل کرتا ہے، لہذا اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل میں ہے:

اگر کوئی مکان یا دوکان کرایہ پر دیا جائے اور مالکِ مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالکِ مکان نے بحثیت مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کرلیا ہے، یہ رقم اس کے لیے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی، آئندہ اگر مالکِ مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کا عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہوجائیں مالک مکان سے وصول کرے اور اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہوسکتا ہے۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۱۵۳). واللہ ﷻ اعلم۔

حق خیار کو فروخت کرنے کا حکم:

سوال: حق خیار کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ نیز حق متقرر اور غیر متقرر میں کیا فرق ہے؟

الجواب: حق خیار کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

قال في الهداية: إن الخيار ليس إلا مشيئة وإرادة لايتصور انتقاله. (الهداية:۳/۳۲).

قوله لايجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة عن الملك قال في البدائع الحقوق المجردة لايحتمل التمليك و لايجوز الصلح عنها ... قوله كحق الشفعة ... و لو صالح المخيرة بمال لتختاره بطل و لاشيء لها. (ردالمحتار:٤/٥١٨، سعيد).

فقہاء نے حق متقرر اور حق غیر متقرر میں فرق کیا ہے کہ حق متقرر کا عوض لے سکتے ہیں، اور حق غیر متقرر کا عوض نہیں لے سکتے، جس عورت کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا خیار حاصل ہوا گر وہ اس کا عوض لے تو یہ بیوی

حسب سابق بیوی رہے گی، اور اسی کو حق غیر متقرر کہتے ہیں کہ عوض لینے کے بعد سابقہ حالت نہ بدلے، حق قصاص کا عوض لے سکتے ہیں، کیونکہ قصاص حق متقرر ہے عوض سے پہلے قاتل مباح الدم تھا اور عوض کے بعد محفوظ الدم بن گیا، نیز حق متقرر کا ایک مطلب حق المالک فی ملکہ ہے، اور خیار کا حق اپنی ملکیت میں نہیں ہوتا، ہدایہ میں ہے:

لأن حق الشفعة ليس بحق متقرر في المحل بل هو مجرد حق التملك فلا يصح الاعتياض عنه . (الهداية:٤/٤٠٦،باب ماتبطل به الشفعة).

ہدایہ کے حاشیہ میں اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

ليس بحق متقرر كحق الاصطياد في الصيد والحق المتقرر كالملك في المملوك.

(حاشية الهداية:٤/٤٠٦،رقم الحاشية،٦).

صاحبِ عنایہ علامہ اکمل الدین بابرتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

والفاصل بين الحق المتقرر وغيره أن ما يتغير بالصلح عما قبله فهو متقرر وغيره غير متقرر واعتبر ذلك في الشفعة والقصاص، فإن نفس القاتل كانت مباحة في حق من له القصاص، وبالصلح حصل له العصمة في دمه فكان حقاً متقرراً وأما في الشفعة فإن المشتري يملك الدار قبل الصلح وبعده على وجه واحد فلم يكن حقاً متقرراً. (شرح العناية بهامش فتح القدير:٩/٤١٦، مايبطل به الشفعة،دار الفكر).

شرح مجلّہ میں ہے:

عدم جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة ليس على إطلاقه، بل فيه التفصيل: وهو أن ذلك الحق المجرد إن كان الشرع جعله لصاحبه لأجل رفع الضرر عنه، كحق الشفعة، وحق القسم للزوجة، وحق الخيار للمخيرة، فالاعتياض عنه بمال لا يجوز، لأن حق الشفعة للشفيع، وحق القسم للزوجة، وكذا حق الخيار في النكاح للمخيرة، إنما ثبت لدفع الضرر عن الشفيع والمرأة، وما ثبت لذلك لا يصح الصلح عنه، لأن صاحب الحق لما رضي علم أنه لا يتضرر بذلك، فلا يستحق شيئاً وإن كان ذلك الحق قد ثبت لصاحبه أصالةً لا على وجه رفع الضرر كالوظيفة في وقف من إمامة وخطابة وأذان وفراشة وبوابة، فإن صاحبها قد ثبت له هذا الحق بتقرير القاضي على وجه الأصالة، لا لأجل رفع ضرر عن صاحبه، فينبغي أن

یصح الاعتیاض عن تلک الوظیفة بمال یأخذه الفارغ، وهو صاحب الوظیفة، من المفروغ له، لأنه صلح عن حق إلحاقاً له بالاعتیاض عن القصاص بمال، وبالاعتیاض عن النکاح بمال، وما أشبه ذلک. (شرح المجلة للاتاسی:۲/۱۱۹،۱۲۰).

مزید ملاحظہ ہو: (ردالمحتار:۴/۵۱۸،۵۲۰،مطلب لایجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردة، سعید۔ وحاشیة الطحطاوی علی الدرالمختار:۳/۹،کویته۔ وعطر ہدایہ،ص۳۳۲۔فقہی مقالات:۱/۱۶۳۔جدید فقہی مسائل:۴/۱۷۶۔وجدید فقہی مباحث،جلدِ سوم۔وحقوق اوران کی خرید وفروخت،ص۱۴۷). واللہ ﷻ اعلم۔

حق تصنیف پر معاوضہ لینے کا حکم:

سوال: حق تصنیف پر معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟عام طور پر اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

(۱)ناشر یا مطبع کسی موضوع پر کام کا پروجکٹ تیار کرے اور اس کے لیے اسکالرز کی خدمات حاصل کرے، نیز ان کا کوئی معاوضہ طے کر دیا جائے، جو اس تصنیف وتالیف،ترتیب وتحقیق یا کسی علمی کام کے بدلے دیا جائے، یہ طریقہ زیادہ تر بین الاقوامی شہرت یافتہ مطابع اور ناشرین کے درمیان مروج ہے۔

(۲)مصنف کتاب کا حق اشاعت ناشر کو دیدے،البتہ ان کے درمیان یہ معاہدہ طے پائے کہ کتاب کے ہر نئے ایڈیشن کی طباعت پر ناشر ایک متعینہ رقم مصنف کو ادا کیا کرے گا،اس کو رائلٹی (Royalty) کہتے ہیں۔

(۳)مصنف ہمیشہ کے لیے کتاب کا حق اشاعت ناشر یا مطبع کے ہاتھوں خطیر رقم کے عوض فروخت کر دیتا ہے، اس طرح کتاب کی طباعت واشاعت کے تمام حقوق مصنف کے بجائے ناشر یا مطبع سے وابستہ ہو جاتے ہیں،البتہ ان صورتوں میں ناشر اخلاقاً اور قانوناً اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ اصل کتاب میں کسی بھی قسم کی تبدیلی اور حذف واضافہ سے گریز کرے۔ان صورتوں میں سے شرعاً کونسی جائز ہے اور کون سی ناجائز؟

الجواب: حق تصنیف پر معاوضہ لینا جائز ہے۔سوال میں ذکر کردہ صورتوں میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے،اس کا حکم وہی ہے جو امامت اور درس وتدریس کے معاوضہ کا ہے، نیز وہ تصنیف ناشر یا مطبع کی ملکیت ہوگی کیونکہ اس نے اس عمل کی اجرت ادا کی ہے۔

(۲)اور(۳) کے بارے میں پہلے اہل علم کا اختلاف رہا ہے ابتداءً اکثر علماء اسے ناجائز کہتے تھے،مگر فی زمانناز یادہ تر علماء کا رجحان جواز کی طرف ہے اور عام طور پر حق تصنیف وتالیف کو درج ذیل وجوہات کی بناپر

مصنف کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

(۱) موجودہ عرف میں ''حق تالیف'' وغیرہ کے ساتھ مال جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، بازار میں اس کی خرید وفروخت اعلیٰ پیمانے پر رائج ہے۔ اور کسی شی کو مال شمار کرنے کے لیے لوگوں کے تعامل کا بڑا دخل ہے، جس کی تفصیلات گزر چکی۔

(۲) فقہاء نے قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم پر اجرت لینے کی اجازت دی ہے، اور اس کی جو علت بیان کی ہے وہ یہاں بھی پائی جاتی ہے، مثلاً مصلحت کی بنیاد پر کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ متاثر ہو جائے گا، اسی طرح اگر بیش بہا محنت ومشقت کے باوجود یہ حق مصنف کو نہ دیا جائے، تو اس کی حوصلہ شکنی ہوگی، کیونکہ مصنف اس کام میں اپنا اچھا خاصا وقت اور دماغی وفکری طاقت صرف کرتا ہے، نیز دین کی حفاظت واشاعت اور تحقیق کا کام بھی متاثر ہو سکتا ہے، پس یہ ایسی مصلحت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) یہ حق اسبقیت ہے جو کہ شریعت کی نگاہ میں معتبر ہے۔ ابوداود شریف کی روایت میں ہے: ''**من سبق إلى ما لم يسبقه إليه مسلم فهو له**''. (رواه البيهقي في سننه الكبرى: ٦/ ١٤٢، كتاب احياء الموات۔ وابوداود: ٢/ ٤٣٧، باب في اقطاع الارضين).

(۴) کسی شی کو مال قرار دینے کے لیے اس کا قابل احراز یعنی حفاظت کیے جانے کے لائق ہونا ضروری ہے، اور مذکورہ حقوق کا احراز قانونی طور پر رجسٹری کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔

(۵) مال کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ قابل انتفاع ہو، اور اس حق سے وافر مقدار میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

(۶) ان حقوق کو قانونی حیثیت دینے کے لیے محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ سرمایہ بھی خرچ کرنا پڑتا ہے لہذا ان کو کسب کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

مزید ملاحظہ ہو: (حقوق اور ان کی خرید وفروخت، ص ۲۰۸۔۲۱۵۔ وجدید فقہی مسائل: ۴/ ۱۷۸۔۱۸۴۔ فقہی مقالات: ۱/ ۲۲۳۔۲۲۷۔ وعطر ہدایہ، ص ۳۴۳۔۳۴۴۔ وجدید فقہی مباحث، جلدِ سوم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہر نئی طباعت پر عوض لینے کا حکم:

سوال: ایک مؤلف نے اپنی کتاب ایک طابع کو چھاپنے کے لیے دی اور اس کے ساتھ شرط لگائی کہ

آپ کتاب کی طباعت کے بعد ہمیں ڈھائی سو نسخے دیں گے، بقیہ نسخے آپ کے ہیں، جس قیمت پر فروخت کرنا چاہتے ہیں آپ کی مرضی ہے، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر مؤلف نے حق طباعت ہمیشہ کے لیے اس طابع کو دیا ہوتو یہ ڈھائی سو نسخے مسودہ کی قیمت بن گئے اور ہمیشہ کا حق طباعت طابع کو حاصل ہو گیا، اور اگر صرف ایک مرتبہ کے لیے کہا ہوتو یہ ڈھائی سو نسخے ایک مرتبہ حق طباعت کا عوض ہے، اور حق طباعت ان حقوق میں سے ہے جس کا عوض لیا جا سکتا ہے، اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

اور اگر مؤلف نے ایک مرتبہ یا ہمیشہ کا ذکر نہیں کیا تو اس میں عرف کا اعتبار ہے اور میری معلومات کے مطابق اس صورت میں صرف ایک مرتبہ کا حق طباعت دیا جاتا ہے، اس لیے مؤلف کو دوبارہ کسی اور جگہ کتاب کی طباعت کا حق بھی ہوتا ہے اور اگر پرانے طابع کے ہاں سے دوبارہ چھپوا دے تو پھر نیا معاملہ کر کے اس سے دوبارہ معاملہ کے مطابق کتاب کے نسخے لے سکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تجارتی لائسنس اور پنشن کو فروخت کرنے کا حکم:

سوال: تجارتی لائسنس اور پنشن وغیرہ کو فروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) کاروباری سہولت اور آسانی کے لیے تاجر یا کمپنی حکومت سے لائسنس منظور کرا لیتی ہے، اور اس لائسنس کی وجہ سے مال درآمد (امپورٹ) اور برآمد (ایکسپورٹ) کرنے میں سرکاری رکاوٹ سے حفاظت ہوتی ہے، لیکن لائسنس کوئی مادی چیز نہیں، بلکہ دوسرے شہر یا مارکیٹ میں سامان بیچنے اور منتقل کرنے یا دوسرے ملک یا شہر سے مال خرید کر لانے کے حق کا نام ہے، اور یہ ایک ایسا حق ہے جس کے حاصل کرنے میں کافی کوشش اور رقم بھی خرچ کرنی پڑتی ہے، اس لیے درج ذیل وجوہات کی بنا پر لائسنس کی خرید و فروخت جائز ہے۔

(۱) از روئے قانون اس کی فروخت درست ہو، اگر قانوناً اس کی خرید و فروخت کی اجازت نہ ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔ مثلاً کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام ہو اور قانون دوسری کمپنی کی طرف اس کی منتقلی کی اجازت نہ دیتا ہو تو اس لائسنس کی بیع جائز نہ ہوگی۔

(۲) مارکیٹ میں اس کی فروخت کا رواج پایا جاتا ہے، اور تاجروں کے عرف میں ''تجارتی لائسنس'' کے

ساتھ مال جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، لہذا یہ مال کے حکم میں ہے۔

(۳) یہ قابل انتفاع ہے از روئے شرع اس سے فائدہ اٹھانا ممنوع نہیں ہے۔

(۴) یہ حق اصحابِ حق کو اصالۃً حاصل ہے، دفع ضرر کے لیے نہیں ہے، اور فی الحال موجود بھی ہے۔

(۵) قابل ادخار ’’جمع کرنے کے لائق ہے، کیونکہ تجارتی لائسنس تحریری سرٹیفکٹ یا رجسٹری کے ذریعہ قانونی طور پر محفوظ کیا جاتا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فقہی مقالات:۱/۲۲۲۔وجدید فقہی مسائل:۴/۱۸۸۔وحقوق اوران کی خرید وفروخت،ص۱۹۳۔والیضاح النوادر۱/۴۳۔ونئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے،ص۱۰۵).

پنشن فروخت کرنے کا حکم:

(۲) پنشن کی بیع کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: (۱) حکومت کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو یہ درحقیقت بیع نہیں ہے بلکہ تبرع مؤجل کو معجّل بنانا ہے، شرعی طور پر حکومت کی رضامندی سے جائز اور درست ہے۔ (۲) حکومت کے علاوہ کسی اور کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اولاً تو حکومت خود راضی نہیں ہوتی ہے، اور ثانیاً اس میں چند خرابیاں ہیں، مثلاً ایک ملک کی کرنسی کی بیع اس ملک کی کرنسی کے ساتھ نسیئۃً جائز نہیں ہے۔ وغیرہ۔

ملاحظہ ہو احسن الفتاوی میں ہے:

پنشن ایک قسم کا انعام ہے، جب تک ملازم کا اس پر قبضہ نہ ہو وہ اس کا مالک نہیں بنتا، اس لیے اس کی بیع جائز نہیں ہے، البتہ خود حکومت سے اس کی بیع کرنا حقیقت میں بیع نہیں، صرف نام اور صورت بیع کی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ حکومت نے جو بڑا انعام قسط وار دینے کا وعدہ کیا تھا اب اس کو کم مقدار میں یکمشت نقد دے رہی ہے، اس لیے حکومت سے یہ معاملہ جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۶/۵۲۱).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

حکومت واپس خرید لیتی ہے اس کے بارے میں فرمایا: یہ صورۃً بیع ہے، ورنہ حقیقت میں گورنمنٹ کی طرف سے تبرع مستقل ہے اس لیے گورنمنٹ کی رضامندی سے جائز ہے۔ (امداد الفتاویٰ:۴/۵۸۰، مسائل شتیٰ).

مزید ملاحظہ ہو: (آپ کے مسائل اور ان کا حل:۶/۵۲۳، ملازم کا اپنی پنشن حکومت کو بیچنا جائز ہے، واسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۶۸۔ وفتاویٰ حقانیہ:۶/۳۹). واللہ ﷻ اعلم۔

حق متقرر اور غیر متقرر فقہاء کی نظر میں:

سوال: فقہاء کے ہاں حقوق کے بارے میں کیا تفصیلات ہیں، نیز حق متقرر اور غیر متقرر میں کیا فرق ہے؟ کونسے حقوق کا عوض لینا جائز ہے اور کونسے حقوق کا عوض لینا نا جائز ہے؟ مثلاً پگڑی وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اس مسئلہ میں علمائے کرام کی بہت بحثیں اور اختلافات ہیں، لیکن آج کل حقوق کا عوض لینے کا عام لوگوں میں رواج ہو گیا ہے۔

فقہاء نے حقوق کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) حقوق متقررہ۔ (۲) حقوق مجردہ۔

(۱) حق متقرر: اس حق کو کہتے ہیں کہ صلح کرنے کے بعد وہ حق متغیر ہو جائے اور اس کا حکم بدل جائے۔

(۲) حق مجرد: اس حق کو کہتے ہیں کہ صلح کرنے کے بعد وہ حق الآن کما کان ہو، اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو۔

حق متقرر کی مثال: قصاص ہے کہ صلح کرنے سے پہلے قاتل مباح الدم تھا، اور صلح کرنے کے بعد وہ محفوظ الدم بن گیا، ایسے حقوق کا عوض لینا، یا اس میں صلح کرنا جائز ہے۔

پگڑی کا حق بھی اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عوض لینے سے قبل مالک کو اس میں حق سکونت حاصل تھا، اور عوض لینے اور صلح کرنے کے بعد اس میں مشتری کو یہ حقوق حاصل ہیں، گویا کہ مشتری کو منفعت مؤبدہ حاصل ہے۔

حق مجرد کی مثال: حق شفعہ اور شوہر کا بیوی کو یوں کہنا: "اختاريني بألف" یعنی پہلے بیوی کو طلاق کا اختیار تفویض کرے اور بعد میں کہدے کہ مجھے ایک ہزار میں پسند کرو، یہ دونوں حقوقِ مجردہ ہیں، اور ان سے کوئی منفعت مالی وابستہ نہیں۔

حق شفعہ، حق مجرد اس لیے ہے کہ صلح کرنے سے قبل زمین مشتری کی ملکیت تھی، اور صلح کرنے کے بعد بھی زمین مشتری کی ملکیت رہے گی، نیز مخیّرہ صلح کرنے سے قبل بھی شوہر کی بیوی تھی اور صلح کرنے کے بعد بھی اسی کی بیوی ہے اس صورت میں سابقہ حالت نہیں بدلی اس لیے یہ حق مجرد ہے، اور اس کا عوض لینا جائز نہیں۔

ہدایہ کے ابواب الشفعہ میں مذکور ہے:

وإن صالح من شفعته على عوض بطلت شفعته ورد العوض، لأن حق الشفعة ليس بحق متقرر في المحل، بل هو مجرد حق التملك، فلايصح الاعتياض عنه،... بخلاف القصاص لأنه حق متقرر. (الهداية: ٤/٤٠٦).

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

والفاصل بین المتقرروغیره أن ما یتغیر بالصلح عما کان قبله فهو متقرر، وغیره غیر متقرر، واعتبر ذلک فی الشفعة والقصاص، فإن نفس القاتل کانت مباحة في حق من له القصاص، وبالصلح حصل له العصمة في دمه، فکان حقاً متقرراً، وأما فی الشفعة فإن المشتري یملک الدارقبل الصلح وبعده علی وجه واحد، فلم یکن حقاً متقرراً. (شرح العنایة بهامش تکملة فتح القدیر:۹/۴۱۶، مایبطل به الشفعة،ط: دارالفکر).

اس اصول کے تحت اور بھی کئی نظائراورمثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں کسی حق کا عوض لینایاصلح کرنا جائز ہو،اوروہ حق متقر رہو،مثلاً نزول عن الوظائف کوفقہاء نے قابل عوض قراردیا ہے،یعنی کوئی شخص ملازمت یا کوئی عہدہ چھوڑکردوسرے کواس پرمقررکردے اوراس کاعوض لیلے،یہ بھی حق متقرر ہے،کیونکہ صلح سے پہلے ایک شخص اس عہدہ پرفائز تھا،اورصلح کے بعددوسرا شخص ملازمت پرفائز ہوا۔

درمختار میں ہے:

وعلیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال. وفی الشامیة: قال العلامة العینيؒ في فتاواه: لیس للنزول شيء یعتمد علیه، و لکن العلماء والحکام مشوا ذلک للضرورة، واشترطوا إمضاء الناظر، لئلا یقع فیه نزاع، ملخصاً من حاشیة الأشباه للسید أبي السعودؒ.

(الدر المختارمع فتاوی الشامی:۴/۵۱۹،سعید).

وللاستزادة انظر: (فتاوی الشامی:۴/۵۲۴،سعید۔والاشباه والنظائرمع الحموی:۱/۲۹۱۔ ومنحة الخالق علی البحرالرائق:۵/۲۳۴،۲۳۵،کوئٹه).

☆ نیز زمین کوپانی دینے کاحق جس کوحق الشرب کہتے ہیں،اس کاعوض لینا بھی بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے،کیونکہ پہلے اس کوپانی لینے کاحق حاصل نہیں تھا،اس لیے کہ یہ شرب خاص ہے،اوراب اس کواپنی زمین سیراب کرنے کاحق حاصل ہوا۔

ہدایہ میں ہے:

بخلاف الشرب حیث یجوز بیعه تبعاً باتفاق الروایات، ومفرداً في روایة وهو اختیار مشایخ بلخؒ، لأنه حظ من الماء. (الهدایة:۳/۵۶).

علامہ سرخسیؒ مبسوط میں کتاب الشفعہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وكان شيخنا الإمام يحكي عن أستاذه أنه كان يفتي بجواز بيع الشرب بدون الأرض، ويقول: فيه عرف ظاهر في ديارنا بنسف، فإنهم يبيعون الماء، فللعرف الظاهر كان يفتي بجوازه. (المبسوط: ۱۳۵/۱۴،دارالفکر).

اس پر علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ اس عرف کا اعتبار نہیں، اس لیے کہ یہ عرف نص کے خلاف ہے، مگر خود انہوں نے آگے چل کر کتاب المزارعۃ میں یہ مسئلہ دوبارہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا، اور بیع شرب کو عرف کی وجہ سے جائز کہنے والے مشائخ متاخرین کا قول ذکر کیا، اور ان کے قول پر کوئی تنقید نہیں کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

وبعض المتأخرين من مشايخنا أفتى أن يبيع الشرب وإن لم يكن له أرض للعادة الظاهرة فيه في بعض البلدان، وهذه عادة معروفة بنسف، قالوا: إنما جوز الاستصناع للتعامل، وإن كان القياس يأباه، فكذلك بيع الشرب بدون الأرض. (المبسوط للامام السرخسیؒ:۱۷۱/۲۳).

وفي الفتاوى السراجية: بيع الشرب تبعاً للأرض جائز، ومقصوداً كذلك في رواية وبه أخذ مشايخ بلخ. (الفتاوی السراجیۃ:۳۷۲،کتاب البیوع،مایجوز بیعہ ومالایجوز).

☆ نیز حق مرور کا عوض لینے کو بھی جائز کہا گیا، کیونکہ یہ بھی حق متقرر کی طرح ہے کہ پہلے مرور کی اجازت نہیں تھی اور اب مل گئی۔

ہدایہ میں ہے:

أما حق المرور يتعلق بعين تبقى، وهو الأرض فأشبه الأعيان.

اور حق المرور کی بیع کا جواز روایتِ ابن سماعہ سے مروی ہے۔

قال في العناية: وبيع حق المرور، وهو حق التطرق دون رقبة الأرض جائز في رواية ابن سماعة. (العنایۃ فی شرح الہدایۃ بہامش فتح القدیر:۴۲۹/۶،دارالفکر۔ وکذا فی الفتاوی الہندیۃ:۱۳۱/۳۔ و۲۹۴/۶۔ وتبیین الحقائق:۵۲/۴،ملتان).

درمختار میں مذکور ہے:

وصح بيع حق المرور تبعاً للأرض بلاخلاف، ومقصوداً وحده في رواية، وبه أخذ

عامة المشايخ. وفي الشامية: قوله وبه أخذ عامة المشايخ، قال السائحاني: وهو الصحيح، وعليه الفتوىٰ، مضمرات، انتهىٰ. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:٥/ ٨٠،سعيد).

☆اسی طرح خلع میں بیوی اپنی خلاصی کے لیے مال دیتی ہے، یہ مال بھی کسی عین کے مقابلے میں نہیں، اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مال کی ادائیگی ہے۔

☆ نکاح میں بھی مہر حق زوجیت کے وصول کے لیے ہے۔

☆اور شرح مجلّہ میں حق علو بلکہ دوسرے حقوقِ مجردہ کا عوض لینے کو بر سبیل صلح جائز قرار دیا ہے۔

قال الأتاسي في شرح المجلة: وعلى ما ذكره من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال، ينبغي أن يجوز الاعتياض عن حق التعلي، وعن حق الشرب، وعن حق المسيل بمال، لأن هذه الحقوق لم تثبت لأصحابها لأجل دفع الضرر عنهم، بل تثبت لهم ابتداءً بحق شرعي، فصاحب العلو إذا انهدم علوه، قالوا: إن له حق إعادته كما كان جبراً عن صاحب السفل، فإذا نزل عنه لغيره بمال معلوم ينبغي أن يجوز ذلک على وجه الفراغ والصلح، لا على وجه البيع، كما جاز النزول عن الوظائف ونحوها لاسيما إذا كان صاحب حق العلو فقيراً قد عجز عن إعادة علوه، فلو لم يجز ذلک له على الوجه الذي ذكرناه، يتضرر فليتأمل، وليحرر، والله سبحانه أعلم. (شرح المجلة للاتاسي:٢/ ١٢١).

حاصل یہ ہے کہ حق متقرر کا عوض لینا ہدایہ اور شرح ہدایہ میں مذکور ہے، اور حق مجرد جیسے حق تعلّی کا عوض لینے کا رواج ہو تو اس کو بھی شرح مجلّہ نے جائز قرار دیا ہے۔

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

حق تصنیف اگرچہ حقوق مجردہ سے متعلق ہے مگر حقوق مجردہ کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت وابستہ ہو، جیسے حق وظیفہ وغیرہ۔ (۲) دوسرے وہ حقوق جن کے ساتھ مالی منفعت متعلق نہیں، جیسے حق شفعہ وغیرہ۔ شریعتِ اسلامی میں مالی منفعت والے حقوق سے دستبرداری کے عوض مال لینا جائز ہے، حق تصنیف کے ساتھ بھی دورِ حاضر میں چونکہ مالی منفعت وابستہ ہے، اس لیے اس کی بیع وشراء جائز ہے، فقہی اصطلاح میں اس کو حق اسبقیت کہا جاتا ہے۔ (فتاویٰ حقانیہ:٦/ ١١١).

اور یہی مضمون نظام الفتاویٰ (٣١٦/٢) میں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ: مکان ودوکان کے ساتھ بھی مالی منفعت وابستہ ہے، لہذا اس کا عوض لینا بھی جائز ہونا چاہئے۔
شامی میں ہے:

فإنهم قالوا: يجوز أخذ العوض على وجه الإسقاط للحق. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢٠، سعيد).
مسئلہ مذکورہ میں بھی مالک نے اپنا حق سکونت ساقط کر کے عوض لیا جو جائز ہونا چاہئے۔
فتاویٰ شامی میں ہے:

وحاصله: أن ثبوت حق الشفعة للشفيع وحق القسم للزوجة، وكذا حق الخيار في النكاح للمخيرة، إنما هو لدفع الضرر عن الشفيع والمرأة، وماثبت لذلك لايصح الصلح عنه، لأن صاحب الحق لما رضي علم أنه لايتضرر بذلك، فلايستحق شيئاً، أما حق الموصىٰ له بالخدمة فليس كذلك، بل ثبت له على وجه البر والصلة فيكون ثابتاً له أصالة، فيصح الصلح عنه إذا نزل عنه لغيره، ومثله مامر عن الأشباه من حق القصاص والنكاح والرق حيث صح الاعتياض عنه، لأنه ثابت لصاحبه أصالة لا على وجه دفع الضرر عن صاحبه... الخ. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢٠، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

ومن ادعى على الآخر مالاً فافتدى يمينه أو صالحه منها على عشرة دراهم فهو جائز. (الهداية: ٣/ ٢٠٩).

جس نے دوسرے پر دعویٰ کیا پھر مدعی علیہ نے مدعی کے ساتھ صلح کر لی اور کچھ رقم مدعی کو دی تو یہ درست ہے یہاں بھی حق یمین کے بدلے عوض وصول ہوا جو کہ جائز ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (حقوق مجردہ کی خرید وفروخت، از مفتی محمد تقی عثمانی صاحب۔ والمدخل الفقهي العام، ج ٣، للشيخ مصطفى الزرقا. وشرح المجلة. والموسوعة الفقهية الكويتية. وجديد فقهي مباحث، ج ٣. والفقه الاسلامي وادلته، ج ٤). واللہ ﷻ اعلم۔

حق پٹہ دوامی کا شرعی ورثاء میں منتقل ہونے کا حکم:

سوال: دائمی کرایہ پر لی ہوئی زمین جسے لیز، یا پٹہ کہتے ہیں۔ کیا اس میں وراثت جاری ہوگی یا نہیں؟

ہمارے صوبہ گجرات ہندوستان میں لیز یا پٹہ پر جو زمینیں حکومت سے لی جاتی ہیں اس کا باضابطہ پرمنٹ لیز ایگریمنٹ (permanent lease agreement) ہوتا ہے جس میں حکومت دائمی کرایہ پر زمین کرایہ دار کو دینے کا اقرار کرتی ہے، کرایہ پر لینے والا تمام ریونیو ریکارڈ (Revenue records) میں کرایہ دار ہی کی حیثیت سے درج ہوتا ہے، اور حکومت ہی اس کی مالک رہتی ہے اور سمجھی جاتی ہے، اور کرایہ دار کو اس زمین پر تمام تصرفات کا حق دیا جاتا ہے، مثلاً کسی اور شخص کو کرایہ دینا، مکان بنا کر کرایہ پر دینا وغیرہ، لیکن کرایہ دار یہ زمین کسی کو بیچ نہیں سکتا، یعنی اس زمین کا سیل ایگریمنٹ (sale agreement) کسی بھی دفتر میں رجسٹر نہیں ہوسکتا۔

ہاں حکومت کرایہ سے یہ زمین کبھی واپس نہیں لیتی اور نہ کسی قسم کے تصرفات سے روکتی ہے جب تک وہ معاہدہ کے تحت رہے۔ حکومت کی طرف سے سالانہ کچھ رقم بطورِ کرایہ متعین ہوتی ہے جو کرایہ دار کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ زمین حکومت کی ملک ہے یا کرایہ دار اس کا مالک سمجھا جائیگا؟ کرایہ دار کے انتقال کے بعد اس کے تمام ورثاء حقدار ہوں گے یا فقط وہ شخص جس کو حکومت منتخب کر کے قبضہ دیدے؟ بینوا توجروا۔

الجواب حامداً ومصلياً ومسلماً :

بصورتِ مسئولہ پٹہ دوامی کا حق یہ ایک ایسا حق ہے کہ کرایہ دار کو تا دوام حاصل ہے بایں وجہ یہ حق کرایہ دار کے انتقال کے بعد اس کے شرعی ورثاء میں منتقل ہوگا، البتہ چونکہ اس پر ملکیت نہیں ہے لہذا اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، ملکیت تو اصل مالک ہی کی رہے گی، ورثاء کو بھی فقط استعمال یا کرایہ پر دینے یا عاریۃً دینے کا حق حاصل ہے بطورِ ملکیت یہ حق منتقل نہیں ہوگا۔ نیز یہ حق تمام شرعی ورثاء کی طرف منتقل ہوگا۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ پگڑی کے بارے میں فرماتے ہیں:

نعم يفتى به فيما دعت إليه الحاجة وجرت به فى المدة المديدة العادة وتعارفه الأعيان بلا نكير كالخلو المتعارف فى الحوانيت ...قلت: ورأيت في فتاوى الكازرونى عن العلامة اللقاني أنه لو مات صاحب الخلو يوفى منه ديونه ويورث عنه وينتقل لبيت المال عند فقد الوارث. (فتاوى الشامي: ٤/ ٥٢١،مطلب في خلو الحوانيت، سعيد).

شریعتِ مطہرہ میں بعض حقوق ایسے ہیں جن میں میراث جاری ہوتی ہے اور وہ تمام ورثاء میں حسبِ سہامِ شرعی تقسیم ہوتے ہیں۔ مثلاً حق قصاص اور حق دیت یہ تمام ورثاء میں منتقل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ مبسوط میں تحریر فرماتے ہیں:

ولأن القصاص حق الميت بدليل أنه لو عفا عن الجارح صح وانقلب مالاً تقضى منه ديونه وتنفذ وصاياه ويورث عنه. (المبسوط للامام السرخسيؒ: ۱۷۸/۲٦).

چنانچہ کرایہ کا حق بھی ان حقوق کی طرح ہے جس میں میراث بھی جاری ہوگی اور تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں:

وأصل هذا أن القصاص حق جميع الورثة وكذا الدية ...ولنا أنه عليه الصلاة والسلام أمر بتوريث امرأة أشيم الضبابى من عقل زوجها أشيم ولأنه حق يجرى فيه الإرث .

(الهداية :٤/ ٥٧٢ ،باب القصاص فيمادون النفس).

علامہ زیلعیؒ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولنا قوله عليه الصلاة والسلام : من ترك مالاً أوحقاً فلورثته ومن ترك كلاً فعلي والقصاص حقه فيكون لجميعهم كالمال وأمر عليه الصلاة والسلام بتوريث امرأة أشيم الضبابى من دية زوجها أشيم ولأن القصاص حق يجرى فيه الإرث حتى أن من قتل وله ابنان فمات أحدهما عن ابن كان القصاص بين الصلبى وبين ابن الابن فثبت لسائر الورثة والزوجية تبقى بعد الموت حكماً فى حق الإرث...وكان علي ﷺ يقسم الدية على من أحرز الميراث والدية حكمها حكم سائر الأموال ...

وبهامشه قوله : والورثة كلهم فى ذلك سواء ، قال الإتقانى : والأصل في ذلك أن القصاص يستحقه من يستحق ماله على فرائض الله تعالىٰ الذكر والأنثى فى ذلك سواء والزوج والزوجة فى ذلك سواء نص عليه الكرخيؒ فى مختصره ... (تبيين الحقائق مع الحاشية : ٦/ ١١٤ ،ط: امداديه ، ملتان).

مذکورہ بالا فقہی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ قصاص اور دیت یہ حقوق ورثاء میں منتقل ہوتے ہیں اور تمام ورثاء ان میں شریک ہیں۔ حق وصیت اور حق شفعہ کے بارے میں ملاحظہ کیجئے:

قال في الهداية : وإن مات المشتري لم تبطل أى الشفعة لأن المستحق باق ولم يتغير سبب حقه . (الهداية: ٤/٣٢١).

مطلب یہ ہے کہ اگر مشتری نے زمین خریدی اور مشتری مرگیا تو حق شفعہ اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوگیا۔

صاحبِ ہدایہ حق وصیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

قال: إلا في مسئلة واحدة وهي أن يموت الموصي ثم يموت الموصى له قبل القبول فيدخل الموصى به في ملک ورثته استحساناً . (الهداية: ٤/٥١٥).

یعنی اگر زید نے عمرو کے لیے اپنی جائیداد کے ثلث کی وصیت کی اور زید کی وفات کے بعد عمرو کا بھی انتقال ہوگیا تو حق وصیت عمرو کے ورثہ کی طرف منتقل ہوگیا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ پگڑی کے بارے میں فرماتے ہیں:

اگر عرف کی خاموش زبان کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو اس کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس مالک نے کرایہ پر لگاتے وقت پگڑی لی، اس نے گویا اپنا حق مالکانہ برقرار رکھتے ہوئے حق سکونت فروخت کردیا، اور یہ حق کرایہ دار کا ایسا حق ہے جو اس سے مالک مکان چھین نہیں سکتا، کرایہ دار کے وارثوں میں بھی یہ حق منتقل ہوگا۔ (مجلّہ فقہ اسلامی: ۱/۸۳)۔

جدید معاشی نظام میں مرقوم ہے:

پٹہ دوامی میں جائیداد پر جو دائمی حق کرایہ دار کو ملتا ہے اور اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہوجاتا ہے وہ ملکیت کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ ملکیت تو درحقیقت اصل مالک کی ہی رہتی ہے، بلکہ اس زمین یا جائیداد کو استعمال کرنے کا حق پٹہ دوامی میں کرایہ دار کو ملتا ہے، اس کے انتقال کے بعد یہی حق ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے چونکہ پٹہ دوامی میں ملکیت نہیں ہوتی بلکہ حق ہوتا ہے۔ (جدید معاشی نظام میں اسلامی قانونِ اجارہ، ص۳۹۳)۔

مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ پٹہ دوامی یہ ایک دوامی حق ہے اور ورثاء میں منتقل ہوگا دیگر حقوق کی طرح اور ملکیت تو اصل مالک ہی کی باقی رہے گی البتہ حق کرایہ یا حق سکونت منتقل ہوگا، نیز تمام ورثاء میں منتقل ہوگا بیٹے کی تخصیص کے بغیر۔

تنبیہ: علامہ شامیؒ کی ایک عبارت (جومجموعۃ رسائل ابن عابدین:۲/۵۲ پر مرقوم ہے) اور مفتی محمد شفیع صاحب کے ایک قول (جوجواہرالفقہ :۵/۲۰ پر درج ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ سکونت دوامی کا حق صرف بیٹے کو ہے اور اگر وہ نہ ہوتو بیٹی کو منتقل ہوگا ہمارے خیال میں یہ جزئیہ سابقہ نقل شدہ عبارات کی وجہ سے مرجوح ہے کیونکہ دوسرے فقہاء اور خود علامہ شامیؒ کی دوسری عبارت (جو ماقبل میں مذکور ہوئی) میں اس کو وراثت قرار دیا ہے اور وراثت میں سب وارثین کا حق ہوتا ہے۔

اور آج کل حق دوامی قیمتی مال سمجھا جاتا ہے اس سے ایک وارث کو مالا مال کرنا اور بقیہ کو محروم کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔

هذا ما ظهر لنا من أقوال الفقهية واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب وعلمه أتم وأحكم .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن عبادة بن الصامت ﷺ قال:
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
"الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر،
والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح،
مثلاً بمثل، سواء بسواء، يداً بيد،
فإذا اختلفت هذه الأصناف،
فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيد".

(رواه مسلم فی باب الربا).

باب......﴿۶﴾

بیع صرف کا بیان

کمی بیشی کے ساتھ مروجہ کرنسی کے تبادلہ کا حکم:

سوال: اگر پرانی کرنسی کو نئی کرنسی کے عوض تفاوت کے ساتھ فروخت کیا جائے تو کیا حکم ہے؟ بعض مفتی حضرات اس کو ناجائز کہتے ہیں، کیونکہ یہ بیع الفلس بالفلسین ہے، اور قطع نظر ثمنیت کے وہ قیمتی دھات ہے، لیکن کاغذ کے نوٹ کی بلاثمنیت کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بے کار چیز ہے، لہذا نوٹ کو روپے پیسوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اس سلسلہ میں آپ کے دارالافتاء کی کیا تحقیق ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزیل۔

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں اصل اور خلقی ثمن دراہم ودنانیر ہیں، فلوس نافقہ یعنی مروجہ کرنسی ثمن عرفی ہے، ثمن خلقی نہیں، البتہ ثمن خلقی کے مشابہ ہے، اس وجہ سے ثمن خلقی کے تمام احکام جاری نہ ہوں گے، کیونکہ ثمن خلقی اور ثمن عرفی کے مابین بڑا تفاوت ہے، ثمن خلقی کی ثمنیت ہمیشہ کے لیے ہے، اور ثمن عرفی کی ثمنیت حکومت کے ثمن قرار دینے تک ہے اگر ثمنیت کے بطلان کا اعلان کردے تو ثمنیت ختم ہو جائیگی، بنابریں مروجہ کرنسی کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو تو اس کی گنجائش ہونی چاہیے۔

ملاحظہ ہو صاحب بحر فرماتے ہیں:

إن الأموال ثلاثة: ثمن بكل حال وهو النقدان، صحبه الباء أولا،...وثمن بالاصطلاح

وهو سلعة فی الأصل كالفلوس فإن كانت رائجة فهي ثمن وإلا فسلعة. (البحر الرائق: ۲۰۳/۶، کتاب الصرف، کوئٹہ۔وکذا فی تبیین الحقائق: ۹۰/۴، ملتان۔والمحیط البرہانی: ۱۷۱/۷).

پھر مروجہ کرنسی کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) جانبین سے غیر معین ہو، کسی ایک جانب بھی تعیین نہ کی ہو تو، یہ معاملہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے، بیع الکالی بالکالی کی وجہ سے۔

(۲) ایک جانب تعیین کردی جائے، اور دوسری جانب غیر معین ہو تو اگر غیر معین مؤجل ہو تو تب بھی بالاتفاق ناجائز ہے، لیکن اگر غیر معین غیر مؤجل ہو اور مجلس عقد میں قبضہ نہ کیا جائے تو اس کے جواز میں اختلاف ہے، بعض علماء کے نزدیک جائز ہے اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے۔

(۳) جانبین سے فلوس معین ہوں، تو اس مسئلہ میں علماء کا مشہور اختلاف ہے، حضراتِ شیخینؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک ناجائز ہے۔ کیونکہ امام محمدؒ ثمن خلقی اور ثمن عرفی کے مابین فرق کے قائل نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں محیط برہانی میں ہے:

وإذا باع فلساً بفلسين حالة الرواج، فهذه المسألة على ثلاثة أوجه:۔ أحدها: أن يبيع فلساً بغيرعينه بفلسين بغير أعيانهما وفي هذا الوجه، البيع فاسد لوجهين: أحدهما أن هذا بيع الدين بالدين. والثاني: أن الجنس بانفراده محرم للنساء عندنا.

الوجه الثاني: إذا باع فلساً بعينه بفلسين بأعيانهما وفي هذ الوجه البيع جائز في قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ، وقال محمدؒ: لايجوز...

والوجه الثالث: إذا كان أحد البدلين عيناً والآخر ديناً وفي هذا الوجه إن كان ما فی الذمة مؤجلاً لايجوز البيع لما ذكرنا أن الجنس بانفراده يحرم النساء عندنا، وإن كان ما في الذمة غير مؤجل لاشک أن على قول محمدؒ لايجوز، لأن عنده لوباع فلساً بعينه بفلسين بأعيانهما لايجوز فإذا كان أحد البدلين بغير عينه أولیٰ.

وأما على قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ: فقد اختلف المشايخ، بعضهم قالوا: يجوز، لأن الفلوس عندهما تصير بمنزلة العرض حال مقابلته لجنسه، قالوا: لو باع فلساً بعينه، بفلسين بأعيانهما يجوز فإذا صار الفلس المعين على مذهبهما بمنزلة العرض كان بمنزلة

ما لو باع عرضاً بعينه بفلسين في الذمة. ومنهم من قال: لايجوز، لأن الفلس عندهما إنما تتعين بالتعيين حال تعيين أحد البدلين، فلا يجوز، وهذا لأن الفلوس الرائجة لها حكم العرض من وجه. (المحيط البرهاني:۷/ ۲۷۰).

وفي البحر: وليس مرادهم خصوص بيع الفلس بالفلسين بل بيان حل التفاضل حتى لو باع فلساً بمائة على التعيين جازعندهما. (البحرالرائق: ۶/ ۱۳۲،باب الربا، کوئٹہ).

وفي الفتاوى الهندية: ولوباع فلساً بعينه بفلسين بغير أعيانهما أوعلى العكس لايجوز مالم يقبض ماكان ديناً في المجلس. (الفتاوی الهندية:۳/ ۱۰۳).

وفي البحر: لوقبض ماكان ديناً في المجلس جاز. (البحرالرائق: ۶/ ۱۳۱، کوئٹہ).

وفي فتح القدير: وأصله (الخلاف مبني على) أن الفلس لايتعين بالتعيين مادام رائجاً عند محمدؒ وعندهما يتعين. (فتح القدير: ۷/ ۲۱، دارالفکر).

صاحبِ ہدایہ، محقق ابن ہمامؒ، اورعلامہ ابوبکر کاسائیؒ نے شیخینؒ کے قول کومختار قرار دیا ہے۔اور شمس الائمہ حلوائیؒ نے فرمایا اس مسئلہ میں فتویٰ شیخینؒ کے قول پر ہے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

وتأخير دليلهما بحسب عادة المصنفؒ ظاهر في اختياره قولهما. (فتح القدير: ۷/ ۱۵۸، كتاب الصرف، دارالفكر).

عالمگیری میں ہے:

قال الشيخ الإمام الأجل شمس الأئمة الحلوانيؒ: كل جواب في الفلوس فهو الجواب في الدراهم البخارية أعني بها الغطارف، وكذلك الجواب في الرصاص والستوق،قالوا: ويجب أن يكون في العدالي كذلك كذا في الذخيرة ؛ حتى لو باع واحداً منهما باثنين يجوز بعد أن يكون يداً بيدٍ، هذا هو المختار للفتوىٰ كذا في الغياثية. (الفتاوى الهندية:۳/ ۱۰۳).

اس معاملہ کے جواز کا دوسرا پہلو:۔

ثمنیت سے قطع نظر اس معاملہ کوایک دوسری جانب سے دیکھا جائے تب بھی اس میں عدم جواز کی کوئی وجہ

نظر نہیں آتی، اس طور پر کہ فلوس کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کرنے میں اگر چہ دونوں جانب جنس متحد ہے، لیکن قدر(کیل ووزن)موجود نہیں اور ربا متحقق ہونے کے لیے قدر مع الجنس کا ہونا ضروری ہے۔وجہ یہ ہے کہ فلوس کی بیع عددیات میں شمار ہوتی ہے، اور عددی چیز میں ہم جنس کا تبادلہ تفاوت کے ساتھ جائز ہے، بشرطیکہ مجلس عقد میں بدلین موجود اور معین ہوں۔

ملاحظہ فرمائیں محیط برہانی میں ہے:

وإن قلنا: إن الثمنية لاتبطل إلا أن ربا النقد إنما يجري بالجنس والقدر وهو الكيل أو الوزن وههنا إن وجد الجنس لم يوجد القدر، أما الكيل فظاهر وأما الوزن، فلأن الناس تعارفوا بيع الفلوس عدداً لا وزناً ولهذا، قلنا: إذا باع فلساً بعينه وأحدهما أثقل من الآخر وزناً أنه يجوز، ولو كان موزوناً لكان لايجوز كما إذا باع درهماً بدرهم أثقل من الآخر وزناً وههنا لما جاز علمنا أن الوزن ساقط الاعتبار في الفلوس فلم يوجد إلا الجنس فلايجرى الربا. (المحيط البرهاني:۷/ ۲۷۰).

وفي البدائع: ويجوز بيع العدديات المتقاربة من غير المطعومات بجنسها متفاضلاً عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ بعد أن يكون يداً بيدٍ كبيع الفلس بالفلسين بأعيانهما. (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۸۵،سعيد).

وفي فتح القدير: قوله ويجوز بيع البيضة بالبيضتين...إن ذلك كله مشروط بكونه يداً بيدٍ أوهي من مسائل الجامع الصغير، صورتها فيه: محمد عن يعقوب عن أبي حنيفةؒ في بيع بيضة ببيضتين وجوزة بجوزتين وفلس بفلسين وتمرة بتمرتين يداً بيدٍجاز إذا كان بعينه وليس كلاهما ولا أحدهما ديناً. (فتح القدير: ۷/ ۲۰،دار الفكر).

وفي العناية : بيع العددى المتقارب بجنسه متفاضلاً جائز إن كانا موجودين لانعدام المعيار، وإن كان أحدهما نسيئة لايجوز لأن الجنس بانفراده يحرم النساء. (شرح العناية على هامش فتح القدير:۷/ ۲۰،دار الفكر).

فتاویٰ شامی میں ہے:

ثم اعلم أن ذكر النساء للاحتراز عن التأجيل، لأن القبض في المجلس لايشترط إلا

فی الصرف وهو بيع الأثمان بعضها ببعض أما ما عداه فإنما يشترط فيه التعيين دون التقابض. (فتاوى الشامي:٥/١٧٢، باب الربا، سعيد).

مسئلہ بالا پر چند اشکالات اور جوابات:

اشکال (۱): بعض مفتی حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نوٹ کو سکوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ سکوں کی ثمنیت ختم ہوجانے پر بھی قیمتی دھات ہیں، جب کہ نوٹ کی کوئی حیثیت نہیں؟

الجواب (۱): اس کا جواب یہ ہے کہ کاغذی نوٹ بھی فی نفسہ مال متقوم ہیں، ثمنیت کے بغیر بھی مختلف مواقع مثلاً جلانے، زیب وزینت، گلے میں ہار ڈالنے اور ری سائیکل (recycle) کرکے دوبارہ استعمال کرنے کے کام آتے ہیں۔ بلکہ کبھی پرانے نوٹ زیادہ قیمتی ہوتے ہیں، کیونکہ لوگ اس کو بطورِ نمائش رکھتے ہیں، یا حکومت زیادہ قیمت پر واپس لے لیتی ہے۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث:۲/۸۱).

(۲) دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ثمنیت کے باب میں اس قسم کا فرق مضر نہیں، وجہ یہ ہے کہ فقہاء نے جو فلوس کی تعریف بیان فرمائی ہے، وہ نوٹ کو بھی شامل ہے صرف معدنی سکوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شیخ احمد زرقا شرح القواعد الفقہیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

والذي يظهر أن الورق النقدي... الرائج في بلادنا الآن ونظيره الرائج فى البلاد الأخرى، هومعتبر من الفلوس النافقة، وما قيل فيها من الأحكام السابقة، يقال فيه لأن الفلوس النافقة هي ماكان متخذاً من غير النقدين الذهب والفضة، ...والورق المذكور من هذا القبيل، ومن يدعي تخصيص الفلوس النافقة بالمتخذ من المعادن فعليه البيان. (شرح القواعدالفقهية، للشيخ أحمد الزرقا، ص١٧٤).

بلکہ حضرت امام مالکؒ کی تصریح کے مطابق فلوس چمڑے کے بھی ہوسکتے ہیں:

لو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى تكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة. (المدونة الكبرى:٣/٩٠، التأخير في صرف الفلوس، دارالفكر).

وفى المصباح المنير: الفلس الذي يتعامل به. (المصباح المنير:٢/٤٨١، بيروت).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث ۲/۱۳۳).

کرنسی نوٹ کاغذی پرزے ہونے کے باوجود فلوس ہی کے حکم میں ہیں اوران کا باہمی تبادلہ تفاضل کے ساتھ جائز ہے، فتح القدیر میں اس کی تصریح موجود ہے:

لو باع كاغذة بألف يجوز و لايكره . (فتح القدير: ۷/۲۱۲،كتاب الكفالة، دارالفكر۔و كذا في ردالمحتار: ۵/۳۲۶،سعيد).

لہٰذا جوحضرات کہتے ہیں کہ بغیرثمنیت کے اس کی کوئی حیثیت نہیں، یہ بات درست نہیں۔

دوسرااشکال اور جواب:

اشکال (۲): بعض حضرات نے صاحبِ ہدایہ کی درج ذیل عبارت سے استدلال کرتے ہوئے منع کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

ومشايخنا لم يفتوا بجواز ذلك في العدالى و الغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربا. (الهداية:۳/۱۰۹).

یعنی نوٹوں کوعدالی اورغطارفہ پرقیاس کرتے ہوئے منع کیا ہے،اس کا کیاجواب ہے؟

الجواب: عدالی اورغطارفہ کی ممانعت کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ان میں چاندی پائی جاتی تھی جوکہ ثمن خلقی ہے، اوروہ بھی اوپر کی سطح پر ہونے کی وجہ سے لوگ چاندی جیسا معاملہ کرتے تھے، نیز دوسری قیمتی دھات کی ملاوٹ کی وجہ سے چاندی کی قیمت سے زیادہ اس میں تفاوت نہیں ہوتا تھا۔

ملاحظہ ہومحیط برہانی میں ہے:

أن الفضة وإن كان أقل فهي قائمة للحال حقيقة، فإنها ترى وتشاهد، فإن اللون لون الفضة ومتى أذيبت تخلص الفضة وتخرج بيضاً خالصةً...فكانت الفضة قائمة باعتبار الحال والمأل...فلأن الفضة يجعل في الصفر لترويج الصفر بالفضة ولهذا سموه دراهم، ولهذا جعلوا الفضة ظاهراً والصفرباطناً فكانت الفضة معتبرة وإن كان أقل من الصفر .(المحيط البرهاني:۷/۲۷۶).

اسی وجہ سے فقہاء نے اس کوبیع صرف میں شمار کرکے بدلین پرتقابض کوضروری قراردیاہے۔

ملاحظہ ہو،فتح القدیر میں ہے:

ولكنه مع هذا صرف حتى يشترط القبض قبل الافتراق...لوجود الفضة من

الجانبین. (فتح القدير:۷/۱۵۲، کتاب الصرف، دار الفکر).

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی شیخین کے مذہب کو راجح قرار دیتے ہوئے پیسوں کے تبادلہ کو کمی بیشی کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی رشیدیہ میں ہے:

معلوم ہوا کہ فلوس عددی ہیں، اگر اپنی مثل سے مبادلہ کیا جاوے تو درست ہے کیونکہ اتحادِ جنس ہے، مگر کیل ووزن نہیں تو تفاضل سب درست ہے مگر نسیئہ حرام ہے، اور یہ مذہب شیخینؒ کا ہے اور یہ قوی ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۵۴۷، مکتبہ رحمانیہ).

مجموعۃ الفتاویٰ میں ہے:

استفسار: چہ فی فرمایند علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین دریں مسئلہ کہ نوٹ (یعنی کاغذ زر) کہ در نیولا رائج است خرید وفروخت انہا برکم وزیادت جائز است یا نہ، بینوا توجروا؟

الجواب هو الملهم للصواب: خرید وفروخت نوٹ مذکور برکمی یا زیادتی جائز ست چرا کہ حکام اورا مال قرارداده است وہر شئی کہ دراصطلاح قوم مال قرارداده شود اگرچہ فی اصلہ دراں ثمنیت ومالیت ثابت نہ باشد لیکن فقط از قراردادن قوم دراں ثمنیت ومالیت ثابت می شود۔ قال في الهداية: ويجوز بيع الفلس بالفلسين... الخ. پس ہرگاه در نوٹ مذکور کہ کاغذ ست مالیت ثابت شده خرید وفروخت آن ہم بکمی وبیشی جائز ست در ردالمحتار در باب بیع العینہ آمده: حتى لو باع كاغذة بألف يجوز و لايكره، انتهىٰ، والله أعلم وعلمه أتم، العبد المجیب محمد ریاست علی عفی عنہ، الجواب صواب محمد ارشاد حسین احمد، الجواب صحیح محمد اعجاز حسین، البتہ بیع وشراء مذکور جائز ست فقط العبد محمد عبد القادر عفی عنہ، الجواب صحیح کتبہ حامد حسین عفی عنہ، الجواب صواب محمد حسین، بلاشبہہ نوٹ دراصطلاح مال قرارداده می شود پس بیع وشراء مذکور جائز ست فقط العبد ابو القاسم محمد مزمل عفی عنہ، حکم کردن مجیب نسبت صحت بیع مذکور صحیح ودرست ست العبد محمد عنایت اللہ عفی عنہ، الجواب ہو الجواب محمد نظر علی، الجواب صواب محمد عبد الجلیل بن محمد عبد الحق خان۔ (مجموعة الفتاویٰ علی هامش خلاصة الفتاویٰ:۳/۱۲، کتاب البیوع).

نیز مفتی نظام الدین اعظمیؒ اور مفتی فرید صاحب نے بھی جائز قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۲/۳۷۴۔ وفتاویٰ فریدیہ:۲/۶۷۷).

حاصل کلام: نوٹ کو یداًبید تفاضل کے ساتھ فروخت کرنا بہت شاذونادر ہے، کبھی عید کے موقعہ پر لوگ نئے نوٹ پرانے نوٹوں کے بدلے میں لیتے ہیں، عام حالات میں اس پر عمل درآمد نہیں، باقی بینک والا سود کہ روپیہ یا رینڈ جمع کراتے ہیں، پھر مدت گزرنے کے ساتھ اس پر زیادتی ہوتی ہے، وہ سود ہے اور قطعاً حرام ہے، اس کو ربا قرآنی کہتے ہیں:

﴿وإن تبتم فلكم رؤس أموالكم لاتظلمون ولاتظلمون﴾. (سورة البقرة،الآية:۲۷۹).

خلاصہ یہ ہے کہ اجل کے بڑھنے سے قرض کی رقم کا بڑھنا بالکل ناجائز ہے۔

دوسرے بعض علماء مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا عبدالحیؒ، مفتی تقی صاحب وغیرہ کی رائے یہ کہ تفاضل کے ساتھ فروخت کرنا ناجائز ہے۔

اور یہ رائے مبنی بر احتیاط ہے، ورنہ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں تفاوت کے ساتھ فروخت کرنے کی گنجائش بہر حال ہونی چاہئے۔

کرنسی کے تبادلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

عصر حاضر میں نوٹوں کے ذریعہ تبادلہ میں مکمل طور پر زر خلقی سونا چاندی کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لیے کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اس ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ نقد جائز ہے نہ ادھار۔ (اہم فقہی فیصلے، ص۲۴، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہنڈی یا بل آف ایکسچینج پر کٹوتی لگانے کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے ایک لاکھ رینڈ کا سامان خریدا اور دونوں نے دو ماہ بعد قیمت کی ادائیگی پر اتفاق کیا اور چیک پر دستخط ہوئے جس کو عمر دو ماہ بعد ہی وصول کر سکتا ہے لیکن عمر جو بائع ہے اس کو رقم کی فی الفور ضرورت ہے تو وہ بکر یا بینک کو وہ بل یا چیک ۹۸ ہزار میں فروخت کرتا ہے اور دو ماہ بعد بکر کو ایک لاکھ رینڈ ملیں گے، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ سودی معاملہ ہے کیونکہ بکر یا بینک نے ۹۸ ہزار دئے اور بعد میں ایک لاکھ وصول کریگا، ہاں اگر کوئی شدید ضرورت ہو تو عمر بکر کو یا بینک کو ۹۸ ہزار کے عوض کوئی سامان فروخت کرے اور ۹۸

ہزار وصول کرلے پھر یہی سامان مشتری قبضہ کرنے کے بعد واپس عمر کو ایک لاکھ میں دو ماہ مؤجل پر فروخت کرے یہ ایک حیلہ وتدبیر ہے،ضرورت کے وقت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام،جلد اول،ص ۱۴۷،بعنوان: بل کو کٹوتی کے ساتھ فروخت کرنا۔واسلام اور جدید معیشت وتجارت،ص ۱۲۳۔اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۲۵۱/۷،بل آف ایکسچینج۔وغیرکی صورتیں، ۳۴۴۔۳۴۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خلافِ جنس کرنسی کے تبادلہ کا حکم:

سوال: کسی جگہ رقم بھیجنے کے دو طریقے ہیں: (۱) ایک یہ کہ یہاں ساؤتھ افریقہ میں کسی بینک یا کسی شخص کو ایک ہزار ڈالر یا ۸ ہزار رینڈ دیدیں اور اس کے بدلے دو تین دن کے بعد کراچی یا دہلی میں متعین طے شدہ روپے وصول کئے جائیں۔اس طریقہ میں بظاہر یہ خرابی لازم آتی ہے کہ ثمن کو ثمن کے بدلے میں فروخت کرنے میں مجلس عقد میں جانبین سے قبضہ ہونا چاہئے،جو یہاں مفقود ہے؟

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کراچی سے لاہور بینک وغیرہ کے ذریعہ ۵۰ ہزار روپے ارسال کرتے ہیں بعینہٖ یہ رقم نہیں پہونچتی بلکہ اتنی رقم بذریعہ بینک وہاں مرسل الیہ کو ادا کی جاتی ہے اس کے بارے میں بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ بعینہٖ سفتجہ ہے جس کو کتب فقہ میں ممنوع لکھا ہے اس کو ہنڈی یا بل آف ایکسچینج کہتے ہیں،دونوں صورتوں کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: (۱) پہلی صورت میں چونکہ ڈالر وغیرہ کے عوض روپے ملتے ہیں اور دو ملکوں کی کرنسی مختلف جنس کے حکم میں ہے اس لیے کمی بیشی کے ساتھ بیع کرنا جائز ہے نیز چونکہ یہ ثمن عرفی ہے ثمن حقیقی نہیں اس لیے اس میں مجلس میں تقابض بھی ضروری نہیں،ہاں ایک جانب سے قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الکالی بالکالی سے بچ جائے ثمن عرفی ثمن حقیقی کے حکم میں نہ ہونے کا فتویٰ تفصیلاً گزر چکا ہے۔

(۲) دوسری صورت بظاہر سفتجہ ہے،اس میں کچھ تفصیل ہے سفتجہ سُفتَن سے ہے جو سوراخ کرکے پرونے کے معنی میں ہے،چونکہ پرانے زمانہ میں دراہم دنانیر کو چوروں سے بچانے کے لیے لاٹھی وغیرہ میں سوراخ کرکے پروتے یعنی ڈالتے تھے اور پھر پہنچاتے تھے،اس لیے اس کو سفتجہ کہتے ہیں،سفتجہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی

کسی کو ہزار درہم بطورِ قرض دیدے اور یہ شرط لگادے کہ میں فلاں شہر میں آپ سے یا آپ کے وکیل سے ایک ہزار درہم وصول کروں گا، فقہاء نے اس کو ممنوع ومکروہ کہا ہے کیونکہ یہ ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' کے حکم میں ہے، اس قرض کی وجہ سے مقرض نے رقم کے لیے راستے کی سلامتی حاصل کرلی اس لیے یہ ممنوع ہے، لیکن اس میں دو شرائط ہیں، ایک یہ کہ قرض ہو اگر بطورِ امانت دیدیں تو پھر کوئی حرج نہیں، اور اگر امانت ہلاک ہوئی تو صاحبِ امانت کی چیز ہلاک ہوگئی۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ قرض کے عقد میں شرط لگادے کہ قرض اس شرط کے ساتھ دیتا ہوں کہ آپ فلاں شہر میں کسی کو لکھدے کہ وہ مجھے یہ رقم وہاں دیگا، اگر بغیر شرط کے دیدیا اور مستقرض نے دوسرے شہر والے کو لکھا تو مکروہ نہیں۔

شیخ اسعد صاغرجی لکھتے ہیں:

فشرط الكراهة أوعدم الجواز شيئان: الأول أن يدفع المال في بلده قرضاً لمن يكتب له، فلو دفعه أمانة لم يكره ولم يفسد. والثاني: أن يشترط عليه في عقد القرض أن يكتب له به إلى البلدة الأخرى فلو لم يشترط لم يكره، عن عطاء بن أبي رباح أن عبد الله بن الزبير ﷺ كان يأخذ من قوم بمكة دراهم، ثم يكتب بها إلى مصعب بن الزبير ﷺ بالعراق فيأخذونها منه، فسئل ابن عباس ﷺ عن ذلک، فلم ير به بأساً، فقيل له: إن اخذوا أفضل من دراهمهم، قال: لابأس إن اخذوا بوزن دراهمهم، وروي في ذلک عن علي ﷺ.

فإن صح ذلک عنه، وعن ابن عباس ﷺ فإنما أرادا والله أعلم إذا كان ذلک بغير شرط. ''السنن الكبرى للبيهقي'': (۳۵۲/۵،دار المعرفة، بيروت). (الفقه الحنفي وادلته''فقه المعاملات، القسم الاول،حكم السفتجة، ص۱۳٤).

فتح القدیر میں ہے:

والقرض بهذا الشرط فاسد ولولم يكن مشروطاً جاز وصورة الشرط ما في الواقعات رجل أقرض رجلاً مالاً على أن يكتب له به إلى بلد كذا فإنه لايجوز، وإن أقرضه بغير شرط وكتب جاز. (فتح القدير: ۲۵۱/۷، كتاب الحوالة،دار الفكر).

لیکن اگر بینک یا کسی شخص کو دراہم بطورِ قرض دیدے اور بھیجنے کی اجرت دے اور پھر عقد میں شرط لگادے کہ فلاں شہر میں لوں گا، تو پھر بھی جائز ہے کیونکہ راستے کے امن کا جو فائدہ حاصل ہوا (بلکہ یہاں مقصود امن

الطریق نہیں صرف رقم کا پہونچانا ہے) وہ قرض کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے عوض اجرت ادا کی گئی اور بینک وکیل بالا جرت بن گیا، عام طور پر منی آرڈر یا بینک کو اس کے بھیجنے کی فیس ادا کی جاتی ہے، تو اس معاملہ میں کوئی حرج نہیں، مولانا فتح محمد لکھنویؒ نے شرح وقایہ کے حاشیہ میں اس کو جائز فرمایا ہے۔ تکملہ عمدۃ الرعایۃ: ۲/۱۱۹، پر اس کی تفصیل موجود ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مکیلی کو موزونی بنانے کا حکم:

سوال: دیہات میں عورتیں بوقتِ ضرورت پڑوسن سے تین کیلو آٹا بطورِ قرض لیتی ہیں، پھر دوسرے وقت تین کیلو واپس کرتی ہیں، فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ گیہوں اور آٹا مکیلات میں سے ہیں، اور مکیلی کو موزونی بنانے کی اجازت نہیں، کیونکہ وزن میں برابری کے باوجود کیل میں کمی بیشی کا امکان رہتا ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: یہ معاملہ قرض کا ہے اور قرض میں مثل کا واپس کرنا ضروری ہے، اور تین کیلو تین کیلو کا مثل ہے، اس لیے یہ معاملہ جائز ہے، نیز بیع میں بھی تین کیلو آٹا تین کیلو کے عوض غیر مؤجل فروخت کرنا جائز ہے، اس لیے کہ اب آٹا وزنی بن چکا ہے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جب کیلی میں وزنی ہونے کا عرف بن جائے تو وزن کے ساتھ برابر فروخت کرنا جائز اور درست ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

ملاحظہ ہو ''شرح القواعد الفقہیہ'' کے حاشیہ میں مصطفیٰ زرقا فرماتے ہیں:

وقال مصطفىٰ أحمد الزرقا: خلافاً لأبي يوسفؒ الذي يعتبر المقياس المتعارف فيهما مطلقاً في كل زمن بحسبه، ويتبدل مقياس التساوي بتغير العرف تبعاً له حيث يعلل النص بالعرف الذي كان قائماً وقت وروده، فلا يكون اتباع العرف عند أبي يوسفؒ مخالفاً للنص، بل يراه هو الموافق للنص، وأن الثبات على المقياس القديم الذي ورد في النص هو المخالف للنص، فهو يعتبر هذا النص نصاً عرفياً، بمعنى أنه ذكر فيه المقياس الذي عينه النص، لأنه كان هو المتعارف حين وروده النص، ولو كان المتعارف مقياساً آخر لورد النص بذلك الآخر، لأن مقاييس الكميات تتبع الأعراف، ولتنظر رسالة" نشر العرف فيما بني من الأحكام على العرف" لابن عابدينؒ. وقد أوضحت هذه المسألة في كتابي المدخل

الفقهی العام . (حاشية شرح القواعد الفقهية، ص ۲۲۱، تحت القاعدة: "العادة محكمة"). **واللہ ﷻ اعلم۔**

فوروڈ ایکسچینج کونٹرکٹ کا حکم:

سوال: فوروڈ ایکسچینج کا معاملہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ مختصر تعارف حسبِ ذیل درج ہے:۔
حاصل یہ ہے کہ فی الحال کرنسی کی مقررہ قیمت کے عوض مختلف مما لک کی کرنسی کا باہمی تبادلہ کرنا، جس میں ایک کرنسی مثلاً ڈالر کی ادائیگی مستقبل کی طے شدہ تاریخ پر ہوگی، اس معاملہ کو فوروڈ ایکسچینج (F.E.RATE) کہتے ہیں۔
مستقبل کی طے شدہ تاریخ عام طور پر تین ماہ ہوتی ہے، اور کرنسی کی یہ مؤجل قیمت نقد سے مختلف ہوتی ہے یعنی کچھ اضافے کے ساتھ ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک ساؤتھ افریقن کمپنی ایک امریکن کمپنی سے ایک لاکھ ڈالر کا سامان خریدتی ہے، جانبین سے عقد کا وعدہ ہوا کہ تین ماہ بعد مبیع سپرد کی جائیگی اور ثمن بھی یعنی ایک لاکھ ڈالر اسی وقت ادا کیا جائیگا، اب ان تین ماہ کے اندر ڈالر کی قیمت میں اضافہ کا قوی امکان ہے جس کی بنا پر ساؤتھ افریقن کمپنی کو نقصان کا اندیشہ ہے، بایں طور کہ اس کو ڈالر کے عوض مزید رینڈ خرچ کرنے ہوں گے، اس نقصان کے اندیشہ سے بچنے کے لیے ساؤتھ افریقن کمپنی کسی بینک وغیرہ کے ساتھ فوروڈ ایکسچینج کرتی ہے، جس میں رینڈ کے بدلے میں ڈالر آج کی مقررہ قیمت پر خریدتی ہے، رینڈ کی ادائیگی فی الحال ہوگی، البتہ ڈالر تین ماہ کے بعد حاصل ہوں گے، جب امریکن کمپنی کو ڈالر ادا کرنے کا وقت آجائے۔ شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اگر ایک کرنسی کو دوسری کرنسی کے عوض آئندہ کے لیے فروخت کردے تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ اگر ڈالر کو رینڈ کے عوض مستقبل کے لیے خریدا جائے اور سب رینڈ بھی دیدئے تاکہ تین ماہ کے بعد فلاں تاریخ کو ڈالر مل جائیں اس معاملہ کو سلم میں داخل کرسکتے ہیں، اگر سلم کی شرائط موجود ہوں تو بطورِ سلم یہ معاملہ صحیح اور درست ہے۔

شرائطِ سلم کو اس جملہ "مصّ جنا مرأة" یا" امرأة مصت جنا" میں جمع کیا گیا ہے: یعنی (۱) میم سے مراد مقدارِ مسلم فیہ، (۲) ص: صفت کا معلوم ہونا، (۳) جیم: جنس کا معلوم ہونا، (۴) ن: نوع کا معلوم ہونا، (۵) الف: اجل کا معلوم ہونا، (۶) میم، راء: مقدارِ رأس المال، (۷) تاء: تسمیۃ المکان کی طرف اشارہ ہے۔

میرے خیال میں کرنسیاں فلوسِ نافقہ کے حکم میں ہیں، یعنی رواجی کرنسی ہیں، حقیقی ثمن نہیں، کیونکہ ثمن حقیقی ذہب وفضہ ہیں۔

سلم کے لیے رأس المال پر قبضہ ضروری ہے قبضہ کے لیے تخلیہ اور قبضہ حکمی بھی کافی ہو جائیگا، نیز کسی کے اکاؤنٹ میں منتقل کرنا بھی کافی ہوگا۔

اگر عقدِ سلم نہ کرے تو پھر بھی گنجائش ہے کہ ایک کرنسی فی الحال دے اور دوسری کرنسی بعد میں لے۔

عالمگیری میں ہے:

ويجوز السلم فی الفلوس عدداً في ظاهر الرواية كذا فی الينابيع وهو الصحيح هكذا فی النهاية. (الفتاوی الهندية:۱۸۳/۳،فصل فی بيان ما يجوز السلم).

فتح القدیر میں ہے:

وكذا فی الفلوس عدداً أی يجوز السلم فی الفلوس عدداً هكذا ذكره محمدؒ فی الجامع الصغير من غير ذكر خلاف فكان هذا ظاهر الرواية عنه . (فتح القدير:۷۵/۷،دار الفكر).

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ رب السلم کچھ نہ دے یہ صورت ناجائز ہے، یہ بیع الدین بالدین ہے، نیز سلم میں رأس المال کی سپردگی لازم ہے۔

قال فی الهداية: ولايصح السلم حتى يقبض رأس المال قبل أن يفارقه فيه أما إذا كان من النقود فلأنه افتراق عن دين بدين وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الكالئ بالكالئ. (الهداية:۹٦/۳).

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ رأس المال دے اور کچھ حصہ نہ دے تو جتنا رأس المال دیا اتنے حصہ میں جائز ہو جائیگا، باقی میں ناجائز رہیگا، لیکن اگر (۲) اور (۳) صورت میں وعدہ کرے عقد نہ کرے تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، جب وعدہ بصورتِ تعلیق ہو تو واجب الوفاء ہوتا ہے، مثلاً یہ کہدے کہ اگر فلاں تاریخ کو میں ڈالر دیدوں تو آپ اتنے بھاؤ میں پونڈز فروخت کریں گے۔

قواعد الفقہ میں ہے:

المواعيد في صورة التعليق تكون لازمة مثل أن يقول بع هذا الشيء من فلان بكذا فإن لم يعطك الثمن فأنا أعطيه . (شرح المجلة، للأتاسی،۲۲۸/۱،شرح القواعد الفقهية،۲٦۳).

ملاعلی قاریؒ شرح النقایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

...المواعيد قد تكون لازمة، قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم : العدة دين فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه. (شرح النقاية:۳/۲۵۳،قبيل فصل الاقالة، بيروت).

نیز یہ ہنڈی کی ایک قسم ہے جس میں تاجیل کی گنجائش ہے کیونکہ یہ ثمن عرفی ہے ہاں ثمن حقیقی میں تاجیل کی گنجائش نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مختلف ممالک کی کرنسی کے تبادلہ کا حکم:

سوال: اگر کسی کو ۵۰۰ رینڈ دے اور کہا کہ تین ماہ بعد اس کے عوض میں مجھے اتنے ڈالر دینا پڑے گا،تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کرنسی ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، نیز مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الجنس کہلاتی ہے،لہذا تقابض فی المجلس ضروری نہیں نسیئۃً بھی جائز ہے۔

ملاحظہ ہو فقہی مقالات میں ہے:

تاجروں اور عام لوگوں میں اس کا رواج ہے کہ وہ ایک ملک کی کرنسی دوسرے شخص کو اس شرط پر دے دیتے ہیں کہ تم اس کے بدلے میں اتنی مدت کے بعد فلاں ملک کی کرنسی فلاں جگہ پر دینا،امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ معاملہ جائز ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اثمان کی بیع میں بیع کے وقت ثمن کا عقد کرنے والے کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں لہذا جب جنسین مختلف ہوں تو ادھار کرنا جائز ہے، چنانچہ شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

وإذا اشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة كالنقود، وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولايشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لايشترط ذلک في الدراهم والدنانير.

(المبسوط للامام السرخسیؒ:۱۴/۲۴، باب البیع بالفلوس، ادارۃ القرآن).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

دو ملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس میں داخل ہیں اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں، جب دونوں کی جنس مختلف ہے تو ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی زیادتی کے ساتھ فروخت

کرنا جائز ہے اور اس کا کاروبار کرنا بھی جائز ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا متبادل کرنسی پر قبضہ ہو جائے، اگر کسی ایک فریق کا بھی مجلس عقد میں متبادل کرنسی پر قبضہ نہ ہوا بلکہ معاملہ کر کے دونوں فریق بعد میں ادائیگی کے وعدہ پر جدا ہو گئے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں افتراق دین بدین لازم آتا ہے جو کہ حدیث کی رو سے ممنوع ہے:

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة وإذا وجد حرم التفاضل والنساء لوجود العلة وإذا وجد أحدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء. (الهداية: ۷۹/۳، باب الربا، دار الفكر). (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱۳۹/۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مروجہ کرنسی کے عوض سونا چاندی خریدنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے سُنار سے ۵۰ ہزار رینڈ کے زیورات خریدے، مشتری کے پاس فقط ۴۰ ہزار رینڈ اس وقت موجود تھے، لہٰذا زیورات کی وصولی کے وقت چالیس ہزار دیئے اور بقیہ دس ہزار ہفتہ کے بعد دینے کا وعدہ کیا، کیا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟ جب کہ بیع صرف میں ید اًبید ہونا ضروری ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ کاغذی نوٹ یعنی مروجہ کرنسی ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، لہٰذا اس کی تجارت میں بیع صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے، بنابریں ادھار خرید وفروخت جائز ہے، ہاں عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

عقد الصرف بيع الثمن بالثمن أى ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنساً بجنس أو بغير جنس كذهب بفضة. (الدر المختار: ۲۵۷/۵، سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

فالصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة. (بدائع الصنائع: ۲۱۵/۵، سعيد).

وفي ردالمحتار: سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا

قبض أحد البدلين. (فتاوى الشامي:٥/ ١٨٠،باب الربا،سعيد).

وفي المبسوط للإمام السرخسيؒ: إذا اشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود...وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف. (المبسوط:١٤/ ٢٤).

وللاستزادة انظر: (المحيط البرهاني:٧/ ٢٦٨ ـ والفتاوى الهندية:٣/ ٢٢٤).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

أما الذهب سواء كان تبراً أومصوغاً فقد أجمع الأئمة الأربعة على أنه لايعامل معاملة البضائع، وإنما يعمل أحكام النقود في جميع الأمور، لكن "الأوراق النقدية" قد وقع فيه خلاف بين العلماء المعاصرين، وإن كثيراً من علماء البلاد العربية جعلوها في حكم الذهب سواء بسواء، ولكن خالفتُهم في رسالتي" أحكام الأوراق النقدية " وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب في جميع الأمور، فلا تجري فيها أحكام الصرف، ولذلك يجوزعندي أن يشترى الذهب أو الفضة بالنقود، ويجوز أيضاً أن يشترى الذهب نسيئة بالأوراق النقدية ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس إذا كان ذهباً خالصاً، وأن يعرف الأجل عند العقد وقد قبل هذا الموقف معظم علماء الهند وكثيرمن باكستان ، والتفصيل في رسالتي" أحكام الأوراق النقدية " ـ(فتاویٰ عثمانی:۳/ ۱۵۹، کتاب البیوع).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

سونا یا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً: سونے کے زیورات خرید لیے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لیے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

...وفي الهندية: قال: وروى الحسن عن أبي حنيفةؒ إذا اشترى فلوساً بدراهم وليس عند هذا فلوس ولاعند الآخر دراهم ثم أن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منها حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية:٣/ ٢٢٤،الفصل الثالث في بيع

الفلوس)۔(جدید معاملات کے شرعی احکام، جلد اول، ص ۱۲۸)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

رائج نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہے، لہذا ان سے بیع ذہب وفضہ بہر کیف جائز ہے، تفاضل ونسیئہ بھی جائز ہے۔(احسن الفتاویٰ:۶/ ۵۱۸۔وکذافی فتاویٰ حقانیہ:۶/۱۲۴)۔

چونکہ بعض علماء اس کو ناجائز کہتے ہیں اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ سنار سے قرض لے کر ہاتھوں ہاتھ معاملہ کرلیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فوریکس کا طریقۂ کار اور اس کا حکم:

سوال: فوریکس کا کیا طریقۂ کار ہے؟ اور شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزیل.

الجواب: فوریکس کا خلاصہ یہ ہے کہ زید ایک ہزار ڈالر کا بینک اکاؤنٹ کھولتا ہے تو کمپنی اس کے ساتھ نوے ہزار ڈالر مزید بطورِ قرض جمع کراتی ہے، پھر یہ شخص ایک لاکھ ڈالر کا کاروبار کرسکتا ہے اس کے بعد یہ شخص کسی بینک سے بذریعہ کمپنی ایک لاکھ کا ایک پلاٹ خرید سکتا ہے گویا کہ اس کی ضمانت میں ایک لاکھ ڈالر آئے پھر کچھ دنوں کے بعد ڈالر کی قیمت بڑھ جائے تو یہ شخص ایک لاکھ ڈالر پونڈ کے عوض کمپنی کے ذریعہ فروخت کرنے کے لیے ٹیلیفون کرتا ہے اور کمپنی ڈالر کو پونڈ کے عوض فروخت کرتی ہے، کمپنی درمیان میں درج ذیل سہولتیں مہیا کرتی ہے:

(۱) بذریعہ ٹیلیفون رابطہ، (۲) وہ مارکیٹ جہاں پر بیٹھ کر کاروبار کیا جاسکتا ہو، (۳) انٹرنیٹ سسٹم، (۴) نوے ہزار بطورِ ضمانت، اس کے علاوہ چند اور سہولتیں۔ پھر جب ایک دفعہ کرنسی کی خرید وفروخت کی جاتی ہے تو کمپنی ایک خاص رقم بطورِ کمیشن وصول کرتی ہے، اور اگر کرنسی کے خریدنے کے بعد فروخت میں تاخیر ہوجائے تو روزانہ کے حساب سے کمپنی کچھ رقم وصول کرتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ کاروبار بظاہر درست ہے۔لیکن اس کاروبار پر بظاہر چند اشکالات وارد ہوتے ہیں:۔

اشکال (۱): پہلا اشکال یہ ہے کہ اس میں کرنسی پر قبضہ نہیں ہوتا ہے جب کہ کرنسی کی خرید وفروخت میں کرنسی پر قبضہ ضروری ہے یعنی خرید وفروخت کے وقت وہ رقم اس شخص یا اس کے وکیل کے پاس نہیں ہوتی، بلکہ

اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کی جاتی ہے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جب زید اس رقم سے جو اس کے اکاؤنٹ میں آ گئی، خرید وفروخت کر سکتا ہے، تو یہ قبضہ حکمی کے مترادف ہے اگر چہ حسی قبضہ متحقق نہیں ہوا۔

معاییر شرعیہ نامی کتاب جس کو ستائیس محققین اربابِ فتویٰ نے مرتب کیا ہے اس میں مرقوم ہے:

يتحقق القبض بحصوله حقيقة أو حكماً وتختلف كيفية قبض الأشياء بحسب حالها واختلاف الأعراف وبما يكون قبضاً لها، إذا أودع في حساب العميل مبلغ من المال مباشرة أو بحوالة مصرفية إلى آخر ما قال... (معاییر شرعیہ، ص۱۲۲).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی کے کھاتے میں رقم کا اس طرح منتقل کر دینا کہ وہ اس میں تجارت کر سکتا ہو قبضہ حکمی ہے۔

شرح عنایہ میں ہے:

إن الفائدة المطلوبة بالعقد إنما هي التمكن من التصرف وذلک يترتب على التعيين فلايحتاج إلى القبض. (شرح العناية:على هامش فتح القدير:۷/۱۸،دار الفكر).

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل میں مرقوم ہے:

بینک کے رجسٹر میں اندراج اس شخص کے حق میں قبضہ کے حکم کے لیے معتبر ہوگا جو ایک کرنسی کو دوسری کرنسی میں تبدیل کرانا چاہتا ہو، خواہ یہ تبدیلی اس کرنسی میں مطلوب ہو جسے وہ شخص بینک کو دے رہا ہے یا بینک میں جمع کرنسی میں ہو۔ (عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل، مرتب قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ، ص۲۳۲).

اشکال (۲): دوسرا اشکال یہ ہے کہ کمپنی سے لی ہوئی رقم زید کے ذمہ دین ہے کیونکہ صرف یہ رقم زید کے اکاؤنٹ میں لکھی جاتی ہے اور جو پونڈ اس نے خریدے وہ بھی اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کیے جاتے ہیں یعنی دین ہے تو یہ بیع الدین بالدین کی وجہ سے ناجائز ہے؟

الجواب: جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اکاؤنٹ میں رقم کا اندراج قبضہ حکمی کے مترادف ہے اور اس سے خرید وفروخت کر سکتے ہیں، یعنی تصرف پر مکمل قدرت حاصل ہے، تو پھر یہ بیع الدین بالدین کیسے ہوئی؟ بلکہ ڈالر تو پہلے ہی سے اس کے اکاؤنٹ میں مرقوم تھے اور قبضہ حکمی حاصل تھا اب پونڈ کے اندراج سے وہ بھی قبضہ میں آ گئے، لہٰذا بیع الدین بالدین کی صورت نہیں پائی گئی، اور ناجائز کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اشکال (۳): تیسرا اشکال یہ ہے کہ جو کمیشن کمپنی وصول کرتی ہے وہ بظاہر اس دین کی وجہ سے ہے جو کمپنی نے دیا ہے لہذا یہ سودی معاملہ ہے، اس وجہ سے ناجائز ہے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دلالی کی اجرت ہے جو جانبین سے لی جاتی ہے اور جانبین سے کمیشن لینا جائز ہے، کیونکہ کمپنی خرید وفروخت وغیرہ دوسری سہولیات فراہم کرتی ہے اس لیے سروس فیس کی اجازت ہونی چاہئے، کتب فقہ میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ جانبین سے فیصد کے حساب سے کمیشن لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو احسن الفتاوی میں ہے:

سوال: دلالی کی اجرت جانبین سے لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب: جائز ہے بشرطیکہ صاف طور پر اجرت معین کرلی جائے۔ **قال في الشامية من البزازية: إجارة السمسار والمنادی والحمامي والصكاك ومالايقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز.** (ردالمحتار: كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة، ٦/٤٧، سعيد)۔ (احسن الفتاوی: ۷/۲۷۲)۔

مزید ملاحظہ ہو: (ردالمحتار: ۴/۵۶۰، سعید۔ فتاوی محمودیہ: ۲۵/۲۸۶۔ نظام الفتاوی: ۱/۲۹۷۔ محمود الفتاوی: ۳/۸۵)۔

لہذا یہ کمیشن لینا سود وقمار میں داخل نہیں ہے، بلکہ دلالی کی اجرت کے تحت جائز ہے۔

(۴) مزید کمپنی یہ شرط لگاتی ہے کہ زید قرض کا مال خود کسی مارکیٹ میں استعمال کرے۔ یہ درست ہے جیسے قرض کی حفاظت کے لیے رہن لینا یا کفیل لینا درست ہے، قرض کے لیے حوالہ اور کفالہ قرض کی توثیق کے لیے ہوتے ہیں۔

(۵) نیز ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ کمپنی بائع اور مشتری دونوں کے لیے وکیل ہے اب بظاہر مسئلہ یہ ہے کہ ایک آدمی بائع اور مشتری دونوں کا وکیل بیک وقت نہیں ہوسکتا ہے۔

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ موکل کی اجازت سے ایک شخص بائع اور مشتری دونوں کا وکیل بن سکتا ہے۔ ملاحظہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

الوكيل بالبيع لايملك الشراء لنفسه لأن الواحد لايكون بائعاً ومشترياً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه، وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لاتقبل شهادته فباع منهم جاز. (فتاوی الشامی، باب الوكالة بالبيع والشراء، ٥/٥٢٣، سعيد۔ وكذا في البحر الرائق: ٧/١٦٧، فصل في الوكيل بالبيع، كوئته)۔

(۶) اگر زید کرنسی کے فروخت میں تاخیر کردے تو اس کو روزانہ کچھ دینا پڑیگا یہ سود ہے اس سے اجتناب کرنا لازم ہے۔ یہ شق نکالی جائے تو معاملہ درست ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چاندی کی انگوٹھی نگینہ کے ساتھ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے چاندی کی انگوٹھی بیچ ڈالی اور اس میں نگینہ تھا اور دونوں کو چاندی کے عوض دوسو درہم نقد اور کچھ نسیئہ میں فروخت کیا تو یہ بیع جائز ہے یا نہیں؟ اور اس میں الگ ہونا ممکن ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ انگوٹھی میں جتنی مقدار چاندی کی ہے اس کے بقدر ثمن مجلس عقد میں ادا کرنا ضروری ہے، اگر ادا نہیں کیا اور بلاضرر کے نگینہ جدا ہوسکتا ہے تو صرف نگینہ کی بیع صحیح ہوجائیگی، اور اگر بلاضرر جدا نہیں ہوسکتا ہے تو دونوں چیزوں میں بیع فاسد ہوجائیگی۔

یعنی اگر کسی نے انگوٹھی بیچی جس میں نگینہ تھا دوسو درہم میں کچھ نقد اور کچھ نسیئہ کے بدلے میں پس اگر دوسو درہم کی چاندی کی مقدار انگوٹھی کی چاندی کی مقدار سے زیادہ ہے، اور مشتری نے مکمل رقم ادا کردی یا صرف انگوٹھی کی مقدار کی رقم ادا کردی اور مابقیہ رقم نسیئہ ہے تو ان دونوں صورتوں میں بیع جائز ہے۔

اور اگر مشتری نے کچھ بھی رقم ادا نہیں کی اور دونوں جدا ہوگئے، پس اگر نگینہ کا انگوٹھی سے جدا کرنا بہ آسانی ممکن ہو تو فقط نگینہ کی بیع صحیح ہے اور حلقے کی بیع فاسد ہے، اور اگر جدا کرنا ناممکن ہو تو دونوں میں بیع فاسد ہوجائیگی۔

ملاحظہ ہو فتاوی عالمگیری میں ہے:

وإذا باع الرجل من آخر حلي ذهب فيه لؤلؤ وجوهر بدنانير وقبض المشترى الحلي ... فإن كانت الدنانير التي هي ثمن أكثر من ذهب الحلي فإنه يجوز البيع في الذهب والجوهر ثم بعد ذلك إن نقد الثمن كله قبل أن يفترقا فالعقد ماضٍ على الصحة وكذلك إن نقد حصة الذهب الذي في الحلي، وإن لم ينقد شيئاً حتى تفرقا فالعقد فيما يخص الحلي من الذهب يفسد وفيما يخص الجوهر إن كان الجوهر بحيث لايمكن تخليصه إلا بضرر يفسد وإن أمكن تخليصه من غير ضرر لايفسد العقد في الجوهر هكذا في المحيط.

(الفتاوی الهندية:۳/۲۲۲، الفصل الثانی فی بیع السیوف المحلاة، کتاب الصرف).

درمختار میں ہے:

من باع سيفاً حليته خمسون...فباعه بمائة وقد نقد خمسين فما نقد فهوثمن الفضة ... فإن افترقا من غير قبض بطل في الحلية فقط وصح في السيف لعدم اشتراط قبض ثمنه في المجلس إن يخلص بلاضرر وإن لم يخلص إلا بضرر بطل أصلاً لتعذر تسليم السيف بلا ضرر كبيع جذع من السقف، نهر. (الدرالمختارمع فتاوی الشامی:۵/۲٦۲،سعید).

ہدایہ میں ہے:

لو باع سيفاً محلى بمائة درهم وحليته خمسون ودفع من الثمن خمسين جازالبيع...فإن لم يتقابضا حتى افترقا بطل العقد فی الحلية لأنه صرف فيها وكذا فی السيف إن كان لايتخلص إلا بضرر وإن كان يتخلص السيف بغير ضرر جازالبيع فی السيف وبطل فی الحلية. (الهداية:۳/۱۰٦، کتاب الصرف).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (المبسوط للامام السرخسیؒ:۱٤/۱۸، کتاب الصرف،ادارۃ القرآن۔ والمحیط البرهانی:۸/۳۳۲،کتاب الصرف،، کتبه رشیدیه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ کے خلاف کرنسی فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ سے زائد یا کم پر رینڈ کو ڈالر کے عوض بیچا جائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ نفس جواز میں تو کوئی کلام نہیں ہے، اس لیے کہ خلافِ جنس کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، البتہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی لازم آئے گی، اور عزتِ نفس ضروری ہے اگر عزت کا خطرہ ہو تو ایسا کام نہیں کرنا چاہئے، اور چند کوڑیوں کے لیے عزت نفس کو خطرہ میں ڈالنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فقہی مقالات میں ہے:

حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ کی مخالفت کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں سود لازم نہیں آئیگا اس لیے کہ دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں اور مختلف الاجناس کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز

ہے اور اس کی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ اس پر تسعیر کے احکام جاری ہوں گے، لہذا جن فقہاء کے نزدیک حکومت کی طرف سے اشیاء میں تسعیر جائز ہے، کرنسی میں بھی جائز ہوگی... لہذا اس کے لیے حکومت کے اس حکم کی مخالفت کرنا تو جائز نہیں (بشرطیکہ اسلامی حکومت ہو اور اسلامی اصول کی پابند ہو آج کل کی حکومتوں کی طرح نہ ہو) لیکن دوسری طرف اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا بھی درست نہیں۔ (فقہی مقالات: ۱/۴۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۱۴۸، فاروقیہ۔ وفتاویٰ رحیمیہ: ۹/ ۲۲۲۔ وکفایت المفتی: ۷/ ۳۵۶)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بیرونی ملک کی کرنسی کی تجارت کا حکم:

سوال: بیرونی ملک کی کرنسی (foreign currency) کی خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟ اگر کوئی مسلمان یہ تجارت کرتا ہے اور دوسرے مسلمانوں کو اس تجارت میں (investment) یعنی پیسہ لگانے کی دعوت دیتا ہے تو اس کو حلال جگہ میں پیسہ لگانا کہا جائیگا یا نہیں؟

الجواب: بیرونی ملک کی کرنسی (foreign currency) کی خرید وفروخت جائز ہے اور اس میں تفاضل بھی جائز ہے اس لیے کہ مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الجنس کہلاتی ہیں، اور فی زمانا کرنسی نوٹ ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، لہذا یہ کاروبار جائز اور درست ہے، بنابریں اس کاروبار میں (investment) یعنی پیسہ لگانا بھی درست ہوگا، اور یہ پیسہ لگانا حلال جگہ میں ہوگا۔

مسئلہ مذکورہ بالا کے دلائل بالتفصیل پیچھے گزر چکے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پانچ رینڈ کے سکوں کو کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: چونکہ ہمارا پرانا صدرِ مملکت (نیلسن منڈیلا) ۹۰ سال کا ہو چکا ہے تو رِزرو (Reserve) بینک والوں نے ۵ رینڈ کے سکے نکالے جن پر اس کی تصویر بنائی، اس سکے کو صرف ایک خاص مقدار میں نکالے ہیں، اگر اس کو جنوبی افریقہ کی بینکوں سے لیا جائے تو اس کی قیمت پانچ رینڈ ہی ہے، لیکن بیرونِ ملک میں اس کے بدلے میں ایک ہزار رینڈ بھی مل سکتے ہیں، کیونکہ اس پر اس کی تصویر ہے اور وہ مشہور ہے اور لوگ ایسی چیزوں کو جمع کرتے ہیں، تو کیا میں ان سکوں کو یہاں سے خرید کر بیچ سکتا ہوں؟ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر اس کورینڈ کے علاوہ دوسری کرنسی کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کیا جائے تو بالکل جائز اور درست ہے، اور اگر زیادہ رینڈ کے بدلے میں بیچدے تو علماء کا اختلاف ہے، بعض مفتی حضرات کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ اس کو ثمن حقیقی کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔لہذا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کی گنجائش ہے۔ ہدایہ میں ہے:

و يجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانهما عند أبي حنيفةؒ و أبي يوسفؒ وقال محمدؒ لايجوز ... ولهما أن الثمنية في حقهما تثبت باصطلاحهما إذ لا ولاية للغير عليهما فتبطل باصطلاحهما و إذا بطلت الثمنية تتعين بالتعيين. (الهداية، باب الربا،۳/۸۱).

فقہی مقالات میں ہے:

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول پر عمل ان فلوس میں متصور ہوسکتا ہے جو بذاتِ خود بحیثیتِ مادہ کے مقصود ہوں جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ مختلف مما لک کے سکے اور کرنسی نوٹ اپنے پاس جمع کرتے ہیں، اس جمع کرنے سے ان کا مقصد تبادلہ یا بیع یا اس کے ذریعہ منافع حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف تاریخی یادگار کے طور پر جمع کرتے ہیں تاکہ آئندہ زمانے میں جب یہ کرنسی بند ہوجائے تو یہ کرنسی ان کے پاس یادگار کے طور پر باقی رہے بظاہر اس قسم کی کرنسی میں ان دونوں حضرات کے قول پر عمل کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کو جائز کہنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔(فقہی مقالات:۱/۴۷).

اور اگر بحیثیتِ ثمن بھی خریدلے جیسے پرانے نوٹ کے بدلے نئے نوٹ کم کبھی کبھی ملتے ہیں تو یہ بھی بعض مفتی حضرات کے نزدیک جائز ہے۔

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں ہے:

نوٹ نہ کیلی ہے اور نہ وزنی بلکہ عددی ہے، اس لیے کمی بیشی کے ساتھ بدلنا جائز ہے۔(نظام الفتاویٰ، کتاب المعاملات،۱/۲۹۹).

فتاویٰ فریدیہ میں ہے:

سوال: اگر کوئی شخص ایک ہزار کا نوٹ دس روپے کے نوٹ پر فروخت کرے تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب: چونکہ یہ دونوں نوٹ کاغذ کے ہیں نہ چاندی کے ہیں نہ سونے کے، تو یہ تبادلہ شرعاً ناجائز اور ربا نہیں ہے، چونکہ ان کی ذاتی قیمت معمولی ہے اور اعتباری اور سرکاری قیمت غیر معمولی ہے پس یہ تبادلہ

ممنوع عرفی ہوگا نہ کہ ممنوع شرعی، اسی طرح ڈالر، ویزہ، ٹکٹ اور کاغذی کرنسی کے تبادلے تفاضل سے ممنوع عرفی ہوں گے نہ کہ ممنوع شرعی۔ (فتاویٰ فریدیہ:۲/۶۷۷).

اس مسئلہ کی تفصیلی بحث پیچھے گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سونے کے تبادلہ میں کمی بیشی کا حکم:

سوال: زید کے پاس ۲۲ کیرٹ کا ۵ تولہ سونے کا پرانا زیور موجود ہے، وہ سنار کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ مجھے فلاں ڈزائن کا نیا زیور ۵ تولہ سونے کا چاہئے سنار نے کہا آپ اپنے زیور کے ساتھ تین ہزار رینڈ مزید ادا کریں گے، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ معاملہ سودی ہے اور ناجائز ہے، ہاں گاہک اپنا زیور پچاس ہزار میں مثلاً فروخت کردے اور ترپین ہزار سے نئے ڈزائن کا زیور خرید لے تو یہ معاملہ جائز اور درست ہوگا۔

ملاحظہ ہو مسلم شریف کی شرح میں ہے:

قوله عليه الصلاة و السلام : " لاتبيعوا الذهب بالذهب و الورق بالورق إلا سواء بسواء" قال العلماء: هذا يتناول جميع أنواع الذهب والورق من جيد ورديئ ، وصحيح ومكسور، وحلي وتبر وغير ذلك، وسواء الخالص والمخلوط بغيره، وهذا كله مجمع عليه. (شرح الامام النووی لصحيح مسلم:۱۱/۱۲،بيروت).

وانظر للمزيد : (المؤطا، ص ۵۸۲، نورمحمد كتب خانه۔والمصنف لعبدالرزاق:۸/۱۲۵،ادارة القرآن والعلوم الاسلامية).

مبسوط میں ہے:

حديث أنس بن مالك رضي الله عنه قال: أتى عمر بن الخطاب رضي الله عنه بإناء خسرواني قد أحكمت صنعته فبعثني به لابيعه فأعطيت به وزنه وزيادة فذكرت ذلك لعمر رضي الله عنه فقال: أما الزيادة فلا، وهذا الإناء كان من ذهب أوفضة وفيه دليل على أنه لا قيمة للصنعة في الذهب والفضة عند المقابلة بجنسها لأنه لم يجوز الاعتياض عنها وما كان مالاً متقوماً شرعاً فالاعتياض عنه جائز فعرفنا أنه إنما لم يجوز لأنه لا قيمة للصنعة في هذه الحالة شرعاً. (المبسوط للامام

السرخسیؒ:۱۴/٤،کتاب الصرف،ادارۃ القرآن)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وإن اشترى خاتم فضة أوخاتم ذهب فيه فص أوليس فيه فص بكذا فلساً وليست الفلوس عنده فهوجائز تقابضا قبل التفرق أولم يتقابضالأن هذا بيع وليس بصرف، كذا في المبسوط . (الفتاوى الهندية:۳/۲۲٤).

مبسوط میں ہے:

ولا بأس ببيع الفضة جزافاً بالذهب أوبالفلوس أو بالعروض لانعدام الربا بسبب اختلاف الجنس. (المبسوط للامام السرخسیؒ:۱٤/٦۹، کتاب الصرف،ادارۃ القرآن).

وانظر: (ردالمحتار:۵/۱۷۹،سعید.والبحرالرائق:۶/۱۹۴ .وفتح القدير: ۶/۲۷۸، دارالفكر. والمحيط البرهاني:۸/۳۰۵).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

رائج الوقت کاغذی نوٹ اور سکے سونے اور چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے اور چاندی کی رسید ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے، چاہے زیورات خریدیں یا دراہم ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۲۸).

التعلیق الممجد میں ہے: **قوله عليه السلام: لاتفعل بع تمرك بالدراهم ثم اشتر بالدراهم جنيباً، وقال: في الميزان مثل ذلك، أي قال: ما يوزن إذا احتيج إلى بيع بعضه ببعض مثل ذلك القول الذي قال في التمر المكيل أي يباع غيرالجيد الموزون بثمن ثم يشتري به موزون جيد... قوله بع تمرك الخ أشار إليه بما يجتنب به عن الربا مع حصول المقصود، وبه احتج جماعة من فقهائنا وغيرهم على جوازالحيلة في الربا وبنوا عليها فروعاً**. (التعليق الممجد:على هامش المؤطاللامام محمد،ص٣٥٤، قديمى كتب خانه).

وكذا في (تكملة فتح الملهم: ۱/۵٦۵ .والمبسوط للامام السرخسیؒ:۳/۲۰۹ . وجدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۳۲۔وفتاویٰ عثمانی:۳/۱۵۹). واللہ ﷻ اعلم۔

کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونا خریدنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونا خرید لے تو یہ عقد جائز ہوگا یا نہیں؟ یعنی کیا اس پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: ڈیبٹ کارڈ جب بائع نے مشتری سے وصول کر کیا اور اس کا نمبر بینک کو بتلا دیا اور بینک نے مشتری کی رقم جو بینک میں پڑی ہے بائع کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی تو بائع قبضہ ہو گیا، لہذا یہ جائز اور درست ہے۔ البتہ کریڈٹ کارڈ میں رقم دوسرے دن بائع کے اکاؤنٹ میں آئیگی، ہاں رسید پر قبضہ ہو جاتا ہے جو قبضہ حکمی کے مترادف ہے نیز درحقیقت یہ بیع صرف بھی نہیں ہے کیونکہ عقد صرف میں دونوں جانب ثمن حقیقی یعنی ذہب وفضہ میں سے ایک ہو اور یہاں ایک طرف سونا اور دوسری طرف ثمن عرفی ہے ثمن عرفی ثمن حقیقی کے حکم میں نہیں، اس پر مجلس میں قبضہ ضروری نہیں۔ ہاں عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے۔ ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

عقد الصرف بيع الثمن بالثمن أى ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنساً بجنس أو بغير جنس كذهب بفضة. (الدر المختار:۵/۲۵۷،سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

فالصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة . (بدائع الصنائع: ۵/۲۱۵،سعید).

وفي رد المحتار: سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين. (فتاوى الشامى:۵/۱۸۰،باب الربا،سعید).

وفي المبسوط للإمام السرخسيؒ: إذا اشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود...وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف. (المبسوط:۱۴/۲۴).

وللاستزادة انظر: (المحيط البرهاني:۷/۲۲۸.والفتاوى الهندية:۳/۲۲۴،و فتاویٰ عثمانی و جدید معاملات کے شرعی احکام ، كما مر).

کریڈٹ کارڈ کے تفصیلی احکام ابواب الربا کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿أحل اللّٰہ البیع وحرم الربا﴾.

(سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۲۷۵).

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿الذین یأکلون الربا لایقومون إلا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس﴾.

(سورۃ البقرۃ،الآیۃ: ۲۷۵).

وقال تعالیٰ:

﴿یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ وذروا مابقي من الربا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللّٰہ ورسولہ﴾.

(سورۃ البقرۃ:۲۷۸،۲۷۹).

ابواب الربا

عن جابر ﷺ قال: "لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: آکل الربا وموکلہ، الخ".

(رواہ مسلم فی باب الربا).

عن عبد اللّٰہ بن مسعود ﷺ عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الربا ثلاثۃ وسبعون باباً أیسرھا مثل أن ینکح أمہ، وإن أربی الربا عرض الرجل المسلم.

(المستدرک للحاکم فی کتاب البیوع).

باب......﴿۱﴾

سود کے احکام کا بیان

جنوبی افریقہ کے مسلم باشندے کے لیے سود لینے کا حکم:

سوال: کیا ساؤتھ افریقہ کے مسلمان کے لیے یہاں ساؤتھ افریقہ کے غیر مسلم بینک سے سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جنوبی افریقہ دارالامن ہے دارالحرب نہیں، بالفرض اگر دارالحرب ہوتو پھر بھی یہاں کے باشندے کے لیے کسی غیر مسلم بینک یا غیر مسلم آدمی سے سود لینا ناجائز ہے، ہاں اگر جنوبی افریقہ کا مسلمان چین، امریکہ یا روس میں جا کر عارضی اقامت اختیار کر کے وہاں کے غیر مسلموں سے ان کی مرضی سے یا غیر مسلم بینک سے منافع لے تو اگر ان ممالک کو ہم دارالحرب کہیں تو طرفینؒ کے نزدیک یہ معاملہ جائز ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دارالحرب میں سود کا حکم:

سوال: فقہاء نے لکھا ہے کہ مسلم مستامن جو ویزا لے کر دارالحرب گیا اور نومسلم حربی دونوں کافر حربی سے سود لے سکتے ہیں، نیز مسلم اصلی جو دارالحرب کا باشندہ ہو وہ دارالحرب میں حربی سے سود لے سکتا ہے، ہاں دارالحرب کا اصلی مسلم یا مستامن حربی کو سود نہیں دے سکتے ہیں، اب ہم ساؤتھ افریقہ کے اصلی مسلمان باشندے جو دو سو سال سے یہاں رہتے ہیں غیر مسلموں سے سود لے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: فقہاء احناف کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، طرفین ؒ کے نزدیک حربی سے سود لینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، لیکن جمہور فقہاء، ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف ؒ کے نزدیک سود لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، اگر چہ حربی ہی سے ہو۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولا ربا بين المسلم والحربي في دار الحرب خلافاً لأبي يوسفؒ والشافعيؒ لهما الاعتبار بالمستأمن منهم في ديارنا، ولنا قوله عليه السلام: "لاربا بين المسلم والحربي في دار الحرب" ولأن مالهم مباح في دارهم فبأي طريق أخذه المسلم أخذ مالاً مباحاً إذا لم يكن فيه عذر بخلاف المستأمن منهم لأن ماله صار محظوراً بعقد الأمان. (الهداية:۳/۸۶).

بدائع الصنائع میں ہے:

إذا دخل مسلم أو ذمي دار الحرب بأمان فعاقد حربياً عقد الربا أو غيره من العقود الفاسدة في حكم الإسلام جاز عند أبي حنيفةؒ ومحمدؒ...وقال أبو يوسفؒ: لايجوز للمسلم في دار الحرب إلا ما يجوز له في دار الإسلام. (بدائع الصنائع:۷/۱۳۲، كتاب السير، سعيد).

وللاستزادة: (البحر الرائق:۶/۲۲۶، كوئته۔وتبيين الحقائق:۴/۷۴۲۔ومجمع الانهر شرح ملتقى الابحر:۵/۱۸۶۔ومنحة الخالق على هامش البحر الرائق:۶/۲۲۶، كوئته۔ورد المحتار:۵/۱۸۶، باب الربا، سعيد۔وفتح القدير:۷/۳۸، باب الربا، دار الفكر).

بعض متأخرین احناف نے اس مسئلہ میں جمہور کے قول کو ترجیح دی ہے اور حضراتِ طرفین ؒ کے مذہب کو چند وجوہات کی بنا پر مرجوح قرار دیا ہے۔

وجوہِ ترجیح ملاحظہ فرمائیں:

(۱) علماء کے درمیان دار الحرب کی تعریف میں بہت اختلاف ہے، لہٰذا قطعی طور پر کسی کو دار الحرب نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) جمہور فقہاء کے نزدیک دار الحرب میں بھی ناجائز ہے، اس وجہ سے شبہ ہو گیا اور ربا کے باب میں شبہ ربا بھی ممنوع ہے۔

(۳) نصوص علی الاطلاق سودی کاروبار کو ممنوع قرار دیتی ہیں۔ مثلاً آیتِ کریمہ: ﴿أحل الله البيع

وحرم الربا﴾. (سورة البقرة، الآية:۲۷۵). سود کی حرمت میں نصِ قطعی ہے۔اسی طرح سودی معاملہ کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔﴿فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله﴾. (سورة البقرة،الآية:۲۷۹). اس کے علاوہ بھی قرآن واحادیث میں اس قدر شدید وعیدیں وارد ہوئی ہیں کہ جن کو سن کر کوئی شبہ ربا کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔

(۴) جمہور فقہاء کا قول احتیاط پر مبنی ہے۔

(۵) جمہور فقہاء کے قول پر عمل کرنے میں اختلافِ فقہاء سے بچاؤ حاصل ہوجاتا ہے۔

بہرحال اس زمانہ میں سود کا لینا مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ: ۳۵۲/۱۶۔احسن الفتاویٰ: ۲۰/۷۔وجدید فقہی مسائل: ۶۲/۴۔ وفتاویٰ بینات: ۹۶/۴۔وکفایت المفتی: ۱۰۳/۸).

البتہ بعض علماء نے طرفینؒ کے قول کو اختیار کیا ہے۔

ملاحظہ ہو: (مجموعۃ الفتاویٰ: ۱۷۰/۲، کتاب الربا، آرام باغ کراچی۔وامداد الاحکام: ۴۵۱/۳، ۴۵۲).

دارالحرب کی تعریف:

دارالحرب کی تعریف میں علماء کے مختلف اقوال ملاحظہ فرمائیں:

جامع الرموز میں ہے:

دارالحرب ماخافوا فيه من الكافرين. (جامع الرموز: ۵۵۶/۵،باب الجهاد).

خزانۃ المفتین میں ہے:

دارالإسلام لاتصير دارالحرب إلا بإجراء أحكام الشرك فيها، وان يكون متصلة بدارالحرب لايكون بينهما وبين دارالحرب مصر آخر للمسلمين، ولايبقى فيها مسلم أو ذمي آمناً بالأمان الأول، فما لم توجد هذه الشرائط، لاتصير دارالحرب، ومعنى قولنا: أن لايبقى مسلم أوذمي آمناً بالأمان الأول،أن لايبقى فيها مسلم أو ذمي آمناً على نفسه إلا بأمان المشركين، وقالا: إذا أجروا فيها أحكام الشرك فإنها تصير دارالحرب، سواء كانت متصلة بدارالحرب أو لم تكن، بقي فيها مسلم أو ذمي آمناً بالأمان الأول أو لم يبق...(خزانة المفتين بحوالة مجموعة الفتاوىٰ: ۱۴۰/۱، كتاب العلم والعلماء، آرام باغ كراچى).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

وذكر الحلواني: إنما تصير دارالحرب بإجراء أحكام الكفر، وأن لايحكم فيها بحكم من أحكام الإسلام ، وأن يتصل بدارالحرب ، وأن لايبقى فيها مسلم ولا ذمي آمناً بالأمان الأول...فإذا وجدت الشرائط كلها صارت دارالحرب ، وعند تعارض الدلائل والشرائط يبقى ماكان على ما كان أو يترجح جانب الإسلام احتياطاً. (الفتاوى البزازية بهامش الهندية:٦/٣١٢، كتاب السير).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

إذا أجرى أهل الحرب في بلدة من بلاد أهل الإسلام أحكام أهل الحرب، تصير دارالحرب كيف ماكان. (فتاویٰ قاضيخان بهامش الهندية:٣/٥٨٤).

بدائع الصنائع میں ہے:

لا خلاف بين أصحابنا في أن دارالكفر تصير دارالإسلام بظهور أحكام الإسلام فيها واختلفوا في دارالإسلام أنها بماذا تصير دارالكفر، قال أبوحنيفةؒ: إنها لاتصير دارالكفر إلا بثلاث شرائط: أحدها ظهور أحكام الكفر فيها، والثاني: أن تكون متاخمة لدار الكفر، والثالث: أن لايبقى فيها مسلم ولا ذمي آمناً بالأمان الأول وهو أمان المسلمين، وقال أبويوسفؒ ومحمدؒ: إنها تصير دارالكفر بظهور أحكام الكفر فيها. (بدائع الصنائع:٧/١٣٠،سعيد).

فتاویٰ شامی میں ہے:

لو أجريت أحكام المسلمين وأحكام أهل الشرك لاتكون دارحرب.

وفي الدرالمختار: ودارالحرب تصير دارالإسلام بإجراء أحكام أهل الإسلام فيها كجمعة وعيد وإن بقي فيها كافر أصلي وإن لم تتصل بدارالإسلام ، درر. (فتاوى الشامي مع الدرالمختار: ٤/١٧٥، سعيد).

ایضاح النوادر میں ہے:

دارالجمہور یہ ایسی حکومت کو کہا جاتا ہے جہاں کا اقتدار نہ کلی طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور نہ ہی غیر مسلموں کے ہاتھ میں، اسی طرح ایوانِ بالا کے قریب قریب تمام ہی افراد نہ مسلمان ہوں اور نہ غیر مسلم، بلکہ مسلم

وغیر مسلم کے درمیان مشترک طور پر حکومت چلانے اور وطنی حقوق حاصل ہونے میں قانونی طور پر معاہدہ ہو، اور ہر فریق کے افراد کو الیکشن لڑ کر کلیدی عہدہ حاصل کرنے اور نظامِ حکومت میں حصہ لینے کا پوری طرح حق حاصل ہو، اگر چہ کسی ایک قوم کی اکثریت کی وجہ سے ایوانِ بالا کے افراد بھی اسی قوم کے زیادہ ہوں مگر حق رائے دہی ہر ایک کو برابری کے ساتھ حاصل ہوتا ہو، اور ہر قوم کو اپنے اپنے مذہبی معاملہ میں کلی طور پر آزادی حاصل ہو، تو ایسی حکومت کو نہ دارالاسلام کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی دارالحرب، بلکہ دارالجمہوریہ کہا جا سکتا ہے، نیز دارالامن یا دارالعہد یا سیکولر ملک سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ (ایضاح النوادر: ۱/۸۸).

وللاستزادة انظر: (الفقه الاسلامي وادلته: ۸/۳۹، دار الفكر۔ والفتاوى الهندية: ۲/۲۳۲۔ وجديدفقهي مسائل: ٤/۷۲۔ ۷٤۔ جديدفقهي مباحث: ۲/۳۵۳، ۳۷۲، ٤۷۳، ٤۷٤).

جمہور کے نزدیک دارالحرب میں بھی سود لینا ناجائز ہے۔ ملاحظہ ہو اعلاء السنن میں ہے:

فقد اشتهر عن مالكؒ والشافعيؒ وأحمدؒ وأبي يوسفؒ وغيرهم من جماهير الفقهاء تحريمهم الربا بين المسلم والحربي في دار الحرب،... وقد اتفقت الأمة على أن الخروج من الخلاف مستحب قطعاً، لأن خلاف الأئمة لاسيما خلاف جمهورهم يورث الشبهة في الجواز، وقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: ''الحلال بين والحرام بين وبينهما شبهات، فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه'' لاسيما وكون الهند دار الحرب، عند الإمام محل نظر بعد، فالشبهة إذن قوية غير ضعيفة، والتوقي عنه واجب من غير ريبة. (اعلاء السنن: ١٤/٣٧٩، ادارة القرآن).

اسی طرح جنوبی افریقہ کو دارالحرب کہنا محلِ نظر اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

امداد المفتین میں ہے:

...حضراتِ صحابہ اور تابعین اور ائمہ اسلام نے سود کے بارے میں ہمیشہ احتیاط کی جانب کو اختیار کیا ہے، خود فاروقِ اعظمؓ فرماتے ہیں: ''**فدعوا الربا والريبة**''. (رواه ابن ماجه في باب التغليظ في الربا) یعنی سود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے شبہ کو بھی، نیز شعبیؒ حضرت فاروقِ اعظمؓ سے روایت فرماتے ہیں: ''**تركنا تسعة أعشار الحلال مخافة الربا**''. (مصنف عبد الرزاق: ۸/۱۵۲، باب طعام الامراء واكل الربا). لہٰذا کفار کے بینکوں سے سود لینے کے متعلق بھی علمائے محققین کا فتویٰ بنظرِ احتیاط اسی پر ہے کہ جائز نہیں۔ (امداد المفتین: جلد دوم،

ص۷۰۵).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتاویٰ حقانیہ:۶/ ۲۰۹۔ وعزیز الفتاویٰ:۱/ ۶۲۱، ۶۲۳۔ وامداد الفتاویٰ: ۳/ ۱۵۳، ۱۵۹۔ وکفایت المفتی:۸/ ۵۷۔ ایضاح النوادر:۱/ ۹۷).

خلاصہ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ نہ دارالاسلام ہے اور نہ دارالحرب ہے بلکہ دارالامن ہے، بنابریں غیر مسلم بینک سے سود لینا ناجائز ہے۔ آج کل مسلمان غیر مسلم ممالک میں بود و باش رکھنے کو اپنے مسلم ممالک پر ترجیح دیتے ہیں، اور اپنے آپ کو غیر مسلم ممالک میں محفوظ و مامون سمجھتے ہیں، تو ان ممالک میں سود لینا کب جائز ہوگا، گویا کہ سکونت کے لیے مسلم ممالک سے بہتر اور سود کھانے کے لیے دارالحرب۔ یہ ایک قسم کا خداع اور دھوکہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں صحیح نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دارالحرب میں سود کے بارے میں قولِ راجح:

سوال: دارالحرب میں سود لینے کے بارے میں احناف کے نزدیک قولِ راجح کیا ہے؟ اور طرفینؒ ایک حدیث ”لا ربا بین المسلم والحربی فی دارالحرب“ سے استدلال فرماتے ہیں، کیا یہ حدیث صحیح ہے، اور اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: امام ابو یوسفؒ اور جمہور فقہاء کا قول دلائل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور اوفق بالزمان بھی ہے، پھر چونکہ اس زمانے میں اکثر ممالک میں مسلمان آرام سے رہتے ہیں اور اپنی عبادات وغیرہ بسہولت ادا کرتے ہیں ان کو سود لینے کی اجازت نہیں، پھر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سود کی اجازت دارالحرب میں بھی نہیں ان کے مذہب کی رعایت اور دلائل کو دیکھتے ہوئے سود لینے کی اجازت بالکل نہیں دی جائیگی۔ لہذا مذہبِ احناف میں اسی قول کو فتویٰ کے لیے راجح قرار دیا جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ابن قدامہ فرماتے ہیں:

ویحرم الربا في دارالحرب كتحريمه في دارالإسلام وبه قال مالكؒ والأوزاعي وأبويوسفؒ والشافعيؒ وإسحاق، وقال أبوحنيفة: لايجرى الربا بين مسلم وحربي في دارالحرب. (المغنی:٤/ ١٦٢، فصل حرمة الربافی دارالحرب).

عدم جواز والوں کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) قرآن اور احادیث میں مطلقاً سود کی حرمت وارد ہوئی ہے، اور سخت وعیدیں بھی موجود ہیں:۔

(۱) **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿أحل اللّٰه البيع وحرم الربا﴾**.(سورة البقرة، الآية:۲۷۵).

(۲) **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿الذين يأكلون الربا لايقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس﴾**.(سورة البقرة،الآية: ۲۷۵).

(۳) **وقال تعالیٰ: ﴿يا أيها الذين آمنوا اتقوا اللّٰه وذروا مابقي من الربا إن كنتم مؤمنين، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللّٰه ورسوله﴾**. (سورة البقرة:۲۷۸،۲۷۹).

صحیح مسلم شریف میں روایت ہے:

عن جابر رضي الله عنه قال: لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: آكل الربا وموكله، الخ.

(رواه مسلم:۲/۲۸،باب الربا،قديمي).

عن عبد اللّٰه بن مسعود رضي الله عنه عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: الربا ثلاثة وسبعون باباً أيسرها مثل أن ينكح أمه، وإن أربى الربا عرض الرجل المسلم. (المستدرك للحاكم:۲/٤۸،كتاب البيوع، دارابن حزم).

وأخرج ابن أبي حاتم في تفسيره (۲/۵۵۱) **والشافعي عن عمر و بن الأحوص أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم،قال:"ألا إن كل رباً كان في الجاهلية موضوع عنكم كله.**

جس طرح شراب نوشی اور زنا کی حرمت کی نصوص مطلق ہیں اور وہ بلاتفریق دارالاسلام اور دارالحرب میں یکساں ہیں اسی طرح سود کی حرمت کا حکم بھی عام اور یکساں ہونا چاہئے۔

(۲) حربی امان لے کر دارالاسلام میں آئے تو جس طرح اس کے مال کو اس عہد کی وجہ سے معصوم تسلیم کیا جاتا ہے اور اس سے سود حاصل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جب مسلمان امان لے کر دارالحرب میں داخل ہو تو اس عہد کی وجہ سے اس کے حق میں اس کا مال معصوم اور محفوظ ہو جائیگا۔

(۳) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مشہور واقعہ کے مطابق قمار کے ذریعہ اونٹ حاصل کیے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ اونٹ لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کر دینے کا حکم فرمایا، "**فجاء به إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم،قال: تصدق به**". (تفسير ابن كثير،سورة الروم ،بحواله ابن ابی حاتم). اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاتفریق دارالاسلام و دارالحرب صدقہ کر دینے کا حکم فرمایا، حالانکہ

مکہ مکرمہ اس وقت دارالحرب تھا۔لیکن حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ منورہ میں تھے،اوراونٹ حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مدینہ منورہ بھیج دیے گئے تھے۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ سے کشتی کی ہار جیت میں بکریوں کی شرط لگائی تھی ،جب آپ نے تین بار شکست دے دی اور بکریاں آپ کو دے دی گئیں تو آپ نے واپس فرمادیں۔"**فقام عنه ورد عليه غنمه**". (الاصابة ، تحت ذكر يزيدبن ركانة:٦/٥١٤).

اگرچہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ اس وقت مسلمان نہیں تھے۔

مجوزین کے دلائل پر ایک نظر:

(۱) پہلی دلیل حدیث ہے۔مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً نقل کیا ہے:"**لا ربا بين المسلم والحربي في دار الحرب**". (معرفة السنن والآثار:٧/٤٧، بيروت).

الجواب: یہ حدیث مرسل ہے اور جمہور علماء نے اس کورد کردیا ہے۔بطورِ"مشتے نمونہ ازخروارے" چند ملاحظہ فرمائیں:

قال المحقق ابن همامؒ في فتح القدير: وهذا الحديث غريب، ونقل ماروى مكحول عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ذلك. قال الشافعيؒ: قال أبويوسفؒ: إنما قال أبوحنيفةؒ هذا لأن بعض المشيخة حدثناعن مكحول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال:" لا ربا بين أهل الحرب" أظنه قال: "وأهل الإسلام" قال الشافعيؒ: وهذا الحديث ليس بثابت ولا حجة فيه، أسنده عنه البيهقي...وهذا لايفيد لمعارضة إطلاق النصوص إلا بعد ثبوت حجية حديث مكحول، وقد يقال: لوسلم حجيته فالزيادة بخبر الواحد لاتجوز.

(فتح القدير:٧/٣٩،باب الربا، دار الفكر).

حاشیہ میں محقق سعدی چلپی فرماتے ہیں:

أقول: قال ابن العز: قال في المغني: هذا خبر مجهول لم يرو في صحيح ولامسند ولاكتاب موثوق به، وهو مع ذلك مرسل . ويحتمل أن المراد بقوله: لاربا النهي عن الربا كقوله تعالىٰ: فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج. انتهى. وعلى تقديرصحته لايصلح مقيداً للمطلقات مثل لا تأكل الربا، إذ لايزاد بخبر الواحد على الكتاب. (حاشية فتح

القدیر:۳۹/۷،دارالفکر)۔

وقال العلامة العينيؒ: هذا حديث غريب ليس له أصل. (البنایة فی شرح الهدایة:۱۶۵/۳)۔

وفي معرفة السنن والآثار: قال الأوزاعي: الربا عليه حرام في دارالحرب وغيرها...وقال أبويوسفؒ: القول ما قال الأوزاعي. وإنما أحل أبوحنيفةؒ هذا لأن بعض المشيخة حدثنا عن مكحول عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أنه قال: لا ربا بين أهل الحرب أظنه قال:" وأهل الإسلام" قال الشافعيؒ: القول كما قال الأوزاعي وأبويوسفؒ وما احتج به أبويوسفؒ لأبي حنيفةؒ ليس بثابت ولاحجة فيه. (معرفة السنن والآثار للامام البیهقی،۴۷/۷، باب بیع الدرهم بالدرهمین فی ارض الحرب، کتاب السیر، بیروت)۔

وکذا فی الأم للامام الشافعیؒ :۳۷۹/۴، بیع الدرهم بالدرهمین فی ارض الحرب، دارالفکر۔وفی نصب الرایة لأحادیث الهدایة:۴۴/۴)۔

وقال الإمام النووي: والجواب عن حديث مكحول أنه مرسل ضعيف فلاحجة فيه ولو صح لتأولناه على أن معناه لايباح الربا في دارالحرب جمعاً بين الأدلة. (المجموع شرح المهذب:۳۹۲/۹،باب الربا،دارالفکر)۔

وقال المحقق ابن قدامة الحنبليؒ: وخبرهم مرسل لانعرف صحته ويحتمل أنه أراد النهي عن ذلک، ولايجوزترک ماورد بتحريمه القرآن وتظافرت به السنة وانعقد الإجماع على تحريمه بخبرمجهول لم يرد في صحيح ولامسند ولاكتاب موثوق به وهو مع ذلک مرسل محتمل . (المغنی :۱۶۳/۴،باب الرباوالصرف،بیروت)۔

وفي حاشية الروض المربع شرح زادالمستقنع : وماروي "ولاربا بين المسلم وأهل الحرب" خبرمجهول، لايترک له تحريم مادل عليه الكتاب والسنة. (حاشیة الروض لعبدالرحمن الحنبلی،ص۱۳۹۲)۔

وفي مطالب أولى النهى: وحديث مكحول...رد بأنه خبر مجهول، لاتترک له تحريم مادل عليه القرآن والسنة الصحيحة. (مطالب اولی النهی لمصطفی السیوطی الحنبلی:۱۸۹/۳،دمشق)۔

وفي الموسوعة الفقهية الكويتية: ذهب جمهور الفقهاء إلى أن الربا حرام في دار الحرب كحرمته في دار الإسلام، وقالوا: إن النصوص في تحريم الربا عامة، ولم يفرق بين دار ودار، ولا بين مسلم وغيره. (الموسوعة: ۲۰/۲۰۸، الربا في دار الحرب).

(۲) حضرت عباس رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر یا اس کے بعد مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مگر آپ نے ہجرت نہیں فرمائی تھی، پھر ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

ربا الجاهلية موضوع وأول ربا أضعه ربانا ربا عباس بن عبد المطلب رضي الله عنه فإنه موضوع كله. (رواه ابو داود: ۱/۲۶۳، كتاب البيوع). گویا حجۃ الوداع کے واقعہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سودی کاروبار پر امتناع عائد نہیں فرمایا یہ اس لیے کہ مکہ دار الحرب تھا اور دار الحرب کے حربیوں سے سود لینا جائز تھا۔

الجواب: علماء نے اس حدیث کے مختلف جوابات دئے ہیں:

(الف) ممکن ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور پر اس کی اجازت دی گئی ہو۔

(باء) امام سبکیؒ نے یہ توجیہ فرمائی ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سودی معاملہ جاری رکھنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، اور اگر قبولِ اسلام کے بعد بھی جاری رکھا ہو تو ممکن ہے کہ لاعلمی اور ناواقفیت کی بنا پر ہو۔ یا ممکن ہے کہ یہ حدیث باقی ماندہ سود سے متعلق ہو جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے پہلے کا ہو۔

(ج) ممکن ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حرمت کے بعد ربا النسیہ کو چھوڑ دیا ہو اور ربا الفضل کو جائز سمجھتے ہو۔

(د) یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تک سود کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ سود کی قطعی حرمت ۹ھ میں آیتِ کریمہ: ﴿يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقي من الربا إن كنتم مؤمنين﴾ کے نزول کے بعد ہوئی۔

اس قول کی تائید دو واقعات سے ہوتی ہے:

(۱) بنو ثقیف نے قبولِ اسلام کے وقت چند شرطیں لگائیں ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ لوگوں کے ذمہ ان کی سودی رقوم باقی ہیں ان کو اس کے وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو منظور فرمالیا تھا۔

(۲) فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا

اس وقت بنوعمرو بن عمیر بن عوف کی سودی رقوم بنومغیرہ کے ذمہ باقی تھیں، تو بنومغیرہ نے جو کہ مسلمان ہو چکے تھے ادا کرنے سے انکار کر دیا، حضرت عتاب رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قضیہ کی بابت خط لکھا، اسی موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ﴿یا أیها الذین آمنوا اتقوا اللّٰه وذروا مابقي من الربا إن کنتم مؤمنین﴾.

اگر ان تاویلات کو ہم قبول نہ کریں تو پھر یہ واقعہ خود احناف کی رائے کے لیے بھی مفید نہ ہوگا کیونکہ رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ دارالاسلام بن چکا تھا تو گویا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دارالاسلام بننے کے بعد بھی سودی کاروبار جاری رکھا، حالانکہ یہ بالاتفاق حرام ہے۔

مذکورہ بالا توجیہات کو ڈاکٹر نزدیہ حماد (جامعہ ام القری مکہ مکرمہ) نے "أحکام التعامل بالربا بین المسلمین وغیر المسلمین" میں جمع کیا ہے، جس کا خلاصہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے جدید فقہی مسائل میں نقل فرمایا ہے، اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل:۴/ ۵۸-۶۲).

(۳) طرفینؒ کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حربی کا مال معصوم اور قابل احترام نہیں اور حرمت مال معصوم کے لینے کی ہے، اس لیے حربی سے سود لینا جائز ہے۔

الجواب: عہد وامان کا منجملہ اسبابِ عصمتِ اموال ہونا فقہاء کے ہاں مسلم ہے، اسی وجہ سے دار الاسلام میں مقیم ذمی سے سود لینا جائز نہیں ہے، اور دارالحرب سے امان لیکر آنے والے حربی مستامن سے بھی سود لینا ناجائز ہے، پس دارالحرب میں امان لے کر جانے والے مسلمان کا چونکہ دارالحرب کے تمام باشندوں سے بحیثیتِ اجتماعی عہد ہو چکا ہے اس لیے اس کے حق میں ان کے اموال کو بھی معصوم قرار دیا جائیگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح سود کی اجازت دینے سے قوی احتمال ہے کہ حدودِ شرعیہ کی حرمت اور شناعت کا تصور مسلمانوں کے دلوں سے بتدریج ختم ہو جائے، اور یہ اتنا بڑا مفسدہ ہے کہ تنہا اس کی حرمت کے لیے کافی ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں مذہب احناف میں امام ابو یوسفؒ کا قول زیادہ قوی اور احوالِ زمانہ کے مناسب ہے، اس لیے امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ (مستفاد از جدید فقہی مسائل:۴/ ۶۲).

علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ امام ابو یوسفؒ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے، لہذا زیادہ تجربہ کی وجہ سے معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا جائیگا۔

ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی میں ہے:

وکل فرع بالقضا تعلقاً ☆ قول أبي یوسفؒ فیه ینتقیٰ

وفـي الـقـنـية من باب المفتي: الفتوىٰ على قول أبي يوسفؒ فيما يتعلق بالقضاء لزيادة تـجـربتـه وكـذا فـي البـزازية، مـن الـقـضـاء ،أي لـحصول زيادة العلم بتجربته ولهذا رجع أبـوحـنيفةؒ عن القول بأن الصدقة أفضل من حج التطوع لما حج وعرف مشقته . (شرح عقود رسم المفتي،ص۲۸،۲۹). واللہ ﷻ اعلم۔

دارالاسلام ودارالحرب ودارالامن کے مابین فرق:

سوال: دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامن میں کیا فرق ہے؟ اور کیا آج کل دارالحرب پایا جاتا ہے یا نہیں؟ کیا امریکہ اور یورپ کے ممالک کو دارالحرب کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: دارالاسلام: وہ مملکت ہے جہاں مسلمانوں کو ایسی سیاسی فوقیت حاصل ہو کہ وہ تمام احکامِ اسلامی کے نفاذ پر قادر ہوں۔

دارالحرب: وہ مملکتِ کافرہ ہے جہاں کافروں کو امن حاصل ہو اور مسلمان شہری امن سے محروم ہوں، نیز وہاں مسلمان مذہبی حقوق وعبادات اور جمعہ وعیدین وغیرہ کی علانیہ انجام دہی سے قاصر ہوں۔

دارالامن: وہ ملک ہے جہاں کلیدِ اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں لیکن مسلمان مامون ہوں، مسلمان دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں، اور ان اسلامی احکام پر، جن کے نفاذ کے لیے اقتدار ضروری نہ ہو، عمل کر سکتے ہوں۔

مذکورہ بالا تعریفات پر مدِ نظر رکھتے ہوئے آج کل کے غیر مسلم ممالک کو دارالحرب کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے، بنابریں اکثر غیر مسلم ممالک دارالامن کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (قاموس الفقہ:۳/۳۹۵-۳۹۹-جدیدفقہی مسائل:۴/۶۲-۸۲-والجهاد في الإسلام للدكتور محمد سعيد رمضان البوطي، ۸۰-واحسن الفتاوی:۳/۲۱-بدائع الصنائع:۷/۱۳۰، سعید- والفتاوى الهندية:۲/۲۳۲-وردالمحتار:۴/۱۷۵، سعید). واللہ ﷻ اعلم۔

گندم کو آٹے کے عوض فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس گندم یا چاول ہے اور اس شخص کو گندم کے آٹے یا چاول کے آٹے کی

ضرورت ہے تو کیا یہ گندم دے کر اس کے برابر آٹا لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کیا تدبیر ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ گندم یا چاول کا آٹا اس آٹے سے جو گندم یا چاول میں ہے یقیناً زائد ہو اور عوضین نقد ہوں تو یہ صورت جائز ہے اس میں ربا متحقق نہیں ہوگا۔ کیونکہ کیلی یا وزنی چیز کا تبادلہ ہم جنس کے ساتھ ہو تو برابر ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے ورنہ ربا متحقق ہوگا، اور اس صورت میں آٹا آٹے کے مقابلہ میں ہوگا اور زائد آٹا بھوسی کے مقابلہ میں ہوجائیگا۔ آج کل بھوسی بھی مال ہے جانوروں کے کھلانے اور دباغت وغیرہ کے کام آتی ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عبادة بن الصامت ﷺ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ''الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبربالبر، والشعيربالشعير، والتمربالتمر، والملح بالملح، مثلاً بمثل، سواء بسواء، يداً بيدٍ، فإذا اختلفت هذه الأصناف، فبيعوا كيف شئتم إذا كان يداً بيدٍ. (رواه مسلم: ۲/۲۵، باب الربا).

ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز بيع الحنطة بالدقيق ولا بالسويق لأن المجانسة باقية من وجه...والمعيار فيهما الكيل لكن الكيل غيرمسوّ بينهما وبين الحنطة لاكتنازهما فيه وتخلخل حبات الحنطة فلا يجوز وإن كان كيلاً بكيل. (الهداية:۳/۸۲،باب الربا).

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے اس بیع کو اس بنیاد پر ناجائز کہا ہے کہ حنطہ اور دقیق کے درمیان کیل میں برابری نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک گندم ابدی طور پر کیلی رہیگا اس کے منصوص علیہ ہونے کی وجہ سے البتہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک اصل عرف کا اعتبار ہے۔ اور فتویٰ امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے۔

ملاحظہ فرمائیں محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

الكيل في الشيء أوالوزن فيه ماكان في ذلك الوقت إلا لأن العادة إذ ذاك بذلك وقد تبدلت فتبدل الحكم...يصار إلى العرف الطاري بعدالنص بناء على أن تغير العادة

يستلزم تغير النص حتى لو كان صلى اللّٰه عليه وسلم حياً لنص عليه... (فتح القدير:۷/۱۵،باب الربا، دارالفكر۔ و كذا في البناية :۳/۱۵۲).

وفي الدرالمختار: وعن الثاني اعتبار العرف مطلقاً ورجحه الكمال وخرج عليه سعدي افندي استقراض الدراهم عدداً وبيع الدقيق وزناً يعني بمثله و في الكافي الفتوىٰ على عادة الناس، بحر، وأقره المصنف. وفي الشامية: وملخصه : إن النص معلول بالعرف فيكون المعتبر هو العرف في أي زمن كان ولايخفى أن هذا فيه تقوية لقول أبي يوسفؒ فافهم. (الدرالمختار مع فتاوى الشامي:۵/۱۷۶،۱۷۷،مطلب في ان النص اقوىٰ من العرف،سعيد).

بدائع الصنائع میں ہے:

وروي عن أبي يوسفؒ أنه إذا غلب استعمال الوزن فيها تصير وزنية ويعتبر التساوى فيها بالوزن وإن كانت في الأصل كيلية . (بدائع الصنائع:۵/۱۹۴، فصل في شرائط جريان الربا،سعيد).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

وقد وجد في الغياثية : عن أبي يوسفؒ أنه يجوز استقراضه وزناً إذا تعارف الناس ذلک وعليه الفتوىٰ، انتهىٰ. (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:۳/۱۰۹).

عزیز الفتاویٰ میں ہے:

محقق ابن ہمامؒ نے اس کو ترجیح دی ہے اور کافی میں کہا: **" الفتوىٰ على عادة الناس".** (عزیز الفتاویٰ: جلد اول،ص ۶۲۵،کتاب الربا والقمار).

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی گیہوں کو وزنی قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو بہشتی زیور میں ہے:

اگر دونوں طرف ایک ہی چیز ہو اور وہ چیز تول کر بکتی ہے جیسے گیہوں کے عوض گیہوں ...تب تو وزن میں برابر ہونا بھی واجب ہے۔(بہشتی زیور،ص ۴۰۳).

فتح القدیر میں ہے:

لأنهما أى السويق والدقيق من أجزاء الحنطة: وإنما لم يقل أجزاؤها لأن من أجزائها النخالة أيضاً. (فتح القدير:۷/۲۲).

ہدایہ میں ہے:

ولا یجوز بیع الزیتون بالزیت والسمسم بالشیرج حتی یکون الزیت والشیرج أکثر مما فی الزیتون والسمسم فیکون الدھن بمثله والزیادة بالثجیر...ولو لم یعلم مقدار ما فیه لایجوز لاحتمال الربا والشبهة فیه کالحقیقة. (الهداية:۳/۸۵، باب الربا).

عطر ہدایہ میں ہے:

سوال: گیہوں سے اس کے آٹے کو بدلنا کس صورت سے جائز ہے؟

الجواب: گیہوں سے اس کے آٹے کو بدلنا احقر کے نزدیک تو مثل سرسوں اوراس کے تیل کے اسی صورت میں جائز ہے کہ نکلا ہوا آٹا اس آٹے سے جو گیہوں میں ہے یقینی طور پر زائد ہو اور عوضین نقد ہوں۔ (عطر ہدایہ،ص ۴۰۸).

مزید ملاحظہ فرمائیں: (معلم الفقہ ترجمہ اردو مجموعۃ الفتاویٰ: جلد دوم،ص ۱۲۸، کتاب البیوع).

لیکن کبھی یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ آٹا زیادہ ہے یا کم تو اس وقت درجِ ذیل حیلہ استعمال کرسکتے ہیں:

حیلہ یہ ہے کہ گندم والا اپنے گندم پیسے کے عوض بیچ دے پھر اس پیسے سے آٹا خرید لے لیکن بیع اول میں بیع ثانی مشروط نہیں ہونی چاہئے۔

ملاحظہ ہو مسلم شریف کی روایت سے اس کا جواز مترشح ہوتا ہے۔

إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بعث أخا بني عدي الأنصاري فاستعمله علی خیبر فقدم بتمر جنیب، فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم:" أکل تمر خیبر ھکذا؟ قال : لا، واللّٰه یارسول اللّٰه ! إنا لنشتری الصاع بالصاعین من الجمع، فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: " لاتفعلوا، ولکن مثلاً بمثل أوبیعوا ھذا واشتروا بثمنه من ھذا ، وکذلک المیزان. (رواہ مسلم:باب بیع الربا:۲/۲٦).

عطر ہدایہ میں ہے:

اس کا حیلہ جائز یہ ہے کہ پہلی سرسوں کو بعوض روپیہ پیسہ کے بیچا جائے پھر روپیہ پیسہ جو بعوض ملا ہو اس سے یا نہ ملا ہو تو خریدار کے ذمہ جو سرسوں کی قیمت واجب ہوگئی ہے اس رقم واجب الادا سے اسی خریدار سے جس قدر چاہے تیل نقد ہو خواہ ادھار خرید لے، یکے بعد دیگرے ان دونوں بیعوں کے ایک ہی مجلس میں صرف زبانی ایجاب وقبول ہی صحیح ہوجانے سے سرسوں بعوض تیل بدلنے کا مقصود جو ہے وہ پورے طور سے حاصل ہوجائے گا،

لیکن یہ مقصود صحیح طور پر تب ہی حاصل ہو سکے گا کہ پہلی بیع کو دوسری بیع کئے جانے کے ساتھ معلق نہ کیا جائے نیز دونوں عقد بائع ومشتری دونوں کی رضامندی سے ہوں اگر پہلی بیع اس شرط پر کی جائے کہ دوسری بیع بھی کی جائے گی یا ان دونوں میں سے کوئی بیع جبر یا مروت کی وجہ سے کی گئی تو جائز نہ ہوگا۔ (عطر ہدایہ، ص ۲۰۷).

امام محمدؒ حیلہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

ما احتال به المسلم حتى يتخلص به من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال فلا بأس به ، وما احتال به حتى يبطل حقاً أو يحق باطلاً أوليدخل به شبهة في حق فهومكروه. (فتح الباری:۱۲/ ۳۳۱۔وکذا فی المبسوط للامام السرخسیؒ: ۳۰/ ۳۷۳، کتاب الحیل، در الفکر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

سرسوں کو اس کے تیل کے عوض فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے علاقے میں سرسوں کی پیداوار زیادہ ہے، بعض لوگ دکاندار کے پاس ایک کیلو سرسوں لے جاتے ہیں اور اس کے بدلے میں آدھا کیلو سرسوں کا تیل لیتے ہیں ایک عالم دین نے بتلایا کہ اس بیع کے لیے ضروری ہے کہ دکاندار کا تیل سرسوں کے اندر کے تیل سے زیادہ ہو، لیکن اکثر تو دکاندار کا تیل سرسوں والے تیل سے کم ہوتا ہے کیونکہ سرسوں سے تیل نکالنے کی محنت کے معاوضہ کو بھی دکاندار سامنے رکھتا ہے، تو اس معاملہ کے جواز کی کیا صورت ہے؟

الجواب: مذکورہ بالا معاملہ کے جواز کی تدبیر یہ ہے کہ مشتری سرسوں کو قیمت کے عوض فروخت کردے اور اس قیمت سے سرسوں کا تیل خرید لے، اس حیلہ سے یہ معاملہ بے غبار درست ہو جائیگا۔

ملاحظہ فرمائیں صحیحین کی روایت میں ہے:

عن سعيد بن المسيب أن أبا سعيد الخدري ﷺ وأبا هريرة ﷺ حدثاه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث سواد بن غزية ﷺ وأمره على خيبر، فقدم عليه بتمرجنيب يعني الطيب، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أكل تمرخيبرهكذا"؟ قال: لا، والله يارسول الله! إنا نشترى الصاع بالصاعين والصاعين بالثلاثة من الجمع ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا تفعل، ولكن بع هذا واشتر بثمنه هذا ، وكذلك الميزان. أخرجه الشيخان. (نصب الراية: ٤/ ٣٦، باب الربا۔رواه البخاری فی باب اذا أراد بيع تمر بتمر خير

منه، ۱/ ۲۹۳ ۔ومسلم:۲/ ۲٦، باب الربا)۔

التعلیق الممجد میں ہے:

قوله عليه السلام: لاتفعل بع تمرك بالدراهم ثم اشتر بالدراهم جنيباً، وقال: في الميزان مثل ذلك، أى قال: ما يوزن إذا احتيج إلى بيع بعضه ببعض مثل ذلك القول الذي قال في التمر المكيل أى يباع غير الجيد الموزون بثمن ثم يشتري به موزون جيد... قوله بع تمرك الخ أشار إليه بما يجتنب به عن الربا مع حصول المقصود، وبه احتج جماعة من فقهائنا وغيرهم على جواز الحيلة في الربا وبنوا عليها فروعاً. (التعليق الممجد:على هامش المؤطاللامام محمد،ص ۳٥٤، قديمى كتب خانه)۔

وكذا في مرقات المفاتيح: (٦/ ٦٢، ٦٣)۔

تکملۃ فتح الملہم میں ہے:

إن الحيلة كلما أوجبت إبطال حكمة شرعية لاتقبل، كحيلة سقوط الزكاة وسقوط الاستبراء، وأما إذا توصل بها الرجل إلى ما يجوزفعله ودفع المكروه بها عن نفسه وعن غيره فلا بأس بها... واستدل على جواز الحيلة المشروعة بقوله تعالىٰ: ﴿وخذ بيدك ضغثاً فاضرب به ولاتحنث﴾ (سورة صٓ، الآية:٤٤)۔ **فإن ذلك تعليم حيلة، وبقوله تعالىٰ: ﴿فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية في رحل أخيه﴾** (سورة يوسف، الآية:٧٠)۔ **فإنه حيلة ... قال العبد الضعيف عفا الله عنه: ومن أقوى ما يدل على جواز الحيلة المشروعة ما أخرجه الشيخان والنسائي عن أبي سعيد رضي الله عنه وأبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استعمل رجلاً على خيبر...وإنما هو تعليم حيلة للتوصل إلى طريق حلال، فما كان من هذا القبيل فهو جائز قطعاً.** (تكملة فتح الملهم:١/ ٥٦٥)۔

مبسوط میں ہے:

فالحاصل أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أويتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق الرجل حتى يبطله أوفي باطل حتى يموهه أوفي حق الرجل حتى يدخل فيه شبهة، فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على

السبيل الذي قلنا أولاً فلا بأس به...أن المفتي إذا بين جواب ماسئل عنه فلا بأس أن يبين للسائل الطريق الذي يحصل به مقصود مع التحرز عن الحرام، ولايكون هذا مما هو مذموم من تعليم الحيل، بل هو اقتداء برسول الله صلى الله عليه وسلم حيث، قال لعامل خيبر: هلا بعت تمرک بسلعة ثم اشتريت بسلعتک هذا التمر. (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۲۰۹/۳۰).

عطر ہدایہ میں ہے:

اس کا حیلہ جائز یہ ہے کہ پہلی سرسوں کو بعوض روپیہ پیسہ کے بیچا جائے پھر روپیہ پیسہ جو بعوض ملا ہو اس سے یا نہ ملا ہو تو خریدار کے ذمہ جو سرسوں کی قیمت واجب ہوگئی ہے اس رقم واجب الادا سے اسی خریدار سے جس قدر چاہے تیل نقد ہو خواہ ادھار خرید لے، یکے بعد دیگرے ان دونوں بیعوں کے ایک ہی مجلس میں صرف زبانی ایجاب وقبول ہی صحیح ہو جانے سے سرسوں بعوض تیل بدلنے کا مقصود جو ہے وہ پورے طور سے حاصل ہو جائے گا، لیکن یہ مقصود صحیح طور پر تب ہی حاصل ہو سکے گا کہ پہلی بیع کو دوسری بیع کئے جانے کے ساتھ معلق نہ کیا جائے نیز دونوں بیعیں بائع ومشتری دونوں کی رضامندی سے ہوں اگر پہلی بیع اس شرط پر کی جائے کہ دوسری بیع بھی کی جائے گی یا ان دونوں میں سے کوئی بیع جبر یا مروت کی وجہ سے کی گئی تو جائز نہ ہوگا۔ (عطر ہدایہ، ص ۴۰۷).

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۶۲/۴). واللہ ﷻ اعلم۔

بونڈ پر مکان خریدنے کا حکم:

سوال: کیا مکان کو بونڈ پر خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: بونڈ کی تعریف انسائیکلو پیڈیا برطانکا میں اس طرح مرقوم ہے:

The term `Bond' has been defined in the encyclopedia Brittanica vol 2; pg 140; as follows:

A loan contract issued by local, state and national governments, and by private corporations specifying an obligation to return borrowed funds. The borrower promises to pay interest on the debt when due (usually semi-annually) at a stipulated percentage of the Face value of the bond.

وہ قرضہ ہے جو کسی حکومت یا کمپنی کی طرف سے اس شرط پر دیا جائے کہ قرض دار اس قرضہ کو سود کی ایک خاص مقدار کے ساتھ ادا کرے گا۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ بونڈ لینا ایک سودی معاملہ ہے جو موبقات میں سے شمار ہوتا ہے بلا شدید مجبوری سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ اور معصیت ہے، اس لیے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا، مگر کبھی کبھی ایسے قرض لینا ضرورت بن جاتی ہے اور تجارت، کاشت اور کاروبار کے لیے ایسے قرض لینا ناگزیر ہو جاتا ہے، ان حالات میں بدرجہ ضرورت ایسے قرض لینے کی اجازت ہوگی، البتہ یہ اجازت اسی وقت ہوگی جب آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضرورتوں، کھانا، کپڑا اور مکان کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے، نہ کہ محض تعیش، آرام طلبی اور معاشی معیار بلند کرنے کے لیے ایسا کرے۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۴۸).

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وفي القنية، والبغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح. (الاشباه والنظائر: ۱/۲۶۷).

علامہ حمویؒ اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وذلک نحوه أن يقترض عشرة دنانير مثلاً و يجعل لربها شيئاً معلوماً في كل يوم ربحاً. (حاشية الحموى على الاشباه: ۱/۲٦۷، القاعدة الخامسة الضرر يزال).

وفي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: وعن جابر بن عبد الله ﷺ، لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهده، وقال: "هم سواء" ولايحل إلا عند الضرورة الملجئة، استناداً للقاعدة الفقهية [الضرورات تبيح المحظورات] التي استمدت حجيتها من الآية الكريمة: ﴿إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير...فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه﴾ [البقرة: ۱۷۳] **فمن ألجأته الضرورة إلى الأكل من هذه المحرمات فيباح له ذلک بشرط أن يأكل منها غير قاصد التلذذ، ولا يتعدى في مقدار ما يأكل حد الضرورة، بل يقصد دفع الضرورة وحفظ الحياة، فالضرورات تقدر بقدرها،...**

وهـذا الـحـكم أيضاً ينسحب على الربا، فهو محظور لايحل إلا في حال الضرورة الملجئة.

(الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:٤/ ٢٥٠،انواع الربا،الضرورات تبیح المحظورات).

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سودی قرض کی گنجائش فقط ضرورت اور مجبوری کی حالت میں ہے جس وقت حرام بھی حلال ہوجاتا ہے، عام حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

ضرورت اور حاجت کے درجات:۔

ضرورت وحاجت وغیرہ کے بارے میں علامہ حمویؒ اشباہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

هھنا خمسة مراتب: ضرورة وحاجة ومنفعة وزينة وفضول .

فـالـضـرورة: بلوغه حداً إن لم يتناول الممنوع ، هلک أوقارب ، وهذا يبيح تناول الحرام .

والـحـاجة : كـالـجـائـع الـذي لو لم يجد ما يأ كله لم يهلک غير أنه يكون في جهد ومشقة ، وهذا لا يبيح الحرام ، ويبيح الفطر فى الصوم .

والمنفعة : كالذي يشتهي خبز البر ولحم الغنم والطعام الدسم .

والزينة: كالمشتهي بحلوى والسكر .

والفضول : التوسع بأكل الحرام والشبهة. (حاشية الاشباه والنظائر:١/ ٢٥٢،القاعدة الخامسة: الضرريزال).

(مثله فی المقالات الفقهية ،ص ٣٢٠ ، الضرورة والحاجة المرخصة، مكتبة دارالعلوم كراتشی).

صورتِ مسئولہ میں بظاہر یہ نوبت نہیں آتی ہے کہ اگر مکان کے لیے قرض نہیں لے گا تو ہلاک ہوجائیگا، کیونکہ مکان کا مالک بننا ضرورت میں داخل نہیں ہے، بلکہ کرایہ کے مکان سے بھی کام چل سکتا ہے، ہاں بعض مرتبہ حاجت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں شدید ضرر یا مشقت کا اندیشہ ہوتا ہے تو ایسی صورت میں فقہاء نے حاجت کو بمنزلہ ضرورت قرار دیا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أوخاصة ولهذا جوزت الإجارة على خلاف الـقـيـاس لـلـحـاجة... وفـي الـقـنـية ، والـبـغية: يجوزللمحتاج الاستقراض بالربح . (الاشباه

والنظائر: ۱/۲٦٧).

اور حاجتِ شدیدہ اور مشقت کا تعین حالات، اشخاص اور مختلف علاقوں کے اعتبار سے ہوگا، ہر جگہ، ہر شخص کے لیے ایک پیمانہ نہیں چل سکتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سودی معاملہ کے بارے میں قرآن واحادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ نیز اقتصادی طور پر بھی سودی قرض لینا مضر ہے کیونکہ ایسے قرض سے اکثر وبیشتر چھٹکارا نہیں ملتا اور ہمیشہ آدمی ایک عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سود لینا اور سود دینا حرام ہے، اگر گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو تو محتاج کے لیے بقدرِ ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱٦/۳۰۲).

دوسری جگہ مرقوم ہے:

سود دینا حرام ہے، ایسے شخص پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے، حرام کا ارتکاب اضطرار کی حالت میں معاف ہے، پس اگر جان کا قوی خطرہ ہے، یا عزت کا قوی خطرہ ہے، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں، مثلاً نہ جائداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے، اور اگر ایسی ضرورت نہیں بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لیے ضرورت ہے، یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے، یا جائداد فروخت ہوسکتی ہے، تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں، کبیرہ گناہ ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱٦/۳۰۵۔۳۰٦، فاروقیہ).

نیز مرقوم ہے:

سوال: وہ کون سی ضرورت ہے جس میں سودی قرض لینا جائز ہے؟

الجواب: ناقابل برداشت مجبوری کے وقت سود لینے سے گناہ نہ ہونے کی توقع ہے، **هكذا حكم سائر المحرمات**۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱٦/۳۷۸، فاروقیہ).

فتاویٰ محمودیہ کی تعلیقات میں مرقوم ہے:

وإذا كان لإنسان حاجة أوضرورة ملحة اقتضت معطى الفائدة أن يلجأ إلى هذا الأمر فإن الإثم في هذا الحال يكون على آخذ الربا، (الفائدة) وحده، وهذا بشرط أن تكون هناك حاجة أو ضرورة حقة لامجرد توسع في الكماليات أو أمور يستغنى عنها. (الحلال والحرام فی الاسلام لیوسف، القرضاوی، ص۲۱۹، بیروت).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (نظام الفتاویٰ:۱/۱۸۶۔ فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۲۷، باب القرض۔ وکتاب الفتاویٰ:۵/۳۲۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم والے کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کے پاس سود کی رقم بعینہٖ موجود ہے تو کیا ہم اس کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ اپنے دین میں ادا کرنا چاہے تو ہم اپنے دین کے عوض وصول کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور مسلمان اور کافر کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟ بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مسلمان کی کسی رقم کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ حرام ہے تو اس کے عوض کوئی شئی فروخت کرنا اور وہ پیسہ حاصل کرنا ناجائز ہے، جہاں یقینی طور پر معلوم نہ ہو وہاں گنجائش ہے۔ لیکن اگر کافر کے پاس سودی رقم ہو تو وہ رقم قرض میں وصول کرنے کی اجازت ہے، جب تک کہ وہ حرام عقلی وقبیح عقلی کا مثلاً خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب نہ کرے۔

ملاحظہ ہو امداد الاحکام میں ہے:

کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لیے خطاب عام کافی نہیں، بلکہ التزام بھی شرط ہے، اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا، نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں، لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا سے خواہ غصب سے خواہ بیوعِ باطلہ وفاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہرصورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا، اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے۔ (امداد الاحکام:۴/۳۹۰، معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو كان لمسلم على نصراني دين، فباع النصراني خمراً أخذ بثمنها وقضاه المسلم من دينه، جازله أخذه، لأن بيعه له مباح، ولو كان الدين لمسلم على مسلم فباع المسلم خمراً وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدين، كره له أن يقبض ذلک من دينه، كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:٥/٣٦٧، كتاب الكراهية، باب في القرض و الدين)۔

البحر الرائق میں ہے:

وكره لرب الدين أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا كافر، يعني إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمراً وأخذ ثمنها وقضى الدين لايحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه وإن كان البائع كافراً جاز له أن يأخذ والفرق أن البيع في الوجه الأول باطل فلم يملك البائع الثمن وهو باقٍ على ملك المشتري فلا يحل له أن يأخذ مال الغير بغير رضاه والبيع في الوجه الثاني صحيح فملك البائع الثمن لأن الخمرمال متقوم في حق الكافر فجاز له الأخذ بخلاف المسلم. (تکملۃ البحر الرائق:۸/۲۰۱، کوئٹہ).

وللاستزادة انظر: (فتاوى الشامي:٦/٣٨٥،فصل في البيع،سعيد۔وتبيين الحقائق:٧/٤٦٨،كتاب الكراهية).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جس پیسہ کے متعلق قطعی طور پر علم ہو کہ یہ حرام ہے اس کے عوض کوئی شئی فروخت کرنا اور وہ پیسہ حاصل کرنا درست نہیں، جہاں علم نہ ہو وہاں گنجائش ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۲۷۳، کتب خانہ مظہری۔ وجواہر الفتاویٰ:۳/۲۹۴).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام:۴/۳۸۶-۳۹۰۔ ومنتخبات نظام الفتاویٰ، ص۴۶۷ پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت). واللہ ﷻ اعلم۔

سودی کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص ایک کمپنی کے ذریعہ مشین منگواتا ہے، جب تک کمپنی کو رقم ادا نہیں کی جاتی اس وقت تک کمپنی مشین کا کرایہ وصول کرتی ہے، لیکن کمپنی بینک کے ساتھ سودی کاروبار کرتی ہے یعنی بینک سے سود پر رقم لیتی ہے اور اس سے مشینیں وغیرہ خریدتی ہے اور پھر اس رقم پر سود ادا کرتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کمپنی سے مشین خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ خریدار کوئی سود ادا نہیں کرتے بلکہ یہ صرف کمپنی کا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر زید نے مشین ایک لاکھ رینڈ میں مثلاً کمپنی کی وساطت سے خریدی اور کمپنی نے ایک لاکھ ادا کیا اور اب کمپنی اقساط میں ایک لاکھ بیس ہزار وصول کریگی تو یہ سود ہے، اگر چہ اس کا نام کرایہ رکھے اور اگر کمپنی نے مشین ایک لاکھ میں خریدی اور زید کو ایک لاکھ بیس ہزار مؤجل میں مثلاً فروخت کی تو یہ

مرابحہ ہے اور یہ جائز ہے۔

اور اگر مشین کمپنی کی رہیگی اور زید اس کو متعین کرایہ ہر ماہ دیتا رہے گا اور کچھ مدت مقررہ کے بعد زید مشین واپس کردے یا کمپنی زید کو کم قیمت پر بیچ دے یا ہبہ کردے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

رہا کمپنی کے سودی کاروبار کا معاملہ تو یہ اس کا اپنا فعل ہے اس سے خریداری متاثر نہ ہوگی، کیونکہ غیر مسلم کمپنی غیر مسلم ممالک میں سودی رقم سے مشین خریدتی ہے اور ہم ان کو اسلامی احکام پر مجبور نہیں کر سکتے، کیونکہ وہاں اسلامی حکومت نہیں ہے، پھر اس میں مسلمان براہِ راست سود کے لین دین میں ملوث نہیں ہے، اور مسلمان کا سود سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے تو ایسی کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے کی گنجائش ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کے ساتھ معاملات کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے بینک کے ساتھ کچھ سرمایہ کاری کے معاملات کئے تھے بینک کے قانون کی وجہ سے بینک نے اس شخص پر سود عائد کیا، تو کیا یہ سود دین کے حکم میں ہوگا؟ اور زکوۃ کے مسئلہ میں سود منہا کیا جائیگا یا نہیں؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے ربا کے معاملات کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے اسی طرح ربا والے بینک کے ساتھ سود کا لین دین بھی ناجائز اور حرام ہے، اس سے اجتناب کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر لازم اور ضروری ہے، قرآن واحادیث میں سودی لین دین کرنے والوں پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ لہذا ایسے معاملہ سے دل کی گہرائی سے توبہ کرنا چاہئے۔

تاہم ضرورت اور مجبوری یا غلطی کی وجہ سے یا فسق وفجور کی وجہ سے ایسا سودی معاملہ کرنے کی صورت میں بینک کی طرف سے سود لازم ہوا ہے تو فقہاء کی عبارات کے پیش نظر کہ نوائب جو ظلماً وصول کیے جاتے ہیں ان کو دین میں شمار کیا ہے اس وجہ سے مذکورہ بالا سودی قرضوں کو دین میں شمار کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ بینک کے دیون اکثر قسطوار ہوتے ہیں لہذا زکوۃ کے مسئلہ میں کل دین منہا نہیں کیا جائیگا بلکہ فقط اسی سال کی قسطیں منہا کر کے پورے مال کی زکوۃ ادا کی جائے گی، اس مسئلہ کی مزید تفصیل جلد سوم ابواب الزکوۃ کے تحت گزر چکی ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

وكذا النوائب ولو بغير حق كجنايات زماننا فإنها في المطالبة كالديون بل فوقها،

حتی لو أخذت من الأكار فله الرجوع على مالك الأرض وعليه الفتوىٰ. وفي الشامية: وإن أريد بها ما ليس بحق كالجنايات المؤظفة على الناس في زماننا ببلاد فارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان في كل يوم أو شهر فإنها ظلم فاختلف المشايخ في صحة الكفالة بها فقيل تصح إذ العبرة في صحة الكفالة وجود المطالبة إما بحق أو باطل.

(فتاوى الشامي: ۵/ ۳۳۰، سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وأما النوائب فإن أريد بها ما ليس بحق...فإنها ظلم اختلف المشايخ في صحة الكفالة بها كذا في فتح القدير، والفتوىٰ على الصحة كذا في شرح الوقاية وممن يميل إلى الصحة الشيخ الإمام البزدوي كذا في الهداية وقال النسفي وشمس الأئمة وقاضيخان مثل قول فخر الإسلام لأنها في حق توجه المطالبة فوق سائر الديون. (الفتاوى الهندية:۳/ ۲۹۱).

وللاستزادة انظر: (شرح العناية على هامش فتح القدير:۷/ ۲۲۲۔وفتح القدير: ۷/ ۲۲۳، دارالفكر).

وفي ردالمحتار: الدين ما وجب في الذمة بعقد أو استهلاك وما صار في ذمته ديناً باستقراضه فهو أعم من القرض كذا في الكفاية. (ردالمحتار:۵/ ۱۵۷،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

کمی بیشی کے ساتھ سٹیل کے برتن کے تبادلہ کا حکم:

سوال: بعض لوگ سٹیل کے پرانے برتن لاکر دکاندار سے نئے برتن لیتے ہیں، دکاندار سٹیل کا پرانا برتن تولتا نہیں، بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ اتنے روپے دیدو اور نیا برتن لیلو، کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سٹیل موزونات میں سے ہے جس میں ربا جاری ہوتا ہے، لہٰذا خرید وفروخت میں جانبین سے برابری ضروری ہے، پس اگر دونوں وزن میں برابر ہوں تو پھر ایک جانب سے مزید روپے لینا ناجائز ہوگا، ہاں پرانے برتن کو روپیوں کے عوض بیچ دے پھر ان روپیوں کے ساتھ مزید رقم ملا کر نیا برتن خرید لے تو یہ معاملہ بے غبار درست ہوگا۔

ملاحظہ ترمذی شریف میں ہے:

عن عبادة بن الصامت ﷺ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ”الذهب بالذهب مثلاً بمثل والفضة بالفضة مثلاً بمثل والتمر بالتمر مثلاً بمثل والبر بالبر مثلاً بمثل والملح بالملح مثلاً بمثل والشعير بالشعير مثلاً بمثل فمن زاد أو ازداد فقد أربى بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يداً بيدٍ...(رواه الترمذي:۱/۲۳۵،ابواب البيوع).

ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز بيع الجيد بالردي مما فيه الربا إلا مثلاً بمثل لإهدار التفاوت في الوصف ... وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنسا لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة. (الهداية:۳/۷۹،باب الربا).

صحیحین کی روایت میں ہے:

عن سعيد بن المسيب أن أبا سعيد الخدري ﷺ وأبا هريرة ﷺ حدثاه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث سواد بن غزية ﷺ وأمره على خيبر، فقدم عليه بتمر جنيب يعني الطيب، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”أكل تمر خيبر هكذا“؟ قال: لا، والله يارسول الله! إنا نشترى الصاع بالصاعين والصاعين بالثلاثة من الجمع، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ”لا تفعل، ولكن بع هذا واشتر بثمنه هذا، وكذلك الميزان. أخرجه الشيخان. (نصب الراية:۴/۳۶، باب الربا۔ رواه البخاري في باب اذا أراد بيع تمر بتمر خير منه،۱/۲۹۳۔ ومسلم:۲/۲۶، باب الربا).

التعلیق الممجد میں ہے:

قوله عليه السلام: لاتفعل بع تمرك بالدراهم ثم اشتر بالدراهم جنيباً، وقال: في الميزان مثل ذلك، أي قال: ما يوزن إذا احتيج إلى بيع بعضه ببعض مثل ذلك القول الذي قال في التمر المكيل أي يباع غير الجيد الموزون بثمن ثم يشتري به موزون جيد...قوله بع تمرك الخ أشار إليه بما يجتنب به عن الربا مع حصول المقصود، وبه احتج جماعة من فقهائنا وغيرهم على جواز الحيلة في الربا وبنوا عليها فروعاً. (التعليق الممجد:على هامش المؤطا للامام محمد،ص۳۵۴، قديمى كتب خانه).

مبسوط میں ہے:

فالحاصل أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أويتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلک أن يحتال في حق الرجل حتى يبطله أوفي باطل حتى يموهه أوفي حق الرجل حتى يدخل فيه شبهة، فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولاً فلا بأس به. (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۲۰۹/۳۰). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بینک میں پیسہ جمع رکھنے کا حکم:

سوال: بعض لوگ رفاہِ عام اور خیراتی کام کرتے ہیں، لیکن رقم کم ہونے کی وجہ سے بینک میں رکھ کر سود حاصل کرتے ہیں تاکہ پیسہ زیادہ ہو جائے، اور کبھی ایک بینک سے دوسرے بینک میں منتقل کرتے ہیں زیادہ سود حاصل کرنے کے لیے، کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: رفاہِ عام اور خیراتی کام کرنا بہت اچھا ہے، مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کام زیادہ سے زیادہ کرنا چاہئے، لیکن سود لینے کی غرض سے بینک میں پیسہ رکھنا ناجائز اور حرام ہے ایک مستحب کام کے لیے حرام کا ارتکاب کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، پھر ایک بینک سے نکال کر زیادہ سود حاصل کرنے کے لیے دوسرے بینک میں رکھنا تو اور زیادہ برا ہے، جو سود لیا ہے وہ ثواب کی نیت کے بغیر فقراء پر صدقہ کردیں، اور آئندہ کے لیے ایسا نہ کریں اور توبہ کرلیں، ہاں بغرضِ حفاظت پیسہ بینک میں رکھنے کی گنجائش ہے۔ تاہم احتیاط اولیٰ ہے۔

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں ہے:

حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم جمع کرنا درست ہے، پھر جو رقم بینک سے سود کے نام سے ملے اس کو مستحقین پر اور قرضہ میں دبے ہوئے اور پریشان حال مسلمانوں پر خرچ کردے۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ: ۱۸۸/۱).

نیز مرقوم ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ حفاظت کی غرض سے یا کسی مجبوری کی وجہ سے اگر بینک میں روپیہ جمع کرنا پڑے تو ایسے شعبہ یا کھاتہ میں جمع کرنے کی کوشش کرے جس میں سود کا حساب ہی نہ لگایا جاتا ہو۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ: ۱۹۰/۱).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

سوال: ایک کمیٹی جو عام مسلمانوں کی خدمت کرتی ہے اس نے کچھ رقم بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کی ہے جس میں سود نہیں ملتا مگر اب کمیٹی کے ممبران چاہتے ہیں کہ یہ رقم ''سیونگ اکاؤنٹ'' میں جمع کی جائے تا کہ اس کا سود ملے اور اسے مصیبت زدہ مسلمانوں پر خرچ کریں، کیا کمیٹی کا یہ اقدام از روئے شرع شریف درست ہوگا؟ اور سود میں ملی ہوئی رقم مسلمانوں پر خرچ کرنا درست ہوگا؟

الجواب: بینک میں حفاظت یا قانونی دشواریوں کی وجہ سے رقم رکھی جاسکتی ہے، سود حاصل کرنے کی نیت سے رقم رکھنا درست نہیں ہے، اگر چہ یہ نیت ہو کہ سود کی رقم محتاجوں کو دے دی جائے گی،....سود حاصل کرنے اور اسے غرباء پر خرچ کرنے کے ارادہ سے بینک میں رقم رکھنا جائز نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۷۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاویٰ:۵/۳۳۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اموالِ ربویہ میں تقابض فی المجلس کا حکم:

سوال: زید دکاندار کے پاس گیا دکاندار نے زید کو ایک کیلو گیہوں ایک کیلو چاول کے بدلے میں فروخت کیا دکاندار نے گیہوں کو تولا لیکن چاول تول کر دینے سے پہلے زید کو کسی نے بلایا وہ گیا اور دس منٹ کے بعد آیا یعنی مجلس بدل گئی تو کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: دکاندار نے اگر زید کے سامنے چاول کو تولا تھا پھر زید گیا اور آ کر چاول پر قبضہ کیا تو یہ معاملہ جائز ہو گیا، لیکن اگر دکاندار نے چاول کو ابھی تک تولا نہیں تھا تو زید کے جانے سے پہلا معاملہ ختم ہو گیا اب نئے سرے سے معاملہ کرنا چاہئے۔

ہدایہ میں ہے:

وما سواه أى ماسوى عقد الصرف مما فيه الربا من بيع الأموال الربوية بجنسها أو بخلاف الجنس يعتبر فيه التعيين ولايعتبر فيه التقابض، فلوافترقا بعد تعيين البدلين عن غير قبض جازعندنا. (الهداية،مع فتح القدير:۷/۱۸،باب الربا، دار الفكر)۔

ردالمحتار میں ہے:

والمعتبر تعيين الربوى في غير الصرف لأن غير الصرف يتعين بالتعيين ويتمكن من التصرف فيه، فلايشترط قبضه كالثياب أى إذا بيع ثوب بثوب بخلاف الصرف، لأن القبض

شرط فيه للتعيين، فإنه لايتعين بدون القبض كذ في الاختيار. (ردالمحتار:۵/۱۷۸،باب الربا،سعید).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

مکیلات اور موزونات کی بیع میں اتحادِ جنس یا اتحادِ قدر کے وقت نساء حرام ہے،البتہ قبض فی المجلس شرط نہیں صرف تعیین فی المجلس کافی ہے۔(احسن الفتاویٰ:۷/۱۳). واللہ ﷻ اعلم۔

معیارِ شرعی سے کم میں ربا کا تحقق:

سوال: فقہ کی عام کتابوں میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص نصف صاع سے کم میں سودی معاملہ کرے تو جائز ہے،مثلاً ایک لپ گندم کا آٹا دیکر دولپ لے تو یہ جائز ہے،کیا اس پر فتویٰ ہے یا نہیں؟ اور یہ کام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: شرعی معیار یعنی نصف صاع سے کم مقدار میں ہم جنس اموالِ ربویہ کا کمی بیشی کے باہمی تبادلے میں ربا کے متحقق ہونے ،نہ ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے:۔

(۱)امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا صورت میں ربا کا تحقق نہیں ہوگا،اس کی وجہ یہ ہے کہ ربا کے متحقق ہونے کے لیے قدر یعنی کیل ووزن کا وجود ضروری ہے اور کیل کا اقل معیار شریعت نے نصف صاع مقرر کیا ہے جو یہاں مفقود ہے۔

(۲)ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) اور امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں بھی ربا کا تحقق ہوگا،لہذا یہ معاملہ ناجائز ہے۔

مذہب احناف میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ ہے۔متاخرین فقہاء نے درجِ ذیل وجوہات کی بناپر امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے:۔

(الف)محقق ابن ہمامؒ نے امام محمدؒ کے قول کو راجح قرار دیا ہے،اور علامہ شامیؒ نے اسی کو مختار کہا، نیز صاحبِ بحرونہر اور علامہ شرنبلالی ومقدسی نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

(ب)نصف صاع سے اقل مقادیر معروف ومشہور ہیں اور بے شمار علاقوں میں رائج ہیں،جن میں تفاضل کو جائز کہنا فساد سے خالی نہیں بالخصوص عصر حاضر میں جب کہ ناپ تول کے جدید آلات رائج ہیں۔

(ج)مالی ذمہ داریوں (مثلاً کفارہ،صدقۃ الفطر،وغیرہ) میں شریعت کا نصف صاع سے کم مقدار مقرر نہ

کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ربا کے باب میں تفاضل یقینی کو لغو اور بے کار قرار دیا جائے۔ خصوصاً جب کہ اس کی حرمت یقینی ہے۔

(د) اگر بیع الحفنہ بالحفنتین میں زیادتی کو سود قرار نہ دیں تو فسادِ زمانہ کی وجہ سے لوگ اسے اموال کثیرہ میں تفاضل کے حصول اور ان میں ربا کے جواز کا ذریعہ اور وسیلہ بنالیں گے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

وفي جمع التفاريق، قيل: لا رواية في الحفنة بقفيز واللب بالجوز، والصحيح ثبوت الربا، ولايسكن الخاطر إلى هذا بل يجب بعد التعليل بالقصد إلى صيانة أموال الناس تحريم التفاحة بالتفاحتين والحفنة بالحفنتين، أما إن كانت مكاييل أصغر منها كما في ديارنا من وضع ربع القدح وثمن القدح المصري فلا شك، وكون الشرع لم يقدر بعض المقدرات الشرعية في الواجبات المالية كالكفارات وصدقة الفطر بأقل منه لايستلزم إهدار التفاوت المتيقن، بل لايحل بعد تيقن التفاضل مع تيقن تحريم إهداره، ولقد أعجب غاية العجب من كلامهم هذا، وروى المعلى عن محمد أنه كره التمرة بالتمرتين، وقال: كل شيء حرم في الكثير فالقليل منه حرام. (فتح القدير:۹/۷،دار الفکر).

وهكذا في البحر الرائق:٦/ ١٣٠،كوئته۔وردالمحتار:١٧٦/٥،سعيد۔والنهر الفائق:٤٧٥/٣۔ والشرنبلالية:١٨٧/٢۔وحاشية الشلبي على التبيين:٩٠/٤،ملتان۔وحاشية الطحطاوی على الدر المختار:١٠٩/٣، كوئته).

فتح المعین میں ہے:

تتمة: ماسبق من أن أدنى ما يكون مال الربا نصف صاع ليس متفقاً عليه...ثم قال: ويجوز بيع الحفنة بالحفنتين خلافاً للشافعي ومحمد... فعلى ما ذكره الكمال من أن الفضل المتيقن حرام وإن لم يدخل تحت أدنى الكيل الذي ورد الشرع به وهونصف صاع ... ومن هنا يعلم ثبوت الحرمة بالطريق الأولىٰ فيما إذا اتخذ بيع الحفنة بالحفنتين وسيلة إلى بيع نحو الكر بالكرين. (فتح المعين لابی السعود علی شرح الكنزلملامسكين:٢٠٢/٢).

شرح نقایہ میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

(وجاز بیع حفنة بحفنتين) وعند مالكؒ والشافعيؒ وأحمدؒ لايجوز ذلک إلا في رواية عن مالكؒ، وروایة عن أحمد وروى المعلى عن محمدؒ أنه كره التمرة بالتمرتين وقال: كل شيء حرم في الكثير فالقليل منه حرام، وإلى هذه الرواية مال بعض المحققين.

(فتح باب العناية في شرح النقاية:۳/۲٦۲). واللہ ﷻ اعلم۔

ایک سیب دوسیب کے عوض فروخت کرنے کا حکم:

سوال: سیب ہمارے ہاں عدد اور گنتی سے بکتے ہیں اگر ایک سیب کی جگہ دو سیب کو لیا جائے کیونکہ ایک کی کوالٹی عمدہ ہے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ اس علاقہ میں سیب عددی ہوں۔

الجواب: فقہی قانون کے اعتبار سے جائز ہونا چاہئے کیونکہ سیب مکیلی موزونی نہیں لیکن ابن ہمامؒ کی عبارت سے اس کا ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے، لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے خصوصاً جب کہ اس زمانہ میں اکثر جگہ سیب وزنی ہے۔

ملاحظہ ہو ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

ولايسكن الخاطر إلى هذا بل يجب بعد التعليل بالقصد إلى صيانة أموال الناس تحريم التفاحة بالتفاحتين. (فتح القدير:۷/۹،دارالفكر).

وهكذا في البحر الرائق: ٦/۱۳۰،كوئٹه۔وردالمحتار:۵/۱۷٦،سعيد۔ والنهر الفائق:۳/٤۷۵۔ والشرنبلالية:۲/۱۸۷۔ وحاشية الشلبي على التبيين:٤/۹۰، ملتان). واللہ ﷻ اعلم۔

تمر کو رطب کے عوض فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی آدمی ایک صاع تمر "سوکھی کھجور" کو رطب "تازہ کھجور" کے عوض فروخت کرے تو امام ابوحنیفہؒ اس کو جائز کہتے ہیں، دوسرے ائمہ اور صاحبینؒ ناجائز کہتے ہیں، صاحبینؒ کا مسلک اس حدیث پر مبنی جس کو اکثر محدثین اور فقہاء نے نقل فرمایا ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"عن سعد بن أبي وقاص ﷺ أنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يسأل عن شرى التمر بالرطب، فقال: أينقص الرطب إذا يبس، قالوا: نعم، فنهاه عن ذلک رواه

أصحاب السنن الأربعة، وقال الترمذي حسن صحيح . (شرح نقایه للملاعلی القاریؒ:۳/۲٦٤،ابواب الربا). امام صاحب اس حدیث کا کیا جواب دیتے ہیں؟ تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں؟

الجواب: (۱) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ عرف میں رطب تمر ہے اس لیے دونوں کو برابر فروخت کر سکتے ہیں، جب امام ابوحنیفہؒ بغداد گئے اور لوگوں نے یہ مسئلہ پوچھا تو مذکورہ بالا حدیث کی سند میں ابوعیاش کو ضعیف بتلایا مزید یہ بتلایا کہ اگر رطب تمر ہو تو دونوں کے تمر ہونے کی وجہ سے برابر فروخت کر سکتے ہیں، اور اگر تمر نہ ہو تو جنس مختلف ہونے کی وجہ سے جائز ہونا چاہئے۔

لیکن ملاعلیؒ نے اس پر اشکال کیا کہ کبھی جنس ایک ہو اور پھر بھی بیع متساویاً جائز نہ ہو کیونکہ کیل مسوی نہیں جیسے بھنے ہوئے حنطہ کو بغیر بھنے ہوئے حنطہ کے عوض نہیں بیچ سکتے کیونکہ ایک نیچے دبتی ہے اور دوسری نہیں، یعنی اگر حدیث نہ ہو تب بھی رطب بالتمر کیلاً ناجائز ہونا چاہئے جیسے حنطہ مقلیہ کو غیر مقلیہ کے عوض برابر بھی کیلا بیچ نہیں سکتے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ نے مذکورہ بالا حدیث پر تنقید فرمائی کہ اس میں زید بن عیاش جس کو ابوعیاش بھی کہتے ہیں، مجہول ہیں، زرقی ہے یا مولیٰ بنی زہرہ یا مولیٰ بنی مخزوم ہیں، اس لیے ابن حزم نے فرمایا "**رجل مجهول**" اور حاکم نے کہا "**إن الشيخين لم يخرجا هذا الحديث لما خشيا من جهالة زيد بن عياش**" اس وجہ سے ابن حزم، طحاوی، طبری عبدالحق اشبیلی نے روایت کو معلول قرار دیا ہے۔

ابن عیاش کے دو تلمیذ ہیں، (۱) عمران بن انس اور (۲) عبداللہ بن یزید، لیکن دو تلمیذ کی وجہ سے جہالتِ ذات ختم ہوئی جہالتِ صفت پھر بھی باقی ہے، نیز عمران بن انس نے عبداللہ بن یزید سے دو باتوں میں اختلاف کیا:

پہلی بات یہ ہے کہ وہ مولیٰ بنی مخزوم کہتے ہیں نہ کہ مولیٰ بنی زہرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ عمران بن انس نے نسیئۃ کا اضافہ کیا، لہٰذا یہ روایت قابلِ اعتماد نہیں، لیکن اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے زید بن عیاش سے روایت لی ہے، جب کہ وہ اکثر ضعفاء سے روایت نہیں لیتے اور امام ترمذیؒ نے حدیث کی تصحیح کی اور ابن جوزی کہتے ہیں:

روى عنه عبد الله بن يزيد وعمران بن أبي أنس فكيف يكون مجهولاً مع تصحيح الترمذي لحديثه قال: فقد عرفه أئمة النقل، قلت: وقد صححه ابن حبان أيضاً وابن خزيمة

والدارقطني وذلک يقتضي أنهم عرفوا حاله . (الدراية على الهداية:۳/۸۳، باب الربا).

اشکال کا حاصل یہ ہے کہ جب بہت سارے حضرات نے زید بن عیاش کو قابل قبول کہا ہے تو حدیث کا ضعف شدید نہیں، نیز احناف تو ضعیف روایات سے بھی احکام میں استدلال کرتے ہیں، جیسے حدیث قہقہ اور مسح علی الرقبہ، نیز یہاں تو باعتبار کیل دونوں میں برابری مشکل ہے کیونکہ رطب متخلل ہے تمر دبنے والی ہے، تو احناف کے اصول کے موافق یہ ناجائز ہونا چاہئے۔

(۳) احناف کی طرف سے یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ چونکہ عمران بن انس کی روایت میں نسیئہ کا لفظ آیا ہے اس لیے نسیئۃً زیادت راوی ہے تو اس کو نسیئۃً ناجائز کہنا چاہئے، اور نقداً جائز ہونا چاہئے۔

اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ دونوں روایتوں کو مان لیں جب ایک جنس ہو تو نسیئۃً ناجائز ہے اور جب مساوات نہیں ہوسکتی تو نقداً بھی ناجائز ہونا چاہئے۔

امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا تسلی بخش جواب بندہ کو علامہ عینیؒ کے کلام میں ملا جو حسبِ ذیل ہے۔

(۴) علامہ عینیؒ نے کنز کی شرح میں تحریر فرمایا ہے:

وصح أيضاً بيع الرطب بالرطب متساوياً أو بيع الرطب بالتمر حال كونه متماثلاً في الوزن عند أبي حنيفةؒ وقالا: لايجوز لأنه عليه الصلاة والسلام نهى عن بيع الرطب بالتمر وبه قالت الثلاثة . (رمز الحقائق في شرح كنز الدقائق:۲/۶۰، باب الربا، ادارة القرآن).

یعنی اگر رطب کو تمر کے عوض وزن کے حساب سے برابر فروخت کریں تو یہ جائز ہے، کیونکہ وزن میں برابری بالکل ہوسکتی ہے، تو اگر صاحبینؒ کا قول کہ ناجائز ہے کیل پر محمول ہو اور امام ابوحنیفہؒ کا قول وزن پر تو اشکال ختم ہو جائیگا۔

علامہ عینیؒ سے دوسرے فقہاء نے بھی نقل کیا ہے:

قال ابن نجيمؒ: وصح أيضاً بيع الرطب بالتمر حال كونه متماثلاً كيلاً كذا في غير كتاب، وقال العينيؒ: وزناً. (النهر الفائق:۳/۴۷۶).

وقال الفقيه أبو السعود المصري: قوله كيلاً، كذا في غير كتاب خلافاً للعينيؒ حيث اعتبر بالوزن. (فتح المعين شرح ملا مسكين:۲/۲۰۳).

ہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ احادیث میں رطب کے موزون ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے:

عن أبي البختري سألت ابن عباس ﷺ فقال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع النخل حتى يوكل منه أو يأكل منه وحتى يوزن. (رواه البخار: ۱/۲۹۹، كتاب السلم).

اس سے پہلے یہ عبارت ہے: **عن أبي البختري الطائي قال: سألت ابن عباس عن السلم في النخل فقال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع النخل حتى يوكل منه وحتى يوزن فقال الرجل: وأي شيء يوزن فقال رجل إلى جانبه: حتى يحرز.** (رواه البخاري: ۱/۲۹۹، كتاب السلم).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

حکومت سے بقدرِ ظلم وصول کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کا بجلی کا بل کسی مہینے میں ایک لاکھ رینڈ آیا جب کہ عام طور پر اس جیسے گھرانے کا بل دو یا تین ہزار ہوتا ہے اس نے وکیل کے ذریعہ میونسپل کمیٹی سے رابطہ کیا، اور اس بل کا ثبوت مانگا، مگر حکومت نے کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا، بالآخر اس نے وہ رقم ادا کردی، اب کیا وہ شخص یہ رقم جو اس سے ظلماً لی گئی ہے، اس کے عوض حکومت سے کسی بھی ممکن طریقے سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جتنی مقدار میں پیسے حکومت نے ظلماً وصول کیے ہیں اتنی مقدار حکومت سے کسی بھی ممکن طریقے سے وصول کرنا جائز اور درست ہے، لیکن چند کوڑیوں کے لیے غلط طریقہ اختیار کرکے عزتِ نفس کو پامال کرنا کارِ عقلمنداں نیست۔ لہذا عزتِ نفس پامال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: جو روپیہ حکومت نے کسی مسلمان سے بطورِ ٹیکس ظلماً وصول کیا تو وہ شخص سرکاری کسی بھی ادارے سے اتنی مقدار بنام ٹیکس وصول کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو امداد المفتین میں ہے:

سوال: گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنے پرائز بونڈ کے نوٹ جاری کیے ہیں، ان پر بحساب چھ فیصد سالانہ سود ملتا ہے، میں گورنمنٹ آف انڈیا کو تقریباً تین ہزار روپیہ سالانہ انکم ٹیکس دیتا ہوں، تو کیا میرے لیے جائز ہوگا کہ میں بونڈ خرید کر اس کا سود اس نیت سے لوں کہ مجھ سے گورنمنٹ یہ رقم انکم ٹیکس، جو شرعاً ایک ناجائز مطالبہ ہے وصول کرچکی ہے، وہ میں واپس لے رہا ہوں؟

الجواب: جس قدر روپیہ گورنمنٹ آپ سے بذریعہ ٹیکس وصول کرتی ہے اسی قدر روپیہ آپ گورنمنٹ بینک یا دوسرے سرکاری محکمات سے، جس طرح ممکن ہو وصول کرسکتے ہیں، گورنمنٹ اس کا نام سود رکھے یا کچھ اور

آپ اپنا جائز مطالبہ وصول کرنے کی نیت سے لیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، اور آپ کے حق میں سود نہ ہوگا، ایسے مواقع میں فقہاء رحمہم اللہ نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے حق کی مقدار چوری یا غصب کر کے بھی اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے وصول کر لے تو جائز ہے۔ **قال في الشامية في باب حد السرقة: إذا ظفر بمال مديونه له الأخذ ديانةً، بل الأخذ من خلاف الجنس على ما نذكره** . (فتاوی الشامي:٤/٩٥، سعيد). انتهى۔(امداد المفتین:۲/۶۰۷، کتاب الربا والقمار، دار الاشاعت)۔

ملاحظہ: یہ بات بھی ذہن نشین کر لی جائے کہ حضرت مفتی شفیع صاحب قدس سرہ کا فتویٰ حکومتی بینک سے متعلق ہے پرائیویٹ بینک سے وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

بطورِ استیناس چند عمومی قواعد ملاحظہ فرمائیں:

وفي قواعد الفقه : الضرر يدفع بقدر الإمكان .(قواعد الفقه ،ص ٨٨).

وفي الأشباه والنظائر: الضرر يزال .(الاشباه والنظائر:١/٥٢٠).

وفي قواعد الفقه عن السير: المظلوم له أن يدفع الظلم عن نفسه بما قدر عليه لكن ليس له أن يظلم غيره.(قواعد الفقه : ١٢٤).

وللاستزادة انظر: (درر الحكام في شرح مجلة الاحكام:١/٣٧،المادة: ٣١۔وشرح القواعد الفقهية للشيخ أحمد الزرقا، ص١١٨، المادة : ٣١، والاشباه والنظائر:١/٥٢٠). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مختلف کارڈ کے احکام کا بیان

بینک کارڈ کی اقسام اور ان کا شرعی حکم:

سوال: (۱) بینک سے کریڈٹ کارڈ کے جواز وعدمِ جواز پر کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

(۲) کریڈٹ کارڈ سے نقدی وصول کرنے کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر بینک کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی یا کمیشن وصول کرے تو کیا حکم ہے؟

(۴) اس کارڈ سے خریداری کی صورت میں اگر بلوں کی قیمت مقررہ مدت میں ادا نہ کرے تو سود لاگو ہوتا ہے، تو کیا سود کی شرط سے عقد فاسد ہوگا یا نہیں؟

(۵) بینک کبھی کریڈٹ کارڈ والوں کو انعام دیتا ہے، کیا اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عصر حاضر میں رائج کارڈ کی تین قسمیں پائی جاتی ہیں:۔

☆ (۱) ڈبیٹ کارڈ۔Debit Card :۔

اس کارڈ کے حامل کا پہلے سے اکاؤنٹ اس ادارے میں موجود ہوتا ہے جس ادارے کا کارڈ اس نے حاصل کیا ہے حامل بطاقہ یعنی کارڈ ہولڈر اس کارڈ کو جب بھی استعمال کرتا ہے، ادارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کر دیتا ہے، اس میں حامل بطاقہ کو ادھار کی سہولت حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ صرف اس وقت تک کارڈ کو استعمال کر سکتا ہے جب تک اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے۔ ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو استعمال کرنا بلاشبہ جائز ہے اور اس کے ذریعہ خرید وفروخت کرنا درست ہے، کیونکہ اس میں نہ قرض کی صورت ہے، نہ سود کی، البتہ حامل بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی امور میں استعمال نہ

کرے۔

☆ (۲) چارج کارڈ Charge Card :۔

اس کارڈ کے حامل کا ادارے میں پہلے سے اکاؤنٹ نہیں ہوتا بلکہ ادارہ حامل بطاقہ کو ادھار کی سہولت فراہم کرتا ہے، حامل بطاقہ کو ایک متعین ایام کی ادھار سہولت میسر ہوتی ہے، جس میں اس کو ادارے کو ادائیگی کرنا ضروری ہوتا ہے، اگر اس مدت میں ادائیگی ہوجائے تو سود نہیں لگتا، البتہ اگر حامل بطاقہ نے وقت پر ادائیگی نہ کی تو پھر اس کو سود کے ساتھ ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ادارہ اس کارڈ کو جاری کرنے کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس کارڈ کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ استعمال کرنا جائز ہے:۔

(۱) حامل بطاقہ اس بات کا پورا انتظام کرے کہ وہ معین وقت سے پہلے پہلے ادائیگی کردے گا، اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

(۲) حامل بطاقہ کی یہ ذمہ داری ہو کہ وہ اس کارڈ کو غیر شرعی امور میں استعمال نہ کرے۔

(۳) اگر ضرورت ڈیبیٹ کارڈ سے پوری ہو رہی ہو تو بہتر ہے کہ اس کارڈ کو استعمال نہ کرے۔

☆ (۳) کریڈٹ کارڈ Credit Card :۔

اس کارڈ کے حامل کا بھی کوئی اکاؤنٹ ادارے میں نہیں ہوتا بلکہ وہ معاہدہ ہی ادھار پر سود کا ہوتا ہے، اس معاہدے میں اگر چہ ادارہ ایک متعین مدت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر حامل بطاقہ ادائیگی کردے تو اس کو سود ادا نہیں کرنا پڑتا۔لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس میں تجدید مدت (Rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، جس سے ادائیگی کی مدت بڑھ جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ساتھ شرحِ سود میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور بعض صورتوں میں اضافی رقم لی جاتی ہے۔

کریڈٹ کارڈ چند قسم کے ہوتے ہیں: (۱) امریکن ایکسپریس۔(۲) ویزا۔(۳) ماسٹر کارڈ۔(۴) یورو کارڈ۔(۵) ڈائنرز کلب وغیرہ۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ڈیبیٹ کارڈ یا چارج کارڈ مہیا نہ ہو تو اس کا استعمال ڈیبیٹ کارڈ یا چارج کارڈ کی شرائطِ مذکورہ بالا کے ساتھ جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہے۔لیکن چونکہ اس میں سود کا احتمال غالب ہے اس لیے اس سے بچا جائے۔

الجواب (۲): کریڈٹ کارڈ سے نقدی وصول کرنے کی دو صورتیں ہیں:۔

ایک صورت ہاتھ سے وصول کرنا ہے کہ کارڈ ہولڈر بینک والوں کو اپنا کارڈ پیش کر دے اور بینک والے کارڈ دیکھ کر نقدی اس کے حوالے کر دیں، تو یہ صورت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نقدی جاری کرنے پر کوئی زائد ٹیکس نہ لیا جائے، کیونکہ یہ ٹیکس قرض کے مقابلے میں ہوگا جو کہ سود ہے۔

کارڈ سے نقدی وصول کرنے کی دوسری صورت:۔

A T M (Automated Transfer Machine) مشین کے ذریعہ وصول کرنا، یہ مشینیں بذاتِ خود بہت قیمتی ہوتی ہیں، پھر اس کی تنصیب اور حفاظت وغیرہ پر بھی کثیر اخراجات لگائے جاتے ہیں،

اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو استعمال کرنے پر اگر متعین رقم مشین کے استعمال کی اجرت کے طور پر ادارہ وصول کرے جو مقدارِ رقم سے قطع نظر ہو تو جائز ہے، لیکن ادارہ رقم کو بنیاد بنا کر کچھ وصول کرے تو یہ جائز نہیں بلکہ سود ہوگا، البتہ ادارہ کارڈ جاری کرنے کی فیس وصول کر سکتا ہے۔

الجواب (۳): بینک کا کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی اور اجرت وصول کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ خدمات کی اجرت ہے، مثلاً یہ کہ کارڈ جاری کرنا، اسے تیار کرنا، اس پر علامات لگانا، فائلوں کی کاروائی کرنا، ٹیلیفون وغیرہ کے اخراجات، نیز دفتری نوعیت کی ہر قسم کی کاروائی اور خدمات انجام دینا، پھر ہر بڑے شہر میں رقم نکالنے کی مشین نصب کرنا جو کہ بذاتِ خود قیمتی مشینیں ہیں، اب ظاہر ہے کہ ان خدمات کی اجرت وصول کی جاتی ہے، لہذا اس میں کوئی حرج نہیں۔

الجواب (۴): سود لاگو ہونا: واضح رہے کہ کریڈٹ کارڈ ہولڈر کے ساتھ بینک کا عقد قرضہ کا ہوتا ہے، کہ بینک کی طرف سے دی ہوئی رقم کارڈ ہولڈر کے ذمہ قرض ہوتی ہے، اور قرض کے سود کی یہ شرط فاسد لگی ہوتی ہے، (کہ اگر متعین مدت میں رقم ادا نہ کی تو سود ادا کرنا ہوگا) لیکن قرض عقودِ تبرع میں سے ہے عقدِ معاوضہ نہیں، اور حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ عقودِ معاوضہ میں شرط فاسد لگانا عقد کو فاسد کر دیتا ہے، عقودِ تبرع میں شرطِ فاسد خود لغو ہو جاتی ہے اور عقد فاسد نہیں ہوتا، البتہ شرطِ فاسد لگانے کی خرابی لازم آتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا مکمل عہد و پیمان کر لے کہ اس شرط فاسد پر کبھی بھی عمل نہ ہوگا، اور وہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کر دے گا اور سود کی ادائیگی کی نوبت نہیں آنے دیگا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شرط فاسد کا گناہ نہیں ہوگا۔

الجواب (۵): بینک کی طرف سے انعام کا حکم:

بینک والے اور کمپنی والے کارڈ ہولڈر کو جو انعامات دیتے ہیں، ان کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے، کیونکہ

بینک کی حیثیت مقرض کی ہے، اور مقرض اپنے مقروض کو کوئی انعام دے تو اس کا لینا مقروض کے لیے جائز ہے، ہاں مقروض اگر قرض خواہ کو (قرض کی وجہ سے) کوئی ہدیہ، انعام وغیرہ دے تو اس کا لینا درست نہیں ہے۔

(مستفاد از کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام، مؤلف مولانا محمد اسامہ۔ فتویٰ از مفتی محمد فاروق صاحب، دار الافتاء جامعہ احتشامیہ، کراچی، ص ۱۳۰۔۱۳۲۔ وفتاویٰ عثمانی: ۳/۳۵۴۔ وکذا فی عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اور ان کا حل: مرتب مولانا موسیٰ کرماڈی: ۲/۱۹۵۔۱۹۹۔ وجدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۴۲۔۱۴۶)۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ عثمانی کے حاشیہ میں ہے:

في المعايير الشرعية :

الحكم الشرعي لأنواع البطاقات: ـــ

☆ بطاقة الحسم الفوري : ـــ

يجوز للمؤسسات إصدار بطاقة الحسم الفوري ما دام حاملها يسحب من رصيده ولا يترتب على التعامل بها فائدة ربوية .

☆ بطاقة الائتمان والحسب والآجل : ـــ

يجوز إصدار بطاقة الائتمان والحسم الآجل بالشروط الآتية: ـــ

(١) ألا يشترط على حامل البطاقة فوائد ربوية في حال تأخيره عن سداد المبالغ المستحقة عليه.

(٢) أن تشترط المؤسسة على حامل البطاقة عدم التعامل بها فيما حرمه الشريعة وأنه يحق للمؤسسة سحب البطاقة في تلك الحالة .

☆ بطاقة الائتمان المتجدد: ـــ

لايجوز للمؤسسات إصدار بطاقات الائتمان ذات الدين المتجدد الذي يسدده حامل البطاقة على أقسام آجلة بفوائد ربوية. والله أعلم . (حاشیۂ فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۵۵۔۳۵۶، اس فتوے پر چند علماء کے دستخط ہیں: ۔حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب۔ مفتی عبد الرؤف سکھروی صاحب، مفتی عبد المنان صاحب، مفتی محمود اشرف صاحب، ومفتی محمد عبد اللہ صاحب)۔

البحر الرائق میں ہے:

وما لايبطل بالشرط الفاسد القرض...بأن قال أقرضتک هذه المائة بشرط أن تخدمني شهراً مثلاً فإنه لايبطل بهذا الشرط، وذلک لأن الشروط الفاسدة من باب الربا وأنه يختص بالمبادلة المالية، وهذه العقود كلها ليست بمعاوضة مالية فلا تؤثر فيها الشروط الفاسدة، ذكره العيني...وفي البزازية: وتعليق القرض حرام والشرط لا يلزم.

(البحرالرائق:۱۸۷/۶، باب المتفرقات من کتاب البیوع، کوئٹہ).

وکذا فی تبیین الحقائق:۱۳۳/۴۔والفتاوی البزازیة علی هامش الفتاوی الهندیة:۴۲۶/۴).

وفي مجمع الأنهر: ومالا يبطله الشرط الفاسد وهو سبعة وعشرون شيئاً على ما ذكره المصنفؒ، الأول القرض...الخ. (مجمع الانهر:۱۵۸/۳، مسائل شتیٰ فی البیع، بیروت).

بینک والوں کا انعام دینا اور اس کا لینا جائز ہے اس عقد کو عقدِ تبرع کہتے ہیں، یعنی کسی کے ساتھ مشروط احسان کرنا، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے امداد الاحکام میں،۳۸۶/۳، پر اس کا جواز تحریر فرمایا ہے۔

نیز اس کے چند شواہد بھی موجود ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک فارسی پڑوسی نے دعوت پیش کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شرط کے ساتھ قبول فرمایا۔ ملاحظہ ہو: (مسلم شریف:۱۷۶/۲).

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک کجاوہ خریدا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عازب سے فرمایا کہ اپنے بیٹے سے کہو کہ یہ کجاوہ میرے گھر پہنچادے، حضرت عازبؓ نے فرمایا: نہیں، جب تک آپ ہمیں ہجرت کا قصہ نہ بیان کریں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کا واقعہ بیان فرمایا۔

عن البراء ﷺ قال: اشترى أبوبكرﷺ من عازب ﷺ رحلاً بثلاثة عشر درهماً، فقال أبوبكرﷺ لعازبﷺ: مر البراء فليحمل إلي رحلي، فقال عازبﷺ: لا، حتى تحدثنا كيف صنعت أنت و رسول الله صلى الله عليه وسلم حين خرجتما من مكة. (رواہ البخاری:۵۱۵/۱، مناقب المهاجرین). واللہ ﷻ اعلم۔

گراج کارڈ اور اس کا حکم:

سوال: ایک کمپنی لوگوں کو گراج کارڈ دیتی ہے اس طور پر کہ جب لوگ اس کارڈ کے ذریعہ پٹرول خریدیں گے تو کمپنی گراج کو خود بل ادا کردے گی، پھر کمپنی مہینے کے آخر میں حساب لگا کر خریدار سے ۱۵ فیصد مزید رقم وصول کرے گی، اس طرح مزید رقم ادا کرنا بھی ضروری ہوگا کیا اس طرح کے معاملے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: گراج کارڈ کا عام طریقہ کار یہ ہے کہ اس کے ذریعہ پٹرول ڈالتے رہو اور ہر مہینے کے آخر میں پورا اسٹیٹ منٹ آپ کو مل جائیگا اور جتنا آپ نے پٹرول ڈالا تھا اسی کے مطابق رقم ادا کرنا ہے مزید ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ طریقہ تو ٹھیک ہے کیونکہ کوئی سود وغیرہ مزید عائد نہیں ہوا جتنا قرض لیا اتنا ادا کر دیا، لیکن صورتِ مسئولہ میں چونکہ ۱۵ فیصد مزید لینے کا ذکر ہے اگر یہ صورتِ حال ہو تو اس کی گنجائش نہیں ہے یہ صریح سود ہے۔ ہاں اگر کمپنی کی طرف سے یہ مہلت مل جائے کہ مثلاً ایک ماہ کے اندر ادا کر دیا تو کوئی اضافی رقم ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مہینے کے بعد ادا کرے تو ۱۵ فیصد مزید ادا کرنا ہوگا تو اس کی گنجائش ہوگی اس طرح کہ سود تک پہنچنے کی نوبت نہ آنے دے اور متعینہ مدت میں ادا کرتا رہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ عثمانی میں ہے:

جب کارڈ کو استعمال کیا جائے تو مقررہ مدت کے اندر اندر بل کی ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ سود نہ لگے، اور اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ Direct Debit کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی کارڈ والے براہِ راست آپ کے بینک سے بل کی رقم وصول کرلیں، تاکہ غیر ارادی طور پر بھی تاخیر کی وجہ سے سود عائد نہ ہو۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۵۴).

درمختار میں ہے:

وما يصح ولايبطل بالشرط الفاسد لعدم المعاوضة المالية... القرض والهبة. وفي الشامية: (قوله القرض) كأقرضتك هذه المائة بشرط أن تخدمني سنة، وفي البزازية: وتعليق القرض حرام والشرط لايلزم. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ٥/٢٤٩، باب مايبطل بالشرط الفاسد، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن عاصم بن كليب عن أبيه عن رجل من الأنصار قال: ...
قال رسول الله صلى الله عليه و سلم:
" أجد لحم شاة أخذت بغير إذن أهلها" فارسلت المرأة، قالت:
يارسول الله! إنى أرسلت إلى البقيع يشترى لي شاة فلم
أجد، فارسلت إلى جار لي قد اشترى شاةً أن أرسل إلى بثمنها
فلم يوجد، فارسلت إلى امرأته، فارسلت إلي بها،
فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم:
أطعميه الأسارى.

(رواه ابوداود).

باب......﴿۲﴾

مصارف ربا کا بیان

بابِ دوم

سودی مصارف کا بیان

کافر سے سودی مال حاصل کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی کافر کے پاس سود کا مال آیا تو اس کی ملکیت میں داخل ہوا یا نہیں ؟ اگر کافر نے کسی مسلمان کو سودی مال کا ہدیہ پیش کیا تو مسلمان کے لیے لینے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی مسلمان سودی مال کا ہدیہ دے تو کیا حکم ہے؟ بینوا بالتفصیل تو جروا باجر جزیل ۔

الجواب: مسلمان کے پاس سود کا مال آجائے تو مسلمان اس کا مالک نہیں بنتا بلکہ اس کو لوٹانا ضروری ہے اگر مال کا مالک معلوم ہو تو مالک کو واپس کردے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلانیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے، اور اس مال کو ایک وبال اور مصیبت سے سبک دوشی سمجھ کر صدقہ کردیا جائے پھر یہ رقم کسی مستحق فقیر مسکین جو صاحبِ نصاب نہ ہو دینا جائز اور درست ہے، لیکن سودی مال کا ہدیہ قبول کرنا جائز اور درست نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ویردونها علی أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (فتاوی الشامی:۶/۳۸۵، کتاب الکراهیة،فصل فی البیع،سعید).

لیکن اگر کافر کے پاس سود کا مال آیا تو کافر اس کا مالک بن جائیگا اور اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز اور درست ہوگا، جب تک کہ وہ حرام عقلی وقبیح عقلی کا ارتکاب نہ کرے، مثلاً خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔ ہاں کفار کو

دار الاسلام میں اسلامی حکومت ربوا کی اجازت نہیں دیگی۔

اس مسئلہ کا اصل مدار اس پر ہے کہ کفار مخاطب بالفروع ہیں یا نہیں، اور اس میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ ابتداءً فقط مخاطب بالایمان والعقوبات ہیں، مخاطب بالمعاملات نہیں ہیں، جب کہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ کفار مخاطب بالمعاملات ہیں، بہر حال کفار سود کی رقم کے مالک ہیں، یہی ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے احکام القران میں تحریر فرمایا ہے:

تحقيق أن الكفار مخاطبون بالفروع أم لا؟

الكفار مخاطبون بالإيمان إجماعاً، وكذا بالمشروع من العقوبات والمعاملات، وكذا بالفروع وعامة الشرائع في حكم المواخذة في الآخرة بلاخلاف، ذكره في المنار وغيره، وأما في وجوب الأداء في أحكام الدنيا فالصحيح أنهم غير مخاطبين به، وما نسب إلى أهل العراق من مشايخنا وإلى الأكثر من أصحاب الشافعيؒ من كونهم مخاطبين بوجوب الأداء في الدنيا فهو مؤول بأنهم مأمورون بأن يومنوا ثم يصلوا كما في عامة كتب الأصول، وذهب البخاريون إلى أنهم مكلفون بالفروع في حق الاعتقاد فقط والصحيح المؤيد بالنصوص والآيات هو ما ذهب إليه الجمهور أنهم مخاطبون باعتقاد الشرائع وكذا بأدائها باستجماع شرائطها منها تقديم الإيمان. (احكام القرآن:١/١١،١٢۔وكذا في الشامي:٤/١٢٨،سعيد).

حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ فقہی عبارات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

عبارتِ مذکورہ سے امور ذیل مستفاد ہوئے:۔

(۱) امام زفرؒ کے نزدیک تمام خطابات عامہ واردہ فی الشرع دربارۂ معاملات کفار کو بھی شامل ہیں خواہ وہ حربی ہوں یا ذمی اور عمومی خطاب کی وجہ سے حکم بھی عموماً ثابت ہوگا لہذا جو معاملات کفار اہل حرب واہل ذمہ خلاف شرع کریں گے، ان پر حکم فساد لگایا جائے گا، گو اہل حرب سے بوجہ عدمِ ولایت واہل ذمہ سے بوجہ معاہدہ کے تعرض نہ کیا جائے گا۔

(۲) صاحبینؒ کے نزدیک اہل حرب کے معاملات خلافِ شرع ہیں ہر ایک پر حکم فساد نہ لگایا جائے

گا کیونکہ انہوں نے احکام اسلام کا التزام نہیں کیا گویا ثبوتِ حکم کے لیے ان کے نزدیک عموم خطاب کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے اور وہ اہل حرب میں مفقود ہے لیکن اہل ذمہ کے جو معاملات اسلام کے مسائل متفق علیہا کے خلاف ہوں گے ان پر حکمِ فساد لگایا جائے گا کیونکہ وہ معاملات میں احکام اسلام کا التزام کر چکے ہیں۔(لیکن موجودہ دور میں کفار کے اکثر ممالک کو دارالامن سے موسوم کیا جاتا ہے ان ممالک میں کفار نے مسلمانوں کے احکام کا التزام نہیں کیا ہے، لہذا یہ حکم ان ممالک میں جاری نہ ہوگا، بنابریں بہرصورت کا فرسود کا مالک قرار دیا جائیگا)۔

(۳) امام اعظمؒ کے نزدیک اہل ذمہ کے بھی معاملات خلافِ شرع پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا، بشرطیکہ وہ معاملات خود ان کے دین کے موافق ہوں کیونکہ اہل ذمہ نے معاملات میں احکام اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے خلاف میں نہیں کیا، ہاں اگر کسی معاملہ کی بابت معاہدہ ہی میں ان سے شرط کر لی جائے اس کا التزام ان کی طرف سے ہوگا، باقی معاملاتِ شرعیہ جو ان کے معتقدات کے موافق نہیں اور نہ ان سے ان کے بارے میں کوئی شرط کی گئی ہے، ان میں اہل ذمہ کی طرف سے التزام نہیں پایا گیا لہذا ایسے معاملات جب وہ اپنے مذہب کے موافق کریں گے تو ان کو صحیح مانا جائے گا اور حکم فساد نہ دیا جائے گا۔(امدادالاحکام:۴/۳۹۰،معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین)۔

چند اشکالات اور ان کے جوابات:

اشکال (۱): فقہاء کے نزدیک جب کفار مخاطب بالفروع اور بالمعاملات بھی ہیں تو پھر ربوا میں ان کا حکم ہماری طرح ہونا چاہئے، جیسا کہ المنار وغیرہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ **حيث قال: والكفار مخاطبون بالأمر بالإيمان وبالمشروع من العقوبات والمعاملات . وفي نورالأنوار: وأما المعاملات فهي دائرة بيننا وبينهم فينبغي أن نعامل معهم حسب ماتعاملنا بيننا فى البيع و الشراء والإجارة وغيرها سوى الخمر والخنزير فإنهما مباحان لهم ، لا لنا.** (نورالانوار، ص۵۹، ٦٠).

لہذا اگر کوئی معاملہ خلافِ شرع کر کے روپیہ حاصل کریں تو یہ روپیہ حلال نہ ہونا چاہئے؟

الجواب: اس کا جواب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے آگے کی عبارت میں دیا ہے، ملاحظہ ہو:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگر چہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے

لیے خطاب عام کافی نہیں، بلکہ التزام بھی شرط ہے، اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا، نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں، لہذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا سے خواہ غصب سے خواہ بیوعِ باطلہ وفاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے، بہر صورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا، اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے۔ (امداد الاحکام: ۴/۳۹۹، معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین).

اشکال (۲): ربا کا مال کھانے کے بارے میں نصوص عام ہیں، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم تو پھر یہاں کافر سے سود کا مال لینا کیسے جائز ہوگا؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ کسی عقد (جنسی، قدری چیزوں) میں بلاعوض زیادہ لینا ربا کہا جاتا ہے، مثلاً ۱۰۰ ارینڈ قرضہ دیا اور ایک مہینے کے بعد ۱۵۰ ارینڈ واپس لینے کی شرط لگائی یہ ربا ہے۔

سید شریف جرجانیؒ فرماتے ہیں:

الربا: هو في اللغة: الزيادة، وفي الشرع: هو فضل خالٍ عن عوض شرط لأحد العاقدين. (التعریفات، ص ۱۱۲).

یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے، بالاتفاق حرام ہے۔ مگر صورتِ مسئولہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ کافر مال کا مالک بن گیا اور وہ مسلمان کو اپنی ملکیت دے رہا ہے تو اس میں بظاہر کوئی وجہ عدمِ جواز کی نہیں، کیونکہ آدمی اپنی مملوکہ چیز میں جس طرح تصرف کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

عطر ہدایہ میں ہے:

سود ہر وہ زیادتی حقیقی یا حکمی جو عقد میں بلاعوض مشروط ہو۔...اور قرض انتہاءً معاوضہ ہے لہذا قرض دے کر نفع وصول کرنا حرام ہوا، ہدیہ وغیرہ میں عوض کا کوئی ذکر نہیں ہوتا اس لیے اگر ہدیہ قبول کرنے والے نے کچھ ہدیہ سے زیادہ واپس کیا تو یہ زیادتی حلال ہے، اور شرط لگائے بغیر جو کچھ لیا یا دیا جائے اس سے سود کا کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ احسان وتبرع ہے۔ (عطر ہدایہ، ص ۱۶۵).

اشکال (۳): اگر کوئی اشکال کرے کہ سود کمانے کا یہ آسان طریقہ ہے کہ کافر سے سود لیلو تو حلال ہوگا مثلاً کوئی کمپنی والا کسی کافر کو اجیر خاص کے طور پر رکھے اور اس سے کہے کہ آپ معاملات کرتے رہو اور سود کماتے رہو پھر وہ سود میرے لیے جائز ہوگا اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: کافر سے سودی مال حاصل کرنا جائز نہیں، جیسا کہ گزر چکا، لیکن اگر کافر نے سود حاصل کیا اور وہ مالک بھی بن گیا پھر بلا کسی عوض مسلمان کو ہدیہ دینا چاہے یا مسلمان ملازم کی تنخواہ میں دینا چاہے تو یہ جائز ہے کیونکہ سود کا مالک بننا مسلمان کے لیے حرام ہے کافر کے لیے کوئی وجہ حرمت نہیں ہے، جب وہ سود کا مالک بن گیا تو پھر اپنا مال چاہے تو خود استعمال کرے یا کسی دوسرے کو ہدیہ دیدے۔

اشکال (۴): صاحبِ ہدایہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کا لین دین ان کے معاملات سے مستثنٰی ہے اس کو کفار کے لیے بھی حلال نہیں کہہ سکتے اس کا کیا جواب ہے؟

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

والربا مستثنى عن عقودهم لقوله عليه السلام : الا من أربى فليس بيننا وبينه عهد.

(الهداية:۲/۳۳۸).

مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے:

عن الشعبي قال: كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أهل نجران وهم نصارى "أن من بايع منكم بالربا فلا ذمة له". (مصنف ابن ابی شيبة:۲۰/۵۵۷).

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کو ذمیوں کے لیے سودی کاروبار کی اجازت نہیں دینی چاہئے، لیکن فی نفسہ اگر سود ان کے نزدیک درست ہو اور وہ لے لیں تو غیر مسلم اس مال کے مالک قرار دیئے جائیں گے، آج کل کوئی اسلامی حکومت ایسی نہیں جو کسی کو ربا سے روکتی ہو لہذا اگر غیر مسلم آپس میں ربا کا لین دین کریں تو وہ اس مال کے مالک ہوں گے۔

ابو عبید قاسم بن سلام اپنی کتاب "الاموال" میں فرماتے ہیں:

قوله : ومن أكل منهم الربا فذمتي منه بريئة لانراه غلظ عليهم أكل الربا خاصة من بين المعاصي كلها ولم يجعله لهم مباحاً وهويعلم أنهم يرتكبون من المعاصي ما هو أعظم من ذلك من الشرك وشرب الخمر وغيره إلا دفعاً عن المسلمين وألا يبايعوهم به فيأكل المسلمون الربا، ولولا المسلمون ماكان أكل أولئك الربا إلا كسائرماهم فيه من المعاصي، بل الشرك أعظم. (الاموال:۱/۴٦٦،بيروت۔والاموال لابن زنجوية:۲/۱۰۳۔وذكره عن ابی عبيدة الزيلعی فی نصب الراية:۳/۲۰۳).

اعلاء السنن میں ہے:

ولنا أن حرمة الربا ثابتة في حقهم، وهو مستثنىٰ من العهد فإن النبي صلى الله عليه وسلم كتب إلي نصارى نجران من أربى فليس بيننا وبينه عهد و كتب إلى مجوس هجر: إما أن تدعوا الربا أوتاذنوا بحرب من الله ورسوله ، فالتعرض لهم فى ذلك بالمنع لايكون غدراً بالأمان كذا في المبسوط(١٤/٥٨) وقد تقدم في شروط أهل الذمة من كتاب الجهاد ما يدل على نهيه صلى الله عليه وسلم والخلفاء الراشدين أهل الذمة عن الإرباء في دار الإسلام وأيضاً: فإنما تثبت العصمة في حق الأحكام بالإحراز والإحراز بالدار لا بالدين، لأن الدين مانع لمن يعتقده حقاً للشرع دون من لايعتقده ولقوة الدار يمنع عن ماله من يعتقد حرمته ومن لم يعتقده كما في المبسوط: (١٤/٥٨) أيضاً فالاعتبار بالدار، هوالصحيح. (اعلاء السنن: ١٤/٣٥٢ـوالمبسوط: ١٤/٥٨). **واللہ ﷻ اعلم۔**

سود میں سود کی ادائیگی کا حکم:

سوال: خالد نے بینک سے ایک لاکھ رینڈ قرض لے کر اس کے عوض ایک گھر خریدا، بینک والوں نے کہا کہ ہمیں ایک لاکھ دس ہزار واپس کرنا، اب خالد وہ گھر زید کو بیچنا چاہتا ہے ایک لاکھ دس ہزار کے بدلے میں تاکہ وہ اپنا دین ادا کردے، زید نے کہا کہ وہ ایک لاکھ رینڈ حلال مال سے ادا کریگا اور دس ہزار سود کا مال دیگا کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سود کا لین دین گناہِ کبیرہ ہے، قرآن واحادیث میں دردناک وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس لیے خالد کو توبہ کرنا چاہئے اور آئندہ کے لیے سودی قرض نہ لینے کا عزم کرنا چاہئے، پھر سود کی رقم کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ یا تو اصل مالک کو واپس کردے اگر مالک معلوم ہے، ورنہ فقراء پر بلانیتِ ثواب صدقہ کردے۔ اور سودی رقم سے سود ادا کرنے کا حکم یہ ہے کہ جس بینک سے سود لیا ہے اسی کو سود کی رقم کسی بھی عنوان سے واپس کرسکتا ہے، لیکن ایک بینک سے لینا اور دوسرے بینک کو واپس کرنا جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو بذل المجہود میں ہے:

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أوحصل له بغير عقد

ولایمکنه أن یرد إلی مالکه ویرید ان یدفع مظلمته فلیس له حیلة إلا أن یدفع إلی الفقراء. (بذل المجھود: ۱/ ۳۷).

البحر الرائق میں ہے:

قالوا: وعلی هذا لومات رجل وکسبه من ثمن الباذق والظلم أو أخذ الرشوة تعود الورثة ولا یأخذون منه شیئاً وهو الأولی لهم ویردونه علی أربابه إن عرفوهم وإلا یتصدقوا به لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد. (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۱، فصل فی البیع، کتاب الکراهیة، کوئتة).

وللاستزادة انظر: (تبیین الحقائق: ۶/ ۲۷، فصل فی البیع، ملتان۔ والدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۸۵، فصل فی البیع، سعید).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

ہر حرام مال کا شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سے ملا ہو وہاں واپس کرسکے تو کردے، پس اس قاعدۂ شرعی کے تحت جو رقم سود کے نام پر جہاں سے ملی تھی وہی پہنچادی جائے اس لیے یہ صورت شرعاً گنجائش رکھے گی، اور اگر ایسا نہ ہوسکے تو سود کی رقم کا حکم شرعی یہ ہے کہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین کو بطورِ صدقہ دیدے۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/ ۱۹۱).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

البتہ اگر ماضی میں غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوادئے گئے ہیں اور سودی قرض لے لیا گیا تو اس طرح تصفیہ کرسکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو، برابر ہوجائے، لیکن آئندہ کے لیے یہ سلسلہ بالکل بند کردیں۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۲۸۰).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

اگر کوئی شخص سودی قرض لینے پر مجبور ہوجائے اور قرض لے لے پھر اس کے پاس بینک سے حاصل ہونے والی سود کی ایک رقم موجود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہی رقم بطورِ سود ادا کردے، اس لیے کہ سود دینا بھی گناہ ہے کیونکہ اس طرح وہ اللہ کے عطا کیے ہوئے مال حلال کو حرام راہ میں خرچ کرتا ہے، اب اگر کوئی شخص سود ہی کی رقم اس راہ میں دے دیتا ہے تو ایک مال حلال کو بے حرمتی سے بچاتا ہے، امید ہے کہ اس پر اس کا

مواخذہ نہ ہوگا، مولانا تھانویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔(جدید فقہی مسائل، جلد اول، ص ۲۵۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم حکومت کے ٹیکس میں ادا کرنے کا حکم:

سوال: کیا سودی رقم سے مندرجہ ذیل ٹیکس ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۱) آمدنی کا ٹیکس، (انکم ٹیکس)۔

(۲) عارضی، وقتی ٹیکس۔

(۳) ویٹ، (V.A.T) خریدی ہوئی چیزوں کا ۱۴ فیصد ٹیکس ادا کرنا قانوناً لازم ہوتا ہے۔

اسی طرح میونسپلٹی/ بلدیہ کے درجِ ذیل محصول سودی رقم سے ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) خالی زمین کا ٹیکس۔

(۲) مکانات کی زمین کا ٹیکس۔ بینوا توجروا۔

الجواب: جہاں تک ہمیں معلوم ہے جنوبی افریقہ کے بینک حکومتی اور سرکاری نہیں ہے بلکہ پرائیویٹ اور خانگی ہوتے ہیں، لہٰذا حکومتی ٹیکس میں سود کی رقم ادا کرنا درست نہیں ہے، سود کی رقم یا تو جس سے لی ہے اسی کو واپس کردے یا فقراء اور مساکین کو بلانیتِ ثواب صدقہ کردینا چاہئے، آج کل دوسری صورت پر عمل درآمد ہے کیونکہ بینک کو واپس کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مزید براں مذکورہ بالا بعض حکومتی ٹیکس ظلماً بھی نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اس کا فائدہ ہمیں اختیاری یا غیر اختیاری طور پر پہنچتا ہے، لہٰذا سود سے انتفاع حاصل کرنے کے مترادف ہے۔

معارف السنن میں ہے:

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء، قال: ومثله يقول ابن القيم في "بدائع الفوائد"، ...قال: والظاهر أن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوي به فراغ ذمته ولايرجو به المثوبة، نعم يرجوها بالعمل بأمر الشارع، وكيف يرجو الثواب بمال حرام ويكفيه أن يخلص منه كفافاً رأساً برأسٍ! وفي سنن الدارقطني (۲/۵٤٥) بإسناده عن عبد الواحد بن زياد قال: قلت: لأبي حنيفةؒ من أين أخذت هذا؟ الرجل يعمل في مال الرجل بغيرإذنه أنه يتصدق

بالربح! قال: أخذته من حديث عاصم بن كليب اه، وحديث ابن كليب أخرجه أبوداود في سننه (ص۴۷۳) في (باب اجتناب الشبهات) من كتاب البيوع : عن عاصم بن كليب عن أبيه عن رجل من الأنصار قال: خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة...فلما رجع استقبله داعي امرأة، فجاء وجيء بالطعام فوضع يده ، ثم وضع القوم فأكلوا فنظر آباؤنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يلوك لقمة في فمه، ثم قال: "أجد لحم شاة أخذت بغير إذن أهلها" فأرسلت المرأة، قالت: يارسول الله ! إني أرسلت إلى البقيع يشتري لي شاة فلم أجد، فأرسلت إلى جار لي قد اشترى شاةً أن أرسل إلى بثمنها فلم يوجد، فأرسلت إلى امرأته، فأرسلت إلي بها، فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم: أطعميه الأسارى اه ، (رواه ابوداود:۲/۱۱۷،باب اجتناب الشبهات من كتاب البيوع). رواه الدارقطني في سننه (في باب الصيد والذبائح:۴/۲۸۶/۵۴). وفيه: فبينا هو يأكل إذ كف يده، وفيه أطعموها الأسارى، وفي طريق آخر: فلما أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم لقمته رمى بها. (في باب الصيد والذبائح:۴/۲۸۶/۵۵). (معارف السنن:۱/۳۴،۳۵،باب ماجاء لاتقبل صلاة بغيرطهور،تحت قوله : ولاصدقة من غلول،سعيد).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

اصل ضابطہ یہ ہے کہ جوبھی حرام مال ہواس کے بارے میں اصل حکم یہی ہے کہ جس کا مال ہے اس کی ملک میں کسی تدبیر سے لوٹا دینا،(إذا علم المالک بعینه فلاشک في حرمته ووجود رده علیه. فتاوی الشامی، باب البیع الفاسد، سعید) اور جب اصل مالک کی ملک میں نہ پہنچا سکے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطورِ صدقہ کسی مستحق صدقہ کو دے کر جلداز جلد اپنی ملک سے خارج کردے اور خود کسی کام میں استعمال نہ کرے اور نہ اس کو صدقہ میں دینے کے بعد ثواب کی نیت کرے،(وأما إذاكان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أوحصل له بغيرعقد ولايمكنه أن يرد إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء. (بذل المجهود:۱/۳۷). مرکزی حکومت سے ملی ہوئی سود کی رقم انکم ٹیکس سیل ٹیکس میں جب کہ مرکزی حکومت کی ہے دے سکتے ہیں، باقی میونسپل کارپوریشن بورڈ، میونسپلٹی ٹیکس اور اس کے علاوہ دیگر ٹیکسوں میں نہیں دے سکتے۔ (نظام الفتاویٰ مع الحاشیہ:۱/۱۸۵).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

بینک سے جو سود ملتا ہے حکومت کے خزانہ سے نہیں ہوتا، لہذا اس سے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں، بلکہ مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مساکین پر واجب التصدق ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۲۱).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اس بارے میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بینک سے جو سود ملتا ہے چونکہ وہ حکومت کے خزانے سے نہیں ملتا اور اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں، بلکہ مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۶۳).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

انکم ٹیکس ایک ناواجبی ٹیکس ہے اور ناواجب حد تک وصول کیا جاتا ہے اس لیے اگر بینک میں کسی مجبوری کے تحت ایسی اسکیم میں رقم رکھنی پڑی جس میں سود حاصل ہوتا ہے، اور سود مل گیا تو اس سود سے انکم ٹیکس ادا کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ بینک یا وہ ادارہ سرکاری ہی ہو،... عام ٹیکس جیسے بلدیہ وغیرہ یا اس طرح کے دوسرے معاملہ کے لیے بینک کے سود کو استعمال کرنے کا حیلہ اختیار کرنا درست نہیں ہوگا۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

مکان کا ٹیکس ان بلدیہ سہولتوں کے عوض وصول کیا جاتا ہے، جو حکومت عوام کو فراہم کرتی ہے، یہ ایک جائز اور منصفانہ ٹیکس ہے، جس کا نفع ٹیکس دہندہ کی طرف لوٹتا ہے، لہذا اگر اس میں سود کی رقم ادا کی جائے تو یہ سود سے استفادہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۱۸، ۳۱۹).

خلاصہ یہ ہے کہ ٹیکس دو قسم کے ہیں (۱) منصفانہ جس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیں پہنچتا ہے، ایسے ٹیکس میں کسی قسم کی سودی رقم دینے کی گنجائش نہیں، چاہے وہ سرکاری بینک کی ہو یا خانگی بینک کی ہو۔ (۲) غیر منصفانہ یعنی وہ ٹیکس جو ظلماً عائد کیے جاتے ہیں مثلاً انکم ٹیکس سیل ٹیکس وغیرہ اس کا حکم یہ ہے کہ مرکزی اور سرکاری بینک کا سود اس میں ادا کرسکتے ہیں، کیونکہ مالک کو پہنچانے کے مترادف ہے، لیکن خانگی اور پرائیویٹ بینک کا سود ادا کرنا جائز اور درست نہیں۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل میں ہے:

ٹیکس جو حکومت عوام سے وصول کرتی ہے وہ دو طرح کے ہیں، بعض منصفانہ ہیں اور خود اسلام میں ان کی

گنجائش ہے، مثلاً پانی، روشنی، سڑک، ہسپتال، لائبریری اور پارک وغیرہ سہولتوں کے بدلے بلدیہ جو ٹیکس لیا کرتی ہے وہ اس کا فائدہ محسوس طور پر ہماری طرف لوٹا دیتی ہے۔

دوسری قسم کے ٹیکس ایسے ہیں جن کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جا سکتا ہے، مثلاً انکم ٹیکس، شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے علاوہ غیر معقول بھی ہیں۔ پہلی قسم کے ٹیکس میں بینک کی سودی رقم دینا درست نہ ہوگا۔
(جدید فقہی مسائل، جلد اول، ص ۲۵۳۔ وکذا فی ایضاح النوادر: ۱/۱۰۰)۔

نیز فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اگر کسی نے کسی سے غلام کو غصب کیا اور اس کو کسی جگہ ملازم رکھا اور اس سے رقم کمائی پھر غلام غاصب کے پاس ہلاک ہو گیا تو اس کے تاوان یا قیمت میں اس رقم کو شامل کر سکتا ہے جو غلام نے کمائی، کیونکہ یہ رقم اصل مالک تک پہونچ جائیگی جس کی وجہ سے خبث آیا ہے اور مالک کے لیے اس میں خرابی نہیں، لیکن اگر غاصب نے وہ غلام کسی کے ہاتھ فروخت کیا پھر مشتری کے پاس غلام مر گیا پھر مستحق نے دعویٰ کر کے غلام کو اپنی ملکیت ثابت کیا اور مستحق نے مشتری سے تاوان لیا تو غاصب غلام کی کمائی سے مشتری کو نہیں دے سکتا، کیونکہ مشتری مالک نہیں، معلوم ہوا کہ اگر سود کا مال جس سے لیا ہے اس کے پاس چلا جائے تو ٹھیک ہے لیکن اگر کسی اور کو دیدے تو یہ جائز نہیں، لہذا سود کی رقم جس سے لی ہے اس کو واپس کر دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو فقراء پر صدقہ کر دے، یہ جائز نہیں کہ پرائیویٹ بینک سے سود لے کر حکومت کو ٹیکس میں ادا کرے۔

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

إذا آجر المغصوب يستعين بأجرة في ضمان القيمة ويتصدق بالفضل . (الفتاوى السراجية على هامش فتاوىٰ قاضيخان: ۲/۷۲).

ہدایہ میں ہے:

فلو هلك العبد في يد الغاصب حتى ضمنه، له أن يستعين بالغلة في أداء الضمان لأن الخبث لأجل المالك، ولهذا لو أدى إليه يباح له التناول فيزول الخبث بالأداء إليه بخلاف ما إذا باعه فهلك في يد المشتري ثم استحق وغرمه ليس له أن يستعين بالغلة في أداء الثمن إليه، لأن الخبث ما كان لحق المشتري إلا إذا كان لايجد غيره لأنه محتاج إليه فله أن يصرفه إلى حاجة نفسه ، فلو أصاب مالاً يتصدق بمثله إن كان غنياً وقت الاستعمال، وإن كان فقيراً فلا شيء عليه لما ذكرنا. (الهدايه: ۳/۳۷۵).

مزید ملاحظہ ہو: (حاشية الطحطاوي على الدر المختار:٤/١٠٤ـ وتبيين الحقائق:٥/٢٢٥ـ وتكملة البحر الرائق: ٨/١١٤ـ والفتاوى الشامي:٦/١٨٩ـ ومجمع الضمانات:١/٢٩٤ـ الفتاوى البزازية:على هامش الهندية:٦/٧٠). واللہ تعالیٰ اعلم۔

سودی رقم رفاہِ عام میں لگانے کا حکم:

سوال: کیا سود کی رقم سے فقراء ومساکین کے لیے کنواں کھودنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اسی طرح مدرسہ کی دیوار وغیرہ بنانے میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز دیگر رفاہِ عام وخیراتی امور میں صرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بينوا بالتفصيل توجروا بأجر جزيل.

الجواب: اس مسئلہ میں علماء عظام اور مفتیانِ کرام کا اختلاف ہے، اکثر مفتی حضرات یہ فرماتے ہیں کہ سودی رقم کنواں کھودنے میں خرچ نہ کرے، بلکہ بلا نیتِ ثواب فقراء پر صدقہ کر دے، ہاں ہندوستان کے بعض مفتی حضرات مثلاً سید مفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سودی رقم رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کی جاسکتی ہے، لیکن احتیاط اکثر کے قول پر عمل پیرا ہونے میں ہے، تاہم اگر کسی نے خرچ کر لی تو گنجائش ہے۔ اگر کنواں کھودنا یا دیگر امورِ خیر میں صرف کرنا ضروری ہی ہو تو یہ تدبیر کر سکتے ہیں کہ کسی فقیر کو سودی رقم دیکر یہ کام کروالیا جائے۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

مسئلہ مختلف فیہ ہے، غریب مسکین کو دینا اولیٰ ہے، سڑک وغیرہ رفاہِ عام کے کاموں میں لگانے کی گنجائش ہے، مسجد میں نہیں لگا سکتے، مسجد کی بیت الخلاء کی مرمت میں لگا سکتے ہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۷۹).

مفتی عبد الرحیم صاحبؒ کے اس فتوے پر مفتی اسماعیل کچھولوی صاحب نے اشکال کیا تو مفتی عبد الرحیم صاحبؒ نے اکابرین علماء کے فتاویٰ بطورِ تائید شامل کیے۔ مثلاً مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کے فتاویٰ، حضرت مفتی سعید احمد مفتی اعظم مظاہر علوم کا فتویٰ، شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنیؒ کا فتویٰ، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کا فتویٰ، وغیرہ۔ تفصیل کے لیے، ملاحظہ ہو: (فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۵۶ـ۲۶۰).

اسلامی فقہ میں ہے:

اگر مجبوراً آدمی کو بینک وغیرہ میں روپیہ جمع کرنا پڑے اور اسے سود ملے تو اسے اپنی ذات اور بال بچوں پر

استعمال نہ کرے، بلکہ بغیر ثواب کی نیت کے غریبوں کو دے دے یا کسی معتبر آدمی کے ذریعہ کسی رفاہی کام میں اسے لگادے، مثلاً محلّہ یا گاؤں کے راستے اور عام پاخانے وغیرہ میں لگادے۔ (اسلامی فقہ:۲/۳۶۹).

حضرت مفتی محمد تقی صاحب نے فتاویٰ عثمانی میں ایک جگہ فرمایا:

سود کی رقم اپنی جان چھڑانے کی نیت سے کسی فقیر یا مسکین کو صدقہ کردیں، اس میں بھی مالک بنا کر دینا ضروری ہے، تعمیر وغیرہ رفاہی کاموں میں یہ رقم استعمال نہیں ہوسکتی۔ (فتاویٰ عثمانی:۳/۲۷۹).

لیکن دوسری جگہ تحقیقی فتویٰ تحریر فرمایا ہے کہ رفاہِ عام میں سود کی رقم خرچ کرنا جائز اور درست ہے، اور حضرت حکیم الامت کے فتوے سے بھی استدلال فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک بھی سودی رقم واجب التصدق ہے واجب التملیک نہیں ہے، اور حضرت مفتی رفیع صاحب نے بھی اس فتوے سے اتفاق کیا ہے۔

بطورِ خلاصہ چند امور حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

☆ حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا اس قسم کا مال بحکمِ لقطہ ہے اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ نافلہ ہے، اس میں تملیک ضروری نہیں۔ (الدر المختار مع رد المحتار:۲/۳۳۸، سعید۔ وشرح منظومہ ابن وھبان:۱/۸۸).

☆ ملکِ خبیث کا واجب التملیک ہونا فقہائے مذہب کی کتابوں میں کہیں صراحت کے ساتھ نہیں بلکہ اس پر لفظ تصدق سے استدلال کیا گیا ہے۔

☆ ملکِ خبیث جو واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے زکوٰۃ کی طرح نہیں، بلکہ متعدد جہات سے فرق ہے، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ مال اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (حاشیۃ الحموی علی الاشباہ: ۲/۱۰۶۔ والدر المختار مع رد المحتار:۴/۲۷۸).

(لیکن بیوی بچوں کو دینے میں یہ اشکال ہے کہ یہ صدقہ صاحبِ مال کی طرف سے ہے ملتقط صرف واسطہ ہے، ہاں میت کے کفن دفن میں خرچ کرنے کے جواز سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں تملیک ضروری نہیں کیونکہ تکفین وتدفین میں تملیک نہیں پائی جاتی۔)

☆ ظاہر الروایہ کے مطابق یہ مال بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (الدر المختار مع رد المحتار:۲/۳۵۱، سعید).

☆ زکوٰۃ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے، لیکن یہ مال غیر مسلم کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (شامی:۴/۳۵۱، سعید۔

وفتاویٰ دارالعلوم زکریا:۳/۲۲۰).

☆ کسبِ خبیث کے مصارف میں فقراء کی تخصیص صرف احناف کے ہاں ہے، دیگر ائمہ اس کو عام مصالح میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔(المعیار المعرب:۶/۱۴۶،بیروت۔ والذخیرة:۵/۱۶۷، بیروت۔ وشرح المهذب:۱۰/۵۲۰،بیروت۔ ونهایة المحتاج :۵/۱۸۵).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ عثمانی:۳/۱۲۸۔۱۴۰).

علاوہ ازیں دیگر علماء عدمِ جواز کی طرف گئے ہیں، ان کے فتاویٰ بھی ملاحظہ فرمالیں:

مفتی اعظم پاک وہند حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

تملیک فقراء ومساکین ضروری ہے بناءِ مدارس ودیگراوقاف ومبرات میں صرف کرنا ان اموال کا جائز نہیں اور دلیل عبارتِ ذیل ہے:

(۱) اس قسم کے اموال میں فقہاء کی عبارات دوطرح پر منقول ہیں، بعض میں " تصدق به "، یا "وجب علیه التصدق " اور بعض میں " تصدق علی الفقراء والمساکین " اوقاف ومبرات پر خرچ کرنا کہیں منقول نہیں۔

(۲) لفظ صدقہ اور تصدق جب بولا جاتا ہے تو عرفِ فقہاء میں وہ واجب التملیک ہوتا ہے۔

تفصیلی دلائل کے لیے ملاحظہ ہو: (امداد المفتین: جلد دوم، ص۳۸۳۔۳۸۶، دارالاشاعت).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اسکول کی تعمیر اور پیشاب خانے وغیرہ مستحق نہیں ہوتے جو کہ تصدق کا حاصل ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے، مستحق کو مالک بنا کر دیا جائے، پھر وہ جو دل چاہے، جہاں چاہے خرچ کرے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۳۸۶، مبوب ومرتب).

آپ کے مسائل میں ہے:

سود کی رقم بغیر نیتِ صدقہ کے کسی ضرورت مند محتاج کو دے دیجئے، کسی کارِ خیر میں اس رقم کا لگانا جائز نہیں۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل:۶/۲۴۲).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

سود کی رقم کسی ضرورت مند کی انفرادی ضرورت کی تکمیل میں لگائی جاسکتی ہے، کسی اجتماعی فائدہ کا کام

کر دینا جیسے کنواں کھودنا وغیرہ۔ مسجدوں اور مدرسوں میں تو یہ رقم نہ لگائی جائے لیکن بیت الخلاء کی تعمیر کی علماء نے اجازت دی ہے۔ (جدید فقہی مسائل: جلد اول، ص ۲۵۴)۔

گویا کہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب کے نزدیک رفاہِ عام میں لگانا جائز ہے فقط مسجد مدرسہ میں نہ لگائے، لیکن پھر مسجد و مدرسہ کی بیت الخلاء بنانے کی اجازت ہے۔

محمود الفتاویٰ میں ہے:

سود کو اس کے وبال کو دور کرنے کی نیت سے (بلا نیتِ ثواب) غرباء و مساکین کو بطورِ تملیک دے دیا جائے، گرُدوارہ میں یہ رقم نہ دی جائے۔ (محمود الفتاویٰ: ۳/۶۴، باب الربا)۔

بہر حال دونوں طرف اکابر علماء ہیں لہذا جس پر چاہے عمل کرنے کی گنجائش ہے، تاہم عمل براحتیاط اولیٰ ہے، اور یہ حیلہ و تدبیر رفاہِ عام میں خرچ کرنا مبنی براحتیاط ہے۔

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں ہے:

تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد مسجد کے پاخانہ کی صفائی وغیرہ میں بھی استعمال کرنا درست ہوگا، اور حیلہ تملیک یہ ہے کہ جتنی رقم سود کی ہے وہ غرباء و مساکین کو جو مستحق صدقہ ہوں دے کر اس کا مالک بنا دیا جائے، پھر وہ مستحق صدقہ اپنی طرف سے بطورِ چندہ مسجد میں دیدے۔ **وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء**. الدر المختار مع رد المحتار: ۲/۳۴۵، کتاب الزکوٰۃ، باب المصرف، سعید. (نظام الفتاویٰ: ۱/۱۹۹)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سیاسی پارٹی میں تعاون کے لیے سودی رقم دینے کا حکم:

سوال: ہمارے یہاں باربودوس میں الیکشن ہوا تھا ایک مسلمان ادارے نے مالی تعاون کے ذریعہ اس میں کسی پارٹی کا ساتھ دینا چاہا، اس مسلمان ادارے نے اس پارٹی کے تعاون کے لیے مسلمان بھائی بہنوں سے چندہ کیا اور مسلمانوں سے سود کی رقم بھی حاصل کی، اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی مسلمان کے لیے جائز ہے کہ سیاسی پارٹی کی خاطر سود کے پیسے کو جمع کرے؟ اگر جائز نہیں تو جو رقم جمع کر کے دیدی گئی اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: سود کی رقم رفاہِ عام میں خرچ کرنے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے جو پہلے مذکور ہوا، البتہ صورتِ مسئولہ میں چونکہ مالی تعاون کرنے میں غیر مسلم ملک میں عام مسلمانوں کا مفاد وابستہ ہے، اور غیر مسلم

حکومت ہونے کی وجہ سے اس طرح سود کی رقم جمع کر کے تعاون کر دیا جائے مسلمان خود استعمال نہ کریں تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

ملاحظہ ہو کفایت المفتی میں ہے:

سوال: کیا سود کی رقم دینی تعلیم، رفاہِ عام اور مسلمان فقراء پر خرچ کی جا سکتی ہے؟

جواب: سود کی رقم وصول کر کے مساکین وغیرہ پر قرضدار مسلمانوں کے قرضہ کی ادائیگی پر تعلیم (پرائمری یا دینیات) پر اور ہر رفاہِ عام کے کام پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۸/۶۸).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

بینک کے سود کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نہ اس کو اپنی ذات پر خرچ کیا جا سکتا ہے اور نہ صدقہ میں دیا جا سکتا ہے ...اس کے علاوہ جو صورتیں ہوں ان میں صرف کیا جا سکتا ہے مثلاً کسی ضرورت مند کی انفرادی ضرورت کی تکمیل کسی اجتماعی فائدہ کا کام کر دینا جیسے کنواں کھودنا وغیرہ، مسجدوں اور مدارس میں تو یہ رقم نہ لگائی جائے لیکن بیت الخلاء کی تعمیر کی علماء نے اجازت دی ہے۔ (جدید فقہی مسائل، جلد اول، ص ۲۵۳).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ رحیمیہ: ۲/۹۰۔ واحسن الفتاویٰ: ۷/۱۶).

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ بہت سارے علماء تملیکِ فقراء کو ضروری سمجھتے ہیں اس لیے تملیک فقیر کے بعد اس قسم کے کاموں میں خرچ کرنے میں اختلاف سے نکلنا ہوگا، اور بالاتفاق درست ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم قرض میں ادا کرنے کا حکم:

سوال: کچھ لوگ سود کی رقم سے کمبل وغیرہ خرید کر مستحقین میں تقسیم کرتے ہیں، ایک مرتبہ سود کی رقم نہیں تھی تو انہوں نے للہ کی رقم قرض لے کر اس سے کمبل وغیرہ خرید لیا پھر جب سود کی رقم آئی تو اس سے قرض ادا کر دیا کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سود کی رقم کے بارے میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ اصل مالک کو واپس کر دی جائے لیکن اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلانیتِ ثواب فقراء و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے، ہاں بعض علماء نے سود کی رقم سے اس قسم کے قرض کی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے، لہٰذا بوقتِ ضرورت ان کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے، البتہ حیلہ تملیک کے بعد صرف کرنا اولیٰ اور مبنی بر احتیاط ہے۔

ملاحظہ ہو سنن کبریٰ بیہقی میں ہے:

عن عبد اللّٰه بن مسعود ﷺ أنه اشترى جارية فذهب صاحبها فتصدق بثمنها وقال: اللّٰهم عن صاحبها فإن كره فلي وعلي الغرم. (رواه البيهقي في سننه الكبرى:٦/١٨٨، كتاب اللقطة، دار الفكر، بيروت).

الدر المختار میں ہے:

فيجب رد عين الربا لو قائماً. (الدر المختار:٥/١٦٩، سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

ويردونه على أربابه إن عرفوهم وإلا يتصدقوا به لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد. (البحر الرائق:٨/٢٠١، فصل في البيع، كتاب الكراهية، كوئتة).

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

سوال: میں ایک مدرسہ میں ملازم ہوں، مجھے جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ بینک کی سودی رقم میں سے دی جاتی ہے..تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سودی رقم کو لوں یا بند کردوں؟ اس کی کیا شکل ہے؟

الجواب: سودی رقم سے تنخواہ نہ لی جائے، جائز نہیں ہے آپ کو تنخواہ دینے کی صورت یہ ہے کہ وہ لوگ کسی سے قرض لے کر آپ کو تنخواہ دیں، اور قرض اس رقم سے ادا کیا جائے گنجائش کی یہی شکل ہے۔ (فتاوی رحیمیہ: ۱۷۴/۳).

مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

سود کی رقم وصول کر کے مساکین وغیرہ پر قرض دار مسلمانوں کے قرضہ کی ادائیگی پر، تعلیم (پرائمری یا دینیات) پر اور ہر رفاہِ عام کے کام پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۵۹/۸).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد مسجد کے پاخانہ کی صفائی وغیرہ میں بھی استعمال کرنا درست ہوگا، اور حیلہ تملیک یہ ہے کہ جتنی رقم سود کی ہے وہ غرباء و مساکین کو جو مستحق صدقہ ہوں دے کر اس کا مالک بنا دیا جائے، پھر وہ مستحق صدقہ اپنی طرف سے بطورِ چندہ مسجد میں دیدے۔ **وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء.** (الدر المختار مع رد المحتار:٢/٣٤٥، كتاب الزكوٰة، باب المصرف، سعيد). (نظام

الفتاویٰ:۱/۱۹۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم اپنے پوتے کو دینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی کے پاس سود کی کچھ رقم ہے، اس کا پوتا فقیر ہے، کیا یہ سود کا مال اپنے پوتے کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ سودی رقم اپنے فقیر پوتے کو دینا جائز اور درست ہے اس وجہ سے کہ سودی رقم مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہے، یعنی مالک کی طرف سے صدقہ ہے نہ کہ دینے والے کی طرف سے اور مالک معطی کے پوتے کے حق میں اجنبی ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ دار العلوم دیو بند میں ہے:

سوال: مالِ حرام یا ارباحِ فاسدہ اگر کسی مسلمان کے پاس جمع ہو جاویں، اور اربابِ اموال کو ان کے حقوق پہنچانا اور واپس کرنا متعذر رہو، تو اس صورت میں مالِ خبیث سے بری الذمہ ہونے کے لیے حضراتِ فقہاءؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کو صدقہ کر دیا جاوے اس میں سوال یہ ہے کہ اس کا مصرف صرف عام صدقاتِ واجبہ کی طرح فقراء و مساکین ہی ہوں گے... یا ایسے اموال کا صدقہ ماں، باپ اور اولاد اور بیوی پر بھی کر سکتا ہے یا زکوٰۃ کی طرح اجنبی پر صدقہ کرنا ضروری ہے؟

جواب: مالِ حرام و ربحِ خبیث کو صدقہ کرنے کا حکم ایک خاص اصل پر مبنی ہے وہ یہ کہ اموال کے مالک معلوم نہ ہوں یا ان تک پہنچانا متعذر رہو وہ بحکمِ لقطہ ہو جاتے ہیں اور حکمِ لقطہ کا یہی ہے کہ جب مالک کے ملنے سے مایوسی ہو جائے تو مالک کی طرف سے اس کا صدقہ کر دیا جاوے مالِ حرام کا مالک جب معلوم نہ ہوں یا ان کو پہنچانا متعذر رہو تو اس مال کا صدقہ کرنا بھی بحکمِ لقطہ مالکِ اموال کی طرف سے ہوگا، اسی وجہ سے اس کا صدقہ کہنا صحیح ہوا، اور اسی وجہ سے فقراء کے لیے اس کا لینا حلال ہوا، ورنہ حرام مال کا کھانا جیسا اس کے لیے حرام تھا، فقراء کے لیے بھی حرام ہوتا، کیونکہ فقراء کے پاس یہ مال منجانبِ مالک گیا ہے نہ کہ منجانبِ کاسبِ حرام، عباراتِ ذیل اس پر شاہد ہیں:

وفي العشرين من بيوع الهندية...وإنما طاب للمساكين على قياس اللقطة....

الغرض ارباحِ فاسدہ اور اموالِ حرام جو واجب التصدق ہیں ان کا مصرف لقطہ کی طرح فقراء و مساکین ہیں...

واضح ہوگیا کہ مالِ حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مالِ حرام نہیں، بلکہ صرف وہ مالِ حرام ہے جس کے مالک نامعلوم یا لاپتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز یہ مال ایسی صورت میں بحکمِ لقطہ ہوجاتا ہے اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے اس لیے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لیے یہ مال حرام نہیں اور اسی بناء پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر بھی کرسکتا ہے کیونکہ وہ اس کا صدقہ نہیں بلکہ اصل مالک کا ہے، كما في الهندية: ان تصدق به على أبيه يكفيه ولايشترط التصدق على الاجنبي (٣٤٩/٥). وفيه من متفرقات الغصب سئل يوسف بن محمد عن غاصب ندم على مافعل و أراد أن يرد المال إلى صاحبه وقع له اليأس عن وجود صاحبه فتصدق بهذا العين هل يجوز للفقير أن ينتفع بهذا العين فقال: لايجوز أن يقبله ولايجوز له الانتفاع وإنما يجب عليه رده إلى من دفعه إليه قال: إنما أجاب بهذا الجواب زجراً لهم كيلا يتساهلوا في أموال الناس أما لوسلك الطريق في معرفة المالك فلم يجده فحكمه حكم اللقطة، كذا في التاتارخانية. (الفتاوى الهندية: ١٥٧/٥). مأخوذ از فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، جلد دوم، ص ٣٨٦-٣٨٣). واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم غیر مسلم کو دینے کا حکم:

سوال: اگر کسی کے پاس سودی رقم ہو تو مسلمان فقیر کو دینا ضروری ہے یا غیر مسلم فقیر کو بھی دے سکتا ہے؟

الجواب: سودی رقم غیر مسلم فقیر کو بھی دی جاسکتی ہے البتہ مسلمان فقیر کو دینا اولیٰ ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

قوله وصح دفع غيرها أي وصح دفع غير الزكاة إلى الذمي واجباً كان أوتطوعاً كصدقة الفطر والكفارات والمنذور لقوله تعالىٰ: ﴿لا ينهاكم اللّٰه عن الذين لم يقاتلوكم في الدين﴾ الآية، وخصت الزكاة بحديث معاذ ﷺ وفيه خلاف أبي يوسفؒ ولايرد عليه العشر لأن مصرفه مصرف الزكاة كما قدمناه فلا يدفع إلى ذمي والصرف فى الكل إلى فقراء المسلمين أحب، وقيد بالذمي لأن جميع الصدقات فرضاً كانت أو واجبة أوتطوعاً لاتجوز

للحربي اتفاقاً كما في غاية البيان. (البحرالرائق: ۲۴۲/۲،باب المصرف، کوئته).

(و كذا في فتاوى الشامي: ۳۵۱/۲، باب المصرف، سعيد).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

سودی رقم غریب، مسکین، محتاج کو دی جاسکتی ہے اور وہ اپنے کام میں لے سکتا ہے،غریب مسلمان کو فائدہ پہنچانا چاہئے وہ بہ نسبت غیر مسلم کے زیادہ حق دار ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۲۷۹/۹). واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم سے بیت الخلاء بنانے کا حکم:

سوال: کیا سودی رقم سے مدرسہ اور اسکول کی بیت الخلاء بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بعض مفتی حضرات کے نزدیک سودی رقم سے مدرسہ،اسکول وغیرہ کی بیت الخلاء کی تعمیر کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

مسئلہ مختلف فیہ ہے،غریب مسکین کو دینا اولیٰ ہے،سڑک وغیرہ رفاہِ عام کے کاموں میں لگانے کی گنجائش ہے،مسجد میں نہیں لگا سکتے،مسجد کی بیت الخلاء کی مرمت میں لگا سکتے ہیں۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۲۷۹/۹).

کفایت المفتی میں ہے:

وصول کرنے کے بعد اس روپے کو امور خیر میں جو رفاہِ عام سے تعلق رکھتے ہوں،یا فقراء و مساکین کی رفعِ حاجات کے لیے مفید ہوں،مثلاً یتامیٰ و مساکین اور طلبائے مدارسِ اسلامیہ کے وظائف اور امدادِ کتب وغیرہ پر خرچ کرنا یا مسافر خانہ، کنواں، سڑک وغیرہ تعمیر کرنا،سڑکوں پر روشنی کرنا، یہ سب صورتیں جائز ہیں،البتہ مسجد پر خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدسِ مسجد کے منافی ہے۔(کفایت المفتی: ۱۰۵/۷،دارالاشاعت).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

سود کی رقم کسی ضرورت مند کی انفرادی ضرورت کی تکمیل میں لگائی جاسکتی ہے،کسی اجتماعی فائدہ کا کام کردینا جیسے کنواں کھودنا وغیرہ۔مسجدوں اور مدرسوں میں تو یہ رقم نہ لگائی جائے لیکن بیت الخلاء کی تعمیر کی علماء نے اجازت دی ہے۔(جدید فقہی مسائل: جلد اول،ص ۲۵۳).

اسلامی فقہ میں ہے:

اگر مجبوراً آدمی کو بینک وغیرہ میں روپیہ جمع کرنا پڑے اور اسے سود ملے تو اسے اپنی ذات اور بال بچوں پر استعمال نہ کرے، بلکہ بغیر ثواب کی نیت کے غریبوں کو دے دے یا کسی معتبر آدمی کے ذریعہ کسی رفاہی کام میں اسے لگادے، مثلاً محلّہ یا گاؤں کے راستے اور عام پاخانے وغیرہ میں لگادے۔(اسلامی فقہ:۲/۳۶۹).

البتہ حیلہ تملیک کے بعد سودی رقم سے بیت الخلاء کی تعمیر کرنے میں احتیاط ہے۔

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں ہے:

تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد مسجد کے پاخانہ کی صفائی وغیرہ میں بھی استعمال کرنا درست ہوگا، اور حیلہ تملیک یہ ہے کہ جتنی رقم سود کی ہے وہ غرباء ومساکین کو جو مستحق صدقہ ہوں دے کر اس کا مالک بنادیا جائے، پھر وہ مستحق صدقہ اپنی طرف سے بطورِ چندہ مسجد میں دیدے۔ وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء. الدر المختار مع رد المحتار:۲/۳۴۵، کتاب الزکوٰۃ، باب المصرف، سعید.(نظام الفتاوی:۱/۱۹۹). واللہ ﷻ اعلم۔

لقطہ اور ربا کا مصرف تقریباً ایک ہے:

سوال: بینک کے ربا کا مصرف اور لقطہ کا مصرف ایک ہے یا جدا ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ دونوں کا مصرف تقریباً ایک ہے، بظاہر کوئی فرق نہیں ہے، مثلاً لقطہ غیر مسلم فقراء کو دینا جائز ہے اسی طرح سود کی رقم بھی دے سکتے ہیں، لقطہ میں تملیک ضروری نہیں ہے، رفاہِ عام میں، مردوں کے کفن دفن میں صرف کرنا جائز ہے، اسی طرح بعض علماء کے نزدیک ربا میں بھی تملیک ضروری نہیں ہے، گویا ربا اور لقطہ دونوں واجب التصدق ہے لیکن واجب التملیک نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ورابعها الضوائع مثل مالا يكون له أناس وارثونا

فمصرف الأولين أتى بنص وثالثها حواه مقاتلونا

ورابعها فمصرفه جهات تساوى النفع فيها المسلمونا

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله الضوائع: جمع ضائعة أى اللقطات...وقوله ورابعها فمصرفه جهات، موافق

لما نقله ابن الضياء في شرح الغزنوية عن البزدوي من أنه يصرف إلى المرضى والزمنى واللقيط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذلك، ولكنه مخالف لما في الهداية والزيلعي أفاده الشرنبلالي أى فإن الذي فى الهداية وعامة الكتب أن الذي يصرف في مصالح المسلمين هو الثالث كما مر ، وأما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقيط والفقير والفقراء الذين لا أولياء لهم فيعطى منه نفقتهم وأدويتهم وكفنهم وعقل جنايتهم كما فى الزيلعي وغيره. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:۲/۳۳۸، باب العشر، سعيد).

محیط برہانی میں ہے:

اللقطات والتركات تصرف إلى ما فيه صلاح المسلمين،كمال الخراج والجزية إلا أنه يجعل لها بيت على حدة، لما أنه ربما يظهر لها مستحق بعينها. وقال: الخراج والجزية تصرف إلى المقاتلة، وإلى سد ثغور المسلمين، وبناء الحصون فى الثغور وإلى مراصد الطريق في دار الإسلام ليقع الأمن عن قطع الطريق من جهة اللصوص، وإلى كري الأنهار العظام الذي فيه صلاح المسلمين، وإلى من فرغ نفسه لعمل المسلمين نحو القضاة والمحتسب والمفتين والمؤذنين والمعلمين وإلى عمارة المساجد والقناطر وإلى معالجة المرضى إذاكانوا فقراء وإلى تكفين الموتى الذين لا مال لهم وما أشبه ذلك ، والحاصل : أن هذا النوع يصرف إلى مافيه صلاح الدين وصلاح دار الإسلام والمسلمين . (المحيط البرهاني:۲/۶۲۳، الفصل السابع فى تعجيل الخراج).

البحر الرائق میں ہے:

والرابع اللقطات والتركات التي لا وارث لها وديات مقتول لا ولي له قالوا: مصرفه اللقيط الفقير والفقراء الذين لا أولياء لهم يعطون منه نفقتهم وأدويتهم ويكفن به موتاهم.

(البحر الرائق: ۵/۱۲۸، فصل فى الجزية،وكذا فى تبيين الحقائق: ۳/۲۸۳).

وفى الفتاوى الهندية: والرابع اللقطات هكذا في محيط السرخسي وما أخذ من تركة الميت الذى مات ولم يترك وارثاً أو ترك زوجاً أوزوجة وهذا النوع يصرف إلى نفقة المرضى وأدويتهم وهم فقراء و إلى كفن الموتى الذين لا مال لهم . (الفتاوى

الهندية: ۱/۱۹۱، باب في صدقة الفطر۔ وكذا في مجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر: ۲/۴۸٦، في تقسيم القسمة، بيروت).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

یہ بات تقریباً مسلّم ہے کہ کسبِ خبیث کا واجب التصدق ہونا اس بناء پر ہے کہ اس کا صحیح مالک یا تو معلوم نہیں یا اس تک پہنچانا متعذر ہے، لہٰذا وہ لقطے کے حکم میں ہوگیا، اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ وہ واجب التصدق ہے، اور چونکہ فقہائے حنفیہ نے بیت المال کے مصارف ذکر کرتے ہوئے لقطے کا مصرف صرف فقراء کو قرار دیا ہے، اس لیے اس سے یہ استنباط کیا گیا کہ زکوٰۃ کی طرح اس کی بھی تملیک ضروری ہے، لیکن یہ استنباط محلِ نظر ہے۔

اول تو بعض فقہائے حنفیہ نے لقطے کو صرف فقراء کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اسے تمام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کو درست قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ نے علامہ بزدویؒ سے نقل کیا ہے: ''أنـه يصرف إلى المرضى والزمنى... الخ. الدر المختار میں علامہ ابن الشحنہ سے مصارف بیت المال سے متعلق جو اشعار منقول ہیں ان میں بھی یہی موقف اختیار کیا گیا ہے، البتہ علامہ شامیؒ نے آگے اس پر اعتراض کیا ہے کہ عام کتابوں میں لقطے کا مصرف فقراء کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وأما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقيط الفقير والفقراء الذين لا أولياء لهم فيعطى منه نفقتهم وأدويتهم وكفنهم وعقل جنايتهم''.

بیت المال میں لقطے کے مصرف کے بارے میں اور بھی متعدد کتب میں یہی عبارت موجود ہے، لیکن اس عبارت پر غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ فقہاء نے فقراء کو لقطے کا مصرف قرار دیا ہے، لیکن اس کے لیے تملیک ضروری نہیں قرار دی جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ فقیر اموات کی تکفین کو بھی لقطے کے مصرف میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ میت کی تکفین میں تملیک متحقق نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ تملیک کے بغیر بھی فقراء پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۱۳٦).

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ لقطہ کارِ خیر میں صرف کیا جا سکتا ہے، ملاحظہ ہو اشرف الاحکام میں ہے:

ایک صاحب ایک ٹکٹ لائے اور عرض کیا کہ جو ردی خطوط مجھ کو تلف کرنے کے لیے دیئے ہیں، ایک لفافہ میں سے یہ ٹکٹ نکلا ہے کمترین نے عرض کیا ایسے ٹکٹوں کا کیا حکم ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہ لقطہ ہے اور لقطہ کا حکم

یہ ہے کہ جب مالک کا پتہ چلنا متعذر ہو تو کسی کارِ خیر میں دے دیا جائے چنانچہ میں مدرسہ میں دے دیتا ہوں۔
(اشرف الاحکام،ص۱۹۷،بحوالہ حسن العزیز:۳/۲۰)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مالِ حرام کے صدقہ میں تملیک کا حکم:

سوال: غیر مسلم ممالک میں جو رقم ناجائز طریقے پر حاصل ہوئی ہو جیسے سود کی رقم اس کا صدقہ کرنا لازم ہے، لیکن وہ فقراء کو دینا ضروری ہے یا تملیک فقیر کے بغیر کسی دوسرے کارِ خیر میں استعمال ہو سکتی ہے؟

الجواب: بعض مفتی حضرات کی رائے یہ ہے کہ جس مال میں خبث وحرمت ہو وہ فقراء کو دینا ضروری ہے، لیکن بعض مفتی حضرات یہ فرماتے ہیں کہ وہ دوسرے کارِ خیر مثلاً بیت الخلاء بنانا یا راستے سڑک وغیرہ بنانے میں بھی خرچ ہو سکتی ہے، یہ حضرات صدقہ واجبہ اور واجب التصدق میں فرق کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صدقہ واجبہ جیسے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر وغیرہ کی تملیک فقیر کو ضروری ہے، جبکہ واجب التصدق میں تملیکِ فقیر ضروری نہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم ثمود کی جگہ پہونچ گئے اور صحابہ نے ان کے کنویں کے پانی سے آٹا گوندھا تو آپ نے وہ آٹا اونٹوں کو کھلانے کا حکم فرمایا:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن الناس نزلوا مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أرض ثمود الحجر فاستقوا من بئرها واعتجنوا به فأمرهم رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم أن یهریقوا مااستقوا من بئرها وأن یعلفوا الإبل العجین وأمرهم أن یستقوا من البئر التي کانت تردها الناقة. (رواه البخاری: ۱/۴۷۸).

ایک روایت میں آٹے کے پھینکنے کا حکم ہے، اس آٹے میں کراہتِ تحریمی آئی تھی یا تنزیہی دونوں صورتوں میں اونٹوں کو کھلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز میں خبث آجائے اور خود استعمال نہ کر سکے اس کو کسی کارِ خیر میں استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، ہاں خمر کو گرانے کا حکم ہے اس کی تملیک کی اجازت نہیں، عینی نے شرحِ بخاری میں اس آٹے کی کراہتِ تحریمیہ یا تنزیہیہ کے دونوں قول نقل فرمائے ہیں۔ (عمدۃ القاری:۱۱/۹۹).

اگر غنی کو گم شدہ چیز لقطہ مل جائے تو وہ واجب التصدق ہے خود اس چیز کو استعمال نہیں کر سکتا، لیکن اس کو میت کے کفن دفن میں استعمال کرنے کی گنجائش فقہاء نے لکھی ہے۔

وأما الرابع فمصرفه المشهور هو اللقیط الفقیر والفقراء الذین لا أولیاء لهم فیعطی

منہ نفقتهم وأو ديتهم و كفنهم وعقل جنايتهم. (فتاوی الشامی:۲/ ۳۳۸،سعید). رالع میں لقطہ شامل ہے۔

نیز علامہ بزدویؒ کا قول ہے:

أنه يصرف إلى المرضى والزمنى واللقيط وعمارة القناطر والرباطات والثغور والمساجد وما أشبه ذلک . (شامی :۲/ ۳۲۸،سعید).

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ بینک کی جمع شدہ رقم کے بارے میں لکھتے ہیں جو روپیہ بینکوں میں جمع کیا جاتا ہے اس کا سود بینک سے وصول کرلیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے مسیحی مذہب کی تبلیغ اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اعانت کا گناہ نہ ہو وصول کرنے کے بعد اس روپے کو امورِ خیر میں جو رفاہِ عام سے متعلق ہوں یا فقراء و مساکین کی رفعِ حاجات کے لیے مفید ہوں مثلاً یتامی و مساکین اور طلبہ مدارسِ اسلامیہ کے وظائف اور امدادِ کتب وغیرہ میں خرچ کرنا یا مسافر خانہ کنواں سڑک وغیرہ تعمیر کرنا سڑکوں پر روشنی کرنا یہ سب صورتیں جائز ہیں البتہ مسجد پر خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدسِ مسجد کے خلاف ہے۔ (کفایت المفتی :۸/ ۶۷).

زیادہ تفصیل فتاویٰ عثمانی میں دیکھی جاسکتی ہے اور بظاہر مفتی محمد تقی عثمانی اور مولانا رفیع عثمانی اور وہاں کے دیگر مفتی حضرات کا موقف بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مال خبیث واجب التصدق ہے، لیکن صدقہ واجبہ کی طرح نہیں، نفس صدقہ غیر واجب التملیک کو بھی کہتے ہیں:

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا مات الإنسان انقطع عمله إلا من ثلاث، صدقة جارية ، أو علم ينتفع به ، أو ولد صالح يدعو له. (رواه مسلم).

وقف پر بھی صدقہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ حرام سے کمائے ہوئے نفع کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کو ایک ہزار رینڈ دیئے اور ایک ہزار پانچ سو وصول کیے، تو یہ ۵۰۰ واجب التصدق ہے، لیکن اگر غلطی سے تصدق سے قبل اس نے ۵۰۰ رینڈ کو کسی کاروبار میں لگا کر ۱۰۰۰ رینڈ بنالیے، تو اب یہ مزید ۵ سو واجب التصدق ہے یا اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کی گنجائش ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مالِ حرام کی طرف اشارہ کرکے کوئی چیز خریدی اور وہ مشارالیہ مالِ حرام

قیمت میں ادا کردیا تو اس کی آمدنی ناجائز ہے اور واجب التصدق ہے، لیکن اگر مالِ حرام کی طرف اشارہ کیے بغیر اس مال سے کچھ خریدا یا مالِ حرام کی طرف اشارہ کیا لیکن مالِ حلال ادا کیا تو اس صورت میں امام ابوالحسن کرخیؒ کے نزدیک کمایا ہوا نفع حلال ہوگا، صرف اصل مالِ حرام واجب التصدق ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مالِ حرام کو کمائی اور منافع کا ذریعہ بنالے ایسا کرنا بالکل ناجائز ہے ہاں اگر غلطی سے کرلیا تو امام کرخیؒ کے نزدیک وہی حکم ہے جو مذکور ہوا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

اكتسب حراماً واشترى به أو بالدراهم المغصوبة شيئاً، قال الكرخيؒ: إن نقد قبل البيع تصدق بالربح وإلا لا وفي رد المحتار: (قوله اكتسب حراماً، الخ) توضيح المسألة ما في التاتارخانية حيث قال: رجل اكتسب مالاً من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه إما أن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولاً ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم،... قال الكرخيؒ في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكر: لايطيب في الكل لكن الفتوىٰ الآن على قول الكرخيؒ دفعاً للحرج عن الناس. وفي الوالوالجية: وقال بعضهم: لايطيب في الوجوه كلها وهو المختار ولكن الفتوىٰ اليوم على قول الكرخيؒ دفعاً للحرج لكثرة الحرام.

(الدرالمختار مع ردالمحتار: ۵/۲۳۵، سعيد).

درمختار میں ہے:

لو تصرف في المغصوب والوديعة بأن باعه وربح فيه إذا كان ذلك متعيناً بالإشارة أو بالشراء بدراهم الوديعة أو الغصب ونقدها يتصدق بربح حصل فيهما إذا كانا مما يتعين بالإشارة وإن كانا مما لايتعين فعلى أربعة أوجه فإن أشار إليها ونقدها فكذلك يتصدق وإن أشار إليها ونقد غيرها أو أشار إلى غيرها ونقدها أو أطلق ولم يشر ونقدها لايتصدق في الصور الثلاث عند الكرخيؒ قيل: وبه يفتىٰ. (الدرالمختار: ۶/۱۸۹، سعيد).

وكذا في حاشية الطحطاوي على الدرالمختار وزاد بقوله: والمختار أنه لايحل

مطلقاً كذا في الملتقى ولو بعد الضمان هو الصحيح كما في فتاوى نوازل واختار بعضهم الفتوىٰ على قول الكرخيؒ في زماننا لكثرة الحرام وهذا كله على قولهما وعند أبي يوسفؒ لايتصدق بشيء منه كما لو اختلف الجنس ذكره الزيلعي. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار:٤/١٠٥).

خلاصہ یہ ہے صورتِ مسئولہ میں مزید ۵۰۰ رینڈ جو بطورِ نفع حاصل کیے واجب التصدق نہیں ہے، اس کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے البتہ آئندہ ایسا نہ کرے کیونکہ مالِ حرام فی الفور واجب التصدق ہوتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

سودی رقم کے عوض دوسری رقم صدقہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کی رقم انگلینڈ کے کسی بینک میں رکھی ہوئی ہے اور اس پر سود لگتا ہے اگر یہ شخص اپنے پاس موجودہ دوسری رقم سے فقراء کو بینک کے سود کی طرف سے ادا کردے تو بری الذمہ ہوجائیگا یا بعینہ وہی رقم بینک سے نکلوا کر صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ افضل اور بہتر تو یہی ہے کہ معینہ رقم کو صدقہ کیا جائے، لیکن اگر سودی رقم کی جگہ ذمہ فارغ کرنے کے لیے کسی دوسری رقم کو صدقہ کیا جائے تو ذمہ فارغ ہوجائیگا، کیونکہ نقود میں تعیین نہیں ہوتی، پھر یہ کہ بینک والے سودی رقم الگ نہیں دیتے بلکہ اصل رقم کے ساتھ ملا کر دیتے ہیں، بنابریں اصل اور سود کے درمیان تمیز ناممکن ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

لو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه، لأن الخلط استهلاك إذا لم يمكن تميزه عند أبي حنيفةؒ، وقوله أرفق، إذ قلما يخلو مال عن غصب. وفي الشامية: قوله لأن الخلط استهلاك، أي بمنزلة من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمة، لا بالأعيان،...لأنا نقول: إنه لما خلطها ملكها، وصار مثلها ديناً في ذمته، لا عينها. (الدر المختار مع رد المحتار:٢/٢٩٠، مطلب فيما لو صادر السلطان جائزاً،سعيد).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

ما يأخذه الأعونة من الأموال ظلماً ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخر يصير ملكاً له

وينقطع حق الأول فلا يكون أخذه عندنا حراماً محضاً نعم لا يباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب . (الفتاوى البزازية على هامش الهندية، قبيل كتاب الزكاة،٤/٨٣).

(و كذا في فتاوى الشامي:٢/٢٩٢،مطلب في التصدق من المال الحرام ، سعيد).

اس مسئلہ کی واضح مثال یہ ہے کہ عموماً مدارسِ اسلامیہ کے سفراء چندہ وغیرہ کے لیے مقرر ہوتے ہیں اور یہ بات کثرت سے پیش آتی ہے کہ وہ چندہ کرتے ہی فوراً پہنچنے اور مدرسہ کو ادائیگی کرنے سے بعض دفعہ قاصر ہوتے ہیں، چنانچہ علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر سفیر مدرسہ نہ پہنچ سکتا ہو اور مدرسہ کو فوری ضرورت ہو تو وہ اپنے گھر اطلاع کردے کہ میرے پیسوں میں سے چندے کی رقم کے بقدر مدرسہ کو ادا کردیے جائیں، چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ جب اس کے گھر والوں نے مدرسہ کو اس کی ذاتی رقم سے ادائیگی کردی تو سفیر فارغ الذمہ ہوجائیگا، اور اس کے لیے اس رقمِ زکوٰۃ کا استعمال بالکل درست ہوگا۔

نیز ایک ملک سے دوسرے ملک زکوٰۃ کی رقوم بھیجنے کا عام دستور ہے اس میں بھی زکوٰۃ دہندہ کے ملک کی کرنسی زکوٰۃ میں بعینہٖ نہیں دی جاتی بلکہ تبدیل کرکے دی جاتی ہے، مثلاً رینڈ پاؤنڈ اور ڈالر وغیرہ کی زکوٰۃ ہندوستان پاکستان میں فقراء کو روپیوں کی شکل میں دی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلد سوم، ص ۱۹۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی پاک رقم سے سود ادا کرنا بہتر نہیں، سودی رقم نکالنے کے بعد ہی کسی فقیر کو دیدیں، نیز سود حاصل کرنے کی نیت سے بینک میں رقم رکھوانا بھی درست نہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم تبدیل کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص سود کی رقم سے کوئی چیز خرید کر فقیر کو دیدے تو کیا یہ درست ہے؟ مثلاً سودی رقم سے سلائی مشین خرید لی اور فقیر کو دیدی تو یہ درست ہے یا نہیں؟ رقم ہی فقیر کو بلا نیتِ ثواب دینا ضروری ہے یا دوسری جنس خرید سکتے ہیں؟

الجواب: فقہاء کے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مالِ حرام اصل مالک کو پہنچانا ضروری ہے، اور اربابِ اموال کے نامعلوم ہونے پر بعینہٖ وہ چیز یا رقم صدقہ کردی جائے اس کو تبدیل کرنا درست نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

فيجب رد عين الربا لو قائماً لا رد ضمانه يعني إنما يجب رد ضمانه لو استهلكه.

(فتاوی الشامی:۵/۱٦۹،باب الربا، سعید).

نیز مذکور ہے:

(و يجب رد عين المغصوب) لقوله عليه السلام على اليد ما أخذت حتى ترد ولقوله عليه السلام "لايحل لأحدكم أن يأخذ مال أخيه لاعباً ولاجاداً ، وإن أخذه فليرده عليه، زيلعي، وظاهره أن رد العين هو الواجب الأصلي وه الصحيح . (فتاوى الشامي:٦/١٨٤، كتاب الغصب، سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

قال إذا تغيرت العين المغصوبة بفعل الغاصب حتى زال اسمها وعظم منافعها زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولايحل له الانتفاع بها حتى يؤدى بدلها وقال:...فإن موجب أصل الغصب إنما هو رد العين ولايصار إلى رد المثل أوالقيمة إلا بعد هلاك العين فلم يكن رد المثل أوالقيمة إلا بعد هلاك العين.... (فتح القدير مع الهداية: ٩/٣٣٢،دار الفكر).

منحۃ الخالق میں علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

(قوله وإنما الذي يجب حقاً للشرع) قال بعض الفضلاء: قد علمت أن العقد المذكور تعلق بسببه حقان حق العبد وهو رد عينه إن كان باقياً ورد ضمانه إن مستهلكاً وحق الشرع وهو رد عينه بنقض العقد السابق المنهي عنه شرعاً . (منحة الخالق على هامش البحر الرائق:٦/١٢٥،باب الربا، كوئته). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ٹرافک فائنس میں سودی رقم دینے کا حکم:

سوال: کیا ٹرافک فائنس (traffic fines) میں سودی رقم دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: حکومت کے مرتب کردہ قوانین جو کہ خلافِ شریعت نہ ہوں ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے، ہاں اگر ظالمانہ ہوں یا خلافِ شریعت ہوں تو پھر اطاعت نہیں کرنی چاہئے ،اسی طرح شاہراہ کے قوانین بھی لوگوں کی سلامتی اور آسانی کے لیے ہوتے ہیں، لہذا ان کے قوانین کے مطابق چلنا ضروری ہوگا، اگر غلطی کی وجہ سے

کسی پولیس نے روکدیا اور کچھ جرمانہ وغیرہ عائد کیا تو یہ بجا ہے اس میں سودی رقم دینا نا جائز ہے، ہاں اگر ظلماً بہت زیادہ عائد کرتے ہیں تو پھر حکومتی بینک کا سود دینے کی گنجائش ہے لیکن پرائیویٹ بینک کا سود حکومت کو دینا جائز نہیں۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

وتجب طاعة الإمام عادلاً كان أو جائراً إذا لم يخالف الشرع . (فتاوى الشامي:٤/٢٦٣، سعيد) .

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

لیکن آدمی جب کسی حکومت کے ماتحت رہتا ہے تو اس کے قانون کی پابندی قانوناً لازم ہوتی ہے، اس کے خلاف کرنا قانونی چوری ہوتی ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۱۴۸، جامعہ فاروقیہ).

شامی میں ہے:

(قوله عن طاعته) ... ومثله ما ذكره عن الدرر وجهه أنه إذا لم يكن كذلك يكون عاجزاً أوجائراً ظالماً يجوز الخروج عليه. (فتاوى الشامي:٤/٢٦٤، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

سروس چارج میں سودی رقم ادا کرنے کا حکم:

سوال: بینک کے سروس چارج میں سودی رقم ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ عام طور پر بینک ماہانہ سروس چارج عائد کرتا ہے، نیز یہ چارج اپنے قرض داروں اور قرض خواہوں دونوں سے تناسب کے ساتھ لیا جاتا ہے، اور یہ چارج عام طور پر بینک کے کارکنان، عملہ اور نگہبان وغیرہ کی اجرت میں ادا کیا جاتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: سروس چارج یعنی بینک کا عملہ جو حساب کتاب یا حفاظت وغیرہ کی ذمہ داری سنبھالتا ہے ان کی اجرت بینک ادا کرتا ہے اور پھر بینک میں رقم جمع کرنے والوں (قرض خواہ) یا بینک سے قرض لینے والوں (قرض دار) پر تناسب سے تقسیم کرتا ہے تا کہ ہر ایک اس میں شریک ہو جائے اور سب مل کر اس عملہ کی اجرت ادا کر دیں، تو اصل مسئلہ احتیاج کا ہے جو اس عمل کا محتاج ہے اس کے ذمہ اجرت آئیگی اور بنظر غائر دیکھا جائے تو احتیاج دونوں طرف سے ہے بینک اس معنی میں محتاج ہے کہ لوگوں کی رقوم سے تجارت کر کے نفع حاصل کرتا ہے، اور جمع کروانے والے بھی محتاج ہیں کہ ان کی رقوم کی حفاظت ہو رہی ہے اور جب نکالنا چاہیں نکال سکتے ہیں نیز وہ

اپنی ضرورت کی وجہ سے بینک کے دروازے پر حاضر ہوئے بینک نے دعوت پیش نہیں کی تھی، لہذا بینک کا سروس چارج بجا ہے اس میں سودی رقم ادا کرنا جائز اور درست نہیں ہے۔ ورنہ سودی رقم سے انتفاع لازم آئیگا اور سودی رقم سے کسی قسم کا انتفاع از روئے شریعت جائز اور درست نہیں ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وأجرة الكيال وناقد الثمن على البائع أما الكيل فلا بد منه للتسليم و هو على البائع و معنى هذا إذا بيع مكايلة، وكذا أجرة الوزان والزراع والعداد، وأما النقد فالمذكور رواية ابن رستم عن محمدؒ لأن النقد يكون بعد التسليم، ألا ترى أنه يكون بعد الوزن والبائع هو المحتاج إليه ليميز ما تعلق به حقه من غيره أوليعرف المعيب ليرده، وفي رواية ابن سماعةؒ عنه على المشترى لأنه يحتاج إلى تسليم الجيد المقدر، والجودة تعرف بالنقدكما يعرف القدر بالوزن فيكون عليه وأجرة وزان الثمن على المشتري لما بينا أنه هوالمحتاج إلى تسليم الثمن وبالوزن يتحقق التسليم. (الهداية:۳/۲۹).

(وكذا في الفتاوى الهندية : ۲۸/۳، الفصل السادس فيما يلزم المتعاقدين من المؤنة في تسليم المبيع والثمن. والمحيط البرهاني،الفصل الثالث في قبض المبيع بإذن البائع ،۶/ ۲۷۱. والبحرالرائق:۵/۳۰۶،كتاب البيوع.وكذا في مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر: ۳/ ۳۱، دارالكتب العلمية، بيروت).

بحوث فی قضافقہیۃ یامعاصرہ میں ہے:

لا مانع شرعاً من أن يطالب البنک مستقرضيه بأداء مبلغ مقابل التكلفات الإدارية التي تحملها في تقويم المشروعات، ومتابعة تنفيذها، ما دام ذلک المبلغ لايجاوز التكلفات الفعلية الواقعة في ذلک المشروع خاصة، فإن كان من الممكن تحديد هذه التكلفات بدقة ، فهو الأنسب الأوفق بأحكام الشرعية، فإنه لا غبار على جوازه...مادامت هذه العمولة لاتجاوز أجرالمثل على مثل هذه الأعمال، فإن الذي لايجوز مطالبة الربح أو الأجر عليه ، هو عمل القرض بنفسه ، أما الأعمال الإدارية بالنسبة لذلک القرض، فلايجب شرعاً أن تكون مجانية...

ونظير ذلک ما ذكره الفقهاء أن القاضي والمفتي لايسع لهما مطالبة الأجر من

الخصم، أو المستفتي، ولكن يجوز لهما أن يطالبه بأجرة كتابة الفتوىٰ، أو كتابة الوثائق، والمحاضر والسجلات، ما دامت هذه الأجرة لاتجاوز أجر المثل على مثل هذه الأعمال، ولاتتخذ حيلة لاكتساب الأجرة على الإفتاء والقضاء نفسها.

وجاء في الدر المختار للحصكفيؒ: يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق، والمحاضر، والسجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتي، فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوىٰ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان، ومع هذا الكف أولىٰ، احترازاً عن القيل والقال، وصيانة لماء الوجه عن الابتذال.

ويقول العلامة ابن عابدينؒ تحته:

قال في جامع الفصولين: للقاضي أن يأخذ ما يجوز لغيره، وما قيل في كل ألف خمسة دراهم، لانقول به، ولايليق ذلك بالفقه، وأى مشقة للكاتب في كثرة الثمن؟ وإنما أجر مثله بقدر مشقته أو بقدرعمله في صنعته أيضاً كحكاك، وثقاب يستاجر بأجر كثير في مشقة قليلة، وقال بعض الفضلاء: أفهم ذلك جواز أخذ الأجرة الزائدة، وإن كان العمل مشقته قليلة ونظرهم لمنفعة المكتوب له، قلت: ولايخرج ذلك عن أجرة مثله فإن من تفرغ لهذا العمل، كثقاب اللآلي مثلاً لايأخذ الأجر على قدر مشقته، فإنه بمؤنته، ولو ألزمناه ذلك لزم ضياع هذه الصنعة، فكان ذلك أجر مثله. (ردالمحتار:٦/٩٢، كتاب الاجارة، مسائل شتىٰ،سعيد).(بحوث فى قضايافقهية معاصرة:١/٢٠٤-٢٠٦).

درج کردہ عبارات میں اگر چہ قرض دار سے سروس وغیرہ کی فیس وصول کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن قرض خواہ کے لیے بھی وہی علت پائی جاتی ہے کہ بینک حفاظت اور حساب کتاب وغیرہ انتظامات کے اخراجات برداشت کرتا ہے، تو ضروری نہیں ہے کہ سب مفت برداشت کرے، بلکہ تناسب کے ساتھ کچھ اجرت قرض خواہوں پر بھی عائد کردے ان کی رقوم کی حفاظت وغیرہ کے عوض میں تو عدم جواز کی کوئی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتی، پھر جب سروس چارج بجا ہے تو اس میں سودی رقم ادا کرنا ناجائز ہوا۔ هذا ماعندي إن كان الصواب فمن الله وإن كان الخطأ فمني ومن الشيطان. ﴿ولعل الله يحدث بعد ذلك أمرا﴾.

واللہ ﷻ اعلم۔

سودی رقم رشوت میں دینے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کو اپنے کسی ضروری کام کی وجہ سے رشوت دینے کی ضرورت پڑ جائے تو سود کی رقم اس میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: سودی رقم کو رشوت دینے میں استعمال کرنا جائز اور درست نہیں، اس میں دہرا گناہ ہوگا ایک سودی رقم استعمال کرنے کا اور دوسرا رشوت دینے کا۔

ملاحظہ ہو آپ کے مسائل میں ہے:

س...... سود حرام ہے اور رشوت بھی حرام ہے، حرام چیز کو حرام میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ سود کی رقم رشوت میں دی جاسکتی ہے کہ نہیں؟

ج...... دہرا گناہ ہوگا سود لینے کا اور رشوت دینے کا۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۴۲/۶)۔

محمود الفتاویٰ میں ہے:

سوال: جن زمینوں میں کھیتی کی جاتی ہے، ان میں مکانات بنانے کے لیے حکومت کی طرف سے N-A کی کاروائی کرنی پڑتی ہے، جس میں حکومت اور آفیسر حضرات خوب پریشان کرتے ہیں، حکومت این اے کی کاروائی کے لیے رقم لیتی ہے اور آفیسر حضرات بھی رشوت مانگتے ہیں تو کیا ان دونوں جگہوں میں سود کی رقم دے سکتے ہیں؟

الجواب: این۔اے کی کاروائی میں جتنی رقم قانونی طور پر حکومت وصول کرتی ہے، اس میں حکومتی بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم ادا کر سکتے ہیں، لیکن افسران کو دی جانے والی رشوت میں نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ اس صورت میں وہ رقم حکومت کے پاس نہیں جاتی۔ (محمود الفتاویٰ: ۲/۳، ۷، باب الربا)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام
رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾

(المائدة،الآية: ۹۰).

وقال عطاء ومجاهد: الميسر القمار كله
حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب.

(تفسير السمرقندي).

باب......(۳)

انشورنس کے احکام کا بیان

عن أبي هريرةؓ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم
عن بيع الحصاة، وعن بيع الغرر.

(رواه مسلم)

باب ...... (۳)

انشورنس کے احکام کا بیان

میڈیکل ایڈ کا حکم:

سوال: کیا میڈیکل ایڈ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: میڈیکل ایڈ جو آج کل غیر مسلم ممالک میں رواج پذیر ہے عقدِ اجارہ کی حیثیت سے جائز ہونا چاہئے کیونکہ اس عقد کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک فریق مخصوص و متعین رقم دیتا ہے اور دوسرا فریق اس کے علاج کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، اس کے دو نظائر حسبِ ذیل درج ہیں:۔

(۱) ہندوستان پاکستان کے قصبات و دیہات بلکہ شہروں میں یہ معاملہ صدیوں سے رائج ہے کہ حلاق، لوہار، بڑھئی وغیرہ لوگوں کے متعلقہ کام کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں اور لوگ ان کو فصل آنے پر فصلانہ یا کچھ رقم دیتے ہیں، یہ عمل افغانستان، ہندو پاک، دیوبند، تھانہ بھون، سہارنپور ہر جگہ رائج تھا، حلاق نے خاندان والوں کے بالوں کو درست کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جو مجہول ہے، لیکن موجبِ نزاع نہیں، اور لوگ ان کو فصل آنے پر اناج یا کچھ رقم دیتے ہیں، میڈیکل ایڈ میں بھی ایک فریق علاج کی ذمہ داری لیتا ہے، دونوں میں عمل کی جہالت ہے جو سببِ نزاع نہیں۔

ہدایہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو وکیل بنادے کہ میری طرف سے مثلاً قتل عمد میں صلح کرالو اور وکیل نے مصالحت کرالی تو مصالحت کی رقم وکیل پر لازم نہیں لیکن اگر وکیل نے اس رقم کی ذمہ داری قبول کی تو رقم لازم

ہوگی پھر تحریر فرمایا: "**لأنه حينئذٍ مواخذ بعقد الضمان**". (الهداية:٣/ ٢٥٠،باب التبرع بالصلح والتوكيل به).

(۲) بچوں کے لیے دودھ پلانے والی کا رکھنا بالاتفاق جائز ہے اس میں بھی ایک فریق نے دودھ پلانے وغیرہ کی ذمہ داری لی اور دوسرا فریق تنخواہ یا اجرت دیتا ہے، دودھ پلانے کے اوقات سب مجہول ہیں، لیکن یہ جہالت سببِ نزاع نہیں لہذا بالاتفاق جائز ہے۔

اشکال: البتہ ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہ علاج کی ذمہ داری اٹھانے والا فریق اجیر خاص ہے یا اجیر مشترک، اگر اجیر خاص ہو تو دوسرے لوگوں کی ذمہ داری کیسے لیتا ہے جب کہ اجیر خاص دوسروں سے کام نہیں لیتا:

"**والخاص لايمكنه أن يعمل لغيره لأن منافعه في المدة صارت مستحقة للمستأجر والأجر مقابل بالمنافع**". (فتاوى الشامي:٦/ ٦٤،باب ضمان الاجير، سعيد).

اور اگر اجیر مشترک ہو تو اجرت کا مستحق تب ہے جب کہ عمل کرلے اور میڈیکل ایڈ میں اس کو اجرت ملتی اگر چہ اس ماہ میں کام نہ کرے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاء نے اجیر خاص و اجیر مشترک کو بعض صورتوں میں جمع کیا ہے مثلاً مرضعہ اگر اپنے گھر پر بچے کو دودھ پلائے تو وہ اجیر خاص و اجیر مشترک دونوں ہیں، یعنی اس کو دودھ پلانے کی اجرت ملتی ہے اگر چہ وہ دوسرے بچوں کو دودھ پلائے۔

فتح المعین شرح کنز میں ہے:

والحاصل أن المسائل في الظئر تعارضت فمنها مايدل على أنها في معنى أجير الوحد كقولهم لعدم الضمان في هذه، ومنها ما يدل على أنها في معنى المشترك كقولهم إنها تستحق الأجرعلى الفريقين إذا أجرت نفسها لهما، قال الاتقاني: والصحيح أنه إن دفع الولد إليها لترضعه فهي أجير مشترك وإن حملها إلى منزله فهي أجير وحد وقال في العناية: وذكر في الذخيرة مايدل على أنها يجوز أن تكون خاصاً ومشتركاً حتى لو أجرت نفسها لغيره استحقت الأجر على الفريقين كاملاً عملاً بشبه الأجير المشترك وتأثم نظراً إلى أن لها شبهاً بالأجير الخاص. (فتح المعين:٣/ ٢٥٤، وكذا في فتاوى الشامي:٦/ ٧١،سعيد).

أقول: ويرتفع الإثم إذا كان الإذن بالعمل للغير.

اسی طرح میڈیکل ایڈ کمپنی علاج کرے یا نہ کرے کیونکہ کسی ماہ علاج کی ضرورت نہ پڑی ہوگی اجیر خاص کی طرح

مستحق اجر ہے اور دوسروں کے کام کو بھی قبول کر سکتی ہے۔

دوسرا جواب: اجارہ سے ہٹ کر دوسرا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ عقدِ موالات میں فقہاء ذکر فرماتے ہیں کہ اگر مولیٰ اسفل جنایت کریگا تو مولیٰ اعلیٰ کو دیت دینی پڑیگی اور اگر مولیٰ اسفل کا انتقال ہو جائے تو مولیٰ اعلیٰ کو میراث ملے گی حالانکہ مولیٰ اسفل کبھی جنایت ہی نہیں کرتا پھر بھی مولیٰ اعلیٰ کو میراث ملتی ہے کیونکہ اس نے عقدِ ضمان کرلیا ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

(أسلم رجل) مكلف (على يد آخر و والاه أو) والى (غيره) الشرط كونه عجمياً لامسلماً على مامر وسيجيء (على أن يرثه) إذا مات (ويعقل عنه) إذا جنى (صح) هذا العقد (وعقله عليه وإرثه له)... (الدرالمختار: ٦/ ١٢٦، فصل في ولاء الموالات، سعيد).

حاشیۃ الطحطاوی علی الدر میں ہے:

قال إبراهيم النخعيؒ: إذا أسلم الرجل على يدى رجل و والاه فإنه يرثه ويعقل عنه وهذا قول علمائنا الثلاثة... (حاشية الطحطاوى على الدرالمختار: ٤/ ٧٠، كوئته).

اس سے وہ اشکال بھی دفع ہو گیا کہ میڈیکل ایڈ میں رقم جمع کرانے والا اس مہینہ میں بیمار نہیں ہوا؟

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ کمپنی جو عقدِ ضمان کی وجہ سے ہر ماہ وصول کرتی ہے اگر چہ رقم دینے والا بیمار نہ ہو پھر بھی اس رقم کا لینا درست ہے جیسا کہ عقدِ مولات میں مذکور ہوا کہ جنایت نہ کرنے کے باوجود میراث ملتی ہے اور فقہاء نے میراث کا لینا درست قرار دیا ہے۔

اردو فتاویٰ میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ نے میڈیکل ایڈ کے بارے میں عدمِ جواز کا مختصر جواب احسن الفتاویٰ میں دیا ہے جس کی عبارت درجِ ذیل ہے:

سوال: امریکہ میں میڈیکل علاج معالجہ کی سہولتیں پرائیویٹ اداروں کے سپرد ہیں...الخ۔

الجواب باسم ملہم الصواب: جائز نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/ ۲۵)۔

ممکن ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے عمل کی جہالت کی وجہ سے ناجائز لکھا ہو لیکن دوسرے مقامات پر مفتی صاحب نے عمل کی اس جہالت کو درست فرمایا جس سے نزاع پیدا نہ ہو، روٹی پکانے کی اجرت میں روٹی دینے کے بارے میں فرمایا: (۱) اجرت عمل سے ہے، (۲) اجرت مجہول ہے، دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جہالتِ اجرت

جب مفضیہ الی النزاع نہ ہوتو مفسدِ اجارہ نہیں۔واللہ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ:۷/۳۱۳)۔
جو جہالت مفضیہ الی النزاع نہ ہو وہ مفسدِ عقد نہیں،اس بات کو اکثر فقہاء نے تحریر فرمایا ہے۔
ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وأما شرائط الصحة ومنها أن يكون المعقود عليه وهو المنفعة معلوماً علماً يمنع المنازعة فإن كان مجهولاً جهالة مفضية إلى المنزاعة يمنع صحة العقد وإلا فلا. (الفتاوى الهندية:٤/ ٤١١).

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک قیمتی بات فرمائی ہے:

إن الناس يعاملون في أشياء تكون جائزة فيما بينهم على طريق المروء ة والإغماض، فإذا رفعت إلى القضاء يحكم عليها بعدم الجواز، فالاستقراض المذكور"أي استقراض البعير" عند عدم المنزاعة جائز عندي، وذلك لأن العقود على نحوين : نحو: يكون معصية في نفسه وذا لا يجوز مطلقاً ، ونحو آخر: لايكون معصية وإنما يحكم عليه بعدم الجواز لإفضائه إلى المنازعة فإذا لم تقع فيه منازعة جاز. (فيض البارى :٢٨٩/٣، كتاب الوكالة).

اس عبارت کا خلاصہ بھی یہ ہے کہ جب عقد معصیت پر مشتمل نہ ہوتو صرف جہالت کو سببِ فساد نہیں قرار دیا جاسکتا جب تک وہ نزاع پیدا نہ کرے۔
علی احمد الندوی "جمہرۃ القواعد الفقہیۃ" میں فرماتے ہیں:

الجهالة ليست بمانعة لذاتها، بل لكونها مفضية إلى النزاع، وهذا أصل مهم ينبغي التعويل عليه فى الأحكام، فإن به حل كثير من المشكلات، وليعلم أن أحكام المعاملات الشرعية مبنية على أصلين عادلين :

الأول : منع كل ما فيه ظلم وأكل لأموال الناس بالباطل .

الثاني: منع ما يؤدي إلى الاختلاف والنزاع بسبب الجهالة ، فإذا انتفى ما يؤدي إلى الظلم والنزاع بسبب الجهالة ، صح التعامل ، والعرف أصل عظيم يرجع إليه في ذلك بعد الشرع. (جمهرة القواعد الفقهية فى المعاملات المالية :٣١٩/١ ، تحت القاعدة : الجهالة انما توجب الفساد اذا كانت مفضية الى النزاع المشكل).

حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو جہالت نزاع کا سبب ہو وہ منع ہے اور جو جہالت نزاع کا سبب نہیں بنتی وہ منع نہیں ہے۔(درس الهدایه: الجزء الثالث،ص ۲۹)۔

آج کل لوگوں میں میڈیکل ایڈ کے ساتھ ملی جلی صورتیں رائج ہیں جن کو لوگ اپناتے چلے آرہے ہیں مثلاً لوگ چوریوں اور ڈکیتیوں کی مصیبت سے بچنے کے لیے کسی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کو ہر ماہ اتنی رقم دیں گے اور آپ ہماری سیکورٹی کے ذمہ دار ہیں، پھر اگر کار وغیرہ چوری ہوتی ہے تو کمپنی اپنے آلات کے ذریعہ گاڑی معلوم کرتی ہے یا ریڈیو سے اعلان کراتی ہے اور گاڑی کو چور سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے، اس صورت میں بھی اداشدہ رقم کے عوض جو سیکورٹی یا خدمت ملتی ہے وہ مجہول ہے پھر کبھی سالہا سال اس خدمت لینے کی نوبت نہیں آتی لیکن جھگڑا نہ ہونے کی وجہ سے اور سببِ نزاع نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی جائز ہے، میڈیکل ایڈ کا معاملہ بھی اسی طرح سمجھ لیجئے۔

میڈیکل ایڈ کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کی کمپنیاں اکثر کاروباری نہیں ہوتیں صرف اپنے ملازمین کی تنخواہوں کی حد تک منافع کی فکر کرتی ہیں اور اپنا کام احسان وتبرع سمجھتی ہیں، اور غالباً ان کے قوانین میں بھی یہ تحریر شدہ ہے کہ یہ امدادِ باہمی کی بنیاد پر چلتی ہیں، بنابریں اس معاملہ کو تبرعِ مشروط میں بھی ہم داخل کرسکتے ہیں کہ کمپنی علاج کی امداد اور احسان کرتی ہے اور اس کے عوض اس کو کچھ رقم ادا کی جاتی ہے، تبرعِ مشروط کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے۔

امداد الاحکام میں ایک مفصل سوال جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی کمپنی کسی دکاندار سے یہ معاملہ کرلے کہ اگر آپ نے ہماری کمپنی سے دس ہزار کا مال خریدا تو آپ کو تین سو روپے بطورِ انعام دئے جائیں گے، لیکن اگر آپ نے کسی دوسری کمپنی سے ایک مرتبہ بھی خریدا جو ہماری کمپنی کی ہم پلہ ہے تو آپ کو یہ رعایت نہیں ملے گی کیا یہ شرط ٹھہرانا جائز ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں لکھا ہے: یہ معاملہ جائز ہے کیونکہ خریدار کو سال کے تمام پر جو کمیشن ہر سیکڑہ پر دیا جاتا ہے وہ بائع کی طرف سے تبرع ہے، خریدار کا حق لازم نہیں اور تبرع کو کسی شرط سے مشروط کرنا جائز ہے۔ (امدادالاحکام:۳/۳۸۶)۔

ایک اور جگہ مذکور ہے، سوال: مدارس میں فیس داخلہ اور فیس ماہواری طلبہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے کیونکہ یہ اجرت نہیں بلکہ چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا جس کو شرط منظور نہ ہوگی اس کو عدمِ داخلہ کا اختیار رہوگا۔ ودليله أنه صلى الله عليه وسلم قال لمن أضافه وعائشة رضي الله تعالىٰ عنها قال: لا، قال: فلا إذن حتى قال في الثالثة: وعائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قال: نعم۔ (امداد الاحکام:۳/۲۰۶).

سوال وجواب کا خلاصہ یہ ہے کہ داخلہ کی فیس کو کیسے جائز کہا جائے یہ تو تعلیم کی اجرت نہیں بلکہ وہ الگ ہوتی ہے، جواب یہ دیا کہ یہ تبرعِ مشروط ہے کہ ہمارا داخلہ دینا چندہ دینے کے ساتھ مشروط ہے اور اس میں جبر نہیں کیونکہ بچے کو داخل نہ کرنے کا اختیار بچے کے والد کو ہے، بچے کو داخل ہی نہ کرادے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ عنہ سے اونٹ کا پالان خریدا عازب رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اپنے بیٹے براء سے کہہ دیں کہ یہ پالان میرے ساتھ لے جائیں، حضرت عازب رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں مگر اس شرط پر کہ آپ ہجرت کا قصہ سنادیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سنایا اور براء رضی اللہ عنہ پالان لے گئے۔

بخاری شریف میں ہے:

عن البراء رضي الله عنه قال: اشترى أبوبكر رضي الله عنه من عازب رضي الله عنه رحلاً بثلاثة عشر درهماً فقال أبوبكر رضي الله عنه لعازب رضي الله عنه: مر البراء فليحمل إلي رحلي فقال عازب رضي الله عنه: لا، حتى تحدثنا كيف صنعت أنت ورسول الله صلى الله عليه وسلم حين خرجتما من مكة والمشركون يطلبونكم قال: ارتحلنا من مكة ... الخ. (رواه البخاري:۱/۵۱۵، في مناقب المهاجرين).

یہ تبرعِ مشروط ہے جس کی شرعاً گنجائش ہے، اسی طرح میڈیکل ایڈ میں علاج کی ذمہ داری لینا چندہ کے ساتھ مشروط ہے غرض یہ کہ اس کو اجارہ میں داخل کریں یا تبرعِ مشروط میں دونوں معاملات جائز ہیں ان میں سے کوئی بھی ناجائز نہیں۔

اشکال: یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس معاملہ کو اجارہ قرار دیا جائے یا تبرع بالعوض دونوں صورتوں میں میڈیکل کمپنیوں کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ سودی کاروبار اور بینکوں سے سود لینے میں ملوث ہوں گی، پھر اس علاج کا کیا حکم ہے جس میں سود کا عنصر شامل ہو؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ عام طور پر غیر مسلم ممالک میں میڈیکل ایڈ کمپنیاں غیر مسلموں کی ہوتی ہیں اور غیر مسلموں کے کاروبار اور معاملات کے بارے میں تین مذاہب ہیں:

(۱) امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ کافر حربی دارالحرب میں خلافِ شریعت معاملہ کرلے تو وہ فاسد ہے، کیونکہ قرآن وحدیث کا خطاب عام ہے، ہاں حربیوں سے دارالحرب میں ہونے کی وجہ سے اور ذمیوں سے معاہدہ کی وجہ سے تعرض نہ کیا جائیگا، اس لیے غیر مسلم نے جو مال ناجائز طریقہ پر حاصل کیا ہو خواہ سود سے ہو یا قمار وخمر سے اس کا لینا مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

(۲) امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اگر کافر حربی دارالحرب میں خلافِ شریعت معاملہ کرلے تو فاسد نہیں، کیونکہ انہوں نے احکامِ اسلام کی پابندی اپنے اوپر لازم نہیں کی، ہاں ذمی جو مسلمان ملک میں رہتے ہوں ان کے معاملات کو اسلامی قوانین پر رکھا جائیگا، اگر ان کے معاملات اسلام کے متفقہ قوانین کے خلاف ہوں تو ان پر فساد کا حکم لگایا جائیگا، اور پھر اس سے حاصل شدہ رقم مسلمان کے لیے حلال نہیں، اگر انہوں نے سود سے رقم حاصل کرلی تو وہ رقم مسلمان کے لیے حلال نہیں ہوگی۔

(۳) حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ کفار خواہ دارالحرب کے رہنے والے ہوں یا دارالاسلام میں رہتے ہوں بغیر التزام اور معاہدہ کے اسلامی احکام کے پابند نہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دارالحرب کے کفار تو دارالاسلام میں رہنے کی وجہ سے احکامِ اسلام کی پابندی سے دور ہیں اور جو ذمی غیر مسلم دارالاسلام میں رہتے ہیں انہوں نے ان احکام میں جو ان کے مذہب یا طریقہ یا قانون کے خلاف ہیں اپنے آپ کو پابند نہیں بنایا اور نہ اسلامی احکام پر چلنے کی پابندی خود پر لازم کی، لہذا وہ لوگ جو معاملہ اسلامی شریعت کے خلاف کرتے ہیں ان کو فاسد نہیں کہا جائیگا، اور اس کی کمائی سے مسلمانوں کا لینا جائز ہوگا، ہاں اگر اہل ذمہ مسلمانوں کے ساتھ کسی ایسے معاہدے پر دستخط کردیں یا ایسی شرط کو قبول کرلیں جو اسلامی قانون یا اسلامی حکم ہو تو اس کے خلاف کرنے کو فاسد کہا جائیگا، اور پھر اس کا لینا یا کھانا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہوگا، غیر مسلم ممالک میں رہنے والے غیر مسلم تو حربیوں کی طرح ہیں، لہذا ان کے معاملات کو جو ان کے قانون کے موافق ہیں فاسد نہیں کہا جائیگا، اور اس سے حاصل شدہ نفع مسلمان کے لیے لینا درست ہوگا، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ نے اس پر امداد الاحکام میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ فتویٰ حضرت تھانویؒ کی نظر سے گزرا ہے۔

امداد الاحکام کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمة

والفساد کے لیے خطاب عام کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے، اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں لہذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائے خواہ ربا سے خواہ غصب سے خواہ بیوعِ باطلہ وفاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہر صورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائیگا، اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے۔ (امدادالاحکام: ۴/۳۹۰)۔

لیکن ہدایہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سود کے معاملہ میں مسلمان اور کفار دونوں برابر ہے یعنی دونوں کے لیے سودی کاروبار ممنوع ہیں لہذا اگر میڈیکل ایڈ کمپنی کے کاروبار میں غالب حصہ سود یا پورا سود ہو تو ایسی کمپنی کی امداد لینے سے اجتناب کرنا چاہئے، ہاں اگر غالب کاروبار حلال ہے پھر اس سے نفع اٹھانے اور علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

والربا مستثنىٰ عن عقودهم لقوله عليه السلام: ألا من أربى فليس بيننا وبينه عهد.
(الهداية: ۲/۳۳۸)۔ (صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا جواب مصارفِ ربا کے تحت تفصیل سے مذکور ہوا وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)۔

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

إن كان غالب مال المهدى من الحلال لا باس بأن يقبل الهدية ويأكل مالم يتبين عنده أنه حرام لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب ، وإذا مات عامل من عمال السلطان وأوصى أن يعطى الحنطة للفقراء قالوا: إن كان ماأخذه من أموال الناس مختلطاً بماله لا بأس به وإن كان غير مختلط لايجوز للفقراء أن يأخذوه إذا علموا أنه مال الغير وإن لم يعلم الآخذ أنه من ماله أو مال غيره فهو حلال حتى يتبين أنه حرام . (امدادالفتاویٰ بحواله قاضيخان: ۳/۴۹۴)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر حلال حرام پر غالب ہے تو اس کے ساتھ معاملہ کرنے اور اس کے ذریعہ سے علاج کرانے میں کوئی حرج نہیں، ہاں اگر حلال پر غالب ہو اور مسلمان کمپنی ہے تو پھر معاملہ کرنا درست نہیں۔

واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل ایڈ کمپنی سے رقم وصول کرنے کا حکم:

سوال: میڈیکل ایڈ کی وہ صورت جس میں بیمار شخص رقم وصول کر کے خود علاج ومعالجہ کرالے یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: میڈیکل ایڈ کی یہ صورت قطعاً ناجائز ہے کہ علاج وغیرہ کے لیے ان سے رقم وصول کی جائے اس لیے کہ ملنے والی رقم لامحالہ آپ کی جمع کردہ رقم سے زائد ہوگی اور جو زیادتی آپ وصول کریں گے وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہے بلکہ آپ کی رقم پر اضافی رقم صریح سود کے زمرہ میں داخل ہو کر ناجائز ہوگی۔

ملاحظہ ہو"التعریفات" میں ہے:

الربا هو في اللغة : الزيادة ، وفي الشرع : هو فضل خال عن عوض شرط لأحد العاقدين. (التعريفات للجرجاني،ص۱۱۲).

اعلاء السنن میں ہے:

الفضل المشروط في القرض ربا محرم لايجوز للمسلم من أخيه المسلم أبداً ، لإجماع المجتهدين على حرمته. (اعلاء السنن:۱۴/۵۱۸،ادارة القرآن).

حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

الربا هو القرض على أن يؤدي إليه أكثر وأفضل مما أخذ. (حجة الله البالغة:۲/۲۸۲،قديمي).

علاج معالجہ کی مد میں کمپنی سے خود رقم وصول نہ کریں بلکہ کمپنی خود اس رقم کے عوض علاج ومعالجہ کی ذمہ داری اٹھالے اور علاج وغیرہ کرادے تو اس صورت میں جو رقم آپ نے کمپنی کو جمع کرائی تھی اس کے عوض کمپنی نے آپ کو علاج کی سہولت فراہم کردی، اگرچہ اس صورت میں ثمن کا عوض مجہول ہے مگر چونکہ یہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہے اور لوگ اسی جہالت کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں اس لیے اس کی گنجائش ہے، تاہم بعض علماءِ کرام اس صورت سے بھی منع کرتے ہیں اور ناجائز قرار دیتے ہیں اس لیے احتیاطاً ایسا معاملہ نہیں کرنا چاہئے، اگرچہ گنجائش بھی ہو تب بھی یہ کمپنیاں عموماً سودی معاملات کرتی ہیں تو ان کمپنیوں سے تعاون کی خرابی ضرور لازم آئے گی۔ دلائل کے لیے میڈیکل ایڈ کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیلی فتویٰ ملاحظہ ہو۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل ایڈ کمپنی سے فیس وصول کرنے کا حکم:

سوال: کیا میڈیکل ایڈ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو ڈاکٹر اپنی فیس وغیرہ میڈیکل ایڈ کمپنی سے وصول کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ میڈیکل ایڈ جس میں اپنی رقم کے بدلہ میڈیکل ایڈ کمپنی سے علاج ومعالجہ ملتا ہے، براہِ راست رقم نہیں ملتی یہ صورت جائز اور درست ہے، اور ڈاکٹر حضرات جو مریض کا علاج کرتے ہیں وہ بھی میڈیکل ایڈ کمپنی سے اپنی فیس وصول کر سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں وہ اپنے کام کی اجرت لیتے ہیں، ہاں اگر میڈیکل ایڈ کمپنی کی آمدنی کے اکثر ذرائع حرام ہوں تو اس سے بچنا ضروری ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ڈاکٹر معائنہ کرنے کی فیس لیتا ہے وہ جائز ہے، اس کو ہر کام میں خرچ کر سکتا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۹۱/۱۶، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل ایڈ کمپنی کی باقی ماندہ ادویہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے میڈیکل ایڈ کرایا ہے اگر وہ شخص اس میڈیکل ایڈ کے ذریعہ اپنے مریض بھائی کے لیے دوا نکالنا چاہے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح کمپنی سے تو اپنے لیے حاصل کی تھی لیکن وہ بچ گئی تو دوسرے کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کسی نے میڈیکل ایڈ کمپنی سے اپنے لیے دوا حاصل کی وہ کسی وجہ سے بچ گئی اور اس کی واپسی کا کوئی قانون اور صورت نہ ہو تو دوسرے کو وہ دوا دینا جائز ہے، لیکن اگر اپنا نام استعمال کرتا ہے اور دوسرے کے لیے دوا نکالتا ہے تو یہ دھوکہ اور فریب دہی ہے اور ناجائز ہے، ہاں اگر میڈیکل اید کمپنی کی طرف سے اجازت ہو کہ اپنے بچوں یا والدین کے لیے بھی دوا نکا سکتے ہیں تو پھر ان کے لیے دوا نکالنا جائز ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل انشورنس کا حکم:

سوال: میڈیکل انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: میڈیکل انشورنس تقریباً میڈیکل ایڈ ہی کی طرح ہے، لہذا اس کا حکم بھی میڈیکل ایڈ ہی کی طرح ہوگا کہ اگر کمپنی ادا کردہ رقم کے عوض علاج معالجہ کرادے اور رقم واپس نہ دے تو صحیح اور درست ہے، لیکن

اگر رقم ادا کردے تو ناجائز ہے، اسی طرح اس کمپنی کا روبار اور آمدنی کے ذرائع اکثر و بیشتر حلال ہوں اگر اکثر کمائی کے ذرائع حرام ہیں تو بھی ناجائز ہے۔ دلائل کے لیے مذکورہ بالا میڈیکل ایڈ کا تفصیلی مسئلہ ملاحظہ ہو۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل انشورنس اور امدادِ باہمی:

سوال: میڈیکل انشورنس کی یہ شکل مثلاً ایک آفس کے چند دوست واحباب نے باقاعدہ ایک فنڈ قائم کیا کہ ہر شخص ہر تنخواہ پر چند روپے فنڈ میں جمع کرائے اور پھر بوقتِ ضرورت ہر ممبر کے علاج کے موقع پر اسے مالی امداد مہیا کرے، اگر فنڈ میں سے زیادہ بیمار ممبروں پر صرف ہوتا ہے تو تمام ممبروں کے لیے فیس بڑھا دیتے ہیں اور اگر کم ہوتا ہے تو فیس کم کر دیتے ہیں، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: میڈیکل انشورنس کی یہ صورت چونکہ اس کے کسی مرحلہ میں سود یا قمار نہیں اور بھی کوئی چیز خلافِ شریعت نہیں اس لیے امدادِ باہمی کی یہ صورت بلا کراہت جائز بلکہ مستحب ہے۔ علماءِ کرام کی طرف سے انشورنس اور امدادِ باہمی کی جو جائز صورتیں مختلف مواقع پر تجویز کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، مسلمانوں کو انشورنس کی رائج الوقت حرام صورتوں کو چھوڑ کر جائز صورتیں اختیار کرنا چاہئے۔ (ملخص از آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۲۵۷)۔

امدادِ باہمی (تعاونی بیمہ) سے متعلق رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ کی اسلامک فقہ اکیڈمی کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں:

اکیڈمی کا اجلاس باتفاقِ رائے سعودی عرب کے ھیئۃ کبار العلماء کے فیصلہ نمبر ۵۱ مؤرخہ ۴/ ۴/ ۱۳۹۷ھ بابت تعاونی بیمہ کے جواز اور تجارتی بیمہ کی حرمت کی درجِ ذیل دلائل کی بنیاد پر تائید کرتا ہے:

اول:۔ تعاونی بیمہ عقدِ تبرع کی ایک قسم ہے جس کا مقصودِ اصلی نقصانات کی تقسیم اور حوادثات کے مواقع پر ذمہ داری میں اشتراک ہے، اس کے لیے کچھ اشخاص نقد رقومات جمع کرتے ہیں اور نقصان رسیدہ شخص کا تعاون کرتے ہیں، تعاونی بیمہ گروہ کا مقصود نہ تجارت ہوتا ہے اور نہ دوسروں کے مال سے حصولِ نفع، بلکہ اپنے درمیان نقصانات کی تقسیم اور اس کی تلافی مقصود ہوتا ہے۔

دوم:۔ تعاونی بیمہ سود کی دونوں قسموں ربا الفضل اور ربا النسأ (زیادتی اور ادھار) سے خالی ہوتا ہے، اس کے حصہ داروں کا عقد نہ تو سودی ہوتا ہے اور نہ ہی جمع شدہ قسطوں کو سودی معاملات میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سوم :۔تعاونی بیمہ میں حاصل ہونے والی منفعت کی مقدار سے حصہ داروں کی عدم واقفیت بھی کوئی ضرررساں نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ عطیہ کرنے والے ہوتے ہیں، جہاں خطرہ،غرراور قمار نہیں ہوتا،اس کے برعکس تجارتی بیمہ ایک مالی تجارتی معاوضہ ہوتا ہے۔

چہارم :۔حصہ داریاان کے نمائندے جمع شدہ قسطوں کی سرمایہ کاری کرکے اس تعاون کے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں،سرمایہ کاری کرنے والے خواہ رضا کارانہ یہ کام انجام دیں یاکسی اجرت پر،اس میں کوئی حرج نہیں۔

...اجلاس کی رائے ہے کہ تعاونی بیمہ کی بابت تفصیلی مواد کی تیاری میں درجِ ذیل بنیادوں کی رعایت رکھی جائے:

۱۔ تعاونی بیمہ کی تنظیم کاایک مرکزی آفس ہوجس کے تحت تمام شہروں میں اس کی شاخیں ہوں، اورتنظیم کے اندرعلاحدہ علاحدہ نقصانات کی تلافی اورعلاحدہ علاحدہ پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اعتبار سے علاحدہ شعبے ہوں،مثلاً شعبہ برائے صحت بیمہ(Health Insurance)شعبہ برائے معذورین وپیرانہ سالی بیمہ،وغیرہ۔

۲۔ تعاونی بیمہ تنظیم انتہائی درجہ آسان وسہل ہواور پیچیدہ طریقوں سے بالکل دور ہو۔

۳۔ تنظیم کی ایک مجلس اعلیٰ ہوجوطریقہ کار طے کرے اوران لازمی ضوابط کی تجویز کرے جوشرعی قواعد سے ہم آہنگی کے بعدنافذ العمل ہوں۔

۴۔ اگرنقصانات تنظیم کی آمدنی سے زائد ہوجائیں جوقسطوں میں اضافہ سبب بننے لگیں توحکومت اور شرکاءاس اضافہ کوبرداشت کریں۔

المجمع الفقہی کااجلاس مجلس ھیئۃ کبارالعلماء کی تجویزاوراس کے اس احساس کی تائید کرتا ہے کہ تعاونی کمپنی کے لیے تفصیلی مواد کی تیاری ماہرین اوراصحابِ اختصاص کے ذریعہ کرائی جائے۔(عصرحاضر کے پیچیدہ مسائل کاشرعی حل،مرتب قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ،ص۳۷۔۴۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اورجدیدمعاشی مسائل:۷/۲۹۲،وجدیدفقہی مسائل:۴/۱۰۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل ایڈ کمپنی کاممبر بننے کاحکم:

سوال: میڈیکل ایڈ کمپنی کا ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: میڈیکل ایڈ کمپنی اگر رقم کے عوض علاج معالجہ کرتی ہے اور اس کا غالب کاوبار حلال ہے تو اس کمپنی کا ممبر بننا جائز اور درست ہے بصورتِ دیگر ناجائز ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

انشورنس کرانے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک جماعت کی ملکیت میں کچھ مکانات ہیں ان گھروں کو اسی طرح اسکول، مدرسہ اور مساجد کی عمارتوں کو انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں تو عدمِ جواز کی کیا وجہ ہے؟ اور اگر کسی نے کرایا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: فی زماننا انشورنس (insurance) کا معاملہ جن بنیادوں پر استوار ہے ان کے تحت شرعی نقطہ نظر اور اصول وقواعد کی روشنی میں کسی بھی قسم کی املاک اور جائیداد کو انشورنس کرانا جائز نہیں ہے۔ اور عدمِ جواز کا حکم دو ایسے محرمات کے پائے جانے کی وجہ سے ہے جن کی تحریم نصوصِ قطعیہ کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے ثابت اور ظاہر وباہر ہے، چنانچہ وہ دو مفاسد ربا اور قمار کا پایا جانا ہے، جس کی بنا پر یہ معاملہ ناجائز ہے۔

ربا تو اس وجہ سے کہ جو رقم انشورنس کمپنی کو ادا کی جارہی ہے فقہی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت قرض کی ہے اور اس کی واپسی پر جو منافع ساتھ ملتے ہیں وہ گویا اس مہلت کا معاوضہ ہے جو قرض کی واپسی کے لیے مقرر کی گئی تھی، اگر چہ انشورنس کمپنی اصل رقم کے ساتھ جو منافع دیتی ہے اسے بونس (Bonus) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اس کی حقیقت چونکہ ''سود'' کی ہے اس لیے نام بدلنے سے اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوسکتی ہے چنانچہ اسی حقیقت کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ رقمطراز ہیں:

ظاہر ہے کہ محض نام بدل دینے سے کسی معاملہ کی حقیقت نہیں بدلتی، بیمہ کمپنی کے منافع بلاشبہ سود وربا کی تعریف میں داخل ہیں''۔ (جواہر الفقہ :۲/۱۸۱).

اور بے شمار نصوصِ قطعیہ ربا کی حرمت پر موجود ہیں۔

دوسرا مفسدہ اس میں ''قمار'' کا پایا جانا ہے، وہ اس طرح کہ قمار کی حقیقت یہ ہے کہ دونوں طرف مال ہو اور نفع اور نقصان کسی غیر معین اور غیر معلوم چیز پر معلق ہو، اسی کو فقہاءِ کرامؒ ''خطر اور مخاطرہ'' سے تعبیر کرتے ہیں علمائے امت نے قمار کے بارے میں جو قاعدہ لکھا ہے وہ یہ ہے:

تعليق الملک على الخطر والمال فى الجانبين. (جواهر الفقه:۲/۲۲۷، وامدادالفتاوی:۳/۱۶۱).

چنانچہ ابوبکر جصاص رازیؒ رقمطراز ہیں:

لاخلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وإن المخاطرة من القمار قال ابن عباس رضي الله عنه: إن المخاطرة قمار وإن أهل الجاهلية كانوا يخاطرون على المال والزوجة وقد كان ذلک مباحاً إلى أن ورد تحريمه. (احكام القرآن:۱/۳۲۹،باب تحريم الميسر،وكذافي احكام القرآن للتهانويؒ:۱/۳۹۳).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وسمى القمارقماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار:۶/۴۰۳،كتاب الحظروالاباحة، سعيد).

مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

تمام صحابہ وتابعین اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن صالح رضی اللہ عنہ اور عطاءؒ اور طاؤسؒ نے فرمایا:

الميسر القمار حتى لعب الصبيان بالكعاب والجوز، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔ (معارف القرآن:۱/۵۳۲).

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ میسر کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

وقال عطاء ومجاهد: الميسر القمار كله حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب.

(تفسیر السمرقندی:۱/۲۰۳).

اور انشورنس کمپنی میں بھی حادثہ کی صورت میں مال پر حاصل ہونے والی منفعت کا حصول اور عدم حصول خطرہ میں ہوتا ہے اس لیے یہ بھی قمار میں داخل ہے، اور قمار کی حرمت پر نصوصِ قطعیہ موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾. (المائدة،الآية:۹۰).

امام دارالہجرت حضرت مالک بن انسؒ اس قسم کے ایک معاملہ کی مثال دیکر اس کا حکم تحریر فرماتے ہیں:

أن يعمد الرجل إلى الرجل قد ضلت راحلته أو دابته أوغلامه وثمن هذه الأشياء خمسون دينارفيقول: أنا آخذها منك بعشرين ديناراً فإن وجدها المبتاع ذهب من مال البائع بثلاثين ديناراً وإن لم يجدها ذهب البائع منه بعشرين ديناراً وهما لايدريان كيف يكون حالهما في ذلك ولايدريان أيضاً إذا وجدت تلك الضالة كيف توخذ وماحدث فيها من أمر الله ممايكون فيه نقصها وزيادتها فهذا أعظم المخاطرة. (المدونة الكبرى:۳/۲۵۴، كتاب الغرر، دار الفكر).

ایک شخص دوسرے شخص کے پاس جائے جس کا اونٹ یا کوئی جانور یا غلام گم ہوگیا ہو اور ان کی قیمت مثلاً پچاس دینار ہو وہ جاکر اس سے کہے میں تم سے اس گم شدہ چیز کو بیس دینار میں خریدتا ہوں سو اگر خریدنے والے کو گم شدہ چیز مل جاتی ہے تو مالک کو تیس دینار کا نقصان ہوگا اور اگر نہیں ملتی تو اس کو بیس دینار مفت مل جائیں گے، ان دونوں کو معاملہ کرتے وقت کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوگا وہ چیز ملتی ہے یا نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو کس حال میں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں کیا زیادتی کمی ہوچکی ہے، اس طرح کا معاملہ کرنا بہت بڑا خطرہ اور دھوکہ ہے۔

اس مثال میں یہی بتایا گیا ہے کہ ایسا معاملہ جس میں انجام کے اچھے یا برے دونوں طرح کے ہونے کا احتمال ہو، شرعاً درست نہیں، ایسا ہی معاملہ انشورنس کا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انشورنس کمپنی سودی کمپنی ہے اس میں رقم جمع کرانا اور مسجد یا مدرسہ کی جائیداد کو یا جماعت کی کسی عمارت کو انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں، اگر کسی جماعت نے غلطی سے انشورنس کرالیا ہو تو صرف اپنی جمع شدہ رقم ہی واپس لیں زائد ہرگز نہ لیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کار اور املاک کے انشورنس کا حکم:

سوال: کار انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً نئی گاڑی خریدی اور اس کی قیمت کے بقدر انشورنس کرالیا اگر یہ چوری ہوگئی تو انشورنس کمپنی اس کی قیمت ادا کرے گی، نیز گاڑی خراب ہوجائے تو انشورنس کمپنی اس

کوٹھیک کرادیگی۔

الجواب: انشورنس کی پہلی صورت جس میں کمپنی رقم ادا کرتی ہے یہ تو قطعاً ناجائز ہے، ازروئے شریعت اس میں ربا اور قمار لازم آتا ہے، اور قرآن وحدیث میں دونوں کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

ہاں اگر انشورنس کمپنی رقم ادا نہیں کرتی بلکہ رقم کے عوض کار کی مرمت کرادیتی ہے تو اس صورت کی گنجائش ہے، مگر احتیاطاً ایسا معاملہ نہیں کرنا چاہئے، اس صورت میں عوضِ ثمن میں اگر چہ جہالت ہے مگر مفضی الی النزاع نہیں ہے، بعض علماء اس کو بھی ناجائز فرماتے ہیں، اور سودی کمپنی سے تعاون تو بہر حال لازم آتا ہے، اس لیے ایسا معاملہ کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

باعتبارِ صورت کے تو یہ قمار ہے "لأنه تعليق الملك على الخطر و المال في الجانبين" اور باعتبارِ حقیقت کے سود ہے... اور قمار اور سود دونوں حرام ہیں پس یہ معاملہ یقیناً حرام ہے۔(امداد الفتاویٰ:۳/۱۶۱)۔

مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

بیمہ کمپنیوں سے دکانوں کارخانوں عمروں کا بیمہ کرانا ناجائز ہے کیونکہ بیمہ ربا اور قمار پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ دونوں ناجائز ہیں۔(کفایت المفتی:۸/۸۳)۔

مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربا بھی قمار اس لیے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے، جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے، اس کو قمار کہتے ہیں اور ربا اس طرح کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور زیادہ رقم ملتی ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۷/۲۹۰)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

زندگی اور املاک کا انشورنس اصلاً جائز نہیں ہے کہ اس میں سود بھی ہے اور قمار بھی۔(جدید فقہی مسائل:۴/۱۴۴)۔

اسلامی فقہ میں ہے:

موجودہ انشورنس کی اسکیم میں سود و قمار وغیرہ کے بیشمار مفاسد پائے جاتے ہیں، اور اخلاقی ومعاشی

اعتبار سے بھی انسانی اخلاق ومروت اور تمدنی زندگی کو سود اور قمار وغیرہ گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ (اسلامی فقہ :۲/۳۶۰)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جبری انشورنس کا حکم:

سوال: آج کل کمپنیوں میں دستور ہے کہ وہ لوگ ملازمین کی تنخواہ میں سے ایک متعین رقم کاٹ لیتے ہیں یہ رقم لائف انشورنس کے فنڈ میں جمع کردی جاتی ہے، ملازمین کی تنخواہ پر قبضہ کرنے سے پہلے کمپنی اس رقم کو از خود کاٹ لیتی ہے ملازم کو کوئی اختیار نہیں ہوتا اور ملازم کمپنی کے وضع شدہ قانون اور دستور کے مطابق مجبور ہے، اگر ملازم کا انتقال ہو جائے تو ایک بہت بڑی رقم ملازم کے ورثاء کو دی جاتی ہے جو اصل رقم سے بہت زیادہ ہوتی ہے کیا یہ رقم ورثاء کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ نیز املاک وغیرہ کے جبری انشورنس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: موجودہ دور میں جب کہ انشورنس کے بغیر ملازمتوں کا ملنا اور اگر ملازمت ہے تو اس کا باقی رہنا ناممکن سا ہو گیا ہے، اسی طرح آئے دن فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کا جو مالی نقصان ہوتا ہے، نیز حکومت کے قانون کے مطابق ملازمتوں میں زندگی کا بیمہ لازم کردیا گیا ہے جس کے بغیر یا تو ملازمت کا استحقاق نہیں ہوتا یا اگر ہو تو بقاء ودوام نہیں رہتا اس لیے مجبوری کی صورت میں اس قسم کے انشورنس کی اجازت ہوگی چنانچہ بعض اہل علم نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ہاں دل سے اس کو برا سمجھتے ہوئے توبہ اور استغفار بھی کرتا رہے۔

پھر انشورنس کی وہ صورت جس میں از خود رقم جمع کرائی ہے اس پر جو زائد رقم حاصل ہو اس کو اپنے استعمال میں لانا درست نہیں بلکہ ثواب کی نیت کے بغیر فقراء پر صدقہ کردیا جائے۔ ہاں انشورنس کی وہ صورت جس میں کمپنی تنخواہ سے ایک حصہ ملازم کے اختیار کے بغیر کاٹ لیتی ہے اور پھر اس پر زائد رقم ادا کرتی ہے یہ سود نہیں ہے اس رقم کا استعمال جائز اور درست ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی یہ دونوں چیزیں ممنوع ہیں، بیمہ بھی ممنوع ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان ومال کی حفاظت ہی نہ ہو سکتی ہو، یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۳۸۷، جامعہ فاروقیہ)۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

جب کہ بغیر کاروبار یا فیکٹری یا دوکان کے گزارہ دشوار ہے، اور اس پر یہ قانونی پابندی ہے تو مجبوراً اس بیمہ زندگی میں آدمی معذور قرار دیا جائیگا، تاہم جو رقم اس کے داخل کردہ رقم سے زائد ہے اس کو غرباء پر صدقہ کردے اپنے کام میں نہ لائے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۳۹۰، جامعہ فاروقیہ).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

انشورنس کی وہ تمام صورتیں جن میں سرکاری قانون کے تحت انشورنس لازمی ہے جائز ہوں گی، جیسے بین ملکی تجارت میں درآمد و برآمد کے لیے، کہ اس میں انشور کرانے والے کے اختیار کو دخل نہیں۔ (جدید فقہی مسائل: ۱۲۴/۴).

امداد الفتاوی میں ہے:

تنخواہ کا کوئی جزو اس طرح وضع کرا دینا اور پھر یکمشت وصول کر لینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے کیونکہ درحقیقت وہ سود نہیں ہے اس لیے کہ تنخواہ کا جو جزء وصول نہیں ہوا وہ اس ملازم کی ملک میں داخل نہیں ہوا پس وہ رقم زائد اس کی مملوک شئی سے منتفع ہونے پر نہیں دی گئی بلکہ تبرع ابتدائی ہے جو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود کہے....؟ (امداد الفتاویٰ:۳/ ۱۴۹).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

گورنمنٹ وہ زائد رقم اگرچہ سود کے نام سے دیتی ہے لیکن سود کی تعریف تو اس وقت صادق آتی جب کہ ہم نے خود رقم جمع کی ہوتی اور اس پر مزید رقم ملتی لیکن یہاں تو گورنمنٹ نے ہمارے اختیار کے بغیر از خود رقم کاٹ کر جمع کر لی ہے جو ابھی ہمارے قبضہ و ملک میں بھی نہیں آئی، اور اس پر اضافہ کرتی ہے اس لیے اس رقم پر جو بھی اضافہ ہوگا وہ ہماری مملوک میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ ابتدائی تبرع و انعام ہوگا۔ (جدید فقہی مباحث:۴/ ۴۸۵).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

سرکاری طور پر جبراً جو روپیہ حکومت بیمہ کے نام پر کاٹ لیتی ہے وہ روپیہ اور اس میں جتنا ملا کر دے وہ سب بھی ناجائز نہیں ہے، لے سکتے ہیں اور اپنے کام میں خرچ کر سکتے ہیں۔ (نظام الفتاویٰ:۲/ ۲۳۶).

مزید ملاحظہ فرمائیں: (جدید فقہی مباحث:۴/ ۲۳۷، وفتاویٰ عثمانی:۳/ ۳۱۴، وجدید فقہی مسائل:۱/ ۴۳۵، واحسن الفتاویٰ:۷/ ۲۵).

جبری انشورنس کے جواز کے چند عمومی دلائل ملاحظہ فرمائیں:

شریعت کا ایک بہت بڑا اصول یسر اور رفعِ حرج ہے:

قال اللّٰہ تعالیٰ : ﴿ یرید اللّٰہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر﴾ (سورۃ البقرۃ،الآیۃ:۱۸۵).

وقال تعالیٰ: ﴿ وما جعل علیکم فی الدین من حرج ﴾ (سورۃ الحج،الآیۃ:۷۸).

فقہ کے مسلمہ قواعد میں سے چند حسبِ ذیل درج ہیں:

" المشقة تجلب التيسير". (الاشباہ والنظائر:۱/۲۲٦).

"الضرورات تبيح المحظورات". (شرح المجلة، وقواعدالفقه،والاشباه ،:۱/۲۵۱).

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أوخاصة". (الاشباه والنظائر:۱/۲٦۷).

"وماحرم لذاته يباح للضرورة".(تفسيرالمنارلمحمدرشيدبن علی رضا، ٦/۲۲۳).

"وماحرم سداً لذريعة يباح للحاجة".(تفسيرالمنارلمحمدرشيدبن علی رضا، ٦/۲۲۳).

"إذاضاق الأمر اتسع ". (قواعدالفقه، ص ٦۲). **واللّٰہ ﷻ اعلم۔**

تھرڈ پارٹی انشورنس کا حکم:

سوال: تھرڈ پارٹی انشورنس جائز ہے یا نہیں؟ جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے،اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لیے بیمہ کرایا جاتا ہے۔مثلاً گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دوسرے کا نقصان ہونے کا خطرہ ہے،اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہوجائے گا، اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثے کے وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔اس کو عموماً(Third party insurance) کہتے ہیں۔بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کر کے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے،اس خطرے سے بچنے کے لیے بھی گھر کے مالکان بیمہ کرالیتے ہیں، یہ بھی "تأمين المسئولية" کی ایک شکل ہے جس میں تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔اس انشورنس کا کیا حکم ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا باجر جزیل۔

الجواب: تھرڈ پارٹی انشورنس کے بارے میں علمائے کرام کے درمیان اختلاف ہے،بعض علماء ناجائز

کہتے ہیں، مثلاً مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں ہر قسم کا انشورنس حرام اور ناجائز ہے، اس لیے کہ ربا اور قمار پر مشتمل ہے، ملاحظہ ہو: (فتاویٰ عثمانی:۳/۳۲۸، واسلام اور جدید معاشی مسائل:۷/۲۹۰، واسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص۱۶۱)، اور دیگر بعض کا میلان جواز کی طرف ہے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

حادثہ اگر ڈرائیور کی غلطی سے ہوا ہے اور اس میں اگر کسی شخص کی موت واقع ہوگئی ہے تو شریعت کی رو سے قتل خطا کی دیت ادا کرنے کی ذمہ داری ڈرائیور پر عائد ہوتی ہے، مگر وہ دیت کی بڑی رقم کہاں سے ادا کرے گا؟ اسلام نے عاقلہ (اس کے خاندان) کو دیت کی ادائیگی میں شریک کیا تھا لیکن موجودہ زمانہ میں خاندانی سسٹم نہیں رہا اور ڈرائیور بالعموم اس بوجھ کا محتمل نہیں ہوتا اس لیے موجودہ متمدن دنیا نے تھرڈ پارٹی انشورنس کا یہ طریقہ رائج کر کے بہت بڑی سہولت فراہم کردی ہے... یہ انشورنس درحقیقت تعاون ہی کی ایک شکل ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے نظام میں کچھ فاسد چیزیں بھی شامل ہوگئی ہیں، مگر اس بنا پر اس معاملہ کو جو ایک ناگزیر تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

...غرض یہ کہ تھرڈ پارٹی موٹر انشورنس موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت اور جائز نوعیت کا معاملہ ہے اگرچہ اس کے نظام میں فاسد اجزاء بھی شامل ہوگئے ہیں جس کا گناہ ان لوگوں کے سر ہے جو اس نظام کو چلاتے ہیں۔ (جدید فقہی مباحث:۴/۲۹۶۔۲۹۷، مرتب قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

فقیر کا خیال ہے کہ انشورنس کی یہ صورت ہر اس سماج میں جائز ہونا چاہئے، جہاں ایسے مواقع کے لیے نظامِ معاقل عملی طور پر موجود نہ ہو، انشورنس کی اس صورت میں تو سود کا سوال ہی نہیں کہ بیمہ کرانے والے کو حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں کوئی رقم واپس نہیں ملتی، البتہ ایک گونہ خطر موجود ہے کہ اگر وہ حادثہ سے محفوظ رہا تو اس کو اپنی جمع شدہ رقم سے ہاتھ دھونا ہوگا، حادثہ پیش آیا تو اس سے بڑھ کر اعانت حاصل ہوگی، مگر غور کیا جائے تو اس درجہ کا خطر خود معاقل کے نظام میں بھی ہے، ولاءِ موالات میں بھی ہے اور بعض اور معاملات میں بھی ہے، اصل یہ کہ انشورنس کی یہ صورت از قبیل تبرعات ہے، بیمہ کی قسط ادا کرنے والا اپنے ہم پیشہ لوگوں کے لیے تبرع پیش کرتا ہے اور کبھی وہ خود اس میں مبتلا ہوجائے تو اپنے ہم پیشہ لوگوں کی مدد سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ (جدید فقہی مسائل:۴/۱۲۰)۔

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں سود کا پہلو نہیں ہے اس وجہ سے کہ انشورنس کمپنی رقم ادا نہیں کرتی بلکہ دوسرے کی گاڑی ٹھیک کرادیتی ہے، تو یہ خدمت کا معاوضہ ہے، ہاں اس میں غرر موجود ہے اس طور پر کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کار کا ایکسیڈنٹ نہ ہو تو ایک طرف ادائیگی یقینی ہے اور دوسری طرف یقینی نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غررِ یسیر ہے جو مفضی الی النزاع نہیں ہے اور فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں غررِ یسیر قابل برداشت ہے مفسدِ عقد نہیں ہے۔

غرر سے متعلق فقہاءِ کرام کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

غرر کی تحقیق اور اس کا حکم:

علماء نے غرر کی مختلف تعریفات بیان کی ہے۔ جن میں سے چند حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: **الغرر ما يكون مستور العاقبة.** (المبسوط:۱۲/۱۹٤،ادارة القرآن).

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

الغرر وهو فى الأصل الخطر، والخطرهو الذي لايدرى أيكون أم لا، وقال ابن عرفة: الغرر هو ما كان ظاهره يغر وباطنه مجهول، قال والغرور ما رأيت له ظاهراً تحبه وباطنه مكروه أومجهول، وقال الأزهري: بيع الغرر ما يكون على غيرعهدة ولاثقة، وقال صاحب المشارق: بيع الغرر بيع المخاطرة، وهوالجهل بالثمن أو المثمن أوسلامته أوأجله. (عمدة القاری:۸/٤۳۵،ملتان).

وقال في إكمال المعلم: فأما الغرر فما تردد بين السلامة والعطب أوما في معنى ذلك، وذلك أنه يلحق بمعنى إضاعة المال، لأنه قد لايحصل المبيع فيكون بذل ماله باطلاً. (اكمال المعلم:۵/۱۳۳، باب بيع الحصاة والبيع الذى فيه الغرر).

وقال ابن العربي فى القبس: فأما الغرر فهو كل أمرخفيت علانيته وانطوى أمره. (القبس:۲/۷۹۲).

وقال ملك العلماء: الغرر هو الخطر الذي استوى فيه طرف الوجود والعدم بمنزلة الشك. (بدائع الصنائع:۵/۱٦۳،سعيد).

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں کہ غرر ایسی غیر یقینی حالت کا نام ہے جس میں وجود وعدم برابر ہوں، شک کے درجہ میں ہو۔

غرر کی ممانعت میں بکثرت نصوص وارد ہوئی ہیں:

قال العلامة العينيؒ: وقد وردت أحاديث كثيرة في النهي عن بيع الغرر: منها: رواه مسلم في صحيحه من حديث أبي هريرةؓ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحصاة، وعن بيع الغرر، وأخرجه الأربعة أيضاً، ومنها: حديث ابن عمرؓ رواه البيهقي من حديث نافع عنه، قال: نهى رسول الله صلى الله عليه و سلم عن بيع الغرر. ومنها حديث ابن عباسؓ أخرجه ابن ماجة من حديث عطاء عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر، ومنها حديث أبي سعيد أخرجه ابن ماجة أيضاً من حديث شهربن حوشب عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شراء ما في بطون الأنعام حتى تضع، وعما في ضروعها إلا بكيل، وعن شراء العبد وهو آبق وعن شراء المغانم حتى تقسم وعن شراء الصدقات حتى تقبض، وعن ضربة القانص. ومنها حديث عليؓ أخرجه أبو داود وفيه: قد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع المضطر وبيع الغرر...ومنها: حديث ابن مسعودؓ أخرجه أحمد عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتشتروا السمك في الماء فإنه غرر ومنها: حديث عمران بن الحصينؓ أخرجه ابن أبي عاصم في كتاب البيوع: أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع ما في ضروع الماشية قبل أن تحلب وعن بيع الجنين في بطون الأنعام، وعن بيع السمك في الماء وعن المضامين والملاقيح وحبل الحبلة وعن بيع الغرر. (عمدة القاری: ۴۳۶/۸، باب بیع الغرر).

تمام نصوص بالا کا خلاصہ اور ما حصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معاملات سے منع فرمایا ہے جس میں غرر ہو، اسلام سے پہلے بہت سے معاملات مروج تھے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر ہی کی بنا پر منع فرمایا تھا، جیسے: ”بیع حبل الحبله، بیع المضامین، بیع الملاقیح، بیع الملامسه، بیع المنابذه، بیع الحصاة، بیع عسب الفحل، بیع الثمرقبل بدوصلاحه، بیع السمک فی الماء الکثیر، بیع الطیرفی الهواء، بیع اللبن فی الضرع، بیع ضربة الغائص وغیرها من البیاعات

التي تتضمن الغرر الفاحش المؤدي إلى النزاع المشكل بين العاقدين.

عام طور پر غرر و جہالت پیدا ہونے کے چند اسباب ہیں۔

(۱) مبیع کا وجود ہی یقینی نہ ہو۔ جیسے بھا گا ہوا غلام۔

(۲) مبیع کا وجود معلوم ہو لیکن حصول غیر یقینی ہو، جیسے فضاء میں پرندہ۔ مچھلی پانی میں۔

(۳) مبیع کی جنس ہی معلوم نہ ہو۔

(۴) جنس تو معلوم ہے لیکن سامان کی نوع معلوم نہیں ہے۔

(۵) مقدار معلوم ومتعین نہ ہو۔

(۶) بقاء یقینی نہ ہو، جیسے ظاہر ہونے سے پہلے پھل کی بیع۔

(۷) اجل مجہول ہو۔

غرر کی اقسام:

غرر کی دو قسمیں ہیں (۱) غرر کثیر، فاحش (۲) غرر یسیر، قلیل، حقیر۔

غرر کا حکم:

فقہاء اور محدثین کی عبارات کا جائزہ لینے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر غرر مفسد ومبطل بیع نہیں ہے، بلکہ غرر کثیر ممنوع اور مفسد ہے، اور غرر یسیر معاف ہے۔

ملاحظہ فرمائیں حضرت شیخ اوجز المسالک میں نقل فرماتے ہیں:

وقال الباجي: هو ما كثر فيه الغرر، وغلب عليه حتى صار البيع يوصف ببيع الغرر، فهذا الذي لاخلاف في المنع منه، وأما يسير الغرر، فإنه لايؤثر في فساد عقد بيع فإنه لايكاد يخلو عقد منه. (اوجز المسالك ،باب بيع الغرر،۱۳/۸۸،دمشق).

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وروى الطبري عن ابن سيرين بإسناد صحيح، قال: لا أعلم ببيع الغرر بأساً، وقال ابن بطال: لعله لم يبلغه النهي، وإلا فكل مايمكن أن يوجد وأن لايوجد لم يصح وكذلك إذا كان لايصح غالباً، فإن كان يصح غالباً كالثمرة في أول بدو صلاحها أو كان يسيراً تبعاً كالحمل مع الحامل جاز لقلة الغرر، ولعل هذا هو الذي أراد ابن سيرينؒ. (عمدة القاری،باب بیع

الغرر وحبل الحبلة:٨/٤٣٨، ملتان).

جمہرۃ القواعد الفقہیۃ میں ہے:

وهـذا الـنهي الوارد منصب على الغرر الكثير الفاحش إذ اليسير منه معفو عنه باتفاق العـلـمـاء، إذ هـو من قبيل مالايستطاع الاحتراز منه في المعاملات، فهناك نصوص فقهية كثيرة تطرقت إلى هذا المفهوم. (جمهرة القواعدالفقهية:١/٣٠٩).

زادالمعاد میں ہے:

...ليس كـل غـرر سبباً لـلتحريم، والغرر إذاكان يسيراً أولايمكن الاحتراز منه لم يكن مانعاً من صحة العقد. (زادالمعاد: ٥/٨٢٠، بيع المغيبات).

الموافقات میں امام شاطبی فرماتے ہیں:

أصـل البيـع ضـروري، ومـنـع الـغـرر والـجهالة مكمل، فلو اشترط نفي الغرر جملة لانحسم باب البيع. (الموافقات:٢/٧، كتاب المقاصد، المسألة الثالثة، دار الفكر).

وقـال الإمـام الـنـوويؒ فـي شرح مسلم: أجمع المسلمون على جواز أشياء فيها غرر حقير. (شرح مسلم:٢/٢، كتاب البيوع)

تكمله فتح الملهم میں ہے:

فـأمـا الـغرر بمعنى جهالة المبيع فربما يحتمل إذا كان يسيراً دعت الحاجة إليه، ولم يـكـن مفضياً إلى المنازعة في العرف،...قال العبد الضعيف عفا اللّٰه عنه: ويخرج على هذا كثير من المسائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة أنهم يضعون أنواعاً من الأطعمة في قدور كبيرة، ويخيرون المشتري في أكل ماشاء بقدر ماشاء، ويأخذون ثمناً واحـداً معيناً من كل أحد، فالقياس أن لا يجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها، ولكنه يـجـوز لأن الـجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع، وقد جرى بها العرف والتعامل...(تكملة فتح الملهم:١/٣٢٠ـ وكذا في جمهرة القواعد الفقهية:١/٣٢٠).

اكمال المعلم میں ہے:

ولـمـا رأيـنـاهـم أجـمـعوا على جواز المسائل التي عددناها، قلنا: ليس ذلک إلا لأن

الغرر فيها نزر يسير غير مقصود، وتدعو الضرورة إلى العفو عنه. (اكمال المعلم شرح صحيح مسلم للقاضي عياض، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذى فيه غرر، ۵/ ۱۳۴، دار الوفاء).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

غرر کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے فقہاء نے غرر کے بھی درجات مقرر کیے ہیں، غرر کثیر معاملہ کے درست ہونے میں مانع ہے اور یسیر غرر مانع نہیں ہے۔ (جدید فقہی مسائل: ۴/۲۰۹).

خلاصہ یہ ہے کہ علمائے کرام کے اختلاف کے پیش نظر انشورنس کے ہر معاملہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

A.A. کمپنی کا حکم:

سوال: آج کل جو ہمارے ملک میں A.A. کمپنی ہے، یعنی ایک کمپنی ہے جو یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ اگر آپ کی گاڑی راستہ میں خراب ہو جائے تو گاڑی اٹھانے میں اور ٹھیک کرانے میں آپ کی مدد کر دیتی ہے، اور اس کے عوض آپ کو ہر سال متعین رقم ادا کرنی ہوگی، تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اس کمپنی کو اجیر خاص یا اجیر مشترک کہا جائیگا؟ اسی طرح گاڑی کی حفاظت کے لیے ایک اور کمپنی ہے کہ اگر گاڑی چوری ہو جائے تو وہ کمپنی گاڑی کو معلوم کر لیتی ہے، اور اس کے عوض بھی ماہانہ کچھ رقم ادا کی جاتی ہے تو یہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ درست ہے اس وجہ سے کہ رقم کے عوض خدمت ملتی ہے، البتہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ گاڑی خراب نہیں ہوتی اور ٹھیک کرانے کی نوبت نہیں آتی پھر بھی کمپنی اجرت کی مستحق ہوگی یا نہیں اگر یہ کمپنی اجیر خاص ہے تو اجرت کی مستحق ہوگی، لیکن دوسروں کا بھی کام لیتی ہے اس وجہ سے یہ اجیر مشترک کے حکم ہونی چاہئے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کمپنیاں نہ بالکل اجیر مشترک کے حکم میں ہے اور نہ بالکل اجیر خاص بلکہ بین بین ہے، لہذا اجیر خاص کی طرف نظر کرتے ہوئے اجرت کی مستحق ہوگی اور دوسروں کے عمل قبول کرنے کی وجہ سے اجیر مشترک بھی شمار کی جائیگی۔

اس کی نظیر ملاحظہ فرمائیں فتح المعین میں ہے:

والحاصل أن المسائل فى الظئر تعارضت فمنها مايدل على أنها في معنى أجير الوحد كقولهم لا ضمان عليها إذا ضاع الصبي من يدها أو سرق ما عليه، ومنها ما يدل على أنها

في معنى المشترك كقولهم إنها تستحق الأجرعلى الفريقين إذا أجرت نفسها لغيره، قال الاتقاني: والصحيح أنه إن دفع الولد إليها لترضعه فهي أجير مشترك وإن حملها إلى منزله فهي أجير وحد وقال في العناية: وذكر في الذخيرة مايدل على أنها يجوز أن تكون خاصاً ومشتركاً حتى لو أجرت نفسها لغيره استحقت الأجر على الفريقين كاملاً عملاً بشبه الأجير المشترك وتأثم نظراً إلى أن لها شبهاً بالأجير الخاص. (فتح المعين:۳/۲۵۴، وكذا في فتاوى الشامي:٦/٧١،سعيد).

أقول: ويرتفع الإثم إذا كان الإذن بالعمل للغير . والله ﷻ اعلم۔

کسی کمپنی کے ساتھ انشورنس کرنے کا حکم:

سوال: ایک سامان کو منتقل کرنے والی کمپنی ایک متعین مقدار فیس پر سامان منتقل کرتی ہے۔ مثلاً ۵۰ رینڈ اور وہ اس منتقل شدہ سامان کے اوپر زائد فیس کے عوض (مثلاً ۱۰ فیصد) انشورنس اوفر کرتی ہے، ممکن ہے کہ یہ کمپنی ایک دوسری کمپنی سے انشورنس حاصل کرتی ہے، اور جو چیز منتقل کی جارہی ہے وہ مہنگی ہے، مثلاً لیپ ٹوپ کمپیوٹر وغیرہ۔ کیا ایسا انشورنس کروانا جائز ہے؟

الجواب: انشورنس میں چونکہ دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی ہیں (۱) ربا (۲) قمار اور دونوں حرام ہیں، اس لیے انشورنس بھی ناجائز ہے، لہذا مذکورہ صورت میں کمپنی سے سامان منتقل کرنے والے آدمی کے لیے انشورنس کرانا ناجائز ہے، چاہے سامان منتقل کرنے والی کمپنی خود انشورنس کرتی ہو یا کسی دوسری کمپنی سے انشورنس حاصل کرتی ہو، اس لیے کہ اس صورت میں گویا وہ سامان منتقل کرانے والے کی طرف سے ایجنٹ ہے اور اصل عقد سامان منتقل کرانے والے اور انشورنس کمپنی کے درمیان ہوا بنابریں ایسے معاملہ سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو احکام القرآن میں ہے:

لاخلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار قال بن عباس رضي الله عنه: إن المخاطرة قمار وإن أهل الجاهلية كانوا يخاطرون على المال والزوجة وقد كان ذالك مباحاً إلى أن ورد تحريمه. (أحكام القرآن للجصاص:۱/۳۲۹).

فتاوی الشامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من القمارين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (فتاوى الشامي:٦/٤٠٣،سعيد).

نیز مذکور ہے:

الربا هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعي شرط لأحد المتعاقدين في المعاوضة.

(فتاوى الشامي:٥/١٦٨،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی یہ دونوں چیزیں ممنوع ہیں بیمہ بھی ممنوع ہے۔(فتاوی محمودیہ:۱۶/۳۸۷، جامعہ فاروقیہ)۔

ہاں میڈیکل ایڈ کی اجازت ہے کیونکہ اس میں رینڈ جمع کراتے ہیں اور اس کے عوض رقم نہیں ملتی بلکہ علاج ملتا ہے اور مذکورہ بالا صورت میں رقم کے عوض رقم ملتی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

انشورنس کمپنی کا ایجنٹ بننے کا حکم:

سوال: زید کئی کمپنیوں کی طرف سے انشورنس ایجنٹ ہے وہ کمپنیاں طویل المیعاد اور قصیر المیعاد انشورنس کا کام کرتی ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ کمپنیوں کے لیے گاہک فراہم کرنے سے کمپنیاں اسے کمیشن دیتی ہیں، اور انشورنس کی اکثر کمپنیاں سودی کاروبار میں ملوث ہیں، تو کیا ایسی ایجنسی جائز ہے یا نہیں؟ اور کمیشن لینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: آج کل انشورنس کی اکثر کمپنیوں کے کاروبار سود اور قمار پر مشتمل ہیں، لہٰذا سودی کمپنی کی ایجنسی جائز نہیں ہے اور سودی کمپنی کی طرف سے ملنے والا کمیشن بھی ناجائز ہے اس سے بچنا چاہئے، ہاں جو کمپنیاں اکثر حلال کاروبار کرتی ہیں ان میں حصہ لینے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿**أحل الله البيع وحرم الربا**﴾(سورة البقرة).

وقال تعالىٰ: ﴿**يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقي من الربا إن كنتم مؤمنين**﴾

(سورۃ البقرۃ:).

وقال تعالیٰ: ﴿ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان﴾ (سورۃ المائدۃ:۲).

وعن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدہ وقال ھم سواء. (رواہ مسلم:۲/۲۷، باب الربا).

جدید فقہی مسائل میں ہے:

انشورنس اصل میں سود اور جوئے سے خالی نہیں اس لیے مسلمان کے لیے انشورنس کمپنی کی ایجنسی لینا اور اس کو ذریعہ معاش بنانا جائز نہیں۔ (جدید فقہی مسائل:۱/۴۳۸، وآپ کے مسائل اوران کا حل:۶/۲۵۸). واللہ تعالیٰ اعلم۔

ڈاکٹر کے لیے انشورنس کرانے کا حکم:

سوال: کیا ڈاکٹر کے لیے جائز ہے کہ وہ ڈاکٹری انشورنس کرائے یعنی وہ اس حیثیت سے انشورنس کا معاملہ کرے کہ اگر اس سے آپریشن یا علاج وغیرہ میں کوئی غلطی ہوجائے اور مریض کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو اس کی تلافی انشورنس کمپنی کی مدد سے کردے۔ کیونکہ مسلمان مریض تو نفع نقصان کو تقدیر پر محمول کر کے کوئی دعویٰ نہیں کرتے، مگر کافر جو کہ تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے وہ غلطی ہوجانے کی صورت میں دعویٰ دائر کر کے بہت سی رقم وصول کر لیتے ہیں، تو کیا اس مشکل سے بچنے کے لیے ڈاکٹر انشورنس کرا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: عام طور پر اس قسم کے انشورنس میں رقم کے عوض رقم حاصل کی جاتی ہے اور انشورنس کمپنی اس پر اضافی رقم بھی ادا کرتی ہے، یہ صریح سود ہے جو حرام اور ناجائز ہے، لہذا اس قسم کے انشورنس سے اجتناب کرنا ایک مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے لازم اور ضروری ہے۔ ہاں اگر انشورنس کمپنی رقم ادا نہ کرے بلکہ اس رقم کے عوض مریض کے نقصان کی تلافی کسی بڑے ہسپتال میں کسی تجربہ کار ماہر ڈاکٹر کے ذریعہ کرادے تو اس کی گنجائش ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پراویڈنٹ فنڈ کا حکم:

سوال: سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے ایک خاص تناسب سے ماہانہ رقم وضع کی جاتی ہے اور یہ حکومت بجبر کرتی ہے ملازمین کا اس میں اختیار نہیں ہوتا، پھر ملازمت ختم ہونے کے بعد مزید اضافہ کے ساتھ

واپس کی جاتی ہے تو اس رقم کا لینا اور استعمال کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ تکمیل ملازمت پر پراویڈنٹ فنڈ کی رقم لینا اور اس کا استعمال کرنا جائز اور درست ہے، کیونکہ تنخواہ سے جو رقم حکومت وضع کرتی ہے وہ استحقاق کے زمرے میں آتی ہے اس پر ملازم کی ملکیت نہیں آتی، لہذا حکومت جو سود اس رقم پر دیتی ہے وہ سود نہیں، کیونکہ سود اپنی مملوک رقم پر مشروط اضافے کا نام ہے، جب کہ یہ رقم مملوک نہیں۔

ملاحظہ ہو کفایت المفتی میں ہے:

پراویڈنٹ فنڈ پر جو رقم محکمہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اسی طرح دونوں کے مجموعے پر سود کے نام سے بڑھائی جاتی ہے یہ سب رقم جائز ہے یہ شرعاً سود نہیں اگر چہ محکمہ اس کو سود کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ (کفایت المفتی: ۸/۹۷).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

جبری پراویڈنٹ فنڈ کی اصل رقم پر جو زیادتی محکموں کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں ہے، اس لیے اس کا وصول کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۰۷).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

یہ سلسلہ حکومت نے اپنے قانون کے پیش نظر جاری کیا ہے جس سے ملازم کی خیر خواہی مقصود ہے، جب تک اس پر ملازم کا قبضہ نہ ہو یہ ملازم کی ملکیت نہیں، لہذا اس پر جو کچھ اضافہ ملتا ہے یہ بھی سود نہ ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ :۱۶/۳۹۴، جامعہ فاروقیہ).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

حکومت سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ رقم جبراً وضع کرتی ہے جس کو جی پی فنڈ کہا جاتا ہے، اختتامِ ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو اور اس کے انتقال کی صورت میں اس کے ورثاء کو ادا کر دیتی ہے، اس میں سود کے نام سے ایک اضافی رقم بھی ملاتی ہے اب یہ اضافی رقم جو حکومت ادا کرتی ہے اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ کہ یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے کیونکہ سود دو آدمیوں کے درمیان بذریعہ عقد طے ہوتا ہے، جب کہ دونوں طرف سے مال ہو اور ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم سے جو رقم تنخواہ سے وضع کی جاتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی، اس لیے کہ ملازم کی تنخواہ کے ملک میں داخل ہونے کے لیے ضروری

ہے کہ وہ قبضہ میں ہو:

قال العلامة ابن نجيمؒ: قوله بل بالتعجيل أو بشرطه أو بالاستيفاء أو بالتمكن أي لايملك الأجرة إلا بواحد من هذه الأربعة. (البحر الرائق:۷/ ۳۰۰).

چونکہ اس رقم پر ملازم یا اس کے وکیل نے قبضہ نہیں کیا، اس لیے ملازم اس رقم کا مالک نہیں ہوا، لہذا ملازم کے تصرفات اس میں نافذ نہ ہوں گے، اب حکومت اصل رقم یا سود پر اضافی رقم یا سود کے نام پر اضافی رقم جو کچھ بھی ادا کر رہی ہے، سب اجرت ہی کا حصہ ہے جو حکومت مؤجلا اکھٹی ادا کر رہی ہے، چنانچہ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام سے جو رقم ملتی ہے وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/ ۱۶۹، بحوالہ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ، ص۴).

آپ کے مسائل میں ہے:

پراویڈنٹ فنڈ پر جو اضافی رقم محکمہ کی طرف سے دی جاتی ہے اس کا لینا جائز ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل:۶/ ۲۱۲).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (منتخبات نظام الفتاویٰ، جلد اول، ص۲۰۸، واحسن الفتاویٰ:۷/ ۵۰، وجدید فقہی مسائل، جلد اول، ص۲۴۹، وجدید فقہی مباحث:۶/ ۲۹۰، ورسالہ ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ اور سود کا مسئلہ'' از حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ). واللہ ﷻ اعلم۔

اختیاری پراویڈنٹ فنڈ کا حکم:

سوال: ایک شخص ایک کمپنی کا ملازم ہے اور اس کمپنی میں اس کی تنخواہ دو ہزار رینڈ ہے لیکن ہر ماہ اس میں سے دوسو رینڈ کٹتے ہیں، اور یہ کٹوتی اس کی مرضی سے ہے، پھر کمپنی اس کے ساتھ مزید ایک سو رینڈ ملاتی ہے، اور ملازمت ختم ہونے کے بعد پوری رقم ملتی ہے، کیا یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بہت سارے علماء نے دونوں قسم کے پراویڈنٹ فنڈ کا ایک ہی حکم تحریر فرمایا ہے، البتہ اپنے اختیار سے وضع کرانے میں ربا کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے اس وجہ سے اس سے اجتناب کرنا چاہئے، تاکہ سود کھانے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

ملاحظہ ہو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

البتہ پراویڈنٹ فنڈ میں رقم اپنے اختیار سے کٹوائی جائے تو اس میں تشبہ بالربا بھی ہے اور ذریعہ سود بنا لینے کا خطرہ بھی اس لیے اس سے اجتناب کیا جائے۔ (پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ، ص۴).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

کوئی ملازم بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم جی پی فنڈ میں کٹوائے اور پھر اختتامِ ملازمت پر اصل رقم مع سود وصول کرے شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اصل رقم تو حلال ہے، اس پر حکومت کی طرف سے سود کے نام پر جو اضافی رقم ملے گی، اس میں تشبہ بالربا ہے آئندہ سودخوری کا ذریعہ بنا لینے کا بھی خطرہ ہے، اس لیے اس سے اجتناب کیا جائے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۷۰، بحوالہ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

جبری اور اختیاری فنڈ دونوں کا حکم یہی ہے، البتہ جو رقم اپنے اختیار سے کٹوائی گئی ہو اس پر ملنے والی زیادتی کو احتیاطاً صدقہ کر دیں تو بہتر ہے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۰۸).

بعض علماء نے اضافی رقم کو سود قرار دیکر ناجائز فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو آپ کے مسائل میں ہے:

اور اگر ملازم خود کٹواتا ہے تو اس پر منافع لینا جائز نہیں، سود ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/۲۲۵، وامداد الاحکام: ۳/۴۷۲، وفتاویٰ حقانیہ: ۶/۲۱۳). واللہ ﷻ اعلم۔

پنشن فنڈ کا حکم:

سوال: سرکاری ملازمین کو اختتامِ ملازمت کے بعد ماہانہ وظیفہ بحساب نصف تنخواہ کے بطورِ پنشن ملتا ہے، از روئے شریعت اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: پنشن حکومت کی طرف سے محض عطیہ اور قسم کا تعاون ہے لہذا اس کا لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

پنشن جو ملازم کو ملازمت سے سبکدوشی پر ملتی ہے جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ۸/۹۷).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

بعض محکموں میں ملازمت ختم ہونے پر حسن کارکردگی کے صلہ میں پنشن ملتی ہے، اس کو بھی سود نہیں

کہا جاتا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۹۴/۱۶، جامعہ فاروقیہ)۔

آپ کے مسائل میں ہے:

پنشن کی حیثیت ایک لحاظ سے عطیہ کی ہے اس لیے جو معاملہ پنشنر اور حکومت کے درمیان طے ہو جائے وہ صحیح ہے یہ جوا اور قمار نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۹۴/۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رٹائرمنٹ پالیسی کا حکم:

سوال: میت نے اپنی زندگی میں اپنے اختیار سے لائف انشورنس اور رٹائرمنٹ پالیسی اپنی بیوی کے نامزد کیا، اب انتقال کے بعد انشورنس کمپنی اس کی بیوی کو بڑی رقم دیگی، اور ماہانہ پنشن بھی ملتا رہے گا، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: لائف انشورنس اور رٹائرمنٹ پالیسی جس میں رقم کے عوض رقم ملتی ہے اور ساتھ میں اضافی رقم بھی ملتی ہے یہ سودی معاملہ ہے اور یہ ناجائز ہے، اس سے اجتناب کرنا لازم اور ضروری ہے، لیکن اگر غلطی سے یا جہالت یا فسق و فجور کی وجہ سے کسی نے ایسا عقد کرالیا تھا تو ادا کردہ رقم سے زائد بلانیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے۔ پھر یہ ادا کردہ رقم میت کے انتقال کے بعد اس کے جمیع ورثاء میں شرعی طریقہ پر تقسیم کی جائیگی، اور کمپنی کا ماہانہ پنشن تبرع کے حکم میں ہے اس کی گنجائش ہے۔

جدید معاشی مسائل میں ہے:

زندگی کے بیمہ میں تین طریقے سے حرمت پائی جاتی ہے۔

(۱) اس میں جمع شدہ رقم پر بطورِ سود زائد رقم ملتی ہے اس لیے حقیقۃً ربا اور سود میں داخل ہے۔

(۲) جیون بیمہ اپنی صورت و شکل کے اعتبار سے قمار اور جوا ہے اس لیے کہ طالبِ بیمہ کا کب انتقال ہو جائیگا اور کتنی زائد رقم ملے گی اور اگر کسی مجبوری سے رقم جمع کرنیکا سلسلہ بند ہو جائے تو پچھلی جمع شدہ ساری رقم سوخت ہو جاتی ہے اور یہ سب امور از قبیل تعلیق الملک علی الخطر ہے جس کو شریعت میں قمار اور جوا کہا جاتا ہے۔

(۳) انسان کی جان اور اعضاء اشیاء متقومہ میں سے نہیں ہیں اور شئی غیر متقوم کا کوئی عوض نہیں ہوا کرتا ہے اور اگر بالفرض عوض مقرر کیا جائے تو وہ عوض نہیں ہوتا بلکہ صورۃً رشوت ہوتی ہے اور رشوت بھی بحکم خبر حرام اور باعثِ عذاب ہے۔ لہذا ان وجوہ حرمت کی بنا پر جیون بیمہ قطعی ناجائز اور حرام ہے اور اس کے لیے اسلامی

شریعت میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ (جدید معاشی مسائل ،ص۹۴، بحوالہ امداد الفتاویٰ:۳/۱۶۱، فتاویٰ رحیمیہ:۲/۲۰۰، فتاویٰ محمودیہ:۶/۳۰۸، کفایت المفتی:۸/۶۷، آپ کے مسائل اوران کا حل:۶/۲۵۵، جدید فقہی مسائل:۱/۲۶۰، نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۲).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

پراویڈنٹ فنڈ، لائف انشورنس، کوآپریٹوسوسائٹی جیسے معاملات میں ان کے ضوابط کے مطابق اگر کسی شخص نے اپنی رقم کے لیے دوسرے کو نامزد کردیا تو نامزد شخص خواہ وارث ہو یا غیر وارث، اس کی حیثیت نہ موصی لہ کی ہوگی اور نہ موہوب لہ کی، بلکہ صرف امین کی ہوگی، لہذا نامزد کرنے والے شخص کی جمع کردہ اور وضع شدہ رقم اس کی موت کے بعد حسبِ سہام شرعی اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگی، اور سود کی رقم بلانیتِ ثواب فقراء کو دے دینا ضروری ہوگا، اسی طرح نامزد کرنے والے شخص کی جان یا مال ضائع ہوجانے کی صورت میں معاوضہ میں ملی ہوئی رقم اس کے وارثوں میں حسبِ سہام شرعی تقسیم ہوگی۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، مرتب مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ، ص۲۵۵، دفعہ۱۰). واللہ ﷻ اعلم۔

تعلیمی پالیسی کا حکم:

سوال: مرحوم نے اپنی بیٹی کی تعلیم کے لیے انشورنس نکالا، ماہانہ متعین رقم انشورنس کمپنی کو دیتا ہے، جب بیٹی کی عمر ۲۵ سال کو پہنچ جائیگی تو اس کو ماں کی بڑی رقم کمپنی کی طرف سے ملے گی، کیا بڑی رقم کا لینا اور تعلیمی فیس وغیرہ میں ادا کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: تعلیمی انشورنس میں بھی رقم کے عوض رقم مع اضافہ ملتی ہے لہذا یہ سودی معاملہ ہے اور یہ ناجائز ہے، صرف ادا کردہ رقم لینا اور استعمال کرنا جائز ہے بقیہ اضافی، سودی رقم بلانیت ثواب صدقہ کردیا جائے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

امدادی فنڈ کا حکم:

سوال: سوال: ہمارے ہاں عورتوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ ۵۰ عورتیں دوسو روپے فی نفر ایک عورت کے پاس جمع کراتی ہیں، اور ہر ماہ قرعہ اندازی کے ذریعے وہ رقم ایک عورت کو مل جاتی ہے پھر دوسرے ماہ دوسری کو اس طرح ہر ایک کو ملتا ہے کوئی محروم نہیں رہتی، اس میں سود بھی نہیں بلکہ جتنی رقم لی ہے اتنی رقم آئندہ جمع کرتی ہے، کیا یہ شکل بنگاہِ شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: صورتِ مسئولہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ اولیٰ اور بہتر ہے، اس کی حیثیت ایک دوسرے کو قرض دیکر مالی تعاون کی ہے، یعنی جس عورت کا نام سب سے پہلے نکل آیا گویا اس کو دوسری عورتوں نے قرض دیکر تعاون کیا، آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے کے فضائل قرآن اور احادیث میں بے شمار موجود ہیں۔ بطورِ ''مشتے نمونہ از خروارے'' چند حسبِ ذیل درج ہیں:

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وتعاونوا علی البر والتقوی﴾ (سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۲).

قال الإمام القرطبيؒ: وھو أمر لجمیع الخلق بالتعاون إلی البر والتقوی؛ أی لیُعِن بعضکیم بعضاً ...وقال الماورديؒ: ندب اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ إلی التعاون بالبر وقرنہ بالتقوی لہ؛ لأن في التقوی رضا اللّٰہ تعالیٰ، وفي البر رضا الناس، ومن جمع بین رضا اللہ تعالیٰ ورضا الناس فقد تمت سعادتہ وعمت نعمتہ، ...والتعاون علی البر والتقوی یکون بوجوہ؛ فواجب علی العالم أن یعین الناس بعلمہ فیعلمھم، ویعینھم الغنی بمالہ، والشجاع بشجاعتہ في سبیل اللّٰہ، وأن یکون المسلمون متظاھرین کالید الواحد ''المؤمنون تتکافأ دماؤھم ویسعی بذمتھم أدناھم وھم یدعلی من سواھم''. (الجامع لاحکام القرآن: ۶/۳۳).

وقال ابن کثیرؒ: یأمر تعالیٰ عبادہ المؤمنین بالمعاونۃ علی فعل الخیرات وھو البر وترک المنکرات وھو التقوی...عن أنس ﷺ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ''انصر أخاک ظالماً أو مظلوماً'' قیل: یارسول اللّٰہ ھذا نصرتہ مظلوماً، فکیف انصرہ ظالماً؟ قال: ''تمنعہ من الظلم فذاک نصرک إیاہ''. (تفسیر ابن کثیر: ۲/۷).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

قرآن حکیم نے ایک ایسے اصول اور بنیادی مسئلہ کے متعلق ایک حکیمانہ فیصلہ دیا ہے جو پورے نظامِ عالم کی روح ہے، اور جس پر انسان کی ہر صلاح وفلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے وہ مسئلہ ہے باہمی تعاون وتناصر کا، اس دنیا کا پورا نظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے، اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریاتِ زندگی کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ (معارف القرآن: ۳/۲۰).

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون﴾.

وعن ابن عمر رضي الله عنه أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: المسلم أخو المسلم لايظلمه ولايسلمه، من كان في حاجة أخيه كان اللّٰه في حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة فرج اللّٰه عنه بها كربة من كرب يوم القيامة، ومن ستر مسلماً ستر اللّٰه يوم القيامة، متفق عليه.

وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: "من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا، نفس اللّٰه عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر يسر اللّٰه عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر مسلماً ستره اللّٰه في الدنيا والآخرة، واللّٰه في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه ... (رياض الصالحين: ١/٦٠٥، باب قضاء حوائج المسلمين، دار السلام).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

چند افراد مل کر ماہانہ متعینہ رقم ادا کریں اور قرعہ اندازی کے ذریعہ چٹھی کے شرکاء میں سے جس کا نام نکل آئے اس کو دے دی جائے، اس طرح باری باری تمام لوگوں کو پوری رقم یکمشت حاصل ہو جائے، جیسے دس آدمی دس دس ہزار روپے ماہانہ چٹھی میں دیں، اور ہر ماہ شرکاء میں سے ایک کو یکمشت ایک لاکھ روپے مل جائیں، یہ صورت جائز ہے، اس کی حیثیت ایک دوسرے کو قرض دینے کی ہے، یعنی جس شخص کی چٹھی پہلی بار میں اٹھ گئی، گویا اس کو نو ساتھیوں نے نوے ہزار روپے قرض دیا، یہ صورت نہ صرف جائز، بلکہ بہتر ہے، اور اس کے ذریعہ معاشی خود کفالت میں مدد مل سکتی ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/۳۴۳). واللہ تعالیٰ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿یا أیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون﴾

(المائدة،الآیة: ۹۰).

وعن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ قال:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

"إن اللّٰہ حرم علی أمتي الخمر والمیسر"

(مسند احمد وسنن ابی داود).

باب......﴿٤﴾

احکام

القمار والرشوة

باب......﴿۴﴾

جوا اور رشوت کے احکام

گھوڑ دوڑ میں بازی لگانے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں حضراتِ مفتیانِ کرام وعلمائے عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک شخص ہے جو گھوڑا سواری کا مقابلہ کرتا ہے، اس نے کئی دفعہ مقابلے میں انعام جیتا ہے، اور اس انعامی روپے کے ذریعہ ایک دوکان (جس میں کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ بیچتا ہے) بنائی مزید اسی روپے کے ذریعہ سے دوکان بنانا چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس شخص کا گھوڑا سواری کا مقابلہ کرنا اور انعام حاصل کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر اس کی آمدنی حلال نہیں تو پھر اس دکان سے خرید وفروخت درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ گھوڑا سواری کے مقابلہ میں ہار جیت کی بازی لگانا اور اس پر جانبین سے پیسہ کی شرط رکھ کر انعام حاصل کرنا ناجائز اور حرام ہے اور یہ جوا ہے، قرآن کریم میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اور اس حرام پیسے سے دوکان بنانا جائز نہیں ہے، اور ایسی دوکانوں سے خرید وفروخت کرنے سے بھی بچنا چاہئے۔

ہاں فریقین میں سے صرف ایک شخص کی طرف سے انعام کی شرط ہو، دوسرے کی طرف سے انعام کی شرط نہ ہو تو یہ جائز ہے، اسی طرح اگر مقابلہ میں شریک ہونے والے آدمیوں کے علاوہ کوئی اور شخص انعام دے اس کا لینا بھی جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون. (المائدة،الآية: ٩٠).

فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ میسر کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

وقال عطاء ومجاهد: الميسر القمار كله حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب. (تفسير السمرقندى: ١/٢٠٣).

التعریفات الفقہیہ میں ہے:

القمار مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب، وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين. (التعريفات الفقهية،ص ١٧٧، وجواهر الفقه: ٢/٢٢٧، وامداد الفتاوى: ٣/١٦١).

فتاوی شامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار: ٦/٤٠٣،كتاب الحظر والاباحة، سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

(والمسابقة) بالفرس والإبل والأرجل والرمي جائزة وحرم شرط الجعل من الجانبين، لا من أحد الجانبين، ومعنى شرط الجعل من الجانبين أن يقول إن سبق فرسک فلک علي كذا، وإن سبق فرسي فلي عليک كذا، وهو قمار فلا يجوز. وإذا شرط من جانب واحد بأن يقول إن سبقتني فلک على كذا، وإن سبقتک فلا شيء لي عليک جاز استحساناً. (الفتاوى الهندية: ٦/٤٤٥، مسائل شتىٰ).

البحر الرائق میں ہے:

قال رحمه الله (والمسابقة بالفرس ...جائزة وحرم شرط الجعل من الجانبين لا من أحد الجانبين، لما روى ابن عمرؓ أن النبي صلى الله عليه وسلم سبق بالخيل وراهن،

ومعنى شرط الجعل من الجانبين أن يقول إن سبق فرسک فلک علی کذا ، وإن سبق فرسي فلي عليک کذا ، وهو قمار فلا يجوز، لأن القمار من قمر الذي يزاد تارة وينقص أخرى، وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من القمارين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه فيجوز الازدياد والنقصان في كل واحد منهما فصار ذلک قماراً وهو حرام بالنص. (تکملة البحر الرائق:٨/٤٨٦، مسائل شتیٰ، کوئٹه).

وللاستزادة انظر : (ردالمحتار علی الدر المختار:٦/٧٥٢،سعید۔وتبیین الحقائق:والجوهرة النيرة:).

اسلامی فقہ میں ہے:

جس طرح ہرطرح کا سودی کاروبار حرام ہے، اسی طرح جوئے کا تمام کاروبار حرام ہے، جوا خواہ بازی لگا کر کھیلا جائے، یا کوئی شرط لگا کر یا بخت واتفاق کی بنا پر کوئی فائدہ اٹھایا جائے اسلام میں یہ سب ناجائز ہے، قرآن وحدیث میں جوئے (میسر) کو حرام کیا گیا ہے۔(اسلامی فقہ:۲/۳۵۴).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے گھوڑے کمپنی کی ملک اور سوار اس کمپنی کے ملازم اور دوسرے لوگ گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگاتے ہیں جس کی فیس ان کو داخل کرنا ہوتی ہے جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اس نمبر پر داؤ لگانے والے کو انعامی رقم مل جاتی ہے، باقی سب لوگوں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے۔

یہ صورت مطلقاً حرام ہے، اول تو اس ریس کو قوتِ جہاد پیدا کرنے سے کوئی واسطہ نہیں، کیوں کہ بازی لگانے والے نہ گھوڑے رکھتے ہیں نہ سواری کی مشق سے ان کو کچھ کام ہے، ثانیاً جو صورت معاوضہ کی رکھی گئی ہے ایک شق میں داؤ لگانے والے کو انعامی رقم ملتی ہے اور دوسری شق میں اس کو اپنی دی ہوئی فیس سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہ عین قمار ہے جو بنص قرآن حرام ہے۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۷۳).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل، جلد اول، ص۲۶۳). واللہ تعالیٰ اعلم۔

گھوڑ دوڑ کی بازی میں محلل کا حکم:

سوال: اگر زید اور عمر گھوڑ دوڑ میں یہ شرط لگا دیں کہ جو آگے بڑھے گا دوسرا اس کو دس ہزار رینڈ دیگا تو یہ

صورت ناجائز ہے، حدیث شریف سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں محلل کے داخل ہونے سے شرط لگانا جائز ہوجاتا ہے، اس محلل ''جواز پیدا کرنے والا'' کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: گھوڑ دوڑ کی بازی میں محلل کے داخل ہوکر جواز پیدا کرنے کی دو صورتیں ہیں:۔

محلل کی پہلی صورت:۔

زید اور عمر محلل سے کہیں کہ اگر تم بازی لے گئے تو ہماری طے شدہ رقم تمہیں مل جائیگی اور اگر تم ہار گئے تو تم بازی لے جانے والے کو کچھ نہیں دو گے، بلکہ جیتنے والا اپنے دوسرے فریق سے طے شدہ رقم لے لیگا، اس صورت سے چار شکلیں برآمد ہوتی ہیں:

(۱) اگر محلل جیتا تو اسے بیس ہزار رینڈ ملیں گے۔

(۲) اگر زید اور عمر میں سے کوئی جیتا تو اسے دوسرے کے دس ہزار ملیں گے، اور محلل کو کچھ نہیں ملے گا۔

(۳) زید وعمر دونوں محلل سے جیتنے میں برابر رہے تو دونوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

(۴) محلل اور زید یا عمر میں سے کوئی جیتنے میں برابر رہے تو اس میں اختلاف ہے، علامہ شامیؒ کے نزدیک محلل کو کچھ نہیں ملے گا، اور دوسرے کو طے شدہ رقم (دس ہزار رینڈ) ملے گی، اور ملا علی قاریؒ کے نزدیک محلل اور دوسرے جیتنے والے کے درمیان نفع تقسیم ہوگا۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

وصورة إدخال المحلل أن يقولا للثالث إن سبقتنا فالمالان لک و إن سبقناک فلا شيء لناعليک ولكن الشرط الذي شرطاه بينهما وهو أيهما سبق كان له الجعل على صاحبه باق على ماله فإن غلبهما أخذ المالين وإن غلباه فلا شيء لهما عليه ويأخذ أيهما غلب المال المشروط له من صاحبه. (تبيين الحقائق:٦/٢٢٨،ملتان).

الدرالمختار میں ہے:

...إلا إذا أدخلا ثالثاًمحللاً بينهما...ثم إذا سبقهما أخذ منهما وإن سبقاه لم يعطهما وفيما بينهما أيهما سبق أخذ من صاحبه. (الدر المختار:٦/٤٠٣،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ثم إذا كان المال مشروطاً من جانبين فأدخلا بينهما ثالثاً وقال للثالث إن سبقتنا

فالمال لك وإن سبقناك فلا شيء لنا يجوز استحساناً...وإن سبقناه على التعاقب فالذي سبق صاحبه يستحق المال على صاحبه وصاحبه لايستحق المال عليه. (الفتاوى الهندية: ٣٢٤/٥).

وللاستزادة انظر: (عمدة القاري: ١٩٢/١٠، ط: ملتان، ورد المحتار: ٧٥٢/٦، سعيد، و الفتاوى السراجية، ص ٣٣٦، والبحر الرائق: ٤٨٢/٨).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وإن سبقاه وجاءا معاً فلا شيء لواحد منهما وإن سبق المحلل مع أحدهما ثم جاء الآخر فلاشيء على من مع المحلل بل له ماشرطه الآخر له كما لو سبق ثم جاء المحلل ثم جاء الآخر فلاشيء للمحلل. (فتاوى الشامي: ٤٠٣/٦، سعيد).

مرقاۃ المفاتیح میں ہے:

وإن جاء المحلل و أحد المستبقين معاً ثم جاء الثاني مصلياً أخذ السابقان سبقه.

(مرقاة المفاتيح: ٣٢٠/٧، ملتان).

محلل کی دوسری صورت:

زید اور عمر محلل سے کہیں کہ اگر تم جیتے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا اور اگر ہار گئے تو تم ہم میں سے جیتنے والے کو کچھ نہیں دو گے، اور ہم میں سے جیتنے والا دوسرے سے دس ہزار رینڈ لے لیگا، اس صورت میں بھی قمار کا گناہ نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں ہے:

فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار مثلاً خالد کو اپنے ساتھ شریک کرلیں پھر...شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ زید بڑھے تو عمر ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور عمر آگے بڑھے تو زید اتنی ہی رقم اس کو ادا کرے اور اگر خالد بڑھ جائے تو اس کو کچھ دینا کسی کے ذمہ نہیں۔ (جواہر الفقہ: ۳۵۵/۲، احکام القمار)۔

(وكذا في الفقه المعاملات: ٧٢/٢، واشرف التوضيح شرح مشكوٰة المصابيح: ٥٦٨/٢).

پہلی صورت کی طرح یہاں بھی چار شکلیں نکلتی ہیں:

دوسری دو صورتیں یکساں ہیں اور پہلی شکل میں جب کہ محلل جیت جائے تو اس صورت میں اسے کچھ نہیں

ملے گا، اور آخری میں بھی محلل کو کچھ نہیں ملے گا، البتہ محلل کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ اس کا گھوڑا پہلے دونوں کے گھوڑوں کے مساوی ہو یعنی اس کے جیتنے اور ہارنے کا احتمال ہو، اس کا جیتنا یا ہارنا متیقن نہ ہو ورنہ قمار ہی شمار کیا جائیگا۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من أدخل فرساً بين فرسين يعني وهو لايؤمن أن يسبق فليس بقمار، ومن أدخل فرساً بين فرسين وقد أمن أن يسبق فهو قمار. (رواه ابوداود، ص ۳۵۵).

وللاستزادة انظر: (تبيين الحقائق: ٦/٢٢٧، ملتان، الفتاوى الهندية: ٥/٣٢٤ـ وبدائع الصنائع: ٦/٢٠٦، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ثالث کی طرف سے انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: ایک اسکول میں فنکشن ہو رہا ہے اس میں ہال میں بیٹھنے بلکہ اسکول کی مدد کے لیے ۵۰ رینڈ داخلہ فیس ہے، اس اسکول کے مالک کی طرف سے نہیں بلکہ کسی ثالث کی طرف سے قرعہ اندازی کے ذریعہ ایک یا چند انعامات ملتے ہیں مثلاً موبائل فون ملتا ہے اگر فیس جمع کرانے والے کو یہ انعام مل جائے تو اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ فیس جمع کرانے والے کو اگر یہ انعام مل جائے تو اس کا لینا دو وجہ سے جائز اور درست ہے۔

(۱) یہ انعام ۵۰ رینڈ فیس کے بدلے میں نہیں ملتا اس لیے کہ ۵۰ رینڈ تو داخلہ کی فیس ہے اور بالفاظِ دیگر اسکول کی مدد کے لیے ہوتے ہیں، انعام کا بدل نہیں ہوتے اس وجہ سے جائز اور درست ہے۔

(۲) جواز کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ انعام ثالث کی طرف سے ہے نہ کہ اسکول کے مالک کی طرف سے، اور ثالث کی طرف سے انعام لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وكذلك (أى لا بأس به) ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين: من

سبق منکما فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلك من باب التحريض على استعداد أسباب الجهاد خصوصاً من السلطان. (بدائع الصنائع:٦/٢٠٦، كتاب السباق، سعيد۔وفتاوى الشامي: ٣٥٤/٥،سعيد).

اس عبارت میں بادشاہ ثالث کے درجہ میں ہے تو جس طرح بادشاہ کا انعام دینا جائز ہے اسی طرح صورتِ مسئولہ میں ثالث کا انعام دینا بھی جائز ہوگا۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

مشروط معاوضہ گھوڑ دوڑ کی جائز صورت ایک یہ ہے کہ فریقین جو اپنے اپنے گھوڑے دوڑا کر بازی لگا رہے ہیں آپس میں کسی کو کسی سے کچھ لینا دینا نہ ہو، بلکہ حکومت وقت یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطورِ انعام کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لیے مقرر ہو تو یہ جائز اور درست ہے۔(جدید معاملات کے شرعی احکام: جلد دوم،۱۷).

مزید ملاحظہ ہو: (جواہر الفقہ:۳۵۶/۲). واللہ ﷻ اعلم۔

انعامی بانڈز کا حکم:

سوال: انعامی بانڈز کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگ ۱۰، ۱۰ رینڈ جمع کرتے ہیں اور پھر ایک آدمی یا چند آدمیوں کو انعام ملتا ہے اور باقی لوگوں کی رقم ڈوب جاتی ہے یہ تو قمار کی ایک شکل ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ جو ۱۰، ۱۰ رینڈ جمع کرتے ہیں وہ واپس مل جاتے ہیں اور قرعہ اندازی کے طریقہ پر بعض کو انعام ملتا ہے اس میں بظاہر قمار نہیں ہے کیونکہ رقم نہیں ڈوبی اور بظاہر سود بھی نہیں اس لیے کہ سود کی تعریف :الفضل المشروط الخالی عن العوض" ۔ اور یہاں فرداً فرداً کسی کے ساتھ شرط نہیں لگائی کہ آپ کو اتنی زائد رقم دیں گے اس دوسری صورت کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: انعامی بانڈز کی مروجہ یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

بعض حضرات نے انعامی بانڈز کو جائز کہا ہے اس نقطہ نظر سے دیکھا کہ چونکہ یہاں تعلیق التملیک علی الخطر نہیں ہے کیونکہ جتنے پیسے دیئے ہیں وہ ہر حال میں مل جائیں گے لہذا یہ قمار نہیں ہے تو یہ جائز ہوگیا، لیکن یہ خیال

درست نہیں ہے کیونکہ یہاں اگر چہ قمار بذاتِ خود نہیں ہے لیکن اس میں ربا ہے اس لیے کہ اگر اس کا نام قرعہ اندازی میں نکل آتا ہے تو اس کو مثلاً اگر سو روپے دئے تھے اس کے عوض میں ایک لاکھ ایک سو روپے ملیں گے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا کہ یہ سود بھی نہیں ہے اس لیے کہ جب میں نے بانڈز لیا تھا تو میرے ساتھ کوئی مشروط زیادتی کا معاملہ نہیں تھا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ مجموعہ مقروضین کے ساتھ زیادتی مشروط ہے اور اگر چہ صراحت نہیں ہوتی کہ ہم اس کے اوپر کوئی منافع دیں گے لیکن عمل ہوتا ہے اور وہ عمل مستمر اور تعامل ہے کہ جب کوئی شخص اپنا قرض واپس لیتا ہے تو حکومت اس کو کچھ زیادہ دیتی ہے، لہذا یہاں اگر چہ لفظوں میں شرط نہیں تھی لیکن " المعروف کالمشروط " میں آ گیا۔

عموماً یہ ہوتا ہے کہ حکومت ہر بانڈز والے کے بانڈز پر سود لگاتی ہے پھر سب کے سود کو اکٹھا کر کے قرعہ اندازی کے ذریعہ افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ سود کو قمار کی شکل میں تقسیم کرتے ہیں، اگر چہ وہ شرعاً قمار اس لیے نہ ہوا کہ سود ملکیت ہے ہی نہیں لیکن اس میں قمار کی روح موجود ہے اور قمار سود پر ہو رہا ہے کہ ایک آدمی کا سود یا بہت سارے آدمیوں کا سود ملا کر ایک شخص کو قرعہ اندازی کے ذریعہ دیدیا گیا اس واسطے یہ نا جائز ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۱۱-۷۸).

فتاویٰ بینات میں ہے:

پرائز بانڈز کی خرید و فروخت کرنا اور اس سے ملنے والا انعام حاصل کرنا از روئے شرع نا جائز اور حرام ہے۔ (فتاوی بینات: ۴/۲۲۷).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل: ۱/۲۶۳).

خلاصہ یہ ہے کہ انعامی بانڈز کی پہلی صورت قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع اور نا جائز ہے اور دوسری صورت میں سود شامل ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، لہذا دونوں صورتوں سے بچنا لازم اور ضروری ہے۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

ایک اسکیم جو ۲۵۰ سے ۳۰۰ ممبران پر مشتمل ہوتی ہے، ہر ممبر ۳۰۰ روپے ماہوار دیتا ہے، ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے جس کا نام نکل آئے اس ۱۵۰۰۰ روپے یا اتنی مالیت کے برابر دوسری چیز دی جاتی ہے اور اس سے باقی قسطیں نہیں لی جاتیں۔

اس اسکیم میں بھی دو احتمال ہیں یا تو ہر ممبر کو انعامی رقم ملنا یقینی ہوگا یا اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگا، اگر ملنا یقینی ہے تو یہ ''سود'' ہے کیونکہ رقم جمع کروانے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ رقم اور زیادہ رقم لے کر آئے اور اسکیم چلانے والے بھی اس کی ترغیب اور لالچ دلاتے ہیں کہ ممبر قرعہ اندازی میں حصہ لے نام نکلنے پر زائد رقم حاصل کرے۔ اگر اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہے تو یہ جوا ہے، سود اور جوا دونوں حرام ہیں، ان سے بچنا فرض ہے ۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۶۴).

البتہ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کے تفصیلی فتویٰ (جو منتخباتِ نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۵، پر درج ہے) سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ دوسری صورت جس میں رقم پوری ملتی ہے سود میں داخل نہیں ہے، اس کا لینا جائز اور درست ہے، اس مسئلہ کی مزید وضاحت عنقریب سپردِ قرطاس کی جائیگی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اخباری معمہ حل کرنے پر انعام کا حکم:

سوال: بہت سی مرتبہ اخبارات میں شائع ہوتا ہے کہ فلاں چیز کا مطلب بیان کردے یا فلاں معمہ حل کردے تو اتنا انعام ملے گا، جب کہ کوئی فیس وغیرہ اخبار کے ساتھ ادا نہیں کی جاتی تو یہ انعام لینا درست ہے یا نہیں؟ ہاں اخبار خریدنا پڑتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اخبار میں انعامی اسکیم شائع ہوتی ہے اس کو حل کرنے پر انعام حاصل کرنا جائز اور درست ہے اس میں کوئی حرج نہیں یہ یک طرفہ چیز ہے نہ اس میں قمار ہے اور نہ سود۔ اور جو رقم اخبار خریدنے میں خرچ ہوئی اس کے عوض اخبار مل گیا۔

ملاحظہ ہو تنویر الابصار میں ہے:

حل الجعل إن شرط المال من جانب واحد...وفي الشامية: جواز الجعل فيما ذكر استحسان . (تنویرالابصارمع فتاوی الشامی:٦/٤٠٢، کتاب الحظرو الاباحة،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وحرم شرط الجعل من الجانبين، لا من أحد الجانبين ،... وإذا شرط من جانب واحد بأن يقول إن سبقتني فلك علي كذا، وإن سبقتك فلا شيء لي عليك جاز استحساناً. (الفتاوی الهندية: ٦/٤٤٥، مسائل شتیٰ).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اخبار میں شائع ہوا کہ جو شخص فلاں چیز کا مطلب بیان کردے یا فلاں مسئلہ کو حل کردے تو اس کو اتنا انعام دیا جائیگا، پھر کسی نے اس کو حل کردیا اور انعام ملا تو یہ انعام اس کی ملک ہے...اس میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ یک طرفہ چیز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۴۴۳، جامعہ فاروقیہ).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

اگر بچوں سے انعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لیے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے، اور قرعہ اندازی تقسیم انعامات کے لیے جائز ہے۔ (فتاویٰ عثمانی:۳/۳۴۲).

حلال وحرام میں ہے:

ہاں اگر معمہ بھیجنے والوں سے کوئی فیس نہ لی جائے تو یہ صورت درست ہوگی اور اس رقم کی حیثیت خالص انعام کی قرار پائے گی۔ (حلال وحرام،ص۳۸۱).

مزید ملاحظہ ہو: (مالی معاملات پر غرر کے اثرات،ص۴۰۱). واللہ ﷻ اعلم۔

فیس والا معمہ حل کرنے پر انعام کا حکم:

سوال: بعض جگہوں پر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے بھیجے اور اس کے ساتھ اتنی فیس مثلاً ایک روپیہ فیس کا بھیجے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان میں سے انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعہ نکل آئے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسی اسکیموں میں شرکت کی گنجائش ہے یا نہیں؟ نیز شرکت کرنے پر انعام حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر چلانے والے داخلہ فیس لیتے ہیں تو یہ قمار میں داخل ہو کر ناجائز ہے، ایسی اسکیموں میں شرکت کی گنجائش نہیں ہے، اس سے بچنا لازم اور ضروری ہے، اگر کسی نے غلطی سے شرکت کر کے انعام حاصل کرلیا تو پوری رقم واجب التصدق ہوگی، اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو قرآن کریم میں ہے:

﴿**یا أیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون**. (المائدة،الآیة:۹۰).

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ میسر کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

وقال عطاء ومجاهد: الميسر القمار كله حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب.

(تفسير السمرقندي: ١/٢٠٣).

التعریفات الفقہیہ میں ہے:

القمار مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب، وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين. (التعريفات الفقهية،ص ١٧٧، وجواهر الفقه: ٢/٢٢٧، وامدادالفتاوى: ٣/١٦١).

فتاوی شامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار: ٦/٤٠٣، كتاب الحظر والاباحة، سعيد).

آپ کے مسائل میں ہے:

جو رقم فیس داخلہ وغیرہ ساتھ دی جاتی ہے وہ زیادہ کی خواہش اور زیادہ لینے کے لیے دی جاتی ہے اس لیے سود ہوا اور ملنا نہ ملنا غیر یقینی اس لیے جوا ہوا، سود اور جوا دونوں حرام ہیں۔ زیادہ ملنے کی صورت نقد کی ہو یا ٹکٹ کی شکل میں، دونوں حرام ہیں، ان اسکیموں کا اصل مقصد زائد رقم کا لالچ ہوتا ہے ذہنی وعلمی اضافہ مقصد نہیں ہوتا۔ اس طرح جوئے کی عادت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے یہ ایک شریفانہ جوا ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/۲۶۱).

جواہر الفقہ میں ہے:

معمہ کی مختلف صورتیں لکھ کر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے بھیجے اور اس کے ساتھ اتنی فیس مثلاً ایک روپیہ فیس کا بھیجے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان میں سے انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعہ نکل آئے ...کھلا ہوا قمار (جوا) ہے کہ ایک شخص اپنا فیس کا ایک روپیہ اس موہوم طریق پر ڈالتا ہے کہ یا تو یہ روپیہ بھی ضائع ہوگیا اور یا ہزاروں روپیہ لے کر آیا اسی کا نام شرعِ اسلام میں جوا یا قمار ہے۔ (جواہر الفقہ: ۲/۳۴۹).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

معمے کے حل بھیجنے کے لیے اگر کوئی فیس مقرر کی گئی ہو تو وہ قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔
(فتاویٰ عثمانی:۳/۳۴۱).

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فیس داخلہ کے لیے ہے انعام کا بدل نہیں تو اس کے بارے میں حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

سب جانتے ہیں کہ محض داخلہ مقصود نہیں کہ اس کے لیے فیس برداشت کی جائے، بلکہ تحصیل رقم مقصود ہے جس کا نام "انعام" رکھا ہے...اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ انعام دینے والے کا مقصود بھی محض خانہ پری نہیں، نہ اس سے کوئی خاص غرض وابستہ ہے بلکہ انعام کثیر کا لالچ دے کر روپیہ جمع کرنا مقصود ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۴۴۲، جامعہ فاروقیہ). واللہ تعالیٰ اعلم۔

بینک میں بازی لگا کر رقم جیتنے کا حکم:

سوال: جنوبی افریقہ کے ایک خاص بینک نے ایک نئے قسم کا اکاؤنٹ ایجاد کیا ہے اس اکاؤنٹ میں وہ سود نہیں دیتا بلکہ جو بھی اکاؤنٹ کھولتا ہے وہ خود بخود ایک مقابلہ میں شریک ہو جاتا ہے اور دس لاکھ رینڈ جیتنے کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص جیت گیا تو اس کے لیے اس رقم کا لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اگر جمع کردہ رقم کا برقرار رہنا یقینی ہو اور اس کے ساتھ زائد رقم ملتی ہو تو بعض حضرات کے نزدیک یہ سود ہے، اور اگر جمع کردہ رقم سوخت ہو جاتی ہو تو یہ صریح قمار اور جوا ہے، دونوں شریعت کی نگاہ میں حرام اور ناجائز ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافاً مضاعفة، واتقوا الله، لعلکم تفلحون﴾ (سورة آل عمران،الآیة:۱۳۱).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذهب ماله إلی صاحبه، ویجوز أن یستفید مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار:۶/۴۰۳، کتاب الحظر والاباحة، سعید).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں حضرت مفتی تقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

بعض حضرات نے انعامی بانڈز کو جائز کہا ہے اس نقطہ نظر سے دیکھا کہ چونکہ یہاں تعلیق التملیک علی الخطر نہیں ہے کیونکہ جتنے پیسے دئے ہیں وہ ہر حال میں مل جائیں گے لہذا یہ قمار نہیں ہے تو یہ جائز ہو گیا، لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیونکہ یہاں اگر چہ قمار بذاتِ خود نہیں ہے لیکن اس میں ربا ہے اس لیے کہ اگر اس کا نام قرعہ اندازی میں نکل آتا ہے تو اس کو مثلاً اگر سو روپے دئے تھے اس کے عوض میں ایک لاکھ ایک سو روپے ملیں گے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا کہ یہ سود بھی نہیں ہے اس لیے کہ جب میں نے بانڈز لیا تھا تو میرے ساتھ کوئی مشروط زیادتی کا معاملہ نہیں تھا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ مجموعہ مقروضین کے ساتھ زیادتی مشروط ہے اور اگر چہ صراحت نہیں ہوتی کہ ہم اس کے اوپر کوئی منافع دیں گے لیکن عمل ہوتا ہے اور وہ عمل مستمر اور تعامل ہے کہ جب کوئی شخص اپنا قرض واپس لیتا ہے تو حکومت اس کو کچھ زیادہ دیتی ہے، لہذا یہاں اگر چہ لفظوں میں شرط نہیں تھی لیکن ''المعروف کالمشروط'' میں آ گیا۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۱-۷۸)۔

البتہ دیگر بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ رقم سودی نہیں کیونکہ سود کی نفی کی گئی ہے، اور جو انعام ملا وہ انعام ہی ہے سود نہیں، اور ''کل قرض جر نفعاً فهو ربا'' مشروط پر محمول ہے اور یہاں شرط نہیں لگائی کہ مجھے ہی انعام ملے گا بلکہ یہ انعام ہر ایک کو نہیں ملتا لہذا یہ مشروط نہیں ہے، کل قرض جر نفعاً کے ذیل میں اذا کان مشروطاً لکھا ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

و فی الذخیرة : إن لم یکن النفع مشروطاً فی القرض فعلی قول الکرخیؒ لا بأس به.

(فتاوی الشامی: ۱۶۶/۵، مطلب کل قرض جرنفعاً حرام، سعید).

قال الجرجانیؒ فی التعریفات : الربا: هو فی اللغة : الزیادة ، وفی الشرع : هو فضل خالٍ عن عوض شرط لأحد العاقدین. (التعریفات، ص ۱۱۲، بیروت).

وفی الهدایة: لأن الربا: هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه. (الهدایة: ۷۸/۳، باب الربا).

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں:

سوال کا ماحصل یہ ہے: یہاں پر ڈاک خانہ میں ایک اسکیم جاری ہے کہ وہاں ایک پونڈ دو پونڈ پانچ پونڈ جمع کرتے ہیں اور اس کی نمبروار رسید دیتے ہیں، اس پر کوئی سود نہیں لگتا لیکن ہر ماہ اخبارات میں کچھ نمبرات نکلتے ہیں ایک پونڈ کا سو پونڈ ملتا ہے، تو زیادہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ جمع کی ہوئی پوری رقم ملتی ہے۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ زائد رقم لینا جائز ہے، کیونکہ روپیہ جمع کرتے وقت یہ معاملہ ہوتا ہے کہ اس پر واپسی کے وقت کچھ زائد رقم نہیں ملے گی اور معاملہ غیر سودی ہوگا، اور زیادتی کے ملنے کا یقین بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کا مطالبہ ہی ہوتا ہے اور نہ سب کو زیادتی مل ہی جاتی ہے، بلکہ محکمہ محض اپنی صواب دید اور محض اپنے ضابطہ کے مطابق کچھ نمبرات کے لیے زائد رقم دینے کا اعلان کرتا ہے اور جن کا نام نکلتا ہے صرف ان کو دیتا ہے اس لیے یہ زیادتی جرنفعاً کا مصداق نہیں ہوئی اور اس زیادتی کو شرعاً ربا نہیں کہیں گے۔

ہاں اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے تو یہ الگ اور اولیٰ بات ہوگی، اور تقویٰ یہ ہوگا کہ اس رقم کو اس محکمہ میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر غرباء و مساکین پر خرچ کردے یا کسی کارِ خیر یا رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کردے۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ: ۱/۱۹۴۔۱۹۵).

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض حضرات نے اس کو سود میں شامل نہیں کیا، تاہم اس جیسے معاملہ سے اجتناب بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مچھلی پکڑنے پر انعام کا حکم:

سوال: ایک سمندر کے ساحل پر ایک جگہ بنائی گئی ہے، اس میں مچھلیوں کے پکڑنے کا مقابلہ ہوتا ہے اور داخل ہونے والوں سے فیس لی جاتی ہے، پھر جس نے بڑی مچھلی پکڑی اس کو نمبروار انعامات اسی جمع شدہ رقم سے دئے جاتے ہیں، کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اور انعام لینا درست ہوگا یا نہیں؟ جب کہ بعض محروم بھی ہوتے ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ طریقہ قمار اور جوا میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو علماء نے قمار کی تعریف درجِ ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

التعریفات الفقھیہ میں ہے:

القمار مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب،

وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين. (التعريفات الفقهية،ص ۱۷۷، وجواهر الفقه:۲/۲۲۷، وامدادالفتاوی:۳/۱۶۱).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار:۶/۴۰۳،كتاب الحظروالاباحة، سعيد).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: ہلال احمر ایک پاکستانی ادارہ ہے جو پانچ روپے اور تین روپے کی ٹکٹیں فروخت کرتا ہے اور جمع شدہ رقم میں سے ہر ماہ تین لاکھ اور ڈیڑھ لاکھ روپے انعام کی صورت میں تقسیم کرتا ہے...یہ ٹکٹیں خرید کر انعام لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ سود اور جوا کا مجموعہ ہے،اس لیے حرام ہے۔(احسن الفتاویٰ:۷/۲۶).

تقریر ترمذی میں ہے:

غرر کی تیسری صورت ہے" تعليق التمليك على الخطر"یعنی تملیک کو کسی ایسے واقعے کے ساتھ معلق کرنا جس کے وجود میں آنے اور نہ آنے دونوں کا احتمال ہو...اس لیے یہ معاملہ درست نہیں اس کو تعلیق التملیک علی الخطر کہا جاتا ہے،اور اس کو قمار بھی کہا جاتا ہے،اس لیے کہ''قمار'' میں بھی ایک طرف سے پیسوں کی ادائیگی یقینی ہوتی ہے، جب کہ دوسری طرف سے اس کا عوض یقینی نہیں ہوتا، بلکہ محتمل ہوتا ہے،اس لیے''قمار'' بھی غرر میں داخل ہے۔(تقریر ترمذی:۱/۹۷،و اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۷۶).

ہاں اگر وہاں لوگوں کے بیٹھنے اور کھانے پینے اور کچھ مشروبات وغیرہ کا انتظام کیا جائے تو پھر رقم اس انتظام کے عوض ہو کر داخلہ فیس قرار دی جائیگی اور پھر اول دوم سوم آنے والوں کو انعام دیا جائے تو اس میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

ووڈا کوم کمپنی کے مسابقہ میں حصہ لینے کا حکم:

سوال: آج کل بہت سی کمپنیوں میں مسابقہ ہوتا ہے جس میں جیتنے والے کو قیمتی انعامات دئے جاتے

ہیں، اس سلسلہ کی ایک کڑی ووڈاکوم (vodacom) کمپنی کی طرف سے پیش کردہ مسابقہ ہے۔

اس کمپنی کا طریقہ کار یہ ہے کہ آدمی اس vodacom کمپنی کو ایک میسیج (sms) بھیجتا ہے، اس میں تقریباً دس رینڈ خرچ ہوتے ہیں، دن کے اخیر میں sms بھیجنے والوں کے درمیان قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور جس کا نام نکلتا ہے اس کو ڈھائی لاکھ رینڈ کی گاڑی B.M.W. دی جاتی ہے۔

آج کل ہمارے مسلمان بھائی بھی اس مسابقہ میں بڑے ذوق سے حصہ لیتے ہیں، کیا شریعت کی نگاہ میں ایسے مسابقہ میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی کو انعام میں گاڑی ملجائے تو اس کا لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ vodacom کمپنی کا مسابقہ قمار اور جوا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس میں حصہ لینا اور انعام حاصل کرنا جائز اور درست نہیں ہے، ہاں اگر کسی کو گاڑی مل جائے تو اس کو بیچ کر رقم کا صدقہ کرنا واجب اور ضروری ہے، البتہ داخلہ میں جتنی رقم خرچ ہوئی تھی فقط اس کا لینا درست ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾ (سورة المائدة، الآية: ٩٠).

وعن عبد اللّٰہ بن عمرو ﷺ قال: قال رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم: "إن اللّٰہ حرم على أمتي الخمر والميسر. (مسند احمد: ٢/٣٥١/٥٦١١، بيروت، وسنن ابی داود، ص٣٢٧، باب ماجاء في السكر).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه، وهو حرام بالنص. (ردالمحتار: ٦/٤٠٣، كتاب الحظر والاباحة، سعيد).

احکام القرآن میں ہے:

إن أهل الجاهلية كانوا يخطرون على المال والزوج وقد كان مباحاً إلى أن ورد تحريمه. (احكام القرآن للجصاصؒ، ١/٣٢٩).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

غرر کی ایک صورت جس کو فقہاء کرامؒ نے ''تعلیق التملیک علی الخطر'' سے تعبیر فرمایا ہے کہ عقود معاوضہ میں

تملیک کوکسی خطرہ پر معلق کرنا، خطر کا معنی ہے کوئی ایسا آنے والا واقعہ جس کے واقع ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو اس واقعہ پر تملیک کو معلق کردینا کہ اگر یہ واقعہ پیش آ گیا تو میں نے اپنی فلاں چیز کا تمہیں مالک بنادیا... اوراس کو قمار بھی کہتے ہیں۔

اسی کا ایک شعبہ قمار بھی ہے قمار یعنی جوا یا میسر اس میں ایک طرف سے تو ادائیگی یقینی ہو اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہو...مثلاً کوئی شخص کہے کہ سب لوگ دو، دوسو روپے میرے پاس جمع کروادیں، پھر قرعہ اندازی کرونگا، جس کا نام قرعہ اندازی کے ذریعہ نکلے گا میں اس کو ایک لاکھ روپے دوں گا،...یہ قمار کہلاتا ہےاور یہی میسر بھی کہلاتا ہے،...تو جتنی بھی لاٹریاں ہمارے زمانے میں مشہور ہیں مثلاً ایئرپورٹ پر گاڑی کھڑی کررکھی ہے کہ دو سوروپے کے ٹکٹ خریدو بعد میں قرعہ اندازی کریں گے جس کا نمبر نکل آیا اس کو کار مل جائے گی ، یہ قمار ہے، ”تعلیق التملیک علی الخطر“ ہےاور غرر کا ایک شعبہ ہے جو حرام ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/ ۷۶).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۴۳۵، جامعہ فاروقیہ، واحسن الفتاویٰ:۷/ ۲۶، ومنتخبات نظام الفتاویٰ:۲/ ۳۰۲)

اشکال: بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میسیج کے ۱۰ ار یند داخلہ فیس ہے،اورانعام کمپنی کی طرف سے لوگوں کو رغبت دلانے کے لیے ہوتا ہے، پھر عدمِ جواز کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل داخلہ مقصود نہیں ہوتا بلکہ انعام حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے آدمی اسی کے لیے فیس بھی برداشت کرتا ہے۔

ملاحظہ ہو حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ فرماتے ہیں:

سب جانتے ہیں کہ محض داخلہ مقصود نہیں کہ اس کے لیے فیس برداشت کی جائے ، بلکہ تحصیل رقم مقصود ہے جس کا نام ”انعام“ رکھا ہے...اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ انعام دینے والے کا مقصود بھی محض خانہ پری نہیں، نہ اس سے کوئی خاص غرض وابستہ ہے بلکہ انعامِ کثیر کا لالچ دے کر روپیہ جمع کرنا مقصود ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۴۴۲، جامعہ فاروقیہ). واللہ ﷻ اعلم۔

لائسنس حاصل کرنے کے لیے رشوت دینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی ڈرائیور لائسنس کے لیے جب بھی جاتا ہےاس کونا کام کیا جاتا ہے،معلوم ہوا کہ رشوت کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں کرتے ،اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس حال میں رشوت دینے کی شرعاً

اجازت ہوگی یا نہیں؟

الجواب: اگر وہ شخص گاڑی چلانا اچھی طرح جانتا ہے نیز راستوں کے قوانین وغیرہ سے بھی واقف ہے، اس کے باوجود لائسنس لینے میں کامیاب نہیں ہوتا، اور رشوت دیئے بغیر چارۂ کار نہ ہو تو مجبوری کی صورت میں رشوت دینے سے امید ہے کہ آخرت میں مؤاخذہ نہیں ہوگا، لیکن رشوت لینا بہر حال ممنوع اور ناجائز ہے۔

جامع الترمذی میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي.

(جامع الترمذی: ۱/۲٤۸).

ہدایہ میں ہے:

و دفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز. (الهداية: ۳/۲٤٥).

قال الجرجانيؒ في التعريفات: الرشوة: ما يعطى لإبطال حق أو لإحقاق باطل.

(التعريفات، ص ١١٤، والتعاريف للمناوی، ص ٣٦٥).

أو المال الذي يعطى بمقابلة الواجب.

أو ما يأخذه الآخر ظلماً.

أو أخذ الأموال على فعل ما يجب على الآخذ فعله أو فعل مايجب عليه تركه. (تفسير البحر المحيط: ٤/٥٣٣، و دستور العلماء: ٢/١٣٦).

فتح القدیر میں ہے:

(قوله ودفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز) هذا دليل عقلي على ما ذهب إليه أئمتنا من جواز الصلح من إنكار أو سكوت أيضاً متضمن للجواب عن دليل عقلي للشافعيؒ مذكور فيما قبل، وهو قوله ولأن المدعى عليه يدفع المال لقطع الخصومة، وهذا رشوة، قال الشراح: لايقال لا نسلم جواز دفع الرشوة لدفع الظلم لأن قول النبي صلى الله عليه وسلم: "لعن الله الراشي والمرتشي" عام لأنا نقول: هذا الحديث محمول على ما إذا كان على صاحب الحق ضرر محض في أمر غير مشروع، كما إذا دفع الرشوة حتى أخرج الوالي أحد الورثة عن الأرث وأما إذا دفع الرشوة لدفع الضرر عن نفسه فجائز للدافع، انتهىٰ،

واعترض بعض الفضلاء على الجواب حيث قال فيه، إن المعتبر هو عموم اللفظ وما الدليل على أنه محمول على ما ذكرغيرمجرى على عمومه انتهىٰ، أقول: الدليل عليه ما ورد من النصوص في أن الضرورات تبيح المحظورات منها قوله تعالىٰ: ﴿ وماجعل عليكم في الدين من حرج﴾ ولاشک أن في دفع الضرر عن نفسه دفع الحرج. (تكملة فتح القدير:٨/٤٠٨، كتاب الصلح، دار الفكر).

تبیین الحقائق میں ہے:

ولو قلنا إنه رشوة فهي جائزة للدافع لدفع الظلم عن نفسه وماجاء فيه من الذم من قوله عليه الصلاة والسلام:" لعن اللّٰه الراشي والمرتشي، المراد به إذا كان هو الظالم فيدفعها إلى بعض الظلمة من ولاة الأموريستعين به على الظلم بالرشوة وأما لدفع الضررعن نفسه فلا شبهة فيه حتى روي عن أبي يوسفؒ أنه أجاز ذلک للوصي من مال اليتيم أيضاً لدفع الضرر عن اليتيم، ألا ترى أن الخضرعليه السلام خرق السفينة كيلا يأخذها الظالم وماكان مراده بذلک إلا الإصلاح واللّٰه يعلم المصلح من المفسد. (تبيين الحقائق:٥/٣١، كتاب الصلح، ملتان).

البحر الرائق میں ہے:

ومنها إذا دفع الرشوة خوفاً على نفسه أو ماله فهوحرام على الآخذ غير حرام على الدافع وكذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال ومنها إذا دفع الرشوة ليسوى أمره عند السلطان حل له الدفع ولايحل للآخذ أن يأخذ. (البحرالرائق:٦/٢٦٢، كتاب القضاء، كوئته).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

إذا دفع الرشوة لدفع الجور عن نفسه أو أحد من أهل بيته لم يأثم. (الفتاوى الهندية: ٤/٤٠٣).

فتاویٰ شامی میں ہے:

ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أوماله حلال لدافع حرام على الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولايجوز أخذ المال ليفعل الواجب. (فتاوى

الشامي: ٥/٣٦٢، كتاب القضاء، سعيد).

وكذا في (رسائل ابن نجيم الاقتصادية، ص ٢٠٠، وتكملة ردالمحتار: ٢/٢٢٢).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

اگر کام کرنے والے پر آپ کا حق ہو کہ وہ اس کام کو کرے نیز جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ کام جائز بھی ہو اور اس کا مقصود دوسروں کے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو تو اپنا جائز حق حاصل کرنے اور ظلم و ناانصافی سے بچنے کے لیے کراہت خاطر کے ساتھ رشوت دینے کی گنجائش ہے، لیکن رشوت لینا بہر صورت حرام ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲۴۵/۶).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

رشوت کا دینا لینا حرام ہے البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے بحالتِ مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہگار ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۴۵۵/۱۸، جامعہ فاروقیہ).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

بعض لوگ رشوت دے کر نوکری حاصل کرتے ہیں، جب کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، لیکن بعض آدمی رشوت دینے پر مجبور ہوتے ہیں اس کے بغیر نوکری کا حصول مشکل ہو جاتا ہے، سرکاری افسران رکاوٹ ڈالتے ہیں، ایسی صورت میں دفعِ ظلم کے لیے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائیں گے، باقی رشوت دے کر جو نوکری حاصل کی گئی ہو اس کی تنخواہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اس ملازم میں کام کی اہلیت موجود ہے اور کام اس کے سپرد کیا گیا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے تو اس کی تنخواہ حلال ہے اگر وہ اس کام کا اہل ہی نہیں یا کام ٹھیک انجام نہیں دیتا تو تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱۷۹/۱). واللہ ﷻ اعلم۔

لاٹری کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

اس ملک میں اور دیگر ممالک میں یہ طریقہ رائج ہے کہ عام طور پر دکانوں پر نمبر کی پرچیاں بکتی ہیں، لوگ ان کو خریدتے ہیں اور چند نمبرات پر نشاندہی کرنے کے بعد واپس کرتے ہیں، اگر نشاندہی والے نمبرات ان کے مخصوص نمبرات کے ساتھ موافق ہو گئے تو بطورِ انعام بڑی رقم ملتی ہے، تو کیا اس رقم کو حاصل کرنا اس طریقہ پر

جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ پرچیاں مختلف قیمتوں میں بکتی ہیں مثلاً بعض ۵۰ رینڈ میں اور بعض ۱۰۰، ۲۰۰ رینڈ میں۔ اسی طرح دیہاتوں میں بچے گوٹی (ماربل) کھیلتے ہیں، اس کا بھی یہ طریقہ ہوتا ہے کہ سب اپنی گوٹیاں ایک دائرہ میں رکھتے ہیں، اور باری باری اس پر نشانہ لگاتے ہیں جس کا نشانہ صحیح نکلا وہ سب لے لیتا ہے اور باقی سب محروم ہوتے ہیں، از روئے شریعت یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ دونوں طریقے ناجائز اور حرام ہے، اس لیے کہ اس میں تعلیق الملک علی الخطر ہے اس طور پر کہ ایک جانب سے ادائیگی یقینی ہے اور دوسری طرف موہوم اور مشکوک ہے، اسی کو قمار کہتے ہیں۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ **إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون** ﴾. (سورة المائدة).

وعن عبد الله بن عمرو ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله حرم على أمتي الخمر والميسر. (مسندالامام احمدبن حنبلؒ: برقم ٦٥١١).

احکام القرآن میں امام جصاصؒ فرماتے ہیں:

قال قوم من أهل العلم القمار كله من الميسر... وهو السهام التي يجيلونها فمن خرج سهمه استحق منه ما توجبه علامة السهم فربما أخفق بعضهم حتى لايحظى بشيء وينجح البعض فيحظى بالسهم الوافر، وحقيقته تمليک المال على المخاطرة، وهو أصل في بطلان عقود التمليكات الواقعة على الأخطار. (احکام القرآن: ٢/٤٦٥، سهیل اکیڈمی).

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وقال عطاء وطاؤس ومجاهد حتى لعب الصبيان بالكعاب والجوز. (احکام القرآن: ١/٣٢٩).

قال الفقيه أبو الليث السمرقنديؒ: الميسر القمار كله حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب. (تفسیرالسمرقندی: ١/٢٠٣).

تبیین الحقائق میں ہے:

وحرم لو شرط المال من الجانبين. (تبیین الحقائق: ٤/٣٢، ملتان).

درمختار میں ہے:

وحرم لو شرط فيها من الجانبين لأنه يصير قماراً . وفي رد المحتار: لأن القمار من القمر الذي يزداد تارة وينقص أخرى، وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص.

(الدر المختار مع رد المحتار: ٦/٤٠٣، سعيد).

کفایت المفتی میں ہے:

لاٹری کا ٹکٹ خریدنا جائز نہیں ہے وہ قمار ہے اور قمار حرام ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/۲۲۶، دار الاشاعت).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

جتنی بھی لاٹریاں ہمارے زمانے میں مشہور ہیں مثلاً ایئر پورٹ پر گاڑی کھڑی کر رکھی ہے کہ دوسو روپے کے ٹکٹ خریدو بعد میں قرعہ اندازی کریں گے جس کا نمبر نکل آیا اس کو کار مل جائیگی یہ قمار ہے، تعلیق التملیک علی الخطر ہے اور غرر کا ایک شعبہ ہے جو حرام ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۷۷).

مالی معاملات پر غرر کے اثرات میں ہے:

بعض علاقوں میں چھوٹے بچے اخروٹ یا کانچ کی گولیاں اس طرح ہار جیت کی بنیاد پر کھیلتے ہیں کہ جیتنے والا لڑکا ہارنے والے سے گولیاں یا اخروٹ لے لیتا ہے، یہ عمل قمار میں داخل ہے۔ (مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص ۳۹۳).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (نظام الفتاوی: ۲/۳۰۱۔ فتاوی محمودیہ: ۱۶/۴۳۵۔ جدید فقہی مسائل: ۱/۴۳۰۔ ایضاح النوادر: ۱/۱۲۳۔ وجواہر الفقہ: ۲/۳۴۸۔ ۳۵۰۔ قاموس الفقہ: ۴/۵۲۴۔ فتاویٰ بینات: ۴/۲۱۴۔ مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص ۴۰۱).

واللہ ﷻ اعلم۔

سٹہ بازی کا حکم:

سوال: آج کل اکثر بڑی کمپنیوں میں سٹہ کا کاروبار بام عروج پر ہے، شرعاً اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اس معاملہ کا مقصد شیئرز کی خریداری نہیں ہوتی ہے بلکہ بڑھتے گھٹتے دام کے ساتھ نفع نقصان کو برابر کر لینا مقصود ہوتا ہے، اس صورت میں معاملہ میں نہ تو خریدار کی طرف سے قیمت کی ادائیگی ہوتی

ہے اور نہ بائع کی طرف سے مبیع کی حوالگی، لہذا یہ ناجائز ہے۔

سٹا بازی قمار اور جوا کی ایک قسم ہے، لغت میں سٹا بازی کہتے ہیں (۱) ایک قسم کا جوا جس میں کسی بات کے متعلق حکم لگانے پر شرطیں کی جاتی ہیں، (۲) بیوپاری کا ایک سودا۔ (فیروز اللغات، ۷۸۰).

سٹا کے ناجائز ہونے کی دو وجوہات ہیں:

(۱) غیر مملوک کی بیع۔

(۲) بیع قبل القبض۔

دلائل کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/ ۸۰۔۸۲۔ وجدید فقہی مباحث: ج۱۶، واسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص۸۴۔۱۱۴۔ وجدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/ ۱۰۸۔ وفتاویٰ عثمانی: ۳/ ۱۸۶۔ وغرر کی صورتیں، ۳۷۱۔ ۳۷۲)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تجارت کو فروغ دینے کے لیے قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام کا حکم:

سوال: اکثر ممالک میں بڑی بڑی دکانوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ زیادہ سے زیادہ چیزوں کو فروخت کرنے اور اپنی تجارت کو عروج پر لانے کے لئے انعامات کی قرعہ اندازی کرتے ہیں اور جس کے نام کا قرعہ نکلتا ہے اس کو نقد یا جنس کی شکل میں انعام ملتا ہے۔ خریداری میں خریدار پوری قیمت ادا کرتا ہے لیکن انعام الگ ہوتا ہے جو سیکڑوں خریداروں میں سے چند کو ملتا ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسا انعام حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں جبکہ بعض مفتی حضرات فرماتے ہیں کہ ایسا انعام سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے؟

الجواب: بصورت مسئولہ ایسا انعام مقرر کرنا اور قرعہ اندازی میں نام نکلنے پر اس کا حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔ نہ یہ سود میں داخل ہے اور نہ یہ قمار اور جوا ہے۔ سود اس وجہ سے نہیں ہے کہ فقہاء کے ہاں سود اس زیادتی کو کہتے ہیں جو کسی عوض کے بدلہ میں نہ ہو اور وہ زیادتی عقد میں مشروط ہو۔

ملاحظہ فرمائیں صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه. (الهداية: ۳/ ۷۸).

اور اس کو قمار اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ قمار کی تعریف فقہاء نے یہ فرمائی ہے کہ جانبین سے مال کی شرط لگائی جائے۔ **تعلیق الملک بالخطر من الجانبین.**

البتہ درجِ ذیل شرائط کو ملحوظ رکھا جائے:

(۱) بائع ثمن مثل پر سامان فروخت کر رہا ہو۔ یعنی جس قیمت پر عام دکانوں میں سامان فروخت ہوتا ہے وہی قیمت ہو۔ اگر بائع نے انعام کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کیا ہے تو پھر یہ جائز اور درست نہیں ہوگا اور یہ معاملہ قمار میں داخل ہو جائیگا۔

ملاحظہ ہو جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اگر خریدی ہوئی اشیاء انعامی کوپن کی وجہ سے بازاری قیمت سے زیادہ پر فروخت کی جارہی ہو جب کہ وہی چیز انعامی کوپن کے بغیر کم قیمت پر مل رہی ہو تو اس صورت میں متوقع انعامات کے حاصل کرنے کی جستجو کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس سے بچنا ضروری ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ قمار میں داخل ہو جائیگا جو شرعاً حرام ہے۔
(جدید معاملات کے شرعی احکام ج:۱/ ۱۲۶، واسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/ ۷۶)۔

(۲) بعض حضرات نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مشتری انعام حاصل کرنے کی غرض سے نہ جائے۔ اصل مقصد خریداری ہو پھر انعام مل گیا تو یہ جائز ہوگا اور اگر انعام ہی کی غرض سے گیا تو یہ قمار ہے۔ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ جواہر الفقہ میں فرماتے ہیں:

لیکن اب مدار نیت پر رہ جاتا ہے جو شخص موہوم انعام کی غرض سے یہ ٹکٹ خریدتا ہے وہ ایک گونا قمار کا ارتکاب کر رہا ہے اور جس کے پیش نظر صرف نمائش میں جانا ہو انعام کی ہوس پیش نظر نہیں پھر اتفاقاً انعام بھی مل گیا وہ قواعد کی رو سے قمار کے حکم سے نکل گیا۔ (جواہر الفقہ:۴/ ۵۶۶)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں:

اگر خریدنے والے کا مقصد سامان خریدنا تھا اسکے ساتھ انعامی کوپن مل گیا اور اتفاق سے کوپن میں اس کا نام نکل آیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور اگر اصل مقصود ہی انعامی کوپن حاصل کرنا تھا اور اسی مقصد کے لئے سامان خریدا تھا تو یہ صورت جائز نہ ہوگی بلکہ یہ جوا کے حکم میں ہوگا۔ (کتاب الفتاوی:۵/ ۲۴۹)۔

البتہ مفتی احسان اللہ شائق صاحب نے اس صورت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/ ۱۲۶)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عدمِ جواز والوں کا قول مبنی بر احتیاط ہے اور جواز والوں کا قول رخصت پر محمول ہوگا۔

انعامی کوپن حاصل کرنا نہ سود ہے اور نہ قمار میں داخل ہے، اس کے چند دلائل اور نظائر حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں:

جب یہ حقیقت ہے کہ چاہے اس کے نمبرات نکلیں یا نہ نکلیں اس کا جمع کیا ہوا روپیہ پورا پورا ملے گا اور جب چاہے واپس لے سکتے ہیں اور اس روپیہ کے ضائع ہونے کا ڈر نہیں ہے تو اس معاملہ میں قمار تو نہ ہوا، رہ گیا نمبرات نکل آنے پر جو زائد رقم ملے گی اس کا شرعی حکم کہ وہ رقم سود میں شمار ہوگی یا نہیں؟... جب روپیہ جمع کرتے وقت یہ معاملہ ہوتا ہے کہ اس پر واپسی کے وقت کچھ زائد رقم نہیں ملے گی اور معاملہ غیر سودی ہوگا اور یہ معاملہ سودی نہ ہوگا۔ پھر جب اس زیادتی کے ملنے کا یقین بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کا مطالبہ ہی ہوتا ہے اور نہ سب کو وہ زیادتی مل ہی جاتی ہے بلکہ محکمہ محض اپنی صوابدید اور محض اپنے ضابطہ کے مطابق کچھ نمبرات کے لئے زائد رقم دینے کا اعلان کرتا ہے اور جن کا نام نکلتا ہے صرف ان کو دیدیتا ہے اور کسی شخص کو اس زائد رقم کے لئے مطالبہ کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا ہے... اس لئے اب اگر کسی کے نمبرات نکل آنے پر کچھ زائد رقم مل جانے سے چاہے ایک پونڈ پر سو پونڈ زیادتی کا حساب کیوں نہ آجائے اس زیادتی کو ربا شرعاً نہیں کہیں گے...

...ان تمام بحثوں کے بعد یہ بات منقح ہو کر سامنے آگئی کہ یہ زیادتی منجانب محکمہ تبرع ہے اور تبرع جائز ہوتا ہے ممنوع نہیں، لہذا یہ زیادتی لینا جائز ہوگا۔ ہاں اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے تو یہ الگ اور اولیٰ بات ہوگی۔ (منتخباتِ نظام الفتاوی: ۱/۱۹۴)۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ فرماتے ہیں:

اس تملیک کو مطلق بھی رکھا جا سکتا ہے اور کسی شرط کے ساتھ مشروط بھی کیا جا سکتا ہے، مثلاً میرے مرنے کے بعد میرا فلاں مکان تمہارے لئے وصیت ہے یہ مطلق کی مثال ہے اور یہ کہنا کہ اگر تم اگلے سال حج کرلو تو میں اپنے مرنے کے بعد فلاں مکان کی تمہارے لئے وصیت یہ مطلق کی مثال ہے اور یہ کہنا کہ اگر تم اگلے سال حج کرلو تو میں اپنے مرنے کے بعد فلاں مکان کی تمہارے لئے وصیت کرتا ہوں یہ مشروط کی مثال ہے پس اگر اس نے حج کرلیا تو وصیت کرنے والے کی موت کے بعد جس چیز کی وصیت کی گئی اس کا وہ مالک ہوجائیگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی ص ۲۴۸)۔ (اس وصیت کی صورت میں بھی ایک جانب سے تعلیق الملک علی الخطر ہے۔ پھر بھی اس کو جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ دونوں جانب سے مال مشروط نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ قمار اس وقت ہے جب جانبین سے شرط پائی جائے)۔

حضرت مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

شرط صرف یہ ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہے وہ ثمن مثل پر بیچی جائے...اب وہ بائع اگر قرعہ اندازی کے ذریعہ کسی کو انعام دے گا تو یہ تبرع ہے جو جائز ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۷۷)۔

مفتی اعجاز احمد صمدانی صاحب فرماتے ہیں:

اس چوتھی شرط سے ان بہت سی انعامی اسکیموں کا حکم معلوم ہوجاتا ہے جو تجارتی کمپنیاں اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے جاری کرتی ہیں۔ان اسکیموں کے اندر اگر تجارتی کمپنیاں اپنی مصنوعات کی وہی بازاری قیمت کا مطالبہ کرتی ہے جو انعامی اسکیم نہ ہونے کی صورت میں بھی طلب کی جاتی ہو تو وہ صورت قمار میں داخل نہیں ہے...کیونکہ اس صورت میں خریداردی ہوئی رقم کا پورا معاوضہ حاصل کرچکا ہے اب اگر اس کا انعام نہ بھی نکلے تو اس کا کوئی نقصان نہیں اور اگر کچھ انعام نکل آئے تو یہ کمپنی کی طرف سے محض انعام ہوگا جس کا لینا جائز ہوگا۔(مالی معاملات پر غرر کے اثرات،ص:۳۸۷)۔

نیز قرعہ اندازی بھی جائز اور درست ہے۔کیونکہ قرعہ اندازی ہر اس موقع پر جائز ہے جہاں کسی واجب حق کا ابطال لازم نہ آئے بلکہ اس کے ذریعہ یا تو حقوق کی تمیز وافراز مقصود ہو یا ابتدائی تبرع اور احسان کا معاملہ ہو اور اس میں قرعہ اندازی تطییبِ قلوب کی خاطر کی جائے۔اور بصورتِ مسئولہ انعام میں ابتدائی تبرع ہے کسی کا کوئی واجب حق نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو تکملہ فتح القدیر میں ہے:

قوله : (والقرعة لتطييب القلوب إزاحة الميل) قال الشراح: هذا جواب الاستحسان، والقياس يأباها...ولكنا تركنا القياس هاهنا بالسنة والتعامل الظاهرمن لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى يومنا هذا من غيرنكيرمنكر...ألايرى أن يونس عليه السلام في مثل هذا استعمل القرعة مع أصحاب السفينة...وكذلک زكريا عليه السلام استعمل القرعة مع الأحبار في ضم مريم إلى نفسه...وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرع بين نسائه إذا أراد السفرتطييباً لقلوبهن . (تكملة فتح القدير:۹/ ٤٤٠،دار الفكر،و كذا في العناية على هامش فتح القدير:۹/ ٤٤٠)۔

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

اور قرعہ اندازی تقسیم انعامات کے لئے جائز ہے۔ (فتاوی عثمانی: ۳/۳۴۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اشکالات اور جوابات:

اشکال (۱): بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں نام کا نکلنا مشکوک ہے لہذا یہ تعلیق الملک بالخطر ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

وأما الذي لايصح تعليقه بالشرط شرعاً فضابطه كل ما كان من التمليكات سواء كان مبادلة المال بمال من الطرفين أو لا كالبيع والإجارة والاستيجار والقسمة والهبة. (شرح مجلة: ١/٢٣٤).

الجواب: اولاً تو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ "تعلیق الملک بالخطر" کی صورت اس وقت ممنوع ہے جب کہ جانبین سے مال مشروط ہو کیونکہ یہ نص قرآنی کی وجہ سے قمار میں داخل ہے۔

قال اللّٰه تعالی: ﴿... إنما الخمر والميسر... رجس من عمل الشيطان، فاجتنبوه﴾. (المائدة: ٩٠). **والميسر القمار. وقال في التعريفات الفقهية: القمار مصدر قامر هو كل لعب بشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين.** (التعريفات الفقهية، ص: ١٧٧، بيروت).

وفي معجم لغة الفقهاء: القمار... تعليق الملك على الخطر والمال من الجانبين (معجم الفقهاء، ص: ٣٦٩).

وفي تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان: وأما الميسر فهو كل المغالبات التي يكون فيها عوض من الطرفين. (تيسير الكريم الرحمن، ص: ٨١).

احکام القرآن میں ہے:

لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار وأن المخاطرة من القمار قال ابن عباسؓ: إن المخاطرة قمار وإن أهل الجاهلية كانوا يخاطرون على المال والزوجة وقد كان ذلك مباحاً إلى أن ورد تحريمه. (احكام القرآن للجصاص: ١/٣٧٩، سهيل).

فتاوی الشامی میں ہے:

لأن القمار من القمر الذی یزداد تارة وینقص أخری وسمی القمار قماراً لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذهب ماله إلی صاحبه ویجوز أن یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنص ولا کذلک إذا شرط من جانب واحد. (فتاوی الشامی :٦ /٤٠٣، وکذا فی البحر الرائق :٨ /٤٨٦) .

امداد الفتاوی میں ہے:

تعلیق الملک علی الخطر والمال من الجانبین. (امدادالفتاوی: ٣/ ١٦١، ومثله فی جواهر الفقه:٢/ ٣٤٢)۔ مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۷۲)۔

چونکہ صورتِ مسئولہ "**تعلیق الملک بالخطر من الجانبین**" میں داخل نہیں، کیونکہ مشتری نے اپنا مال دے کر اس کا عوض سامان کی صورت میں وصول کرلیا اب فقط بائع کی طرف سے انعام کے حصول کیلئے نام نکلنے کی شرط ہے اسوجہ سے یہ قمار نہیں ہے۔

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

اتنی بات جان لینی چاہئے کہ قمار اس وقت ہوتا ہے جب ایک طرف سے ادائیگی یقینی ہو اور دوسری طرف محتمل ہو لیکن جہاں دونوں طرف سے ادائیگی متیقن ہو اور پھر کوئی فریق کہے کہ قرعہ اندازی کروں گا تو یہ قمار نہیں ہے...دو تاجر ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو ہم سے سامان خریدے گا ہم ہر ایک کو ایک پرچی دیں گے اور پھر بعد میں کسی وقت قرعہ اندازی کریں گے...تو اب یہ قمار نہیں ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۷۶)۔

مفتی اعجاز احمد صمدانی فرماتے ہیں:

اگر کسی شخص نے اپنے مال کا حقیقی عوض حاصل کرلیا اور پھر انعام بھی مل گیا تو یہ جوا نہیں ہے۔ (غرر کے اثرات، ص:۳۸٦، ومثلہ فی جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۲٦)۔

مفتی تقی عثمانیؒ فرماتے ہیں:

انعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لئے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے قرعہ اندازی تقسیم انعامات کے لئے جائز ہے۔ (فتاوی عثمانی:۳/۳۴۲)۔

لیکن قابلِ اشکال بات یہ ہے کہ شارحِ مجلّہ نے "**تعلیق الملک بالخطر من جانب واحد**" تملیکات

میں ہوتو اس کو بھی ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے اس کا کیا حل ہوگا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ شارحِ مجلّہ کی دیگر عبارات اور دیگر کتب کی عبارات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔اس قاعدہ سے مستثنیات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب سے شرط لگانا درست ہے اگر چہ اس میں تملیک کا پہلو ہو۔

ملاحظہ فرمائیں شرحِ مجلّہ میں ہے:

وما كان من الإطلاقات كالإذن بالتجارة و كالوكالة أو الولايات كالقضاء والإمارة... أو ما كان من التحريضات صح تعليقه بالملائم وذلک كقول المولى لعبده إن قبضت لي من فلان الألف التي لي عليه فقد أذنت لک بالتجارة... وإن وصل إليک كتابي فقد عزلتک وكقول الإنسان للدائن إذا جاء مديونک من سفره فأناْ كفيل لما لک عليه... وأما غير الملائم كأن هبت الريح أو دخلت الحمام فلا يصح . (شرح المجلة:۱/۲۳۳).

مذکورہ بالا قاعدہ سے معلوم ہوا کہ تحریضات وترغیبات میں ایک جانب سے ملائم للعقد شرط لگانا جائز اور درست ہے اور صورتِ مسئولہ میں بھی تحریض کا ایک پہلو بایں معنی ہوسکتا ہے کہ اپنی تجارت کو مشہور کرنے اور فروغ دینے کے لیے خریداروں کو ابھارنا ہے اور قرعہ اندازی پر انعام کی شرط ملائم للعقد ہے لہذا یہ درست ہونی چاہئے۔

نیز یہ تبرع مشروط کی طرح ہے کیونکہ بائع جو انعام دیتا ہے وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہے بلکہ ابتدائی تبرع ہے اور تبرع میں شرط لگانا جائز ہے کہ جس کا نام نکلے گا وہ انعام حاصل کریگا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کی ضیافت شرط لگائی تھی اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضرت براءؓ کے والد نے شرط لگائی تھی وغیرہ۔ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن أنس رضي الله عنه أن جاراً لرسول الله صلى الله عليه وسلم فارسياً كان طيب المرق فصنع لرسول الله صلى الله عليه وسلم ثم جاء يدعوه ، فقال: وهذه لعائشة رضى الله تعالىٰ عنها فقال: لا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا، فعاد يدعوه ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :وهذه ، قال: لا ، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا، ثم عاد يدعوه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وهذه ، قال: نعم في الثالثة ، فقاما يتدافعان حتى أتيا منزله.

(رواه مسلم: ۲/۱۷۶).

حدیثِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ: ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ طعام پیش کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھی شرط لگائی اس نے انکار کر دیا پھر تیسری مرتبہ میں اجازت دیدی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اونٹ کا پالان خریدا اور عازب رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اپنے بیٹے براء رضی اللہ عنہ سے کہدے کہ یہ پالان میرے ساتھ لے چلے، عازب رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں مگر اس شرط پر کہ آپ ہجرت کا واقعہ سنا دیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا واقعہ سنایا اور حضرت براء رضی اللہ عنہ پالان لے گئے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن البراء رضي الله عنه قال: اشترى أبوبكر رضي الله عنه من عازب رضي الله عنه رحلاً بثلاثة عشر درهماً، فقال أبوبكر رضي الله عنه: لعازب رضي الله عنه مر البراء فليحمل إلي رحلي، فقال عازب: لا، حتى تحدثنا كيف صنعت أنت ورسول الله صلى الله عليه وسلم حين خرجتما من مكة والمشركون يطلبونكم، قال: ارتحلنا... الخ. (رواه البخاري ۱/۵۱۵، في مناقب المهاجرين).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

یہ انعام دکاندار کی طرف سے تبرع ہے کسی چیز کا عوض نہیں ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۲۶)۔

اشکال: شرحِ مجلّہ کے قاعدہ سے مترشح ہوتا ہے کہ تملیکات میں شرط من جانبِ واحد لگانا درست نہیں اور ہبہ کو بھی تملیکات میں شمار کیا گیا ہے جبکہ ہبہ تبرع ہے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبرعات میں شرط لگانا بھی ناجائز ہے؟

الجواب: شرحِ مجلّہ کی مزید تفصیلی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ تملیکات جن کو شرط کے ساتھ مشروط کیا جاتا ہے وہ دو قسم پر ہیں:

(۱) وہ معاملہ جس میں مبادلۃ المال بمال ہو۔

(۲) جس میں مبادلۃ المال بمال نہ ہو۔

پھر ان دونوں کا حکم جداگانہ ہے یعنی وہ معاملات جو قسم اول کی قبیل سے ہیں وہ شرط فاسد کی وجہ سے خود فاسد ہو

جاتے ہیں۔لیکن جو قسم دوم کی قبیل سے ہیں ان میں شرطِ فاسد جو غیر ملائم ہو لغو ہو کر معاملہ خود صحیح ہو جاتا ہے۔یعنی ہبہ میں موہوب لہ کی ملکیت اس پر ثابت ہو جائیگی۔اور شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرط سے غیر ملائم شرط مراد ہے،یعنی شرط ملائم رکھنا درست ہے اور شرط غیر ملائم ہبہ میں باطل ہو جاتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں شرح مجلّہ میں ہے:

لكن ما كان فيه مبادلة مال بمال يبطل أيضاً بالشرط الفاسد كالبيع وماليس كذلك كالهبة والصدقة والإبراء ... لايبطل بالشرط الفاسد بل يصح ويلغو الشرط. (شرح المجلة: ١/ ٢٣٤).

اور تبرعات قسمِ دوم کے قبیل سے ہیں اسوجہ سے شرط غیر ملائم خود لغو ہوگی اور معاملہ صحیح ہوگا۔

تنبیہ: قابل توجہ بات یہ ہے کہ شرح مجلّہ میں تبرعات میں بظاہر ہر قسم کی شرط کو فاسد قرار دیا گیا ہے جب کہ علامہ شامیؒ کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ تبرعات میں شرطِ ملائم صحیح اور درست ہے اور شرطِ غیر ملائم فاسد ہے۔ لہذا شرح مجلّہ کی عبارت کو شرط غیر ملائم پر محمول کرلیں تو اشکال رفع ہو جائیگا۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں ہے:

ويصح تعليق هبة وحوالة وكفالة وإبراء عنها بملائم. (الدر المختار:٥/ ٢٥٥).

دوسری جگہ مذکور ہے:

وما يصح ولايبطل بالشرط الفاسد...قوله والهبة والصدقة كوهبتك هذه المائة أو تصدقت عليك على أن تخدمني سنة فتصح ويبطل الشرط لأنه فاسد وفي جامع الفصولين ويصح تعليق الهبة بشرط ملائم...ولو مخالفاً تصح الهبة لا الشرط. (الدر المختار مع رد المحتار: ٥/ ٢٤٩،سعيد).

اور احادیثِ مذکورہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تبرعات میں شرطِ ملائم لگانا صحیح اور درست ہے۔

اشکال (۲): گھوڑ دوڑ تیر اندازی وغیرہ مسابقہ پر نیز تعلیمی مسابقہ پر انعامات حاصل کرنا تحریضات اور ترغیبات کی قبیل سے ہے اس میں کسی ایک صفت کو ترقی دینا مقصود ہے مثلاً پہلی صورت میں جہادی تربیت اور دوسری صورت میں علمی ترقی جبکہ آپکی (مسئولہ) صورت میں کسی صفت کی ترقی مقصود نہیں۔

ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

فيباح في كل الملاعب أي التي تعلم الفروسية وتعين على الجهاد لأن جواز الجعل فيما مر إنما ثبت بالحديث على خلاف القياس فيجوز ما عداها بدون الجعل. (فتاوى الشامي:٦/ ٤٠٢، سعيد).

الجواب:(۱) اس کا جواب یہ ہے کہ جن مواقع میں انعام مقرر کیا جاتا ہے ان کی تین قسمیں ہیں:

(الف) مسابقات کی قبیل سے ہو اور مسابقہ مفید بھی ہو تو اس میں ایک جانب سے انعام مقرر کرنا بالاتفاق جائز اور درست ہے۔ بلکہ بہتر ہے۔

(ب) مسابقات کی قبیل سے ہے لیکن وہ مسابقہ نہ تو معاونِ جہاد ہے اور نہ چنداں مفید ہے۔ اس میں ایک جانب سے انعام مقرر کرنا بہتر نہیں ہے، اگر چہ مسابقہ جائز اور درست ہے، تاکہ اس کام کی حوصلہ شکنی ہو۔

(ج) جو تبرعات، تحریضات اور ترغیبات کی قبیل سے ہو اور اس میں یک طرفہ انعام مقرر کیا جائے تو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جائز اور درست ہے۔

قال ابن عابدينؒ: ألقى شيئاً وقال: من أخذه فهو له فلمن سمعه أو بلغه ذلک القول أن يأخذه... لأنه أخذه على وجه الهبة وقد تمت بالقبض. (فتاوى الشامي:٤/ ٢٨٥ سعيد).

دیگر فقہاء بھی جواز کے قائل ہیں:

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

رجل قال لآخر من أكل من مالي فهو في حل قيل لايحل لأحد أن يأكل والفتوى على أنه يحل . (الفتاوى السراجية، ص:٤٠٣).

عالمگیری میں ہے:

إذا وضع الرجل مقداراً من السكر أو عدداً من الدراهم بين قوم وقال من شاء أخذ منه شيئاً أو قال من أخذ منه شيئاً فهو له فكل من أخذ منه شيئاً يصير ملكاً له. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٤٥).

اور مسئلہ مبحوث عنہا قسم سوم میں سے ہے بنابریں اس میں یک طرفہ انعام لگانا جائز اور درست ہے اگر چہ کسی صفت کی ترقی مقصود نہیں ہے۔

اشکال (۳): حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی ایک عبارت سے عدمِ جواز مترشح ہوتا ہے وہ

عبارت درج ذیل ہے:

...اس کاروبار کا خلاصہ خرید وفروخت بشرطِ انعام ہے اور شریعت میں ایسی خرید وفروخت ناجائز ہے جس میں کوئی ایسی خارجی شرط لگائی جائے جس میں فریقین معاملہ میں سے کسی ایک کا نفع ہو۔ (آپ کے مسائل اور انکا حل: ۶/۲۷۷)۔

الجواب: بظاہر حضرت مولاناؒ کی عبارت سمجھ میں نہیں آتی اس لئے کہ انعام تجارت کے ساتھ مشروط نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص انعامی کوپن نہ لینا چاہے تو کوئی جبر نہیں ہے اور سامان اسکو بغیر کوپن کے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر حضرت کا یہ فرمانا کہ خرید وفروخت بشرط انعام ہے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، پھر یہاں انعام مشروط نہیں ہے بلکہ موہوم ہے مشروط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مشتری انعام کا مستحق ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت مفتی نظام الدینؒ کی تحریر سے بھی جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادتی مشروط نہیں ہوتی بلکہ یہ انعام تبرع محض ہے۔ ملاحظہ ہو:

پھر جب اس زیادتی کے ملنے کا یقین بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کا مطالبہ ہی ہوتا ہے اور نہ سب کو وہ زیادتی مل ہی جاتی ہے بلکہ محکمہ محض اپنی صوابدید اور محض اپنے ضابطہ کے مطابق کچھ نمبرات کے لئے زائد رقم دینے کا اعلان کرتا ہے اور جن کا نام نکلتا ہے صرف ان کو دیدیتا ہے... یہ زیادتی منجانب محکمہ تبرع ہے اور تبرع جائز ہوتا ہے ممنوع نہیں، لہذا یہ زیادتی لینا جائز ہوگا۔ پھر حدیث شریف کل قرض جر نفعا کا مصداق وہ جر ہوگا جس میں نفع عقد معاملہ میں مشروط ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے۔ (منتخباتِ نظام الفتاوی: ۱/۱۹۴، ۱۹۵)۔

اشکال (۴): بعض مرتبہ انعام نقد رقم کی شکل میں حاصل ہوتا ہے اور یہ سود ہے اس لئے کہ اسنے جتنی رقم ادا کی تھی اس سے کئی گنا زیادہ ہے اور یہ زیادتی بلاعوض حاصل ہوئی ہے اس لئے سود ہے۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

الربا فضل مال بلاعوض فی معاوضة مال بمال. (تبیین الحقائق: ۴/۸۵، ط: ملتان).

الجواب: صورت مسئولہ کو سود میں داخل کرنا بے سود ہے کیونکہ سود اس کو کہتے ہیں کہ جو معاوضہ مالیہ میں زیادتی مشروط ہو۔ جبکہ مسئلہ مجوث عنہا میں زیادتی مشروط نہیں ہے بلکہ موہوم ہے نہ ہر ایک کو ملتی ہے نہ ہر ایک اسکے مطالبہ کا حق رکھتا ہے۔ مزید براں خریدار کا معاملہ سامان کے عوض ہوتا ہے اس نے نقد کے عوض سامان اور مبیع کو حاصل کرلیا انعام کے ساتھ بظاہر اسکا کوئی تعلق نہیں رہا۔ صرف اتنی بات ہے کہ خریدار کی فہرست میں ہونے کی

وجہ سے قرعہ اندازی میں نام نکلنے پر بائع کی طرف سے محض تبرعاً ایک انعام حاصل ہوگا جو کہ موہوم ہے۔ ربا کی تعریف ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه. (الهداية:۳/۷۸).

العنایہ شرح الہدایہ میں ہے:

الربا في اللغة هو الزيادة...وفي الاصطلاح هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع. (العناية: ۳ / ۷ ، ومثله في الدر المختار:۵/ ۱۶۸،سعيد).

معجم لغۃ الفقہاء میں ہے:

الربا كل زيادة مشروطة في العقد خالية عن عوض مشروع. (معجم لغة الفقهاء،ص ۲۱۸، وكذا في التعريفات الفقهية ،ص ۱۰۲).

حضرت مفتی نظام الدینؒ فرماتے ہیں: شرعاً ربا کے معنی میں جتنی عبارتیں فقہاء نے نقل فرمائی ہے ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اموالِ ربویہ میں عقدِ معاوضہ کا معاملہ ہو اور اسی عقد میں کسی جانب کو زیادتی بلاعوض ہو (یعنی) جس میں نفع عقد معاملہ میں مشروط ہو۔ (منتخباتِ نظام الفتاوی:۱/۱۹۵)۔

مزید براں یہ معاملہ قابل اشکال اس وقت ہوگا جب کہ انعام نقد کی صورت میں ہو اگر انعام کسی اور جنس کی شکل میں ہو تو پھر کوئی اشکال کی بات نہیں ہے کیونکہ مذہب احناف میں ربا کے متحقق ہونے کے لئے دونوں جانب میں ہم جنس ہونا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

فالعلة عندنا الكيل مع الجنس أو الوزن مع الجنس. (الهداية:۳/۷۸).

وفي معجم لغة الفقهاء: ربا الفضل بيع شيء من الأموال الربوية بجنسه متفاضلاً.

(معجم لغة الفقهاء،ص: ۲۱۸). واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن عائشة رضي الله تعالیٰ عنها قالت:
”توفي رسول الله صلی الله علیه وسلم
ودرعه مرهونة عند یهودی بثلاثین صاعاً من شعیر“.

(رواه البخاری).

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم:
”من أخذ أموال الناس یرید أداء ها أدی الله عنه
ومن أخذ یرید إتلافها أتلفه الله“.

(رواه البخاری).

باب......《۵》

قرض اور دیون کے احکام کا بیان

باب......﴿۵﴾

قرض اور دیون کے احکام

قرض دار کے ٹال مٹول کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کو قرض دیا ہے مقروض ادا نہیں کرتا ہے، اور قرض خواہ بار بار مانگتا ہے پھر بھی ٹال مٹول کرتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بلا کسی عذرِ شرعی کے کسی کی رقم دبا لینا اور باوجود وسعت کے مطالبہ پر بھی نہ دینا شریعت کی نگاہ میں یہ ظلم ہے اور حرام ہے، لہذا مقروض کو چاہئے کہ جلد از جلد قرض ادا کردے۔

ملاحظہ ہو وسعت کے باوجود ٹال مٹول کرنے پر حدیث شریف میں وعید وارد ہوئی ہے:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: مطل الغني ظلم ...متفق عليه. (مشکوٰۃ شریف:۱/۲۵۱، باب الافلاس والانظار، قدیمی).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غنی یعنی مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

وعن الشريد ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لي الواجد يحل عرضه وعقوبته، قال ابن المباركؒ: يحل عرضه يغلظ له عقوبته يحبس له، رواه أبو داود والنسائي. (مشکوٰۃ شریف:۱/۲۵۳، باب الافلاس والانظار، قدیمی).

ترجمہ: حضرت شرید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا اس کی عزت اور سزا کو حلال کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: ''یحل عرضہ'' یعنی اسے زبان سے لعنت ملامت کی جائیگی اور سزا یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائیگا۔

ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي سعيد الخذري رضي الله عنه قال: صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوماً صلاة العصر بنا بنهار ثم قام خطيباً فلم يدع شيئاً يكون إلى قيام الساعة إلا أخبرنا به...وفيه ألا وخيرهم الحسن القضاء الحسن الطلب، ألا وشرهم سيئ القضاء وسيئ الطلب ...الخ.

(رواه الترمذی: ۲/۴۳، باب ما اخبرالنبی صلی الله علیه وسلم اصحابه بماهو کائن الی یوم القیامة، فیصل).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک صاع گیہوں قرض لینے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے ایک صاع گیہوں کو ایک صاع گیہوں کے عوض ایک ماہ تک فروخت کیا تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر ایک صاع گیہوں قرض دیا کہ ایک ماہ تک واپسی ہوگی تو یہ جائز ہے اور معمول بہ ہے، حالانکہ قاعدہ ''الاعتبار للمعانی'' کے تحت دونوں کا حاصل اور خلاصہ ایک ہے، فقہاء کہتے ہیں، کفالہ بشرط براءۃ الدین حوالہ ہے اور حوالہ بشرط اعطاء المدیون کفالہ ہے، کیونکہ معانی کا اعتبار ہے، جب معانی کا اعتبار رہے تو قرض کیوں جائز ہے؟

الجواب: قانون کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ قرض بھی ناجائز ہو لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرض لیا کرتے تھے اور اس حالت میں وفات ہوئی تھی کہ یہودی سے قرضہ لیا تھا۔ اس لیے استحساناً بالحدیث جائز ہے، جیسے سلم بیع المعدوم سے مستثنیٰ ہے، نیز قرض میں ضرورت بھی ہے، لہذا قرض لینا دینا جائز ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة عند يهودي بثلاثين صاعاً من شعير. (رواه البخاری: ۲/۶۴۱، فیصل).

دوسری روایت میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''من أخذ أموال الناس

یرید أداء ھا أدی اللّٰہ عنہ (أی یسر علیہ أداء دینہ) ومن أخذ یرید إتلافھا أتلفہ اللّٰہ. (رواہ البخاری:۱/۳۲۱، باب من أخذ أموال الناس).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس نے کسی سے قرض لیا ادائیگی کے ارادہ سے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے قرض کی ادائیگی کو آسان بنادیتے ہیں اور جس نے قرض لیا دبا لینے کی نیت سے اللہ تعالیٰ اس کو تلف فرماتے ہیں یعنی اس کے لیے آئندہ آسانی کا معاملہ نہیں فرماتے بلکہ اس کو مزید تنگی میں مبتلا فرمادیتے ہیں۔

بدائع الصنائع میں ہے:

القرض یسلک بہ مسلک العاریۃ...والدلیل علی أنہ یسلک بہ مسلک العاریۃ أن لا یخلو إما أن یسلک بہ مسلک المبادلۃ وھي تملیک الشيء بمثلہ أویسلک بہ مسلک العاریۃ لا سبیل إلی الأول لأنہ تملیک العین بمثلہ نسیئۃ وھذا لایجوز، فتعین أن یکون عاریۃ فجعل التقدیر کأن المستقرض انتفع بالعین مدۃ ثم رد عین ماقبض وإن کان یرد بدلہ فی الحقیقۃ وجعل رد بدل العین بمنزلۃ رد العین. (بدائع الصنائع:فصل فی شرائط القرض، کتاب القرض :۷/۳۹٦،سعید).

عالمگیری میں ہے:

وعن أبي یوسفؒ في روایۃ یجوز استقراضہ(الدقیق) وزناً استحساناً إذا تعارف الناس ذلک وعلیہ الفتویٰ کذا فی الغیاثیۃ. (الفتاوی الھندیۃ:۳/۲۰۱).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

کھانے پینے کی جن چیزوں میں عادۃً تسامح سے کام لیا جاتا ہے ان میں قرض دینے اور لینے سے مقصد نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ محض وقتی ضرورت پوری کرنا مقصد ہوتا ہے، اس میں معمولی کمی وزیادتی سود میں داخل نہیں، لہٰذا ان چیزوں میں سود کا تحقق نہیں ہوگا۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۸۷).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

مبادلۃ الجنس بالجنس ہونے کی وجہ سے ربا کا مغالطہ ہوسکتا تھا، مگر درحقیقت اس صورت میں ربا نہیں، بلکہ یہ قرض ہے، ربا جب ہوتا ہے کہ مبادلۃ الجنس بغیر الجنس ہو یا مبادلۃ الجنس بالجنس ہو اور اس میں لفظ بیع یا مبادلہ یا

معاوضہ استعمال کیا گیا ہو، اگر جنس دے کر وہی جنس واپس لینے کا معاملہ ہو مگر بیع یا مبادلہ یا معاوضہ کے الفاظ نہیں کہے تو یہ قرض ہے خواہ قرض کا لفظ کہے یا نہ کہے اور یہ بلاشبہہ جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۱۷۳).

عطر ہدایہ میں ہے:

اور قرض کی یہ صورت بھی بیع نسیۃً بالجنس الواحد میں داخل ہونے سے ربا تھی لیکن چونکہ اس کا مقصود بالذات باعتبارِ وضع صلہ واحسان ہے مبادلہ گو ہوتا ہے مگر مقصود بالذات مبادلہ نہیں ہوتا مقصود بالذات احسان وصلہ ہے اس لیے چونکہ شارع نے اس کو جائز بلکہ مندوب قرار دیا ہے اور اس کے جواز پر اجماع امت ہے...

ہدایہ کے حاشیہ میں ہے: **قوله وهو ربا وهذا يقتضي فساد القرض لكن ندب الشارع إليه وأجمع الأمة على جوازه.** (حاشية الهداية: ۳/ ۷٦، رقم الحاشية ۱۹). (عطر ہدایہ، ص ۴۱۶).

مزید ملاحظہ فرمائیں: (معلم الفقہ ترجمہ اردو مجموعۃ الفتاوی: ۲/ ۱۷٦، باب القرض والرشوۃ). واللہ ﷻ اعلم۔

رینڈ کے قرض میں ڈالر کی ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے شخص کو ایک لاکھ رینڈ کا قرض ایک سال کی مہلت پر دیا، پھر اگر وہ مقروض سے یہ کہدے کہ ایک سال کے بعد آپ مجھے رینڈ کی جگہ ۱۵ ہزار ڈالر دو گے، تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ دائن کا مدیون سے یہ کہنا کہ ایک لاکھ رینڈ قرض کے عوض ایک سال بعد ۱۵ ہزار ڈالر واپس کردے، اور ایک لاکھ رینڈ اسی مجلس میں ادا بھی کردیئے تو یہ معاملہ جائز اور درست ہے۔ اس میں ربا وغیرہ کا کوئی تحقق نہ ہوگا کیونکہ کرنسی ثمن خلقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہے، نیز مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الجنس کہلاتی ہے، لہذا تقابض فی المجلس ضروری نہیں نسیۃً بھی جائز ہے، ہاں ایک کرنسی پر قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

ملاحظہ ہو فقہی مقالات میں ہے:

تاجروں اور عام لوگوں میں اس کا رواج ہے کہ وہ ایک ملک کی کرنسی دوسرے شخص کو اس شرط پر دے دیتے ہیں کہ تم اس کے بدلے میں اتنی مدت کے بعد فلاں ملک کی کرنسی فلاں جگہ پر دینا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ معاملہ جائز ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اثمان کی بیع میں بیع کے وقت ثمن کا عقد کرنے والے کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں لہذا جب جنسین مختلف ہوں تو ادھار کرنا جائز ہے، چنانچہ شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

وإذا اشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة كالنقود، وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولايشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لايشترط ذلك في الدراهم والدنانير.

(المبسوط للامام السرخسیؒ: ۱٤/۲٤، باب البيع بالفلوس، ادارة القرآن). (ماخوذ از فقہی مقالات: ۱/۴۲).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

دوملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس میں داخل ہیں اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں، جب دونوں کی جنس مختلف ہے تو ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس کا کاروبار کرنا بھی جائز ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا متبادل کرنسی پر قبضہ ہو جائے، اگر کسی ایک فریق کا بھی مجلس عقد میں متبادل کرنسی پر قبضہ نہ ہوا بلکہ معاملہ کر کے دونوں فریق بعد میں ادائیگی کے وعدہ پر جدا ہو گئے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں افتراق دین بدین لازم آتا ہے جو کہ حدیث کی رو سے ممنوع ہے:

قال العلامة برهان الدين المرغيناني: وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة وإذا وجدا حرم التفاضل والنساء لوجود العلة وإذا وجد أحدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء. (الهداية: ۷۹/۳، باب الربا، دار الفكر). (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۳۹).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

قرض کے جواز کے لیے مثلی ہونا شرط ہے، جن چیزوں کے مثل نہ ہوان کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز نہیں، کیونکہ قرض میں جو چیز لی گئی ہے اس کی مثل واپس کرنا شرعاً لازم ہے۔

قال العلامة الصابوني: ونص الفقهاء على أن قرض المكيل والموزون جائز، كاستقراض الحب والشعير، والتمر والزبيب وكالاستقراض السمن والزيت، وكل ما يكال ويوزن، وأما مالا مثل له فلا يجوز إقراضه كاللآلي، والجوهرات، وهذا مذهب أبي حنيفة وأجاز الشافعية والحنابلة إقراض مالا مثله له إذا كان معروف القيمة، فيجب رد القيمة. (فقه المعاملات)

حاصل یہ ہے کہ مکیلی اور موزونی چیز کی مثل موجود ہوتے ہوئے ان کو قرض دینا جائز ہے اور جو چیزیں غیر مثلی ہیں، جن کو ذوات القیم کہا جاتا ہے ان کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں، البتہ دراہم ودنانیر اور دیگر کرنسی کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز ہے کیونکہ ہر ملک کی کرنسی اس ملک کے اندر ذوات الامثال ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۸۳). واللہ تعالیٰ اعلم۔

قیمت کم ہونے پر زیادہ وصول کرنے کا حکم:

سوال: میں نے زید کو ۱۰۰۰ رینڈ بطورِ قرض دیئے اور ایک سال کی مدت طے ہوئی، اب سوال یہ ہے کہ زید ایک سال کے بعد جب مجھے ادا کر رہا ہے تو اس کی قیمت ایک ہزار نہیں بلکہ کم ہوگئی، تو اب ایک ہزار گزشتہ قیمت پر وصول کروں تو یہ ربا ہے اور اگر موجودہ قیمت پر ایک ہزار وصول کروں تو مجھے نقصان ہوگا، تو کیا کوئی صورت ایسی ہے کہ میں نقصان سے بھی بچ جاؤں اور ربا بھی متحقق نہ ہو؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپ صرف ہزار رینڈ جو آپ نے دئے تھے واپس لے سکتے ہیں اس سے زائد لینے کی اجازت نہیں، کیونکہ قرض میں زیادہ لینے سے ربا متحقق ہوتا ہے، اور قرض میں مدت ختم ہونے کے بعد مثلی چیز کو لوٹایا جاتا ہے، اسی وجہ سے قیمی چیزوں میں قرض جائز نہیں، اور ثمن اصطلاحی مثلی چیز کے حکم ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار مع فتاوی الشامی میں ہے:

(القرض هو عقد مخصوص) أي بلفظ القرض ونحوه (يرد على دفع مال) بمنزلة الجنس (مثلي)خرج القيمي (لآخر ليرد مثله) (وصح القرض في مثلي) هو كل مايضمن بالمثل عند الاستهلاك (لا في غيره)، (قوله في مثلي) كالمكيل والموزون والمعدود المتقارب كالجوز والبيض...واستقراض من الفلوس الرائجة والعدالي ...وكذا كل ما يكال ويوزن لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة لغلائه ورخصه. وفي كافي الحاكم، لوقال أقرضني دانق حنطة فأقرضه ربع حنطة، فعليه أن يرد مثله إلى أن قال وكذلك لوقال أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم فعليه مثلها، ولاينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها، وفي الفتاوى الهندية: استقرض حنطة فأعطى مثلها بعد ما تغير سعرها يجبر المقرض على القبول. (الدرالمختار مع فتاوی الشامی:۵/۱۶۱،۱۶۲،باب القرض، سعید).

نیز یہ مسئلہ غصب کی طرح ہے، اگر غاصب نے کوئی چیز غصب کر لی پھر اس چیز کی قیمت کم ہوگئی اور جب واپس کر رہا ہے تو اسی چیز کو واپس کرنا ضروری ہے اس چیز کی قیمت میں کمی بیشی کا اعتبار نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ولو وجده المغصوب في بلد الغصب ونقص السعر يأخذ العين لا القيمة يوم الغصب. (فتاوى الشامي:٦/١٨٢، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

بخلاف تراجع السعر إذا رد في مكان الغصب لأنه عبارة عن فتور الرغبات دون فوات الجزء. (الهداية:٣/٣٧٥).

ہاں اگر آپ نقصان سے بچنا چاہتے ہیں تو یہ تدبیر کر سکتے ہیں کہ سونا مثلاً کرو گر رینڈ قرض میں دیں، اور مدت ختم ہونے کے بعد اسی کو وصول کریں، کیونکہ عام طور پر سونے کی قیمت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

قرض میں بشرط تعجیل کمی کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے دوسرے شخص پر ۱۰ ہزار رینڈ مؤجل ہیں مدیون نے اس سے کہا کہ تم ایک ہزار معاف کر دو میں فی الحال ۹ ہزار ادا کر دوں گا، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر شرط لگائی تو یہ معاملہ جائز نہیں ہے لیکن بغیر شرط کے صلح کر لے تو یہ احسان ہے کہ دائن نے کم کر کے مدیون پر احسان کیا اور مدیوں نے جلدی ادا کر کے دائن پر احسان کیا، نیز اگر کوئی ثالث بطورِ صلح کہہ دے کہ تم اتنی رقم معاف کر دو تو مدیون فی الحال ادا کر دیگا تو اس کی بھی گنجائش ہے، روایت میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا قرضہ تھا اور مسجد میں دونوں کی بحث چل رہی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دائن سے فرمایا تم نصف معاف کر دو اور مدیون سے کہا تم فی الحال ادا کر دو۔ مدیون نے ادا کر دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں پوچھا کہ دین مؤجل ہے یا معجّل ،معلوم ہوا کہ اگر مؤجل ہو تو پھر بھی بطورِ صلح یا بغیر شرط کے تعجیل کے ساتھ دین کا بعض حصہ معاف ہو سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو تکملہ رد المحتار میں ہے:

وذكر في شرح الكافي للاسبيجابي جواز هذا الصلح مطلقاً على قياس قول أبي

یوسفؒ لأنه إحسان من المديون في القضاء بالتعجيل وإحسان من جانب الدائن في الاقتضاء بحط بعض حقه وحسن ،هذا إذا لم يكن مشروطاً في الآخر، وأما إذا شرط أحدهما في مقابلة الآخر فدخل في الصلح معاوضة فاسدة فيكون فاسداً وهكذا في غاية البيان. (تكملة ردالمحتار:٢/٢٥٣،سعيد).

لیکن اگر شرط لگائی ہے تو پھر صحیح نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

قال ولو كانت له ألف مؤجلة فصالحه على خمسمائة حالة لم يجز لأن المعجل خير من المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بإزاء ماحطه عنه وذلك اعتياض عن الأجل وهو حرام. (الهداية:٣/٢٥١، باب الصلح عن الدين).

قال في التنويروشرحه: ولا يصح (الصلح) عن دراهم على دنانير مؤجلة أوعن ألف مؤجل على نصفه حالاً لأنه اعتياض عن الأجل وهوحرام . (الدرالمختارمع ردالمحتار:٥/٦٤٠).

خلاصہ یہ ہے کہ شرط نہ ہو بلکہ وعدہ ہو یعنی دائن وعدہ کرے کہ ان شاء اللہ اگر آپ نے جلدی ادا کیا تو میرا وعدہ ہے کہ نصف آپ کو واپس کردوں گا تو یہ درست ہے۔اسی طرح بجائے نقد کے سامان کی شرط لگادے،مثلاً یہ کہے کہ نصف دین کی مقدار کا سامان ادا کردے تو پھر شرط لگانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

قال الجصاصؒ في احكام القرآن : ومن أجاز من السلف إذا قال عجل لي واضع عنك فجائز أن يكون أجازوه إذا لم يعجله شرطاً فيه وذلك بأن يضع عنه بغيرشرط ويعجل الآخر الباقي بغير شرط. (احكام القرآن :١/٤٦٧، باب الربا).

قال ابن الرشد في بداية المجتهد: أما ضع وتعجل فأجازه ابن عباس ﷺ من الصحابة وزفرؒ من فقهاء الأمصار، ومنعه جماعة منهم ابن عمر ﷺ من الصحابة ومالكؒ وأبوحنيفةؒ والثوريؒ وجماعة من فقهاء الأمصار واختلف قول الشافعي في ذلك ، فأجاز مالكؒ وجمهور من ينكر " ضع وتعجل" أن يتعجل الرجل في دينه المؤجل عرضاً يأخذه وإن كانت قيمته أقل من دينه. (بداية المجتهد:٢/١٠٨ باب في بيوع الذرائع الربوية).

نیز اگر دین معجّل ہو تو اس میں بھی کمی کرنے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو شرح عنایہ میں ہے:

ومن له على آخر ألف درهم حالة فقال: اد إلي غداً منها خمسمائة على أنك بريء من الفضل ففعل فهو بريء . (شرح العناية على هامش فتح القدير:۸/۴۲۷، دار الفكر، وكذا في البناية للعيني: الجزء الثالث، ص ۵۱٦). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیس سال کے بعد قرض کی وصولی پر زیادہ لینے کا حکم:

سوال: بیس سال پہلے ایک عورت نے گاڑی ۴۵۰۰۰ رینڈ (جو اس وقت بازاری قیمت تھی) میں بیچی مگر خریدار نے قیمت ادا نہیں کی اب مشتری نے توبہ کی اور پیسے ادا کرنا چاہتا ہے، مگر ۲۰ سال کے بعد ۴۵ ہزار بہت کم ہے، بازاری اعتبار سے اس کی قوتِ خرید میں کافی تفاوت ہو چکا ہے، تو کیا بائع زیادہ وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ۲۰ سال کے بعد جب مشتری گاڑی کی قیمت ادا کررہا ہے تو ۴۵ ہزار ہی ادا کرنا لازم ہے بائع زیادہ وصول نہیں کرسکتا، کیونکہ کرنسی ثمن اصطلاحی ہے اور مثلی ہے اس لیے کمی بیشی کا اعتبار نہیں۔

ملاحظہ ہو درمختار مع فتاوی الشامی میں ہے:

واستقراض من الفلوس الرائجة والعدالي ...وكذا كل ما يكال ويوزن لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة لغلائه ورخصه. وفي كافي الحاكم، لوقال أقرضني دانق حنطة فأقرضه ربع حنطة، فعليه أن يرد مثله إلى أن قال وكذلك لوقال أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم فعليه مثلها، ولاينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها، وفي الفتاوى الهندية: استقرض حنطة فأعطى مثلها بعد ما تغير سعرها يجبر المقرض على القبول. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:۵/۱٦۱،۱٦۲، باب القرض، سعيد).

نیز یہ مسئلہ غصب کی طرح ہے، اگر غاصب نے کوئی چیز غصب کرلی پھر اس چیز کی قیمت کم ہوگئی اور جب واپس کررہا ہے تو اسی چیز کو واپس کرنا ضروری ہے اس چیز کی قیمت میں کمی بیشی کا اعتبار نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ولو وجده المغصوب في بلد الغصب وانقص السعر يأخذ العين لا القيمة يوم الغصب. (فتاوی الشامی:٦/١٨٢، سعید).

ہدایہ میں ہے:

بخلاف تراجع السعر إذا رد في مكان الغصب لأنه عبارة عن فتور الرغبات دون فوات الجزء. (الهداية:٣/٣٧٥). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مقروض کے نفلی صدقہ کا حکم:

سوال: کیا مقروض آدمی نفلی صدقہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا صدقہ کرنے پر ثواب ملے گا یا گنہگار ہوگا؟

الجواب: نفلی صدقہ نفل کے درجہ میں ہے اور قرض فرض کے درجہ میں ہے، لہذا فرض کو پہلے ادا کرنا چاہئے ہاں اگر مقروض آدمی قرض کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرتا ہے اور ساتھ ساتھ نفلی صدقہ بھی دیتا ہے تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔

ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

ومن تصدق وهو محتاج أو أهله محتاج أوعليه دين فالدين أحق أن يقضى من الصدقة والعتق والهبة...والمعنى أن شرط التصدق أن لايكون محتاجاً ولا أهله محتاجاً ولايكون عليه دين فإذا كان عليه دين فالواجب أن يقضي دينه، وقضاء الدين أحق من الصدقة والعتق والهبة لأن الابتداء بالفرائض قبل النوافل، وليس لأحد إتلاف نفسه وإتلاف أهله وإحياء غيره، وإنما عليه إحياء غيره بعد إحياء نفسه وأهله إذ هما أوجب عليه من حق سائر الناس. (عمدة القارى:٦/٤٠١،باب لاصدقة الا عن ظهرغنى،ملتان).

وعن أبي هريرة ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "من أخذ أموال الناس يريد أداء ها أدى الله عنه، ومن أخذ يريد إتلافها أتلفه الله". (رواه البخاري:١/٣٢١، باب من أخذ أموال الناس).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

یہ چندہ نفل کے درجہ میں ہے اور قرض ادا کرنا فرض ہے، اگر فرض ذمہ میں باقی رہتے ہوئے کوئی شخص نفل

پڑھتا ہے تو اس کو ثواب بھی ملتا ہے اور قرض کی تاخیر پر باز پرس بھی ہے، لہذا یہ کہنا کہ ثواب نہیں ملے گا صحیح نہیں، البتہ قرض کی ادائیگی کا اہتمام چاہئے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/۴۲۴، جامعہ فاروقیہ). واللہ ﷻ اعلم۔

قرض کی ادائیگی میں زیادہ دینے کا حکم:

سوال: قرض کی ادائیگی کے وقت قرض سے زیادہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ زیادتی عقد میں مشروط نہ ہو، اتفاقاً قرض ادا کرتے وقت کچھ دیدیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ قرض ادا کرتے وقت اتفاقاً کچھ زیادہ دیدیا جائے، جب کہ زیادتی نہ تو عقد میں مشروط ہو اور نہ معروف ہو کہ اس کی امید رکھی جاتی ہو اور نہ دینے پر ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہو تو درست ہے ورنہ جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں روایت ہے:

عن أبي هريرة ﷺ قال: استقرض رسول الله صلى الله عليه وسلم مسناً فأعطى مسناً خيراً من مسنه وقال خياركم أحاسنكم قضاء. (رواه الترمذي:۱/۲۴۵،ورواه ابن ماجه في باب السلم في الحيوان).

وعلى هامش الترمذي: وفي الحديث دليل على أن رد الأجود في القرض من مكارم الأخلاق وليست من الأموال الربوية وأيضاً لم يكن مشروطاً في صلب العقد. (حاشية الترمذي،للمحدث احمدعلى السهارنپوري:۱/۱۵۸).

وفي شرح مسلم للإمام النوويؒ: وفيه أنه يستحب لمن عليه دين من قرض وغيره أن يرد أجود من الذي عليه وهذا من السنة ومكارم الأخلاق وليس هو من قرض جر منفعة فإنه منهي عنه لأن المنهي عنه ما كان مشروطاً في عقد القرض. (الشرح الكامل:۲/۳۰).

(وكذا في تكملة فتح الملهم:۱/۶۴۴).

وفي الدرالمختار: وكان عليه مثل ما قبض فإن قضاه أجود بلاشرط جاز.

(الدرالمختار:۵/۱۶۵،سعيد).

البحر الرائق میں ہے:

ولایجوز قرض جرنفعاً بأن أقرضه دراهم مکسورة بشرط رد صحیحه أو أقرضه طعاماً في مکان بشرط رده في مکان آخر فإن قضاه أجود بلاشرط جاز .

(البحرالرائق:٦/ ١٢٢،تتمة فی مسائل القرض،کوئتة).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وإذا رجح في بدل القرض ولم یکن الرجحان مشروطاً فی القرض فلا بأس به کذا فی المحیط ،... قال محمدؒ في کتاب الصرف أن أباحنیفةؒ کان یکره کل قرض جر منفعة ، قال الکرخیؒ : هذا إذاکانت المنفعة مشروطة فی العقد بأن أقرض غلة لیرد علیه صحاحاً أو ما أشبه ذلک فإن لم تکن المنفعة مشروطة فی العقد فأعطاه المستقرض أجود مما علیه فلا بأس به. (الفتاوی الهندیة:٣/ ٢٠٣).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

قرض سے جو نفع اٹھانا حرام ہے یہ اس صورت میں ہے کہ قرض دینے والا شرط لگائے یا عادۃً وہاں معروف ہو کہ قرض لینے والا زائد واپس کرتا ہے، اگر قرض کی واپسی میں زیادتی مشروط نہ ہو بلکہ مقروض حسن قضا کے طور پر زائد واپس کرتا ہے تو یہ شرعاً سود نہیں بلکہ ایسا کرنا بہتر ہے۔

لحدیث جابر بن عبد اللہ ﷺ قال: کان لي علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم حق فأعطاني وزادني. (اخرجه الشیخان والامام احمد).(جدید معاملات کے شرعی احکام:١/١٨٣).

مزید ملاحظہ ہو: (بدائع الصنائع: ۷/ ۳۹۵،سعید۔مرقات المفاتیح:۶/ ۹۹۔واعلاء السنن:۱۴/ ۵۲۱۔ وامدادالاحکام: ۳/ ۴۸۹۔وآپ کے مسائل اوران کاحل:۶/ ۱۶۱۔وفتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۴۱۳،جامعہ فاروقیہ۔وکتاب الفتاویٰ:۵/ ۳۷۳). واللہ ﷻ اعلم۔

مدیون کے انتقال پر دین کے معجّل ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی مدیون کا انتقال ہوگیا اور دین مؤجل تھا تو وہ معجّل بن جائیگا یا نہیں؟ یعنی ایک شخص نے کچھ سامان خریدنے کے لیے قسطوں میں قرض لیا، اور یہ دین ایک یا دو سال میں بذریعہ قسط ادائیگی طے پائی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص کے مرنے کے بعد یہ قرض فوری طور پر ادا کردیا جائیگا یا بذریعہ قسط متعینہ وقت میں آہستہ آہستہ ادا کیا جاسکتا ہے؟

الجواب: مذہب احناف کے مطابق قرض میں اجل ذکر کرنے سے اجل لازم نہیں ہوتی ،وجہ یہ ہے کہ قرض ایک تبرع اور احسان ہے،و لا جبر فی التبرع ،بایں وجہ مقرض جب بھی اپنے قرض کا مطالبہ کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ہاں اجل کی حیثیت ایک وعدہ کی سی ہے اور وعدہ کو پورا کرنا دیانۃً لازم ہوتا ہے اس وجہ سے مقروض کو مہلت دینی چاہئے ،لیکن جب مقروض کا انتقال ہوگیا تو اب اس کا مال وارثین میں منتقل ہوگیا،اور میراث تقسیم ہونے سے پہلے دین ادا کرنا ضروری ہے بنابریں دین مؤجل معجّل بن جائیگا اور فوری ادائیگی ضروری ہوگی،ہاں اگر سب تاجیل وتقسیط پر راضی ہوں تو پھر مؤجل قسط وار ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ صاحبِ محیط اور امام قاضیخانؒ نے فرمایا۔

علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء في تأخير الدين في القرض إلى أجل فقال أبوحنيفةؒ وأصحابه: سواء كان القرض إلى أجل أوغير أجل له أن يأخذه متى أحب وكذلك العارية وغيرها لأنه عندهم من باب العدة والهبة غيرمقبوضة وهوقول الحارث العكلي وأصحابه وإبراهيم النخعي وقال ابن أبي شيبة : وبه نأخذ. (عمدة القاری:۹/۱۲۵باب اذا اقرضه الى اجل مسمىٰ، ط:ملتان).

احکام الترکات والمواریث میں ہے:

وثالثها أن في التأجيل ضرراً بالوارث لأن فيه تأخيراً لاستخلاص حقه في الميراث لايتخلص إلا بعد أداء الدين لقوله تعالىٰ: من بعد وصية يوصي بها أو دين. (احکام الترکات والمواریث، لمحمد ابوزهرة،ص ۴۰).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله ودين الميت: أي لو مات المديون وحل المال فأجل الدائن وارثه لم يصح لأن الدين في الذمة وفائدة التأجيل أن يتجر فيودي الدين من نماء المال فإذا مات من له الأجل تعين المتروك لقضاء الدين، فلا يفيد التأجيل كذا في الخلاصة وظاهره أنه في كل دين وذكره في القنية في القرض، بحر، وفي الفتح مثل ما في القنية لكن في الذخيرة تأجيل رب الدين ماله على الميت لايجوز والصحيح أنه قول الكل لأن الأجل صفة الدين ولا دين على الوارث فلا يثبت الأجل في حقه ولا وجه أيضاً لثبوته للميت لأنه سقط عن ذمته بالموت ولا

لثبوته في المال لأنه عين والأعيان لاتقبل التأجيل، وفي البرجندي قال صاحب المحيط : الأصح عندي أن تأجيله صحيح وهكذا أفتى الإمام قاضيخان. (فتاوى الشامي:٥/١٥٨،سعيد،وكذا في البحر الرائق:٦/١٢٢،كوئتة).

وفي تنوير الأبصار: ولزم تأجيل كل دين إلا القرض فلا يلزم تأجيله. وفي الشامية: أي يصح تأجيله مع كونه غير لازم فللمقرض الرجوع عنه، لكن قال في الهداية: فإن تأجيله لا يصح لأنه إعارة و صلة في الابتداء حتى يصح بلفظة الإعارة و لا يملكه من لا يملك التبرع كالوصي و الصبي ومعاوضة في الانتهاء فعلى اعتبار الابتداء لايلزم التأجيل فيه كما في الإعارة إذ لاجبر في التبرع . (فتاوى الشامي:٥/١٥٨،سعيد).

السنن الکبریٰ للبیہقی میں ہے:

عن علي رضي الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أتى بجنازة لم يسأل عن شيء من عمل الرجل إلا أن يسأل عن دينه ...إلى أن قال: إنه ليس من ميت يموت وعليه دين إلا وهو مرتهن بدينه. (رواه البيهقي :٦/٧٣، باب وجوب الحق بالضمان).

احکام الترکات میں ہے:

فإن هذا الحديث يقتضي التعجيل بقضاء الدين فكاً لهذه النفس المرهونة بالقضاء وذلک يقتضي سقوط الأجل. (احكام التركات،ص٣٩). واللہ ﷻ اعلم۔

حیلہ اور تدبیر سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص پر قرض ہو اور مقروض قرض ادا کرنے سے انکار کرتا ہو تو کیا قرض خواہ کسی اور طریقہ سے یا حیلہ اور تدبیر سے اپنا قرض وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: احناف کا اصل مذہب تو یہی ہے کہ کسی اور طریقہ سے قرض وصول کرنا درست نہیں، لیکن فی زماننا فتویٰ اس پر ہے کہ کسی اور طریقہ سے بھی قرض وصول کرنے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

(قوله أطلق الشافعي أخذ خلاف الجنس)أي من النقود أو العروض...قال القهستاني:

وفيه إيماء إلى أن له أن يأخذ من خلاف جنسه عند المجانسة في المالية وهذا أوسع فيجوز الأخذ به وإن لم يكن مذهبنا، فإن الإنسان يعذر في العمل به عند الضرورة كما في الزاهدي. قلت: وهذا ما قالوا: إنه لامستندله، لكن رأيت في شرح نظم الكنز للمقدسي من كتاب الحجر، قال: ونقل جد والدي لأمه الجمال الأشقر في شرحه للقدوري أن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس كان في زمانهم لمطاوعتهم في الحقوق، والفتوىٰ اليوم على جواز الأخذ عند القدرة من أي مال كان لاسيما في ديارنا لمداومتهم للعقوق. (فتاوى الشامي: ٤/٩٥، كتاب السرقة، سعيد).

وفي الشامية: فلو من جنسه فله أخذ قدر حقه منه بلا كلام. (فتاوى الشامي:٦/٥٠١،باب مايجوز ارتهانه، سعيد).

احسن الفتاوی میں ہے:

یہ طریقہ جائز ہے مگر اس کا پورا اہتمام رہے کہ اپنے حق سے زیادہ ہرگز نہ لے، وصول ہونے کے بعد اس کی اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں، خصوصاً جب کہ ناراضگی کا اندیشہ ہو۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۱۷۴، بحوالہ رد المحتار: ۵/۳۰۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

انشورنس کمپنی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی سے قرض لیا اب وہ ادا نہیں کرسکتا، اور اس کا انتقال ہوگیا، لیکن اس کا لائف انشورنس ہے، تو دائن انشورنس کمپنی سے اپنا قرض وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ میت کے اصل راس المال سے اپنا قرض وصول کرلے اور مزید سودی رقم بلا نیتِ ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کردے، اس کو استعمال میں لانا جائز اور درست نہیں۔ اور اگر اصل راس المال سے قرض پورا نہیں ہوتا اور میت نے کوئی دوسرا مال بھی نہیں چھوڑا تو سودی رقم حیلہ تملیک کے بعد اپنے قرض میں لے سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو کتاب الفتاویٰ میں ہے:

انشورنس کرانا جائز نہیں، جو رقم انشورنس کمپنی ادا کرے، ان میں سے وہ مقدار حلال ہے جو مالک نے

ادا کی ہے، زائد رقم سود میں داخل ہے، اسے بلا نیتِ ثواب غرباء پر خرچ کر دینا واجب ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳۶۰/۵).

ردالمحتار میں ہے:

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال، وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له، ويتصدق به بنية صاحبه. (ردالمحتار:۹۹/۵، مطلب فیمن ورث مالاً حراماً، سعید).

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں ہے:

تملیک مستحق کے حیلہ کے بعد مسجد کے پاخانہ کی صفائی وغیرہ میں بھی استعمال کرنا درست ہوگا، اور حیلہ تملیک یہ ہے کہ جتنی رقم سود کی ہے وہ غرباء ومساکین کو جو مستحق صدقہ ہوں دے کر اس کا مالک بنا دیا جائے، پھر وہ مستحق صدقہ اپنی طرف سے بطورِ چندہ مسجد میں دیدے۔ **وقدمنا أن الحيلة أن يتصدق على الفقير، ثم يأمره بفعل هذه الأشياء.** الدرالمختار مع ردالمحتار:۳۴۵/۲، کتاب الزکوٰۃ، باب المصرف، سعید. (نظام الفتاویٰ:۱۹۹/۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

کافر سے مالِ حرام قرض میں وصول کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی کافر پر کسی مسلمان کا قرض ہو اور یہ معلوم ہے کہ کافر کے پاس سود یا غصب یا چوری کی رقم ہے تو اس سے قرض کے بدلے میں لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی ملکیت اس مالِ حرام پر ثابت ہو جاتی ہے اس لیے مسلمان اپنے قرض میں وصول کر سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه أي بيع الكافر الخمر لأنها مال متقوم في حقه فملك الثمن فيحل الأخذ منه. (فتاوی الشامی:۳۸۵/۶).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو كان لمسلم على نصراني دين، فباع النصراني خمراً أخذ بثمنها وقضاه المسلم من دينه، جازله أخذه، لأن بيعه له مباح. (الفتاوی الهندية:۳۶۷/۵، کتاب الكراهية، باب فی القرض والدين).

البحر الرائق میں ہے:

وكره لرب الدين أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا كافر، يعني إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمراً وأخذ ثمنها وقضى الدين لايحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه وإن كان البائع كافراً جاز له أن يأخذ والفرق أن البيع في الوجه الأول باطل فلم يملك البائع الثمن وهو باقٍ على ملك المشتري فلا يحل له أن يأخذ مال الغير بغير رضاه والبيع في الوجه الثاني صحيح فملك البائع الثمن لأن الخمر مال متقوم في حق الكافر فجاز له الأخذ بخلاف المسلم. (تکملۃالبحرالرائق:۸/۲۰۱، کوئٹہ).

وللاستزادة انظر: (فتاوى الشامي:٦/٣٨٥،فصل في البيع،سعيد۔وتبيين الحقائق:٧/٤٦٨، كتاب الكراهية).

امدادالاحکام میں ہے:

کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لیے خطاب عام کافی نہیں، بلکہ التزام بھی شرط ہے، اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا، نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں، لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا سے خواہ غصب سے خواہ بیوعِ باطلہ وفاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہرصورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہوجائے گا، اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے۔(امدادالاحکام:۴/۳۹۰، معاملات المسلمین باہل الکتاب والمشرکین).

واللہ ﷻ اعلم۔

مسئلہ مذکورہ بالا کی تصحیح وتشریح

یہ مسئلہ یوں سمجھنا چاہئے کہ غیر مسلم اگر چوری اور غصب سے مال جمع کریں اور چونکہ غیر مسلم ذمی یا کفار مامونین اور معاہدین کے حکم میں ہیں اس لیے جس کام کو وہ اپنے دین میں حرام سمجھتے ہوں اور اس کے ذریعہ سے مال حاصل کریں تو بعینہٖ وہ مال قرض میں لینا صحیح نہیں، ہاں اگر مال مخلوط ہو اور غالب حلال ہو یا شراب وغیرہ کی آمدنی ہو غصب، چوری نہ ہو تو مسلمان اس کو اپنے قرض میں وصول کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو امدادالاحکام میں مرقوم ہے:

پس جو عقد اہل ذمہ اپنے دین کے موافق کریں و شرائطِ معاہدہ کے بھی خلاف نہ ہو اس میں حکم صحت دیا جائیگا گو وہ شریعت کے خلاف ہو البتہ جو عقد ان کے دین کے بھی خلاف ہو یا شرائطِ معاہدہ کے خلاف ہو اس میں حکم فساد دیا جائیگا، ولعل الحق لا یتجاوز عن ذلک ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک أمرا۔ (امداد الاحکام:۳۹۰/۴)۔

صلح حدیبیہ کے واقعہ میں آیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے سفر میں اپنے مشرک ساتھیوں کو قتل کر کے ان کا مال چھینا اور مدینہ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام قبول ہے اور مال سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **وأما المال فلست منه في شيء أی لا أتعرض له لكونه أخذ ه غدراً ويستفاد منه أنه لا يحل أخذ أموال الكفار في حال الأمن غدراً لأن الرفقة يصطحبون على الأمانة والأمانة تؤدى الى أهلها مسلماً كان أو كافراً وان أموال الكفار انما تحل بالمحاربة والمغالبة ولعل النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ترك المال في يده لامكان أن يسلم قومه فيرد اليهم أموالهم** . (فتح الباری: ۳٤١/٥، باب الشروط فی الجهاد...)۔

حافظ عینیؒ فرماتے ہیں:

قال أی المغيرة لأبي بكر رضی اللہ عنہ : قتلتهم وجئت بأسلابهم الى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ليخمس أوليرى فيها رأيه فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أما المال فلست منه في شيء يريد في حل لأنه علم أن أصله غصب وأموال المشركين وان كانت مغنومة عند القهر فلا يحل أخذها عند الأمن فاذا كان الانسان مصاحباً لهم فقد أمن كل واحد منهم صاحبه . (عمدة القاری : ٦٤١/٩، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع اهل الحرب)۔

اہل حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا خواہ غصب خواہ بیوعِ باطلہ و فاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہرصورت وہ روپیہ اس کی ملک میں داخل ہو جائیگا اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے۔ (امداد الاحکام:۳۹۰/۴)۔

موجودہ دور میں اکثر ممالک کے غیر مسلم اہل ذمہ اور معاہدین کے حکم میں ہیں بنابریں وہ اپنے معتقد کے موافق میں جو اموال کمائیں فقط وہ ان کی ملک میں داخل ہیں:۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه أي بيع الكافر الخمر لأنها مال متقوم في حقه فملك الثمن فيحل الأخذ منه. (فتاوى الشامي:٣٨٥/٦).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو كان لمسلم على نصراني دين، فباع النصراني خمراً أخذ بثمنها وقضاه المسلم من دينه، جازله أخذه ، لأن بيعه له مباح. (الفتاوى الهندية:٣٦٧/٥، كتاب الكراهية،باب في القرض والدين).

تکملة البحر الرائق میں ہے:

وكره لرب الدين أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا كافر، يعني إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمراً وأخذ ثمنها وقضى الدين لايحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه وإن كان البائع كافراً جاز له أن يأخذ والفرق أن البيع في الوجه الأول باطل فلم يملك البائع الثمن وهو باقٍ على ملك المشتري فلا يحل له أن يأخذ مال الغير بغير رضاه والبيع في الوجه الثاني صحيح فملك البائع الثمن لأن الخمرمال متقوم في حق الكافر فجاز له الأخذ بخلاف المسلم. (تكملة البحرالرائق:٢٠١/٨،كوئته).

امدادالفتاویٰ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے نومسلمہ کی حالتِ کفر میں زنا کی کمائی کے بارے میں فرمایا: یہ غیر طیب ہے، کیونکہ زنا کسی ملت میں حلال نہیں۔(امدادالفتاویٰ:۱۴۴/۴)۔

وللاستزادة انظر: (فتاوى الشامي:٣٨٥/٦،فصل في البيع،سعيد۔وتبيين الحقائق: ٤٦٨/٧، كتاب الكراهية) .

نیز مالِ مخلوط جس میں غالب حلال ہو اس پر بھی ملک ثابت ہوجاتی ہے بنابریں ایسے اموال کا قرض میں وصول کرنا بھی جائز اور درست ہے۔ہاں اگر چوری، غصب کا مال معلوم اور معین ہے تو پھر نہیں لینا چاہئے۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں؛الدرالمختار میں ہے:

و لو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه ؛ لأن الخلط استهلاک اذا لم يمكن تمييزعند أبي حنيفةؒ، وقوله أرفق اذ قلما يخلو مال عن غصب. وفي رد المحتار: قوله لأن الخلط استهلاک ، أي بمنزلته من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمة لا بالأعيان...لأنا نقول: انه لما خلطها ملكها وصار مثلها ديناً في ذمته لا عينها. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ٢/ ٢٩٠، ٢٩١،سعيد).

فتاویٰ بزازیہ میں مرقوم ہے:

ما يأخذه الأعونة من الأموال ظلماً و يخلطه بماله و بمال مظلوم آخر يصير ملكاً له وينقطع حق الأول فلا يكون أخذه عندنا حراماً محضاً . (الفتاوى البزازية بهامش الفتاوى الهندية: ٨٣/٤).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

اشترى بدراهم مغصوبة ، أو بدراهم اكتسبها من الحرام شيئاً ، فهذا على وجوه : (١) إما أن دفع إلى البائع تلک الدراهم أو لا ، ثم اشترى منه بتلک الدراهم ، (٢) إذا اشترى قبل الدفع بتلک الدراهم ، ودفعها ، (٣) أو اشترى قبل الدفع بتلک الدراهم ، ودفع غير تلک الدراهم ، (٤) أو اشترى مطلقاً ، ودفع تلک الدراهم ، (٥) أو اشترى بدراهم آخر ، ودفع تلک الدراهم ، ففي الوجوه كلها لا يطيب له التناول قبل ضمان يعني قبل ضمان الدراهم ، وبعد الضمان يطيب له الربح ، هكذا ذكره في الجامع الصغير قال أبو الحسن الكرخيؒ: هذا الجواب صحيح في الوجه الأول والثاني ، أما في الوجه الثالث والرابع والخامس يطيب له، واليوم قالوا : الفتوىٰ على قول أبي الحسن الكرخيؒ، لكثرة الحرام دفعاً للحرج على الناس ، و على هذا تقرر رأى الصدر الشهيدؒ. (الفتاوى التاتارخانية : ١٦/ ٥١٠، ط: ديوبند).

وللمزيد راجع: (الدر المختار مع رد المحتار: ٥/ ٢٣٥ سعيد، والدر المختار: ٦/ ١٨٩ سعيد، وحاشية الطحطاوي على الدر المختار: ٤/ ١٠٥، كوئته).

مالِ مخلوط میں غالب کا اعتبار ہے جب کہ حرام مال معلوم ومعین نہ ہو۔ فقہی عبارات ملاحظہ فرمائیں؛۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات: أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال... لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب . (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٤٢).

المحيط البرهاني میں ہے:

وفي عيون المسائل: رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لا ينبغي أن يقبل ويأكل من طعامه ما لم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه، وإن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل ما لم يتبين له أن ذلك من الحرام؛ وهذا لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام وتخلو عن كثيره، فيعتبر الغالب ويبنى الحكم عليه.

(المحيط البرهاني: ٦/ ١١٠، الفصل السابع عشر في الهدايا والضيافات). (وكذا في الموسوعة الفقهية الكويتية: ١٥/ ٧٨، والاشباه والنظائر: ١/ ٣٤٣، والمبسوط: ١٠/ ١٩٧).

جواہر الفتاویٰ میں ہے:

جس شخص کے ذرائع آمدنی حلال وحرام دونوں طرح کے ہیں تو اس میں تفصیل ہے، اگر حلال آمدنی اور حرام آمدنی اس کے پاس الگ الگ ہیں، اپنے اخراجات کھانے، پینے، لباس وغیرہ میں حلال آمدنی استعمال کرتا ہے اور اس کی بات پر اعتماد ہے تو اس کے یہاں کھانا، پینا جائز ہے اور حلال مال سے کہہ کر اگر ہدیہ تحفہ دیتا ہے تو اس کا لینا بھی جائز ہے۔ اور مخلوط ہو تو غالب کا اعتبار ہوگا۔ (جواہر الفتاویٰ: ۳/ ۲۹۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تعلیمی فیس ادا کرنے کے لیے سودی قرض لینے کا حکم:

سوال: اگر مالدار آدمی اپنے بیٹے کے جامعہ کی فیس ادا کرنے کے لیے مالِ ربا سے قرض لے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا ولکم الأجر الجزیل.

الجواب: اگر اموالِ ربویہ سے قرض لینے کا مطلب یہ ہو کہ قرض بینک سے لیتا ہے اور اس پر سود ادا کریگا تو یہ درست نہیں کیونکہ جامعہ کی تعلیم فرض نہیں اور نہ انتہائی مجبوری ہے کہ اس کے لیے ناجائز کا ارتکاب کیا جائے، اور اگر یہ مطلب ہو کہ کسی کے پاس سودی رقم پڑی ہے اور باپ اپنے بیٹے کے لیے وہی سودی رقم بطورِ قرض لیتا ہے حالانکہ بیٹا باپ دونوں مالدار ہیں تو سودی رقم فی الفور واجب التصدق ہے اس کو قرضوں میں چلانا صحیح نہیں، ہاں اگر بیٹا فقیر ہے صاحبِ نصاب نہیں اور اس کو تملیکاً سودی رقم ملی تو صحیح ہے پھر وہ اس کو کہیں بھی استعمال کرسکتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسلمان سے مالِ حرام قرض میں وصول کرنے کا حکم:

سوال: زید کا عمرو کے ذمہ کچھ قرض ہے زید کو یقیناً معلوم ہے کہ عمرو میرا قرض سود کی رقم سے ادا کریگا، کیا اس صورت میں میرے لیے جائز ہے کہ سودی رقم سے اپنا قرض وصول کروں؟

الجواب: مسلمان سودی رقم کا مالک نہیں بن سکتا سودی رقم فی الفور واجب التصدق ہے، لہذا کسی مسلمان کا قرضہ ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے اور قرض خواہ کے لیے اپنے قرض میں سودی رقم لینا بھی ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى ذمتين، سألت عنه الشهاب بن الشبلي، فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك أما لو رأى المكاس مثلاً يأخذ من أحد شيئاً من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلك الآخر آخر فهو حرام.

(ردالمحتار:۵/۹۸،سعید).

درمختار میں ہے:

وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه ... وعلى هذا لومات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لايحل لورثته كمابسطه الزيلعي وفي الأشباه الحرمة تنتقل. (الدرالمختار:۶/۳۸۵،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو كان الدين لمسلم على مسلم فباع المسلم خمراً وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدين، كره له أن يقبض ذلك من دينه، كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية:٥/٣٦٧، كتاب الكراهية، باب في القرض والدين).

البحر الرائق میں ہے:

وكره لرب الدين أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا كافر، يعني إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذي عليه الدين خمراً وأخذ ثمنها وقضى الدين لايحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه. (تكملة البحر الرائق:٨/٢٠١، كوئٹه).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

والحاصل أن القرض لايتأدى بكسب الزانية والمغنية والربا لأن الإجارة عليهما باطلة فلم تملك الزانية والمغنية ما أعطيتا من الأجرة فهو مال الغير لايتأدى به القرض والحرام لايحل بتبدل اليد وكذا الربا، هذا ما عندي، والله تعالىٰ أعلم. (احسن الفتاویٰ:۷/۱۹۲، رسالہ اداء القرض من الحرام)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نابالغ بچے کا مال بطورِ قرض لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنے نابالغ بچے کا مال بطورِ قرض لینا چاہتا ہے تو شرعاً لینے کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: آدمی اپنے استعمال کے لیے اپنے نابالغ بچے کا مال بطورِ قرض لے سکتا ہے کسی اور کو بطورِ قرض نہیں دے سکتا۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

الوصي إذا أراد أن يقرض مال اليتيم من غيره فليس له ذلك باتفاق الروايات كذا في المحيط، فإن أقرض كان ضامناً والقاضي يملك الإقراض واختلف المشايخ في الأب لاختلاف الروايات عن أبي حنيفة والصحيح أن الأب بمنزلة الوصي لا بمنزلة القاضي ولو قضى الوصي دين نفسه بمال اليتيم لايجوز ولو فعل الأب ذلك جاز. (الفتاوى الهندية:٦/١٤٧،

الباب التاسع فی الوصی ومایملکه).

شامی میں ہے:

تتمة: لو آجره الأب أو الجد أو الوصي صح، إذ لهم استعماله بلا عوض للتهذيب والرياضة فبالعوض أولىٰ، والوصي لو استأجره لنفسه صح لا لو آجر نفسه لليتيم، ولو آجر الأب نفسه له صح وله قضاء دينه من مال ولده بخلاف الوصي...ولا بأس للأب أن يأكل من ماله بقدر حاجته لومحتاجاً ولايضمن . (فتاوی الشامی:۶/۷۱۲، سعید).

مجمع الضمانات میں ہے:

ولو قضى الوصي ديون نفسه بمال اليتيم لايجوز، ولوفعل الأب ذلک جاز لأن الوصي لايملک أن يشتري مال اليتيم لنفسه بمثل القيمة والأب يملک. (مجمع الضمانات:۲/ ۸۲۸،الباب الخامس والثلاثون فی الوصی والولی والقاضی).

جامع احکام الصغار میں ہے:

وذكر رحمه اللّٰه تعالىٰ أيضاً في قضاء الجامع الصغير أن الأب لو أخذ مال ولده الصغير قرضاً جاز. (جامع احکام الصغار:۱/۱۹۷). **واللہ ﷻ اعلم۔**

قرض کی کاروائی کے اخراجات کا حکم:

سوال: قرض لینے کی کاغذی کاروائی کا خرچہ قرض خواہ کے ذمہ ہے یا قرض دار کے ذمہ؟

الجواب: اصل مسئلہ احتیاج کا ہے جو ضرورت مند ہے وہ ادا کریگا، اور اس نطقہ نظر سے قرض دار کا احتیاج تو ظاہر ہے، لیکن قرض خواہ بھی ایک اعتبار سے محتاج ہے اس کا قرض وصول ہو جائے، البتہ زیادہ احتیاج قرض دار کی طرف سے ہے، اس وجہ سے کاغذی کاروائی کا خرچہ قرض دار کے ذمہ ہونا چاہئے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وأجرة الكيال وناقد الثمن على البائع أما الكيل فلا بد منه للتسليم و هو على البائع و معنى هذا إذا بيع مكايلة، وكذا أجرة الوزان والزراع والعداد، وأما النقد فالمذكور رواية ابن رستم عن محمدؒ لأن النقد يكون بعد التسليم، ألا ترى أنه يكون بعد الوزن والبائع هو

المحتاج إليه ليميز ما تعلق به حقه من غيره أوليعرف المعيب ليرده، وفي رواية ابن سماعة عنه على المشتري لأنه يحتاج إلى تسليم الجيد المقدر، والجودة تعرف بالنقد كما يعرف القدر بالوزن فيكون عليه وأجرة وزان الثمن على المشتري لما بينا أنه هو المحتاج إلى تسليم الثمن وبالوزن يتحقق التسليم. (الهداية:۲۹/۳).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۲۸/۳، الفصل السادس فيما يلزم المتعاقدين من المؤنة في تسليم المبيع والثمن).

محیط برہانی میں ہے:

ثم أجرة الوزان على المديون، فكذا أجرة الناقد، فأما إذا قبض رب الدين فقد دخل في ضمانه فإذا ادعى أنه على خلاف حقه كان النقد محتاجاً إليه ليتمكن من الرد وذلك يقع لرب الدين فيكون الأجر عليه. (المحيط البرهاني:،الفصل الثالث في قبض المبيع بإذن البائع،۲۷۱/۶)

البحر الرائق میں ہے:

و أما أجرة نقد الدين فإنه على المديون إلا إذا قبض رب الدين الدين ثم ادعى عدم النقد فالأجرة على رب الدين لأنه بالقبض دخل في ضمانه فالناقد إنما يميز ملكه ليستوفي بذلك حقاً له فالأجرة عليه. (البحر الرائق:۳۰۶/۵،كتاب البيوع۔وكذا في مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر: ۳۱/۳، دار الكتب العلمية،بيروت).

وأجرة رد العارية على المستعير لأن الرد واجب عليه لما أنه قبضه لمنفعة نفسه و الأجرة مونة الرد فتكون عليه. (الهداية:۲۸۲/۳). واللہ ﷻ اعلم۔

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرض لینے کا حکم:

سوال: کیا انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی قرضہ لے سکتے ہیں؟ کیونکہ جن کے قرضے زیادہ ہوتے ہیں گورنمنٹ ان پر کم ٹیکس لگاتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اولیٰ اور بہتر تو یہی ہے کہ ہر سودی معاملہ سے بچا جائے، لیکن اگر حکومت کی طرف سے انکم ٹیکس ظلماً بہت زیادہ لگایا جاتا ہے تو بوقتِ ضرورت دفعِ ضرر کے لیے سودی قرض کی گنجائش ہونی چاہئے۔فقہاء نے دفعِ ضرر کے لیے رشوت دینے کی بھی اجازت دی ہے۔

ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث میں ہے:

انکم ٹیکس سے بچنے اور قیمتی اشیاء خریدنے کے لیے رشوت وسود دینے کا حکم:

جواب:۔ یہ صورت بلاشبہہ جائز ہے کیونکہ اس میں مسلمان کا نفع نیز دفع ضرر ہے، قائلین عدمِ جواز کے نزدیک بھی گنجائش ہونا چاہئے کیونکہ تجارت کے ذریعہ ترقی کرنا، کسی قسم کا کوئی مال ٹرک وغیرہ خریدنا، یہ ہمارے لیے حلال ہے اور ہم کو اس کا حق حاصل ہے، ہم جب اس حق کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو ٹیکس وغیرہ کے سارے قضیے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو اگر چہ یہ صورت اضطرار کی نہیں لیکن ظلم ضرور ہے جس میں کھلا ہوا ہمارا ضرر ہے اس ظلم وضرر سے بچنے کے لیے اس طرح کی صورتیں بھی جائز ہونی چاہئے۔ (جدید فقہی مباحث:۲/۴۹۹)۔

بطورِ استیناس واستشہاد قاعدۂ فقہیہ ذکر کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

"الضرر يزال" أصلها قوله صلى الله عليه وسلم: "لا ضرر ولا ضرار"...ويبتنى على هذه القاعدة كثير من أبواب الفقه، فمن ذلك الرد بالعيب وجميع أنواع الخيارات و الحجر بسائر أنواعه على المفتى به...الخ. (الاشباه والنظائر: ١/ ٢٥٠، القاعدة الخامسة). واللہ ﷻ اعلم۔

پنشن فنڈ سے میت کا قرض ادا کرنے کا حکم:

سوال: کیا پنشن فنڈ کی حاصل شدہ رقم سے میت کا قرض ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: پنشن فنڈ سے جو مال ملتا ہے اس کا استعمال کرنا اور میت کا قرض وغیرہ ادا کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو کفایت المفتی میں ہے:

پنشن جو ملازم کو ملازمت سے سبکدوشی پر ملتی ہے جائز ہے۔ (کفایت المفتی:۸/۹۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تاخیر پر سود عائد ہونے والے قرض کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے ایک کمپنی سے اس طور پر سود لیا کہ اگر تین ماہ تک ادا نہیں کریگا تو بعد میں سود عائد کیا جائیگا، قرض دار کا ارادہ ہے کہ تین ماہ میں ادا کر دیگا تو ایسے قرضے لینے کا کیا حکم ہے؟ کیا قرض لینے والا

گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: قرض خواہ کا پختہ ارادہ ہے کہ تین ماہ میں ادا کردیگا تو اس کی گنجائش ہوگی، لیکن ایسے عقود سے بچنا اولیٰ اور بہتر ہے۔

کمپنی کا یہ معاہدہ کہ تین ماہ میں قرض ادا نہیں کیا تو اتنی فیصد رقم زائد وصول کی جائے گی، یہ سودی معاملہ ہے اور قرض شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو" البحر الرائق" میں ہے:

وما لايبطل بالشرط الفاسد القرض...بأن قال أقرضتك هذه المائة بشرط أن تخدمني شهراً مثلاً فإنه لايبطل بهذا الشرط، وذلك لأن الشروط الفاسدة من باب الربا وأنه يختص بالمبادلة المالية ، وهذه العقود كلها ليست بمعاوضة مالية فلا تؤثر فيها الشروط الفاسدة ، ذكره العيني...وفي البزازية: وتعليق القرض حرام والشرط لا يلزم .

(البحر الرائق:٦/١٨٧، باب المتفرقات من كتاب البيوع، كوئته).

وكذا في تبيين الحقائق:٤/١٣٣ـ والفتاوى البزازية على هامش الفتاوى الهندية:٤/٤٢٦).

لہذا تین ماہ کے اندر ادائیگی کی کوشش کرے اگر تین ماہ میں ادا نہ کرے تو اس پر سود دینے کا سخت گناہ ہوگا۔ فتاویٰ عثمانی میں ہے:

مقررہ مدت کے اندر اندر ادائیگی کا اہتمام ضروری ہے، تاکہ سود نہ لگے۔(فتاویٰ عثمانی:۳/۳۵۳).

واللہ تعالیٰ اعلم۔

تعیش کے لیے قرض لینے کا حکم:

سوال: بلاضرورت محض زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے اور تعیش کے لیے قرض لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: قرض لینے کی اجازت بدرجہ مجبوری ہے، محض تعیش کے لیے قرض لینے سے احتراز کرنا چاہئے۔ ملاحظہ ہو اسلامی فقہ میں ہے:

اسلامی شریعت نے شدید معاشی ضرورت یا اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے قرض لینے کی اجازت دی ہے، اب کوئی شخص فضول خرچی تعیش یا اپنی عرفی ساکھ اور مصنوعی معیارِ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے قرض لے، یا

قرض لے تو کسی مجبوری ہی سے مگر اس کی ادائیگی سے بے خبر ہو جائے یا استطاعت کے باوجود ٹال مٹول کرے تو وہ اخلاقاً بھی مجرم ہوگا، اور قانوناً بھی، یعنی آخرت میں بھی پکڑا جائے گا، اور دنیا میں بھی اس کو سزا ملنی چاہئے۔
(اسلامی فقہ: ۲/ ۴۲۹، بلاضرورت قرض لینے کی مذمت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گندم کے قرض کو رینڈ سے بدلنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کے ذمہ دس کیلو گندم قرض ہے، قرض دار نے قرض خواہ سے کہا ۵ دن کے بعد میں گندم کی جگہ ۱۰ رینڈ دے دوں گا، تو کیا یہ معاملہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب گندم کو دس رینڈ کے عوض بدلا جا رہا ہے تو دس رینڈ فوری طور پر ادا کرنا لازم ہے ورنہ افتراق عن الدین بلاعوض متحقق ہوگا اور یہ ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قوله بدارهم مقبوضة الخ، في البزازية من آخر الصرف: إذا كان له على آخر طعام أو فلوس فاشتراه من عليه بدراهم وتفرقا قبل قبض الدراهم بطل وهذا مما يحفظ فإن مستقرض الحنطة أو الشعير يتلفها ثم يطالبه المالک بها ويعجز عن الأداء فيبيعها مقرضها منه بأحد النقدين إلى أجل، وأنه فاسد لأنه افتراق عن دين بدين. (فتاوى الشامي: ۵/ ۱۶۵، فصل في القرض، سعيد).

بہشتی زیور میں ہے:

تم نے دو سیر گیہوں یا آٹا وغیرہ کچھ قرض لیا جب اس نے مانگا تو تم نے کہا اس وقت گیہوں تو نہیں ہیں اس کے بدلے تم دو آنہ پیسے لیلو اس نے کہا اچھا تو یہ پیسے اسی وقت سامنے رہتے رہتے دیدینا چاہئے، اگر الگ ہو گیا تو معاملہ باطل ہو گیا۔ (بہشتی زیور: پانچواں حصہ، ص ۳۱، قرض لینے کا بیان)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قرض میں سونے کو معیار بنانے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے کو پندرہ ہزار رینڈ بطورِ قرض دیکر کہا اس کی قیمت فی الحال ایک اونس سونا ہے، قرض واپس کرتے وقت ایک اونس سونا واپس کریں، گردش زمانہ کی وجہ سے دو سال کے بعد پندرہ ہزار

رینڈ کا ادھا اونس سونا دستیاب ہوتا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک اونس سونا ادا کرنا لازم ہے یا صرف پندرہ ہزار رینڈ ادا کریگا؟ اور اگر سونا ادا کرنے سے انکار کردے تو جبر ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء نے جوازِ قرض کے لیے مثلی ہونے کی شرط عائد کی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ واپسی میں مثل ہی ادا کیا جائے، اگر خلافِ جنس کی ادائیگی کی شرط لگائی تو یہ اگر چہ صورۃً قرض ہے لیکن حقیقۃً قرض نہیں ہے بلکہ ایک تبادلہ ہے اور اس کا حکم یہ ہے کاغذی نوٹ یعنی مروجہ کرنسی ثمن خلقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، لہذا اس کی تجارت میں بیع صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے، بنابریں ایک اونس کی واپسی کی شرط صحیح ہے اور یہ معاملہ ادھار جائز ہے، ہاں مجلس عقد میں بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ ضروری ہے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامی فرماتے ہیں:

سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين. (فتاوى الشامي:٥/ ١٨٠،باب الربا،سعيد).

وفي المبسوط للإمام السرخسيؒ: إذا اشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود...وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف. (المبسوط:١٤/ ٢٤).

وللاستزادة انظر: (المحيط البرهاني:٧/ ٢٦٨ـ والفتاوى الهندية:٣/ ٢٢٤).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

أما الذهب سواء كان تبراً أومصوغاً فقد أجمع الأئمة الأربعة على أنه لايعامل معاملة البضائع، وإنما يعمل أحكام النقود في جميع الأمور، لكن "الأوراق النقدية" قد وقع فيه خلاف بين العلماء المعاصرين، وإن كثيراً من علماء البلاد العربية جعلوها في حكم الذهب سواء بسواء، ولكن خالفتُهم في رسالتي "أحكام الأوراق النقدية" وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب في جميع الأمور، فلا تجري فيها أحكام الصرف، ولذلک يجوزعندي أن يشترى الذهب أو الفضة بالنقود، ويجوز أيضاً أن يشترى الذهب نسيئة بالأوراق النقدية ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس إذا كان ذهباً خالصاً، وأن يعرف الأجل عند العقد وقد قبل هذا الموقف معظم علماء الهند وكثيرمن باكستان ، والتفصيل

في رسالتي " أحكام الأوراق النقدية ". (فتاویٰ عثمانی:۳/۱۵۹، کتاب البیوع).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

سونا یا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً: سونے کے زیورات خرید لیے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لیے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

...وفي الهندية: قال: وروى الحسن عن أبي حنيفةؒ إذا اشترى فلوساً بدراهم وليس عند هذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم أن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منها حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية:۳/۲۲۴، الفصل الثالث في بيع الفلوس). (جدید معاملات کے شرعی احکام، جلد اول، ص۱۲۸).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

رائج نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہے، لہذا ان سے بیع ذہب وفضہ بہر کیف جائز ہے، تفاضل ونسیئہ بھی جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۶/۵۱۸۔ وکذا فی فتاویٰ حقانیہ:۶/۱۲۴).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

قرض کے جواز کے لیے مثلی ہونا شرط ہے، جن چیزوں کے مثل نہ ہو ان کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز نہیں، کیونکہ قرض میں جو چیز لی گئی ہے اس کی مثل واپس کرنا شرعاً لازم ہے۔

قال العلامة الصابوني: ونص الفقهاء على أن قرض المكيل والموزون جائز، كاستقراض الحب والشعير، والتمر والزبيب وكالاستقراض السمن والزيت، وكل ما يكال ويوزن، وأما مالا مثل له فلا يجوز إقراضه كاللآلي، والجوهرات، وهذا مذهب أبي حنيفة وأجاز الشافعية والحنابلة إقراض مالا مثله له إذا كان معروف القيمة، فيجب رد القيمة. (فقه المعاملات)

حاصل یہ ہے کہ مکیلی اور موزونی چیز کی مثل موجود ہوتے ہوئے ان کو قرض دینا جائز ہے اور جو چیزیں غیر مثلی ہیں، جن کو ذوات القیم کہا جاتا ہے ان کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں، البتہ دراہم ودنانیر اور دیگر کرنسی کو قرض

کے طور پر دینا بھی جائز ہے کیونکہ ہر ملک کی کرنسی اس ملک کے اندر ذوات الامثال ہے۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۸۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قرض میں کرنسی کو قیمت کے ساتھ مربوط کرنے کا حکم:

سوال: خالد نے بکر کو دس ہزار رینڈ بطورِ قرض دئے اور یہ شرط لگائی کہ دوسال کے بعد جب ادا کرو تو دس ہزار میں جو کمی ہوگی اس کی وجہ سے مزید ادا کروگے، یعنی مثلاً دوسال کے بعد قوتِ خرید میں کمی واقع ہوئی اور دس ہزار کے بارہ ہزار ہوگئے تو آپ پر بارہ ہزار ادا کرنا لازم ہوگا؟

الجواب: موجودہ دور میں کرنسی مستقل ثمن اصطلاحی کے حکم ہے، وہ کسی سیم و زر کے تابع نہیں ہے، اور جب مستقل ثمن کے حکم میں ہے تو جب تک رائج ہے اس میں کمی بیشی کا اعتبار نہیں، الا یہ کہ کرنسی بالکل منسوخ ہوجائے تو اور بات ہے، لہذا خالد بکر سے دوسال کے بعد اپنے دئے ہوئے فقط دس ہزار وصول کرسکتا ہے اس سے زیادہ وصول کرنے کا حقدار نہیں، یہ سود کے مشابہ ہے اور درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

رجل اشترى بالفلوس الرائجة والعدالي في زماننا شيئاً وكسدت الفلوس قبل القبض ...إلى أن قال: وإن غلا أو رخص لا يفسد العقد ولا خيار لأحدهما في ظاهر الرواية. (فتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية:٢/٢٥٣،باب الصرف).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو لم تكسد ولكنها رخصت قيمتها أو غلت لا ينفسخ البيع بالإجماع وعلى المشتري أن ينقد مثلها عدداً ولا يلتفت إلى القيمة ههنا لأن الرخص أو الغلاء لا يوجب بطلان الثمنية ألا ترى أن الدراهم قد ترخص وقد تغلو وهي على حالها أثمان...استقرض شيئاً من ذوات الأمثال وقبضه ثم انقطع عن أيدي الناس...ولولم تكسد ولكنها رخصت أو غلت فعليه رد مثل ما قبض بلا خلاف لما ذكرنا أن صفة الثمنية باقية. (بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع:٥/٢٤٢،فصل فی حكم البيع،سعيد).

فتح القدیر میں ہے:

فلو لم تكسد ولم تنقطع ولكن نقصت قيمتها قبل القبض فالبيع على حاله بالإجماع ولايتخير البائع ، وعكسه لوغلت قيمتها وازدادت فالبيع على حاله ولا يتخير المشتري ويطالب بالنقد بذلك العيار الذي كان وقت البيع. (فتح القدير:۷/۱۵۵،باب الصرف، دارالفكر).

(وهكذا في العناية على هامش فتح القدير:۷/۱۵۵،باب الصرف، دارالفكر_والكفاية :۲۷۹/۶،مكتبه رشيدية).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو لم تكسد ولكنها رخصت أو غلت لم يفسد البيع وللمشتري ما بقي من الفلوس كذا في الحاوي. (الفتاوى الهندية:۲۲۵/۳، الفصل الثالث في بيع الفلوس،و كذا في المبسوط للامام السرخسيؒ:۴۳/۱۴).

فتح المعین میں ہے:

واعلم أن تقييد الاختلاف في رد المثل أوالقيمة بالكساد يشير إلى أنها إذا غلت أو رخصت وجب ردالمثل بالاتفاق. (فتح المعين للسيدابي السعود:۶۴۱/۲، سعيد).

الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

وقيد بالكساد لأنها إذا غلت أو رخصت كان عليه رد المثل بالاتفاق كذا في النهاية.

(الجوهرة النيرة:۲۷۲/۲،باب الصرف،مداديه ملتا).

حاشیہ شرنبلالیہ میں ہے:

تنبيه : قيد بالكساد لأنها إذا غلت أو رخصت كان عليه رد المثل بالاتفاق. (غنية ذوى الاحكام في بغية درر الحكام:۲۰۶/۲، باب الصرف).

تبیین الحقائق کے حاشیہ میں ہے:

(قوله في المتن ولو كسدت الخ) وإنما قيد بالكساد احترازاً عن الرخص والغلاء لأن الإمام الإسبيجابي ذكر في شرح الطحاوي وأجمعوا أن الفلوس إذا لم تكسد ولكن غلت قيمتها أو رخصت فعليه مثل ما قبض من العدد. (حاشية العلامة شهاب الدين احمد الشلبي على تبيين الحقائق:۱۴۳/۳، كتاب الصرف، ملتان).

درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

استقراض من الفلوس الرائجة والعدالی ...وكذا كل ما يكال ويوزن لما مر أنه مضمون بمثله فلا عبرة لغلائه ورخصه. وفي كافي الحاكم، لوقال أقرضني دانق حنطة فأقرضه ربع حنطة، فعليه أن يرد مثله إلى أن قال وكذلک لوقال أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم فعليه مثلها، ولاينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها، وفي الفتاوى الهندية: استقرض حنطة فأعطى مثلها بعد ما تغير سعرها يجبر المقرض على القبول. (الدرالمختارمع فتاوی الشامی:۵/۱۶۱،۱۶۲،باب القرض، سعید).

محیط برہانی میں ہے:

إذا غلت بأن ازدادت قيمتها، فالبيع على حاله ولا يخير المشتري، وإذا انتقصت قيمتها فالبيع على حاله ويطالبه بالدراهم بذلک العنان الذي كان وقت البيع. (المحيط البرهانی:۷/۲۴۹،الفصل الرابع فی المسائل التی تعلق بالثمن).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

نوٹ بنانے والوں نے جو بھی دھوکہ بازی کی ہو اس کے ذمہ دار وہ ہیں، جن سے نوٹ قرض لیا ہے اس سے نوٹ ہی واپس لینے کا حق ہے، اگر سو کا نوٹ لیا تھا تو سو کا نوٹ واپس کردے، بری الذمہ ہو جائے گا، اس کی گرانی سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

فتاویٰ محمودیہ کی تعلیق میں ہے:

سئلت عن رجل أقرض آخر مقداراً من الريال المجيدي وقت رواجه بثلاثين قرشاً، ثم رد المستقرض له مثل المقدار الذي استقرضه منه بعد أن نزل إلى عشرين قرشاً، فامتنع المقرض من قبوله، وطلب منه صرفها على سعر ثلاثين قرشاً، فهل ليس له ذلک ؟ فالجواب أنه ليس له الامتناع من قبول مثل ما دفع...وفي نتيجة الفتاوىٰ ما نصه: والمقبوض على وجه القرض مضمون بمثله ، وفيها نقلاً عن جامع الفصولين: والواجب في القرض ردالمثل . (الفتاوى الكاملية ،ص۹۲،باب القرض مطلب الواجب فی القرض ردالمثل، مكتبة حقانية پشاور)۔(فتاویٰ محمودیہ مع تعلیقاتها:۱۶/۴۰۷،جامعہ فاروقیہ).

اشکال اور جواب:

اشکال: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ موجودہ کرنسی کی کمی بیشی کا اعتبار ہونا چاہئے، کیونکہ آئے دن کرنسی میں انحطاط ہوتا رہتا ہے، اگر ہم اعتبار نہیں کرتے تو قرض خواہوں کا نقصان ہوگا، اور اس میں سود کی کوئی بات نہیں ہے اس لیے کہ دو سال پہلے جو کمی واقع ہوئی تھی اس کی تلافی کرنا ہے۔ اور اپنی تائید میں علامہ شامیؒ کی درجِ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں۔

وفي البزازية عن المنتقى غلت الفلوس أو رخصت فعند الإمام الأول والثاني، أولاً ليس عليه غيرها وقال الثاني ثانياً عليه قيمتها من الدراهم يوم البيع والقبض وعليه الفتوىٰ، وهكذا في الذخيرة والخلاصة عن المنتقىٰ. (فتاوی الشامی:٤/٥٣٣، کتاب البیوع، مطلب فی احکام النقود، سعید). اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: (۱) اس کا جواب یہ ہے کہ قرض ایک تبرع اور احسان ہے، لہٰذا ثواب کی امید رکھتے ہوئے دی ہوئی رقم کے بقدر ہی واپس لینا چاہئے زیادہ لینے کی گنجائش نہیں ہے، زیادہ وصول کرنے میں ربا متحقق ہوگا، شریعت کا مقصد یہ ہے کہ قرض پر کسی قسم کا نفع نہ لیا جائے، اور جہاں تک علامہ شامیؒ کی عبارت کا تعلق ہے تو بزازیہ سے بحوالہ منتقیٰ نقل کی ہے اور منتقیٰ حاکم شہید کی کتاب ہے جس میں مسائل نوادر ہیں، اور قاضیخانؒ کی درج کردہ عبارت مذہب کی ظاہر الروایہ ہے، جو اصولِ مسلّمہ عند الشرع کے عین مطابق ہے، لہٰذا اسی کو ترجیح حاصل ہوگی۔ ملاحظہ ہو رسم المفتی میں ہے: **وظاهر المروي ليس يعدل عنه إلى خلافه إذ ينقل.**

(رسم المفتی:٢٨).

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ منتقیٰ سے خلاصہ، بزازیہ، ذخیرہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور بزازیہ سے علامہ شامیؒ، ابن نجیم مصریؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے جب کہ قاضیخانؒ اور قاضی اسبیجابیؒ اور دیگر شراح اور اہل فتاویٰ جن کی عبارات مذکور ہوئیں انہوں نے کرنسی کی قوتِ خرید کا اعتبار نہ کرتے ہوئے فقط مثل ہی کو واجب اور لازم کیا ہیں۔ مزید ملاحظہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وفي البزازية معزياً إلى المنتقىٰ...وهكذا في الذخيرة والخلاصة بالعزو إلى المنتقىٰ وفي فتاوىٰ قاضيخان يلزمه المثل وهكذا ذكر الإسبيجابي قال: ولاينظر إلى القيمة.

(البحر الرائق:٦/٢٠٢، کتاب الصرف، کوئٹة).

بحوث فی قضایافقہیۃ معاصرۃ میں ہے:

أما ربط القروض وسائر الديون بقائمة الأسعار، فالمقصود منه أن لايرد المستقرض إلى المقرض مبلغ قرضه فحسب، بل يضيف إليه قدراً زائداً بنسبة الزيادة في قائمة الأسعار...فلو ألزمنا المقترض أن يدفع إليه ماقبض منه، لم يكن ذلك إلا إكمال المالية المقترضة ...وليس زيادة على المالية المقترضة ، فينبغي أن لاتعتبر هذه الزيادة من الربا الحرام شرعاً.

لكن الحق أن هذا الدليل لاينطبق على القواعد الشرعية بحال من الأحوال، لأن القروض يجب فى الشرعية الإسلامية أن تقضى بأمثالها، وهذا أمر لايختلف فيه اثنان، ...فبقي الآن تعيين المثلية ، فالسوال الأساسي هنا: هل يجب أن تتحقق هذه المثلية فى القدر (أى الكيل ، والوزن ، والعدد) أو فى القيمة والمالية؟ والذي يتحقق من النظر في دلائل القرآن والسنة ومشاهدة معاملات الناس، أن المثلية المطلوبة فى القرض هى المثلية فى المقدار والكمية، دون المثلية فى القيمة والمالية . (بحوث فى قضايا معاصرة:۱/۱۷۳،۱۷٤).

(۳) جب قاضیخانؒ اور دیگر اہل فتاویٰ میں تعارض ہوتو علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں فرمایا کہ قاضیخانؒ کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی میں ہے:

وسابق الأقوال فى الخانية .أى أن أول الأقوال الواقعة في فتاوى الإمام قاضي خان له مزية على غيره فى الرجحان لأنه قال في أول الفتاوىٰ: وفيماكثرت فيه الأقاويل من المتأخرين اختصرت على قول أو قولين وقدمت ما هو الأظهر وأفتتحت بما هو الأشهر إجابة للطالبين وتيسيراً على الراغبين . (شرح عقود رسم المفتى،ص۳۱،وفتاوىٰ قاضيخان على هامش الهندية:۱/۲).

علامہ قاسم بن قطلوبغا فرماتے ہیں:

وهذا ما تيسر على مختصر القدوري مع زيادات نص على تصحيحها القاضى الإمام فخر الدين قاضي خان في ''فتاواه'' فإنه من أحق من يعتمد على تصحيحه. (مقدمة التصحيح

والترجیح،ص ١٣٤).

(۴) حاکم شہیدؒ کی دوسری کتاب ''الکافی'' ہے جس میں امام محمدؒ کی کتب ستہ یعنی ظاہر الروایہ کو جمع کیا ہے اس میں کرنسی کی قوتِ خرید کا اعتبار نہیں کیا اور فقط مثل واجب قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ نے کافی سے نقل کیا ہے:

وفي كافي الحاكم، لو قال أقرضني دانق حنطة فأقرضه ربع حنطة، فعليه أن يرد مثله إلى أن قال وكذلك لو قال أقرضني عشرة دراهم غلة بدينار، فأعطاه عشرة دراهم فعليه مثلها، ولا ينظر إلى غلاء الدراهم ولا إلى رخصها. (فتاوى الشامي:٥/١٦١، ١٦٢، باب القرض، سعيد).

اور جب حاکم شہیدؒ کی کتاب ''الکافی'' اور ''المنتقی'' دونوں میں تعارض ہو تو الکافی کی عبارت کو ترجیح دی جائیگی، جب کہ اصولِ مسلّمہ عند الشرع کے مخالف نہ ہو اور نوادر کا درجہ بعد کا ہے، یہی مشائخ احناف کا طریقہ کار ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قال في فتح القدير وغيره إن كتاب الكافي هو جمع كلام محمدؒ في كتبه الست التي هي كتب ظاهر الرواية انتهى، وفي شرح الأشباه للعلامة إبراهيم البيري اعلم أن من كتب مسائل الأصول كتاب الكافي للحاكم الشهيد وهو كتاب معتمد في نقل المذهب شرحه جماعة من المشايخ منهم شمس الأئمة السرخسيؒ. (شرح عقود رسم المفتي:١٣).

(۵) امام ابو یوسفؒ کا یہ مذہب ان فلوسِ نافقہ کے بارے میں ہے جو نقدین سے مربوط ہو لیکن آج کل کرنسی مستقل ثمن اصطلاحی کے حکم میں ہے وہ کسی سے مربوط اور کسی کے تابع نہیں ہے۔

ملاحظہ مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

فاستدل بعض الاقتصاديين على أنه إذا وجب الدين في صورة الفلوس، فالواجب أداء قيمتها إذا طرأ عليها الغلاء والرخص...ولكن هذا الاستدلال غير صحيح، والحقيقة أن مذهب أبي يوسفؒ لا علاقة له بفكرة ربط الديون بقائمة الأسعار...والواقع أن الفلوس في الأزمنة المتقدمة كانت مرتبطة بنقود الذهب والفضة، تقوم على أساسها، وتعتبر كالفكة للنقود الذهبية والفضية، فكانت عشرة فلوس مثلاً تعادل درهماً واحداً من الفضة، فكان الفلس الواحد يعتبر عشر الدرهم الفضي، ولكن قيمة الفلس هذه لم تكن

مقدرة على أساس قيمتها الذاتية، وإنما كانت قيمة رمزية اصطلح عليها الناس، فكان من الممكن أن يتغير هذا الاصطلاح ...

والذي يظهر لي ـ والله اعلم ـ أن أساس الخلاف بين أبي يوسفؒ والجمهور مبني على اختلافهم في تكييف هذه الفلوس، فيبدو أن جمهور الفقهاء اعتبروا الفلوس أثماناً اصطلاحية مستقلة غير مربوطة بالدراهم والدنانير ارتباطاً دائماً، فمن اقترض عدداً من الفلوس، فإنه يؤدي نفس العدد دون نظر إلى قيمتها بالنسبة للدراهم، وأما أبويوسفؒ فاعتبر الفلوس أجزاء اصطلاحية كالفكة للدرهم، فالمقصود بالاقتراض عنده ليس عدد الفلوس وإنما المقصود اقتراض أجزاء للدرهم بمثلها ذلک العدد من الفلوس ...

فالحاصل أن قول الإمام أبي يوسفؒ إنما يتأتى في فلوس مرتبطة بثمن آخر ارتباطاً دائماً يجعلها كالأجزاء والفكة لذلک الثمن، أما النقود الورقية اليوم، فليست مرتبطة بثمن آخر ولا معتبرة كالأجزاء والفكة له، وإنما هي أثمان اصطلاحية مستقلة. (بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة:١/١٨٦،١٨٧،١٨٨).

(۲) ہمارے علماء نے سودی معاملے کی بدبو سے دوری اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے حتی کہ شبہ ربا سے بھی منع کیا ہے، اور صرف ربا کے اندیشہ کی وجہ سے بعض معاملات سے روکا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

قال ومشايخنا لم يفتوا بجواز ذلک فی العدالی والغطارفة لأنها أعز الأموال في ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربا كذا فی الهداية والتبيين. (الفتاوی الهندية:٣/١٠٦).

ہدایہ مع فتح القدیر میں ہے:

(ومشايخنا) يعني مشايخ ماوراء النهر من بخارى وسمرقند (لم يفتوا بجواز ذلک) أی بيعها بجنسها متفاضلاً (فی العدالی والغطارفة) مع أن الغش فيها أكثر من الفضة (لأنها أعز الأموال في ديارنا، فلو أبيح التفاضل فيها ينفتح باب الربا) الصريح، فإن الناس حينئذٍ يعتادون التفاضل فی الأموال النفيسة فيتدرجون إلى ذلک فی النقود الخالصة فمنع ذلک حسماً لمادة الفساد. (الهداية مع فتح القدير:٧/١٥٣، باب الصرف، دار الفكر).

(۷) یہ مسئلہ غصب کی طرح ہے، اگر غاصب نے کوئی چیز غصب کرلی پھر اس چیز کی قیمت کم ہوگئی اور جب واپس کررہا ہے تو اسی چیز کو واپس کرنا ضروری ہے اس چیز کی قیمت میں کمی بیشی کا اعتبار نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

ولو وجده (المغصوب) في بلد الغصب وانتقص السعر يأخذ العين لا القيمة يوم الغصب. (فتاوى الشامي:٦/١٨٢، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

بخلاف تراجع السعر إذا رد فی مكان الغصب لأنه عبارة عن فتور الرغبات دون فوات الجزء. (الهداية:٣/٣٧٥).

وللاستزادة انظر: (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ:۱/۱۷۳-۱۹۳، وجدید فقہی مباحث:۲، کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت، وفتاویٰ محمودیہ مع التعلیقات:۱۶/۴۰۵-۴۰۷، جامعہ فاروقیہ). **واللہ ﷻ اعلم۔**

قرض میں عمدہ چیز واپس کرنے کی شرط کا حکم:

سوال: زید نے عمرو کو دس کیلو معمولی درجہ کے گندم بطورِ قرض دئے اور اس سے کہا کہ ایک ماہ کے بعد قرض واپس کروگے تو عمدہ اور اعلیٰ درجے کے گندم دوگے، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اموالِ ربویہ میں باہمی تبادلہ کے وقت نقد اور برابری ضروری ہے، نیز اعلیٰ اور ادنی کا بھی اعتبار نہیں، لیکن قرض کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے اسی وجہ سے نسیئہ ہونے کے باوجود شریعت نے اس کو جائز قرار دیا ہے، البتہ مماثلت اس میں بھی لازم اور ضروری ہے، لہذا واپسی کے وقت کمیت اور کیفیت میں مساوات ضروری ہے، اس میں عمدہ واپس کرنے کی شرط نفع حاصل کرنے کے مترادف ہے جو کہ ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ولا يجوز قرض جر نفعاً بأن أقرضه دراهم مكسورة بشرط رد صحيحة أو أقرضه طعاماً في مكان بشرط رده في مكان آخر. (البحر الرائق:٦/١٢٢، تتمة فی مسائل القرض، كوئتة).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما (الشرائط) الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لايكون فيه جرمنفعة فإن كان

لم يجز نحو ما إذا أقرضه دراهم غلة على أن يرد عليه صحاحاً أو أقرضه وشرط شرطاً له فيه منفعة لماروي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه نهى عن قرض جرنفعاً ولأن الزيادة تشبه الربا لأنها فضل لايقابله عوض والتحرز عن حقيقية الربا وعن شبهة الربا واجب، هذا إذا كانت الزيادة مشروطة في القرض. (بدائع الصنائع: ۳۹۵/۷، سعيد).

وفي ردالمحتار : قوله كل قرض جرنفعاً حرام ، أي إذا كان مشروطاً .

(ردالمحتار:۱٦٥/٥،سعيد).

اعلاء السنن میں ہے:

لا نزاع في حرمة الفضل المشروط في القرض ، سواء كان وصفاً أو قدراً. (اعلاء السنن:۱٤/۵۲۱،ادارة القرآن).

عطر ہدایہ میں ہے:

ہر ایسا قرض جس میں نفع مشروط ہو رہا ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كل قرض جر نفعاً فهو ربا، یعنی ہر وہ قرض جس میں نفع لیا جائے سود ہے۔ (عطر ہدایہ ص۲۹۳).

و للاستزادة انظر : (الفتاوى الهندية:۲۰۲/۳. ومرقات المفاتيح: ۹۹/٦. واعلاء السنن: ۵۲۱/۱۴. والفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۲۲۲/۴. وفتاوى محموديه: ۴۱۳/۱٦، جامعه فاروقيه. جديد معاملات كے شرعي احكام: ۱۸۴/۱. كتاب الفتاوى: ۳۷۳/۵). واللہ ﷻ اعلم۔

قرض کی ادائیگی میں تاخیر پر مالی جرمانے کا حکم:

سوال: جلدِ رابع میں آپ نے لکھا ہے کہ بعض علماء تعزیر بالمال کو جائز سمجھتے ہیں، اوراس کے کافی دلائل لکھے گئے ہیں، اب یہ مسئلہ دریافت کرنا ہے کہ اگر کوئی مدیون یا مستقرض قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے اوراس پر ایک لاکھ کا قرضہ ہے اور قرضہ کی اجل یکم دسمبر پوری ہو چکی تو کیا قرض کی تاخیر کی وجہ سے اس پر مالی جرمانہ لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً دو ماہ کی تاخیر پر دو ہزار اور تین ماہ کی تاخیر پر تین ہزار دینے پڑیں گے۔ کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ صورت بالکل ناجائز ہے، ایک لاکھ قرض کی جگہ ایک لاکھ دو ہزار وصول کرنا جائز نہیں، اس

کو قرآنی ربا کہتے ہیں کہ اجل کے بڑھنے سے دین اور قرض بڑھ جاتا ہے یعنی قرض پر جرمانہ لگانا ناجائز ہے۔ ہاں کسی نامناسب فعل پر جرمانہ لگانے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے ایک جماعت کے ہاں یہ جرمانہ درست ہے اس کی تفصیل فتاویٰ دار العلوم زکریا جلد چہارم میں گزر چکی ہے۔

نیز اجل کی بیع اور اس کا ثمن وصول کرنا بھی ناجائز ہے۔ (الهداية:٣/٧٤).

وكذا في التبيين : لأن الأجل ليس بمال متقوم فلايقابله شيء من الثمن . (تبيين الحقائق:٤/٧٨).

والمبسوط للإمام السرخسيؒ: فإن مبادلة الأجل بالمال ربا (ألا ترى) أن الشرع حرم ربا النساء وليس ذلك إلا شبهة مبادلة المال بالأجل فحقيقة ذلك يكون رباً حراماً أولىٰ. (المبسوط :٢١/٣١).

نیز جاہلیت کے زمانے میں اجل کے بڑھنے کے ساتھ رقم بڑھ جاتی تھی۔

وفي تكملة فتح الملهم : ربا النسيئة : وقد عرفه الإمام أبوبكر الجصاص بقوله : هو القرض المشروط فيه الأجل ، وزيادة مال على المستقرض...وكان هذا الربا محرماً في سائر الأديان السماوية . أخرج ابن جرير عن ابن جريج قال: كانت بنوعمروبن عميربن عوف يأخذون الربا من بني المغيرة ، وكانت بنوالمغيرة يربون لهم في الجاهلية فجاء الإسلام ولهم عليهم مال كثير. وقد أخرج ابن أبي حاتم والشافعي عن عمروبن الأحوص أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ألا أن كل ربا كان في الجاهلية موضوع عنكم كله لكم رؤوس أموالكم لاتظلمون ولاتظلمون. (تكملة فتح الملهم:١/٥٦٧،٥٦٨). واللہ تعالیٰ اعلم۔

مودَع المدیون سے قرض وصول کرنے کا حکم:

سوال: زید کے ذمے عمر کا قرضہ ہے زید باوجود استطاعت کے ادا نہیں کر رہا ہے زید مدیون کی دکان میں ایک ملازم اور زید کا بیٹا ہے کیا اس ملازم یا بیٹے کو یہ حق حاصل ہے کہ زید کی دکان سے قرض کی مقدار یا اس سے کم کوئی چیز یا رقم عمر قرض خواہ کو دیدے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عمر زید سے یا زید کے مودَع سے خود دین کی مقدار یا اس سے کم وصول کرسکتا ہے لیکن زید

کے ملازم اور بیٹے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اصل مالک یعنی مدیون کے مال میں سے دائن یا مقرض کو دیدے۔
ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

كما إذا كانت له ألف درهم وديعة عند إنسان وعليه ألف لغيره فلغريمه أن يأخذه إذا ظفر به وليس للمودَع أن يدفعه إليه. (الهداية:۳/۲۷۶،كتاب الوديعة).

شرح مجلّہ میں ہے:

وأما إذا كان مطلوب الدائن من جنس الوديعة فللدائن المرقوم عند ظفره أن يأخذ من المستودع مقداراً كافياً لمطلوبه، وإن كان إعطاء المستودع غيرجائز، ولا يلزم المستودع الضمان في هذه الحالة. (دررالحكام شرح مجلة الاحكام:۲/۲۷۰).

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مدیون سے مال وصول نہیں ہوسکتا تو اس کے مودَع سے وصول کرسکتا ہے لیکن مدیون کے مودَع کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بقدرِ دین دائن کو دیدے، یاد رہے کہ دکان میں بیٹا یا معاون ہوگا یا اجیر ہوگا اور اجیر خاص مودَع کی طرح ہے، **كما هو المصرح في كتاب الإجارة.** (الهداية:۳/۳۱۰،تحت باب ضمان الاجير).

یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ مودَع کے لیے دینا جائز نہیں ہے لیکن اگر مودَع نے دیدیا تو تاوان آئیگا یا نہیں اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں کہ مودَع ضامن ہوگا، اور صاحبِ فتاویٰ ولوالجیہ کی عبارت سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ اور علامہ بدرالدین صاحبِ جامع الفصولین نے دو قول نقل کیے ہیں، اور فتاویٰ ہندیہ میں عدمِ ضمان والے قول کو مختار کہا گیا ہے، اور شارح مجلّہ نے بھی یہی نقل کیا ہے۔
ملاحظہ ہو علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

ولو قضى المودَع بها دين المودِع ضمن على الصحيح. (الاشباه والنظائر:۲/۴۰۷،الفن الثاني الفوائد).

فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے:

رجل له عند رجل ألف درهم وديعة، ولرجل على المودِع ألف درهم دين، فقضى المودَع دينه، مما عنده من الوديعة بغير إذن المودِع، فهو بالخيار إن شاء ضمن المودَع، وأخذ وديعته، وسلم الألف للآخذ، وليس للمودَع أن يرجع به على أحد لأنه متبرع بقضاء

دينـه عنـه، وإن شـاء أجاز القضاء، ولاشيء له على المودَع. (الفتاوى الولوالجية:٤/٩٣،الفصل الخامس فى المسائل المتفرقة).

وفـي جـامـع الـفـصـولـيـن: والمودَع لوقضى دين ربها والدين من جنس الوديعة قيل ضمن وقيل لا. (جامع الفصولين:٢/١٥٢).

(وكذا فى مجمع الضمانات: ١/٢١٩، الفصل الثانى فيمن يضمن المودع بالدفع اليه).

وفي الفتاوى الهندية: المودَع إذا قضى دين المودِع من مال الوديعة يضمن وإن كان مـن جـنـس الـوديعة قيل: لا يضمن وهو المختار عند البعض كذا في خزانة المفتين. (الفتاوى الهندية:٤/٣٥٨).

(وكـذا فـى شـرح الـمـجلة لمحمد خالد الاتاسى :٣/٢٧٣، المادة:٧٩٣ـ ودرر الحكام شرح مجلة الاحكام لعلى حيدر:٢/٢٧١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مدیون کا دائن کو ثالث کے حوالہ کرنے کا حکم:

سوال: بکر خالد کا مقروض ہے اور خالد کے ذمہ عمر کا قرضہ ہے۔ خالد نے عمر سے کہا مجھ سے قرضہ نہ لو بلکہ بکر سے لو وہ میرا مقروض ہے۔ بکر نے منظور کرلیا۔ اب عمر کہتا ہے کہ میں تو خالد سے اپنا قرضہ وصول کرونگا اور خالد دینے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نے بکر سے وصول کرنے کو قبول کرلیا تھا۔ اب خالد کا انکار صحیح ہے یا نہیں؟ حاصل یہ ہے کہ مدیون اگر اپنا دین اپنے مدیون کے حوالے کردے تو کیا دائن مدیون سے لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جب مدیون اپنے دائن کو کسی ثالث کر حوالہ کردے اور ثالث اس کو قبول بھی کرلے تو اب دائن اپنے مدیون سے مطالبہ نہیں کرسکتا۔ لہٰذا بصورت مسئولہ عمر اپنے مدیون المدیون بکر جو ثالث ہے اس سے وصول کریگا خالد سے مطالبہ نہیں کرے گا الا یہ کہ رقم ڈوب جائے تو پھر مدیون سے مطالبہ کرسکتا ہے مثلاً ثالث مرجائے اور کچھ مال واسباب موجود نہ ہوں یا حوالہ سے انکار کردے اور حوالہ پر گواہ بھی موجود نہ ہو۔ ملاحظہ فرمائیں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

قـال وإذا تـمت الحوالة بالقبول برئ المحيل من الدين قال في الفتح هذا قول طائفة

من المشائخ وهو الصحيح من المذهب... ولايرجع المحتال على المحيل إلاأن يتوى حقه ... والتوى عند أبي حنيفةؒ أحد الأمرين إما أن يجحد الحوالة ويحلف ولابينة له عليه أو يموت مفلساً لأن العجز عن الوصول يتحقق بكل منهما وهو التوى في الحقيقة. (الهداية مع فتح القدير:٦ /٣٤٧). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ :

﴿إن اللّٰہ یأمرکم أن تؤدوا الأمانات إلی أھلھا﴾

(سورۃ النساء،الآیۃ:).

وقال تعالیٰ :

﴿فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون، الذین ھم یرآء ون ویمنعون الماعون﴾

(سورۃ الماعون،الآیۃ:).

باب العاریۃ والامانۃ

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :

”أد الأمانۃ إلی من ائتمنک ولاتخن من خانک“.

(رواہ ابوداود).

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :

الأمانۃ تجر الرزق والخیانۃ تجر الفقر.

(مسند الشھاب).

عن عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ،

عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال:

”لیس علی المستعیر غیر المغل ضمان،

ولا علی المستودع غیر المغل ضمان .

(رواہ الدارقطنی).

عاریت اور امانت کے احکام

مدت سے قبل شی مستعار واپس لینے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے دوسرے کو زمین بطورِ عاریت تین سال کے لیے دیدی تا کہ اس میں اپنے پودے، درخت وغیرہ لگادے، پھر ایک سال کے بعد زمین واپس لینا چاہتا ہے، مستعیر کہتا ہے کہ اس میں میرا نقصان ہے، اب کیا کرنا چاہئے؟ کیا پودے اکھاڑنے کے بعد مالک پر تاوان آئیگا یا نہیں؟ اور اگر آئیگا تو کتنا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مدت ختم ہونے سے قبل بھی معیر کو اپنی زمین خالی کرانے کا اختیار رہوگا، لیکن اس طرح کرنا مکروہ ہے، ہاں قبل از وقت خالی کرانے کا جو نقصان مستعیر کو ہوگا معیر اس کا ذمہ دار ہوگا، اور اس کا تاوان ادا کریگا، یعنی معیر نے تین سال کے لیے باغ لگانے کے لیے زمین دی، اور ایک ہی سال میں واپسی چاہتا ہے تو مستعیر کو کہا جائیگا کہ اپنا باغ کاٹ لے، اور زمین خالی کردے، اب اگر باغ تین سال تک رہتا تو اس کی قیمت مثلاً پانچ ہزار رینڈ ہوتی اور جس وقت خالی کررہا ہے اس وقت اس کی قیمت مثلاً دو ہزار رینڈ ہے تو یہ تین ہزار رینڈ نقصان کا تاوان معیر مستعیر کو ادا کریگا، اور اگر معیر درخت بھی لینا چاہے اور مستعیر دینا چاہے تو اس وقت جو قیمت ہوگی وہ پوری قیمت ادا کی جائیگی۔

اور اگر مستعیر کے درخت اکھاڑنے سے زمین کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے تو زمین کے مالک کو اختیار ہے اگر وہ چاہے تو درخت اپنے لیے رکھ لے اور پوری قیمت ادا کردے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وإن وقَّت العارية فرجع قبله كلفه قلعهما وضمن المعير للمستعيرما نقص البناء والغرس بالقلع بأن يقوم قائماً إلى المدة المضروبة وتعتبرالقيمة يوم الاسترداد، بحر. وفي رد المحتار: (قوله مانقص البناء) هذا مشى عليه فى الكنز والهداية، وذكر فى البحر عن المحيط ضمان القيمة قائماً إلا أن يقلعه المستعير ولا ضرر فإن ضر فضمان القيمة مقلوعاً، وعبارة المجمع: وألزمناه الضمان فقيل ما نقصهما القلع، وقيل قيمتهما ويملكهما، وقيل إن ضر يخير المالك يعنى المعير يخير بين ضمان ما نقص وضمان القيمة، ومثله في درر البحار والمواهب والملتقى وكلهم قدموا الاول وبعضهم جزم به وعبر عن غيره بقيل فلذا اختاره المصنف وهي رواية القدوري والثاني رواية الحاكم الشهيد كما في غرر الأفكار. (قوله قائماً) فلو قيمته قائماً فى الحال أربعة وفى المآل عشرة ضمن ستة، شرح الملتقى.

(الدرالمختارمع ردالمحتار:۵/ ٦٨١،سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

وإن كان وقَّت العارية ورجع قبل الوقت، صح رجوعه، لما ذكرنا (أى أن العارية غيرلازمة) ولكنه يكره، لما فيه من خلف الوعد، وضمن المعيرمانقص البناء والغرس بالقلع لأنه مغرور من جهته حيث وقَّت له، فالظاهر هوالوفاء بالوعد فيرجع عليه دفعاً للضرر عن نفسه، كذا ذكره القدوري فى المختصر. وذكرالحاكم الشهيد أنه يضمن رب الأرض للمستعير قيمة غرسه وبنائه، ويكونان له إلا أن يشاء المستعير أن يرفعهما، ولايضمنه قيمتهما فيكون له ذلك، لأنه ملكه، قالوا: إذاكان فى القلع ضرربالأرض فالخيار إلى رب الأرض، لأنه صاحب أصل والمستعيرصاحب تبع، والترجيح بالأصل. (كذافى الهداية).

قلت: وحاصل ما ذكروه أن هذه المسئلة على أربعة أوجه...الثالثة: أن تكون موقتة والقلع لايضر، فالمستعير يؤمر بالقلع ويضمن له المعيرمانقص البناء والغرس، على ما وضحته هذه المادة، وهذه رواية القدوري وعليها مشت المجلة تبعاً للهداية و الكنز و غيرهما، وأما على رواية الحاكم الشهيد، فالمعير يتملكهما بقيمتهما قائمين، إلا أن يشاء المستعير قلعهما، ولايضمن المعير شيئاً.

الرابعة : أن تكون موقتة والقلع يضر بالأرض، فالمعير مخير بين أن يتملكهما بقيمتهما قائمين أو يأمر المستعير بالقلع ويضمن نقص البناء والغرس، على ماتبين في متن هذه المادة. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی،۳/۳۳۵،المادة : ۸۳۱).

تنبیہ:۔ یہ مسئلہ مکان اور درخت کا ہے، لیکن اگر کسی کو کھیت جوتنے، بونے کے لیے عاریۃً دیا تو اس میں مدت مقرر ہو یا نہ ہو، جب تک فصل کٹ نہیں جاتی معیر خالی نہیں کرا سکتا۔ ہاں اجرتِ مثل دی جائیگی۔

شرح مجلّہ میں ہے:

إذا كانت إعارة الأرض للزرع سواء كانت موقتة أو غير موقتة ليس للمستعير أن يرجع بالإعارة ويسترد الأرض قبل وقت الحصاد .

عبارة الكنز وغيره:ولو استعارها ليزرعها، لم تؤخذ منه حتى يحصد الزرع استحساناً وقّت أو لم يوقّت . قال الزيلعيّ: فيترك بأجر المثل، لأن فيه مراعاة الحقين، كما في الإجارة إذا انقضت المدة والزرع لم يدرك. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی:۳/۳۳۷،المادة : ۸۳۲) . واللہ ﷻ اعلم۔

مستعار مکان واپس لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے عبادت خانے کے لیے مکان دیدیا، جماعت کے حضرات نے اس میں نماز پڑھنا شروع کردیا، ایک صاحبِ خیر شخص نے اس کو عبادت خانہ سمجھ کر اس میں ایک کمرہ بنوادیا بعد میں جماعت والوں نے اپنی مسجد بنائی، اور مالک مکان نے اس مکان کو فروخت کردیا، اب وہ صاحبِ خیر شخص جس نے کمرہ بنوایا تھا وہ کمرے کی قیمت کا طلب گار ہے تاکہ اس رقم کو کسی اور کارِ خیر میں لگائے، اب شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مالکِ مکان نے اپنا مکان عبادت خانہ کے لیے عاریت پر دیا تھا اور کوئی مدت متعین نہیں کی تھی لہذا مالک اپنا مکان جب چاہے واپس لے سکتا ہے، اور کمرہ بنانے والے سے کہا جائیگا کہ کمرہ گرا کر مکان فارغ کردے، پھر اگر اکھاڑنے کی وجہ سے مکان کو نقصان نہیں پہونچتا ہے تو معیر کمرہ بنانے والے کو کمرہ کے گرانے سے نہیں روک سکتا، ہاں اگر مکان یا زمین کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے تو معیر کو اختیار ہے کہ کمرہ رہنے دے اور مقلوعاً ملبے کی قیمت ادا کردے، اور اگر چاہے اکھاڑنے کا حکم دیدے۔

الغرض صورتِ مسئولہ میں چونکہ معیر نے مکان فروخت کردیا ہے، لہٰذا مقلوعاً ملبے کی قیمت ادا کردے، تاکہ وہ صاحبِ خیر شخص اس کی قیمت کسی کارِ خیر میں صرف کرلے۔

شرح مجلّہ میں ہے:

استعارة الأرض لغرس الأشجار والبناء عليها صحيحة، لكن للمعير أن يرجع بالإعارة متى شاء، فإذا رجع لزم المستعير قلع الأشجار و رفع البناء ... لأن العارية غير لازمة، فكان له أن يرجع أي وقت شاء، وإذا صح الرجوع بقي المستعير شاغلاً أرض المعير، فيكلف تفريغها، ثم إن لم يكن وقّت العارية، فلا ضمان عليه، لأن المستعير مغتر غير مغرور، حيث اعتمد إطلاق العقد من غير أن يسبق منه الوعد...

قلت: وحاصل ما ذكروه أن هذه المسئلة على أربعة أوجه، لأنها إما غير موقتة أو موقتة، وعلى كل فإما أن لايضر القلع بالأرض، أو يضر، ففى الصورة الأولىٰ، وهي ما إذا كانت غير موقتة والقلع لايضر، يؤمر المستعير بالقلع ولايضمن له المعير شيئاً، لأن المستعير مغتر لا مغرور.

الثانية: أن تكون غير موقتة والقلع يضر، فالمعير مخير بين أن يتملك البناء والغرس بقيمتهما مقلوعين، وبين أن يكلف القلع ولاضمان عليه. (شرح المجلة، لمحمد خالد الاتاسى، ۳/۳۳٦، المادة: ۸۳۱).

مزید ملاحظہ ہو: (شرح العناية: ۹/۱٤، على هامش فتح القدير، دارالفكر۔ والدر المختار مع ردالمحتار: ٦/۲٤۸، سعيد۔ والفتاوى الهندية: ٤/۳۷۰). واللہ ﷻ اعلم۔

قبل از مدت زمین مستعار واپس لینے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو مکان بنانے کے لیے بطورِ عاریت ایک زمین دی، اور یہ کہا کہ بیس سال تک تم اس کو استعمال کرو، عمر نے کچا مکان بنایا، تین سال کے بعد زید عمر سے ناراض ہوگیا اور اس کو نکالنا چاہتا ہے، عمر اس کو دھوکہ سمجھتا ہے، اب اگر عمر اپنا مکان گرادے تو زید سے نقصان لے سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: عمر زید سے نقصان لے سکتا ہے، فرض کریں اگر کھڑی عمارت بیس ہزار کی ہے اور گرانے

کے بعد اس کا ملبہ دس ہزار کا ہے، دونوں کے درمیان دس ہزار کا فرق ہے، یہ دس ہزار عمر زید سے لے سکتا ہے، ہاں اگر زمین فصل بونے کے لیے دی اور وقتِ معین سے پہلے مانگنا شروع کیا تو فصل کو پکنے تک رہنے دیں گے، اور تقاضا اور پکنے کے درمیان جتنے دن ہیں ان کا کرایہ زید عمر سے وصول کر سکتا ہے۔ کذا فی کتب الفقہ۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

مستعیر پر تاوان کا حکم:

سوال: ایک طالبِ علم نے دوسرے طالبِ علم سے اس کی اجازت سے موبائل بغرض استعمال لیا پھر اسی رات کو واپس کرنے کے لیے وہ طالبِ علم پہونچا لیکن موبائل کا مالک سو رہا تھا، دوسرے دن مدرسہ میں تلاشی ہوئی اور اس موبائل کو توڑ دیا گیا، اب وہ معیر طالبِ علم اپنے موبائل کی قیمت مستعیر سے طلب کرتا ہے، اب شرعی حکم کیا ہے آیا قیمت ادا کرنا واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: شی مستعار کا حکم شرعی یہ ہے کہ وہ جب تک مستعیر کے پاس رہے گی بطورِ امانت بے ضمانت ہوگی، یعنی اس کی حفاظت کرنا مستعیر پر اسی طرح ضروری ہے، جس طرح امانت کی حفاظت کی جاتی ہے، لیکن اگر وہ چیز اتفاق سے ٹوٹ گئی یا خراب ہوگئی تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ یعنی اس پر تاوان کی ذمہ داری اس صورت میں نہ ہوگی، جب وہ چیز اتفاق سے خراب ہوگئی یا ٹوٹ گئی ہو، لیکن اگر اس نے غلط طریقہ سے استعمال کیا، یا غیر ذمہ دار آدمیوں کے ہاتھ میں دیدیا اور وہ چیز ہلاک ہوگئی یا قصداً اس نے خراب کر دیا، یا توڑ دیا تو ان تمام صورتوں میں مستعیر پر اس کا تاوان لازم ہوگا۔

اب اس حکمِ شرعی کے تحت مسئلہ بالا کو دیکھیے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مدرسہ نے جب فون کا مطالبہ کیا ہو اور مستعیر نے جھوٹ بولکر یہ کہا ہو کہ میرے پاس نہیں ہے، یا بار بار پوچھنے پر خاموش رہا ہو تو یہ اس کی زیادتی وتعدی ہے اس کی وجہ سے اربابِ مدرسہ نے توڑ دیا ہو، اگر مستعیر صاف بتلا دیتا کہ یہ فون فلان طالبِ علم کا ہے، اس پر اس کے نام کا چٹ لگا دو، تو شاید اربابِ مدرسہ اس کو نہ توڑتے، لہذا اگر مذکورہ بالا صورتِ حال ہے تو پھر مستعیر پر تاوان لازم ہوگا، اور اگر اربابِ مدرسہ نے کسی مصلحت سے بغیر کسی وجہ کے توڑ دیا تو پھر مستعیر پر تاوان نہیں آئیگا، مگر دوسرا پہلو بعید ہے۔

ملاحظہ ہو شرح عنایہ میں ہے:

(والعارية أمانة إن هلكت من غير تعد لم يضمن الخ) إن هلكت العارية فإن كان

بتعد أوجب الضمان بالإجماع وإن كان بغيره لم يضمن . (شرح العناية على هامش فتح القدير:۹/۷،دار الفكر).

درمختار میں ہے:

(ولاتضمن بالهلاك من غير تعد) وشرط الضمان باطل كشرط عدمه في الرهن خلافاً للجوهرة. وفي الشامية : (قوله بالهلاك) هذا إذا كانت مطلقة فلو مقيدة كأن يعيره يوماً فلو لم يردها بعد مضيه ضمن إذا هلكت كما في شرح المجمع وهو المختار كما في العمادية. قال في الشرنبلالية : سواء استعملها بعد الوقت أولا وذكر صاحب المحيط وشيخ الإسلام : إنما يضمن إذا انتفع بعد مضي الوقت لأنه حينئذٍ يصير غاصباً، أبو السعود.

(الدر المختار مع رد المحتار:۵/۶۷۹،كتاب العارية ،سعيد).

شرح المجلہ میں ہے:

العارية أمانة في يد المستعير فإذا هلكت أو ضاعت أو نقصت قيمتها بلا تعد ولا تقصير لايلزم الضمان... وإذا حصل من المستعير تعد أو تقصير بحق العارية ثم هلكت أو نقصت قيمتها فبأي سبب كان الهلاك أو النقص يلزم المستعير الضمان. (شرح المجلة: ۳/۳۱۲، المادة:۸۱۳،۸۱۴).

عالمگیری میں ہے:

ولو رد الثوب المستعار فلم يجد المعير ولا من في عياله فأمسكه الليل وهلك لايضمن ولو وجد من في عياله ولم يرده يضمن. (الفتاوى الهندية:۴/۳۷۰).

مزید ملاحظہ ہو: (البحر الرائق:۶/۲۱۷،كوئٹہ۔والفتاوى الهندية:۴/۲۶۳۔وحاشية الطحطاوي على الدر المختار:۳/۳۸۶۔وفتح باب العناية :۳/۳۴۶). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شئی مستعار کے نقصان کی تلافی کا حکم:

سوال: زید نے عمرو کی کار بطورِ عاریت استعمال کے لیے لی، استعمال کے دوران کچھ نقص واقع ہوا، کیا زید پر نقصان کی تلافی لازم ہے یا نہیں؟ اور قصداً کیا ہو یا بغیر قصد کے نقص واقع ہوا ہو دونوں میں کوئی فرق ہوگا یا

نہیں؟ نیز متعین مقدار سے زیادہ تیز چلانے کی وجہ سے نقصان واقع ہوا ہوتو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زید نے کار معروف طریقے پر استعمال کی اور بلا تعدی کچھ نقصان ہو گیا تو زید اس کا ذمہ دار نہیں، اس پر تاوان نہیں آئیگا، ہاں اگر معروف طریقے سے تجاوز کیا اور تعدی کی تو زید اس کا ذمہ دار ہوگا، اسی طرح متعین رفتار سے زیادہ تیز چلائی اور قوانین کی مخالفت کی اور کوئی خرابی واقع ہوگئی تب بھی زید پر تاوان آئیگا۔

عالمگیری میں ہے:

وأما حكمها (العارية) فهو ملك المنفعة للمستعير بغيرعوض أو ما هو ملحق بالمنفعة عرفاً وعادةً عندنا كذا في البدائع، والعارية أمانة إن هلكت من غير تعد لم يضمنها ... ولو تعدى ضمن بالإجماع نحو أن يحمل عليها ما يعلم أنها لاتحمل مثله وكذلك إذا استعملها ليلاً أو نهاراً فيما لايستعمل فيه الدواب في العرف والعادة، فعطبت ضمن قيمتها كذا في غاية البيان. (الفتاوى الهندية:٤/٣٦٣، كتاب العارية).

شرح عنایہ میں ہے:

إن هلكت العارية، فإن كان بتعد كحمل الدابة مالايحمله مثلها أو استعمالها استعمالاً لايستعمل مثلها من الدواب أوجب الضمان بالإجماع. (شرح العناية على هامش فتح القدير:٩/٧، كتاب العارية، دار الفكر).

اسلامی فقہ میں ہے:

اگر معیر نے وقت، جگہ یا طریقہ استعمال کی کوئی قید نہ لگائی ہو، تو مستعیر کو اختیار ہے کہ وہ جس وقت تک چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے، اس صورت میں اگر کوئی نقصان ہوگا تو مستعیر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر عام طور پر جس طرح وہ چیز استعمال کی جاتی ہے، اس کے خلاف استعمال کریگا، تو اجازت کے باوجود تاوان دینا پڑیگا، مثلاً کسی نے کسی سے سائیکل یا موٹر عاریۃً لی، اس کو مجمع میں بے تحاشہ یا اس رفتار سے زیادہ تیز چلانا شروع کردیا، جو عام طور پر اس کی مقرر ہے، اور وہ ٹکرا گئی تو اس کے نقصان کی ذمہ داری مستعیر پر ہوگی، اسی طرح اس سے ٹکرا کر جس دوسری چیز کا نقصان ہوگا، اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی، مثلاً کسی کو چوٹ لگ گئی، یا کسی کا مالی نقصان ہوگیا تو اس کا تاوان اسی کو دینا پڑیگا۔ (اسلامی فقہ:۲/۴۹۸، عاریت کا حکم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مستعار مکان کو اجرت پر دینے کا حکم:

سوال: بکر نے خالد کو ایک مکان بطورِ عاریت رہنے کے لیے دیا، خالد نے مکان کے دو حصے کیے ایک حصہ میں وہ خود رہتا ہے اور دوسرا حصہ کرایہ پر دیا، اور ماہانہ کرایہ وصول کرتا ہے، کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کرایہ کا حقدار کون ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ خالد کے لیے جائز نہیں ہے کہ بلا اجازت مکان مستعار اجرت پر دے، یہ اجارہ صحیح نہیں ہے، اور اجرت واجب التصدق ہوگی، ہاں اگر بکر نے کرایہ پر دینے کی اجازت دی ہے تو پھر جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں عالمگیری میں ہے:

ليس للمستعير أن يواجر المستعار من غيره وإن كانت الإعارة تمليكاً عندنا كذا في الظهرية ، فإن آجر فعطب ضمن حين سلمه إلى المستأجر كذا في الكافي، وكان الأجر له ويتصدق به في قول أبي حنيفة ؒ كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ٤/٣٦٤، كتاب العارية، باب في التصرفات).

مجلّہ میں ہے:

ليس للمستعير أن يوجر العارية ولا أن يرهنها بدون إذن المعير. (مجلة: ٣/٣٢٥، المادة: ٨٢٣).

تبیین الحقائق میں ہے:

قوله (ولايوجر) لأن الإجارة لازمة فيلزم المعير زيادة الضرر لأنه لوجازت الإجارة من المستعير لما جاز للمعير أن يرجع عليه حتى يفرغ مدتها فيتضرر فلا يلزمه بغير رضاه. وفي حاشية الشلبي: قال: فإذا فعل ذلك وآجرها صار بمنزلة الغاصب والغاصب إذا فعل يملك الأجرة ويتصدق بها لأنها حصلت بسبب خبيث وهو استعمال مال الغير فكان سبيله التصدق. (تبيين الحقائق مع الحاشية: ٥/٨٥، كتاب العارية، ط: ملتان).

مجلّہ کی عبارت "بدون إذن المعير" اور تبیین کی عبارت "بغير رضاه" ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

معیر کی اجازت اور رضامندی سے شئی مستعار کا اجارہ پر دینا جائز اور درست ہونا چاہئے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مودَع بالا جر پر تاوان کا حکم:

سوال: عمرو نے بکر کے پاس اپنی کوئی قیمتی چیز بطورِ ودیعت رکھی، اور ماہانہ اس کی حفاظت کی اجرت بھی ادا کرتا ہے، اتفاق سے وہ قیمتی چیز بکر کے پاس سے گھر میں سیلاب آنے کی وجہ سے ضائع ہوگئی، اب عمرو وہ قیمتی چیز یا اس کی قیمت طلب کرتا ہے، تو کیا شرعاً بکر اس کا ذمہ دار ہوگا یا نہیں؟ یعنی مودَع بالا جر پر تاوان لازم ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ودیعت وامانت کی حفاظت مودَع پر لازم کرنا اور اس کے عوض اجرت مقرر کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، ہاں اس صورت میں مودَع کے پاس سے ودیعت ضائع ہوجائے جس سے بچنا ممکن ہو تو مودَع بالا جر ضامن ہوگا ورنہ نہیں۔ لہذا صورتِ مسئولہ میں بکر نے حفاظت میں کوتاہی نہیں کی بلکہ محفوظ جگہ رکھی تھی اور ضائع ہوگئی تو بکر پر ضمان نہیں، لیکن اگر بکر نے حفاظت میں کوتاہی کی تو ضامن ہوگا۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه كذا في جواهر الأخلاطي . (الفتاوى الهندية:٣٤٢/٤، كتاب الوديعة).

ہدایہ میں ہے:

إذا هلك بسبب يمكن الاحترز عنه كالغصب والسرقة فإن كان التقصير من جهته فيضمنه كالوديعة إذا كانت بأجر بخلاف مالايمكن الاحتراز عنه كالموت حتف أنفه والحريق الغالب وغيره لأنه لاتقصير من جهته. (الهداية:٣٠٨/٣، باب ضمان الاجير).

مجلّہ میں ہے:

الوديعة أمانة في يد الوديع فإذا هلكت بلا تعد من المستودع وبدون صنعه وتقصيره فى الحفظ لايلزم الضمان، فقط إذا كان الإيداع بأجرة فهلكت أوضاعت بسبب يمكن التحرز عنه لزم المستودع ضمانها . (مجلة :٢٤٢/٣،المادة:٧٧٧،فصل فى احكام الوديعة وضمانها).

درمختار میں ہے:

وهي (الوديعة) أمانة ، هذا حكمها مع وجوب الحفظ والأداء عند الطلب واستحباب قبولها، فلا تضمن بالهلاک إلا إذا كانت الوديعة بأجر... (الدرالمختار:٥/٦٦٤،سعيد).

"**الأشباه والنظائر**" میں ہے:

وفي البزازية: لو جعل للكفيل أجراً لم يصح، وذكر الزيلعي ؒ أن الوديعة بالأجر مضمونة ، وفي الصيرفية من أحكام الوديعة إذا استأجر المودِع المودَع صح. (الاشباه والنظائر:٢/٣٩٩).

ومثله في تبيين الحقائق، وزاد بقوله: والمتاع في يده (أى الأجير المشترک) غير مضمون بالهلاک...بخلاف الوديعة بأجر لأن الحفظ واجب عليه مقصوداً ببدل (فيضمن). (تبيين الحقائق:٥/١٣٥،ملتان).

ملاحظہ ہورد المحتار میں ہے:

وأما من جرى العرف بأنه يأخذ في مقابلة حفظه أجرة يضمن ،لأنه وديعة بأجرة لكن الفتوىٰ على عدمه، سائحاني. (ردالمحتار:٥/٦٦٤،كتاب الايداع ، سعيد).

خلاصة الفتاویٰ میں ہے:

فإن شرط عليه الضمان إذا هلک يضمن في قولهم جميعاً، لأن الأجير المشترک إنما لايضمن عند أبي حنيفة ؒ إذا لم يشترط عليه الضمان، أما إذا شرط يضمن، قال الفقيه أبو الليث، الشرط وعدم الشرط سواء، لأنه أمين ، واشتراط الضمان على الأمين باطل، وبه يفتىٰ. (خلاصة الفتاوىٰ:٣/١٣٧).

امدادالاحکام میں ہے:

ودیعۃ بالاجر میں عدم ضمان پرفتویٰ ہے۔(امدادالاحکام:٣/٦٣٧۔وکذافی ایضاح النوادر،ص١٧٢).

حاصل یہ ہے کہ مودع بالاجر کے پاس اگرودیعت ہلاک ہوجائے تو تاوان آنے اور نہ آنے میں اختلاف ہے،اورفتاویٰ کا بھی اختلاف ہے جیسا کہ مذکورہوا، بندہ فقیر کے خیال میں جب مالک نے ودیعت کی حفاظت کے لیے اجرت کا اہتمام کیا ہو،اوریہ بھی کہا کہ تم ذمہ دارہوتو پھرتاوان کافتویٰ دیا جاسکتا ہے،خصوصاً اس زمانے میں جب کہ سستی اورتکاسل عام ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ ودیعت کو تجارت میں لگانے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کے پاس ایک لاکھ رینڈ بطورِ امانت رکھے، مودَع یعنی عمر نے چند دن کے بعد اس کو اپنی تجارت میں لگایا اور ایک سال میں اس سے مزید دو لاکھ رینڈ کمائے اب یہ بات تو ظاہر ہے کہ عمر پر ایک لاکھ کی ادائیگی زید کو ضروری ہے، لیکن یہ دریافت کرنا ہے کہ کمایا ہوا نفع عمر کا ہے یا زید کا؟ عمر نے اپنے لیے بغیر اجازت کے تجارت کی زید کے لیے نہیں کی۔ اور کیا یہ نفع واجب التصدق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر عمر نے امانت کی رقم پر عقد منعقد کیا اور وہی رقم ادا کردی تو جو نفع کمایا وہ تمام نفع واجب التصدق ہے، اور اگر عقد اسی رقم پر کیا لیکن دوسری رقم ادا کردی یا مطلق رقم پر عقد کیا پھر امانت والی رقم ادا کردی تو ان صورتوں میں کمایا ہوا نفع واجب التصدق نہ ہوگا اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، لیکن بعض علماء کے یہاں مطلق رقم پر عقد کیا ہو پھر بھی نفع واجب التصدق ہے، لہٰذا احتیاط تصدق میں ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فإن كانت الوديعة دراهم فالدراهم يشترى بها ثم ينظر إن اشترى بها بعينها ونقدها لايطيب له الفضل وإن اشترى بها ونقد غيرها أو اشترى بدراهم مطلقة ثم نقدها يطيب له الربح هنا لأن الدراهم لاتتعين بنفس العقد مالم ينضم إليه التسليم ولهذا لو أراد أن يسلم غيرها له ذلك فأما بالقبض يتعين نوع تعين ولهذا لايملك استرداد المقبوض من البائع ليعطيه مثلها فلهذا قلنا إذا استعان في العقد والنقد جميعاً بالدراهم الوديعة أو المغصوبة لايطيب له الفضل. (المبسوط للامام السرخسيؒ: ١١/١١٢، كتاب الوديعة).

درمختار میں ہے:

لو تصرف في المغصوب والوديعة بأن باعه وربح فيه إذا كان ذلك متعيناً بالإشارة أو بالشراء بدراهم الوديعة أو الغصب ونقدها يتصدق بربح حصل فيهما إذا كانا مما يتعين بالإشارة وإن كانا مما لايتعين فعلى أربعة أوجه فإن أشار إليها ونقدها فكذلك يتصدق وإن أشار إليها ونقد غيرها أو أشار إلى غيرها ونقدها أو أطلق ولم يشر ونقدها لايتصدق في الصور الثلاث عند الكرخيؒ قيل: وبه يفتىٰ. (الدرالمختار: ٦/١٨٩، سعيد).

وکذا في حاشية الطحطاوي على الدرالمختار وزاد بقوله: والمختار أنه لايحل مطلقاً كذا في الملتقى ولو بعد الضمان هو الصحيح كما في فتاوى نوازل واختار بعضهم الفتوىٰ على قول الكرخيؒ في زماننا لكثرة الحرام وهذا كله على قولهما وعند أبي يوسفؒ لايتصدق بشيء منه كما لو اختلف الجنس ذكره الزيلعي. (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:٤/١٠٥وكذا في الفتاوى السراجية،ص:٤٤٨،باب المتفرقات). **واللہ ﷻ اعلم۔**

امانت کم ہونے پر تاوان کا حکم:

سوال: خالد نے بکر کے ہاں کچھ رقم امانت کے طور پر رکھنے کی درخواست کی، بکر نے انکار کیا، پھر خالد کے اصرار کرنے پر بکر نے وہ رقم ایک محفوظ جگہ پر رکھدی، کافی دنوں کے بعد خالد نے وہ رقم طلب کی بکر نے وہ رقم نکال کر خالد کے سپرد کردی جب خالد نے دیکھی تو کچھ کم نظر آئی، بکر کہتا ہے کہ میں نے اس رقم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا، اب اس کا کون ذمہ دار ہوگا؟

الجواب: امانت کا حکم یہ ہے کہ اگر امین کی غفلت یا تساہلی کے بغیر کم ہوگئی یا ضائع ہوگئی، تو امین پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اگر اس نے تفریط یا تعدی کی یعنی رقم کی حفاظت میں تساہلی کی یا مودِع کی ہدایت کے خلاف اس نے کوئی قدم اٹھایا یا اس کو مودِع کی اجازت کے بغیر استعمال کرلیا تو ان تمام صورتوں میں اس کو تاوان دینا پڑیگا۔لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر بکر اپنے بیان میں سچا ہے، اور امانت جہاں رکھی تھی وہاں سے نہیں ہٹائی گئی اور خالد امانت کو وہاں رکھنے پر راضی تھا، تو بکر اس کا ذمہ دار نہیں، حدیث شریف میں ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عاریت پر سامان لینے والے اور امین سے اگر دھوکہ دئے بغیر سامان ضائع ہوجائے اور اس میں اس نے کوئی خیانت بھی نہ کی ہو تو وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

دارقطنی میں ہے:

عن عمروبن شعيب عن أبيه عن جده عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان. (رواه الدارقطني:٣/٤١/١٦٨).

تبیین الحقائق میں ہے:

الإيداع هو تسليط الغير على حفظ ماله والوديعة مايترك عندالأمين... وهي أمانة فلاتضمن بالهلاک لقوله عليه الصلاة والسلام:" لا ضمان على مؤتمن". رواه الدارقطني، ولأن المودع متبرع في الحفظ وما على المحسنين من سبيل ولأن يده يد المالک فيكون هلاكها في يد المالک فلا يجب الضمان ولأن للناس حاجة إلى الإيداع فلوضمن المودع لامتنع الناس عن قبول الودائع فكانوا يحرجون بذلک. (تبيين الحقائق:٥/٧٦، كتاب الوديعة، ملتان).

شرح مجلّہ میں ہے:

الوديعة أمانة في يد الوديع فإذا هلكت بلا تعد من المستودع وبدون صنعه وتقصيره في الحفظ لايلزم الضمان. (شرح المجلة، لمحمد خالد الاتاسي:٣/٢٤٢، المادة:٧٧٧). **واللہ ﷻ اعلم۔**

خیراتی رقم ضبط ہونے پر تاوان کا حکم:

سوال: ایک شخص دوسرے ملک مثلاً ہندوستان میں عرصہ دراز سے خیراتی کام کرتا ہے، اور یہ شخص انگلینڈ یا افریقہ میں رہتا ہے، بہت سے لوگ زکوٰۃ، للہ وغیرہ کی رقوم دیتے ہیں، بعض لوگ بطورِ امانت کچھ رقوم اس کے پاس رکھتے ہیں، وہ شخص دوسرے ملک مثلاً ہندوستان میں جانے سے پہلے انگلینڈ یا افریقہ سے رقوم بھجد یتا ہے، اس کا ایک معاون دوست ان رقوم کو ہندوستان میں وصول کر کے اپنے گھر میں محفوظ جگہ پر رکھدیتا ہے، یہ کارروائی حفاظت کی غرض سے ہے، چند ہفتے پہلے پولیس نے کسی شبہ کی وجہ سے ہندوستان میں اس کے گھر کی تلاشی لی، اس کے معاون کو گرفتار کرلیا اور تمام رقوم ضبط کرلی، اب کیا حکم ہے؟ کیا رقم بھیجنے والا ان رقوم کا ذمہ دار ہے یا نہیں؟ نیز مزکین پر دوبارہ زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا ولکم الأجر الجزیل۔

الجواب: کسی شخص کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ امین پر حتی الامکان حفاظت کرنا ضروری ہے، لہٰذا اگر بغیر زیادتی، غفلت اور تساہل وسستی کے ہلاک ہوجائے یا ضائع ہوجائے تو امین پر تاوان نہیں آئیگا، لیکن اگر مودَع نے حفاظت میں کوتاہی کی غفلت برتی اور تعدی کی تو مودَع اس کا ضامن ہوگا، اسی طرح اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز پہنچانے کا وکیل بنایا اس کا حکم بھی امین کی طرح ہے، بغیر کوتاہی کے وکیل کے پاس مال ہلاک ہوجائے یا ضائع ہوجائے تو اس پر بھی ضمان نہیں آئیگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

الإيداع شرعاً تسليط الغير على حفظ ماله صريحاً أو دلالة...وهي أمانة ، هذا حكمها مع وجوب الحفظ والأداء عند الطلب، واستحباب قبولها، فلاتضمن بالهلاك.

(الدر المختار:٥/٦٦٤،سعيد).

عالمگیری میں ہے:

وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع ، وصيرورة المال أمانة في يده ، ووجوب أدائه عند طلب مالكه. (الفتاوى الهندية:٤/٣٣٨).

بدائع الصنائع میں ہے:

إن المبيع أمانة في يد الموكل، ألا ترى أنه لو هلك في يده فالهلاك على الموكل.

(بدائع الصنائع:٦/٣٧،سعيد).

فتاویٰ عالمگیری میں ایک مسئلہ کے ذیل میں لکھا ہے:

فهو ـــ أى الوكيل ـ مصدق، لأنه أمين، كذا في محيط السرخسي في باب الوكيل مع الموكل إذا اختلفا. (الفتاوى الهندية:٣/٦٤٤).

نیز جب کسی نے کسی کو زکوٰۃ ادا کرنے کا وکیل بنایا اور فقراء متعین اور معروف ہیں، ہر سال انھیں کو زکوٰۃ دی جاتی ہے، تو وکیل کے قبضہ کرنے سے مزکین کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے، پھر اگر اتفاق سے وکیل کے پاس سے رقم ضائع ہو جائے تو دوبارہ ادا کرنا لازم اور ضروری نہیں ہے۔

ہمارے اکابرؒ کے فتاویٰ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اربابِ مدرسہ اوران کے سفراء عاملین صدقہ کے حکم میں ہو کر فقراء کے وکیل ہیں، معطین کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو فقراء کا وکیل تسلیم کر کے اپنا چندہ ان کے حوالہ کر دیا، جب بحیثیت وکیل رقم پر قبضہ کر لیا تو وہ فقراء کا قبضہ حکمی کہلائیگا۔ (مستفاد از امداد المفتین،جلد دوم،۱۰۸۵).

تذکرۃ الرشید میں ہے:

مہتمم مدرسہ قیم و جملہ طلبہ کا نائب ہوتا ہے...پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضے سے ملک معطی سے نکلا، اور ملک طلبہ کا ہو گیا۔ (تذکرۃ الرشید:۱۶۴۔وامداد الفتاویٰ:۳/۳۱٦۔ونظام

الفتاویٰ:۲۴۶۔وفتاویٰ محمودیہ:۹/۵۰۶۔وجدید فقہی مسائل:۱/۲۲۷)۔

قال في الدرالمختار مع ردالمحتار: (لايخرج عن العهدة)... بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي، لأن يده كيد الفقراء. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۲/ ۲۷۰،سعید)۔

اوراگرفقراءومستحقین متعین نہیں ہیں،وکیل اپنی صواب دید پرزکوۃ کامال خرچ کرتاہےتومزکین کی زکوۃ ادانہیں ہوئی دوبارہ اداکرنالازم اورضروری ہے۔

قال في الدرالمختار: ولايخرج عن العهدة بالعزل، بل بالأداء للفقراء. وفي الشامية: (لايخرج عن العهدة) فلوضاعت لاتسقط عنه الزكاة، ولومات كان ميراثاً عنه، بخلاف ما إذا ضاعت في يد الساعي، لأن يده كيد الفقراء. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۲/ ۲۷۰،سعید)۔

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

رجل عزل زكاة ماله و وضعها في ناحية بيته ، فسرقها سارق لايقطع يده للشبهة وعليه أن يزكيها. (خلاصة الفتاوى:۱/ ۲۳۸)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ:۹/۴۸۰۔وکفایت المفتی:۴/۲۹۷۔وفتاویٰ فریدیہ:۳/۲۷۵)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

حکومت کو پورا ٹیکس ادانہ کرنا:

سوال: بہت سی مرتبہ تجارگاہکوں سےتوٹیکس وصول کرتے ہیں لیکن حکومت کوپوراادانہیں کرتے،کیایہ ٹیکس امانت ہے؟اس کاپہنچاناضروری ہے یانہیں؟

الجواب: تجار جب گاہکوں سےوصول کرتے ہیں تویہ حکومت کی طرف سےوکیل ہوتے ہیں اورٹیکس کی رقم ان کے پاس بطورِامانت ہوتی ہے،حکومت کواداکرناضروری اورلازم ہے ورنہ خیانت ہوگی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿**يا أيها الذين آمنوا لاتخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتكم**﴾.

عالمگیری میں ہے:

وأما صفتها أي صفة الوكالة فإنها من العقود الجائزة الغير اللازمة... ومنه أنه أمين فيما في يده كالمودع. (الفتاوى الهندية:۳/۵٦۷)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:

﴿يهب لمن يشاء إناثاً ويهب لمن يشاء الذكور﴾

(سورة الشورى)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

"تهادوا تحابوا".

(رواه البيهقي في سننه الكبرى، والبخاري في الادب المفرد).

كتاب الهبة

عن أبي هريرة ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال:
"تهادوا فإن الهدية تذهب وحر الصدر ولاتحقرن جارة لجارتها ولو شق فرسن شاة"

(رواه الترمذي)

أحسن إلى الناس تستعبد قلوبهم
فطالما استعبد الإنسان إحسان

لوگوں پر احسان کر اور ان کے دلوں کو خرید لے
کیوں کہ عام طور پر احسان انسان کو غلام بنالیتا ہے۔

فصل اول

تبرعِ مشروط کے احکام کا بیان

A.T.M نصب کرنے کی مشروط اجازت دینا:

سوال: ایک مسلمان پٹرول پمپ چلا رہا ہے، زمین اصل پٹرول کمپنی کی ہے، اس شخص نے کرایہ پر لیا ہے، ایک بینک اس پٹرول پمپ میں ایک (A.T.M) مشین ڈالنا چاہتی ہے اس مشین میں لوگ پیسے ڈالتے ہیں اور اس سے پیسے نکالتے ہیں، بینک والوں نے یہ شرط لگائی کہ ہر مہینہ پہلے تین ہزار لوگ اس کو استعمال کریں گے تو اس مسلمان کو کچھ نہیں ملے گا، لیکن تین ہزار کے بعد ہر استعمال میں (چاہے پیسے ڈالے یا نکالے) اس مسلمان شخص کو ۷۵ سینٹ ملیں گے، کیا ایسا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس قسم کا عقد دو وجوہات کی بنا پر صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے:۔

(۱) یہ تبرع مشروط ہے یعنی احسان میں کوئی شرط لگانا مثلاً تین ہزار تک مفت کی اجازت دینا تبرع ہے اور اس کو اجارہ کے ساتھ مشروط کرنا کہ زائد کا کرایہ بینک ادا کریگا یہ تبرع مشروط بن گیا اس لیے یہ عقد جائز اور درست ہے۔

(۲) یہ عقدِ اجارہ ہے اس میں شرط لگائی ہے لیکن عرف کی وجہ سے اور مفضی الی النزاع نہ ہونے کی وجہ سے یہ شرط مفسدِ عقد نہیں۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

...إلا أن يكون متعارفاً لأن العرف قاضٍ على القياس. (الهداية:۳/۵۹،باب البيع الفاسد).

مزید تفصیل کتاب الاجارہ میں گزر چکی ہے۔

تبرع مشروط کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

مسلم شریف میں ہے:

عن أنس رضي الله عنه أن جاراً لرسول الله صلى الله عليه وسلم فارسياً كان طيب المرق فصنع لرسول الله صلى الله عليه وسلم ثم جاء يدعوه، فقال: وهذه لعائشة رضى الله تعالىٰ عنها فقال: لا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا، فعاد يدعوه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وهذه، قال: لا، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا، ثم عاد يدعوه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: وهذه، قال: نعم في الثالثة، فقاما يتدافعان حتى أتيا منزله. (رواه مسلم:۲/۱۷۶).

حدیثِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ: ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ طعام پیش کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھی شرط لگائی اس نے انکار کر دیا پھر تیسری مرتبہ میں اجازت دیدی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اونٹ کا پالان خریدا اور عازب رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ اپنے بیٹے براء رضی اللہ عنہ سے کہدے کہ یہ پالان میرے ساتھ لے چلے، عازب رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں مگر اس شرط پر کہ آپ ہجرت کا واقعہ سنا دیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا واقعہ سنایا اور حضرت براء رضی اللہ عنہ پالان لے گئے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن البراء رضي الله عنه قال: اشترى أبوبكر رضي الله عنه من عازب رضي الله عنه رحلاً بثلاثة عشر درهماً، فقال أبوبكر رضي الله عنه: لعازب رضي الله عنه مر البراء فليحمل إلي رحلي، فقال عازب: لا، حتى تحدثنا كيف صنعت أنت ورسول الله صلى الله عليه وسلم حين خرجتما من مكة والمشركون يطلبونكم، قال: ارتحلنا...الخ. (رواه البخاري ۱/۵۱۵،في مناقب المهاجرين).

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تبرعِ مشروط جائز ہے اور تبرعِ مشروط یہ ہے کہ احسان میں کوئی

شرط لگانا یا کسی معاملہ میں اپنے فائدہ کی شرط لگانا، صورتِ مسئولہ میں بھی یہی شکل ہے، کہ بینک والوں نے (A.T.M) مشین لگانے کی درخواست کی تو اس پمپ والے نے کہا ٹھیک ہے میں مفت میں اجازت دیتا ہوں، لیکن پہلے تین ہزار کے بعد ہر استعمال میں ۷۵ سینٹ آپ مجھے دیں گے، بینک والوں نے منظور کرلیا، لہذا یہ معاملہ درست ہے۔

مزید ملاحظہ ہو ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام: ۳/۳۸۶، و ۶۰۶). واللہ تعالیٰ اعلم۔

ماہنامہ کے خریداروں کے لیے انعام کا حکم:

سوال: ریڈرس ڈائجسٹ ایک ماہنامہ ہے جو حضرات پیشگی رقم ادا کر کے خریدتے ہیں ان کے درمیان قرعہ اندازی کر کے جس کا نام برآمد ہوتا ہے اس کو انعام ملتا ہے کیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اور نام نکلنے پر انعام حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر ڈائجسٹ قیمۃً خریدا گیا اور ڈائجسٹ کے منتظمین نے یہ کہا ہو کہ جس کا نام نکلے اس کو ہم فلاں چیز بطورِ انعام دیں گے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ تبرعِ مشروط کے قبیل سے ہے یعنی ڈائجسٹ خریدنے والوں پر ہم احسان کریں گے جو قرعہ اندازی کے ساتھ مشروط ہوگا جیسے طالبِ علم کو داخلہ بشرطِ فیس دیا جاتا ہے، اس قرعہ اندازی میں قمار نہیں پایا جاتا کیونکہ قمار والے قرعہ میں کوئی مستحق محروم اور کوئی مستحقِ مال ہوتا ہے، جب کہ یہاں کوئی بھی مستحق نہیں، اس لیے کہ رقم کے عوض وہ ڈائجسٹ کے مستحق ہیں جو ان کو مل چکا ہے۔

امداد الاحکام میں ہے:

پس ارشاد ہوا کہ معاہدہ مذکورہ کہ خریدار کو سال بھر کے برابر چالو مارکو کا مال خریدتے رہنے کی حالت میں دو تین روپیہ سیکڑہ مثلاً سال کے تمام پر رعایت دی جائے اور دورانِ سال دوسری جگہ ایک مرتبہ بھی خریدنے میں بالکل کچھ نہ دیا جائے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ معاہدہ جائز ہے کیونکہ خریدار کو سال تمام پر جو کمیشن ہر سیکڑہ پر دیا جاتا ہے وہ بائع کی طرف سے تبرع ہے خریدار کا حق لازم نہیں، اور تبرع کو کسی شرط سے مشروط کرنا جائز ہے۔ (امداد الاحکام: ۳/۳۸۶).

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

سوال: مدارس میں فیس داخلہ اور فیس ماہواری طلبہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے کیونکہ یہ اجرت نہیں بلکہ چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا جس کو شرط منظور نہ ہوگی اس کو عدمِ داخلہ کا اختیار رہوگا۔

ودليله أنه عليه السلام قال لمن أضافه وعائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قال: لا، قال: فلا إذن، قال في الثالثة وعائشة رضي الله تعالىٰ عنها قال: نعم۔ (امداد الاحکام:۳/۶۰۲)۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرنا چاہتا تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہاں جانے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جانے کی شرط رکھی جس کو تیسری مرتبہ میزبان نے قبول کرلیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لیجانا تبرع تھا جس کو حضرت عائشہؓ کے جانے کے ساتھ مشروط فرمایا۔

(امداد الاحکام حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی میں تحریر شدہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

''ماہنامہ ''البلاغ'' جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ میں حضرت مولانا مفتی عبد الشکور ترمذی صاحبؒ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں حضرت نے فرمایا:... حقیقت میں یہ امداد الاحکام حضرت تھانویؒ کے امداد الفتاویٰ کا تتمہ ہے....البلاغ، ص ۴۰)۔

مذکورہ بالا معاملہ میں اگر کوئی اور خرابی نہ ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دعوتِ طعام کو چندہ کے ساتھ مشروط کرنے کا حکم:

سوال: بعض اداروں میں ایسا ہوتا ہے کہ جب پیسے کی ضرورت پڑتی ہے اور اخراجات زیادہ ہوجاتے ہیں تو عام دعوتِ طعام پیش کرتے ہیں اور آنے والوں سے زائد رقم وصول کرتے ہیں اور جو رقم بچ جاتی ہے وہ اپنے ادارہ کے اخراجات میں لگاتے ہیں تو کیا یہ زائد رقم لینا اور اپنے کام میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: دعوتِ طعام ادارہ والوں کی طرف سے اصلاً ایک تبرع ہے جس میں زائد رقم کی شرط بغیر کسی جبر کے لگائی گئی ہے، جس کو شرط منظور نہ ہو تو اس کو عدمِ حاضری کا اختیار رہے، لہٰذا یہ معاملہ تبرعِ مشروط کے حکم میں داخل ہوکر جائز اور درست ہے۔

حوالہ جات گزر چکے ہیں، تکرار سبب طوالت ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ولیمہ میں مشروط ہدایا کا حکم:

سوال: ولیمہ وغیرہ دعوتوں میں یہ رواج ہے کہ لوگ ہدیہ جمع کرتے ہیں اور جن کی دعوت ہو وہ دعوت کے آخر میں تمام ہدیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس کو قلمبند کرتے ہیں اس کا مقصد یہ ہوتا ہے جب ان کے ہاں دعوت ہو تو ہم کو بھی اتنا دینا ہے، اور جو لوگ ہدیہ دیتے ہیں ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ جب ہماری باری آئیگی تو ہم کو بھی اتنا ہدیہ ملنا چاہئے، کیا ایسے ہدایا کا لینا دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ تبرعِ مشروط ہے اور اس میں دوسری جانب سے جو دیا جاتا ہے اس کی کمی اور خراب کوالٹی کی وجہ سے کبھی ناراضگی اور غیبت ہوتی ہے، غریب لوگوں کے لیے یہ رسم وبالِ جان ہے اس لیے اس رسم سے بچنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وما آتيتم من ربا ليربو في أموال الناس فلا يربو عند الله﴾ (سورة الروم:٣٩).

تفسیر عثمانی میں ہے:

بعض مفسرین نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جو آدمی کسی کو کچھ دے اس غرض سے کہ دوسرا اس کو بڑھ کر احسان کا بدلہ کریگا تو یہ دینا اللہ تعالیٰ کے یہاں موجبِ برکت وثواب نہیں گو مباح ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص۵۴۳).

معارف القرآن میں یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور امام شافعیؒ سے منقول ہے۔ (معارف القرآن: ۱۵۸/۶، از مولانا ادریس کاندھلوی صاحب).

اصلاح الرسوم میں حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

یہ قرض مشروط کی طرح ہے کیونکہ جب اس کی دعوت میں پیسہ دیں گے تو وہ ان کی دعوت میں بھی پیسہ دیں گے اگرچہ لفظاً نہیں کہے لیکن حسبِ قاعدہ ''المعروف کالمشروط'' اور یہ صحیح نہیں۔ (اصلاح الرسوم:۴۱).

لیکن امداد الاحکام میں حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسا معاملہ تبرعِ مشروط ہوتا ہے۔ (امداد الاحکام:۳/۳۸۶، ۶۰۶).

ہاں تبرعِ مشروط جائز ہے لیکن بہت سارے مفاسد کی وجہ سے اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تبرعِ مشروط کا ایک مسئلہ:

سوال: ہوائی جہاز والوں کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ جو ہمارے جہاز میں زیادہ سفر کریگا اور مخصوص میل بن جائیں گے تو ہم ان کو مفت میں ٹکٹ دیں گے یا اور کچھ مراعات دیں گے تو کیا شرعاً اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ تبرعِ مشروط کے حکم میں ہو کر جائز اور درست ہے۔جیسے کہ مدرسہ والے فیس اور چندہ کو داخلہ کے ساتھ مشروط کرتے ہیں، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے جائز قرار دیا ہے۔تفصیلات پیچھے گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔واللہ ﷻ اعلم۔

فصل دوم

ہبہ کے احکام کا بیان

ہبۃ المشاع کا حکم:

سوال: زید نے بہ ہوش وحواس اپنے چار بھائیوں کو اپنی زمین ہبہ کردی اور زمین ان بھائیوں کے قبضہ میں ہے لیکن زمین کو تقسیم کر کے الگ الگ نہیں دی، زید کا انتقال ہوگیا اب زید کی بہنیں اس زمین میں وراثت کا مطالبہ کر رہی ہے، کیا ان کا مطالبہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: عام فقہاء یہ تحریر فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہبہ مشاع درست نہیں الا یہ کہ تقسیم کر کے دیدے، ہبہ مشاع کا مطلب مجموعہ کا ایک حصہ ہبہ کرنا ہے، فقہ کی عام کتابوں میں یہ مسئلہ بصراحت مذکور ہے اس کے حوالہ کی ضرورت نہیں، لیکن آج کل یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ ہبہ مشاع کا عام رواج ہو چکا ہے اور اسلامی قانون کے علاوہ دوسرے قوانین میں یہ ہبہ درست اور تام سمجھا جاتا ہے، بنابریں فقہاء نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ عرف عام جب نص فقہاء کے خلاف ہو تو عرفِ عام وعرفِ خاص کو ترجیح ہوگی تو بندہ کے خیال میں یہ ہبہ نافذ ہونا چاہئے، ہاں قبضہ دینا ضروری ہے، قبضہ ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ وامام احمدؒ کے نزدیک ضروری ہے، ہبہ مشاع میں قبضہ تو ہوگا لیکن قبضہ ناقص ہوگا قبضہ تام نہیں ہوگا۔

فقہ کی عام کتابوں میں یہ تحریر ہے کہ شریک اجیر نہیں بن سکتا یعنی دو بھائی کسی کاروبار میں شریک ہیں اور ایک بھائی کے لیے اس کے حصہ کے منافع کے ساتھ تنخواہ مقرر کریں تو یہ جائز نہیں ہے، لیکن حضرت مفتی رشید احمد

صاحبؒ نے لمبی تحقیق کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ: نص مذہب کوتعامل خاص سے بھی ترک کیا جاتا ہے اور کمپنی کے شرکاء کو اجیر رکھنے کا تعامل عام ہے، لہذا اس بطریق اولیٰ نص مذہب متروک ہوگی۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۳۲۸).

اس سے پہلے تحریر فرماتے ہیں:

ترکِ نص شرعی کے لیے تعامل عام شرط ہے مگر ترکِ نص مذہب کے لیے تعامل خاص بھی کافی ہے۔ (حوالہ بالا).

چند شواہد ملاحظہ فرمائیں:

☆ "سرحتک" کے جملہ کو پرانے فقہاء نے کنایات میں شمار کر کے طلاقِ بائن شمار کیا ہے، لیکن بعد والے فقہاء نے اس کو عرف کی وجہ سے صریح شمار کیا ہے اور بغیر نیت کے طلاق رجعی کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

☆ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف سلطان کی طرف سے اکراہ شمار کیا جاتا ہے، لیکن امام محمدؒ نے غیر سلطان کی طرف سے اکراہ کو بھی اکراہ شمار کیا ہے۔

☆ کتابوں کو کرایہ پر دینے لینے کو عام فقہاء نے ناجائز فرمایا ہے، لیکن بعض فقہاء نے عرف کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ کما مر فی موضعہ۔

☆ نیز تضمین الساعی وتضمین اجیر مشترک کا فتویٰ بھی عرف ہی کی وجہ سے صادر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نص حدیث عرفِ عام اور عرفِ خاص کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے ہیں، ہاں عرفِ عام کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ سکتے ہیں، مثلاً قفیز الطحان کی روایت عرفِ عام کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے لیکن اس پر قیاس شدہ دوسرے مسائل مثلاً کمیشن ایجنٹ جو فیصد پر کام کرتا ہو، عرفِ عام کی وجہ سے یہ جائز ہے، کیونکہ ضرورت کے علاوہ اس پر عرفِ عام بھی ہے، اسی وجہ سے مشائخ بلخؒ نے فیصد کے اعتبار سے اجرت کو جائز کہا ہے، یعنی وہ کپڑا اسی لے اور نصف یا ربع لے تو اس کو عرفِ عام سمجھ کر جائز کہا، اگرچہ علامہ شامیؒ کو اس کے عرفِ عام ہونے میں تامل ہے، (موجودہ زمانے میں اس کا اتنا رواج ہوگیا ہے کہ اب اس کے عرفِ عام ہونے میں کوئی شک نہیں۔)

لیکن نص مذہب یا ظاہر الروایہ کو عرفِ عام جو تمام بلاد میں ہو اور عرفِ خاص جو خاص بلاد میں ہو دونوں کی وجہ سے چھوڑ سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ شرح عقود رسم المفتی اور علامہ شامیؒ کا رسالہ نشر العرف اور عرف پر دوسری کتابوں میں موجود ہے، لہذا اگر ہبہ مشاع میں قبضہ دیکر بغیر تقسیم کے دینے کا عرفِ عام ہو اور آج کل یہ عرف ہے اور قانون بھی ہے تو اس

ہبہ کو تسلیم کرنا چاہئے غالباً اسی وجہ سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فیض الباری شرح صحیح بخاری (۳/۳۷۰) میں فرمایا ہے:

ثم اعلم أن هبة المشاع لاتتم في أصل المذهب وإن تحقق القبض أيضاً وأفتى المتأخرون بجوازها وبه أفتى وذلک لأني أتردد في نفس مسألة الشيوع فلست أشدد فيها كالحنفية ولا أوسع فيها كالبخاري بل هي أمر بين الأمرين كما علمت ، فإن مرضى الشرع وهو رفع الإبهام والتمييز، والشيوع يخل به ، فلا يكون هدراً، كما أهدره البخاري، ولا ضرورياً ، كما فهمه الحنفية ، بحيث قالوا ببطلان الهبة ؛ وبالجملة إذا كان حال الشيوع عندي ما سمعت، فلم أشدد فى الحكم ووافقت المتأخرين في جواز هبة المشاع عند القبض. (فیض الباری : ۳/۳۷۵،کتاب الهبة).

قدیم فقہاء میں سے جلیل القدر و رفیع الشان فقیہ علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط میں تحریر فرمایا ہے:

وبالإجماع هبة المشاع فيما لايحتمل القسمة تتم بالقبض وكذلک عندى فيما يحتمل القسمة جائز. (المبسوط للامام السرخسی: ۲۱/۶۹،ط:ادارة القرآن).

علامہ سرخسیؒ نے یہ عبارت کتاب الہبہ کے بعد کتاب الرہن میں لکھی ہے۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ نزاع نہ ہو اور اگر نزاع پیدا کرے کہ کونسا حصہ کون لے تو پھر صحیح نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فیض الباری میں ہے:

والذي أراه أن النهي عنه لكونه مفضياً إلى النزاع، وكل أمر يكون النهي عنه كذلک لا يشدد فيه الشارع بنفسه، بل ربما يغمض عنه أيضاً، فلا ينبغي التشدد فيه، ويدل عليه ما أخرجه البخاري...وفيه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لما كثرت عنده الخصومة في ذلک: فإما لا، فلا تبتاعوا حتى يبدو صلاح الثمر، كالمشورة يشيرها، لكثرة خصومتهم.

(فیض الباری: ۳/۳۷۲). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ولد صغیر کو ہبہ کرنے میں قبضہ کا حکم:

سوال: مکرمی حضرت مفتی صاحب گزشتہ دنوں میرے والد صاحب کا انتقال ہوا ہے، میرے والد

صاحب نے وفات سے سات مہینہ پہلے یوں کہا تھا کہ ’’یہاں افریقہ میں جو کچھ میرا ہے وہ میرے چھوٹے بیٹے حسین کا ہے‘‘اس کلام کے گواہ میں اور میرے بہنوئی عبداللہ اور میری بیوی ہے۔

لہذا قابلِ استفسار بات یہ ہے کہ اس سے ہبہ مکمل ہو جائیگا؟ جب کہ اس کے سوا کوئی بھی کاغذی کاروائی نہیں کی گئی تھی، یہ بات ملاحظہ ہو کہ ہمیں بقیہ بھائی بہنوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ آپ کے والد کا یہ کہنا کہ ’’یہاں افریقہ میں جو کچھ میرا ہے وہ میرے چھوٹے بیٹے حسین کا ہے‘‘ ہدیہ ہے، اور یاد رہے کہ والد کا اپنے چھوٹے نابالغ بیٹے کو کسی چیز کا ہبہ کرنا صرف عقد سے تمام ہو جاتا ہے یعنی قبضہ یا دیگر کاغذی کاروائی کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ باپ بذاتِ خود اپنے نابالغ اولاد کا ولی ہے، لہذا باپ کا قبضہ نابالغ اولاد کا قبضہ ہے، بنابریں ہبہ تام ہو گیا۔

ملاحظہ فرمائیں بدائع الصنائع میں ہے:

ولو نحل ابنه الصغير شيئاً جاز ويصير قابضاً له مع العقد كما إذا باع ماله منه حتى لو هلك عقيب البيع يهلك من مال الابن لصيرورته قابضاً للصغير مع العقد وينبغي للرجل أن يعدل بين أولاده في النحل لقوله سبحانه وتعالىٰ: ﴿إن الله يأمر بالعدل والإحسان﴾.

(بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع:٦/١٢٧،شرائط الهبة، منها القبض، سعيد).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۴/ ۳۹۱،الباب السادس في الهبة للصغير).

درمختار میں ہے:

وهبة من له ولاية على الطفل في الجملة تتم بالعقد أي بالإيجاب فقط، كما يشير إليه الشارح كذا في الهامش وهذا إذا أعلمه أو أشهد عليه والإشهاد للتحرز عن الجحود بعد موته والإعلام لازم لأنه بمنزلة القبض، بزازية، قال في التاتارخانية: فلو أرسل العبد في حاجة أو كان آبقاً في دار الإسلام فوهبه من ابنه صحت، فلو لم يرجع العبد حتى مات الأب لايصير ميراثاً عن الأب، قوله لو الموهوب معلوماً، قال محمدؒ: كل شيء وهبه لابنه الصغير وأشهد عليه وذلك الشيء معلوم في نفسه فهو جائز والقصد أن يعلم ما وهبه له والإشهاد ليس بشرط لازم لأن الهبة تتم بالإعلام تاتارخانية، قوله وكان في يده أو في يد مودعه لأن قبض الولي ينوب عنه والأصل أن كل عقد يتولاه الواحد يكتفى فيه بالإيجاب.

(الدر المختار مع فتاوی الشامی: ٥/٦٩٤ کتاب الهبة، سعید).

وفي التحرير المختار: قال الرحمتي: وهل يشترط أن يكون محوزاً مقسوماً كما هو الشرط في الهبة أو يقال إنماشرط ذلک لأجل تمام القبض وهو مقبوض لولي القبض فلا يفتقر لذلک. (تقریرات الرافعي: علی ردالمحتار: ٥/٢٥٢، کتاب الهبة،سعید).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال کا ماحصل یہ ہے کہ ایک شخص اپنے نابالغ بچوں کو کچھ سونا چاندی دے، تو نیت کرنے سے مالک بن جاتے ہیں یا قبضہ ضروری ہے؟ قبض ضروری ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: نابالغ اولاد کو ہدیہ دیا تو اولاد کی ملک کے لیے والد کا قبضہ ہی کافی ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۲۵۸).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

نابالغ کے باپ یا اس کے دیگر ولی یا وصی نے کوئی مال و جائیداد حاصل کی اور کہا کہ یہ میں نے فلاں نابالغ کے لیے حاصل کی ہے تو اس کا صرف یہ کہنا نابالغ کے حق میں ہبہ ہو جائیگا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص ۲۴۲، کتاب الہبۃ، دفعہ ۱۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہبہ کو معلق بالشرط کرنے کا حکم:

سوال: ہبہ معلق بالشرط صحیح ہے یا نہیں؟ مثلاً کوئی شخص کہے کہ اگر اس مہینہ میں میری شادی ہوئی تو یہ کتاب آپ کو ہدیہ ہے۔

الجواب: بصورتِ مسؤلہ ہبہ معلق بالشرط باطل ہے صحیح نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

ثانيها أن كل ما كان من التمليكات أو التقييدات كرجعة يبطل تعليقه بالشرط.

وقال الشاميؒ: قوله من التمليكات كبيع وإجارة واستئجار وهبة. (الدرالمختار مع فتاوی الشامی: ٥/٢٤١، سعید).

البحرالرائق میں ہے:

وفي البزازية من البيوع وتعليق الهبة بـ"إن" باطل وبـ"على" إن ملائماً كهبته على أن

يعوضه يجوز وإن مخالفاً بطل الشرط وصحت الهبة. (البحرالرائق:٦/١٩١،کوئٹه).

حاشية الطحطاوی میں ہے:

قوله و يصح تعليق هبة أی بشرط ملائم إن كان بـ"على" لا بـ"إن" قال فی البزازية من البيوع ...الخ. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:٣/١٣٦،باب المتفرقات،کوئٹه).

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

رجل قال لآخر: إن كان كذا فقد وهبت مالي منك لم يصح. (الفتاوی السراجية، ص٤٠٦،كتاب الهبةباب الهبة الجائزة والفاسدة).

وفي شرح المجلة: قال: والظاهر أن الفساد لكونه تعليق الهبة بالخطر. (شرح المجلة لمحمدالاتاسی:٣/٣٧١،كتاب الهبة).

وللاستزادة انظر: (تكملة ردالمحتار:٨/٤٢٧،كتاب الهبة، سعيد.والفتاوى الهندية:٤/٣٩٧).

خلاصہ یہ ہے کہ شرط ملائم ہوتو "على" کے ساتھ تعلیق صحیح ہے، لیکن "إن" کے ساتھ تعلیق صحیح نہیں ہے۔ البتہ علامہ شامیؒ نے ایک غیر مشہور قول نقل کیا ہے کہ "إن" کے ساتھ تعلیق بھی صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

لكن فی البحر أيضاً عن المناقب عن الناصحي: لو قال: إن اشتريت جارية فقد ملكتها منك يصح، ومعناه إذا قبضه بناء على ذلك، أی إذا قبض الموهوب له الموهوب بناء على التمليك يصح مع أنه معلق بـ"إن" وهو خلاف ما فی البزازية من إطلاق بطلانه، ولعله قول آخر يجعل التعليق بالملائم صحيحاً كالتقييد تأمل. (فتاوی الشامی:٥/٢٥٥،سعيد).

لیکن مشہور قول یہ ہے کہ "إن" کے ساتھ تعلیق صحیح نہیں ہے اس کی تائید رقبی والے مسئلہ سے ہوتی ہے جو طرفینؒ کے نزدیک باطل ہے۔

ملاحظہ ہو مبسوط میں ہے:

و هو أن يقول: أراقب موتك فراقب موتي فإن متُّ فهي لك وإن متَّ فهي لي فيكون هذا تعليق التمليك بالخطر و هو موت المملك قبله وذلك باطل. (مبسوط للامام السرخسیؒ: ١٢/٨٩،باب الرقبی، ادارة القرآن). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

گمشدہ چیز کے ہبہ کا حکم:

سوال: ایک آدمی کی گھڑی گم ہوگئی اس نے زید سے کہا کہ گمشدہ گھڑی اگر تم تلاش کرلوگے تو تمہاری ہے، اس نے گھڑی تلاش کی اور مل گئی اب گھڑی کا مالک اپنی بات پر پشیمان ہوا، کیا گھڑی زید کی ملکیت بنی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ گھڑی پر زید کی ملکیت ثابت نہیں ہوئی بلکہ بدستور مالک کی ملکیت میں ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

رجل أضل لؤلؤة فوهبها لآخر وسلطه على طلبها وقبضها متى وجدها قال أبويوسفؒ: هذه هبة فاسدة ، لأنها هبة على خطر ، و الهبة لا تصح مع الخطر، و قال زفرؒ : تجوز هذه الهبة. (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندية:۳/۳۸۱).

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

رجل سقطت منه لؤلؤة فوهبها من رجل وسلطه على الطلب و القبض فطلبها وقبضها فالهبة باطلة ، لأن في قيامها وقت الطلب خطراً، والهبة تبطل بالأخطار. (الفتاویٰ السراجية، كتاب الهبة، باب الهبة الجائزة و الفاسدة، ص۴۰۵).

وللاستزادة انظر: (فتاوى الشامي:۵/۶۸۸، كتاب الهبة، سعيد. والفتاوى الهندية:۴/۳۸۱. ومجمع الضمانات:۲/۷۱۴. ودرر الحكام فى شرح مجلة الاحكام:۲/۳۸۵، المادة:۸۵۲).

واللہ ﷻ اعلم۔

ہوائی جہاز کی شال لینے کا حکم:

سوال: ہوائی جہاز میں جو شال استعمال کے لیے دیتے ہیں، کیا اس کو ائیر ہوسٹس (Air hostess) کی اجازت سے لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: ہوائی جہاز کی شال خادمہ کی اجازت سے لینا درست نہیں، کیونکہ وہ اس شال کی مالکہ نہیں، اصل مالک کوئی اور ہوتا ہے، مزید براں اس پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ استعمال کے بعد واپس کردی جائے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ومنها (شرائط الهبة) أن يكون مملوكاً للواهب فلا تجوز هبة مال الغير بغير إذنه لاستحالة تمليک ما ليس بمملوک للواهب كذا في البدائع. (الفتاوی الهندية:٤/٣٧٤).

واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مسلم کو قرآن ہدیہ میں دینے کا حکم:

سوال: کیا غیر مسلم کو قرآن ہدیہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: غیر مسلم کے دل میں اگر قرآن مجید کی عظمت ہو اور اس کی طرف سے بے ادبی و بے حرمتی کا اطمینان ہو تو قرآن مجید ہدیہ میں دینا جائز اور درست ہے۔ ممکن ہے کہ اس کو ہدایت نصیب ہو جائے۔ لیکن اگر اس کے خلاف کا اندیشہ ہو تو دینا جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن عبد اللّٰه بن عمر ؓ عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم أنه كان ينهى أن يسافر بالقرآن إلى أرض العدو مخافة أن يناله العدو. (رواه مسلم: ٢/١٣١، باب النهى ان يسافر بالمصحف الى ارض الكفار اذا خيف وقوعه بايديهم).

نفع المفتی والسائل میں ہے:

الاستفسار: هل يجوز السفر إلى أرض العدو مع المصحف ؟

الاستبشار: من سافر إلى أرض العدو ليس له أن يخرج المصاحف إلا في جيش يؤمن عليهم من استيلاء الكفار. قال في التبيين شرح الكنز: لما فيه من تعريض المصحف على الاستخفاف، وهو المراد من قول النبي صلى اللّٰه عليه وعلى آله وسلم: "لا تسافروا بالقرآن في أرض العدو". وذكر الطحاوي أن هذا النهي كان في ابتداء الإسلام حيث كانت المصاحف قليلة، والقراء قليلين، فيخاف ذهاب بعض القرآن، وانتسخ ذلک حين كثرتهم، والأول أصح وأحوط، كذا في كشف الوقاية. (نفع المفتی والسائل، ص٤٣٦، مايتعلق بقراءة القرآن وسجدة التلاوة والمصاحف).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

اگر غیر مسلم کے دل میں قرآن مجید کی عظمت ہواور اس کی طرف سے اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ اس کی بے ادبی نہیں کرے گا تو اس کو قرآن مجید دینا جائز ہے، ممکن ہے کہ اس کو ہدایت نصیب ہو جائے مگر اس کو یہ ہدایت کردی جائے کہ یہ اللہ کا مقدس کلام ہے ناپاکی کی حالت میں اس کو چھونا اس کی عظمت کے خلاف ہے، لہٰذا ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کر کے ورنہ وضو کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے اس کو وضو اور غسل کا طریقہ بھی بتلا دیا جائے، اس سے اس کے دل میں قرآن مجید کی عظمت پیدا ہوگی، ان شاء اللہ درمختار میں ہے: **ويمنع النصراني (وفي بعض النسخ الكافر) من مسه وجوزه محمدؒ إذا اغتسل ولا بأس بتعليمه القرآن والفقه عسى يهتدي۔** (درمختار مع الشامی) غیر مسلم مکلّف بالاعمال نہیں ہے مگر قرآن مجید کو بے ادبی اور بے حرمتی سے محفوظ رکھنا اہم پر ضروری ہے....(فتاویٰ رحیمیہ:۲۸۳/۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مسلم کو خنزیر کی کھال کے جیکٹ کا ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے جیکٹ خرید ابعد میں معلوم ہوا کہ خنزیر کی کھال کا بنا ہوا ہے کیا وہ کسی غیر مسلم کو ہبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: خنزیر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ نجس العین ہے کسی بھی جزو کا استعمال جائز نہیں ہے، لہٰذا خنزیر کی کھال کا جیکٹ مسلمان کے لیے ممنوع ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ واپس کردے اور اپنا ثمن لے لے۔ اگر کسی وجہ سے واپسی ممکن نہ ہو تو بلا نیتِ ثواب کسی غیر مسلم کو دیدے، کیونکہ مسلمان کو مالِ حرام کا ہبہ درست نہیں۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ بینات میں ہے:

سوال: ہمارے ملک میں چائنا، اسپین اور دوسرے ممالک سے جو جوتے اور چمڑے کی مصنوعات آرہی ہے، ان میں سور (خنزیر) کی کھال استعمال ہو رہی ہے ...بعض جوتے ریگزین کے بنے ہوئے ہیں مگر ان کے اندر استر سور کی کھال کا ہے اور کچھ مکمل سور کی کھال کے بنے ہوئے ہیں...کیا یہ جوتے پہننا حرام ہے؟ کیا اس کی فروخت حرام ہے؟...جن دکاندار نے بھول سے کروڑوں روپے کا مال خرید لیا ہے، انھیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب باسمہ تعالیٰ: خنزیر کے نجس العین ہونے میں کوئی شک نہیں...فقہاء کرام نے اس کے تمام اجزاء کے استعمال اور ان کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے، اور وہ اشیاء جن میں خنزیر کے اجزاء اور کھال وغیرہ شامل

ہوں، اس کا بھی یہی حکم ہوگا، خنزیر اور اس کے اجزاء سے تیارشدہ اشیاء میں بیع منعقد ہی نہیں ہوتی اور اس کا ثمن (قیمت) بائع کے لیے حرام ہوتا ہے، بلکہ اس کی ملکیت میں بھی داخل نہیں ہوگا... جن لوگوں نے بھول کر ایسی مصنوعات خرید لی ہیں، وہ ان دکانداروں کو واپس کردیں اور اور دکانداروں کو چاہئے کہ وہ ان کمپنیوں کو مال واپس کردیں جن سے انہوں نے خریدا ہے، تاکہ وہ ان غیر مسلموں کو یہ مال ومصنوعات واپس کرکے اپنی رقم واپس لے سکیں۔ (فتاویٰ بینات، کتاب الحظر والاباحۃ، جلد چہارم، ص ۴۷۰۔۴۷۱، مکتبہ بینات).

معارف السنن میں ہے:

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء، قال: ومثله يقول ابن القيم في "بدائع الفوائد"، ...قال: والظاهر أن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوي به فراغ ذمته ولايرجو به المثوبة، نعم يرجوها بالعمل بأمر الشارع، وكيف يرجو الثواب بمال حرام ويكفيه أن يخلص منه كفافاً رأساً برأسٍ! ... وحديث ابن كليب أخرجه أبو داود في سننه (ص٤٧٣) في(باب اجتناب الشبهات) من كتاب البيوع: عن عاصم بن كليب عن أبيه عن رجل من الأنصار قال: خرجنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في جنازة...فلما رجع استقبله داعي امرأة، فجاء وجيء بالطعام فوضع يده، ثم وضع القوم فأكلوا فنظر آباؤنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يلوك لقمة في فمه، ثم قال: "أجد لحم شاة أخذت بغير إذن أهلها" فأرسلت المرأة، قالت: يارسول الله! إني أرسلت إلى البقيع يشتري لي شاة فلم أجد، فأرسلت إلى جار لي قد اشترى شاةً أن أرسل إلى بثمنها فلم يوجد، فأرسلت إلى امرأته، فأرسلت إلي بها، فقال رسول الله صلى الله عليه و سلم: أطعميه الأسارى اه، (رواه ابوداود:٢/١١٧،باب اجتناب الشبهات من كتاب البيوع). رواه الدارقطني في سننه(في باب الصيد والذبائح:٤/٢٨٦/٥٤). وفيه: فبينا هو يأكل إذ كف يده، وفيه أطعموها الأسارى، وفي طريق آخر: فلما أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم لقمته رمى بها. (في باب الصيد والذبائح:٤/٢٨٦/٥٥). (معارف السنن: ١/٣٤،٣٥،باب ماجاء لاتقبل صلاة بغيرطهور،تحت قوله : ولاصدقة من غلول،سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

بغیر قبضہ کے صدقہ وہبہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنے گھر میں ایک صندوقچہ (چھوٹا سا بکس) رکھا ہے اور اس میں للہ کی رقم جمع کرتا رہتا ہے، اس رقم سے اپنی واجب یا نفل قربانی کرنا چاہتا ہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ نفلی صدقہ اور ہبہ بغیر قبضہ کے تام نہیں ہوتے، لہذا جب تک قبضہ نہیں دیا اس کو اپنے استعمال میں لانا درست ہے، لہذا اس رقم سے واجب یا نفل قربانی کرنا بھی جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

اعلم أن التمليك بلفظ الصدقة كالتمليك بلفظ الهبة من حيث أنها لاتصح إلا بالقبض. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی،۳/۳۹۸).

تبيين الحقائق میں ہے:

والصدقة كالهبة لاتصح إلا بالقبض ولا في مشاع يحتمل القسمة لأنه تبرع كالهبة ويلزم فيها ما يلزم فی الهبة فامتنعت بدون القبض كالهبة. (تبیین الحقائق:۵/۱۰۴).

عالمگیری میں ہے:

الصدقة بمنزلة الهبة فی المشاع وغير المشاع وحاجتها إلى القبض. (الفتاوی الهندية:٤/٤٠٦).

وللاستزادة انظر: (شرح العناية على الهداية: ۹/۵۶. والبحر الرائق:۷/۲۹۷، کوئٹه. وفتح باب العناية :۳/۳۱۹. والاختيار لتعليل المختار : ۳/۲۶).

ہاں اگر یہ صندوقچہ مسجد یا کسی مدرسہ کا ہے اور کسی آدمی نے اس میں صدقہ، للہ کی رقم ڈالی تو عرف میں یہ مسجد یا مدرسہ کو سپرد کر دینے کے مترادف ہے، کیونکہ صندوقچہ کا قبضہ مسجد کے متولی کے قبضہ کی طرح ہے، لہذا یہ رقم واہب کی ملکیت سے نکل گئی اب رجوع کرنا صحیح نہیں ہے، بایں وجہ ایسے صندوقچہ سے اپنی نفل یا واجب قربانی کرنا درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

ويظهر لي من مجموع هذه النقول أن الهبة كما تنعقد بالألفاظ الدالة على التمليك

مجازاً لغة أو عرفاً، تنعقد أيضاً بالفعل بطريق التعاطي، لكن مع قرينة لفظية أوحالية ، ومنها العرف والعادة، تعين أن ذلک الفعل أريد به التمليک. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی: ۳۴۹/۳) . واللہ تعالیٰ اعلم۔

کاغذات پر قبضہ سے ہبہ کی تکمیل کا حکم:

سوال: کسی زمین یا دکان کے ہبہ کی تکمیل کے لیے ان کے کاغذات کا قبضہ کافی ہے یا اس کو خالی کر کے موہوب لہ کے ہاتھ میں دینا ضروری ہے؟

الجواب: جائیداد کے ہبہ کی تکمیل کے لیے کاغذات پر قبضہ کافی ہے، یعنی کاغذات پر قبضہ کر لینے سے ہبہ تام ہو جائیگا۔ ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

وفي العقار ما يناسبه فقبض مفتاح الدار قبض لها. (حاشية الطحطاوی علی الدر المختار: ۳۹۵/۳).

شرح مجلّہ میں ہے:

إعطاء مفتاح العقار الذي له قفل للمشتري يكون تسليماً إذا تهيأ له فتحه من غير تكلفة ،كما في البحر ومثله في الهندية والتاتارخانية وغيرهما، والظاهر أن المراد بتهيؤه فتحه من غير تكلف، أن يكون المفتاح مفتاح ذلک العقار، وهومعنى مافي الخانية ونصها: ولو باع الدار وسلم المفتاح فقبض المفتاح ولم يذهب إلى الدار يكون قابضاً. (شرح المجلة،لمحمد الاتاسی،۲/ ۱۹۹ ،المادة : ۲۷۱).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

شیئرز سرٹیفکیٹ حاصل ہونے کے بعد خریدار کا اس پر قبضہ متحقق ہو جاتا ہے۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۹/۱۶).

نیز مذکور ہے:

عرف میں شیئرز کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب کہ سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے ، نیز ہر چیز کے قبضہ کا طریقہ عرف ہی سے متعین ہوتا ہے،...نیز عرف میں اکثر لوگ بغیر کاغذی ثبوت کے قبضہ کا اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۲۶/۱۶). واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہبۃ المشاع من الشریک کا حکم:

سوال: کاغذات میں بیوی اور شوہر کی مشترکہ دکان ہے، شوہر نے بہت سارے لوگوں کے سامنے کہا کہ میں نے یہ دکان بیوی کو دیدی اور قبضہ بیوی کا ہے شوہر بھی دکان پر جاتا ہے لیکن باہر کا کام زیادہ کرتا ہے تو بیوی اس دکان کی مالکہ بن گئی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شوہر کا یہ کہنا کہ میں نے یہ دکان بیوی کو دیدی ہبہ ہے اور قبضہ تو پہلے سے بیوی ہی کا تھا لہذا ہبہ تام ہو گیا اور بیوی دکان کی مالکہ بن گئی، کاغذات میں جس کا نام ہو شرعی ہبہ اس سے متاثر نہ ہوگا۔ پھر چونکہ دکان اکثر غیر منقسم چیز کی طرح ہے لہذا بغیر تقسیم کے اس کا ہبہ درست ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی قاضیخان میں ہے:

وفيما لا يقسم كالعبد والدابة والثوب والحمام يجوز هبة المشاع من الشريك وغيره في قولهم جميعاً . (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندية:۳/۲٦۷، کتاب الهبة).

وفي الفتاوى الهندية: وهبة المشاع فيما لا يحتمل القسمة تجوز من الشريك ومن الأجنبي كذا في الفصول العمادية. (الفتاوی الهندية:٤/۳۷۸، الباب الثاني فيمايجوز من الهبة ومالايجوز).

(وكذا في فتاوى الشامي :۵/۲۹۲ ،سعيد.وبدائع الصنائع:۶/۱۱۹ ،سعيد).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

محض کاغذی طور پر جائیداد کے واہب کے نام ہونے سے ہبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۴۵۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ بچوں کی اشیاءِ کہنہ کے ہدیہ کا حکم:

سوال: اگر چھوٹے بچے کے کپڑے پرانے ہوجائے تو وہ بطورِ صدقہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟ یا اس کی قیمت لگا کر بچے کے لیے قیمت رکھنا چاہئے اور کپڑے اپنی طرف سے صدقہ کرنا چاہئے؟

الجواب: برائے کودکاں جو اشیاء تملیکاً خریدی جاتی ہیں، بچے ان کے مالک ہیں، لہذا بچوں کی طرف سے صدقہ ہبہ وغیرہ درست نہیں ہے، **لأن الصبي لايملك التبرع** ، ہاں ان کی مناسب قیمت لگا کر بچوں

کے لیے قیمت رکھلے اس کے بعد اپنی طرف سے ان اشیاء کا ہبہ کرنا جائز ہوگا۔ اگر عرف میں یہ اشیاء عاریۃً دی جاتی ہوں تو پھر دوسروں کو دے سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو فتاوی قاضیخان میں ہے:

رجل اتخذ ثياباً لولده الصغير ثم أراد أن يدفع إلى ولد له آخر لم يكن له ذلك، لأنه لما اتخذ ثياباً لولده الأول صار ملكاً للأول بحكم العرف فلا يملك الدفع إلى غيره إلا إذا بين عند اتخاذه للأول أنه عارية فحينئذٍ يملكه لأن الدفع إلى الأول يحتمل الإعارة فإذا بين ذلك صح بيانه... ولايجوز للأب أن يهب شيئاً من مال ولده الصغير بعوض وغيرعوض لأنها تبرع ابتداءً. (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندية: ٢٨٠،٢٧٩/٣، فصل فی هبة الوالد لولده والهبة للصغير).

وفي الفتاوى الهندية: رجل اتخذ لولده أولتلميذه ثياباً ثم أراد أن يدفع إلى ولده الآخر أو تلميذه الآخر ليس له ذلك إلا أذا بين وقت الاتخاذ أنها عارية. (الفتاوى الهندية: ٣٩٢/٤). **(وكذا في الفتاوى الهندية: ٤٠٠/٤. والبحرالرائق: ٢٨٨/٧، كتاب الهبة. وجامع احكام الصغار المجلد الاول، في مسائل الهبة).**

وقال في الدر المختار: اتخذ لولده أو لتلميذه ثياباً ثم أراد دفعها لغيره ليس له ذلك مالم يبين وقت الاتخاذ أنها عارية . وفي تكملة ردالمحتار: قوله اتخذ لولده أي الصغير وأما الكبير فلا بد من التسليم،...وفي البزازية اتخذ لولده الصغير ثياباً يملكها، وكذا الكبير بالتسليم... قوله مالم يبين قال في البحر: وإن أراد الاحتياط يبين أنها عارية حتى يمكنه أن يدفع إلى غيره ، وفي الحاوي الزاهدي برمز بم دفع لولده الصغير قرضاً فأكل نصفه ثم أخذه منه ودفعه لآخر يضمن إذاكان دفعه لولده على وجه التمليك، وإذا دفعه على وجه الإباحة لايضمن قال عرف به أن مجرد الدفع من الأب إلى الصغيرلايكون تمليكاً وأنه حسن. (الدر المختار مع تكملة ردالمحتار: ٤٥٣/٨، سعيد).

وفي الشامية ايضاً في باب القرض : قال في الهداية: فإن تأجيله لايصح لأنه إعارة وصلة في الابتداء حتى يصح بلفظ الإعارة ولايملكه من لايملك التبرع كالوصي

والصبي. (فتاوی الشامی: ۱۷/٤، سعید).

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

بچوں کے لیے جو جوتے، کپڑے عام گھروں میں بنائے جاتے ہیں ان میں احتیاطاً ایسا کرنا چاہئے کہ ان کو بچوں کی ملک نہ بنائیں اپنی ہی ملکیت میں رکھیں تا کہ ایک بچہ کے بدن پر کپڑا چھوٹا ہو جائے تو وہ دوسرے بچے کو پہنا سکیں اور اگر کپڑا بچے کی ملک کر دیا گیا ہے تو پھر باپ کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ یہ کپڑا کسی دوسرے بچے کو پہنا دے۔ (مجالس حکیم الامت مع ملفوظات، ص۲۷).

نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی اسی طرح تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: (مجالس مفتی اعظم، ص۱۸۱، ۱۸۲، بعنوان ''نابالغ کا حق ادا کرنے کا طریقہ'')۔ واللہ ﷻ اعلم۔

معمولی چیز بچے کی طرف سے ہدیہ دینے کا حکم:

سوال: اگر ان اشیاء کی کوئی خاص قیمت نہ ہو تو بچے کے ایصالِ ثواب کے لیے وہ کپڑے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس میں خاص مصلحت کو دیکھا جائیگا یا نہیں؟ مثلاً بچے کو استاذ کی خدمت میں لگانا مصلحت ہے۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے مصالحِ کودکاں کو بالکل نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی مصلحتوں اور نفع کو مقدم رکھا ہے اسی وجہ سے بچے کی اشیاء میں ولی کے لیے تبرع کو روا نہیں رکھا کہ اس میں بچے کا نقصان ہے، لیکن اگر بچوں کی ملکیت میں ایسی اشیاء ہوں جن کی کوئی خاص قیمت نہیں ہے تو پھر بچے ہی کے نفع کی خاطر صدقہ یا ایصالِ ثواب کرنے میں چنداں حرج نہیں، ہاں اگر اچھی خاصی قیمت ہو تو پھر بلا معاوضہ دینا درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو جامع احکام الصغار میں ہے:

وفي فوائد صاحب المحيط ذكر شمس الائمة في كتاب الوكالة للأب أن يعير ولده الصغير، وليس له أن يعير ماله قال: و تأويل هذا إذا كان ذلك في تعليم الحرفة بأن دفعه إلى أستاذ ليعلمه الحرفة ويخدم أستاذه أما إذا كان بخلاف ذلك لايجوز. (جامع احكام الصغار للعلامة الاستروشني: ۱/۱۷۱، فی مسائل العارية).

وفيه أيضاً: لأن التصرف للصبي مقيد بالنظر. (جامع احكام الصغار للعلامة الاستروشني: ۱/۲۱۵، فی مسائل الاجارات).

وفيه أيضاً : لو وهب داراً لابنه الصغير ثم اشترى بها داراً أخرى فالثانية لابنه الصغير أيضاً .(جامع احکام الصغار للعلامة الاستروشنی:١/١٧٦، فی مسائل الهبة۔وکذا فی الفتاوی الهندية:٤/٣٩٢).

وقال أيضاً : إذا آجر الأب أو الجد أو وصيهما الصبي في عمل من الأعمال فهو جائز لأن لهؤلاء ولاية استعمال الصغير من غير عوض بطريق التهذيب و الرياضة فمع العوض أولىٰ .(جامع احکام الصغار للعلامة الاستروشنی:١/٢١٤، اوائل الاجارة).

وفيه أيضاً : وفي آخر الفصل الثامن من إجارات الذخيرة وهكذا نقول فيمن سكن دار صغير أو حانوت صغير و أنه معد للاستغلال أنه يجب أجر المثل، إلا إذا انتقص بسبب سكناه وضمان النقصان انفع في حق الصغير فحينئذٍ يجب ضمان النقصان. (جامع احکام الصغار علی هامش جامع الفصولين:١/٢١٩، فی مسائل الاجارات).

وفي الفتاوى الهندية: قبول الهبة من الصبي صحيح إذا تمحضت الهبة منفعة في حق الصغير، أما إذا كان في هذا ضرر للصبي لايصح حتى أنه إذا وهب رجل لصبي عبداً أعمى أو تراباً في دار قيل: إن كان يشترى منه ذلک فإنه يصح قبوله ولا يرد ، وإن كان لايشترى منه بشيء ويلزمه مؤونة النقل ونفقة العبد فإنه يرد ذلک .(الفتاوی الهندية:٤/٣٩٣).

واللہ ﷻ اعلم۔

دودھ کے ڈبے کو ہدیہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنے چھوٹے بچے کے لیے دودھ کا ڈبہ خریدا اب اگر اس دودھ کی ضرورت بچے کو نہ ہو تو یہ ڈبہ کسی اور بچے کو دے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء کے قول کے مطابق اشیائے خوردنی جو بچہ کو ہدیہ میں حاصل ہوئی ہیں والدین کا کھانا جائز ہے، لہذا جن اشیاء خوردنی سے بچہ مستغنی ہو گیا ہے وہ کسی دوسرے کو دینا بھی جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو جامع احکام الصغار میں ہے:

إذا أهدى الصغير شيئاً من المأكولات روي عن محمدؒ أنه يباح لوالديه وشبه ذلک بضيافة المأذون وأكثر مشايخ بخارى على أنه لايباح ، وفي كراهية التجنيس إذا أهدى الفواكه إلى الصبي الصغير يحل للأب والأم الأكل إذا أريد بذلک بر الأب والأم لكن

أهدى إلى الصغير استصغاراً للهدية، لجواز الذي يلعب به الصبيان يوم العيد يؤكل لما روي عن ابن عمر رضي الله عنه أنه كان يشتري الجوز لصبيانه يوم الفطر يلعبون به ويأكل منه وهكذا فعل علي رضي الله عنه بجواريه. (جامع احكام الصغار:١/١٤٦، في مسائل الكراهية).

درمختار میں ہے:

ويباح لوالديه أن يأكلا من مأكول وهب له وقيل لا، انتهى فأفاد أن غير المأكول لايباح لهما إلا لحاجة. وفي الشامية: قال في التاتارخانية روي عن محمدؒ نصاً أنه يباح، وفي الذخيرة وأكثر مشايخ بخارى على أنه لايباح . (الدر المختار:٥/٦٩٦،سعيد).

قال العلامة الفقيه طاهربن عبد الرشيد البخاري: وفي الفتاوىٰ: رجل وهب للصغير شيئاً من المأكول يباح للوالدين أن يأكلا منه كذا روي عن محمدؒ. (خلاصة الفتاوىٰ:٤/٤٠٠،جنس آخر في الهبة من الصغير۔و كذا في البحر الرائق:٧/٢٨٨،نقلاً عن الخلاصة). واللہ ﷻ اعلم۔

بچے کی رقم اس کے اخراجات میں لگانے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے نابالغ لڑکے کو کسی نے یا خود والد نے کچھ رقم ہبہ کر دی، اس رقم سے اس بچے کے لیے کپڑے وغیرہ خرید سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا بچے کے اخراجات والد خود اپنی طرف سے برداشت کریگا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بچہ کے پاس جب رقم موجود ہو تو والد اس رقم سے اس کے اخراجات پورے کرسکتا ہے، لیکن والد بچے کی رقم کو فضولیات میں خرچ نہیں کرسکتا، بچوں کے اموال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

فإن نفقة المملوك على مالكه والغني في ماله الحاضر. وفي الشامية: قوله في ماله الحاضر، يشمل العقار والأردية والثياب ، فإذا احتيج إلى النفقة كان للأب بيع ذلك كله وينفق عليه لأنه غني بهذه الأشياء بحر، وفتح. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:٣/٦١٢،سعيد).

وفي البحر الرائق: الصغير إذا كان له مال فنفقته في ماله . (البحر الرائق: ٤/٢٠١، كوئته).

وفي الفتاوى الهندية: إرضاع الصغير إذا كان يوجد من ترضعه إنما يجب على الأب

إذا لم يكن للصغير مال وأما إذا كان له مال فتكون مؤنة الرضاع في مال الصغير كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية:١/ ٥٦٠).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: نابالغ بچوں کوان کے نانا یا دادا کچھ عطا کریں تو اس عطا کو بچوں کے ماں باپ ان بچوں پر کس طرح سے صرف کریں، اگر روٹی کپڑے میں صرف کیا جائے تو یہ ماں باپ کے ذمہ ہے، تاوقتیکہ بالغ ہوں، تو اس عطا کو امانۃً جمع کریں بلوغ تک یا شیرینی وبالائی میں خرچ کردیویں، کیا صورت کریں؟

الجواب: **في الدر المختار: ولطفله الفقير الحر لأن نفقة المملوك على ملكه والغني في ماله الحاضر**، اس روایت سے معلوم ہوا کہ جو نابالغ مالک کسی مال کا ہو اول نفقہ اسی مال میں ہوگا، مال کے ہوتے ہوئے باپ پر واجب نہ ہوگا پس صورتِ مذکورہ میں یہ عطیات اس نابالغ کے ضروری نفقات میں صرف کردئے جائیں۔(امداد الفتاویٰ:۳/ ۴۸۰، کتاب الہبۃ).

دوسری جگہ مذکور ہے:

اگر اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی وہ مالدار ہوں یعنی کسی طور پر ان کی ملک میں مال آگیا ہو خواہ بطورِ ہبہ کے یا بطورِ میراث کے، سو اس حالت میں ان کا نان ونفقہ خود ان کے مال میں واجب ہے والدین کے ذمہ صرف انتظام کرنا ہے۔(امداد الفتاویٰ:۲/ ۵۴۳). واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ بچے کا ہدیہ قبول کرنے کا حکم:

سوال: استاذ نابالغ بچے کا ہدیہ قبول کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر کوئی چیز بچوں کو استعمال کے لیے دی جائے تو والدین کی اجازت سے دوسروں کو دینا جائز ہے بنا بریں استاذ کو قبول کرنا بھی جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو امداد المفتیین میں ہے:

لڑکے جو انعام دیتے ہیں دو شرطوں سے جائز ہے اول یہ کہ اگر لڑکے خود بالغ ہیں تو اپنی رضا سے دیں اور اگر نابالغ ہیں تو ان کے والدین کا راضی ہونا شرط ہے، (والدین کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ والدین کا مال ہے) دوسرے یہ کہ مدرس اپنا طرز ایسا نہ ڈالے جس سے طلبہ کو یہ معلوم ہو کہ اگر انعام نہ دیں گے تو ہمیں

نقصان پہنچے گا۔ (امداد المفتین، جلد دوم، ص۷۳۳، کتاب الہبۃ والصدقۃ، دار الاشاعت)۔
شرح مجلّہ میں ہے:

لو أحضر الصغير لأحد هدية وقال له أرسلني أبي بهذه الهدية لک فلذلک الشخص تناول تلک الهدية مالم يقع في قلبه أن الصغير المذكور كاذب في قوله هذا.

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام: ۲/ ۳۹۸، دار الكتب العلمية بيروت).

وفي جامع أحكام الصغار: وفي هبة الملتقط: صبي أهدى وقال: إني أرسل إليک بهذه الهدية يحل له التناول إلا أن يقع في قلبه أنه كاذب . (جامع احكام الصغار: ۱/ ۱۸۳، فى مسائل الهبة). (وكذا فى الفتاوى الهندية: ۴/ ۳۹۳، قبول الهدية من الصغير). **واللہ ﷻ اعلم۔**

والد کا بیٹے کو دکان ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک والد نے اپنے بیٹے کو ایک دکان ہبہ کی باپ تصرف نہیں کرتا ہے، صرف بیٹا تصرف کرتا ہے، لیکن والد روزانہ دکان پر آ کر بیٹھتا ہے، حساب کتاب وغیرہ سب امور بیٹا ہی انجام دیتا ہے، شرعاً بیٹے کا قبضہ ہو گیا یا نہیں؟ اور اگر والد بھی تصرف کرتا ہے تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر باپ نے بیٹے کو دکان ہبہ کر کے قبضہ بھی دیدیا تو دکان بیٹے کی ملکیت میں آ گئی، اگر چہ قبضہ کے بعد باپ کبھی کبھی یا ہمیشہ بیٹھتا ہو، اور اگر باپ نے ہبہ کر لیا لیکن دکان اپنے قبضے میں رکھی تو بیٹے کی ملکیت نہیں آئی دکان بدستور باپ کی ملکیت میں رہے گی۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

وشرائط صحتها فى الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميزاً غير مشغول. وفى الشامية: وتصح الهبة بـ"كوهبت"، وفيه دلالة على أن القبول ليس بركن كما أشار إليه فى الخلاصة وغيرها، وذكر الكرماني أن الإيجاب فى الهبة عقد تام ، وفى المبسوط أن القبض كالقبول فى البيع . (فتاوى الشامى مع الدر المختار: ۵/ ٦۸۸، كتاب الهبة، سعيد).

(وكذا فى تبيين الحقائق: ۵/ ۹۲، ملتان).

وفى ردالمحتار: وفى شرح المجمع لابن ملک عن المحيط لو كان أمره بالقبض

حین وهب لایتقید بالمجلس ویجوز قبضه بعده . (فتاوی الشامی:٥/٦٨٨، کتاب الهبة، سعید).

نیز مذکور ہے:

وفي خزانة الفتاویٰ: إذا دفع لابنه مالاً فتصرف فیه الابن یکون للأب إلا إذا دلت دلالة التملیک بیری، قلت: فقد أفاد أن التلفظ بالإیجاب والقبول لایشترط بل تکفی القرائن الدالة علی التملیک کمن دفع لفقیر شیئاً وقبضه ولم یتلفظ واحد منهما بشيء.

(فتاوی الشامی:٥/٦٨٨، کتاب الهبة، سعید).

وفی الفتاوی الهندیة: رجل دفع إلی ابنه في صحته مالاً یتصرف فیه ففعل وکثر ذلک فمات الأب إن أعطاه هبة فالکل له وإن دفع إلیه لأن یعمل فیه للأب فهو میراث کذا في جواهر الفتاویٰ. (الفتاوی الهندیه:٤/٣٩٢).

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکمل تصرفات بیٹے کے ہاتھ میں ہے تو بیٹے کا قبضہ سمجھا جائے گا اور ہبہ تام ہو جائیگا، اور اگر باپ نے تمام تصرفات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں تو قبضہ متحقق نہ ہونے کی وجہ سے ہبہ تام نہیں ہوگا۔

واللہ ﷻ اعلم۔

بغیر قبضہ کے صرف زبانی ہبہ کا حکم:

سوال: ایک باپ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ میں نے تجھ کو یہ گھر دے دیا لیکن گھر بیٹی کے نام پر رجسٹر نہیں کیا والدین اس گھر میں رہتے تھے اور گھر کا سارا خرچہ برداشت کرتے تھے، بیٹی اور والدین سب سمجھتے تھے کہ یہ گھر بیٹی کا ہے، اب والدین کے مرنے کے بعد دوسرے ورثاء اس گھر میں اپنے حق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور بیٹی دعویٰ کر رہی ہے کہ والدین نے اس کو یہ گھر ہبہ کر دیا، برائے مہربانی بتلا دیجئے کہ گھر کا صحیح مالک کون ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ باپ نے بیٹی کو صرف زبانی طور پر گھر ہبہ کیا تھا اور باپ نے بیٹی کو اپنی زندگی میں مالکانہ قبضہ نہیں دیا تھا، لہذا ہبہ صحیح نہیں ہوا اور گھر تمام ورثاء کے درمیان حسبِ سہام شرعی تقسیم ہوگا۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

منها (شرائط الهبة) أن یکون الموهوب مقبوضاً حتی لایثبت الملک للموهوب له قبل القبض . (الفتاوی الهندیة:٤/٣٧٤).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

ہبہ تام اور صحیح ہونے کے لیے قبضہ کامل شرط ہے، درمختار میں ہے: **شرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميزاً غير مشغول ...وتتم الهبة بالقبض الكامل**. (الدر المختار: ٥/٦٨٨).

لہٰذا جب کہ مرحوم تاحین وفات جائداد پر خود ہی قابض ومتصرف رہا ہے اور اس کی زندگی میں لڑکا اور لڑکی کا مالکانہ قبضہ اور تصرف ثابت نہیں ہے تو یہ ہبہ معتبر نہیں ہے، جملہ ورثاء وارث ہیں وہ اپنے حصے لے سکتے ہیں فتاویٰ مہدویہ میں ہے:

إذا مات الواهب قبل قبض الموهوب له الهبة بطلت وتكون ميراثاً من الواهب كما في متروكاته. (٤/٥٧٣).(ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ:٣/١٧٧). واللہ ﷻ اعلم۔

بروزِ عاشوراء ہدیہ دینے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:۔

(۱) عاشوراء کے دن ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کا کیا حکم ہے؟

(۲) عاشوراء کے دن خاندان والوں کا جمع ہونا کیسا ہے؟

(۳) عاشوراء کے موقع پر مبارک باد دینا محض خوشی کی وجہ سے ٹھیک ہے یا نہیں؟

آج کل موبائل کے ذریعہ میسیج بھیجنے کا رواج ہے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ کا قانون یہ ہے کہ جو کام سنت ومستحب نہ سمجھا جائے اس کی اصل کا ثبوت کافی ہے، اور اصولِ مسلمہ عندالشرع سے متصادم نہ ہو، تو اس کام کے کرنے کی گنجائش ہوگی شریعتِ مطہرہ میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں:۔ مثلاً تعویذ یا دم کے لیے مطلق ثبوت کافی ہے، خصوصی ثبوت کی ضرورت نہیں، بنابریں عاشوراء کے دن ہدیہ دینا اظہارِ مسرت اور الفت ومحبت کی خاطر درست ہے جب کہ ضروری اور سنت نہ سمجھیں، لیکن جہاں ضروری سمجھا جاتا ہو اور نہ دینے والوں پر نکیر کی جاتی ہو تو وہاں درست نہیں اس سے بچنا چاہئے۔

لیکن ایسے امور آہستہ آہستہ غلط رسم ورواج بن جاتے ہیں یا ان کو شریعت کی طرح سمجھا جاتا ہے اس لیے ان امور سے احتراز کرنا بہتر ہے۔

مطلق ہدیہ کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) روی البخاری عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: يا نساء المسلمات لاتحقرن جارة لجاتها ولو فرسن شاة. (رواہ البخاری: ۱/۳۴۹).

(۲) وروی أيضاً عنه عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لو دعيت إلى ذراع أو كراع لأجبت ولو أهدى إلي ذراع أو كراع لقبلت. (رواہ البخاری: ۱/۳۴۹).

(۳) وروی أيضاً عن ابن عباس رضي الله عنه قال: أهدت أم حفيد خالة ابن عباس رضي الله عنه إلى النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم أقطاً وسمناً وأضباً فأكل النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الأقط والسمن.... (رواہ البخاری: ۱/۳۵۰).

وعن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم كان يقبل الهدية ويثيب عليها. (رواہ البخاری: ۱/۳۵۲).

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: "تهادوا تحابوا". (رواہ البیھقی فی سننہ الکبری، والبخاری فی الادب المفرد).

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: "تهادوا فإن الهدية تذهب وحر الصدر ولاتحقرن جارة لجارتها ولوشق فرسن شاة" (رواہ الترمذی).

وعن أنس بن مالک رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: يا معشر الأنصار تهادوا فإن الهدية تحل السخيمة وتورث المودة. (مجمع الزوائد: ۴/۱۷۲).

عاشوراء کے دن اہل خاندان کا جمع ہونا:۔

عاشوراء کے دن اہل وعیال کو اچھا اور خوب کھانا کھلانا احادیث اور کتب فقہ سے ثابت ہے، لیکن اس کے لیے جمع ہونا لازم نہیں، بلکہ کبھی کبھی جمع ہوجایا کریں تو ٹھیک ہے جب کہ اس کے ساتھ منکرات وغیر شرعی امور نہ ہوں، ہاں اکثر جمع ہونے سے بچنا چاہئے۔

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ تنبیہ الغافلین میں فرماتے ہیں:

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: من وسع على عياله يوم عاشوراء وسع اللّٰہ عليه سائر السنة، قال سفيان: جربناه فوجدناه كذلك. (۱/۳۳۲).

یہ روایت اگر چہ ضعیف ہے لیکن فضائل اعمال میں اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے نیز فقہاء نے بھی اس حدیث کو قابل عمل فرمایا ہے۔

اس روایت کی تحقیق، جلد اول ابواب الحدیث ص ۲۹۳، پر گزر چکی ہے۔

عاشوراء کے دن مبارک بادی دینا:۔

یہ عمل بھی خوشی او عیدین کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، لہذا اگر ضروری نہ سمجھیں بلکہ محض باعثِ مسرت سمجھ کر مبارک بادی دے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن ایسی چیزیں آہستہ آہستہ شرعی حکم کی طرح سمجھی جاتی ہیں اس لیے ان رسوم سے بچنا چاہئے۔

أخرج الطبراني برواية حبيب بن عمر الأنصاری عن أبيه قال: لقيت واثلة بن الأسقع يوم عيد فقلت: تقبل اللّٰه منا ومنک، فقال: نعم، تقبل اللّٰه منا ومنک. (المعجم الكبير للطبراني: ۱۵/۴۳۰/۱۷۵۸۹). (وكذا في مجمع الزوائد: ۲/۴۴۲، التهنية بالعيد).

وأخرج البخاري عن عبد اللّٰه بن كعب بن مالک عن أبيه في حديث طويل في قصة غيابه عن غزوة تبوک ثم إجابة اللّٰه توبته بعد خمسين يوماً تقريباً، يحكي حال مجيئته إلى المسجد بقوله: قال كعب رضي الله عنه حتى دخلت المسجد فإذا برسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم جالس حوله الناس فقام إلى طلحة بن عبيد اللّٰه رضي الله عنه يهرول حتى صافحني وهناني إلى آخر الحديث. (رواه البخاري: ۲/۶۳۶).

وفي كشف الخفاء: التهنية بالشهور والأعياد مما اعتاده الناس، قال في المقاصد: مروي في العيد أن خالد بن معدان لقي واثلة بن الأسقع رضي الله عنه في يوم عيد فقال له: تقبل اللّٰه منا ومنک، فقال له مثل ذلک، وأسنده إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لكن الأشبه فيه الوقف، وله شواهد عن كثير من الصحابة رضي الله عنهم بينها الحافظ في بعض الأجوبة...وروي في المرفوع من جملة حقوق الجار إن أصابه خير هنأه...بل أقوى منه ما في الصحيحين في قيام طلحة رضي الله عنه لكعب رضي الله عنه وتهنيته بتوبة اللّٰه عليه. (كشف الخفاء: ۱/۳۲۰).

وكذا في (المقاصد الحسنة، ص ۹۲).

قال في الدر: ندب...وإظهار البشاشة وإكثار الصدقة والتختم والتهنئة بتقبل اللّٰه منا

ومنكم لاتنكر. قال الشاميؒ: وقال المحقق ابن أمير حاج: بل الأشبه أنها جائزة مستحبة ....ثم ساق آثاراً بأسانيد صحيحة عن الصحابةؓ في فعل ذلك. (الدر المختار مع فتاوى الشامي:۲/۱٦۹، باب العيدين، سعيد).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلد دوم ص۵۸۲، بعنوان عیدین کے موقع پر مبارک بادی دینا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی پہلے ہی سے رسومات سے بھری ہوئی ہے، لہذا ہدایا کی رسم اور مبارک باد دینے کی رسم قابل ترک ہے، اگر چہ اس کو دین کا حصہ نہ سمجھے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غیر اسلامی تقریبات پر ہدایا کا حکم:

سوال: کرسمس اور دیگر غیر اسلامی تقریبات کے موقعوں پر تحفے تحائف لینے دینے کا کیا حکم ہے؟ کیا تجارتی تعلقات کی وجہ سے انہیں دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ وہ ہماری اسلامی تقریبات میں ہمیں بھی تحفے دیتے ہیں، اور ان کو دینے میں تعلقات نبھانا مقصود ہے ان کے دین کی تعظیم مقصود نہیں ہے، تو کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر ان کے دین کی تعظیم مقصود نہ ہو بلکہ ظاہری دوستی یا ظاہری تعلقات نبھانا مقصود ہو تو تحفے تحائف کی گنجائش ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ کرسمس کے دن نہ دے بلکہ آگے پیچھے دیدے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ولو أهدى لمسلم ولم يرد تعظيم اليوم بل يجرى على عادة الناس لايكفر وينبغي أن يفعله قبله أو بعده نفياً للشبهة. (فتاوى الشامي:٦/٧٥٤، سعيد).

امداد الفتاویٰ میں حضرت تھانویؒ فقہی عبارات نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ان روایات سے مہادات مسئول عنہا کے احکام کی تفصیل معلوم ہوگئی کہ اگر کوئی ضرر دینی نہ ہو تو کفار مصالحین سے ہدایا کا لین دین جائز ہے اور اس سے اکثر سوالوں کا جواب حاصل ہوگیا، صرف دو جزو خاص قابل تعرض کے باقی رہ گئے، ایک یہ کہ ہدیہ دیوالی کا شاید اس تہوار کی تعظیم کے لیے ہو جس کو فقہاء نے سخت ممنوع لکھا ہے، دوسرا یہ کہ اس میں تصاویر بھی ہوتی ہیں، ان کا اقتناء واحترام مستلزم للتقوم واستعمال لازم آتا ہے اور بعض فروع میں تصاویر کے تقوم کی نفی کی گئی ہے، تو اس میں اس حکم شرعی کا بھی معارضہ ہے، جواب اول کا یہ ہے کہ یہ

عادت سے معلوم ہے کہ اس ہدیہ کا سبب مہدی لہ کی تعظیم ہے نہ کہ تہوار کی تعظیم، اور جواب ثانی کا یہ ہے کہ مقصود اہداء میں صورت نہیں بلکہ مادہ ہے، البتہ یہ واجب ہے کہ مہدی لہ فوراً تصاویر کو توڑ ڈالے۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۴۸۲).

مولانا عبد الحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

سوال: اگر ہندو ہولی یا دیوالی کے دن معزز مسلمانوں کے سامنے مٹھائی وغیرہ پیش کریں تو مسلمانوں کو لینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: درست ہے مگر فرحت اور سرور میں کفار کی عید کے دن موافقت نہ کرنا چاہئے مجمع البرکات میں ہے کہ نیروز کے دن جو مجوسی کہ بڑے لوگوں کے پاس اور اپنے دوست اشناؤں کے گھر کھانے کی چیزیں لاتے ہیں ان کا لے لینا حلال ہے اور کیا ان کے لینے والے کو کوئی دینی ضرر ہے تو بعض کہتے ہیں کہ جو ان کی خوشی میں شریک ہو کر لیتا ہے اس کو دینی ضرر ہے اور جو اس کے سوا اور کسی طرح لیتا ہے اس کو حرج نہیں مگر پھر بھی اس سے احتراز اچھا ہے ایسا ہی مطالب المؤمنین میں ہے۔ (معلم الفقہ ترجمہ مجموعۃ الفتاویٰ: ۲/۳۶۳، وکذا فی ۳۵۸، و۳۸۲).

واللہ ﷻ اعلم۔

بیٹے کے نام بینک میں رقم رکھنے سے ہبہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی کچھ رقم ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنے بیٹے کے نام پر بینک میں رکھی، اب بیٹے کے نام پر ہونے کی وجہ سے بیٹا مالک سمجھا جائے گا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بینک میں رکھنے کا مقصد تملیک الابن نہ ہو بلکہ کسی مصلحت کی وجہ سے رکھی ہے تو بیٹا مالک نہیں بنا، ہاں اگر تملیک مقصود ہو تو بیٹا مالک بن گیا۔

ملاحظہ ہو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

اگر فی الواقع زید نے یہ مکان اپنی زوجہ کی ملک نہ کیا تھا بلکہ کسی مصلحت سے کاغذات سرکاری میں اس کا نام لکھوا دیا تھا تو یہ مکان زوجہ کی ملک نہیں ہوا اور بعد اس کی وفات کے اس کے وارثوں کا اس میں حق نہ ہوگا، بلکہ بدستور زید کی ملک میں رہے گا کاغذاتِ سرکاری میں کسی کا نام درج ہو جانے سے شرعاً اس کی ملک ثابت نہیں ہوتی جب تک کہ مالک اپنی رضا سے اس کو مالک نہ بنائے اور قبضہ نہ کرائے، وہذا کلہ ظاہر من عامۃ کتب الفقہ۔

(امداد المفتین، جلد دوم، ص ۷۴۸، کتاب الہبۃ، دار الاشاعت).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ عثمانی: ۳/۴۴۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ماں کا بیٹے کو مکان ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: میری ماں نے مجھے ایک گھر دیا جو ہندوستان میں ہے جب کہ وہ زندہ اور صحتمند تھی اب میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے تو اب گھر کا کیا حکم ہے؟ میری بہن زندہ ہے کیا اس کا حصہ اس گھر میں ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر آپ کی والدہ نے آپ کو مکان ہبہ کر کے قبضہ دیا ہو یا آپ کے کسی وکیل کو قبضہ دیا ہو تو یہ گھر آپ کا ہے، اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

ولایتم حکم الهبة إلا مقبوضة ويستوي فيه الأجنبي والولد إذا كان بالغاً هكذا في المحيط، والقبض الذي يتعلق به تمام الهبة وثبوت حكمها القبض بإذن المالك والإذن تارة يثبت نصاً وصريحاً وتارة يثبت دلالة. (الفتاوى الهندية: ٤/٣٧٧، الباب الثاني فيما يجوز من الهبة وما لا يجوز).

شرح مجلّہ میں ہے:

لو وهب أحد جميع أمواله في حال صحته لأحد ورثته وسلمه إياها وتوفي بعد ذلک فليس لسائر الورثة المداخلة في الهبة المذكورة، (علي أفندي)، مثلاً لو وهب من كان له عدة أولاد جميع أمواله لأحدهم في حال صحته وسلمه إياها كانت صحيحة (البزازية).

(درر الحكام شرح مجلة الاحكام: ٢/٤٣٣، المادة: ٨٧٩). **واللہ ﷻ اعلم۔**

دائن کا اپنا دین غیر مدیون کو ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: زید کا عمر پر پانچ ہزار رینڈ کا قرضہ تھا بکر کے ساتھ زید دائن کی دوستی تھی دائن نے مدیون عمر سے کہا کہ وہ قرضہ مجھے نہ دیں بلکہ بکر کو دیدے، میں نے اس کو ہبہ کیا ہے اور بکر کو کہا تم لے لو، چنانچہ عمر نے بکر کو دیدیا، پھر بکر کے ساتھ زید دائن کے تعلقات خراب ہو گئے اور اب وہ کہتا ہے کہ پانچ ہزار مجھے واپس کردیں بکر نے وہ رقم خرچ کر لی ہے، چونکہ زید اور عمر دونوں عالم ہیں اس لیے زید نے دلیل میں فقہ کا جزئیہ "تمليک الدين من غير المديون لا يصح" پیش کیا اب عمر کیا کرے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب دائن نے مدیون سے کہا کہ میرا دین بکر کو دیدے اور عمر نے بکر کو دیدیا تو یہ ہبہ مکمل ہوگیا اور زید کا دین بھی ادا ہوگیا اب زید عمر سے مطالبہ نہیں کرسکتا، اور تملیک الدین من غیر المدیون میں جب دائن خود غیر مدیون کو اجازت دیدے تو صحیح ہے اور ہبہ مکمل ہوجاتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

أجيب بأن هبة الدين من غير المديون إنما لاتجوز إذا لم يأذن للغير في قبضه فأما إذا وهب الدين من آخر وأذن له في قبضه جاز استحساناً. (فتح القدیر، کتاب الکفالۃ، ۷/ ۱۹۰، دارالفکر).

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

إن تمليك الدين من غير من عليه الدين يصح استحساناً إذا وهبه وأذن له فی القبض فقبضه، وهذا لأن ذلك إنما لايصح لأنه تمليك ما لايقدر على تسليمه، وإذا أذن له بالقبض صار كأنه أخرجه من الكفالة ووكله بالقبض فقبضه ثم وهبه إياه وحينئذٍ يكون تمليك الدين ممن عليه الدين وهو جائز. (العناية فی شرح الهداية على هامش فتح القدير: ۷/ ۱۹۰، دارالفکر).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما هبة الدين لغير من عليه الدين فجائز أيضاً إذا أذن له بالقبض وقبضه استحساناً والقياس أن لايجوز وإن أذن بالقبض... وجه الاستحسان أن ما فی الذمة مقدور التسليم والقبض ألاترى أن المديون يجبر على تسليمه إلا أن قبضه بقبض العين فإذا قبض العين قام قبضها مقام قبض عين ما فی الذمة إلا أنه لابد من الإذن بالقبض صريحاً ولايكتفي فيه بالقبض بحضرة الواهب بخلاف هبة العين. (بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع: ۶/ ۱۱۹، فصل فی شرائط الهبة، سعيد).

مبسوطِ سرخسی میں ہے:

هبة الدين من غير من عليه الدين جائزة، فإذا سلطه عليه فهو مسلط عليه فی الجملة أو يجعل ذلك نقلاً للدين منه، بمقتضى الهبة منه فيصير هبة الدين ممن عليه الدين لو أمكن ذلك لأن له ولاية نقل الدين إليه قصداً بإحالة الدين عليه فيثبت ذلك بمقتضى تصرفهما

تصحيحاً له. (المبسوط للامام السرخسيؒ: ۹۲/۲۰).

محیط برہانی میں ہے:

أن الواهب لما أمره بالقبض فقد جعله نائباً عن نفسه في القبض فيقع قبض الموهوب للواهب أولاً ثم لنفسه أو أن عمل الهبة ما بعد القبض وبعد القبض هو مال محل للتمليك.

(المحيط البرهاني:۱۷٤/۷).

وللاستزادة انظر: (المحيط البرهاني:۹۲/۶،و۱۷۴/۷، كتاب الهبة والصدقة. ورد المحتار:۷۰۸/۵، سعيد. وشرح المجلة:۳۶۰/۳. والفتاوى الهندية:۳۸۴/۴. والبحر الرائق:۲۸۴/۷. وتبيين الحقائق:۱۱/۳، ملتان).

واللہ ﷻ اعلم۔

اپنی حیات میں مال تقسیم کرنے کا حکم:

سوال: کیا کوئی شخص اپنی حیات ہی میں اپنا مال، جائیداد وغیرہ تقسیم کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اپنی حیات ہی میں اپنا مال تقسیم کرنا ہبہ ہے اور یہ صحیح ہے، اور مفتی بہ قول کے مطابق اولاد کے درمیان مساوات کا خیال رکھنا چاہئے، لیکن اس میں تفاضل بھی چل سکتا ہے، البتہ بلاوجہ کسی کو ضرر پہنچانا درست نہیں ہے، ہاں دینداری اور فسق وفجور کی وجہ سے تفریق جائز ہے، بلکہ دیندار متقی باشرع کو کچھ زیادہ دینا افضل واولیٰ ہے۔ ملاحظہ ہو خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

رجل له ابن وبنت أراد أن يهب لهما شيئاً فالأفضل أن يجعل للذكر مثل حظ الانثيين عند محمدؒ وعند أبي يوسفؒ بينهما سواء هو المختار لورود الآثار.

ولو وهب جميع ماله لابنه جاز في القضاء وهو آثم نص عن محمدؒ هكذا في العيون، ولو أعطى بعض ولده شيئاً دون البعض لزيادة رشده لا بأس به وإن كانا سواء لاينبغي أن يفضل، ولو كان ولده فاسقاً فأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه لأن فيه إعانة على المعصية، ولو كان ولده فاسقاً لايعطى له أكثر من قوته.

(خلاصة الفتاوى:٤/٤٠٠، جنس آخر في الهبة من الصغير).

شرح مجلّہ میں ہے:

لو وهب أحد جميع أمواله في حال صحته لأحد ورثته وسلمه إياها وتوفى بعد ذلك فليس لسائر الورثة المداخلة فى الهبة المذكورة، (على أفندي)، مثلاً لووهب من كان له عدة أولاده جميع أمواله لأحدهم في حال صحته وسلمه إياها كانت صحيحة (البزازية)، و مع ذلك فترجيح بعض الأولاد على البعض مكروه كراهية تحريمية (أبوالسعود المصرى) ويكره ذلك عندتساويهم فى الدرجة أما عند عدم التساوى كما إذاكان أحدهم مشتغلاً بالعلم لا بالكسب لا بأس أن يفضله على غيره أى لايكره إذا كان التفضيل لزيادة فضل له فى الدين، فعليه (على الواهب) مراعاة المساواة فى الهبة لأولاده حتى لووهب لابنه وابنته يجب أن يعطى البنت كما يعطى الصبي وهذا هوالمفتىٰ به (الطحطاوى)، وقد روى أحد الصحابة رضى اللّٰه تعالىٰ عنه أن أباه قد وهبه مالاً وأراد أن يشهد النبي صلى اللّٰه عليه وسلم على هذه الهبة فتمثلت أنا مع أبي في حضور النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وذكر أبي له الأمر فسأله الرسول صلى اللّٰه عليه وسلم ألك أولاد غيره ؟ أجابه أبي: نعم يارسول اللّٰه فقال له ، هل وهبتهم مثل ما وهبت هذا ؟ فقال أبي: كلا، فقال صلى اللّٰه عليه وسلم: هذا جور: أى ظلم (العناية)، إلا أنه إذا كان أحد الأولاد يفضل غيره فى العلم والكمال فلا بأس من ترجيحه على غيره كما بين فى الكتب الفقهية مساغاً للترجيح (أبوالسعود المصرى) وإن كان في أولاده فاسق لاينبغي أن يعطيه أكثرمن قوته كي لايصير معيناً له فى المعصية ولوكان ولده فاسقاً فأراد أن يصرف ماله إلى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه، (الطحطاوى باختصار). (دررالحكام شرح مجلة الاحكام لعلى حيدر، ٤٣٣/٢، تحت المادة: ٨٧٩، دارالكتب العلمية بيروت).

وللاستزادة انظر: (الدرالمختار مع ردالمحتار: ٦٩٦/٥، كتاب الهبة، سعيد. البحرالرائق: ٧/ ٢٨٨، كتاب الهبة. والفتاوى الهندية: ٣٩١/٤، فى الهبة للصغير. وتكملة ردالمحتار: ٣٥٥/٨، سعيد)،

احسن الفتاویٰ میں ہے:

(۱) اگر دوسروں کا اضرار مقصود ہو تو مکروہِ تحریمی ہے، قضاءً نافذ ہے دیانۃً واجب الرد ہے۔

(۲) اضرار مقصود نہ ہو اور کوئی وجہ ترجیح بھی نہ ہو تو مکروہِ تنزیہی ہے، ذکور واناث میں تسویہ مستحب ہے۔

(۳) دینداری، خدمت گزاری، خدمات دینیہ کا شغل یا احتیاج وغیرہ وجوہ کی بنا پر تفاضل مستحب ہے۔

(۴) بے دین اولاد کو بقدرِ قوت سے زائد نہیں دینا چاہئے، ان کو محروم کرنا اور زائد مال امورِ دینیہ میں صرف کرنا مستحب ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۲۵۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تقسیم کے وقت مساوات کا حکم:

سوال: عام حالات میں اولاد کے درمیان تقسیم کے وقت مساوات کا خیال رکھنا چاہئے لیکن مساوات واجب نہیں ہے۔ فقط افضل وبہتر ہے۔ البتہ شارحِ مجلّہ علی حیدرؒ نے فرمایا ہے کہ مساوات واجب ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ (ملاحظہ ہو شرح مجلۃ ج۲ص۴۳۳) اسی طرح مولانا خالد سیف اللہ نے بھی واجب لکھا ہے۔

الجواب: احناف کا مفتی بہ مذہب یہ ہے کہ عام حالات میں اولاد کے درمیان تقسیم کے وقت برابری اور مساوات افضل اور بہتر ہے واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر بعض کو خواہ مخواہ نقصان پہونچانا چاہتے ہوں تو پھر برابری لازم ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

ولو وهب لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض على البعض عن أبي حنيفةؒ لابأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل في الدين وإن كانا سواء يكره، و روى المعلى عن أبي يوسفؒ أنه لاباس به إذا لم يقصد به الإضرار وإن قصد به الإضرار سوى بينهم وهو المختار ولو كان الولد مشتغلاً بالعلم لا بالكسب فلا بأس أن يفضله على غيره. (الفتاوى الهندية: ٤/ ٣٩١، كتاب الهبة).

اعلاء السنن میں ہے:

والحاصل أن قول الأمر بالتسوية بين الأولاد على الوجوب خلاف القياس وذهب الجمهور إلى أن التسوية مستحبة فإن فضل بعضاً صح وكره وجعلوا الأمر في حديث النعمان على الندب والنهي على التنزيه. (اعلاء السنن: ١٦/ ١٠١-١٠٢، ط: ادارة القرآن).

عمدۃ القاری میں ہے:

فإن قلت في حديث الباب الأمر بالرجوع صريحاً حيث قال: "فارجعه" قلت: ليس

الأمر على الإيجاب وإنما هو من باب الفضل والإحسان ألا ترى إلى حديث أنسؓ رواه البزار في مسنده أن رجلاً كان عند رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فجاء ابن له فقبله وأجلسه على فخذه وجاءته بنية له فأجلسها بين يديه فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ألا سويت بينهما وليس هذا من باب الوجوب وإنما هو من الإنصاف والإحسان. (عمدة القارى :٩ / ٤٠٥ ،كتاب الهبة ،ط ملتان).

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

إن عمل الخليفتين أبى بكرؓ وعمرؓ بعد النبى صلى الله عليه وسلم على عدم التسوية قرينة ظاهرة فى أن الأمر للندب. (عمدة القارى: ٩ /٤٠٧، كتاب الهبة،ط : ملتان)

حضرت شیخ الحدیثؒ اوجز المسالک میں فرماتے ہیں:

وقد تمسک به من أوجب التسوية فى عطية الأولاد وبه صرح البخارى وهو قول طاووس والثورى وأحمد وإسحاق ... وقال أبويوسفؒ تجب التسوية إن قصد بالتفضيل الإضرار وذهب الجمهور إلى أن التسوية مستحبة فإن فضل بعضاً صح وكره واستحبت المبادرة إلى التسوية أو الرجوع فحملوا الأمر على الندب و النهى على التنزيه. (اوجز المسالك :١٤ /١٧٥ باب ما يجوز من النحل).

مزید ملاحظہ ہو: (عمدة القارى: ٩/ ٤٠٨، وفيض البارى: ٣ / ٣٦٨، وتكملة فتح الملهم : ٢ / ٦٨).

شرحِ مجلّہ کی عبارت کا جواب:

شرحِ مجلّہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

على الواهب مراعاة المساواة في الهبة لأولاده حتى لووهب لابنه وابنته يجب أن يعطى البنت كما يعطى الصبي وهذا هوالمفتى به (الطحطاوى). (دررالحكام شرح مجلة الاحكام:٢/٤٣٤).

شارحِ مجلّہ علی حیدرؒ نے عام حالات میں اولاد کے درمیان تساوی کے واجب ہونے کا قول بحوالہ علامہ سید احمد طحطاویؒ اختیار فرمایا ہے، لیکن علامہ طحطاویؒ کی اصل عبارت پر غور کرتے ہیں تو وجوب مترشح نہیں ہوتا۔ طحطاوی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

قال في الخانية ولو وهب رجل شيئاً لأولاده في الصحة وأراد تفضيل البعض على البعض في ذلك لا رواية لهذا في الأصل عن أصحابنا وروى عن الإمامؒ أنه لا بأس به إذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين وإن كانا سواء يكره وروى المعلى عن أبي يوسفؒ أنه لا باس به إذا لم يقصد به الإضرار وإن قصد به الإضرار سوى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطي الابن قال محمدؒ يعطي للذكر ضعف ما يعطي للانثى والفتوى على قول أبي يوسفؒ.

(حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ٣ / ٤٠٠).

عبارت بالا میں یجب کا لفظ کہیں مذکور نہیں۔ ممکن ہے کہ شارحِ مجلّہ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کی اپنی طرف سے تعبیر فرمائی ہو۔ کیونکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر اضرار کا قصد ہو تو تساوی واجب اور لازم ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وفي الخانية لاباس بتفضيل بعض الأولاد...إن لم يقصد به الإضرار وإن قصده فسوى بينهم يعطي البنت كالابن عند الثاني وعليه الفتوى وفي الشامية: قوله وعليه الفتوى أي على قول أبي يوسفؒ من أن التنصيف بين الذكر والأنثى أفضل من التثليث الذي هو قول محمدؒ. (الدر المختار: ٥ / ٦٩٦، سعيد).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

وقال أبويوسفؒ تجب التسوية إن قصد بالتفضيل الإضرار وإلا فهي مستحبة. (تكملة فتح الملهم ج ٢ ص ٦٨ كتاب الهبات، وكذا في اوجز المسالك: ١٤ / ١٧٥).

مولانا خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ العالی کی عبارت کا جواب:

مولانا نے قاموس الفقہ (۳۳۱/۵) میں برابری کو مستحب قرار دیا ہے اور کتاب الفتاوی (۳۱۶/۶) سے وجوب مستفاد ہوتا ہے۔ البتہ ''اسلام اور جدید فکری مسائل'' (ص۱۶۴) میں صراحۃً واجب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تو اسکے چند احتمالات ہو سکتے ہیں: (۱) اس قول کو اضرار کے قصد سے زیادہ دینے والے قول پر محمول کرے تو بالاتفاق وجوب والا قول مفتی بہ ہے۔

(۲) سیاق وسباق کا مضمون اس کی تائید کرتا ہے کہ فساد زمانہ کی وجہ سے وجوب کا قول اختیار کیا۔

(۳) معترضین اور مستشرقین کو سامنے رکھتے ہوئے وجوب کا قول اختیار کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ زندگی میں اولاد کے درمیان تقسیم کے وقت ضرر کا قصد نہ ہو تو ایک دوسرے کو ترجیح دینے میں کوئی حرج نہیں ہے یعنی تساوی مستحب کے درجہ میں ہے واجب اور لازم نہیں ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے مراجعہ فرمائیں: (عمدة القاری: ۹/۲۰۵، وتکملة فتح الملهم: ۲/ ۶۸، واوجز المسالک: ۱۴/ ۱۷۵، وفتاوی محمودیة: ۱۶/ ۴۹۷، واعلاء السنن: ۱۶/ ۹۲).

والله تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بغیر قبضہ کے ہبہ کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال ۲۰۰۶ء میں ہوا تھا، اس نے ایک وصیت نامہ میں لکھا تھا کہ میرے مرنے کے بعد میرا ترکہ میرے ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے، اس شخص کے انتقال کے نو مہینے بعد اس کے ایک لڑکے یحییٰ نے ترکہ میں سے ایک زمین کا دعویٰ کیا کہ والد نے اس کو اپنی حیات میں بتاریخ ۲/ مارچ ۲۰۰۴ء میں یہ زمین ہبہ کی تھی، اور دعوے کے ثبوت کے لیے ایک تحریر پیش کی جس میں ہبہ کی تصریح موجود ہے اور اس تحریر پر یحییٰ کے لڑکے محمد اور ایک غیر مسلم افریقی عورت کے دستخط موجود ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور گواہ نہیں، نیز یحییٰ صاحب نے اس زمین پر قبضہ بھی نہیں کیا تھا، اور نہ وہ زمین اپنے نام پر رجسٹر کروائی تھی، مزید براں دیگر ورثاء کو اس کے متعلق کچھ علم بھی نہیں، کیا صورتِ مسئولہ میں یہ زمین یحییٰ صاحب کی سمجھی جائیگی یا اس زمین میں سب ورثاء شریک ہوں گے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہبہ تام نہیں ہوا، وجہ یہ ہے کہ ہبہ تام ہونے کے لیے قبضہ ضروری ہے، اور قبضہ متحقق نہیں ہوا، دوسری وجہ یہ ہے کہ تحریری معاہدہ پر جن گواہوں کے دستخط ہیں ان کی گواہی بھی قابل قبول نہیں، کیونکہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قابل قبول نہیں، اسی طرح غیر مسلم کی گواہی مسلمان کے خلاف مقبول نہیں، بنابریں متروکہ زمین یحییٰ صاحب کی ملکیت میں داخل نہیں ہوئی اس وجہ سے تمام ورثاء کے درمیان حسبِ سہام شرعی تقسیم ہوگی۔ درمختار میں ہے:

وشرائط صحتها في الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميزاً غير مشغول ... وتتم الهبة بالقبض الكامل . (الدر المختار: ۵/۶۸۸، ۶۹۰، کتاب الهبة، سعید).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

منها (شرائط الهبة) أن يكون الموهوب مقبوضاً حتى لايثبت الملك للموهوب له قبل القبض . (الفتاوى الهندية:٤/٣٧٤).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

و لا شهادة الولد لوالديه و أجداده و جداته من قبلهما و إن علو. (الفتاوى الهندية: ٣/٤٦٩ كتاب الشهادات، الفصل الثالث فيمن لاتقبل شهادته للتهمة).

درمختار میں ہے:

فيشترط الإسلام لو المدعي عليه مسلماً . (الدرالمختار:٥/٤٦٢،كتاب الشهادات،سعيد).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

شرعاً ہبہ کے لیے تحریری ہبہ نامہ مرتب کرنا ضروری نہیں، یعنی زبانی بھی ہوسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ ہبہ شدہ چیز پر قبضہ کرلے۔ (فتاویٰ عثمانی:۳/۴۴۳، کتاب الہبۃ). واللہ ﷻ اعلم۔

میراث پر قبضہ کرنے سے پہلے ہبہ کا حکم:

سوال: ایک آدمی کا انتقال ہوا اور ترکہ میں ایک گھر چھوڑا جو ابھی غیر مقسوم تھا اور ورثاء میں سے ایک شخص نے اپنا حصہ اپنی بہن کو ہبہ کردیا، اب اس آدمی کا انتقال ہوگیا، دوسرے ورثاء اس ہبہ کو قبول نہیں کرتے جب کہ موہوب لہا کے پاس گواہ بھی موجود ہیں، تو کیا ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ وارث کے لیے جائز ہے کہ میراث پر قبضہ کرنے سے پہلے حقِ ساقط کردے یا دوسرے کی طرف منتقل کردے، اور آج کل یہاں کے مکانات مشاع ناقابل تقسیم کی طرح ہیں، لہٰذا اس میں سے اپنا حصہ بغیر تقسیم کے ہبہ کیا جاسکتا ہے، اور گواہ موجود ہونے کی وجہ سے مذکورہ ہبہ مکمل ہوگیا اب اس حصہ میں دوسرے ورثاء کا حق نہیں۔

ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر میں ہے:

وذكر الشيخ الإمام المعروف بـ ”خواهر زاده“ أن حق الموصى له وحق الوارث قبل القسمة غيرمتأكد يحتمل السقوط بالإسقاط، انتهىٰ. (الاشباه والنظائر:١/٢٧٢).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وحق الوارث قبل القسمة يسقط بالإسقاط .(فتاوی الشامی:٥/٦٤٢،فصل فی التخارج،سعید).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وفيما لايقسم كالعبد والدابة والثوب والحمام يجوز هبة المشاع من الشريك وغيره في قولهم . (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندية:٣/٢٦٧،کتاب الهبة، فی هبة المشاع).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو مثلاً جانوران کا ہبہ تقسیم سے پہلے صحیح ہے۔

قال العلامة الخوارزمي: هبة المشاع فيما لايقسم جائزة يعني به مالايحتمل القسمة أى لايبقى منتفعاً بعد القسمة أصلاً كعبد واحد أو دابة واحدة. (الکفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٧/٤٨٨،کتاب الهبة). (**جدید معاملات کے شرعی احکام: جلد دوم،٨٢**). **واللہ ﷻ اعلم۔**

حقوق ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: کیا حقوق کو ہبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: جو حقوق اصالۃً ثابت ہوتے ہیں وہ قابل انتقال ہوتے ہیں اور وہ لازمہ سمجھے جاتے ہیں ان میں ہبہ چل سکتا ہے، اور جو حقوق محض دفعِ ضرر کی وجہ سے ثابت ہوتے ہیں وہ قابل انتقال نہیں ہوتے، اور حق میراث حق الملک حق لازم سمجھا جاتا ہے اس میں انتقال بھی ہوتا ہے، اور اس کا ہبہ بھی درست ہوگا۔

ملاحظہ ہو صاحبِ عنایہ علامہ اکمل الدین بابرتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

والفاصل بين الحق المتقرر وغيره أن ما يتغير بالصلح عما قبله فهو متقرر وغيره غير متقرر واعتبر ذلك فى الشفعة والقصاص، فإن نفس القاتل كانت مباحة في حق من له القصاص، وبالصلح حصل له العصمة في دمه فكان حقاً متقرراً وأما فى الشفعة فإن المشتري يملك الدارقبل الصلح وبعده على وجه واحد فلم يكن حقاً متقرراً. (شرح العناية بهامش فتح القدير:٩/٤١٦، مايبطل به الشفعة،دار الفكر).

شرح مجلّہ میں ہے:

عدم جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة ليس على إطلاقه، بل فيه التفصيل: وهو

أن ذلک الحق المجرد إن كان الشرع جعله لصاحبه لأجل رفع الضرر عنه، كحق الشفعة ، وحق القسم للزوجة ، وحق الخيار للمخيرة، فالاعتياض عنه بمال لايجوز،لأن حق الشفعة للشفيع ، وحق القسم للزوجة ، وكذا حق الخيار فى النكاح للمخيرة، إنما ثبت لدفع الضرر عن الشفيع والمرأة ، وماثبت لذلک لايصح الصلح عنه، لأن صاحب الحق لمارضي علم أنه لايتضرر بذلک، فلايستحق شيئاً وإن كان ذلک الحق قد ثبت لصاحبه أصالةً لا على وجه رفع الضرر كالوظيفة في وقف من إمامة وخطابة وأذان وفراشة وبوابة، فإن صاحبها قد ثبت له هذا الحق بتقرير القاضي على وجه الأصالة، لا لأجل رفع ضرر عن صاحبه، فينبغي أن يصح الاعتياض عن تلک الوظيفة بمال يأخذه الفارغ، وهوصاحب الوظيفة، من المفروغ له، لأنه صلح عن حق إلحاقاً له بالاعتياض عن القصاص بمال، وبالاعتياض عن النكاح بمال، وما أشبه ذلک. (شرح المجلة للاتاسی:۲/۱۱۹،۱۲۰).

وفي "بحوث في قضايا فقهية معاصرة": وأما النوع الثاني من الحقوق الشرعية ، فهي الحقوق التي تثبت لأصحابها إصالة ، لا على وجه دفع الضرر فقط، مثل حق القصاص وحق تمتع الزوج بزوجته ببقاء نكاحها معه ، وحق الإرث وما إلى ذلک...أن حق الوراثة في حياة المورث ليس حقاً ثابتاً، بل هوحق متوقع يحتمل الثبوت وعدمه، وإنما يتقرر بموت المورث...وأما بعد موت المورث ، فإن ذلک الحق ينتقل إلى ملک مادّی في تركته ، فيصح بيعه أو التنازل عنه. (بحوث فی قضايا فقهية معاصرة:۱/۷۸،۸۰).

مزید ملاحظہ ہو: (ردالمحتار:۴/۵۱۸،۵۲۰،مطلب لايجوزالاعتياض عن الحقوق المجردة، سعيد. وحاشية الطحطاوى على الدر المختار:۳/۹،کويته. وعطر ہدایہ،ص۳۳۲۔فقہی مقالات:۱/۱۶۳۔جدید فقہی مسائل:۴/۱۷۶۔وحقوق اوران کی خرید وفروخت،ص۱۴۷). واللہ ﷻ اعلم۔

عشق ومحبت کے ہدایا کا حکم:

سوال: اگرکوئی شخص کسی لڑکی سے محبت کرتا ہےاوراس کے پاس ہدایا بھیجتا ہےتو اس کا لینا درست ہے یانہیں؟اوراگرلڑکا بعد میں محبت سےتوبہ کرتا ہےتو ان ہدایا کا واپس لینا درست ہے یانہیں؟

الجواب: ناجائز تعلقات میں ایک دوسرے کو ہدایا پیش کرنا رشوت کے حکم میں ہے اس کا قبول کرنا درست نہیں ہے، اس سے ملکیت بھی ثابت نہیں ہوتی، اور دینے والے کو واپس مطالبہ کا حق رہتا ہے۔ ہاں توبہ کرنے کے بعد اگر اس کا مطالبہ ترک کردے اور معاف کردیں تو کوئی حرج نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وفيها (القنية) ما يدفعه المتعاشقان رشوة يجب ردها ولايملك . (البحرالرائق: ۲۸۶/۶، كتاب الهبة، كوئته).

عالمگیری میں ہے:

المتعاشقان يدفع كل واحد منهما لصاحبه أشياء فهي رشوة لايثبت الملك فيها وللدافع استردادها. (الفتاوى الهندية: ۴۰۳/۴، الباب الحادى عشرفى المتفرقات).

(وكذا فى مجمع الضمانات: ۹۳۸/۲). **واللہ ﷻ اعلم۔**

عشق ومحبت کا ہدیہ استعمال کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے دوستوں میں سے ایک دوست کو ایک لڑکی نے عشق ومحبت میں ایک موبائل دیا بعد میں تعلقات ختم ہوگئے، اب وہ لڑکا موبائل فروخت کرنا چاہتا ہے تو قیمت خود استعمال کرسکتا ہے یا اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عشق ومحبت کا ہدیہ رشوت کے حکم میں ہونے کی وجہ سے لڑکے کی ملک میں داخل نہیں ہوا، لہذا واہبہ لڑکی کو پہنچانا ضروری ہے، اس کو فروخت کرنا درست نہیں ہے، لیکن اگر فروخت کرلیا تو قیمت اس لڑکی کو پہنچادے، الا یہ کہ لڑکی معاف کرے اور مطالبہ چھوڑ دے۔

ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أوالظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولايأخذون منه شيئاً وهو أولىٰ بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، والا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه . (فتاوى الشامى: ۳۸۵/۶، فصل فى البيع، سعيد) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

بغرض نکاح ہدیہ پیش کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے محبت کرتا ہو اور نا جائز تعلقات نہیں لیکن کوئی ہدیہ اس کے خاندان کے پاس اس لیے بھیجتا ہے تا کہ لڑکی یا لڑکی کے اہل خانہ نکاح کے لیے تیار ہو جائیں تو کیا یہ بھی رشوت کے حکم میں ہو کر نا جائز ہوگا؟

الجواب: بصورتِ مسؤلہ چونکہ نا جائز تعلقات نہیں ہیں، یہ ہدیہ تالیفِ قلب کی ایک تدبیر ہے اس لیے یہ ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، جیسے مؤلفۃ القلوب کو ہدیہ یا صدقہ دینا دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تھا یہاں بھی نکاح جو دینی مقصد ہے اس کے حصول کے لیے یہ ایک ذریعہ ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہبہ میں قبضہ عرفی کافی ہے:

سوال: میرے والد نے مجھے ایک بلڈنگ ہبہ کی کاغذات میں میرے نام کر دی گئی، اس بلڈنگ میں دو مکان اور چار دکانیں ہیں، اور ان میں کرایہ دار آباد ہیں، والد کی زندگی میں ان کا کرایہ میں وصول کرتا ہوں، ٹیکس وغیرہ کا معاملہ بھی میرے ذمہ ہے، گویا میں متصرف ہوں صورتِ بالا میں میرا قبضہ ہبہ کی تکمیل کے لیے کافی ہے یا کرایہ داروں کو نکال کر ظاہری قبضہ ضروری ہے، یہ ظاہر ہے کہ کرایہ داروں کو حسبِ معاہدہ نکالنے کی کوئی صورت نہیں ہے؟

الجواب: ہر چیز کا قبضہ اس چیز کے مناسب ہوتا ہے کار کا قبضہ یہ ہے کہ چابی مشتری کے حوالہ کر دے، اس صورت میں کاغذات موہوب لہ کے حوالے کرنے سے قبضہ ہو جائیگا، اور والد کی وفات کے بعد دوسرے وارث اس بلڈنگ میں اپنا حق وراثت نہیں مانگ سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو رد المحتار میں ہے:

وحاصله أن التخلية قبض حكماً لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع،...قال أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائزتكون قبضاً...الخ.

(ردالمحتار:۴/۵۶۲،۵۶۳،مطلب في شروط التخلية،سعيد۔وكذا في الفتاوى البزازية على هامش الهندية:۴/۴۹۹۔ والفتاوى الهندية:۳/۱۹).

جدید فقہی مباحث میں ہے:

قرآن وسنت میں قبضہ کی کوئی خاص حقیقت نہیں بتائی گئی ہے، بلکہ احادیث میں قبضہ کی مختلف کیفیات کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت میں مقام خریداری سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ تجار خرید کردہ مال کو اپنے کجاوے میں منتقل کرلیں، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ناپ تول کو قبضہ قرار دیا گیا ہے، اسی لیے فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس بابت لوگوں کا عرف ہی معیار ہے، جس چیز کے بارے میں جس درجہ کے عمل دخل کو لوگوں کے عرف میں قبضہ تصور کیا جائے وہی اس کے حق میں شرعاً بھی قبضہ مانا جائیگا۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

ولایشترط القبض بالبراجم، لأن معنی القبض هو التمیكن و التخلي و ارتفاع الموانع عرفاً و عادة حقیقة .(بدائع الصنائع:۵/۱۴۸،سعید۔جدید فقهی مباحث:۱۵/۱۲).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

...امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ حسی قبضہ ضروری نہیں بلکہ تخلیہ کافی ہے، تخلیہ کے معنی یہ ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دیدی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کرلے جب قبضہ کرنے میں کوئی مانع باقی نہیں رہے تو سمجھیں گے کہ تخلیہ ہوگیا، مثلاً کوئی بکس ہے، اس کے اندر کئی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، اس کی چابی اس کے حوالہ کردی، تو جب چابی حوالے کردی اب چاہے وہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، قبضہ متحقق ہوگیا، امام بخاریؒ نے یہاں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اختیار کیا ہے اور حضرت جابرؓ کا واقعہ موصولاً روایت کیا ہے کہ حضرت جابرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ خریدا اور پھر حضرت جابرؓ نے اسی اونٹ پر مدینہ منورہ تک سفر کیا، حضرت جابرؓ اس سے نہیں اترے لیکن تخلیہ متحقق ہوگیا تھا، امام بخاریؒ یہ کہتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ تخلیہ سے قبضہ ہوگیا۔ (اسلام اور معاشی مسائل،۲/۹۸،۱۰۰).

عطر ہدایہ میں ہے:

قبضہ یعنی دوسرے کی اجازت سے کسی چیز میں تصرف پر قدرت کا حاصل ہونا، اب اگر یہ قدرت مالک کی اجازت سے ہے یا شرعی حق کی وجہ سے تو اس کو قبضہ جائز کہا جاتا ہے۔ (عطر ہدایہ، ص۸۸).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: وجدید معاملات کے شرعی احکام،۱/۴۰،۴۲۔ وقاموس الفقہ،۴/۴۶۶،۴۶۷).

خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ کی حقیقت عرف پر مبنی ہے، نیز اشیاء کے اعتبار سے بھی فرق ہوگا، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بلڈنگ کا کرایہ وصول کرنا اور اس کا ٹیکس وغیرہ ادا کرنا یعنی اس میں مکمل تصرف کا اختیار ہونا یہ قبضہ کے مترادف ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ حرام سے ہدیہ قبول کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی کافر کے پاس سود کا مال آیا تو اس کی ملکیت میں داخل ہوا یا نہیں؟ اگر کافر نے کسی مسلمان کو سودی مال کا ہدیہ پیش کیا تو مسلمان کے لیے لینے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی مسلمان سودی مال کا ہدیہ دے تو کیا حکم ہے؟

الجواب: مسلمان کے پاس سود کا مال آجائے تو مسلمان اس کا مالک نہیں بنتا بلکہ اس کو لوٹانا ضروری ہے، اگر مال کا مالک معلوم ہو تو مالک کو واپس کردے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلا نیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے، اور اس مال کو ایک وبال اور مصیبت سے سبک دوشی سمجھ کر صدقہ کردیا جائے پھر یہ رقم کسی مستحق فقیر مسکین جو صاحبِ نصاب نہ ہو دینا جائز اور درست ہے، لیکن سودی مال کا ہدیہ قبول کرنا جائز اور درست نہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

لو رأى المكاس مثلاً يأخذ من أحد شيئاً من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلك الآخر آخر فهو حرام. (فتاوی الشامی:۵/۹۸، مطلب الحرمة تتعدد، سعید).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (فتاوی الشامی:۶/۳۸۵، کتاب الکراهية، فصل فی البیع، سعید).

عالمگیری میں ہے:

ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لاتخلوعن قليل حرام فالمعتبر الغالب، وكذا أكل طعامهم كذا في الاختيار شرح المختار. (الفتاوی الهندية:۵/۳۴۲).

ہاں اگر یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ مالِ حرام ہے یا مخلوط ہے اور غالب حلال کمائی کا ہے تو پھر ہدیہ قبول

کرنے کی گنجائش ہوگی۔

حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ فقہی عبارات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی آمدنی حلال اور حرام سے مخلوط ہو اس غالب کا اعتبار ہے، غالب حلال ہے تو اس کا ہدیہ وضیافت قبول کرنا جائز ہے لیکن اگر خاص ہدیہ یا طعام کی بابت یقیناً معلوم ہو جائے کہ اس میں کچھ حرام ملا ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے اور کھانا بھی حرام مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط واستہلاک ہے اس لیے ان کے قول پر گنجائش ہے جیسا کہ بعض روایات سے ظاہر ہوگا اور اگر غالب آمدنی حرام ہے تو ہدیہ وضیافت قبول کرنا حرام ہے ہاں اگر اس طعام وہدیہ کی بابت اطلاع کردے کہ یہ حلال ہے تو جائز ہے۔ (امداد الاحکام:۴/۳۹۹)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (شامی:۵/۹۸، وامداد الاحکام:۴/۳۹۷۔۴۰۰۔ وفتاوی عثمانی:۳/۳۹۵)۔

لیکن اگر کافر کے پاس سود کا مال آیا تو کافر اس کا مالک بن جائیگا اور اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز اور درست ہوگا، جب تک کہ وہ حرام عقلی وقبیح عقلی کا ارتکاب نہ کرے، مثلاً خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ۔ ہاں کفار کو دارالاسلام میں اسلامی حکومت ربوا کی اجازت نہیں دیگی۔

اس مسئلہ کا اصل مدار اس پر ہے کہ کفار مخاطب بالفروع ہیں یا نہیں، اور اس میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ ابتداءً فقط مخاطب بالایمان والعقوبات ہیں، مخاطب بالمعاملات نہیں ہیں، جب کہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ کفار مخاطب بالمعاملات ہیں، بہر حال کفار سود کی رقم کے مالک ہیں، یہی ظاہر ہوتا ہے۔

دلائل کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (ابواب الربا، باب دوم سودی مصارف)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہبۃ المشغول کے جواز کی تدبیر:

سوال: زید کے پاس ایک بڑا مکان ہے جو بارہ کمروں پر مشتمل ہے وہ مکان سامان سے بھرا ہوا ہے اس میں بڑا کتب خانہ، فریزر، فرج، کئی بھاری مشینیں، آلاتِ ورزش، چارپائی، قالین، مطبخ کا سامان وغیرہ موجود ہیں، اس آدمی کے تین بیٹے ہیں، دو کے پاس اپنا مکان ہے ایک کے پاس مکان نہیں اور وہ والد کے ساتھ رہتا ہے اور والد کی خدمت کرتا ہے اور عالمِ دین ہے، زید چاہتا ہے کہ یہ مکان اس عالم بیٹے کو ہبہ کردوں، لیکن

زید سامان نہیں دینا چاہتا، کیونکہ مرنے کے بعد سامان سب ورثہ میں تقسیم ہونے کو زید بہتر خیال کرتا ہے، اور زندگی میں استعمال کرنا چاہتا ہے، زید خود عالمِ دین ہے، اس کو معلوم ہے کہ مکان ہبہ کرنے کے لیے قبضہ دینا ضروری ہے اور قبضہ کے لیے مکان کو خالی کرنا ضروری ہے، لیکن مکان کو خالی کرنا کارے دارد ہے، اب زید کے لیے کونسی تدبیر ہے کہ مکان بھی ہبہ ہو جائے اور خالی کرنے کی مشقت سے بھی بچ جائے زید ہدایہ پڑھا تا رہتا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو خالی کرنا پڑے گا؟

الجواب: زید صحیح فرماتے ہیں کہ قبضہ دینے کے لیے مکان کو خالی کرنا پڑے گا لیکن فقہاء نے اس کی آسان تدبیر تحریر فرمائی ہے کہ جس سے معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ مکان کا پورا سامان موہوب لہ کے پاس بطورِ ودیعت رکھے اور اس کو قبضہ دیدے جس کے لیے تخلیہ کافی ہے اس کے بعد اس کو مکان ہبہ کر دے اور قبضہ بھی دیدے یعنی مکان کی چابی دیدے اور خود نکل جائے۔ پھر سامانِ ودیعت جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں درر الحکام شرحِ مجلۃ الاحکام میں شیخ علی حیدر فرماتے ہیں:

الحيلة في هبة المشغول هي أن يودع المال الشاغل للموهوب له ويسلم إليه أولاً ثم تسلم الدار إليه وفي هذا تكون الهبة والتسليم صحيحين. (درر الحكام شرح مجلة الاحكام:۲/۳۹۶،بيروت).

الجوهرة النيرة میں ہے:

ولو وهب داراً فيها متاع للواهب وسلم الدار إليه وسلمها مع المتاع لم يصح لأن الدار مشغولة بالمتاع والفراغ شرط لصحة التسليم والحيلة فيه أن يودع المتاع أولاً عند الموهوب له ويخلي بينه وبينه ثم يسلم الدار إليه فيصح لأنها مشغولة بمتاع هو في يده.

(الجوهرة النيرة:۲/۱۱،كتاب الهبة،مكتبه امداديه ،ملتان).

وكذا في حاشية الطحطاوي على الدر المختار: (۳/۳۹۵،كوئته)،**وغمز عيون البصائر شرح الاشباه والنظائر:**(۲/۳۴۲،نقلاً عن الجوهرة). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:

﴿علی أن تأجرني ثماني حجج، فإن أتممت عشراً فمن عندک، وما أريد أن أشق عليک، ستجدني إن شاء اللہ من الصالحين، قال: ذلک بيني وبينک، أيما الأجلين قضيت فلا عدوان علي، واللہ على ما نقول وکيل﴾

(سورة القصص،الآية:۲۷،۲۸).

قال رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم:

"أعطوا الأجير قبل أن يجف عرقه".

(رواه ابن ماجه).

کتاب الاجارة

وقال رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم:

هم إخوانکم خولکم جعلهم اللہ تحت أيديکم فمن جعل أخاه تحت يده فليطعمه مما يأکل وليلبسه مما يلبس ولايکلفه من العمل مايغلبه فإن کلفه مايغلبه فليعنه عليه.

(متفق عليه).

کرایہ داری کے مسائل کا بیان

اجارہ کی تعریف اور مدت کی جہالت کا حکم:

سوال: عقدِ اجارہ کی تعریف کیا ہے؟ اور اجارہ میں مدت کی جہالت کا کیا حکم ہے؟ اور اگر کسی کافر کے ساتھ اجارہ کا معاملہ ہو تو کیا حکم ہے؟

الجواب: (۱) اجارہ کی تعریف:۔

کسی معلوم منفعت کے مقابلہ میں کسی متعین عوض کا معاملہ کرنے کو اجارہ کہتے ہیں۔ یعنی اجارہ اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جس میں ایک فریق کی طرف سے منفعت کی پیش کش ہو اور دوسرے کی طرف سے معاوضہ اور اجرت کی مثلاً ایک شخص کی طرف سے مکان ہو جس میں رہنے کی اجازت دی جائے اور دوسرے کی طرف سے اس کا کرایہ ادا ہو، تو یہ "اجارہ" کہلائے گا۔

وفی الهداية : الإجارة عقد يرد على المنافع بعوض. (الهداية:۳/۲۹۳، كتاب الاجارات).

وفي شرح المجلة : الإجارة في اللغة بمعنى الأجرة وقد استعملت في معنى الإيجار أيضاً... وفي اصطلاح الفقهاء بمعنى بيع المنفعة المعلومة في مقابلة عوض معلوم الخ.

(شرح المجلة لمحمد الاتاسی:۲/ ۴۷۲ المادة:۴۰۵).

(۲) اجارہ میں مدت کا حکم:۔

اجارہ میں مدت کی تعیین ضروری ہے، مدت کی وہ جہالت جو مفضی الی المنازعہ ہو وہ مفسدِ عقد ہے۔ ہاں

جو مفضی الی النزاع نہیں ہے وہ مفسدِ عقد نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها بيان المدة في إجارة الدور والمنازل والبيوت والحوانيت وفي استئجار الظئر لأن المعقود عليه لا يصير معلوم القدر بدونه فترك بيانه يفضي إلى المنازعة ، وسواء قصرت المدة أو طالت من يوم أوشهر أوسنة أو أكثر من ذلك بعد أن كانت معلومة وهو أظهر أقوال الشافعي ... وسواء عين اليوم أوالشهر أوالسنة أولم يعين ، ويتعين الزمان الذي يعقب العقد لثبوت حكمه الخ. (بدائع الصنائع :۱۸۱/٤، سعيد).

وفي الدرالمختار: (يفسدها) كجهالة مأجورة أو أجرة أومدة...وفي الشامية: قوله أومدة، إلا فيما استثنى، قال في البزازية : إجارة السمسار والمنادى والحمامى والصكاك ومالا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل ، وذكر أصلاً يستخرج منه كثير من المسائل . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ٤٦/٦، باب الاجارة الفاسدة، سعيد).

وفي تقريرات الرافعي: قوله وذكر أصلاً يستخرج منه كثيرمن المسائل) هو أنه إذا استاجرإنساناً على عمل لو رام الأجير الشروع فيه حالاً قدرعليه صحت الإجارة ذكر له وقتاً أو لا كالإجارة على خبز عشرين مناً من الدقيق والآلات كالدقيق ونحوه في ملك المستاجر وإن لم يذكر مقدار العمل لكن ذكر الوقت نحو أن يقول استاجرتك لتخبز لي اليوم إلى الليل يجوز أيضاً لأن المنفعة تصير معلومة بذكر الوقت أيضاً وكذا لوقال: أصلح هذا الجدار بهذا الدرهم يجوز وإن لم يذكر الوقت لأنه يمكن له الشروع في العمل حالاً.

(التحريرالمختار:٢٦٤/٦ ،سعيد۔ وكذا فى الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٤٠/٥).

وفي الفقه الحنفي وأدلته: وكل جهالة تفسد البيع تفسد الإجارة من جهالة المعقود عليه، أو الأجرة أوالمدة، لما عرف أن الجهالة مفضية إلى المنازعة. (الفقه الحنفى وادلته:٩٠/٢، كتاب الاجارة، بيروت).

جہالت کی مزید تفصیل کتاب البیوع کے تحت گزر چکی ہے۔

(۳) کافر کے ساتھ عقدِ اجارہ کا حکم:۔

کافر کے ساتھ عقدِ اجارہ منعقد کرنا جائز اور درست ہے، عقدِ اجارہ کی شرائط میں اسلام کی شرط مذکور نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وأما شرائطها فأنواع...وإسلامه ليس بشرط أصلاً فتجوز الإجارة والاستئجار من المسلم والذمي والحربي والمستامن الخ. (الفتاوى الهندية:٤/٤١٠، كتاب الاجارة).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما إسلام العاقد فليس بشرط فيصح من المسلم والكافر والحربى المستامن كما يصح البيع منهم . (بدائع الصنائع:٤/١٧٩، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

سوسال کے لیے کرایہ پر لینے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے مکان یا دوکان یا زمین سوسال تک کرایہ پر لی تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: سوسال تک کرایہ پر لینے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض فقہاء فرماتے ہیں یہ اجارہ درست نہیں ہے اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ جائز اور درست ہے اور یہی راجح قول ہے، بنابریں صورتِ مسئولہ میں دوکان یا مکان یا زمین سوسال تک کرایہ پر لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فالمذهب عندنا أنه إذا استاجرها مدة معلومة صح الاستئجار طالت أوقصرت ، إلى قوله...وقد دل على جواز الاستئجار أكثر من سنة قوله تعالىٰ : ﴿على أن تأجرني ثماني حجج فإن أتممت عشراً فمن عندک﴾ (سورة القصص، الآية:٢٧) **ولأن كل مدة تصلح أجلاً للبيع فإنها تصلح مشروطة في عقد الإجارة كالسنة وما دونها والمضى فيه وهو أن الشرط الإعلام فيها على وجه لايبقى بينهما منازعة.** (المبسوط :١٥/١٣٢، دارالفكر).

البحرالرائق میں ہے:

فتصح على مدة معلومة أي مدة كانت لأن المدة إذا كانت معلومة كان قدرالمنفعة

فيها معلوماً فأفاد أنها تجوز ولو كانت المدة لايعيش إلى مثلها عادة واختاره الخصاف ومنعه بعضهم . (البحر الرائق:۷/۲۹۹، کوئٹہ).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها بيان المدة في إجارة الدور والمنازل والبيوت والحوانيت...وسواء قصرت المدة أوطالت من يوم أوشهر أوسنة أو أكثر من ذلك بعد أن كانت معلومة ...لأن المانع إن كان هو الجهالة فلا جهالة وإن كان عدم الحاجة فالحاجة قدتدعو إلى ذلك . (بدائع الصنائع: ٤/١٨١، سعيد).

وفي الشامية : قوله ببيان المدة لأنها إذا كانت معلومة كان قدر المنفعة معلوماً قوله وإن طالت أي ولو كانت لايعيشان إلى مثلها عادة ، واختاره الخصاف ، ومنعه بعضهم ، بحر، وظاهر إطلاق المتون ترجيح الأول . (فتاوى الشامي:٦/٦، كتاب الاجارة، سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

للمالك أن يوجر ماله وملكه لغيره مدة معلومة قصيرة كانت كيوم أوطويلة كسنين، أو أكثر حتى لو آجرها إلى مدة لايعيش العاقدان إلى مثلها عادةً جاز واختاره الخصاف ومنعه بعضهم وظاهر إطلاق المتون ترجيح الأول . (شرح المجلة لسليم رستم باز اللبناني،١/٢٧١، المادة : ٤٨٤).

عطر ہدایہ میں ہے:

اجارہ دوسو برس تک کا ہو یا پانچ سو برس کا یا اور کسی ایسی طویل مدت کا (کہ مدت تک عادۃً متعاقدین زندہ نہ رہتے ہوں) خصاف وغیرہ بعض فقہاء کے قول پر جائز ہے۔(عطر ہدایہ،ص۲۲۳). واللہ ﷻ اعلم۔

کتابوں کو کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص کتابوں کو مطالعہ کے لیے کرایہ پر لے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: علامہ شامی وغیرہ حضرات نے فرمایا کہ کتابیں کرایہ پر لینا جائز نہیں ہے، لیکن شیخ الاسلام قاضی القضاۃ علامہ ابوالحسن علی سغدیؒ (المتوفی سنۃ ۴۶۱ھ) نے ”النتف فی الفتاوی“ میں جائز قرار دیا ہے،

بنابریں اگر کتابوں کو گھر یا اپنی تحویل میں رکھے تو دوسرے کے مال کو حبس کرنے کی وجہ سے کرایہ جائز ہونا چاہئے نیز فی زماننا اس کا عرف ہے لوگ کتابیں کرایہ پر لیتے ہیں اس وجہ سے بھی جائز ہونا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں النتف فی الفتاوی میں ہے:

ویجوز في قول الشیخ الإجارة في مصاحف القرآن والفقه لیقرأ فیها أو لینسخها إذا احتاج إلی ذلک . (النتف فی الفتاویٰ، ص ۳۴۸،کتاب الاجارة، دارالکتب العلمیة ، بیروت).

احسن الفتاوی میں ہے:

کتابت کی کاپی کا مالک چونکہ مؤلف ہے اس کے اجارہ کا عرفِ عام بھی ہو چکا ہے لہذا اس کے استعمال کی اجرت کے طور پر تاجر سے کتاب کے کچھ نسخے لے سکتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/ ۳۱۷).

بعض فقہاء نے عرف نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

و لایجوز استئجار کتب الفقه والتفسیر والحدیث لعدم التعارف. (البحر الرائق: ۸/ ۲۰، کوئٹہ).

بدائع الصنائع میں ہے:

لأن جوازها (الإجارة) ثبت علی خلاف القیاس لتعامل الناس فما لم یتعاملوا فیه لایصح فیه الإجارة ولهذا لم تصح إجارة الأشجار لتجفیف الثیاب و إجارة الأوتاد لتعلیق الأشیاء علیها وإجارة الکتب للقراءة ونحو ذلک . (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۷۳، سعید).

لیکن فی زماننا کتابوں کو کرایہ پر لینے دینے کا عام رواج ہے، جیسا کہ حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ نے تحریر فرمایا۔ اور عرف وعادت کے بدلنے کی وجہ سے احکام بدل جاتے ہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: ؎

والعرف فی الشرع له اعتبار لذا علیه الحکم قد یدار

مارأہ المسلمون حسناً فهو عند اللّٰه حسن ، واعلم أن اعتبار العادة والعرف رجع إلیه في مسائل کثیرة حتی جعلوا ذلک أصلاً فقالوا: تترک الحقیقة بدلالة الاستعمال والعادة ... وفي شرح البیري عن المبسوط الثابت بالعرف کالثابت بالنص، ثم اعلم أن کثیراً من

الأحكام التي نص عليها المجتهد صاحب المذهب بناء على ماكان في عرفه وزمانه قد تغيرت بتغير الأزمان بسبب فساد أهل الزمان أوعموم الضرورة . (شرح عقود رسم المفتي، ص۳۷). واللہ ﷻ اعلم۔

عاقدین میں سے کسی کے مرنے سے اجارہ کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے دوکان کو بیس سال کے لیے کرایہ پر لیا اور درمیان میں مستاجر یا مالکِ مکان کا انتقال ہوگیا تو شرعاً اجارہ ختم ہوگیا، لیکن قانوناً باقی ہے، اب شرعاً مستاجر کی موت کے بعد دوسرا فسخ کا مطالبہ کرے گا، لیکن قانون مانع ہے، لہذا شریعت کی نظر میں اجارہ کو باقی رکھنے کا کیا طریقہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بیس سال کے کرایہ میں اگر یوں لکھ دے کہ مالکِ مکان یا کرایہ دار دونوں میں سے ایک کا انتقال ہوا تو پھر بھی اجارہ کا معاملہ جاری رہے گا تو پھر طویل المدت اجارہ مدتِ معین تک جاری رہے گا اگرچہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہوجائے۔ یعنی معاہدہ کی وجہ سے باقی رہیگا۔

درمختار میں ہے:

وتنفسخ بلا حاجة إلى الفسخ بموت أحد عاقدين عندنا...إلا لضرورة كموته في طريق مكة ولا حاكم فى الطريق فتبقى إلى مكة . وفى الشامية : قوله إلا لضرورة قال فى الدرالمنتقى ، وقد تقرر استثناء الضروريات ، فمن الظن أنه ينتقض بموت المزارع أوالمكارى في طريق مكة فإنه لاينفسخ حتى يبلغ مأمنا، لأن الإجارة كما تنتقض بالأعذار تبقى بالأعذار فليحفظ . (الدرالمختار على ردالمحتار:۶/۸۳،۸۴،سعيد).

وفي تقريرات الرافعي: قوله فمن الظن أنه ينتقض بموت المزارع الخ. أى فيما إذا استاجر أرضاً فزرع فيها ثم مات قبل انقضاء المدة كان على ورثته ماسمى من الأجر إلى أن يدرك الزرع كما فى الهندية. (التحرير المختار:۶/۲۷۱،باب فسخ الاجارة، سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

لو انفسخت الإجارة بموت أحد العاقدين قبل إدراك الزرع، فإنه يترك بالمسمىٰ على حاله إلى الحصاد استحساناً. (شرح المجلة،المادة : ۵۲۶، ۲/۶۱۶،لمحمدخالد الاتاسى).

شرح مجلّہ میں ہے:

وتنفسخ الإجارة أيضاً بلا حاجة إلى الفسخ بموت أحد عاقدين عقدها لنفسه (تنوير) لنفسه إلا لضرورة كما لومات موجر السفينة في وسط البحر أو مات موجر الدابة في الطريق فإنها لاتنفسخ حتى يبلغ مأمناً لأن الإجارة كما تنقض بالأعذار تبقى بالأعذار (درمنتقى) . (شرح المجلة لسليم رستم باز اللبناني:١/٢٥١،المادة:٤٤٣).

عطر ہدایہ میں ہے:

اجارہ دوسو برس تک کا ہو یا پانچ سو برس کا یا اور کسی ایسی طویل مدت کا (کہ مدت تک عادةً متعاقدین زندہ نہ رہتے ہو) خصاف وغیرہ بعض فقہاء کے قول پر جائز تو ہے...لیکن حسبِ تصریح فقہاء " **وتنفسخ الإجارة بموت أحد العاقدين** " (شرح الوقایۃ) یہ اجارہ طویلہ بھی موت احدالعاقدین سے خود بخود بدون فسخ کے فسخ ہو جائے گا، ہاں بصورتِ معاہدہ (بحکم عہد نہ کہ بمقتضائے عقد) حسبِ استنباط والدمرحوم موت احدالعاقدین سے بھی تا انقضائے مدت منفسخ نہ ہوگا، (چنانچہ والدمرحوم تکملہ عمدۃ الرعایۃ علی الجلد الثالث من شرح الوقایۃ میں تحریر فرماتے ہیں:

" **وأما قول فقهائنا في هذا كله صحيح على محله لأن العقد صار على شرف الفسخ إلا أن يمنعه مانع كالجهل أو العهد أو الضرر فما قلنا قلنا بحكم العهد وعدم إضرار العاقدين وما قالوا قالوا ما كان مقتضى العقد فتجويز المعارضة بين فقهائنا وبين رأينا الغالب فيه الخطأ مجادلة باطلة بل إنا استنبطنا من هداياتهم وإفاداتهم فانظر.** (تكملة عمدة الرعاية:٣/٣١١،باب فسخ الاجارة، رقم الحاشية: ٤).

والدمرحوم کا یہ استنباط گو خود مشائخ کا انفساخ بموت احدالعاقدین کے قاعدہ سے (وبحکم " **الضرورة تبيح المحظورات وأن الإجارة تنتقض بالأعذار تبقى بالأعذار.** (شامي ص٥٦ ج ٥بحواله در منتقى). ضرورت واعذار مستثنیٰ کرنے اور احکام عقد وعہد میں فرق ہونے وغیرہ قواعد نظائر کی وجہ سے صحیح ہے مگر منصوص نہیں ہے۔ (عطر ہدایہ ص۲۲۳، بعنوان اجارۂ طویلہ).

تکملہ عمدۃ الرعایہ میں مذکور ہے:

قوله طالت الخ...والإجارات تنفسخ بالموت وكذلك إن شرط الدوام كمن يقول

آجرتک أرضي هذا الدوام على أن تعطيني كل شهر كذا لأن فيه معنى تمليك العين أو الإجارة بعد موت وذا لايجوز نعم إذا شرط مثل هذه الأمور معاهدة ومواعدة لا بأس به لأن العهود غير العقود والعقود تتبع الوجود دون العهود فتنبه. (تكملة عمدة الرعاية:۳/ ۲۹۰،رقم الحاشية:۱۸). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

کرایہ کے مکان کی مرمت کا حکم:

سوال: بعض حضرات نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا، کرایہ دار نے مالکِ مکان کی اجازت سے مکان میں کچھ تصرفات کر لیے تھے، مثلاً دروازہ دوسری جانب منتقل کرلیا وغیرہ، لیکن پہلے سے یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ جو تصرفات کرایہ دار نے کئے ہیں مکان واپس کرتے وقت کرایہ دار خود اپنے پیسے سے ٹھیک کرادیگا، اب اکتوبر میں اس مکان سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے، لیکن سامان وغیرہ اسی مکان میں موجود ہے، اور مکان کی چابیاں بھی کرایہ دار کے پاس ہیں، دسمبر میں مکان واپس کرنا طے پایا تھا اور کرایہ بھی دسمبر تک ادا کرنا منظور ہوا تھا، نیز مکان ٹھیک کرنے وعدہ بھی ہوگیا تھا، لیکن نومبر میں بحکم مالکِ مکان کرایہ دار نے سامان فوری طور پر منتقل کرلیا اور مالک نے قفل وغیرہ بھی بدل دئے یعنی مکان مکمل اپنے قبضہ میں لے لیا اور یہ بھی بتلادیا کہ مرمت میں خود کرلونگا اور قیمت آپ ادا کردیں گے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) پورے مکان کی مرمت کرایہ دار کے ذمہ ہے یا صرف جو تصرف کیا تھا اسی کی مرمت ضروری ہے؟

(۲) اگر مالکِ مکان ٹھیک کرنے کے بعد قیمت طلب کرے تو کونسی قیمت واجب ہوگی؟ درمیانی یا اعلیٰ؟

(۳) دسمبر کا کرایہ لازم ہے یا نہیں جب کہ مکان نومبر سے مالک کے اختیار وقبضہ میں ہے؟

الجواب: بشرطِ صحتِ سوال، صورتِ مسئولہ میں: (۱) مکان میں جو تصرفات کرایہ دار نے کیے تھے ان تمام تصرفات کا ٹھیک کرانا کرایہ دار کے ذمہ لازم ہے۔ اس لیے کہ کرایہ دار نے اس کا عہد کیا تھا اور یہ تصرفات اپنے فائدے کے لیے کیے تھے، مالک کا اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ ان کے علاوہ مکان کی مرمت وغیرہ کرایہ دار پر لازم اور ضروری نہیں ہے، بلکہ مالکِ مکان خود اس کا ذمہ دار ہے۔

(۲) اگر مالکِ مکان نے خود ٹھیک کرالیا اور قیمت طلب کی تو کرایہ دار پر صرف اپنے کیے ہوئے تصرفات

کی قیمت لازم ہوگی، دیگر مکان کی مرمت مثلاً چھت کا ٹھیک کرانا وغیرہ کی قیمت کرایہ دار پر لازم نہیں۔ اور عام طور پر بازار میں جو قیمت رائج ہو اس کے مطابق درمیانی قیمت ادا کرنا لازم ہے اعلیٰ قیمت ادا کرنا کرایہ دار پر لازم اور ضروری نہیں ہے۔

(۳) نومبر میں مالک نے مکان اپنے قبضہ واختیار میں لے لیا تھا اس وجہ سے دسمبر کا کرایہ لازم نہیں۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

و عمارة الدار المستاجرة وتطيينها و إصلاح الميزاب و ما كان من البناء على رب الدار ، و كذا ما يخل بالسكنىٰ . (الدرالمختار: ۶/۷۹، باب فسخ الاجارة ، سعيد).

شرح مجلّہ میں ہے:

أقول: إصلاح ما كان من البناء متى كان تركه مخلاً بالسكنى يجب على المالك بلا فرق بين السطح والجدران...وفى الهندية عن البدائع: وإصلاح بئر الماء والبالوعة والمخرج على رب الدار، ولايجبر على ذلک وإن كان امتلأ من فعل المستاجر، وقالوا: فى المستاجر إذا انقضت مدة الإجارة وفى الدار تراب من كنسه ، فعليه أن يرفعه لأنه حدث بفعله فصار كتراب وضعه فيها، وإن كان امتلأ خلاؤها ومجاريها من فعله ، فالقياس أن يكون عليه نقله ، لأنه حدث بفعله فيلزمه نقله كالكناسة والرماد ، إلا أنهم استحسنوا وجعلوا نقل ذلک على صاحب الدار للعرف والعادة بين الناس أن ماكان مغيباً فى الأرض فنقله على صاحب الدار ، فحملوا ذلک على العادة ، وإن أصلح المستاجرشيئاً من ذلک لم يحتسب له بما أنفق وكان متبرعاً...وفى الأنقروية عن البزازية : خرج المستاجر من البيت وفيه تراب ظاهر أو رماد ، على المستاجر إخراجه ، بخلاف البالوعة ، فإنه يلزم المؤجر تفريغها استحساناً ، وإن شرط على المستاجر عند العقد جاز، وأنه موافق للعقد، أى وإن كان العرف بخلافه ، لأنه حدث بفعله ، فالشرط الموافق للقياس وإن كان مخالفاً للعرف ، لا يفسد العقد ، تأمل. (شرح المجلة للاتاسى:۲/۶۲۲،المادة : ۵۲۹).

شرح مجلّہ میں ہے:

يلزم مراعاة الشرط بقدر الإمكان، أى إمكان الشرط واستطاعته ، ولايلزم ما فوق

الاستطاعة...أن الشروط ثلاثة أقسام: قسم يجوز شرعاً، فيه فائدة لمن اشترطه ، فهذا يلزم مراعاته...وقال في البدائع من كتاب المضاربة : الأصل في الشروط اعتبارها ما أمكن، وإذا كان القيد مفيداً كان ممكن الاعتبار فيعتبر لقوله عليه الصلاة والسلام :"المسلمون عند شروطهم". (شرح المجلة للاتاسي:۱/۲۳٦، المادة :۸۳).

وفيه أيضاً : لايلزم المستاجر إطعام الأجير إلا أن يكون العرف في البلدة كذلك ، حتى لوكان ذلك متعارفاً لايكون اشتراطه على المستاجرمفسداً للعقد على ما قاله الفقيه أبو الليث، كما في الحموى على الأشباه ، قال في ردالمحتار : ثم ظاهر كلام الفقيه أنه لو تعورف ذلك في علف الدابة يجوز، تأمل، والظاهر أنه يلزم المستاجر حينئذٍ أن يطعمه من أوسط الطعام. (شرح المجلة للاتاسي:۲/٦۷۵،المادة:۵۷٦).

وفيه أيضاً : تلزم الأجرة أيضاً في الإجارة الصحيحة بالاقتدار على استيفاء المنفعة ، مثلاً لو استاجر أحد داراً بإجارة صحيحة فبعد قبضها يلزمه إعطاء الأجرة وإن لم يسكنها. ولابد لهذه المسألة من قيدين آخرين: أحدهما أن يكون التمكن من استيفاء المنفعة في المدة التي ورد عليها العقد ...قال في الهندية: فأما إذا لم يتمكن من الاستيفاء أصلاً ... لا يجب الأجر...واستفيد من لفظ الاقتدار أنه لو منعه المالك ...لاتجب الأجرة ،كما صرح به في رد المحتار عن النهاية. (شرح المجلة للاتاسي:۲/۵۵٤،المادة:٤۷۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسلمان انجینیئر کے لیے شراب خانے کی تعمیر کا حکم:

سوال: اگر مسلمان انجینیئر کسی شراب خانے کی ترتیب اور تعمیر کا کام قبول کرے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہائے احناف کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے حضراتِ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اس میں تعاون علی المعصیۃ پایا جاتا ہے اس لیے ایسی مزدوری سے بچنا چاہئے ، جب کہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کے کام میں کوئی معصیت نہیں ،لہذا جائز ہے،تاہم نہ کرنے میں احتیاط کا پہلو ہے، ہاں اگر کسی نے ایسی مزدوری قبول کرلی تو اجرت ناجائز اور حرام نہیں ہوگی۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وجاز تعمير كنيسة وحمل خمر ذمي بنفسه أو دابته بأجر لا عصرها لقيام المعصية بعينه ... وقالا: لاينبغي ذلک لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة. وفى الشامية: قوله وجاز تعمير كنيسة قال فى الخانية : ولو آجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا بأس به لأنه لا معصية في عين العمل، قوله وحمل خمر ذمي قال الزيلعيؒ: وهذا عنده وقالا : هو مكروه ... و له أن الإجارة على الحمل و هو ليس بمعصية ، ولا سبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار . (الدرالمختارمع فتاوی الشامی:۳۹۱/۶، کتاب الحظروالاباحۃ، سعید).

طحطاوی میں ہے:

قوله وجاز تعمير كنيسة أى بالترميم لا بالإعادة بعد الهدم وظاهره جوازه وأنهم لو استامروا الإمام أمرهم وأنه يجوز للمسلم أن يوجر نفسه لذلک . (حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار:۱۹۶/۴، کوئٹہ).

البحرالرائق میں ہے:

وفى التاتارخانية: ولو آجر المسلم نفسه لذمي ليعمل فى الكنيسة فلا بأس به .

(البحرالرائق :۲۰۳/۸،فصل فی البیع،کوئٹۃ).

محیط برہانی میں ہے:

ولو آجر نفسه ليعمل فى الكنيسة يعمرها فلا بأ س به ، إذ ليس فى نفس العمل معصية . (المحیط البراھانی:۱۰۳/۶، الفصل السادس عشر فی معاملۃ اھل الذمۃ،مکتبہ رشیدیۃ).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو استاجر الذمي مسلماً ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر. (الفتاوی الھندیۃ:۴۵۰/۴، وکذا فی فتاوی قاضیخان علی ھامش الھندیۃ:۳۲۴/۲۔والفتاوی البزازیۃ علی ھامش الھندیۃ:۱۲۵/۵۔وجواھرالفقہ :۴۵۳/۲، مسئلۃ الاعانۃ علی الحرام۔وامدادالفتاویٰ:۳۲۲/۴،بعنوان اعانت علی المعصیت کی چند جزئیات). **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر مسلموں کے عبادت خانے کی تعمیر کا حکم:

سوال: ایک شہر میں بدھست لوگوں کا عبادت خانہ بن رہا ہے، اگر کوئی مسلمان شخص اس کی تعمیر میں کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور آمدنی حلال ہوگی یا حرام؟ بینوا توجروا۔

الجواب: غیر مسلموں کے عبادت خانہ کی تعمیر میں مسلمان کے لیے کام کرنے کی گنجائش ہے، بنابریں اجرت اور آمدنی حرام اور ناجائز نہیں ہوگی۔

ملاحظہ ہو طحطاوی میں ہے:

قوله وجاز تعمير كنيسة أى بالترميم لا بالإعادة بعد الهدم وظاهره جوازه وأنهم لو استامروا الإمام أمرهم وأنه يجوز للمسلم أن يوجر نفسه لذلك . (حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ٤/١٩٦، كوئته).

البحر الرائق میں ہے:

وفي التاتارخانية: ولو آجر المسلم نفسه لذمي ليعمل في الكنيسة فلا بأس به .

(البحر الرائق :٨/٢٠٣،فصل فى البيع، كوئتة).

محیط برہانی میں ہے:

ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة يعمرها فلا بأ س به ، إذ ليس في نفس العمل معصية . (المحيط البراهانى:٦/١٠٣، الفصل السادس عشر فى معاملة اهل الذمة،مكتبه رشيدية).

(و كذا فى فتاوى قاضيخان على هامش الهندية:٢/٣٢٤-والفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/١٢٥).

واللہ ﷻ اعلم۔

مسلمان نائی کا غیر شرعی بال کاٹنے کا حکم:

سوال: مسلمان نائی اگر کسی مسلمان کے بال غیر شرعی طور پر کاٹے یا ڈاڑھی کا حلق کرے تو اس مسلمان حجام کی کمائی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں ایک قبضہ کے بقدر ڈاڑھی رکھنا لازم ہے، یک مشت کے اندر کاٹنا، کٹانا دونوں کام بنگاہِ شریعت گناہ اور ناجائز ہیں۔ بنابریں مسلمان نائی کا غیر شرعی بال کاٹنا اور ڈاڑھی کا حلق کرنا اور اس کو پیشہ بنانا ناجائز ہے، اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہے، اس سے توبہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

والأخذ من اللحية وهو دون ذلک (القبضة) كما يفعله بعض المغاربة ، ومخنثة الرجال لم يبحه أحد ، وأخذ كلها فعل يهود الهند، ومجوس الأعاجم. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ، ص ٦٨١، كتاب الصوم ، فصل فيمايكره للصائم، قديمي۔وكذافي فتاوى الشامی:٢/ ٤١٨، كتاب الصوم ، مطلب في الاخذ من اللحية ، سعيد۔وفتح القدير:٢/ ٣٤٨، دارالفكر).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

لايحل للرجل أن يقطع اللحية . (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٦/ ٣٧٩، كتاب الاستحسان).

جواہرالفقہ میں ہے:

باجماعِ امت ڈاڑھی منڈانا حرام ہے اسی طرح ایک قبضہ سے کم ہونے کی صورت میں کتروانا بھی حرام ہے...ائمہ اربعہ حنفیہ مالکیہ شافعیہ حنبلیہ کا اس پر اتفاق ہے۔

ويحرم على الرجل قطع لحيته الخ ، وأما الأخذ منها وهي مادون القبضة كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه أحد. (فتح القديرودرمختار).(جواهرالفقه:٢/ ٤٢٣).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ڈاڑھی منڈنا جائز نہیں ۔...یہ کام گناہ ہے اس کی آمدنی بھی مکروہ ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۷/ ۱۲۳، جامعہ فاروقیہ).

آپ کے مسائل میں ہے:

حرام کام کی اجرت بھی حرام ہے۔(آپ کے مسائل اوران کا حل:۶/ ۴۰).

جدید مسائل کے شرعی احکام میں ہے:

واضح ہو کہ اپنی ڈاڑھی مونڈنا یا ایک مشت سے کم کرنا حرام ہے ایسے ہی دوسرے کی ڈاڑھی مونڈنا مقدارِ مذکورہ سے کم کرنا بھی حرام ہے، ڈاڑھی مونڈنے کی اجرت وصول کرنا بھی حرام ہے، لہذا بار بری کا پیشہ اختیار کرنے والے اپنی روزی حرام نہ کریں۔

ومن آفات اليد حلق راس المرأة ولحية الرجل وقص أقل من قبضة ولوباذن منه لأنه

إعانة على معصية فيكون معصية أيضاً . (شرح الطريقة المحمدية:٣/٤٤٧).

دونوں ہاتھوں کے گناہوں میں سے عورت کے سر کے بال یا مرد کی ڈاڑھی کا مونڈنا اور مٹھی سے کم کاتراشنا ہے چاہے یہ مونڈنا اور کترنا اس مرد یا عورت کی اجازت ہی کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ کے کام میں مدد کرنا ہے اور یہ بھی گناہ ہے۔

نیز ''کشاف القناع'' میں ہے کہ ڈاڑھی مونڈوانے کے لیے کسی اجرت دینا یا اجرت کا لینا دونوں حرام ہیں۔ (کشاف القناع:۴/۹، ماخوذ از داڑھی کی اسلامی حیثیت)۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۰۲). **واللہ ﷻ اعلم۔**

تقریر اور وعظ کہنے پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: کیا تقریر اور وعظ کہنے پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تقریر اور وعظ پر اجرت لینا فقہاء کے کلام سے جائز معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمارے اکابرؒ نے پسند نہیں فرمایا۔لہذا نفس جواز میں تو کوئی کلام نہیں ہے البتہ پسندیدہ نہیں ہے۔ہاں جس مقرر نے وعظ ہی کے لیے اپنے آپ کو فارغ کر رکھا ہے تو اس کے لیے اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان. وفى الشامية : وزاد بعضهم الأذان والإقامة والوعظ. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ٦/٥٥، مطلب تحرير مهم فى عدم جواز الاستئجار على التلاوة...،سعيد).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وفى الأصل لايجوز الاستئجار على الطاعات كتعليم القرآن والفقه والأذان والتذكير والتدريس والحج والعمرة ولايجب الأجر ،كذا فى الخلاصة ومشايخ بلخ جوزوا... والمختار للفتوىٰ في زماننا قول هؤلاء كذا فى الفتاوى العتابية. (الفتاوى الهندية:٤/٤٤٨).

وفى البزازية: الاستئجار على الطاعات كتعليم القرآن والفقه والتدريس والوعظ لايجوز أى لايجب الأجر وأهل المدينة طيب الله ساكنها جوزه قال فى المحيط وفتوىٰ

مشایخ بلخؒ علی الجواز قال الإمام الفضلی والمتأخرون علی جوازہ . (الفتاوی البزازیۃ:۲/۳۷).

مجمع الانہر میں ہے:

ولا یجوز أخذ الأجرۃ عند المتقدمین علی الطاعات و فی شرح الوافی والمذھب عندنا أن کل طاعۃ یختص بھا المسلم فالاستیجار علیھا باطل کالأذان والحج والإمامۃ والتذکیر والتدلیس ... ویفتی الیوم بالجواز ... کما في عامۃ المعتبرات وھذا علی مذھب المتأخرین من مشایخ بلخؒ استحسنوا ذلک وقالوا: الأحکام قد تختلف باختلاف الزمان ألایری أن النساء کن یخرجن إلی الجماعات في زمانہ علیہ الصلاۃ والسلام وفي زمان أبي بکر الصدیقؓ حتی منعھن عمرؓ واستقر الأمر علیہ وکان ذلک ھو الصواب. (مجمع الانھرشرح ملتقی الابحر:۲/۳۸۲).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جس طرح تعلیم وتدریس کی ملازمت درست ہے اسی طرح تذکیروتقریر کی ملازمت بھی درست ہے، کام متعین کرلیا جائے، مثلاً ہر روز ایک گھنٹہ، یا ہر جمعہ کو دو گھنٹے تقریر لازم ہوگی اور اتنا معاوضہ دیا جائے گا، یا مقرر کو مستقل ملازم تقریر کے لیے رکھ لیا جائے کہ جلسوں میں بلانے پر یا بغیر بلائے دیگر مقامات پر جا جا کر تقریر کرے۔

یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے کہ کسی جگہ وعظ فرمایا اور روپئے لے لیے، پھر اگر اپنے انداز سے کچھ کم ہو جائے تو ناک بھوں چڑھانے لگے، اس طرح وعظ کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے اور بلانے والے رسمی طور پر بلاتے ہیں اور بلانے سے پہلے سے ہی فقرے کسنے شروع کر دیتے ہیں کہ ان کو اتنا دیا گیا تھا اس سے ناخوش ہوئے تھے، لہذا جب تک اس سے زیادہ کا انتظام نہ ہو جائے ان کو نہیں بلانا چاہئے، وغیرہ وغیرہ۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۷/۸۵، جامعہ فاروقیہ)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

وعظ کہنے پر اجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں اس بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ اجرت علی الطاعات میں داخل ہے اس لیے جائز نہیں لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جائز ہے چنانچہ دونوں اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

اگر وعظ کہنے کی نوکری اختیار کر لی جائے امامت کی طرح تو اجرت لینا جائز ہے اور اگر (مستقل) نوکری

نہیں کی، بلکہ عین وقت پر اجرت لینے کی شرط طے کرے، (یعنی کسی کو وقتی طور پر وعظ کے لیے بلایا جائے اور وہ اجرت دینے کی شرط رکھے) تو یہ صورت جائز نہیں جیسے کوئی مستقل امام نہ ہو بلکہ نماز کا وقت ہو گیا اور وہ مسجد میں موجود ہے اس کو نماز کے لیے کہا گیا تو عین وقت پر امامت پر اجرت مانگنے لگے، یہ بھی جائز نہیں۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۲۱۴).

احسن الفتاوی میں ہے:

اگر کسی کو وعظ کہنے کے لیے ملازم رکھا گیا ہے یا کسی نے اپنے کو اسی کام کے لیے فارغ کر رکھا ہے تو اس صورت میں وعظ پر اجرت لینا جائز ہے اور اگر کسی خاص موقع پر کسی عالم سے وعظ کہنے کی درخواست کی جائے تو وعظ پر اجرت لینا جائز نہیں۔ (احسن الفتاوی: ۷/۳۰۰).

ہاں اس وقت تحفہ ہدیہ وغیرہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ فرماتے ہیں:

وعظ کی اجرت کو بھی بسبب ضرورت کے متاخرین نے جائز لکھا ہے۔ (تالیفات رشیدیہ، ۴۱۸، ادارہ اسلامیات لاہور).

قاموس الفقہ میں ہے:

اتفاقی وعظ اور تقریر وغیرہ پر اجرت لینا جائز نہیں، اس لیے کہ اس کی وجہ سے کوئی شعار دینی متاثر نہیں ہوتا، نہ دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، ہاں اگر کسی کو خاص اسی کام کے لیے رکھ لیا جائے اور وعظ و نصیحت تبلیغ و دعوت ہی اس کی مستقل ذمہ داری اور ڈیوٹی قرار پائے تو اب اس پر اجرت لینی جائز ہوگی۔ (قاموس الفقہ: ۱/۴۹۷). واللہ ﷻ اعلم۔

مفتی اور قاضی کے لیے اجرت لینے کا حکم:

سوال: کیا مفتی اور قاضی اپنے کام کے لیے فیس اور اجرت مقرر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: مفتی اور قاضی کے لیے زبانی مسئلہ بتانے کی اجرت جائز اور درست نہیں، ہاں تحریری شکل میں جواب لکھ کر دینے کی اجرت جائز اور درست ہے۔ نیز اگر کسی شہر میں متعدد مفتی ہوں تو دوسروں کی موجودگی میں ایک پر مسئلہ بتانا ضروری نہیں ہے اس لیے اس وقت بھی مسئلہ بتلانے پر اجرت لینا جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

قلت: لكن في البزازية: كل ما يجب على القاضي والمفتي لايحل لهما أخذ الأجر به كإنكاح صغير لأنه واجب عليه وكجواب المفتي بالقول، وأما بالكتابة فيجوز لهما على قدر كتبهما لأن الكتابة لاتلزمهما. (الدر المختار:۷/۵۹،سعید).

شرح منظومۃ ابن وہبان میں ہے:

أما المفتي فهل يجوز له أخذ الأجرعلى كتب الجواب؟ ذكر في القنية راقماً لشرح ظهير: أنه يجوز له أخذ الأجر على كتبة الجواب بقدره، لأن الكتابة ليست عليه، لأن الواجب عليه الجواب إما باللسان وإما بالكتابة. فألحقته أيضاً، فقلت وبالله المستعان:

جوز للمفتي على كتب خطه على قدره إذ ليس في الكتب يحصر

...وقال جلال الدين ابوالمحامد حامد بن محمد في كتاب السجلات: يجوز للقاضي أخذ الأجرة على كتبة المحاضرو السجلات، ونحوها من الوثائق بمقدار أجرالمثل، و ذلك لأن القاضي إنما يجب عليه القضاء وإيصال الحق الى مستحقه فحسب، اما الكتابة فزيادة عمل، فيعمله للمقضى له، وعلى هذا قالوا: لابأس للمفتي أن يأخذ شيئاً على كتابة جواب الفتوىٰ، وذلك لأن الواجب على المفتى الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان، ومع هذا الكف عن ذلك أولىٰ حذراً عن القيل والقال، وصيانة لماء الوجه عن الابتذال.

(شرح منظومة ابن وهبان:۱/۲۸۸، فصل من كتاب ادب القاضي،ط: الوقف المدني،ديوبند).

(وهكذا في الدر المختار مع ردالمحتار:۶/۹۲، مسائل شتى من كتاب الاجارة، سعيد۔ولسان الحكام في معرفة الاحكام لابن الشحنة الحنفي،ص۲۱۹،الفصل الاول في آداب القضاء،دارالفكر).

وفي فتاوى الشامي: قوله يستحق القاضى الأجر الخ)...وفي المنح عن الزاهدى: هذا إذا لم يكن له في بيت المال شيء، تأمل. (فتاوى الشامي: ۶/۹۲،مطلب في اجرة صك القاضي والمفتي،سعيد).

وفي الدرالمختار: وفي الصيرفية: حكم وطلب أجرة ليكتب شهادته جاز، وكذا المفتي لو في البلدة غيره، وقيل مطلقاً لأن كتابته ليست بواجبة عليه، وفي الشامية: قوله

وقيل مطلقاً أي ولو لم يكن في البلدة غيره وهو ظاهر ما مر في المتن، ووجهه ظاهر للتعليل المذكور. (الدرالمختارمع فتاوى الشامي: ٩٢/٦، مطلب في اجرة صك القاضي والمفتي،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: فتویٰ کردہ اجرت گرفتن جائز است یانہ؟

الجواب: با اجرت فتویٰ کردن دوصورت دارد: یکے بزبان جواب سوال دادن، وبرآن اجرت گرفتن بلا شروطِ اجارہ وبلا پابندئ وقت روانیست۔

دوم: تحریر جوابِ استفتاء دادن، وآن بلا شبہ رواست، زیرا کہ آن اجرت نوشتن است، وبر مفتی نوشتہ جواب دادن از جانبِ شرع واجب نیست، پس برآن اجرت گرفتن روا خواہد بود مثل دیگر کاروبار نوشتی، مگر مقتضائے غایتِ تقویٰ آنست کہ اگر مقدرہ بود، صرف برائے خدا ایں خدمت بانجام رسانید، اجرت نگیرد، پس اجرت گرفتن رخصت است، کہ مرتکبش قابل ملامت نیست، واجرت نگرفتن عزیمت است کہ عاملش لائق تحسین کذافی ردالمحتار۔ (فتاویٰ محمودیہ: ٢٩/١٧، جامعہ فاروقیہ). واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کو زمین یا مکان کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: اپنی زمین یا مکان بینک کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عمومی سطح پر بینک سودی کاروبار میں ملوث ہے، لیکن آج کل بینکوں میں سودی کاروبار کے علاوہ دیگر معاملات بھی ہوتے ہیں، بلکہ اکثر کاروبار درآمد برآمد تنخواہوں کی ادائیگی، بجلی اور ٹیلی فون کے بل وغیرہ اس کے ذریعہ ادا کیے جاتے ہیں، لہذا بینک کو کرایہ پر دئے ہوئے مکان کا کرایہ حرام نہیں ہوگا، ہاں بچنا اولیٰ اور بہتر ہے۔

پھر اگر بنانے والے نے بینک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں تو مکروہِ تحریمی ہے اور اگر ایسے کمرے صرف بینک ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے کاموں اور دفاتر کے لیے بھی بنتے ہیں تو مکروہِ تنزیہی ہے۔

ملاحظہ ہو مبسوط میں ہے:

ولا بأس بأن يواجر المسلم داراً من الذمي ليسكنها، فإن شرب فيها الخمر أو عبد

فيها الصليب أو دخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم فيه إثم في شيء من ذلک لأنه لم يواجرها لذلک والمعصية في فعل المستاجر دون قصد رب الدار فلا إثم على رب الدار في ذلک . (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۱۶/۳۰۹، بیروت).

خلاصۃ الفتاوی میں ہے:

رجل آجر بيتاً ليتخذ فيه نار أو بيعة أوكنيسة أو يباع فيه الخمر فلا باس به، وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار. (خلاصة الفتاوى: ٤/٤٧٦، كتاب الكراهية).

درمختار میں ہے:

(و جاز إجارة بيت بسواد الكوفة) ... و خص سواد الكوفة ، لأن غالب أهلها أهل الذمة (ليتخذ بيت نار أوكنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر) وقالا : لاينبغي ذلک لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة. وفى الشامية: قوله وجاز إجارة بيت الخ، هذا عنده أيضاً لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولامعصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار فينقطع نسبته عنه...والدليل عليه لوآجره للسكنى جاز وهولابد له من عبادته فيه...قال فى المنح:...والمنقول في كثير من الفتاوى أنه يكره وهوالذى عولنا عليه فى المختصر، أقول: هو صريح أيضاً في أنه ليس مما تقوم المعصية بعينه ، ولذا كان ما فى الفتاوى مشكلاً كما مر عن النهر . (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/٣٩٢، سعيد).

جواہرالفتاوی میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصولاً محضاً، وهومع ذلک سبب قريب بحيث لايحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من أهل الفتنة ، وبيع العصير ممن يتخذه خمراً...وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها ، فكله مكروه تحريماً إن يعلم به البائع والآجر، من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم كان معذوراً ...لكن الإعانة حقيقة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولايتحقق إلا بنية الإعانة أوالتصريح بها أوتعينها في استعمال هذا الشيء ،

بحيث لايحتمل غير المعصية . (جواهرالفقه :٢/٤٥٣، مسئلة الاعانة على الحرام).

وفي الدر المختار: قلت: ...إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً وإلا فتنزيهاً فليحفظ توفيقاً . (الدرالمختار:٦/٣٩١، كتاب الحظرو الاباحة،سعيد).

(كذا فى فتاوى قاضيخان على هامش الهندية:٢/٣٦٤ ـو الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/١٢٥).

فتاویٰ خلیلیہ میں ہے:

دفتر بینک کے لیے مکان کرایہ پر دینا بظاہر جائز معلوم ہوتا ہے۔ (فتاویٰ خلیلیہ:۱/۲۵۲۔ وامداد الفتاویٰ:۴/۳۲۲، بعنوان اعانت علی المعصیت کی چند جزئیات)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شراب اور سنیما کے لیے مکان کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: کیا مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا مکان، زمین وغیرہ ایسے آدمی کو کرایہ پر دے جو شراب بیچتا ہے؟ اور اس کرایہ کو کہاں استعمال کیا جائے؟ ماضی میں وصول کردہ کرائے کا اب کیا حکم ہے؟

الجواب: یہ مسئلہ فقہائے احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے، حضرت الامام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جہاں کفار کی اکثریت ہوں وہاں شراب وغیرہ کی فروخت کے لیے مکان یا زمین کرایہ پر دینا جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی اور اجرت کا لینا بھی درست ہے۔ لیکن صاحبینؒ فرماتے کہ یہ مکروہ ہے۔

چنانچہ فتاوی قاضیخان میں ہے:

ولو استأجر الذمي من مسلم بيتاً يبيع فيه الخمر جاز عند أبي حنيفةؒ ولابأس لمسلم أن يؤاجر داره من ذمي ليسكنها وإن شرب فيه الخمر. (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية:٢/٣٢٤).

اسی طرح البحر الرائق میں ہے:

و إجارة بيت ليتخذ بيت نار أو بيعة أو كنيسة أو يباع فيه خمر بالسواد و هذا قول الإمامؒ، وقالا: يكره كل ذلك لقوله تعالىٰ: ﴿وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولاتعاونوا على الإثم والعدوان﴾. (البحرالرائق:٨/٢٠٢، كوئته).

فتاوی بزازیہ میں ہے:

ولو آجر نفسه لحمل الخمر قال الإمام: لايكره وعلى قولهما يكره، لأن التصرف في الخمر حرام، وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار، كما إذا آجر منزله ليتخذ بيعة أو كنيسة أو بيت نار يطيب له . (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/١٢٥،العاشر في الحظر والاباحة).

صاحبینؒ اسے گناہ کی چیز پر تعاون کے سبب مکروہ فرماتے ہیں، پھر اگر ایسی چیز فروخت کرے جو خود تو کارِ معصیت نہ ہو لیکن معصیت کا سبب قریب ہو تو کراہت تنزیہی ہوگی، جیسے معلوم ہو کہ انگور کے شیرہ سے شراب بنائیگا، **بأنه لاتقوم المعصيه بعينه بل بعد تغيره**. (فتاوى الشامي:٦/١٩٢،سعيد).

اور اگر ایسی چیز ہو جس کے ساتھ معصیت قائم بعینہٖ ہو مثلاً شراب تو کراہتِ تحریمی ہوگی، جب کہ پہلے سے معلوم ہو۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اجارہ گھر کی منفعت پر ہوتا ہے اسی لیے جب گھر سپرد کر دیا تو محض سپرد کرنے سے اجرت لازم ہوگی اور نفس اجارہ میں کوئی معصیت کا مفہوم نہیں ہے، معصیت مستاجر کا اپنا فعل ہے اور وہ فاعل مختار ہے لہٰذا اس معصیت کی نسبت موجر کی طرف کرنا درست نہ ہوگا۔

چنانچہ البحرالرائق میں ہے:

وله أن الإجارة على منفعة البيت ولهذا تجب الأجرة بمجرد التسليم ولامعصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهومختار فيه فقطع نسبة ذلك إلى المؤجر .

(البحرالرائق:٨/٢٠٢،كتاب الكراهية،كوئتة).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

سوال: مکان وغیرہ ایسے لوگوں کو کرایہ پر دینا کہ جو شراب و دیگر محرمات اس میں فروخت کرتے ہوں یا خود افعال خلافِ شرع ممنوعات اس میں کریں یا کفار کہ وہ اس میں بُت پرستی کریں، منع اور داخل اعانت علی المعصیت ہوگا یا نہیں؟

جواب: ایسے کو کرایہ پر دینا مکان کا درست نہیں حسبِ قولِ صاحبینؒ کے اور امام صاحبؒ کے قول سے جواز معلوم ہوتا ہے کہ مکان کرایہ پر دینا گناہ نہیں گناہ بفعل اختیاری مستاجر کے ہے مگر فتویٰ اسی پر ہے کہ نہ دیوے کہ یہ اعانت گناہ کی ہے۔ **لاتعاونوا على الإثم والعدوان**۔ (تالیفاتِ رشیدیہ، ص۴۲۱، اجرت کے مسائل).

کفایت المفتی میں ہے:

اگر شراب بیچنے والا مسلمان نہ ہو اور مسلمانوں کی آبادی بھی اس بستی میں زیادہ نہ ہو بلکہ زیادہ تر کفار آباد ہوں تو شراب بیچنے والے کافر کو دوکان کرائے پر دینا جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ۷/۳۴۰)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

بندہ کے خیال میں اجارہ من الکافر اور اجارہ من المسلم میں فرق ہے عباراتِ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کافر سے متعلق ہیں اس میں درایۃً وروایۃً کراہتِ تنزیہیہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے اور اجارہ من المسلم میں کراہتِ تحریمہ راجح معلوم ہوتی ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۶/۵۴۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مول میں شراب اور سینما کے کرایہ کا حکم:

سوال: اگر کسی مول میں شراب کی ایک دوکان ہے باقی دوکانیں دوسری چیزوں کی ہیں، تو مسلمان اس کا کرایہ حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ یہ بھی یادرہے کہ مول کی اکثر آمدنی مثلاً ۸۰ یا ۹۰ فیصد حلال ہے، صرف ۱۰ فیصد شراب اور سینما وغیرہ کا کرایہ ہے تو یہ ۱۰ فیصد کرایہ حلال ہے یا حرام؟ مسلمان مالک اس کو وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شراب اور سینما وغیرہ کارِ معصیت کے لیے دکان یا مکان کرایہ پر دینے اور کرایہ کی آمدنی حاصل کرنے کے بارے میں ہمارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے، حضراتِ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ یہ تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے، جب کہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسا عقدِ اجارہ ٹھیک ہے اور اس کی اجرت لینا بھی جائز ہے اس لیے کہ عقدِ اجارہ دکان یا مکان کی منفعت پر وارد ہوا ہے اور اس میں کوئی معصیت نہیں، شراب کی فروخت فاعل مختار کا اپنا فعل ہے مالکِ مکان نے کرایہ دار سے یہ نہیں کہا کہ تم اس میں شراب بیچو، لہٰذا اگر پہلے سے معلوم تھا کہ کرایہ دار شراب بیچے گا تو اس مقصد کے لیے دینا مکروہِ تحریمی ہے، اور گناہ کے کام پر تعاون ہے، لیکن اگر دکان کسی اور مقصد کے لیے دی تھی پھر کرایہ دار اس میں شراب فروخت کرتا ہے تو مکروہِ تنزیہی ہے۔

ملاحظہ ہو مبسوط میں ہے:

ولابأس بأن يواجر المسلم داراً من الذمي ليسكنها، فإن شرب فيها الخمر أو عبد

فيها الصليب أو دخل فيها الخنازير لم يلحق المسلم فيه إثم في شيء من ذلک لأنه لم يواجرها لذلک والمعصية في فعل المستاجر دون قصد رب الدار فلا إثم على رب الدار في ذلک . (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۳۰۹/۱۶، بیروت).

فتاوی بزازیہ میں ہے:

ولو آجر نفسه لحمل الخمر قال الإمام: لايكره وعلى قولهما يكره، لأن التصرف فى الخمر حرام، وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار، كما إذا آجر منزله ليتخذ بيعة أو كنيسة أو بيت نار يطيب له . (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:۱۲۵/۵،العاشر فى الحظر والاباحة).

خلاصۃ الفتاوی میں ہے:

رجل آجر بيتاً ليتخذ فيه نار أو بيعة أو كنيسة أو يباع فيه الخمر فلا باس به، وكذا كل موضع تعلقت المعصية بفعل فاعل مختار . (خلاصة الفتاوى: ٤٧٦/٤،كتاب الكراهية).

(كذا فى الهداية: ٤٧٢/٣، كتاب الكراهية، والكفاية:٣/٨... وفى العينى شرح الكنز:٣٨٤/٢،وكذا فى الدر المختار مع ردالمحتار: ٣٩٢/٦،سعيد، وعزيزالفتاوى: ٦٣٨/١).

اس سلسلہ میں اکابرؒ کے فتاوی میں بظاہر اختلاف ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں:

ایسے کو مکان دینا درست نہیں بقول صاحبینؒ کے امام صاحب کے قول سے جواز معلوم ہوتا ہے کہ مکان کرایہ پر دینا گناہ نہیں...مگر فتویٰ اس پر ہے کہ نہ دیوے کہ اعانت گناہ کی ہے۔(فتاوی رشیدیہ،ص۵۰۲).

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر شراب بیچنے والا مسلمان نہ ہو اور مسلمانوں کی آبادی بھی اس بستی میں زیادہ نہ ہو بلکہ زیادہ تر کفار آباد ہوں تو شراب بیچنے والے کافر کو دکان کرایہ پر دینا جائز ہے۔ (کفایت المفتی:۳۴۰/۷).

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ فرماتے ہیں کہ کافر کو دکان دینا مکروہِ تنزیہی ہے اور مسلمان کو دینا مکروہِ تحریمی ہے۔(احسن الفتاویٰ:۵۴۶/۶).

حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ کی عبارت سے اکابرؒ کے فتاویٰ میں تطبیق کی صورت سامنے آتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر شراب کی دکان مسلمان چلاتا ہے تو اس دکان کے کرایہ کو صدقہ کردینا چاہئے، لیکن اگر غیر مسلم شراب کی دکان چلاتا ہے تو امام صاحبؒ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اجارہ میں صفقۃ فی صفقۃ کا حکم:

سوال: زید نے رنگریز کو کپڑا دیا کہ اس کو ۵۰ روپے میں رنگ دو، اس نے رنگ دیا یا درزی کو کپڑا دیا کہ آپ ۲۰۰ روپے میں سی لو، اس نے سی لیا یہ معاملہ بظاہر جائز ہے اسی پر لوگوں کا عمل درآمد ہے، لیکن اس پر ایک فقہی اشکال ہے کہ جب رنگ اور دھاگہ اجیر کی طرف سے ہے تو یہ صفقۃ فی صفقۃ بن گیا، کیونکہ بیع اور اجارہ دونوں جمع ہوگئے بیع العین اور بیع المنفعۃ صفقۃ فی صفقۃ ہے، نیز اس میں ایک اور خرابی بظاہر یہ ہے کہ اجارہ استہلاک منفعت پر ہوتا ہے جب کہ یہاں استھلاکِ عین پایا گیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء نے تعامل کی وجہ سے اس معاملہ کو جائز فرمایا ہے۔

ہدایہ میں ہے:

وفي الاستحسان يجوز للتعامل فيه فصار كصبغ الثوب وللتعامل جوزنا الاستصناع .

(الهداية:٣/ ٦١، باب بيع الفاسد).

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

فإن القياس لايجوز استيجار الصباغ لصبغ الثوب لأن الإجارة عقد على المنافع لا الأعيان وفيه عقد على العين وهو الصبغ لا الصبغ وحده لكن جوز للتعامل جواز الاستصناع. (العناية مع فتح القدير:٦/ ٨٥،مكتبه رشيديه).

نیز اس میں صفقۃ فی صفقۃ بھی ہے کیونکہ اجارہ کے ساتھ رنگ کی بیع اور خیاطت میں دھاگے اور اس کے متعلقات کی بیع ہے، لیکن اجارہ اصالۃً ہے اور بیع تبعاً ہے۔

ملاحظہ ہو حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

سوال: "نهى عن صفقة في صفقة" کے ظاہری معنی کے لحاظ سے بعض امور ناجائز معلوم ہوتے ہیں حالانکہ بکثرت خاص و عام میں شائع ہیں، مثلاً گھڑی کی مرمت کہ ٹوٹے ہوئے پرزے کو نکال کر صحیح پرزہ لگادے تو اس پرزہ کی تو بیع ہے اور لگانے کا اجارہ۔ (۲) چارپائی بنوانا اور بان اپنے پاس سے نہ دینا اس میں بان کی بیع

ہے اور بننے کا اجارہ۔(۳) سقہ سے پانی لینا کہ جب اس نے کنویں سے پانی نکال کر اپنے ظروف میں لیا تو اس کی ملک ہوگیا سو پانی کی بیع ہوئی اور وہاں سے لانے کا اجارہ نیز بیع ما لیس عندہ بھی ہے، (۴) کوئی زیور یا انگوٹھی جڑنے کو دینا کہ نگینوں کی بیع ہے اور لگانے کا اجارہ وغیر ذلک من المعاملات الرائجۃ۔

الجواب: تعامل کی وجہ سے کہ بلانکیر شائع ہے جو ایک نوع کا اجماع ہے یہ سب معاملات جائز ہیں، پس نص عام مخصوص البعض ہے جیسا کہ فقہاء نے صباغی اور خیاطی میں اس کی اجازت دی ہے کہ صبغ اور خیط صانع کا ہوتا ہے اور اس میں اجارہ بھی ہوتا ہے، وہذا ظاہر جداً فقط، واللہ اعلم۔(امداد الفتاوی:۳/۶۳،۶۴).

صفقۃ فی صفقۃ کی تفصیلی بحث کتاب البیوع میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شادی کا ہال غیر مسلم کو کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: کیا مسلمان اپنا شادی کا ہال کسی غیر مسلم کو کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ یہ یقینی بات ہے کہ غیر مسلم اس ہال میں ناچ گانا بجانا وغیرہ محرمات کا ارتکاب کریں گے۔

الجواب: امام صاحبؒ کے نزدیک غیر مسلم کو ہال کرایہ پر دینا جائز ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے، نیز ہمارے اکابرؒ کے فتاوی میں اختلاف ہے، حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے اختلاف کو دفع کرتے ہوئے فرمایا غیر مسلم کو دینے میں کراہتِ تنزیہیہ ہے، اور صورتِ مسئولہ میں چونکہ کرایہ دار غیر مسلم ہے لہذا یہ معاملہ خلافِ اولیٰ ہوگا حرام یا مکروہِ تحریمی نہیں ہوگا۔

دلائل کی تفصیل گزر چکی ہے، تکرار موجبِ طوالت ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اجارہ منسوخ کرنے پر رقم ضبط کر لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص اتوار کے دن شادی ہال کو بُک کراتا ہے اور رقم کا کچھ حصہ پیشگی ادا کر دیتا ہے، پھر اگر کسی وجہ سے وہ ایک یا دو دن پہلے منسوخ کرتا ہے تو اس کی ادا کردہ رقم میں سے کچھ حصہ ضبط کر لیا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

الجواب: رقم کو ضبط کرنا بیع عربون کے مشابہ ہے اور یہ ناجائز ہے، البتہ اگر شادی ہال والے بکنگ کے لیے کچھ فیس مقرر کرلیں اور وہ رقم ناقابل واپسی ہو مثلاً سو رینڈ بکنگ کے لیے طے کرلیں اور کاغذی کارروائی

، ٹیلی فون کا خرچہ، دفتر کا خرچہ وغیرہ اس سے پورا کیا جاتا ہوتو یہ رقم واپس نہیں ہوگی، جیسے بچے کے داخلہ کی فیس ہوتی ہے جونا قابل واپسی ہوتی ہے۔

بیع عربون کی تفصیلی بحث کتاب البیوع میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

داخلہ فیس کے جواز کے دلائل ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام:۳/۵۲۶، ۶۰۶۔ وامداد الفتاویٰ:۳/۴۰۲). واللہ ﷻ اعلم۔

مستاجر پر مرمت کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: آج کل بعض مصالح کی وجہ سے موجر یعنی مالک نے مستاجر یعنی کرایہ دار پر یہ شرط لگائی کہ جو خرابی کار میں پیدا ہو اس کی اصلاح اور مرمت تم کروگے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ عام کتابوں میں اس کو درست نہیں لکھا ہے۔

الجواب: بعض کتبِ فقہ مثلاً خلاصہ، بزازیہ اور شرح مجلّہ وغیرہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مستاجر پر کچھ ذمہ داری عائد کرنے کی شرط جائز اور درست ہے، اگر چہ نوعیت کچھ مختلف ہے، بالخصوص جب کہ اجارہ کے مسائل کا دارومدار اکثر عرف وعادت پر ہوتا ہے، نیز زمانہ کی مصلحتوں کو بھی بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بایں وجہ مصلحت کے پیشِ نظر کچھ ذمہ داری مستاجر پر بھی عائد کردی جائے تو عقد فاسد نہیں ہوگا۔

ملاحظہ ہو خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

و عمارة الدار و تطيينها و إصلاح ميزابها على الآجر أما تسييل ماء الحمام و تفريغه على المستاجر، قال في المحيط: فإن شرط رب الحمام على المستاجرنقل الرماد والسرقين لايفسد العقد... وفي النوازل: استاجر مكارياً ليحمل له الحنطة إلى مكان كذا فالجوالق والحبل على المكاري إن كان يحمله على دواب المستاجر أو على عنقه فذاك على المستاجر، قال الفقيه أبو الليث: المعتبر في ذلك عادات الناس في تلك البلدة ولو طلب من المكاري أن يدخل بيته فالمعتبر هو العرف. (خلاصة الفتاوى:۳/۱٤۸، الفصل التاسع فيما على الآجر و فيما على المستاجر).

فتاویٰ الشامی میں ہے:

وفي البزازية: ولو امتلأ مسيل الحمام فعلى المستاجرتفريغه ظاهراً كان أوباطناً، وفيها وتسييل ماء الحمام وتفريغه على المستاجر وإن شرط نقل الرماد والسرقين رب

الحمام على المستاجر لا يفسد العقد وإن شرط على رب الحمام فسد ، فتأمل ، ولعله مفرع على القياس أو مبنى على العرف ففى البزازية : وفي استئجار الطاحونة في كرى نهرها يعتبر العرف. (فتاوی الشامی:٦/ ٨٠،سعید).

شرح مجلّہ میں ہے:

وفى الأنقروية عن البزازية : خرج المستاجر من البيت وفيه تراب ظاهر أو رماد ، على المستاجر إخراجه ، بخلاف البالوعة ، فإنه يلزم المؤجر تفريغها استحساناً ، وإن شرط على المستاجر عند العقد جاز ، وأنه موافق للعقد، أى وإن كان العرف بخلافه ، لأنه حدث بفعله ، فالشرط الموافق للقياس وإن كان مخالفاً للعرف ، لا يفسد العقد ، تأمل. (شرح المجلة للاتاسی: ٢/٦٢٣،المادة : ٥٢٩).

شرح مجلّہ میں ہے:

يلزم مراعاة الشرط بقدر الإمكان، أى إمكان الشرط واستطاعته ، ولايلزم ما فوق الاستطاعة...أن الشروط ثلاثة أقسام: قسم يجوز شرعاً، فيه فائدة لمن اشترطه ، فهذا يلزم مراعاته...وقال فى البدائع من كتاب المضاربة : الأصل فى الشروط اعتبارها ما أمكن، وإذا كان القيد مفيداً كان ممكن الاعتبار فيعتبر لقوله عليه الصلاة والسلام :"المسلمون عند شروطهم". (شرح المجلة:١/٢٣٦، المادة :٨٣).

نیز فقہاء نے فرمایا کہ اجیر مشترک اگر کوئی چیز خراب کردے تو تاوان نہیں آئیگا،لیکن اس زمانہ میں لوگوں کے اموال کی حفاظت کی وجہ سے وجوبِ ضمان پر فتویٰ دیا ہے۔ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

وبقولهما يفتى اليوم لتغير أحوال الناس وبه يحصل صيانة أموالهم كذا فى التبيين.

(الفتاوی الهندية:٤/ ٥٠٠).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وقولهما قول عمر ﷺ وعلى ﷺ وبه يفتى احتشاماً لعمر ﷺ وعلى ﷺ وصيانةً لأموال المسلمين، والله أعلم. (فتاوی الشامی:٦/٦٥،مطلب بالقياس يفتى على قوله،سعيد).

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وقد تقدم أن بقولهما يفتى في هذا الزمان لتغير أحوال الناس . (البحرالرائق:۸/۲۷،باب ضمان الاجير،کوئٹہ). **واللہ ﷻ اعلم۔**

اجارہ میں عمل کی ذمہ داری پراجرت کا حکم:

سوال: اگراجارہ میں اجیر کے ذمہ عمل نہ ہو بلکہ صرف عمل کی ذمہ داری اورانتظام ہوتو اجرت لینا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عمل کی ذمہ داری کی تنخواہ واجرت لینا جائزاوردرست ہے، جیسے آج کل کونٹرکٹر وغیرہ کام نہیں کرتے صرف انتظام اورذمہ داری کی تنخواہ لیتے ہیں اوریہ جائز ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإن أطلق له العمل فله أن يستاجر من يعمله لأن المستحق عمل في ذمته ويمكن ايفاؤه بنفسه أو بالاستعانة بغيره بمنزلة إيفاء الدين. (الهداية:۳/۲۹۷).

(وكذا في البحرالرائق:۷/۳۰۳،کوئٹہ).

وفي ردالمحتار: لأن المعقود عليه في حقه هوالعمل أو أثره. (ردالمحتار:٦/٦٤،سعيد).

تقریرات الرافعی میں ہے:

قوله أو أثره أى وأثره إذا لم يشترط أن يعمل بنفسه . (التحريرالمختار:٦/٢٦٨، سعيد).

واللہ ﷻ اعلم۔

مقدارِاجرت میں جہالت کا حکم:

سوال: ایک شخص کوکسی دوسرے نے اپنے یہاں ملازم رکھااوراس کوکہا کہ آپ کی تنخواہ ۱۵۰۰ رینڈ ہے اورساتھ میں کھانا پینا رہن سہن وغیرہ بھی لازم ہےتو یہ جائز ہے یانہیں؟ جب کہ کھانے کی اقسام اورمقداروغیرہ سب مجہول ہیں؟

الجواب: عرفِ عام میں یہ طریقہ مروج ہےاورہر خطے اورعلاقہ نیزحیثیت کے اعتبار سے کھانا پینا رہن سہن وغیرہ ہوتاہے پھراس میں مساحمت چلتی ہے جومفضی الی المنازعہ بھی نہیں ہے لہٰذا ایسا عقد جائزاور درست ہے، ہاں ہرایک کے حقوق کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ فردابروزِقیامت جواب دہی ہوگی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

و وجه الاستحسان أن هذا النوع من الجهالة لايفضي إلى المنازعة ، لأن مبنى الطعام على المسامحة فى العرف والعادة دون المضايقة ، بخلاف ما إذا شرط كل واحد منهما على نفسه كسوة العبد الذي يخدمه أنه لايجوز ، لأنه يجري فى الكسوة المضايقة مالايجري فى الطعام فى العرف والعادة ، فكانت الجهالة فى الكسوة مفضية إلى المنازعة مع ما أن الجهالة فى الكسوة تتفاحش بخلاف الطعام ، لذلك افترقا. (بدائع الصنائع:انواع المهايئات وما يجوز منهاومالايجوز،۷/۳۱، كتاب القسمة، سعيد).

فتاویٰ غیاثیہ میں ہے:

استاجر حماراً ليحمل عليه الحنطة ولم يعين مقدارها ولا أشار إليها قال الشيخ أبوبكرالمعروف بـ " خواهرزاده ": فسدت ، وذكر شمس الأئمة الحلوانيؒ أنه يجوز فينصرف إلى المعتاد وهذا أظهر وأشبه وعليه الفتوىٰ. (الفتاوى الغيائية،كتاب الاجارات، ص۱۵۸).

شمس الائمہ حلوانیؒ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ عقدِ اجارہ میں عرفاً قابلِ تحمل جہالت مفسدِ عقد نہیں ہے۔

اعلاء السنن میں ہے:

قلت: والحاصل أن الجهالة اليسيرة عفو في ما جرى به التعامل، لكونها لا تفضي إلى النزاع عادة. (اعلاء السنن:۱۶/۲۰۹، باب اجرة السمسرة،ادارة القرآن).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

قال العبد الضعيف عفا الله عنه: ويخرج على هذا كثير من المسائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة أنهم يضعون أنواعاً من الأطعمة في قدور كبيرة ، و يخيرون المشترى في أكل ماشاء بقدر ماشاء ، ويأخذون ثمناً واحداً معيناً من كل أحد فالقياس أن لايجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها ، ولكنه يجوز لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع ، وقد جرى بها العرف والتعامل ، وكذلك استئجار السيارات ، ربما لايعرف سائقها مسافة السفر ولاتتعين الأجرة في بداية السفر ، ولكن هذه الجهالة

تتحمل ، لكون العداد رافعاً للنزاع ، ويتفق الراكب والسائق على أجرة يدل عليها العداد ، فلا يقع النزاع. (تكملة فتح الملهم: ۱/ ۳۲۰، باب بيع الحصاة والبيع الذى فيه غرر).

کفایت المفتی میں ہے:

سوال: عام طور سے یہ رواج ہے کہ کچھ روپیہ اور کھانے پر آدمی کو گھر میں ملازم رکھ لیتے ہیں اور کھانے کی مقدار و کیفیت آدمی کو ملازم رکھتے وقت بیان نہیں کرتے تو اس طرح کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

جواب: یہ ملازمت جائز ہے، کھانے کی مقدار بس اتنی معلوم ہونا کافی ہے کہ پیٹ بھر کھانا ملے گا۔

(کفایت المفتی: ۷/۳۱۰، کتاب المعاش، دارالاشاعت).

مزید ملاحظہ ہو: (امداد المفتین، جلدِ دوم، ص ۷۱۶، کتاب الاجارات، دارالاشاعت۔ و مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص ۸۷). واللہ ﷻ اعلم۔

اجیر خاص کی تعدی پر تاوان کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنے ایک ملازم کو امانت دی کہ فلاں جگہ پہونچا دو، مثلاً روشنی سے جوہانسبرگ پہونچا دو، وہ ملازم اپنے کسی کام کی وجہ سے لینس گیا اور جیسے ہی گاڑی کھڑی کی چوروں نے دروازہ توڑا اور امانت چوری کر لی امانت محفوظ جگہ میں رکھی تھی، اب بعض مفتی حضرات فرماتے ہیں کہ اس پر تاوان نہیں، کیونکہ جگہ محفوظ تھی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ملازم اپنے کام کی وجہ سے لینس کیوں گیا، لہذا تاوان آئیگا۔ اب اس مسئلہ میں آپ کے دارالافتاء کی رائے کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ملازم پر لازم تھا کہ وہ (R 82) سیدھا جوہانسبرگ کا راستہ اختیار کرتا لیکن لینس کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے تعدی کرنے والا کہلائیگا لہذا تاوان آئیگا، کیونکہ روشنی سے جوہانسبرگ جانے والے کے لیے لینس کے راستے سے کوئی تعلق نہیں رہتا، ملازم نے خود اپنی مرضی سے اپنے کام کے لیے لینس کا راستہ اختیار کیا اور اپنے مالک کی مخالفت کی اس وجہ سے تاوان کا آنا عین انصاف ہے۔

ملاحظہ ہو محیط برہانی میں ہے:

وسئل أبوبكرؒ عمن أمر رجلاً أن يستكري له حماراً ويذهب إلى مكان كذا على أن يوفيه الآمر من الأجرة ففعل المامور ذلك وأدخله رباطاً فهجم عليه اللصوص في ذلك

الرباط واستولوا على الحمار، قال: فإن كان الرباط على الطريق الذي كان ممر المستاجر عليه فلا ضمان...لأنه لم يخالف. (فعلم من هذا ان لم يكن على الممر فيضمن). (المحيط البرهاني:۳۱/۱۲).

شرح مجلّہ میں ہے:

وكذا لايضمن المال الذي تلف بعمله بلا تعد أيضاً...وفي ردالمحتار: وقوله بعمله أى المأذون فيه، فإن أمره بعمل فيعمل غيره، ضمن ما تولد منه، (تاترخانية). (شرح المجلة:۲/۷۱۸،المادة:۶۱۰).

عالمگیری میں ہے:

وحكم أجير الوحد أنه أمين في قولهم جميعاً حتى أن ما هلك من عمله لاضمان عليه فيه إلا إذا خالف فيه والخلاف أن يأمره بعمل فيعمل غيره فيضمن ما تولد منه حينئذٍ هكذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية:۴/۵۰۰، الباب الثامن والعشرون فى بيان حكم الاجيرالخاص والمشترك).

اشکال: لیکن ہدایہ کی درج ذیل عبارت سے اشکال واقع ہوتا ہے۔

قال في الهداية: وإن استاجر حمالاً ليحمل له طعاماً في طريق كذا فأخذ في طريق غيره يسلكه الناس فهلك المتاع فلا ضمان عليه وإن بلغ فله الأجر وهذا إذا لم يكن بين الطريقين تفاوت...أما إذا كان تفاوت يضمن، وإن كان طريقاً لايسلكه الناس فهلك ضمن. (الهداية:۳/۳۰۰).

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عبارت اس صورت پر محمول ہے جب کہ ایک منزل کے دوراستے ہوں اور دونوں پر سے لوگ برابر گزرتے ہوں، اور دونوں مامون ہوں تو تاوان نہیں آئیگا، لیکن صورتِ مسئولہ میں تو راستہ ہی غلط اختیار کیا، پھر یہ کہ راستہ پر چلنا الگ بات ہے اور راستہ چھوڑ کر کسی اور جگہ جانا الگ بات ہے، اول الذکر موجب ضمان نہیں وثانی الذکر موجبِ ضمان ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اجیر مشترک پر تاوان کا حکم:

سوال: ایک شخص نے مشینوں کی مرمت کی دکان لگائی ہے اس میں فریز روغیرہ اکثر مشینوں کی مرمت کرتا ہے، ایک شخص نے اپنا میکرو مشین مرمت کے لیے دیا، وہ مشین غائب ہوگئی، اب دکاندار پر تاوان آئیگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسا شخص جو اجرت پر مشین ٹھیک کرتا ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو اجیر مشترک کہا جاتا ہے اس کا اصل حکم یہ کہ بغیر تعدی کہ اگر کوئی چیز ہلاک ہوجائے یا چوری ہوجائے تو تاوان نہیں آئیگا، لیکن موجودہ دور میں فسادِ زمانہ اور عام طور پر اجیروں کی غفلت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کے اموال کی حفاظت کے خاطر متأخرین فقہاء نے وجوبِ ضمان کا فتویٰ دیا ہے، لہذا غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے تاوان واجب ہوگا۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

لو تلف المستأجر فيه بتعدى الأجير وتقصيره يضمن سواء كان الأجير خاصاً أو مشتركاً ، وسواء كانت الإجارة صحيحة أو فاسدة ، لأن المستأجر فيه أمانة في يد الأجير ، والأمانة تصير مضمونة بالتعدي أو التقصير بالحفظ ، وهو ظاهر ...تقصير الأجير هو عدم اعتنائه في محافظة المستأجر فيه بلا عذر . (شرح المجلة : ۲/ ۷۱۰، ۷۱۵، المادة: ۶۰۷).

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: ؎

والعرف في الشرع له اعتبار لذا عليه الحكم قد يدار

مارأه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن ، واعلم أن اعتبار العادة والعرف رجع في مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلاً فقالوا: تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة ... وفي شرح البيري عن المبسوط الثابت بالعرف كالثابت بالنص، ثم اعلم أن كثيراً من الأحكام التي نص عليها المجتهد صاحب المذهب بناء على ماكان في عرفه وزمانه قد تغيرت بتغير الأزمان بسبب فساد أهل الزمان أو عموم الضرورة ..ومنه تضمين الأجير المشترك. (شرح عقود رسم المفتي، ص۳۸).

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

لأن تضمين الأجير المشترك كان نوع استحسان عندهما صيانة لأموال الناس لأنه يتقبل الأعمال من خلق كثير رغبة في كثرة الأجرة وقد يعجز عن القيام بها فيقعد عنده

طويلاً فيجب عليه الضمان إذا هلكت بما يمكن التحرز عنه حتى لايتوانى في حفظها . وفي حاشية الشيخ شهاب الدين الشلبي: قوله فيجب عليه الضمان حتى لايقصر في حفظها أو لايأخذ إلا بقدر ما يحفظه. (تبيين الحقائق مع الحاشية:۱۳۸/۵، باب ضمان الاجير،ملتان).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وقولهما قول عمر ﷺ وعلي ﷺ وبه يفتي احتشاماً لعمر ﷺ وعلي ﷺ وصيانةً لأموال المسلمين، والله أعلم. (فتاوی الشامی:۶۵/۶،مطلب بالقياس يفتي على قوله،سعيد).

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

وقد تقدم أن بقولهما يفتي في هذا الزمان لتغير أحوال الناس . (البحرالرائق:۲۷/۸،باب ضمان الاجير،کوئٹہ۔وکذا فی الفتاوی الهندیة:۵۰۰/۴). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مدرس کے دس منٹ دیر سے آنے کا حکم:

سوال: ایک مدرس دس منٹ دیر سے آتا ہے تو اس کی کیا تلافی کرنا چاہئے یا تنخواہ کاٹ لے یا اور کوئی تدبیر ہے؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اگر مدرس نے دیر سے آنے کی عادت بنالی ہے اور بار بار متنبہ کرنے سے بھی باز نہیں آتا تو اس کی تنخواہ کاٹنا درست ہے اور اگر گاہے گاہے دیر سے آتا ہے اور مدرسہ ان کے اخلاص کی وجہ سے تسامح کرتا ہو یا وہ مدرس دوسرے اوقات میں اپنا کام پورا کرتا ہو تو پھر نہ کاٹنے میں کوئی حرج نہیں۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وليس للخاص أن يعمل لغيره ، ولو عمل نقص من أجرته بقدر ما عمل فتاوى النوازل. وفي الشامية: قوله وليس للخاص أن يعمل لغيره، بل ولا يصلي النافلة ، قال في التتارخانية : وفي فتاوى الفضلي: وإذا استاجر رجلاً يوماً يعمل كذا فعليه أن يعمل ذلك العمل إلى تمام المدة ولايشتغل بشيء آخر سوى المكتوبة وفي فتاوى سمرقند: وقد قال بعض مشايخنا له أن يؤدى السنة أيضاً ، واتفقوا أنه لايؤدي نفلاً ، وعليه الفتوىٰ، وفي غريب الرواية قال أبو علي الدقاق : لايمنع في المصر من إتيان الجمعة ، ويسقط من الأجر بقدر اشتغاله إن كان بعيداً ، وإن قريباً لم يحط شيء فإن كان بعيداً واشتغل قدر ربع النهار يحط

عنه ربع الأجرة. قوله ولو عمل نقص من أجرته ،قال في التاترخانية : نجار استؤجر إلى الليل فعمل لآخر دواة بدرهم وهو يعلم فهو آثم ، وإن لم يعلم فلاشيء عليه وينقص من أجر النجار بقدر ما عمل في الدواة. (الدرالمختارمع فتاوی الشامی: ٦/ ٧٠، مطلب ليس للاجير الخاص ان يصلی النافلة، سعيد ـ وكذا في الفقه الحنفي في ثوبه الجديد:٤/ ٤١٥).

فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے:

إذا استاجر يوماً للحصاد أو للخدمة فحصد في بعض اليوم أوخدم لغيره لايستحق الأجر كاملاً ، ويأثم . (الفتاوی الولوالجية:٣/ ٣٣١، الفصل الاول فيماتجوزالاجارة،دارالكتب العلمية ،بيروت).

النتف فی الفتاویٰ میں ہے:

فإن وقعت على عمل معلوم فلا تجب الأجرة إلا بإتمام العمل إذا كان العمل مما لا يصلح أوله إلا بآخره ، وإن كان يصلح أوله دون آخره فتجب الأجرة بمقدار ماعمل. (النتف في الفتاوی،ص٣٣٨، كتاب الاجارة، دارالكتب العلمية).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جب مدرس کے اوقات متعین کر دئے گئے تو ان اوقات میں وہ اجیر خاص ہے،ان اوقات میں اس کو دوسرا کام اجارہ پر کرنا جائز نہیں،بغیر اجارہ کے معمولی مختصر سا کام جس پر عرفاً چشم پوشی کی جاسکتی ہے کہ اس سے مدرسہ کے کام میں کوئی معتد بہ حرج نہ ہو، یا وہ ضروریات میں سے ہو،اس کی اجازت ہے،جیسے مثلاً کوئی معمولی خط لکھ دیا یا پیشاب پاخانہ کی ضرورت پیش آ گئی۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۵۷۳،جامعہ فاروقیہ)۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

اجرت کو معلق بالشرط کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے درزی سے کہا کہ اگر تم نے میرے کپڑے آج سی لیے تو ۵۰ رینڈ اور اگر کل سی لیے تو ۴۰ رینڈ۔کیا یہ دونوں شرطیں صحیح ہیں یا نہیں؟ اس میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کا کیا اختلاف ہے اور صاحبینؒ کے قول پر کسی نے فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟

الجواب: امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پہلی شرط صحیح ہے لیکن دوسری شرط فاسد ہے اور اجر مثل ملے گا۔ صاحبینؒ کے نزدیک دونوں شرطیں جائز اور درست ہیں،ہمارے فقہاء میں سے شیخ الاسلام قاضی القضاۃ ابوالحسن

علی السغدیؒ (المتوفی ۴۶۱) نے صاحبینؒ کے قول کو اختیار فرمایا ہے۔ہاں اگر دھوکہ کا پہلو ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔
ملاحظہ ہو''النتف فی الفتاویٰ''میں ہے:

فإذا قال الخياط، إن خطت اليوم فلك درهم وإن خطت غداً فلك نصف درهم قال أبوحنيفةؒ : الشرط الأول جائز والشرط الثاني باطل ، وقال أبويوسفؒ ومحمدؒ : الشرطان جائزان، وقال الشيخ : الشرطان جائزان إلا أن يقع على التغرير فيبطلان أو يقع أحدهما على التغرير فهو باطل ، والتغرير أن يقول: إن خطت اليوم فلك درهم وإن خطت غداً فلك حبة أوفلس أو نحوها . (النتف فی الفتاوی، ص۳۳۹، الشرط فی الاجارة، دارالکتب العلمية بيروت).

شرح مجلّہ میں ہے:

وكذلك لو ساوم أحد الخياط على أن يخيط له جبة بشرط إن خاطها اليوم فله كذا وإن خاطها غدا فله كذا تعتبر الشروط...والحكم المذكور فيها، وهو صحة الإجارة مع اعتبار الشرطين ، هو قولهما ، وعند أبي حنيفةؒ يصح الشرط الأول، ولا يصح الشرط الثاني فلو خاطه في اليوم الأول يجب المسمى في ذلك اليوم اتفاقاً، وإن خاطه في اليوم الثاني، فعندهما وهو الذي مشت عليه المجلة ، يجب المسمى فيه . (شرح المجلة:۲/ ۵۹٤،۵۹۷، المادة:۵۰٦).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

الجواب: ابھی ہدایہ منگا کر دیکھا تو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے گو امام صاحب کا دوسرا قول ہے،مگر اس پر بھی عمل درست ہے،خصوصاً جب کہ کاریگر پر اس کا اثر ہو،اور بدون اس کے احتمال سستی کا ہو۔ (امدادالفتاویٰ:۳/ ۳۸۹). واللہ ﷻ اعلم۔

اسلامی بینک کے اجارہ پر اشکال اور جواب:

سوال: بعض اسلامی بینکوں میں اجارہ کا یہ طریقہ رائج ہے کہ جس کو گاڑی فروخت کرتے ہیں بینک اس کو گاڑی اجارہ پر دیتا ہے،اور ماہانہ کرایہ بینک وصول کرتا ہے پھر جب اجارہ کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر بینک

گاڑی کرایہ دار کو ہبہ کر دیتا ہے یا معمولی قیمت پر فروخت کرتا ہے، شرعاً یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات اس پر حسبِ ذیل اعتراضات کرتے ہیں:۔

(۱) گاڑی کی مرمت وغیرہ کی ذمہ داری مالک یعنی بینک پر آنی چاہئے، لیکن بینک پوری ذمہ داری کرایہ دار پر ڈالتا ہے؟

(۲) اس میں ہبہ کی شرط لگائی جاتی ہے، یعنی بالفاظ دیگر یہ صفقۃ فی صفقۃ ہے، اگر بینک گاڑی واپس لے لے تو کرایہ دار یقیناً ناراض ہو جائیگا، کیونکہ وہ کرایہ کے عنوان سے گاڑی کی قیمت ادا کر چکا ہے، تو یہ اجارہ مشروط بالہبہ ہے؟

الجواب: (۱) فقہاء کے کلام کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر مستاجر پر عین مؤجرہ کے استعمال کے سلسلے میں کوئی ایسی شرط لگائی جائے جس کا فائدہ مستاجر ہی کو پہنچتا ہو اور اس کا معتد بہ اثر اجارہ ختم ہونے کے بعد باقی نہ رہتا ہو تو یہ مفسدِ عقد نہیں ہے، اور بینک چونکہ مدتِ طویلہ (عام طور پر تین سال) کے لیے کرایہ پر دیتا ہے، پھر اس طویل مدت کے دوران جو سروس، ٹیوننگ یا معمولی مرمت کرائی جائے اس کا معتد بہ اثر تین سال بعد تک باقی نہیں رہتا، بنابریں اگر بینک مستاجر پر ان امور کی شرط عائد کردے جن کا تعلق گاڑی کے استعمال سے ہے، مثلاً پٹرول ڈالنا، سروس کرانا، ٹیوننگ کرانا، پلگ بدلنا، بیٹری تبدیل کرنا وغیرہ تو اس شرط کی وجہ سے اجارہ فاسد نہیں ہوگا۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

وإن شرط أن يثنيها أويكرى أنهارها أو يسرقنها أو يزرعها بزراعة أرض أخرى لا، كإجارة السكنى بالسكنى ، لأن أثر التثنية وكري الأنهار و السرقنة يبقى بعد انقضاء مدة الإجارة فيكون فيه نفع صاحب الأرض وهوشرط لا يقتضيه العقد فيفسد كالبيع، ولأن موجر الأرض يصير مستاجراً منافع الأجير على وجه يبقى بعد المدة فيصير صفقة في صفقة وهو مفسد أيضاً لكونه منهياً عنه حتى لو كان بحيث لايبقى لفعله أثر بعد المدة بأن كانت المدة طويلة أوكان الريع لايحصل إلا به لايفسد اشتراطه ، لأنه مما يقتضيه العقد ، لأن من الأراضي ما لايخرج الريع إلا بالكراب مراراً وبالسرقنة ، وقد يحتاج إلى كري

الجداول ولا يبقى أثره إلى القابل بخلاف كري الأنهار، لأن أثره يبقى إلى القابل عادة، وفي لفظ الكتاب إشارة إليه حيث قال: كري الأنهار؛ لأن مطلقه يتناول الأنهار العظام دون الجداول واستئجار الأرض ليزرعها بأرض أخرى ليزرعها الآخر يكون بيع الشيء بجنسه نسيئة وهو حرام لما عرف في موضعه وكذا السكنى بالسكنى أو الركوب بالركوب إلى غير ذلك من المنافع. (تبيين الحقائق:۵/۱۳۱،باب الاجارة الفاسدة،ملتان).

درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

(أو أرضاً بشرط أن يثنيها أو كرى أنهارها) العظام وفي الشامية: قوله العظام ،لأن أثره يبقى إلى القابل عادة، بخلاف الجداول أي الصغار فلا تفسد بشرط كريها هو الصحيح، ابن كمال، (أو يسرقنها) لبقاء أثر هذه الأفعال لرب الأرض، فلو لم تبق لم تفسد وفي الشامية: قوله فلو لم تبق، بأن كانت المدة طويلة لم تفسد لأنه لنفع المستاجر فقط...(وصحت لو استاجرها على أن يكريها ويزرعها أويسقيها ويزرعها)لأنه شرط يقتضيه العقد. وفي الشامية: قوله لأنه شرط يقتضيه العقد ،لأن نفعه للمستاجر فقط.

(الدرالمختارمع ردالمحتار: ۶/۵۹،۶۰،باب الاجارة الفاسدة، سعيد).

نیز یہ معاملہ مبنی برعرف ہے،فقہاء نے عرف وعادت کا اعتبار کرتے ہوئے بےشمار مسائل فقہیہ کا مدار اسی پر رکھا ہے،اورآج کل کے عرف میں گاڑی کا اجارہ اگر چند گھنٹوں کے لیے ہوتو پٹرول سمیت ہر کام موجر کے ذمہ ہوتا ہے، اوراگر چندایام کے لیے ہوتو مستاجر کے ذمہ صرف پٹرول ہوتا ہے،اوراگر چند سالوں کے لیے ہوتو معمولی مرمت،سروس،ٹیوننگ،بیٹری کی تبدیلی، پلگ کی تبدیلی وغیرہ جواستعمال سے متعلق ہے مستاجر کے ذمہ ہوتا ہے۔

مسئلہ بالا کے چند دلائل اسی باب میں بعنوان''مستاجر پر مرمت کی شرط'' کے تحت گزر چکے ہیں،وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

مزید ملاحظہ ہوردالمحتار میں ہے:

في الظهيرية: استاجر عبداً أو دابة على أن يكون علفها على المستاجر، ذكر في الكتاب أنه لايجوز، وقال الفقيه أبو الليث: في الدابة نأخذ بقول المتقدمين، أما في زماننا

فالعبد يأكل من مال المستاجر عادة ، قال الحموي: أى فيصح اشتراطه، واعترضه ط بقوله : فرق بين الأكل من مال المستاجر بلا شرط، ومنه بشرط، أقول: المعروف كالمشروط، وبه يشعر كلام الفقيه كما لايخفى على النبيه ، ثم ظاهر كلام الفقيه أنه لو تعورف فى الدابة ذلك يجوز تأمل. (ردالمحتار٦/٤٧،باب الاجارة الفاسدة،سعيد۔ و كذا فى الفتاوى الهندية:٤/٤٤٢).

پھر جانور کے چارہ کے بارے میں بھی مختصر مدت اور طویل مدت کے درمیان فرق ہے، چنانچہ پہلے زمانہ میں حج کے طویل سفر میں چارے کے اخراجات موجر کے بجائے مستاجر پر ہوتے تھے۔

ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

فإن أراد الحمال أن يخرجه قبل ذلك فهو يريد أن يلزمه ضرر السفر من غير حاجة إليه فيسقط عن نفسه مؤنة العلف فلا يمكن من ذلك. (المبسوط :١٦/ ٢٠، ط:دار المعرفة).

(۲) صفقۃ فی صفقۃ کے اعتراض کا تفصیلی جواب کتاب البیوع میں گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ اجارہ کا جو طریقہ اسلامی بینک میں اختیار کیا گیا ہے اس میں دو معاملے الگ الگ ہیں، ایک اجارہ کا اور اجارہ کے اختتام پر بیع کا یا ہبہ کا، پھر بعض اداروں میں تو معاہدہ صرف اجارہ کا ہوتا ہے، اور اس وقت بیع یا ہبہ کا کوئی وعدہ نہیں ہوتا، لیکن عملاً اجارے کے اختتام پر گاڑی مستاجر کو معمولی قیمت پر بیچ دی جاتی ہے، یا ہبہ کر دی جاتی ہے، اور بعض اداروں میں عقدِ اجارہ مکمل ہونے بعد موجر کی طرف سے بیع یا ہبہ کا وعدہ ہوتا ہے، اور وعدہ منفصل عن العقد صفقۃ فی صفقۃ میں داخل نہیں ہے۔ اور ایسی صورت میں وعدہ لازم الوفاء قرار دیا جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو جامع الفصولین میں ہے:

ولو ذكرا البيع بلا شرط ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد ، إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس . (جامع الفصولين:١/٢٣٧،فصل فى بيع الوفاء).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد لأن المواعيد قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس . (فتاوى قاضيخان على

هامش الهندية:٢/١٦٥).

جامع الفصولین میں ہے:

ولو تواضعا قبل البيع ثم تبايعا بلا ذكر شرط جاز البيع عند أبي حنيفةؒ إلا إذا تصادقا أنهما تبايعا على ذلك المواضعة، وكذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع ثم قعدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز ، ولا عبرة للمواضعة السابقة. (جامع الفصولين:١/٢٣٧،فصل في بيع الوفاء).

وللاستزادة انظر: (احكام القرآن للجصاصؒ:٢/٢٩٥، والمبسوط للامام السرخسيؒ:باب زكوٰة الابل،ص١٧٩، و ردالمحتار:٥/٨٤، مطلب في الشرط الفاسد اذا ذكر بعدالعقد اوقبل،سعيد۔ ودرر الحكام في شرح مجلة الاحكام:١/٧٧، المادة:٨٤،دارالكتب العلمية۔ وامدادالفتاویٰ:٣/١٠٨۔غیرسودی بینکاری، ص٢٥٦).

واللہ ﷻ اعلم۔

کرایہ دار کا دوسرے کو کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دو ہزار رینڈ پر ایک مکان کرایہ پر لیا اب وہی مکان دوسرے شخص کو دو ہزار پانچ سو میں کرایہ پر دینا چاہتا ہے تو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: کرایہ پر لی ہوئی چیز کا دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز اور درست ہے لیکن جو کرایہ وہ خود ادا کرتا ہے اس سے زائد طلب کرنا درست نہیں ہے، اگر زائد حاصل کیا تو صدقہ کرنا واجب ہے۔

البتہ دو صورتوں میں زائد کرایہ لینے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے:۔

(۱) کرایہ دار وہی مکان دوسرے کو پہلے کرایہ کی غیر جنس پر دیدے تو اب زیادہ لینا خلافِ جنس سے جائز ہے۔

(۲) کرایہ دار اس مکان میں کچھ اصلاح و مرمت کر کے اس کی حیثیت بڑھادے یا اس کے ساتھ اپنی کوئی چیز ملا کر مجموعہ کا کرایہ زیادہ لے تو یہ بھی جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

(وله السكنى بنفسه إسكان غيره بإجارة وغيرها) وكذا كل مالايختلف بالمستعمل يبطل التقييد لأنه غيرمفيد ، بخلاف مايختلف، ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل إلا في

مسألتين : إذا آجرها بخلاف الجنس أو أصلح فيها شيئاً. وفي الشامية: قوله بخلاف الجنس، أي جنس مااستاجر به وكذا إذا آجر مع مااستاجر شيئاً من ماله يجوز أن تعقد عليه الإجارة فإنه تطيب له الزيادة كما في الخلاصة ، قوله أو أصلح فيها شيئاً ، بأن جصصها أو فعل فيها مسناة وكذا كل عمل قائم لأن الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملاً لأمره على الصلاح كما في المبسوط . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۶/ ۲۹،باب مايجوزمن الاجارة،سعيد).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وإذا استاجر داراً وقبضها ثم آجرها فإنه يجوز إن آجرها بمثل مااستاجرها أو أقل وإن آجرها بأكثر مما استاجرها فهي جائزة أيضاً إلا أنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولىٰ فإن الزيادة لاتطيب له ويتصدق بها وإن كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتد فيها وتداً أوحفر فيها بئراً أو طيناً أو أصلح أبوابها أو شيئاً من حوائطها طابت له الزيادة . (الفتاوى الهندية: ٤/ ٤٢٥،الباب السابع في اجارة المستاجر).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جتنی رقم کسی جگہ بھی کرایہ مکان کی آپ ادا کریں اتنی رقم پر دوسرے کو دے سکتے ہیں، اگر اس سے زیادہ رقم لیں گے تو اس کا صدقہ کر دینا ہوگا۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

اگر اس شخص نے اس جائیداد میں کوئی تصرف نہیں کیا تب تو یہ منافع ناجائز ہے اس کا تصدق واجب ہے اگر اس جائیداد کی کوئی اصلاح کی یا مرمت کی ہے اور پھر دوسرے شخص کو دی ہے تو یہ منافع جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۶۰۴، ۶۰۵ جامعہ فاروقیہ).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے، بشرطیکہ اپنے موجر کے ساتھ نہ ہو اور اجرتِ اولیٰ سے کم پر ہو اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ کے ساتھ ہو تو زائد رقم حلال نہ ہوگی اس کا تصدق واجب ہوگا۔

الا یہ کہ دوسرا عقد پہلے عقد کے خلافِ جنس سے ہو، یا یہ کہ کرایہ دار اس میں کوئی مرمت واصلاح کرے، مثلاً اگر مکان ہو تو اس کی مرمت ، رنگ روغن وغیرہ کرے ، اگر زمین ہو تو اس کی نالی وغیرہ درست کرے۔

(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۱۶).

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی:۷/۳۳۱،کتاب المعاش،دارالاشاعت). واللہ ﷻ اعلم۔

ٹی وی کی مرمت کی اجرت کا حکم:

سوال: ایک شخص ٹی وی وغیرہ ٹھیک کرتا ہے اور اس پر اجرت لیتا ہے، تو کیا ٹی وی کی مرمت کی اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ آمدنی حلال ہوگی یا حرام؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ٹی وی اپنی اصل کے اعتبار سے محض الہ لہولعب نہیں ہے بلکہ اس کو اصلاحی تعلیمی تربیتی اور سائنسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، بنابریں اس کی اصلاح اور مرمت کا کام جائز ہونا چاہئے اور اجرت بھی حلال ہونی چاہئے، البتہ چونکہ فی زماننا اس کا غالب استعمال لہولعب، فحاشی، عریانی اور بے حیائی میں ہے اس لیے اس میں ایک قسم کا تعاون علی المعصیت پایا جاتا ہے، بایں وجہ یہ کام کراہت سے خالی نہیں اور اجرت وآمدنی بھی مکروہ ہوگی اس سے اجتناب اولیٰ اور بہتر ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وبيع المكعب المفضض للرجل إن ليلبسه يكره ، لأنه إعانة على لبس الحرام وإن كان إسكافاً أمره إنسان أن يتخذ له خفاً على زي المجوس أو الفسقة أوخياطاً أمره أن يتخذ له ثوباً على زي الفساق يكره له أن يفعل. (فتاوی الشامی:٦/٣٩٢،کتاب الحظروالاباحة،سعید).

جواہر الفتاوی میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصولاً محضاً، وهومع ذلک سبب قريب بحيث لايحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من أهل الفتنة ، وبيع العصير ممن يتخذه خمراً...وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها ، فكله مكروه تحريماً إن يعلم به البائع والآجر، من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم كان معذوراً ...لكن الإعانة حقيقة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولايتحقق إلا بنية الإعانة أو التصريح بها أوتعينها في استعمال هذا الشيء ، بحيث لايحتمل غير المعصية . (جواهر الفقه:٢/٤٥٣، مسئلة الاعانة على الحرام).

وفي الدر المختار: قلت: ...إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً وإلا فتنزيهاً فليحفظ توفيقاً. (الدر المختار:٦/ ٣٩١، كتاب الحظر والاباحة،سعيد).

(كذا في فتاوى قاضيخان على هامش الهندية:٢/ ٣٦٤ ـ والفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/ ١٢٥).

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

ٹی۔وی سیٹ، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ چونکہ جائز مقاصد کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں، اس لیے ان کی مرمت کی اجرت اور فروخت کی قیمت جائز ہے البتہ چونکہ ٹی وی کا غالب استعمال ناجائز کاموں کے لیے ہے اس لیے اس کی اجرت اور اس کی تجارت سے حاصل ہونے والا نفع کراہت سے خالی نہیں۔(کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۹۴).

ٹی وی سے متعلق تفصیلی فتویٰ کتاب البیوع میں بعنوان ''ٹی وی فروخت کرنے کا حکم'' گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

جزوِ عمل کو اجرت بنانے کا حکم: (کمیشن ایجنٹ کا حکم)

سوال: لوگوں میں بعض معاملات پر عمل درآمد ہے ان کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) بعض حضرات کسی کو مرغیاں دیتے ہیں کہ تم پالو اور انڈے آدھے آدھے ہوں گے۔

(۲) چوزے دیتے ہیں کہ پالنے کے بعد آدھے آدھے ہوں گے۔

(۳) کسی کو چندہ کے لیے بھیجتے ہیں کہ ایک ربع آپ کا ہوگا۔

(۴) کوئی چیز فروخت کے لیے دیتے ہیں کہ جتنے میں فروخت ہو تو دس فیصد آپ کا ہوگا۔

(۵) فصل کاٹنے کے لیے کسی کو لگایا جاتا ہے کہ دس گٹھڑیوں میں ایک آپ کی ہوگی۔

بعض علماء ان معاملات کو ناجائز کہتے ہیں کہ یہ قفیز الطحان کے حکم میں ہے یعنی آٹے پیسنے والے کو پیسے ہوئے آٹے کا ایک حصہ دینا جو ناجائز ہے؟ **بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزیل۔**

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں ''عرف وعادت اور تعامل ناس'' قاعدۂ کلیہ اور اصل عظیم کی حیثیت رکھتے ہیں، کثیر تعداد میں مسائل فقہیہ کا مدار اسی قاعدہ پر رکھا گیا ہے، لہٰذا مذکورہ بالا مسائل اور معاملات بھی اسی قبیل سے ہیں آج کل کمیشن ایجنٹ اور دوسرے بعض مسائل میں حصہ لینا عام عادت بن گئی ہے اس لیے یہ تمام معاملات جائز اور درست ہونا چاہئے۔

کتبِ فقہیہ میں مرقوم ہے کہ قفیز الطحان میں یعنی پسے ہوئے آٹے میں سے اجرت دینا یہ مسئلہ حدیث شریف سے ثابت ہے اور کمیشن پر چندہ یا مرغیوں کے پالنے پر پالنے والے کو آدھا حصہ دینا وغیرہ یہ مسائل قیاس سے ثابت ہیں اور یہ قاعدہ بھی مسلّم ہے کہ قیاس اور عرف میں تعارض ہو تو عرف پر عمل ہوگا قیاس کو چھوڑا جائیگا، کیونکہ تعامل ملحق بالاجماع ہے۔

ملاحظہ ہو حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

" قال في نور الأنوار: وتعامل الناس ملحق بالإجماع وفيه ثم إجماع من بعدهم أي بعد الصحابةﷺ من أهل كل عصر". اس سے معلوم ہوا کہ تعامل بھی مثل اجماع کے کسی عصر کے ساتھ خاص نہیں، البتہ جو اجماع کا رکن ہے وہی اس میں بھی ہونا ضروری ہے، یعنی اس وقت کے علماء اس پر نکیر نہ کرتے ہوں، اسی طرح فقہاء نے بہت سے نئے جزئیات کے جواز پر تعامل سے احتجاج کیا ہے۔

كما في الهداية: في البيع الفاسد: ومن اشترى نعلاً على أن يحذوه البائع قوله يجوز للتعامل فيه فصار كصبغ الثوب للتعامل جوزنا الاستصناع وفيها في السلم أن استصنع الى قوله للإجماع الثابت بالتعامل. (فقہ حنفی کے اصول وضوابط، ص ۱۶۱، بحوالہ امداد الفتاوی: ۴/۲۶۵).

قال في الكفاية: وجه الاستحسان أن فيه عرفاً ظاهراً وفي النزوع عن العادة حرج بين فصار كصبغ الثوب لأن القياس أن لايجوز لأن الإجارة بيع المنافع والصبغ عين وجوزناها للتعامل وكالاستصناع فإن بيع المعدوم لايجوز وإنما جوزناه للتعامل. (الكفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير: ٦/٨٥، رشيدية).

وقال في العناية: ووجهه ما بيناه أنه شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين وفي الاستحسان يجوز للتعامل والتعامل قاضٍ على القياس لكونه إجماعاً فعلياً كصبغ الثوب. (العناية في شرح الهداية على هامش فتح القدير: ٦/٨٥، رشيدية).

قال العلامة الزيلعيؒ في تبيين الحقائق: وكان مشايخ بلخؒ والنسفيؒ يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل أهل بلادهم بذلك وقالوا من لم يجوزه إنما لم يجوزه بالقياس على قفيز الطحان والقياس يترك بالتعارف، ولئن قلنا إن النص يتناوله دلالة فالنص يختص بالتعامل ألاترى أن الاستصناع ترك القياس فيه

وخص عن القواعد الشرعية بالتعامل .

وبهامشه قال الشيخ شهاب الدين الشلبيؒ: وأما مشايخ بلخؒ فإنما جوزوا ذلك لأن الناس تعاملوا بذلك حيث احتاجوا إليه و وجدوا له نظيراً وهو المزارعة والمعاملة ، اتقاني. (تبيين الحقائق مع الحاشية:٥/ ١٣٠،باب الاجارة الفاسدة، ملتان).

وهكذا في البحر الرائق وزاد بقوله : وفي الظهيرية: وبه أخذ الفقيه أبو الليث وشمس الأئمة الحلوانيؒ والقاضي أبو علي النسفيؒ. (البحرالرائق:٨/ ٢٤، باب الاجارة الفاسدة، کوئٹه).

محیط برہانی میں ہے:

وإذا دفع الرجل إلى حائك غزلاً لينسجه بالنصف أو ما أشبه ذلك فالإجارة فاسدة واما لأنه في معنى قفيز الطحان لأنه جعل الأجر بعض ما يحدث من عمله...ومشايخ بلخؒ كنصيربن يحيىٰ ومحمد بن سلمة وغيرهما كانوا يفتون بجواز هذه الإجارة في الثياب لتعامل أهل بلدهم في الثياب والتعامل حجة يترك به القياس ويخص به الأثر وتجويزهذه الإجارة في الثياب للتعامل بمعنى تخصيص النص الذي ورد في قفيز الطحان ، لأن النص ورد في قفيز الطحان؛ لا في الحائك إلا أن الحائك نظيره فيكون وارداً فيه دلالة ، فمتى تركنا العمل بدلالة هذا النص في الحائك وعملنا بالنص في قفيز الطحان كان تخصيصاً ، لا تركاً أصلاً وتخصيص النص بالتعامل جائز. (المحيط البرهاني:٩/ ١٧٩،نوع آخر في قفيزالطحان، مكتبة رشيدية).

(وهكذا في الشامي: ٤/ ٥١٩،مطلب في الاعتياض عن الوظائف،سعيد۔والفتاوى الهندية: ٤/ ٤٤٥، الفصل الثالث في قفيزالطحان وما هو معناه۔وكذا في تكملة فتح القدير:٩/ ١٠٩،باب الاجارة الفاسدة،دارالفكر) .

فتاویٰ شامی میں ہے:

تتمة : قال في التاترخانية : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم . وفي الحاوي : سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال : أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثرة التعامل

وكثير من هذا غير جائز ، فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام ، وعنه قال: رأيت ابن شجاع يقاطع نساجاً ينسج له ثياباً في كل سنة. (فتاوی الشامی: ٦/٦٣،مطلب فی اجرة الدلال،سعید).

فتاویٰ غیاثیہ میں ہے:

قال الفقيه أبو الليث : النسج بالثلث والربع لايجوز عند علمائنا لكن مشايخ بلخ استحسنوا وأجازوا لتعامل الناس، قال: وبه نأخذ. (الفتاوی الغیاثیة،کتاب الاجارات،نوع فی النساج،ص ١٦٠).

وفي " الفقه الحنفي في ثوبه الجديد": قال: ولرأي مشايخ بلخ والنسفي وجاهة في مصرنا الحاضر، لأن التعامل به شاع وانتشرفي كل البلاد. (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:٤/٤٠٣، الاستئجار ببعض مایخرج من عمل الاجیر).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

سوال: (۳۳۳)...(۴) کپڑے کی آڑھت (دلالی) والے کے پاس خریدار فرمائش لکھ کر بھیجد یتے ہیں، آڑھت والا فرمائش کے مطابق کپڑا خرید کر بھیجد یتا ہے اور حق آڑھت کا فیصدی جو مقرر ہے لے لیتا ہے، آیا یہ درست ہے؟ (۵) بعض جگہ دلالوں کی دلالی فی روپیہ ایک پیسہ مقرر ہے یعنی جتنے روپے کا کپڑا فروخت کردیں فی روپیہ ایک پیسہ دلالی لے لیتے ہیں ایسی دلالی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: **في شرح طريقة المحمدية للخادمي الجزء الرابع منه عن لب الاحياء وأما إعانته على عمل معين إلى قوله أو مباحاً فيه تعب بحيث يجوز الاستئجار عليه حل أخذه وهو جعل . وفي جامع الفصولين : للقاضي أن يأخذ ...** اس روایت سے معلوم ہوا کہ چونکہ آڑھت میں عمل اور مشقت موجود ہے اس لیے اجرت درست ہے، (۵) جب اجرت کا جواز ثابت ہوگیا، اس کے شرائط میں سے تعیین اجر ہے، اور تعیین کی یہ بھی ایک صورت ہے اس لیے جائز معلوم ہوتا ہے۔ (امدادالفتاویٰ:۳/۳۶۳، تحقیق بعض احکام دلال).

امدادالاحکام میں ہے:

سوال: ایک شخص زید ہے، دوسرا بکر ہے، تو زید نے بکر سے کہا کہ ہمارے پاس سودا ہے، اور اگر سودا کو تم اپنی معرفت کسی کے ہاتھ فروخت کروادو گے تو تم کو اتنا روپیہ کمیشن دیں گے، تو اس طرح کمیشن لینا درست ہے

یا نہیں؟

جواب: اس صورت کو عالمگیریہ نے ذخیرہ سے حرام لکھا ہے، اور شامی نے بھی تاتارخانیہ سے حرمت نقل کی ہے، ولیکن محمد بن سلمہ سے اس میں گنجائش نقل کی ہے،... اور حضرت مولانا تھانویؒ اس صورت میں جواز ہی کو اختیار کرتے ہیں، **والجواب عن الفساد للجهالة ، أن هذة الجهالة لايفضي إلى النزاع ، فكانت يسيرة ، وهي لايفسد الإجارة والبيع ،** اور اس زمانہ میں اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے، پس اس کو جائز کہنا ہی بہتر ہے، واللہ اعلم۔ (امدادالاحکام:۳/۵۸۹، حکم اجرتِ دلال)۔

اعلاء السنن میں ہے:

قلت: والحاصل أن الجهالة اليسيرة عفو في ما جرى به التعامل، لكونها لا تفضي إلى النزاع عادة. (اعلاء السنن:۱۶/۲۰۹، باب اجرة السمسرة،ادارة القرآن)۔

قاموس الفقہ میں ہے:

آج کل مختلف تجارتوں میں کمیشن کا طریقہ مروج ہوگیا ہے، یعنی کمپنی اپنا مال فروخت کرنے والوں کو بجائے تنخواہ متعین کرنے کے فیصد متعین کر دیتی ہے، کہ مثلاً جتنی فروخت ہوگی، اس کا دس فیصد اسے بطورِ اجرت دیا جائیگا... بہت سے دینی اور عصری اداروں میں جو لوگوں کے تعاون پر چلاتے ہیں، انھیں متعینہ تنخواہ دینے کے بجائے کچھ فیصد اجرت دے دی جائے اس میں مدرسہ والے اپنے لیے یہ عافیت سمجھتے ہیں کہ اگر تنخواہ مقرر کی جائے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ محنت میں کمی کرے... اس لیے یہ مسائل موجودہ دور میں علماء کے لیے گہرے فکر اور توجہ کے طالب ہیں... احناف میں مشائخ بلخ نے عرف کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔ (قاموس الفقہ:۱/۴۹۹)۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے خرید وفروخت کے ایسے معاملات کو "دیانۃً" درست قرار دیا ہے جس میں گو کہ قیمت یا سودا پوری طرح متعین نہ ہو مگر آئندہ نزاع اور اختلاف پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔

إن من البيوع الفاسدة ما لو أتى بها أحد جازت ديانةً وإن كانت فاسدةً قضاءً أو ذلك لأن الفساد قد تكون لحق الشرع بأن اشتمل العقد على مأثم فلا يجوز بحال وقد تكون الفساد مخالفة التنازع ولايكون فيه شيء آخر يوجب الإثم فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندي ديانةً وإن بقي فاسداً قضاءً لارتفاع علة الفساد وهي المنازعة. (فيض

الباری:٣/٢٥٨، کتاب البیوع).(مأخوذ از جدید فقہی مسائل:٤/٣٢٣).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل:٤/٣٢٩-٣٣٤-وبحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ:١/٢٠٦-٢٠٨-

وقاموس الفقہ:١/٤٩٨-ومالی معاملات پر غرر کے اثرات،ص٨٩-٩٠).

حدیث شریف ’’قفیز الطحان‘‘ کا جواب:

(١) یہ حدیث ضعیف اور معلول ہے۔

قال المناويؒ في فيض القدير: قال في الميزان : هذا حديث منكر وهشام أبو كليب أحد رواته لايعرف ، و أورده عبد الحق في الأحكام...وفيه هشام أبو كليب قال ابن القطان: لايعرف ، و الذهبي: حديثه منكر ومغلطائي: هو ثقة وجزم ابن حجر بضعف سنده. (فيض القدير:٦/٣٣٥/٩٤٩٣-وكذا في التلخيص الحبير:٣/١٤٦/١٢٨٧-وميزان الاعتدال:٥/٤٣١).

وقال الحافظ ابن حجرؒ في الدراية: حديث نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان، الدارقطني وأبويعلى والبيهقي وفي إسناده ضعف. (الدراية في تخريج احاديث الهداية:٣/٣٠٥، باب الاجارة الفاسدة).

وفي خلاصة البدر المنير: حديث النهى عن قفيز الطحان رواه الدارقطني من رواية أبي سعيدؓ بإسناد فيه مجهول. (خلاصة البدر المنير:٢/١٠٧/١٦٥٥).

قال البوصيري في اتحاف الخيرة المهرة: مدار هذه الطرق على عبدالرحمن الأفريقي وهو ضعيف. (اتحاف الخيرة المهرة:٤/٢٦٢/٣٨٢٠،باب النهى عن عسب الفحل وقفيز الطحان).

(٢) نص عام مخصوص البعض ہے یعنی عرف وتعامل کی وجہ سے نص کی تخصیص کی گئی ہے، جیسا کہ علامہ ابو البرکات نسفیؒ اور علامہ شامیؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ثم اعلم أن العرف قسمان عام وخاص فالعام يثبت به الحكم العام ويصلح مخصصاً للقياس والأثر بخلاف الخاص...قال في الذخيرة في الفصل الثامن من الإجارات في مسألة ما لو دفع إلى حائك غزلاً لينسجه بالثلث ومشايخ بلخ كنصيربن يحيى ومحمدبن سلمة وغيرهما كانوا يجيزون هذه الإجارة في الثياب لتعامل أهل بلدهم في الثياب و التعامل حجة

یترک بـه القياس ويخص به الأثر وتجويزهذه الإجارة فى الثياب للتعامل بمعنى تخصيص النص الذي ورد في قفيز الطحان لأن النص ورد في قفيزالطحان لا فى الحائک إلا أن الحائک نظيره فيكون وارداً فيه دلالة فمتى تركنا العمل بدلالة هذاالنص فى الحائک وعملنا بالنص في قفيز الطحان كان تخصيصاً لا تركاً أصلاً وتخصيص النص بالتعامل جائز ألاترى أنا جوزنا الاستصناع للتعامل والاستصناع بيع ماليس عنده وإنه منهي عنه وتجويز الاستصناع بالتعامل تخصيص منا للنص الذي ورد فى النهي عن بيع ماليس عند الإنسان لاترک للنص أصلاً لأنا عملنا بالنص في غيرالاستصناع قالوا: بخلاف ما لوتعامل أهل بلدة قفيز الطحان فإنه لايجوز ولاتكون معاملتهم معتبرة لأنا لو اعتبارنا معاملتهم كان تركاً للنص أصلاً وبالتعامل لايجوز ترک النص أصلاً وإنما يجوز تخصيصه ولكن مشايخنا لم يجوزوا هذا التخصيص لأن ذلک تعامل أهل بلدة واحدة...بخلاف التعامل فى الاستصناع فإنه وجد فى البلاد كلها، انتهى كلام الذخيرة. (شرح عقودرسم المفتی،ص ۴۱۔وکذا فی رسالة " نشرالعرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف" المندرجة فی رسائل ابن عابدینؒ ،۲/۱۱۴،سہیل).

علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں:

والاستحسان أنواع يكون بالأثر والإجماع والضرورة والقياس الخفي كالسلم فإن القياس يأبى جوازه لعدم المعقود عليه عند العقد إلا أنا تركناه بالنص وهو قوله عليه السلام "من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم" الحديث،والاستصناع فيمافيه تعامل الناس مثل أن يأمر إنساناً بأن يخرز له خفاً بكذا ويبين صفته ومقداره ولم يذكرله أجلاً والقياس يقتضي أن لايجوز لأنه بيع معدوم لكنهم استحسنوا تركه بالإجماع لتعامل الناس فيه فإن قلت: الإجماع وقع معارضاً بالنص وهو قوله عليه السلام "لاتبع ماليس عندک". وأجيب بأن النص صار مخصوصاً في حق هذا الحكم بالإجماع ، وفيه نظرلأن القران شرط الخصوص عندنا والإجماع ليس بمقارن ويمكن أن يجاب عنه بأن القران شرط التخصيص الأول والنص مخصوص قبل الإجماع بالسلم فيجوز بعده بالإجماع. (منار مع شرحه لعبد اللطیف ابن الملک،۲/۸۱۲). واللہ ﷻ اعلم۔

اسٹیٹ ایجنٹ کے لیے سروس فیس وصول کرنے کا حکم:

سوال: کیا اسٹیٹ ایجنٹ (estate agent) کے لیے فیصد کے اعتبار سے سروس فیس وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اسٹیٹ ایجنٹ کی سروس فیس دلالی کے حکم میں ہے اور دلالی کی اجرت فیصد کے اعتبار سے بھی جائز ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

تتمة: قال في التاتارخانية: وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثره التعامل، و كثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام. (فتاوی الشامی: ۶/۶۳، سعید).

مالی معاملات پر غرر کے اثرات میں ہے:

اسٹیٹ ایجنسی کے معاملے میں فریقین کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں مکان کی فروختگی کے لیے ایجنٹ کو کتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی اور اجرت بھی مجہول ہوتی ہے لیکن چونکہ ان صورتوں میں پائی جانے والی جہالت نزاع کا باعث نہیں بنتی، نیز عصر حاضر میں ایسے معاملات بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور لوگوں کو آئے روز اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اس لیے فقہائے کرام نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ (مالی معاملات پر غرر کے اثرات، ص۹۰)

تفصیل مسئلہ مذکورہ بالا میں گزر چکی ہے، تکرار موجبِ طوالت ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وکیل بالبیع کا کمیشن پر فروخت کرنے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو کسی بلڈنگ کا وکیل بالبیع بنایا اور یہ بتایا کہ کم سے کم ایک سکویر میٹر ۱۲ ہزار میں ۴ فیصد کمیشن کے ساتھ فروخت کریں لیکن اگر زائد میں فروخت کیا مثلاً ۱۸ ہزار میں فروخت کیا تو مزید ۶ ہزار میں نصف آپ کا اور نصف میرا ہوگا، یہ معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فیصد کے اعتبار سے کمیشن ایجنٹ کا معاملہ تعامل ناس اور عرف کی وجہ سے جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو امداد الفتاوی میں ہے:

چونکہ آڑھت میں عمل اور مشقت موجود ہے اس لیے اجرت درست ہے، جب اجرت کا جواز ثابت ہوگیا، اس کے شرائط میں تعیین اجر ہے، اور تعیین کی یہ بھی ایک صورت ہے اس لیے جائز معلوم ہوتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ:٣/٣٦٣، تحقیق بعض احکام دلال).

امداد الاحکام میں ہے:

سوال: ایک شخص زید ہے، دوسرا بکر ہے، تو زید نے بکر سے کہا کہ ہمارے پاس سودا ہے، اور اگر سودا کو تم اپنی معرفت کسی کے ہاتھ فروخت کروادو گے تو تم کو اتنا روپیہ کمیشن دیں گے، تو اس طرح کمیشن لینا درست ہے یا نہیں؟

جواب: اس صورت کو عالمگیریہ نے ذخیرہ سے حرام لکھا ہے، اور شامی نے بھی تاتارخانیہ سے حرمت نقل کی ہے، لیکن محمد بن سلمہ سے اس میں گنجائش نقل کی ہے،...اور حضرت مولانا تھانویؒ اس صورت میں جواز ہی کو اختیار کرتے ہیں، والجواب عن الفساد للجهالة ، أن هذة الجهالة لايفضي إلى النزاع ، فكانت يسيرة ، وهي لايفسد الإجارة والبيع ، اور اس زمانہ میں اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے، پس اس کو جائز کہنا ہی بہتر ہے، واللہ اعلم۔ (امداد الاحکام:٣/٥٨٩، حکم اجرتِ دلال).

دلائل کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جانبین سے دلالی کی اجرت کا حکم:

سوال: اگر کوئی ایجنٹ بائع اور مشتری دونوں سے کمیشن لے تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایجنٹ کا بائع اور مشتری دونوں سے کمیشن لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

وأما الدلالة فإن باع العين بنفسه بإذن ربها فأجرته على البائع وإن سعى بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف. وفي الشامية: قوله يعتبر العرف، فتيجب الدلالة على البائع أو

المشتري أو عليهما بحسب العرف ، جامع الفصولين. (الدرالمختار مع ردالمحتار:٤/ ٥٦٠،فصل فيما يدخل في البيع تبعاً،سعيد).

شرح منظومۃ ابن وہبان میں ہے:

فائدة : نقل في العمادية عن فوائد صاحب المحيط لو سعى الدلال بينهما و باع المالك بنفسه ينظر إلى العرف إن كانت الدلالة على البائع فعليه ، وإن كانت على المشتري فعليه ، وإن كانت عليهما فعليهما. (شرح منظومة ابن وهبان :٢/ ٧٨،فصل من كتاب الاجارة، الوقف المدني).

مجمع الضمانات میں ہے:

و لو سعى الدلال بينهما، وباع المالك بنفسه، يعتبر العرف، فتجب الدلالة على البائع ، أو على المشتري أو عليهما ، بحسب العرف. (مجمع الضمانات:١/ ١٥٩، النوع السابع عشر: الدلال ومن بمعناه).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

دونوں طرف سے دلالی جائز ہے جب کہ عرف ہو اصالۃً دلالی کا معاملہ ناجائز ہے، مگر حاجت اور عرف کی بناء پر فقہاء نے اجازت دی ہے، اور یہ اجازت اپنے عموم کی حیثیت سے یک طرفہ دوطرفہ سب کو شامل ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۶۱۷، باب اجرۃ الدلال والسمسار، جامعہ فاروقیہ).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

اگر کوئی شخص دونوں کا کام کرتا ہے تو الگ الگ کام ہونے کی بنا پر دونوں سے اس کے ممیّز عمل کی اجرتِ متعارفہ لے سکتا ہے۔ (نظام الفتاویٰ:۱/ ۲۹۷).

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

سوال: کسی سے کہا کہ اگر تیرا معاملہ کردوں تو اتنی دلالی لوں گا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور بائع مشتری کو اس کی اطلاع دینی ضروری ہے یا ایک سے ٹھہرا لینا کافی ہے، پھر اگر دونوں سے خفیۃً یا صراحۃً ٹھہرا کر لے لیوے تو کیسا ہے؟

الجواب: اجرت دلالی کی درست ہے مگر فریب ودھوکہ نہ ہو، فقط۔ (تالیفاتِ رشیدیہ، ص ۴۱۸).

محمود الفتاویٰ میں ہے:

اگر دونوں طرف سے دلالی لینے کا عرف ورواج ہوتو درست ہے ورنہ نہیں۔ (محمود الفتاویٰ:۴/۸۵)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

سوال: دلالی کی اجرت جانبین سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۷/۲۷۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جمعہ کے دن دکان کھولنے کی شرط کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:۔

ایک آدمی کسی شاپنگ سینٹر میں دکان (ریسٹورنٹ) کھولنا چاہتا ہے اور شاپنگ سینٹر کے قواعد وشرائط میں میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اوقات (کھولنے اور بند کرنے) کی بڑی پابندی کرنی ہوگی، غیر مسلم مینجر دکان چلائیگا اور کام کرنے والے بھی غیر مسلم ہوں گے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ کے وقت میں دکان بند نہیں کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ برائے مہربانی حکمِ شریعت سے مطلع فرمائے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جو شرائط وقواعد آپس میں طے کیے جائیں اگر وہ خلافِ شرع نہ ہوتو ان کی پابندی لازم اور ضروری ہے، بنابریں اوقات کی پابندی کوئی خلافِ شرع نہیں ہے اس لیے اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے، اور غیر مسلم مینجر رکھنا بھی جائز اور درست ہے، شریعتِ مطہرہ نے تجارت میں وکیل کے ذریعہ ہونے والے عقود کو صحیح اور نافذ تسلیم کیا ہے اور وکیل کا مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، غیر مسلم بھی وکیل بالبیع بن سکتا ہے۔

اور جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے اوقات میں دکان کھولنے کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ خرید وفروخت دونوں ممنوع ہے، اس لیے کہ دکان کھولیں گے تو خریدار آئیں گے، لیکن یہ صورت اس وقت ممنوع ہے جب کہ خریداروں کی اکثریت مسلمانوں کی ہو، ہاں اگر اکثر خریدار غیر مسلم ہیں، جیسا کہ اس ملک میں، تو اس وقت غیر مسلم کا دکان کھولنا ممنوع اور نا جائز نہیں ہے، کیونکہ سعی الی الجمعہ مسلمان پر واجب ہے غیر مسلم پر نہیں ہے، نیز فقہاء نے فرمایا ہے کہ جن لوگوں پر سعی الی الجمعہ واجب نہیں ہے، مثلاً مریض، مسافر، عورتیں وغیرہ تو ان کے لیے بیع وشراء بھی ممنوع نہیں ہے۔ لہٰذا غیر مسلم کا دکان کھولنا اوقاتِ

نمازِ جمعہ میں ممنوع نہیں، نیز آپ کے لیے وہ کمائی بھی حرام نہیں ہے۔

عقدِ اجارہ میں شرط لگانے سے متعلق فقہاء فرماتے ہیں کہ ایسی شرط لگانا جو عقد سے مناسبت نہ رکھتی ہو اور عقد کے تقاضا کے خلاف نہ ہو تو اس کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوتا، بایں وجہ ایسا عقدِ اجارہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ جمعہ کے وقت میں دکان کھولنا عقدِ اجارہ کے خلاف نہیں ہے۔ہاں یہ بات ضروری ہے کہ اوقاتِ نمازِ جمعہ میں کوئی مسلمان دکان میں نہ رہے، بلکہ تمام کارکنان غیر مسلم ہوں۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن استاجر أرضاً على أن يكربها ويزرعها ويسقيها لأن الزراعة مستحقة بالعقد ولايتاتى إلا بالسقي والكراب...وكل شرط هذه صفته يكون من مقتضيات العقد فذكره لايوجب الفساد. (الهداية: ۳/۳۰٦).

شرح مجلّہ میں ہے:

وكذا تفسد الإجارة لو استاجر بشرط لا يقتضيه العقد و لا يلائمه...بخلاف ما لو آجرها بشرط أن يحرثها ويزرعها أو يسقيها و يزرعها، فإنها لاتفسد ، لأنه شرط يقتضيه العقد...ولو شرط أن يكري أنهارها العظام أو يسرقنها بحيث يبقى أثر هذه الأفعال لرب الأرض، تفسد لما ذكرنا، فلو لم تبق ، بأن شرط كري جداولها الصغار ، أوكانت المدة طويلة ، لاتفسد ، لأنه لنفع المستاجر ، فهو شرط يقتضيه العقد. (شرح المجلة للاتاسی: ۲/۵٤۰،تحت المادة: ٤٦۰).

(وكذا فی فتاوی الشامی:٦/٦۰،باب الاجارة الفاسدة،سعيد).

ہدایہ میں ہے:

كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكله به غيره لأن الإنسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعتبار بعض الأحوال فيحتاج إلى أن يوكل به غيره فيكون بسبيل منه دفعاً للحاجة وقد صح أن النبي صلى الله عليه وسلم وكل بالشراء حكيم بن حزام ﷺ. (الهداية:۳/۱۷۷).

وفي الدرالمختار: وكره تحريماً مع الصحة البيع عند الأذان الأول إلا إذا تبايعا

یمشیان فلابأس به لتعلیل النهي بالإخلال بالسعي فإذا انتفی انتفی، وقد خص منه من لاجمعة علیه ذکره المصنف. وفي حاشیة الطحطاوي: قوله وقد خص منه، أی من کراهیة البیع عند الأذان الأول وفیه أنه لم یدخل لعدم العلة فیه حتی یخرج وقد یقال إن من لم تجب علیه الجمعة إذا تبایعا عند الأذان لا کراهة ولو سعیا بعد لأن السعي تبرع ، قوله من لاجمعة علیه ، کالنساء والمسافرین والمرضی لعدم وجوب السعي علیهم. (الدر المختار مع حاشیة الطحطاوی : ۸۳/۳، کوئٹہ۔و کذا فی فتاوی الشامی: ۱۰۱/۵، سعید).

امام ابوبکر الرازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

لم یتعلق النهي بمعنی في نفس العقد وإنما تعلق بمعنی في غیره وهو الاشتغال عن الصلاة وجب أن لایمنع وقوعه وصحته کالبیع في آخر وقت صلاة یخاف فوتها إن اشتغل به وهو منهي عنه ولایمنع ذلک صحته لأن النهي تعلق باشتغاله عن الصلاة. (احکام القرآن للجصاصؒ ، الجزء الثالث،ص۴۴۸).

کفایت المفتی میں ہے:

جن جگہوں میں جمعہ جائز نہیں ایسی جگہوں میں بعداذان ظہر خرید وفروخت میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ جمعہ کے روز اذان کے بعد خرید وفروخت کے مکروہ ہونے کی علت استماعِ خطبہ ہے اور یہ علت ظہر میں مفقود ہے۔(کفایت المفتی :۲۸۴/۳). واللہ ﷻ اعلم۔

پیشگی اجرت وصول کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کسی کے مکان کے ایک حصہ میں رہتا ہے، مالکِ مکان کرایہ کے علاوہ ماہانہ آٹھ سو رینڈ بجلی پانی وغیرہ کے لیے لیتا ہے، جب کہ یہ معلوم نہیں کہ کرایہ دار کتنا خرچ کریگا، نیز مالکِ مکان نے پیشگی چھ ماہ کی رقم وصول کی، اس پر اشکال ہوتا ہے کہ بجلی پانی وغیرہ کا خرچہ مجہول ہے، اسی طرح جس وقت کرایہ وصول کیا اس وقت منفعت بھی معدوم تھی، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: قانونِ شریعت کے اعتبار سے عقدِاجارہ میں حصولِ منفعت کے بعد یعنی مہینہ ختم ہونے کے بعد کرایہ دار پر مکان کا کرایہ ادا کرنا لازم ہوجاتا ہے، لیکن اگر مالکِ مکان یادکان پیشگی کرایہ کا مطالبہ کرے اور

کرایہ دار برضاورغبت قبول کرلے تو یہ جائز اور درست ہے۔ اسی طرح روزِ اول سے پیشگی کرایہ کی شرط لگائی ہو تب بھی پیشگی کرایہ وصول کرنا جائز اور درست ہے۔

نیز بجلی پانی کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالکِ مکان نے بجلی پانی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اوراس کے عوض میں کرایہ وصول کیا تو یہ عقدِ ضمان والی صورت بھی درست ہے۔ بہرحال ان چیزوں میں عرف کا بڑا دخل ہے، عرف میں جس طرح عمل درآمد ہو اس طرح معاملہ کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

الأجرة لا تجب بالعقد وتستحق بأحدى معاني ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل من غير شرط أو باستيفاء المعقود عليه...وكذا إذا شرط التعجيل أو عجل من شرط لأن المساواة يثبت حقاً له وقد أبطله . (الهداية:۳/۲۹٤).

شرح مجلّہ میں ہے:

لا تلزم الأجرة بالعقد المطلق يعني لايلزم تسليم بدل الإجارة بمجرد انعقادها حالاً. والمراد بالعقد المطلق الذي لم يذكر فيه اشتراط تعجيل الأجرة، وإنما لايلزم تسليم الأجرة حينئذٍ لأن العقد وقع على المنفعة ، وهي تحدث شيئاً فشيئاً، وشأن البدل أن يكون مقابلاً للمبدل، وحيث لايمكن استيفاؤها حالاً لايلزم بدلها حالاً ، إلا إذا شرطه ولوحكماً بأن عجله، لأنه صار ملتزماً له بنفسه حينئذٍ وأبطل المساواة التي اقتضاها العقد، فصح، كذا في ردالمحتار. (شرح المجلة:۲/۵٤۹،تحت المادة:٤٦٦).

وقال في الهداية: ويجوز أخذ أجرة الحمام والحجام فأما الحمام فلتعارف الناس ولم يعتبر الجهالة لإجماع المسلمين وقال عليه السلام: مارآه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن، وأما الحجام فلما روي أنه عليه السلام احتجم وأعطى الحجام الأجرة ولأنه استيجار على عمل معلوم بأجر معلوم فيبقع جائزاً . (الهداية:۳/۳۰۳).

وقال في الهداية: ومن وكل رجلاً بالصلح عنه فصالح لم يلزم الوكيل ما صالح عنه إلا أن يضمنه...لأنه حينئذٍ هو مؤاخذ بعد الضمان لا بعقد الصلح. (الهداية:۳/۲۵۰).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اجارہ میں اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ جب کام پورا ہو جائے یا ڈیوٹی پوری کر دے اس وقت اجرت کا مستحق قرار پاتا ہے اور موجر کے ذمہ اجرت کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے تاہم اگر کوئی ملازم پیشگی اجرت کی شرط رکھے یا مالکِ مکان ودکان پیشگی کرایہ کا مطالبہ کرے اور کرایہ دار اس شرط کو تسلیم کرے یا ادارہ یا کمپنی خود ملازمین کو مہینہ کے شروع میں پیشگی تنخواہ ادا کر دے تو یہ سب صورتیں آپس کی رضامندی سے شرعاً جائز ہیں۔(جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۵۳). واللہ ﷻ اعلم۔

لفٹ کی مرمت مستاجر کے ذمہ لگانے کا حکم:

سوال: سوال: ہم ایک بلڈنگ میں رہتے ہیں جہاں کرایہ کے کمرے ہیں، وہاں ایک لفٹ بھی موجود ہے، کچھ دن پہلے لفٹ کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا، اب اس کو ٹھیک کرانا ہے اور یہ پرزہ کسی بیرونی ملک سے لایا جائیگا مالکِ بلڈنگ (موجر) چاہتا ہے کہ کرایہ دار اس کا خرچہ برداشت کرے، اگر عرف میں یہ مستاجر پر ہو یا کاغذات میں شرائط میں لکھا ہو کہ مستاجر پر لازم ہوگا تو پھر کیا حکم ہے؟ برائے کرم مطلع فرمائیں کہ از روئے شریعت یہ خرچہ کس پر لازم ہوگا؟

الجواب: عمارت کی مرمت سے متعلق خرچہ مالکِ بلڈنگ پر لازم ہوگا، البتہ اگر عرف میں مستاجر پر لازم ہو تو عرف کا اعتبار ہوگا یا کاغذات میں شرائط میں مستاجر پر لازم کیا ہو تب بھی مستاجر پر لازم ہوگا، اور بلڈنگ میں رہائش پذیر تمام لوگوں پر برابر تقسیم ہوگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

و عمارة الدار المستاجرة و تطيينها و إصلاح الميزاب و ما كان من البناء على رب الدار، و كذا كل ما يخل بالسكنى. (الدر المختار:٦/٧٩،سعيد).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

و عمارة الدار و تطيينها و إصلاح ميزابها على الآجر أما تسييل ماء الحمام و تفريغه على المستاجر، قال في المحيط: فإن شرط رب الحمام على المستاجر نقل الرماد والسرقين لايفسد العقد... وفي النوازل: استاجر مكارياً ليحمل له الحنطة إلى مكان كذا فالجوالق والحبل على المكاري إن كان يحمله على دواب المستاجر أو على عنقه فذاك

علی المستاجر، قال الفقیه أبو اللیثؒ: المعتبر في ذلک عادات الناس في تلک البلدة ولو طلب من المکاري أن یدخل بیته فالمعتبر هو العرف. (خلاصة الفتاویٰ:۳/۱۴۸،الفصل التاسع فیما علی الآجر و فیما علی المستاجر).

فتاوی الشامی میں ہے:

وفی البزازیة: ولو امتلأ مسیل الحمام فعلی المستاجرتفریغه ظاهراً کان أوباطناً، وفیها وتسییل ماء الحمام وتفریغه علی المستاجر وإن شرط نقل الرماد والسرقین رب الحمام علی المستاجرلا یفسد العقد وإن شرط علی رب الحمام فسد، فتأمل، ولعله مفرع علی القیاس أو مبنی علی العرف ففی البزازیة: وفي استئجار الطاحونة في کری نهرها یعتبر العرف. (فتاوی الشامی:۶/۸۰،سعید).

شرح مجلّہ میں ہے:

وفی الأنقرویة عن البزازیة: خرج المستاجر من البیت وفیه تراب ظاهر أو رماد، علی المستاجر إخراجه، بخلاف البالوعة، فإنه یلزم المؤجر تفریغها استحساناً، وإن شرط علی المستاجر عند العقد جاز، وأنه موافق للعقد، أی وإن کان العرف بخلافه، لأنه حدث بفعله، فالشرط الموافق للقیاس وإن کان مخالفاً للعرف، لا یفسد العقد، تأمل. (شرح المجلة للاتاسی: ۲/۶۲۲،المادة: ۵۲۹).

شرح مجلّہ میں ہے:

یلزم مراعاة الشرط بقدر الإمکان، أی إمکان الشرط واستطاعته، ولایلزم ما فوق الاستطاعة...أن الشروط ثلاثة أقسام: قسم یجوز شرعاً، فیه فائدة لمن اشترطه، فهذا یلزم مراعاته...وقال فی البدائع من کتاب المضاربة: الأصل فی الشروط اعتبارها ما أمکن، وإذا کان القید مفیداً کان ممکن الاعتبار فیعتبر لقوله علیه الصلاة والسلام: "المسلمون عند شروطهم". (شرح المجلة:۱/۲۳۶، المادة:۸۳). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شئی مستعار کو اجارہ پر دینے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے کوئی چیز عاریت پر لی، پھر وہ چیز کسی دوسرے کو کرایہ پر دیدی تو یہ کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شئی مستعار کو کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وليس للمستعير أن يواجر ما استعاره فإن آجره فعطب ضمن لأن الإعارة دون الإجارة و الشيء لايتضمن ما هو فوقه و لأنا لو صححنا لا يصح إلا لازماً لأنه حينئذٍ يكون بتسليط من المعير وفي وقوعه لازماً زيادة ضرر بالمعير لسد باب الاسترداد إلى انقضاء مدة الإجارة فأبطلناه . (الهداية:٣/ ٢٨٠، كتاب العارية).

درمختار میں ہے:

ولا توجر ولا ترهن لأن الشيء لايتضمن ما فوقه. (الدرالمختار:٥/٦٧٩).

اور اگر کرایہ پر دیدی تو کرایہ لازم نہیں ہوگا اس لیے کہ یہ اجارہ باطل ہے اور اجارۂ باطلہ میں کرایہ واجب نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

بخلاف الثاني و هو الباطل فإنه لا أجر فيه بالاستعمال. (الدرالمختار:٦/٤٦).

ہاں اگر مالک اجازت دے تو پھر جائز ہونا چاہئے۔

مجلّہ میں ہے:

وليس للمستعير أن يوجر العارية ولا أن يرهنها بدون إذن المعير. (المجلة:٣/٣٢٥).

"**بدون إذن المعير**" سے پتہ چلتا ہے کہ اجازت کے ساتھ جائز ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شعبان میں مستعفی ہونے پر رمضان کی تنخواہ کا حکم:

سوال: اگر مدرس شعبان یا رمضان میں مستعفی ہوجائے تو اس کو رمضان کی تنخواہ ملے گی یا نہیں؟

الجواب: مدرسہ کا معاملہ سال کے لیے ہوتا ہے لیکن عرف میں تعلیمی سال مراد ہے اور وہ شعبان کے آخر تک سمجھا جاتا ہے، لہذا معاملہ شعبان کے آخر تک ہوگا، ہاں اگر یہ شرط لگائی گئی ہو یا عرف ہو کہ مدرسہ مدرس کو

فارغ کردے تو رمضان کی تنخواہ دیتا ہے تو پھر تنخواہ دینی چاہئے، عرف کے علاوہ چھٹی استراحت کے لیے ہوتی ہے تاکہ آئندہ سال کے لیے مدرس ذہنی سکون حاصل کرلے، اس لیے رمضان کو آئندہ سال کے ساتھ لگانا معقول ہے، لہٰذا تعلیمی سال شعبان کے اختتام تک ہوگا۔

شرح مجلّہ میں ہے:

وفي مجمع الحقائق: العادة المطردة تنزل منزلة الشرط، حتى لو باع التاجر في السوق شيئاً بثمن، ولم يصرحا بحلول ولا تأجيل، وكان المتعارف فيما بينهم أن البائع يأخذ من الثمن كل جمعة قدراً معلوماً، انصرف البيع إليه بلا بيان، لأن المعروف عرفاً كالمشروط شرطاً. (شرح المجلة لمحمد الاتاسی:١/٩٥، المادة:٤١).

الاشباہ والنظائر میں ہے:

واعلم أن اعتبار العادة والعرف يرجع إليه في الفقه في مسائل كثيرة، حتى جعلوا ذلك أصلاً، فقالوا في الأصول في باب ما تترك به الحقيقة: تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة، هكذا ذكر فخر الإسلام ...

ومنها: البطالة في المدارس كأيام الأعياد ويوم عاشوراء وشهر رمضان في درس الفقه لم أرها صريحة في كلامهم، والمسألة على وجهين، فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء، وإلا فينبغي أن يلحق ببطالة القاضي. وقد اختلفوا في أخذ القاضي ما رتب له من بيت المال في يوم بطالته، فقال في المحيط: إنه يأخذ في يوم البطالة، لأنه يستريح لليوم الثاني، وقيل: لايأخذ، انتهى. وفي المنية: القاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح، واختاره في منظومة ابن وهبان، وقال إنه الأظهر (منظومة ابن وهبان:١/٢٨٨، فصل من كتاب ادب القاضی) **فينبغي أن يكون كذلك في المدارس، لأن يوم البطالة للاستراحة، وفي الحقيقة يكون للمطالعة والتحرير عند ذي الهمة.** (الاشباہ والنظائر:١/٢٦٨، ٢٧٢، القاعدة السادسة العادة محكمة).

كذا في ردالمحتار:٤/٣٧٢، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، سعيد).

امدادالاحکام میں ہے:

جب اس مدرس نے ماہِ شوال میں آکر کام نہیں کیا (خواہ کام نہ کرنے کا سبب اس کی طرف سے ہو یا کمیٹی کی طرف سے مگر بہر حال کام نہ کرنا متحقق ہو گیا) تو وہ رمضان کی تنخواہ کا مستحق نہیں۔

لأن شرط الاستحقاق هو العمل في شوال ولم يوجد، وإذا فات الشرط فات المشروط بخلاف ما إذا لم يعمل بحصول الرخصة والإذن من المتولي فإنه في حكم العمل كما لا يخفى. والله أعلم. (امداد الاحکام: ۳/۵۷۴).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

تنخواہ تو ایام عمل ہی کی ہے مگر تعطیل کا زمانہ تبعاً ایام عمل کے ساتھ ملحق ہے تاکہ استراحت کر کے ایام عمل میں عمل کر سکے،...شعبان کے ختم پر معزول ہو جانے سے تنخواہ نہ ملے گی اور عدمِ عزل میں رمضان کے ختم پر تنخواہ ملے گی بشرطیکہ شوال میں بھی کام کیا ہو۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۴۸).

فتاویٰ عثمانی میں ہے:

ابتدائے شوال میں آنے کی شرط پر ماہِ رمضان (ایام بطالت واستراحت) کی تنخواہ کو مشروط کرنا اب مفسدِ عقد نہیں، کیونکہ اب یہ شرط معروف ہو چکی ہے، اور خود شیخ المحد ثین حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ نے ''فتاویٰ خلیلیہ'' میں اپنے محاکمے میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ: شرطِ معروف قرار دی جائے تو ان سب صورتوں میں مدرس واقعہ متنازع فیہ میں پوری تنخواہ کا مستحق ہوگا۔ (فتاویٰ خلیلیہ: ۱/۲۴۸)

اس شرط کا معروف ہونا کئی وجوہات سے واضح ہے، جو درج ذیل ہیں:۔

(الف) مدارسِ دینیہ میں اس شرط کا معروف ہو جانا محتاجِ بیان نہیں کہ تقریباً سب مدارس اس پر عمل پیرا ہیں۔

(ب) یہ شرط معروف عند الفقہاء بھی ہے کیونکہ ایام بطالت کی تنخواہ کا استحقاق اسی لیے ہے کہ استراحت کے بعد دوبارہ زیادہ نشاط کے ساتھ کام کر سکے، اگر ایامِ بطالت کے بعد کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں تو ایامِ بطالت کی تنخواہ کا استحقاق کیسے ہوگا؟

(ج) یہ شرط مالِ وقف کی حفاظت اور اسے صحیح تر مصرف پر خرچ کرنے کے بھی عین مطابق ہے، اس لیے کہ مدارس میں زکوٰۃ وعطیات کی رقم معطین یا طلباء کی امانت ہے، اس امانت میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رقم کسی کو بلا عمل یا بلا عوض نہ دی جائے، لہذا عمل موجود ہونا چاہئے (جیسا کہ ایامِ عمل میں) یا مظنون ہونا چاہئے

(جیسا کہ ایامِ استراحت میں جب کہ آئندہ کام کرنے کا ارادہ ہو) ورنہ اجرت کا جواز محلِ نظر ہوگا۔۔۔از مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب مدظلہ)؛

فتویٰ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم:۔

شوال میں کام کرنے کو رمضان کی تعطیل کی تنخواہ کے لیے موقوف علیہ قرار دینا اور نہ قرار دینا دونوں امر جائز ہیں، موقوف علیہ قرار نہ دینے کا جواز واضح ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ عقدِ اجارہ میں ایک ماہ کی تنخواہ بلا عمل جو مقرر کی گئی، وہ گویا سارے سال کے مجموعی عمل پر ایک اجرتِ اضافیہ ہے، جو معلوم ہے، اور فریقین کے اتفاق سے جائز ہے، اور موقوف علیہ قرار دینے کے جواز کی ایک وجہ وہی ہوسکتی ہے جس کی طرف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کے جواب میں اشارہ موجود ہے۔۔۔اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایامِ بطالت کی تنخواہ تجدیدِ عقد کے لیے شرط قرار دی گئی ہے، یعنی اگر شوال میں آئندہ سال کے لیے عقد کی تجدید کی گئی تو ایامِ بطالت کی تنخواہ بھی دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ گویا اس صورت میں عقدِ اجارہ شعبان پر ختم ہوگیا، شوال میں تجدید عقد کے وقت ایامِ بطالت کی تنخواہ اضافی طور پر شوال کے ساتھ دی گئی۔ (فتاویٰ عثمانی:۳/۳۶۸، ۳۷۳، ۳۷۴).

نظام الفتاویٰ میں ہے:

یہ صحیح ہے کہ رمضان کی تعطیل استراحت کے لیے ہوتی ہے کہ بعد استراحت پھر مستعدی سے کام ہوسکے جیسا کہ عام مدارس میں متعارف ہے اور اس بنا پر آئندہ سال نہ آنے والے مدرسین وملازمین کو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوتا۔ (نظام الفتاویٰ:۱/۳۳۲).

مزید ملاحظہ ہو: فتاویٰ خلیلیہ:۱/۲۴۴۔۲۴۸، وفتاویٰ عثمانی:۳/۳۶۶۔۳۷۴، وقاموس الفقہ:۱/۴۹۷۔۴۹۸، وجدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۲۳۵، وفتاویٰ محمودیہ:۱۵/۵۲۹، جامعہ فاروقیہ). واللہ ﷻ اعلم۔

اجارہ میں وقت کی تعیین کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک کمپنی کو مکان بنانے کے لیے دیا، اور اس بات کا پابند کیا کہ تین ماہ میں مکان مکمل کرلے، ایسا اجارہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسا اجارہ جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

وفی الأصل أیضاً لو شرط علی الخباز أن یخبز له هذه العشرة المخاتیم دقیقاً وشرط علیه أن یفرغ عنه الیوم تجوز هذه الإجارة عندهم جمیعاً وإن ذکر الوقت والعمل کذا فی الذخیرة. (الفتاوی الهندیة:۴/۴۲۴).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وذکر الحاکم فی المختصر ما هو إشارة إلی ذلک وقال: ألا تری أنه لو استاجره لیعمل له هذا العمل بدرهم وشرط علیه أن یفرغ منه الیوم کان جائزاً. (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندیة:۲/۳۳۲).

امدادالاحکام میں ہے:

قال فی العالمکیریه: وما یتصل بهذا الفصل إذا جمع في عقد الإجارة بین الوقت والعمل إذا استاجر رجلاً لیعمل له عملاً إلی اللیل بدرهم صباغة أو خبزاً أوغیر ذلک فالإجارة فاسدة في قول أبي حنیفةؒ وفي قولهما یجوز استحساناً ویکون العقد علی العمل دون الیوم حتی إذا فرغ منه نصف النهار فله الأجر کاملاً وإن لم یفرغ فی الیوم فله أن یعمله فی الغد.

اس سے معلوم ہوا کہ صورتِ مذکورۂ سوال امام صاحب کے نزدیک تو درست نہیں کیونکہ عمل اور وقت دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک استحساناً جائز ہے اور اجارہ وقت پر منعقد نہیں ہوگا بلکہ عمل پر منعقد ہوگا۔ (امدادالاحکام:۳/۵۴۱).

وللاستزادة انظر: (وکذا فی ردالمحتار: ۶/۵۹،باب الاجارة الفاسدة،سعید۔وتبیین الحقائق:۵/۱۳۱، ملتان۔ وشرح المجلة:۲/۵۳۹،المادة: ۴۶۰،والفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:۴/۴۰۳). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ضرر کی وجہ سے کرایہ دار کو فارغ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے گھر میں ایڈز کی متعدی بیماری ہے، پڑوسی کے بچوں کو لگنے کا خطرہ ہے کیا مالکِ مکان ایسے کرایہ دار کو گھر سے فارغ کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بہتر یہ ہے کہ اس کو نہ نکالا جائے، ہاں لوگوں کو مطلع کردینا چاہئے تاکہ مرض

متعدی نہ ہو جائے، لیکن اگر مدت ختم ہونے پر یا ضرر کے ظن غالب ہونے پر اس سے معذرت کرلیں تو اس کی بھی گنجائش ہے، ہاں اگر ایسے مریضوں کے لیے کوئی علیحدہ جگہ نہ ہو تو پھر ان کو نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ ہر جگہ رہائش ان کے لیے باعث مصیبت اور سببِ اخراج ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

وفي حاشيتها لأبي السعود عن البيري: والحاصل أن كل عذر لايمكن معه استيفاء المعقود عليه إلا بضرر يلحقه في نفسه أوماله يثبت له حق الفسخ، قال البيري: يؤخذ منه الرجم الذي يقع كثيراً في البيوت ويقال إنه من الجان عذر في فسخ الإجارة لما يحصل من الضرر الخ ماذكره، أقول: يظهر هذا لوكان الرجم لذات الدار أما لوكان لشخص مخصوص فلا ...

(فرع كثير الوقوع) قال في لسان الحكام: لو أظهر المستاجر في الدار الشر كشرب الخمر وأكل الربا والزنا واللواطة يؤمر بالمعروف وليس للمؤجر ولا لجيرانه أن يخرجوه فذلك لايصير عذراً في الفسخ ولاخلاف فيه للائمة الأربعة، وفي الجواهر: إن رأى السلطان أن يخرجه فعل...أقول: وفي جامع الفصولين كل فعل هوسبب نقص المال أو تلفه فهو عذر لفسخه. (فتاوى الشامي:٦/٨١، باب فسخ الاجارة، سعيد).

(وكذا في لسان الحكام، ص ٣٦٨، الفصل الثامن عشر في الاجارة). **واللہ ﷻ اعلم۔**

تلاوتِ مجردہ پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: مصر سے جو قراء آتے ہیں وہ اپنی تلاوت پر عوض لیتے ہیں، تو کیا اجرت دیکر ان کی تلاوت سننا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تلاوتِ مجردہ پر اجرت لینا جائز اور درست نہیں، اگر شرط کے بغیر لوگوں نے اتفاقاً کچھ دیدیا تو اس کا لینا جائز اور درست ہے، ہمارے اکابرؒ کے فتاویٰ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ کے بارے میں مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، جو رسائل ابن عابدین میں شامل ہے۔

عدمِ جواز کے دلائل میں سے چند حسبِ ذیل درج ہیں:

(۱) عن عبد الرحمن بن شبل ، أنه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول:" اقرء وا القرآن، ولاتغلوا فیه، ولاتجفوا عنه، ولا تأکلوا به، ولاتستکثروا به. (رواہ ابو یعلی فی مسندہ ، ۲/۱۹۵/ ۱۵۱۵، مسند عبدالرحمن بن شبل الانصاری).

وبھامشه قال : اخرجه احمد (۳/۴۴۴،۴۲۸) والطحاوی(۲/۱۲)والطبرانی فی الکبیر والاوسط والبزار قال فی المجمع (۴/۹۵): رجاله ثقات،وذکرہ (۷/۱۶۷)ایضاً ، وعزاہ السیوطی فی الجامع الصغیر (۱/۵۱)الی البیهقی ایضاً ،وقال الحافظ : سندہ قوی، انتھیٰ).

وراوہ ابن ابی شیبة فی مصنفه: ۵/۲۴۰/۷۸۲۵،المجلس العلمی. وقال الشیخ محمد عوامة فی تعلیق ھذا الحدیث: رواہ احمد والطبرانی وابویعلی والطحاوی والبیھقی فی الشعب وعبدالرزاق، واسنادہ قوی،انتھی ملخصاً).

(۲) عن سلیمان بن بریدة عن ابیه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:"من قرء القرآن یأکل به الناس جاء یوم القیامة ووجهه عظمة لیس علیه لحم. (رواہ البیهقی فی شعب الایمان:۲/۵۳۲/ ۲۳۸۴).

ورواہ ابن ابی شیبة فی مصنفه عن زاذان مرسلاً ، وقال الشیخ محمد عوامة فی تعلیق ھذا الحدیث: وھذا له حکم الرفع ، فهو مرسل بإسناد حسن، زاذان : هو الکندی ، وهو تابعی صدوق ، وقد رواہ ابونعیم فی الحلیة (۴/۱۹۹، من طریق احمد بن یونس ، عن الثوری به۔ ورواہ مرفوعاً من حدیث بریدة بن حصیب ﷺ : البیهقی فی "الشعب"(۲۳۸۴،۲۶۲۵) وفی إسنادہ حفید الفضل بن دکین: احمد بن میثم بن الفضل بن دکین ، ذکرہ ابن حبان فی المجروحین (۱/۱۴۸) وروی ھذا الحدیث وحدیثاً آخر له ، وقال: ھذان حدیثان لا أصل لهما ، وذکرہ ابن الجوزی فی "العلل المتناهیة"(۱/۱۱۷) انتھی ۔ (المصنف لابن ابی شیبة مع التعلیق:۵/۲۳۸/۷۸۲۴).

ھذہ الأحادیث وإن کان في بعضها مقال، لکنه یؤید بعضها بعضاً.(رسائل ابن عابدین،ص).

عباراتِ فقہیہ ملاحظہ ہو:

فتاویٰ شامی میں ہے:

لأن ما أجازوہ ، إنما أجازوہ في محل الضرورة کالاستیجار لتعلیم القرآن أو الفقه أوالأذان أوالإمامة خشیة التعطیل لقلة رغبة الناس فی الخیر، ولاضرورة فی استئجار

شخص يقرأ على القبر أوغيره. (فتاوى الشامى: ٦/ ٦٩١، باب الوصية للاقارب وغيرهم، سعيد).

محیط برہانی میں ہے:

وقيل: لايجوز الوصية باستئجار القاري ليقرء القرآن وإن كان القاري معيناً وهو قول أبي حنيفةؒ. (المحيط البرهاني: ٢٣/ ٣٩، الرياض ،السعودية).

وفي ردالمحتار: وإن القراءة لشيء من الدنيا لاتجوز، وإن الآخذ والمعطي آثمان، لأن ذلک يشبه الاستئجار على القراءة... كما أوضحت ذلک في شفاء العليل. (رد المحتار: ٢/ ٧٣، مطلب فى بطلان الوصية بالختمات والتهاليل، سعيد).

خلاصہ یہ ہے کہ تلاوتِ مجردہ پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، متون، شروح اور فتاویٰ سب میں اس کی ممانعت موجود ہے۔

ہاں بطورِ ہدیہ کچھ دیدیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں روایت ہے:

عن أنس بن مالک ﷺ أن رجلاً من كلاب سال رسول الله صلى الله عليه وسلم عن عسب الفحل فنهاه، فقال يارسول الله! إنا نطرق الفحل فنكرم فرخص لهم فى الكرامة.

(رواه الترمذى، وقال هذا حديث حسن، ١/ ٢٤٠).

کفایت المفتی میں ہے:

وعظ کی اجرت پہلے سے مقرر نہ کی جائے اور واعظ کی نیت میں بھی یہ بات نہ ہو کہ مجھے کچھ ضرور ملے گا، وہ محض حسبۃً للہ وعظ کہدے اور کوئی شخص اس کو تبرعاً کوئی رقم دیدے تو یہ رقم دینا جائز ہے۔ (کفایت المفتی: ۷/ ۳۱۹، دارالاشاعت).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

مسئلہ نکاح بقاضی و وکیل و شاہدان کہ از طرف عروس فی آیند بخوشی خود بدونِ مطالبہ شاں چیزے دادن جائز است یا نہ؟

الجواب: دادن این مرداں بدونِ مطالبہ و جبر از طرف ایشان مباح است۔

جو چیز کسی کو دی جاتی ہے اس کی چار صورتیں ہیں:

(۱)قسم اول:۔جو متقوم شئی کے عوض میں حاصل ہو۔
(۲)قسم دوم:۔جو چیز غیر متقوم شئی کے عوض میں حاصل ہو۔
(۳)قسم سوم:۔جو بلاعوض بطیبِ خاطر حاصل ہو۔
(۴)قسم چہارم:۔جو بلاعوض بکراہت حاصل ہو۔

تیسری صورت کے متعلق حکیم الامتؒ فرماتے ہیں:

قسم سوم بوجہ ہدیہ وعطیہ ہونے کے حلال ہے۔(امدادالفتاوی:۲/۲۶۵،الصراح فی اجرۃ النکاح).

ملاحظہ: یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ جو قراء حضرات بیرون ملک سے مشقتِ سفر برداشت کرکے تشریف لاتے ہیں،ان کے لیے آمدورفت،قیام گاہ،اوردیگر اخراجات کا انتظام کرنا درست ہے، یہ اجرت علی التلاوۃ میں شامل نہیں ہے،ہاں مجلس تلاوت میں قرآن پڑھنے پر اجرت دینا ناجائز ہے۔

بعض حضرات جواز کے قائل ہیں،چنانچہ درمختار میں ہے:

قلت: وكذا ينبغي أن يكون القول ببطلان الوصية لمن يقرأ عند قبره بناء على القول بكراهة القراءة على القبور أو بعدم جواز الإجارة على الطاعات، أما على المفتي به من جوازهما فينبغي جوازها مطلقاً وتمامه في حواشي الأشباه من الوقف. (الدرالمختار: ٦/٦٩،سعيد).

وفي حاشية الطحطاوي: والمختار جواز الاستيجار على قراءة القرآن على القبور مدة معلومة . (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار: ٤/٣٠،کوئته).

وفى البحرالرائق: وفى الحاوي لكرابيسي إذا استأجره ليختم عنده القرآن ولم يسم له أجراً ليس له أن يأخذ أقل من خمسة وأربعين درهماً شرعاً أما إذا سمى أجراً لزم ما سمى لكن يأثم المستاجر إذا عقد على أقل من خمسة وأربعين درهماً إلا أن يهب المستاجر ما بقي من تمام القدر أو يشترط أن يكون ثواب ما فوقه لنفسه فلا يأثم وكذا إذا قال: اقرأ بقدر ما قدرت عليه فله من الأجر بقدر ما قرأ وهذا يجب حفظه كما فى المبسوط ، أقول: وهذا في عرفهم أما في زماننا فيجوز ذلك . (تکملة البحرالرائق: ٨/٢٠، باب الاجارة الفاسدة،کوئته).

لیکن علامہ شامیؒ نے ان اقوال کو غیر مختار قرار دیا ہے۔چنانچہ علامہ شامیؒ نے ایک مستقل رسالہ ”شفاء

العليل وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل" تحریر فرمایا، اس رسالہ میں علامہ شامیؒ نے اس مسئلہ پر مفصل کلام فرمایا ہے اور قائلین جواز کا جواب بھی دیا ہے۔

☆ درمختار کی عبارت کا جواب:۔

أقول: ليس كذلك لما في الولوالجية لو زار قبر صديق أو قريب له وقرأ عنده شيئاً من القرآن فهو حسن أما الوصية في ذلك فلا معنى لها، ولا معنى أيضاً لصلة القاري لأن ذلك يشبه استئجاره على قراءة القرآن وذلك باطل ولم يفعله أحد من الخلفاء، وفي كونه مما أجيز الاستئجار عليه تأمل، لأن ما أجازوه إنما أجازوه في محل الضرورة كالاستئجار لتعليم القرآن أو الفقه أو الأذان أو الإمامة خشية التعطيل لقلة رغبة الناس في الخير ولاضرورة في استئجار شخص يقرأ على القبر أو غيره. (فتاوى الشامي:٦/ ٦٩١، سعيد).

☆ علامہ سید احمد طحطاویؒ کی عبارت کا جواب:۔

(۱) علامہ شامیؒ کے مذکورہ رسالہ پر علامہ سید احمد طحطاویؒ نے تقریظ تحریر فرمائی ہے جو رسالہ کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، اس میں حمد وصلاۃ کے بعد فرماتے ہیں:

" أما بعد: فقد اطلعت على هذه الرسالة الثمينة التي هي لنفائس الصواب خزينة المسماة بـ"شفاء العليل وبل الغليل في حكم الوصية بالختمات والتهاليل" فوجدتها رفيعة الشان زاهية العرفان...تكفلت بجمع أصح النصوص دون أضعفها... (رسائل ابن عابدين، ص ۱۹۹).

علامہ طحطاویؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

(۲) علامہ طحطاویؒ ابتداء اس کے جواز کے قائل تھے، لیکن منکرات کی وجہ سے بعد میں منع فرمایا۔ منکرات میں سے مثلاً یتیموں کا مال کھانا ڈھول بجانا، مجلس میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط، کثرتِ غوغا سے سونے والوں کو تکلیف پہنچانا، وغیرہ منکرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علامہؒ نے استئجار علی القراءۃ سے منع فرمایا۔

☆ علامہ ابن نجیم مصریؒ کی عبارت کا جواب:۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ثم رأيت العلامة الشيخ خير الدين الرملي في حاشيته على البحر رد على صاحب

البحر...حيث قال:...

أقول: المفتى به جواز الأخذ استحساناً على تعليم القرآن لا على قراءة المجردة كما صرح به في التاتارخانية حيث قال لا معنى لهذه الوصية ولصلة القارئ بقراءته لأن هذا بمنزلة الأجرة والإجارة في ذلك باطل وهي بدعة ولم يفعلها أحد من الخلفاء وقد ذكرنا مسئلة قراءة القرآن .... (رسائل ابن عابدين،ص١٦٨).

قال العلامة الشاميّ: ومن أقوى الدلائل على رده أيضاً عبارة الولوالجية وخزانة الفتاوى فإن فيهما التصريح ببطلان هذه الوصية مع التصريح بجواز القراءة عند القبر، فكيف يصح جعل بطلان الوصية مبنياً على القول بعدم جواز القراءة على القبر كما زعمه في البحر وإنما هو مبني على بطلان الاستئجار على القراءة الذي لم يستثنه أحد من التأخرين . (رسائل ابن عابدين ، ١٦٩).

قائلینِ عدمِ جواز کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

وفي الولوالجية :ولو زار قبر صديق أو قريب له وقرأ ...فهو حسن ، أما الوصية في ذلك فلا معنى له...وذلك باطل . (الفتاوى الولوالجية:٥/٣٣٦،بيروت).

قال العلامة الشاميّ : ورأيت أيضاً النقل ببطلان هذه الوصية وأنها بدعة عن الخلاصة والمحيط السرخسي والبزازية. (رسائل ابن عابدين،ص١٦٨).

وفي خلاصة الفتاوىٰ: وفي النوازل : رجل أوصى لقارى القرآن يقرأ عند قبره بشيء فالوصية باطلة . (خلاصة الفتاوىٰ:٤/٢٣٤،الفصل الرابع في الدفن والكفن ومايتعلق بها).

محیط برہانی میں ہے:

إذا أوصى أن يدفع إلى إنسان كذا من ماله كذا ليقرأ القرآن على قبره فهذه الوصية باطلة ، وقيل إذا كان القاري معيناً ينبغي أن يجوز الوصية له على وجه الصلة دون الأجر، وقيل لايجوز وإن كان القاري معيناً وهوقول أبي حنيفةؒ ، وكان يقول : لا معنى لهذه الوصية ولصلة القاري بقراءته لأن هذا بمنزلة الأجرة والإجارة في ذلك باطلة، وهي بدعة ولم يفعلها أحد من الخلفاء رضوان اللّٰه تعالىٰ عليهم أجمعين وقد ذكرنا مسألة قراءة القرآن

علی القبور في کتاب الاستحسان . (المحیط البرهانی :۳۹/۲۳،الریاض ، السعودیة).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

إذا أوصی أن یدفع إلی إنسان کذا من ماله لیقرأ القرآن علی قبره فالوصیة باطلة لاتجوز . (الفتاوی التاتارخانیة:کتاب الوصایا،فی الفصل التاسع والعشرین).

وفي الطریقة المحمدیة: (ومنها) أی من أمورمبتدعة ابتدعهاالجهلة المغرورون لا أصل لها في الشریعة (الوصیة) من المیت ...(بإعطاء دراهم معدودة) معلومة (لمن یتلو أی یقرأ (القرآن لروحه) أی لروح المیت . (الطریقة المحمدیة مع شرحه الحدیقة الندیة:۷٤۲/۲،الفصل الثالث).

وقال العلامة الشامیؒ : إن القراء ة في نفسها عبادة یرجی بها الثواب وقد عرفوا الریاء بأن یراد بالعبادة غیر وجهه تعالیٰ فالقاري بالأجرة ثوابه ما أراد القراء ة لأجله وهو المال . (رسائل ابن عابدین،ص١٦٧).

علامہ شامیؒ نے ایک اہم بات کی طرف متوجہ کرایا ہے وہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ کوئی فقیہ ایک مسئلہ غیر مفتی بہ نقل کرتا ہے بعدوالے اسی نقل پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کرتے چلے جاتے ہیں،تونقل کرنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، حالانکہ وہ مسئلہ غیر مفتی بہ ہوتا ہے۔مسئلہ بالا میں بھی اسی طرح ہوا ہے۔

چنانچہ شرح عقود رسم المفتی میں فرماتے ہیں:

قلت: وقد یتفق قول في نحو عشرین کتاباً من کتاب المتأخرین و یکون القول خطأ أخطأ به أول واضع له فیأتي من بعده وینقله عنه. (شرح عقود رسم المفتی،ص٥).

امدادالاحکام میں ہے:

قراءتِ قرآن عندالقبو راوراس پر اجرت کوعالمگیر یہ وجوہرہ میں اگر چہ جائز لکھا ہے جب کہ مدت متعین کر کے معاملہ کیا جاوے لیکن عالمگیر یہ وغیرہ کے اس فتویٰ کی علامہ شامیؒ نے تردید وتغلیط کی ہے اس لیے صحیح یہ ہے کہ قراءتِ قرآن پر اجرت لینا ناجائز ہے، لکونه استئجاراً للطاعة وهو لایجوز واستثناء التعلیم والأذان والإمامة للضرورة ولا ضرورة فیه (صرح به فی ردالمحتار). (امدادالاحکام:۵۵۷/۳،وکذافی معلم الفقہ ترجمہ اردو مجموعۃ الفتاوی:۲۴۷/۲). واللہ ﷻ اعلم۔

حکم الإجارة المضافة إلى المستقبل:

سوال: اجارہ جو مستقبل کی طرف منسوب کیا گیا ہو، مثلاً: اگر کوئی شخص یہ کہے "آجرتک هذه الداربعد شهر" تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں ایسا اجارہ جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

إذا أضاف الإجارة إلى وقت في المستقبل بأن قال : آجرتک داري هذه غداً أو ما أشبه فإنه جائز فلو أراد نقضها قبل مجيء الوقت فعن محمدؒ فيه روايتان في رواية قال لايصح النقض وفي رواية قال يصح ،كذا في المحيط . (الفتاوى الهندية:٤/٤١).

وفي الدرالمختار: وتصح الإجارة وفسخها والمزارعة والمعاملة...حال كون كل واحد مما ذكر مضافاً إلى الزمان المستقبل كآجرتک أوفاسختک راس الشهر صح بالإجماع . (الدر المختار: ٦/٩٣، مسائل شتىٰ).

وفي المحيط : إذا أضاف العقد إلى وقت في المستقبل بأن قال: آجرتک داري هذه غداً وما أشبهه، وأنه جائز بناء على الأصل الذي ذكرنا أن الإجارة تنعقد ساعة فساعة على حسب حدوث المنفعة، فالعقد في حق الحكم كالمضاف إلى وجود المنفعة فمبنى الإجارة في حق الحكم على الإضافة كيف تكون الإضافة مانعة صحة الإجارة...وفي فتاوى أبي الليثؒ إذا قال لغيره: إذا جاء رأس الشهر فقد آجرتک هذه الدار، إذا جاء غد فقد آجرتک هذه الدار يجوز وإن كان فيه تعليقاً . (المحيط البرهاني:٩/٨٧، كتاب الاجارات،مكتبه رشيديه).

وكذا في الشامي: وحاشية الطحطاوي على الدر:٤/٥١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بینک کی ملازمت کا حکم:

سوال: ایک شخص جنوبی افریقہ کی بینک میں ملازمت کرتا ہے، کیا ایسی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور

تنخواہ حلال ہے یا حرام؟ کیا بینک میں کسی قسم کی جائز ملازمت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ کسی کاروبار میں سو فیصد معاملہ سودی ہو تو پھر وہاں ملازمت کا کیا حکم ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا اجر جزیل۔

الجواب: بینک کی وہ ملازمت جو خالص سودی حساب کتاب اور لین دین سے متعلق ہو نا جائز ہے، اور اس کی تنخواہ حلال نہیں، کیونکہ سودی اعانت ہے، اور بحوائے حدیث شریف کسی قسم کی سودی اعانت جائز نہیں ہے، ہاں بینک میں وہ شعبے جو سود سے متعلق نہیں ہے مثلاً بینک میں چپراسی، باورچی، ڈرائیونگ، جاروب کشی وغیرہ کی ملازمت جائز اور درست ہے، اور تنخواہ بھی حلال ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ آج کل بینک میں سودی لین دین کے علاوہ درآمدات اور برآمدات، بجلی، ٹیلیفون وغیرہ کے بل ادا کیے جاتے ہیں، یعنی حلال کاروبار بھی ہوتا ہے، لہذا اس سے متعلق ملازمت ہو تو جائز ہونی چاہئے، ہاں سودی معاملہ میں ملوث نہ ہو۔ تاہم اجتناب اولیٰ ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء. (رواه مسلم: كتاب المساقات والمزارعة، باب الربا، ۲/۲۷).

امداد المفتین میں ہے:

حدیث میں سود کے معاملات میں اعانت کرنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔ (امداد المفتین، ۲/۷۰۳).

فتاویٰ بینات میں ہے:

بینک میں ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے اسی طریقے سے بینک کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے اور بینک میں ملازم ہونا سودی کاروبار میں معاون بننا ہے اور اس سے تنخواہ لینا سود سے تنخواہ لینا ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے، دینے، لکھنے، گواہ بننے والوں، اور جملہ معاونین پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ گناہ میں سب برابر ہیں، "صحیح مسلم" میں ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء. (رواه مسلم: كتاب المساقات والمزارعة، باب الربا، ۲/۲۷).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔ (فتاویٰ بینات: ۴/۱۷، بینک میں

ملازمین کی تنخواہ کا حکم)۔

نظام الفتاویٰ میں ہے:

بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو، جائز ہے ،اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں۔(نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۴)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

جب بینک میں تمام معاملہ سودی لین دین کا ہے تو پھر ملازمت کو قبول کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔حدیث شریف میں ہے:

عن جابر ﷺ قال: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء. اس سے ثابت ہوا کہ گناہوں کے کام میں امداد کرنا اور اس میں کسی قسم کا حصہ لینا جائز نہیں گناہ ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**﴾ ،ترجمہ:اور گناہ اور ظلم زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو اور خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدائے پاک سخت سزا دینے والا ہے۔(سورۂ مائدہ)۔(فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۸۹)۔

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

سوال: بینک کے کون کون سے شعبوں کے ملازمین کی آمدنی جائز ہے؟

جواب: ان تمام شعبوں کی آمدنی ناجائز ہے،جن شعبوں میں سود کا کام کرنا پڑتا ہو،سود کا لین دین یا لکھنا یا گواہی دینا یا اس کے معاملہ میں کسی طرح کی معاونت کرنا یہ سب ناجائز ہے، باقی ایسے معاملات جن کا سود سے کوئی تعلق نہیں ہے،جیسے ایک آدمی کیشیئر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی آدمی چیک لاتا ہے اور اس کو چیک دیتا ہے ، یا ڈرائیور یا چپڑ اسی ہے اس حد تک گنجائش ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/۱۳۵،وکذا فی فتاویٰ حقانیہ:۶/۲۵۸)۔

کتاب الفتاویٰ میں ہے:

بینک کے وہ ملازمین جو حساب و کتاب ،نوشت وخواند،لین دین کا کام کرتے ہیں اس گروہ میں داخل ہیں،معصیت میں براہِ راست معاون ہیں،اس لیے یہ ملازمت ان کے لیے جائز نہیں ہے،البتہ نیچے درجے کی ملازمت (مثلاً جاروب کش ،چوکیدار،وغیرہ جن کا کاروبار اور معاملات سے تعلق نہیں،نفس عمارت کی حفاظت

وغیرہ پر مأمور ہیں) جائز ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳۹۲/۵).

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۳۰۷/۷، ۳۱۰، دارالاشاعت۔ وفتاویٰ عثمانی: ۳۹۵/۳). واللہ ﷻ اعلم۔

بینک کی تنخواہ کا حکم:

اس میں اصل قاعدہ یہ ہے کہ اکثر آمدنی اگر حرام ہو تو اس مال سے ہر چیز لینا حرام ہے، خواہ تنخواہ ہو، پیسے ہوں، لیکن بینک میں جو روپیہ ہوتا ہے وہ اکثر حرام نہیں ہوتا اس میں اصل سرمایہ ہوتا ہے، بینک کے مالکین اور دوسرے ڈپازیٹرز کے پیسے ہوتے ہیں اکثریت ان کی ہے۔ لہذا اکثریت مال حرام کی نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی کام جائز کر کے اس کے پیسے لیے جائیں تو جائز ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۱۳۶/۴).

حضرت مفتی تقی صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بینک کی آمدنی کے چار ذرائع ہیں: (۱) اصل سرمایہ، (۲) ڈپازیٹرز کے پیسے، (۳) سود اور حرام کاموں کی آمدنی، (۴) جائز خدمات کی آمدنی، اس سارے مجموعے میں صرف نمبر ۳ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جا سکتا، اور چونکہ ہر بینک میں نمبر ۱ و نمبر ۲ کی اکثریت ہوتی ہے، اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجموعے میں حرام غالب ہے، لہذا کسی جائز کام کی تنخواہ اس سے وصول کی جا سکتی ہے۔

یہ بنیاد ہے جس کی بناء پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں خود کوئی حرام کام کرنا نہ پڑتا ہو، جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳۹۵/۳).

امداد الاحکام میں ہے:

اگر ملازم کو یہ معلوم ہو کہ یہ تنخواہ جو مجھے دی گئی ہے یہ بیع فاسد کے ثمن سے دی گئی ہے یا سود کی آمدنی سے، جب تو اس کا لینا درست نہیں، اور اگر سب مخلوط ہو، اور اس کو معلوم نہ ہو کہ یہ تنخواہ بیع صحیح کی قیمت سے ہے یا فاسد کی تو تنخواہ حلال ہے۔

قال في الأشباه: غلب على ظنه أن أكثر بياعات أهل السوق لاتخلو عن الفساد، فإن كان الغالب هو الحرام تنزه عن شرائه، لكن مع هذا لو اشتراه يطيب له، قال الحموي: ووجهه أن كون الغالب هو الحرام لايستلزم كون المشترى حراماً، لجواز كونه من الحلال المغلوب والأصل الحل. (الاشباه مع شرح الحموی ص۹۲).

قال الشیخ دام ظله: إذا أعطى الموجر الأجرة من المال المخلوط والأجير عالم بالخلط، فكيف يجوز له أخذها والخبث تمكن بها بالخلط ، قلت: هذا على قولهما، وهو الأحوط، ولكن على قول أبي حنيفةؒ فالخلط مستهلک، فإن قيل هذا يفيد ملكه لأجل استمتاعه به ، قلت: عبارات الفتاویٰ تدل على جواز الاستمتاع أيضاً على قوله قال في فتاویٰ قاضیخان: إن كان غالب مال المهدی من الحلال، لا بأس بأن يقبل الهدية ويأكل مالم يتبين عنده أنه حرام، لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب...

(امدادالاحکام:۳/۵۴۳). واللہ ﷻ اعلم۔

حرام وناجائز اشیاء والی دکان پر ملازمت کا حکم:

سوال: کیا ایسے مسلمان کی آمدنی حلال ہے جو غیر مسلموں کی ایسی ہوٹلوں میں کام کرتا ہو جہاں شراب، خنزیر اور دیگر محرمات بیچے جاتے ہوں؟

الجواب: مسلمان شخص کا کسی غیر مسلم کی دکان پر ملازمت کرنا جائز اور درست ہے، بشرطیکہ مسلمان شخص شراب یا خنزیر کھلانے پلانے یا دیگر محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے یا براہِ راست خرید وفروخت کرنے کا عمل نہ کرتا ہو کیونکہ مباشرۃً یہ کام کرنا مسلمان شخص کے لیے ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ لعن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم في الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة إليه وساقيها وبايعها وآكل ثمنها والمشتری لها والمشتراة له. (رواه الترمذی:۱/ ۳۸۰،باب ماجاء في بيع الخمر).

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے: شراب نچوڑنے والا، جس کے لیے نچوڑی جائے، اس کو پینے والا، اٹھانے والا، جس کے لیے اٹھائی جائے، پلانے والا، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، خریدنے والا، جس کے لیے خریدی جائے۔

عالمگیری میں ہے:

وإذا استاجر الذمي مسلماً ليحمل له ميتة او دماً يجوزعندهم جميعاً ...ولو استاجر مسلماً ليرعى له الخنازير يجب أن يكون على الخلاف كما فى الخمر ولو استاجره ليبيع له ميتة لم يجزهكذا فى الذخيرة ، مسلم آجر نفسه من مجوسي ليوقد له النار لا بأس به كذا فى الخلاصة...وسئل إبراهيم بن يوسفؒ عمن آجر نفسه من النصارى ليضرب لهم الناقوس كل يوم بخمسة ويعطى كل يوم خمسة دراهم في ذلك العمل وفي عمل آخر درهمان قال: لايواجر نفسه منهم ويطلب الرزق من طريق آخر ويكره له أن يؤاجر نفسه منهم لعصر العنب ليتخذوا منه خمراً كذا فى الحاوى للفتاوى. (الفتاوى الهندية:٤/ ٤٥٠).

(وكذا فى فتاوى قاضيخان على هامش الهندية :٢/ ٣٢٤).

قاموس الفقہ میں ہے:

جس طرح خود کسی ناجائز اور خلافِ شرع کام کرنا درست نہیں اسی طرح ایسے کاموں میں ملازمت اور تعاون بھی درست نہیں...اس لیے بینک، انشورنس، شراب خانوں، قحبہ خانوں کی ایسی ملازمت جائز نہیں ہوگی جس میں آدمی سود، قمار، شراب یا قحبہ کے کاروبار کا ذریعہ بنے اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، سود کے حساب و کتاب لکھے، ہاں چپراسی وغیرہ کی ملازمت کی جاسکتی ہے، کیوں کہ اس کا براہِ راست اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ (قاموس الفقہ :۱/ ۵۰۰، ناجائز کاموں کی ملازمت)۔

فقہی مقالات میں ہے:

ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے اس لیے کہ شراب پلانا یا اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے۔...اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید وفروخت کا عام رواج ہو، وہاں بھی کسی مسلمان کے لیے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔ (فقہی مقالات:۱/ ۲۵۰۔۲۵۲)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جو کام ناجائز ہے، اس کام کی نوکری بھی ناجائز ہے، دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرے اور اس نوکری کو چھوڑ دے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۷/ ۱۲۱، جامعہ فاروقیہ)۔

تالیفاتِ رشیدیہ میں ہے:

کفار کی نوکری جس میں خلافِ شرع نہ ہو درست ہے۔ (تالیفاتِ رشیدیہ، ص۴۲۰).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

شراب کی خرید وفروخت اور پلانے کی ملازمت جائز نہیں، کسی دوسرے کام کے لیے کافر کے شراب کے کاروبار میں ملازمت کی گنجائش ہے، لیکن اس میں بھی کئی دینی خطرات ہیں اس لیے احتراز بہتر ہے۔(احسن الفتاویٰ: ۷/۳۳۲).

مزید ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام: ۳/۵۳۳، وفقہی مقالات: ۱/۲۵۲۔۲۵۵). واللہ ﷻ اعلم۔

فٹ بال کے کھلاڑی کی اجرت کا حکم:

سوال: فٹ بال کھیلنے والے کی اجرت کا کیا حکم ہے؟ کیونکہ کھیلتے وقت اس کی رانوں کا تقریباً آدھا حصہ کھلا ہوتا ہے۔

الجواب: فٹ بال کے کھیل میں چونکہ عام طور پر کھیلنے والوں کی رانیں کھلی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے اس طرح ران کھلی رکھ کر کھیلنا ناجائز ہے، لیکن کھیلنے والا ڈھانپنے پر بھی قادر ہے اور اجرت نفسِ کھیل کی ہے نہ کہ ران کھولنے کی لہٰذا اجرت حرام نہیں ہے۔ اور کھیلنے والا اجیر خاص ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو تسلیم کر دیتا ہے اس لیے مستحق اجرت ہوگا۔

ابوداود شریف کی روایت میں ہے:

حدثنا عبد اللّٰہ بن مسلمة عن مالک عن أبی النضر عن زرعة بن عبد الرحمن بن جرهد عن أبيه قال: كان جرهد هذا من أصحاب الصفة أنه قال: جلس رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم عندنا وفخذي منكشفة فقال: أما علمت أن الفخذ عورة. (رواه ابوداود: ۲/۵۵۷، باب النهی عن التعری، فیصل).

مشکوٰۃ شریف میں ہے:

وعن علي ﷺ أن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم قال له: يا علي لا تبرز فخذك ولا تنظر إلى فخذ حي ولا ميت. رواه ابوداود، وابن ماجه.

وعن محمد بن جحش ﷺ قال: مر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی معمر وفخذاہ مکشوفتان قال: یا معمر غط فخذیک فإن الفخذین عورۃ ، رواہ في شرح السنۃ.

(مشکوٰۃ شریف:۲/ ۲۶۹،باب النظرالی المخطوبۃ).

ہدایہ میں ہے:

والأجیر الخاص الذي یستحق الأجرۃ بتسلیم نفسہ فی المدۃ وإن لم یعمل کمن استوجر شھراً للخدمۃ أو لرعی الغنم وإنما سمی أجیر وحد لأنہ لایمکنہ أن یعمل لغیرہ لأن منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والأجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الأجر مستحقاً وإن نقص العمل . (الھدایۃ: ۳/ ۳۱۰،باب ضمان الاجیر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

فیشن ماڈل کی اجرت کا حکم:

سوال: فیشن ماڈل کی اجرت کا کیا حکم ہے؟یعنی جب نئے فیشن کے کپڑے برآمد ہوتے ہیں،تو نمائش کے لیے حسین وجمیل عورتیں اجرت پر لی جاتی ہیں، جونمائش گاہ میں اپنے برہنہ جسم کے ساتھ ان کپڑوں کی نمائش کرتی ہے، پھراس کے اشتہارات چھپتے ہیں اوراس کی اجرت لی جاتی ہے، کیا یہ اجرت لینا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: فیشن ماڈل کی اجرت ناجائز ہے، کیونکہ اعضائے جسم کے اظہارکوذریعہ معاش بنایا گیا اور شریعتِ مقدسہ کا قانون یہ ہے کہ عورتیں ازسرتاپا مستورہوں، غیرمحرموں کے سامنے جسم کی ساخت کا اظہار کرنا اور برہنہ ہونا حرام اورناجائز ہے۔ایسی عورتوں کواللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرنا چاہئے اور ایسے عمل سے توبہ کرنی چاہئے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿ یا أیھاالنبي قل لأزواجک وبناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن .

(سورۃ الاحزاب،الآیۃ:۵۹).

وقال تعالیٰ: ﴿ ولایبدین زینتھن إلا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن.

(سورۃ النور،الآیۃ: ۳۱).

وقال تعالیٰ: ﴿ وقرن فی بیوتکن﴾ (سورۃ الاحزاب،الآیۃ:۳۳).

وقال : ﴿ قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ...وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن. (سورة النور، ۳۰،۳۱).

ترمذی شریف میں ہے:

عن عبد الله ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان. (رواه الترمذي: ۱/۲۲۰،ابواب الرضاع).

صحیح مسلم شریف میں ہے:

عن رافع بن خديج ﷺ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ثمن الكلب خبيث ومهرالبغي خبيث وكسب الحجام خبيث. (رواه مسلم:۲/۱۹،باب تحريم ثمن الكلب).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

وفي العيون لاتجب أجرة المغنية وفي المنتقى امرأة نائحة أوصاحبة طبل أوصاحبة مزامير اكتسبت مالاً إن كانت على شرط ردته على أربابها إن علموا وإن لم يعلموا تصدقت به وإن من غيرشرط فهو لها قال الإمام الأستاذ: لا يطيب والمعروف كالمشروط.

(الفتاوى البزازية بهامش الهندية:۵/۱۲۵،العاشرفي الخطروالاباحة). **واللہ ﷻ اعلم۔**

دلالی کی اجرت کا حکم:

سوال: ایک شخص گاڑی بیچنا چاہتا ہے کسی نے اس کے لیے مشتری تلاش کیا تو تلاش کرنے والا اپنی محنت کے بدلہ کچھ رقم لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مشتری تلاش کرنے والا یعنی دلال کے لیے اپنی محنت کی اجرتِ مقررہ لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

قال في البزازية: إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك ومالايقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ويطيب الأجر المأخوذ أو قدر أجر المثل.

(فتاوی الشامی:٦/٤٧،سعید).

نیز مذکور ہے:

تتمة : قال في التاتارخانية : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذلک حرام عليهم، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثره التعامل ، و كثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام. (فتاوی الشامی: ٦/٦٣،سعید).

مزید ملاحظہ ہو: امدادالاحکام :۳/۵۵۵،۵۸۹۔وامدالفتاوی:۳/۳۶۳۔وفتاویٰ محمودیہ:۱۶/،واحسن الفتاویٰ: ۷/۲۷۳). واللہ ﷻ اعلم۔

اجیر خاص کو مدتِ طویلہ کے لیے رکھنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے کمپنی کے ایک ملازم کو تربیت دی اور کام سکھایا اس پر محنت کی اور اس پر خرچہ کیا اور اس کو ملازم رکھا پھر اس سے کہا کہ اگر تم نے پانچ سال سے پہلے ملازمت چھوڑ دی تو تم کو اتنا جرمانہ ادا کرنا پڑیگا، یا تمہارے خلاف قانونی کاروائی کی جائیگی اب وہ ملازم ایک سال کے بعد چھوڑنا چاہتا ہے تو ملازم پر زبردستی کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس ملازم کو پانچ سال تک روکنے کی یہ تدبیر ہوسکتی ہے کہ اس ملازم کو پانچ سال کے لیے رکھلے مثلاً یہ کہے کہ ہم نے تم کو پانچ سال کے لیے رکھا اور پانچ سال کی تنخواہ اتنی ہے، آپ کی مرضی ہے چاہے تو پانچ سال کے بعد تنخواہ وصول کریں یا ماہانہ وصول کرتے رہیں، اس طرح عقدِ اجارہ طے کرنے سے ملازم وقت میعاد سے قبل بغیر شدید عذر کے ملازمت نہیں چھوڑ سکتا، وہ مالک کے پاس رہنے پر مجبور ہوگا، اور مدت سے پہلے چھوڑنے پر قانونی کاروائی کرنے کی اجازت ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاوی بزازیہ میں ہے:

لايجوز عقدها حتى يعلم البدل والمنفعة وبيان المنفعة بأحد ثلاث بيان الوقت وهو الأجل وبيان العمل والمكان. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/١١، كتاب الاجارات).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما في الأجير الخاص فلا يشترط بيان جنس المعمول فيه ونوعه وقدره وصفته وإنما يشترط بيان المدة فقط وبيان المدة في استئجار الظئر شرط جوازه بمنزلة استئجار العبد للخدمة لأن المعقود عليه هو الخدمة . (بدائع الصنائع:۴/۱۸۴،کتاب الاجارة،سعید).

تبیین الحقائق میں ہے:

والخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة... سمي أجيراً خاصاً وأجيروحد لأنه يختص به الواحد وهو المستاجر وليس له أن يعمل لغيره لأن منافعه في المدة صارت مستحقة له والأجرمقابل بها فيستحقه مالم يمنعه من العمل مانع . (تبیین الحقائق:۵/۱۳۷،ملتان).

عالمگیری میں ہے:

وأما في الأجير الخاص فلا يشترط بيان جنس المعمول فيه ونوعه وقدره وصفته وإنما يشترط بيان المدة فقط وبيان المدة في استئجار الظئر شرط الجواز بمنزلة استئجار العبد للخدمة (لأن المعقود عليه هو الخدمة) .(الفتاوی الهندية:۴/۴۱۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

دولہن سنوارنے کی اجرت کا حکم:

سوال: مسلمان شخص صورت کی تزیین اور شکل کی دلکشی بڑھانے کے میدانوں میں نوکری کرسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح دولہن سنوارنے کی اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے شکل وصورت کی خوبصورتی بڑھانے اور اس کو دلکش بنانے کی نوکری کرنا جائز اور درست ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتی ہے کہ جب مجھ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں رخصت کیا گیا تو میری والدہ نے مجھ کو چند عورتوں کے حوالے کیا انہوں نے میری شکل وصورت کو درست کیا اس کے بعد میری رخصتی ہوئی۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: تزوجني النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وأنا بنت

ست سنين فقدمنا المدينة فنزلنا في بنى الحارث بن الخزرج ... فأتتني أمي أم رومان ...ثم أخذت شيئاً من ماء فمسحت به وجهي ورأسي ثم أدخلتنى الدار فإذا نسوة من الأنصار فى البيت فقلن على الخير والبركة وعلى خير طائر فأسلمتني إليهن فأصلحن من شأني فلم يرعني إلا رسول الله صلى الله عليه وسلم ضحى فأسلمنني إليه وأنا يومئذٍ بنت تسع سنين.

(رواه البخارى:۱/۵۵۱،باب تزويج النبى صلى الله عليه وسلم عائشة وقدومه المدينة وبنائه بها).

شرح منظومہ ابن وہبان میں ہے:

تكميل: بذكر إجارة الماشطة لتزيين العروس : قال فى البزازية: استاجر ماشطة لتزيين العروس لا يحل لها الأجر لعدم صحة الإجارة إلا على وجه الهدية ، والصواب أنه إن ذكر العمل والمدة يجوز ، وألحقت ذلك في بيت فقلت: ؎

وما حل أجر للمواشط أو نعم ☆ إذا عمل والوقت يذكر حرروا

(شرح منظومة ابن وهبان:۲/۷۸،فصل من كتاب الاجارة).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

ولو استاجرمشاطة لتزيين العروس قالوا : لا يطيب لها الأجر إلا أن يكون على وجه الهدية بغيرشرط ولا تقاض ، قال مولانارحمه الله تعالىٰ: وينبغي أن الإجارة إذا كانت مؤقتة وكان العمل معلوماً ولم تنقش التمثال والصور جازت الإجارة ويطيب لها الأجر لأن تزيين العروس مباح. (فتاوىٰ قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية:۲/۳۲٤،باب الاجارة الفاسدة).

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

و تصح إجارة الماشطة لتزيين العروس بشرط أن يذكر العمل أو مدته فى العقد .

(الفقه على المذاهب الاربعة:۳/۹۸، مبحث ماتجوز اجارته ومالاتجوز).

وفى الدرالمختار: وجاز إجارة الماشطة لتزيين العروس إن ذكر العمل والمدة ، بزازية. وفى الشامية: قوله والمدة ، عبر فى الذخيرة وغيرها بأو فالواو هنا بمعناها. (الدر المختارمع ردالمحتار:٦/٦٣،باب الاجارة الفاسدة ، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

ایجنٹ کے کام نہ کرنے پر رقم واپس کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے یہاں ملاوی میں ایک شخص مثلاً زید نے عمر کو پانچ لاکھ روپے کاغذات بنانے کی غرض سے دیئے، عمر نے پیسے آفیسر کو کاغذات بنانے کے لیے دیئے، آفیسر نے پیسے لے لیے مگر کوئی کام نہیں کیا، اب سوال یہ ہے کہ کیا عمر پر لازم ہے کہ زید کے پیسے واپس کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر زید نے عمر کو رقم دی کہ عمر اس کا کام کرادیگا اور کام کی ذمہ داری قبول کی جیسے عام طور پر ہوتا ہے تو کام نہ ہونے کی صورت میں عمر پر رقم کی واپسی کی ذمہ داری آتی ہے۔

مثلاً اگر کسی کو روٹیاں پکانے کے لیے اجرت پر لیا اور روٹیاں تنور سے نکالنے سے پہلے جل گئیں تو اس پر تاوان آئیگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولو احترق (أي الخبز) قبله (قبل إخراجه) لا أجر له ويغرم اتفاقاً لتقصيره، درر وبحر. وفي الشامية: قوله لتقصيره أي بعدم القلع من التنور. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۱۶/۶، سعید).

اسی طرح اگر کسی نے کھانا پکانے والے کو مقرر کیا کہ ہمارے لیے کھانا پکاؤ اور اس نے کھانا جلا دیا، یا ٹھیک نہیں پکایا تو اس پر تاوان آئیگا۔

قال في الدرالمختار: فإن أفسد أي الطعام الطباخ أو أحرقه أو لم ينضجه فهو ضامن للطعام. (الدرالمختار: ۱۷/۶، سعید).

نیز اگر کسی نے دودھ پلانے والی کو بچہ کو دودھ پلانے کے لیے کرایہ مقرر کیا اور مرضعہ نے بکری کا دودھ پلایا تو اجرت کی مستحق نہیں ہوگی۔

وقال في الهداية: وإن أرضعته في المدة بلبن شاة فلا أجر لها، لأنها لم تأت بعمل مستحق عليها، وهو الإرضاع فإن هذا إيجار وليس بإرضاع. (الهداية: ۳۰۵/۳).

لیکن اگر عمر نے یہ کہا ہو کہ کام کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، صرف بطورِ وکیل آپ کی رقم آفیسر تک پہنچاؤں گا تو پھر عمر پر ذمہ داری نہیں ہے۔

قال في البدائع: ومنها أي من حقوق التوكيل وأحكامها، أن المقبوض في يد الوكيل

بجهة التوكيل بالبيع والشراء وقبض الدين والعين وقضاء الدين أمانة بمنزلة الوديعة. (بدائع الصنائع: ٦/ ٣٤، كتاب الوكالة، سعيد).

اور اگر کسی قسم کی صراحت نہ کی ہو تو پھر عرف کو دیکھا جائیگا اور عرف میں اتنی بڑی رقم کام کی ذمہ داری پر ہی دی جاتی ہے اس لیے عمر ذمہ دار ہوگا۔ہاں اگر عمر واقعی مجبور ہے تو زید اس کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرلے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

دکان چھوڑنے سے قبل اطلاع کرنے کی شرط کا حکم:

سوال: ایک شخص نے زید سے دکان فی ماہ ۲۰۰۰ رینڈ کرایہ پر لی، مالک دکان نے معاہدہ میں یہ لکھا کہ دکان چھوڑنے سے تین ماہ پہلے اطلاع دینا ضروری ہے، بصورتِ دیگر تین ماہ کا کرایہ مزید دینا ضروری ہوگا، کیا ایسی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ مالی جرمانہ کے قبیل سے ہے، جن علماء کے نزدیک مالی جرمانہ لگانا جائز ہے وہ اس صورت کو جائز کہتے ہیں، اور جو حضرات مالی جرمانہ کو درست نہیں سمجھتے ان کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں۔ مالی جرمانہ کی تفصیل فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلد چہارم میں گزر چکی ہے۔

نیز اگر کسی ملازم پر شرط لگائی گئی کہ آپ ملازمت چھوڑنے سے تین ماہ پہلے بتلادیں گے، بصورتِ دیگر آپ تین ماہ کی تنخواہ کمپنی کو دیں گے، اس کا بھی وہی جواب ہے جو ماقبل میں مذکور ہوا۔

اسی طرح اگر حکومت کی طرف سے ملازم کے حق میں یہ قانون ہو کہ مالک اس کو تین ماہ پہلے اطلاع کے بغیر ملازمت سے نہیں نکال سکتا، ورنہ ملازم حکومت سے نالہ کر کے تین ماہ کی مزید تنخواہ وصول کرواسکتا ہے، اس کا بھی وہی حکم ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

کرایہ کی زمین کی مال گزاری کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے زمین اجارہ پر لی فی کنال (بیگھے کا چوتھا حصہ) سالانہ کرایہ پانچ سو روپے ہے اس زمین کا مالیہ یا مال گزاری کس پر ہے مالک پر ہے یا کرایہ دار پر؟

الجواب: معاہدہ میں جو بات بھی طے پائے وہ درست ہے مالک پر لگانا یا کرایہ دار پر دونوں میں سے جس پر بھی لگائے درست ہے اور اگر کسی پر لگانے کا ذکر نہ ہو تو پھر عرف وعادت میں جس پر لگانا معروف ہو اس

پر لگا دیا جائے تو درست ہوگا، ہاں مزارعت میں مال گزاری مالک پر لگائی جائے گی۔ (ملاحظہ ہو فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۸۰).
واللہ ﷻ اعلم۔

مضبوط آدمی کو معلوم کام کے لیے اجرت پر لینا:

سوال: زید کا ایک مکان ہے جو مدت دراز سے عمر کے پاس کرایہ پر چل رہا ہے، عمر اس کا کرایہ ادا کرتا ہے، معاہدہ کی مدت ختم ہونے کے بعد زید عمر کو اس مکان سے بے دخل کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ زید کو خود اس مکان کی ضرورت ہے، عمر نکلنے کے لیے تیار نہیں، کیا زید ایک مضبوط آدمی کو اجرت مقررہ دیکر عمر کو نکال سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: مدت پوری ہونے کے بعد عمر کا زبردستی رہنا ظلم ہے، اس لیے کسی مضبوط آدمی کو اجرت دیکر عمر کو بے دخل کرنا درست ہے، کسی خاص جائز معلوم کام پر کسی کو اجیر رکھنا شرعاً جائز ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کرایہ دار سے ڈپازٹ لینے کا حکم:

سوال: ڈپازٹ رکھوانا درست ہے یا نہیں؟ مثلاً کوئی شخص گھر کرایہ پر چاہتا ہے تو مالکِ مکان یہ کہتا ہے کہ تم میرے پاس پچاس ہزار رینڈ ڈپازٹ رکھو تو کرایہ پر مکان دوں گا، اب کیا کرنا چاہئے؟ نیز یہ ڈپازٹ کی رقم قرض ہے یا رہن؟ پھر اس میں دو شکلیں ہیں کبھی اس کی وجہ سے کرایہ کم ہوتا ہے اور کبھی نہیں، مثلاً کرایہ تین ہزار ہیں تو ڈپازٹ کی وجہ سے دو ہزار۔ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر ڈپازٹ کی رقم کے استعمال کی اجازت نہ ہو تو یہ رہن ہے اور اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر کرایہ دار کسی چیز یا مکان کو خراب کردے یا کرایہ ادا نہ کرے تو اس مرہون سے منہا کیا جائیگا، اور اگر استعمال کی اجازت ہو تو قرض ہے لیکن اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی سود کے زمرہ میں آئیگی جو ناجائز ہوگی۔

ملاحظہ ہو علامہ حصکفیؒ رہن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هو حبس شيء مالي أي جعل الشيء محبوساً لأن الحابس هو المرتهن بحق يمكن استيفاؤه أي أخذه منه. (الدر المختار: /، كتاب الرهن، كوئته).

درر الحکام میں ہے:

هو حبس المال بحق يمكن أخذه أي الحق منه أي من المال .

جدید فقہی مسائل میں ہے:

ڈپازٹ اور ضمانت کے طور پر دی گئی رقم کا مسئلہ قابل غور ہے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے ...کہ یہ ایک طرح کا رہن ہے۔(جدید فقہی مسائل:۱/۲۱۷).

پھر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ اس طرح زرضمانت کی رقم حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں اور اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے۔(جدید فقہی مسائل:۴/۱۳۰۔۱۰/۲۱۷).

مزید ملاحظہ ہو: (ایضاح النوادر:۲/۲۰۔وجدید فقہی مباحث:۷/۳۴۳۔وآپ کے مسائل اوران کا حل:۶/۱۴۰۔محمود الفتاویٰ:۳/۹۰).

قرض کی صورت میں کرایہ میں کمی کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

و قال عليه الصلاة والسلام كل قرض جر منفعة فهو رباً . إسناده ضعيف مرفوعاً لاموقوفاً . (اتحاف الخيرة المهرة:۳/ ۳۹۰۔ و رواه الحاكم والبيهقي في سننه الكبرى). **واللہ ﷻ اعلم۔**

اسٹاک ایکسچینج میں بروکری کا حکم:

سوال: اسٹاک ایکسچینج میں بحیثیتِ دلال کام کرنا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: اسٹاک ایکسچینج کا مدار ان معاملات پر ہے جن کو ایک دلال انجام دیتا ہے، چنانچہ ایک بروکر بحیثیت دلال شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق کاروبار میں شیئرز بیچنے والوں اور خریدارِ حصص کے درمیان پانچ طرح سے رابطے کا کام دیتا ہے:

(۱) حاضر سودا۔ یہ خرید وفروخت کی دلالی کا عام اور سادہ طریقہ ہے کہ دلال اپنے تعلقات اور معلومات کی بناپر کسی شخص سے شیئرز کی قیمت وصول کر کے یا اس وصولی کے لیے آئندہ کوئی تاریخ معین کر کے اس کے لیے کسی شیئرز ہولڈر سے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کرتا ہے اور اس دلالی پر اس شخص سے متعین معاوضہ (کمیشن) وصول کرتا ہے۔

(۲) بعض اوقات خریدار کے پاس رقم نہیں ہوتی تو دلال کمیشن کے حصول کے لیے اس کی طرف سے شیئرز کی قیمت کا کل یا بعض حصہ ادا کر کے اس کے لیے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کر دیتا ہے، پھر کچھ دنوں تو

خریدار کو قیمت کی ادائیگی کی مہلت بلا سود ہوتی ہے، اس کے بعد دلال اس سے سود وصول کرتا ہے، اسے اصطلاح میں (Sale on Margin) کہتے ہیں۔

(۳) دلال خریدار کو کمیشن کے لالچ میں غیر مملوک شیئرز بھی فروخت کرتا ہے، محض اس توقع یا یقین پر کہ بعد میں خرید لوں گا۔ جسے شارٹ سیل کہتے ہیں۔

(۴) دلال اور خریدار کے درمیان خرید وفروخت سے متعلق معاملے کی نسبت مستقبل کی طرف ہوتی ہے، جسے فارورڈ سیل کہتے ہیں۔

(۵) دلال سٹہ کا معاملہ کرتا ہے۔ اصطلاح میں فیوچر سیل کہتے ہیں، جس کی وضاحت پیچھے گزر چکی ہے۔ ان تمام صورتوں میں سے صرف پہلی صورت جائز ہے، بقیہ چاروں صورتیں بیع فاسد، جوا (سٹہ) یا سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

لہذا اسٹاک ایکسچینج میں اگر کوئی بروکر کی حیثیت سے کام کر کے خود کو ان معاملات کا مرتکب ہونے سے بچا سکتا ہے جو ناجائز اور حرام ہیں تو اس کے لیے اس ادارے میں ملازمت جائز ہے اور اگر ممکن نہیں تو حصص کی دلالی کا کام نہ کرے اور خود کو حرام میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

جدید فقہی مباحث میں ہے:

اسٹاک ایکسچینج بازار میں خرید وفروخت کے لیے واسطہ بننے والوں کو بروکر کہتے ہیں جو دورِ حاضر میں شیئرز کی خرید وفروخت اور قیمتوں سے واقفیت رکھتا ہے، اور خرید وفروخت کی کاروائی کا اندراج کرتا ہے، تو ایسے شخص کی حیثیت ایجنٹ اور اجیر مشترک کی ہے، دوسرے لفظوں میں بروکر ہی کو دلال کہا جاتا ہے، اگر ایسے لوگ حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے ایجنٹ اور بروکر کی حیثیت سے کام کریں تو یہ شرعاً جائز ہے، اور ان کی اجرت شرعاً حلال ہوگی۔ (جدید فقہی مباحث:۱۶/۱۲۶).

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص۱۱۰۔۱۱۲۔ جدید فقہی مباحث :ج۱۶۔ جدید معاملات کے شرعی احکام:۱/۱۰۸۔ وفتاویٰ عثمانی:۳/۱۸۵۔۱۸۹). واللہ ﷻ اعلم۔

علومِ شرعیہ اور طاعات پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: ہمارے ہاں پاکستان میں ایک جماعت پائی جاتی ہے جو یہ اعتقاد رکھتی ہے اور لوگوں میں اس

کو پھیلاتی ہے کہ قرآن حدیث کی تعلیم اور دیگر علومِ شرعیہ کی تعلیم پر اجرت لینا حرام اور ناجائز ہے، اور استدلال میں درجِ آیتِ کریمہ اور حدیث شریف پیش کرتی ہے:

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ولاتشتروا بآياتي ثمناً قليلاً﴾ (سورة المائدة:٤٤).

وعن عبادة بن الصامت ﷺ قال: علمت ناساً من أهل الصفة الكتابة والقرآن فأهدى إليّ رجل منهم قوساً فقلت: ليس بمال وأرمي بها في سبيل الله فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عنها فقال: إن سرك أن تطوق بها طوقاً من نار فاقبلها".

اور بھی دلائل پیش کرتے ہیں لیکن عمدہ اور مضبوط یہ دو نصوصِ مذکورہ بالا ہیں، پس آپ برائے مہربانی طاعات پر اجرت لینے کے بارے میں حکم شرعی سے مطلع فرما کر ان کے دلائل کا جواب بھی عنایت فرمائیں؟ نیز حدیثِ قوس کی فنی حیثیت بیان کریں؟ بینوا بالتفصیل توجروا بأجر جزيل۔

الجواب: مذہبِ احناف میں ائمہ ثلاثہ کا اصل مذہب یہ ہے کہ طاعات پر اجرت لینا ناجائز ہے، اس قول کو اکثر اربابِ متون نے اختیار فرمایا ہے۔ لیکن متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے جواز پر فتویٰ دیا ہے، بیت المال سے معلمین کے عطایا منقطع ہونے کی بنا پر۔ لہٰذا فی زماننا فتویٰ تعلیم وغیرہ کی اجرت لینے کے جواز پر ہے۔

مزید براں متاخرین فقہاء نے یہ فرمایا کہ امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے عدمِ جواز کے فتوے کی بنیاد تقویٰ پر ہے، یا سدِ باب پر ہے، تاکہ قرآن ذریعہ کسبِ معاش اور پیشہ نہ بن جائے۔

علومِ شرعیہ اور طاعات پر اجرت لینے کے دلائل کثیر تعداد میں موجود ہیں، بطورِ ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہم چند ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

(۱) قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن﴾ (سورة الطلاق:٦).

والإرضاع من الطاعات، ومع هذا أمر اللّٰہ تعالیٰ بأداء أجرته إلى المرضع.

(۲) روى ابن أبي شيبة في "المصنف" (١١/٢٧/٢١٢٢٨)، والبيهقي في "السنن الكبرى" (١٢٤/٦) عن الوضين بن عطاء، قال: كان بالمدينة ثلاثة معلمين يعلمون الصبيان، فكان عمربن الخطاب ﷺ يرزق كل واحد منهم خمسة عشر كل شهر.

(۳) روى ابن سلام (١٧٣)، والمنذري في "الأوسط" (٦٥٣٤)، والبيهقي في "السنن الكبرى" (١٣٦/٩) بإسناد صحيح: أن عمربن الخطاب ﷺ بعث عماربن ياسر ﷺ

إلى أهل الكوفة على صلاتهم وجيوشهم، وعبد الله بن مسعود رضي الله عنه على قضائهم وبيت مالهم وعثمان بن حنيف رضي الله عنه على مساحة الأرض، ثم فرض لهم في كل يوم شاة بينهم، قال: أو قال: جعل لهم في كل يوم شاة: شطرها وسواقطها لعمار رضي الله عنه، والشطر الآخر بين هذين.

(۴) وروى ابن سلام (٦٤٥) أن عمر بن عبد العزيزؒ بعث يزيد بن أبي مالك الدمشقيؒ، والحارث بن يمجد الأشعريؒ، يفقهان الناس في البدو، وأجرى عليهما رزقاً، فأما يزيد فقبل، وأما الحارث فأبى أن يقبل، فكتب إلى عمر بن عبد العزيزؒ بذلك، فكتب عمرؒ: إنا لانعلم بما صنع يزيد بأساً، وأكثر الله علينا مثل الحارث بن يمجد .

(۵) روى أحمد (٢٢١٦)، والحاكم (١٤١/٢)، والبيهقي في "السنن الكبرى" (١٢٤/٦) عن ابن عباس رضي الله عنه قال: كان ناس من الأسرى يوم بدر لم يكن لهم فداء، فجعل رسول الله صلى الله عليه وسلم فداء هم أن يعلموا أولاد الأنصار الكتابة .

(۶) روى البخاري (٥٧٣٦) عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه أن ناساً من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم أتوا على حي من أحياء العرب فلم يقروهم، فبينماهم كذلك إذ لدغ سيد أولئك، فقالوا: هل معكم من دواء أو راقٍ؟ فقالوا: إنكم لم تقرونا ولانفعل حتى تجعلوا لنا جعلاً، فجعلوا لهم قطيعاً من الشاء ، فجعل يقرأ بأم القرآن ويجمع بزاقه ويتفل، فبرأ، فأتوا بالشاء، فقالوا: لا نأخذه حتى نسأل النبي صلى الله عليه وسلم، فسألوه ، فضحك وقال:" وماأدراك أنها رقية، خذوها واضربوا لي بسهم".

لكن هذا الحديث فى الرقية دون التعليم، والرقية من قبيل العلاج يجوز أخذ الأجرة بها.

(۷) وفي رواية أخرى عن ابن عباس رضي الله عنه:...قالوا: يارسول الله آخذ على كتاب الله أجراً فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إن أحق ما أخذتم عليه أجراً كتاب الله".

(صحيح البخارى:٥٧٣٧).

(۸) روى ابن عدى فى "الكامل" (١٥٢/٥) عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كسب المعلمين، فقال: " إن أحق ما أخذ عليه الأجر لكتاب الله تعالىٰ". وقال:"هوحديث منكر".

(۹) روى أحمد (۲۱۸۳٦)، وأبوداود (۳۹۰۳)، والنسائي في "الكبرى" (۱۰۸۰٤)، والبيهقي في "الشعب" (۲۱۵۰)، وغيرهم عن خارجة بن الصلت عن عمه أنه مر بقوم فأتوه فقالوا: إنک جئت من عند هذا الرجل بخير، فأرق لنا هذا الرجل، فأتوه برجل معتوه في القيود فرقاهم بأم القرآن ثلاثة أيام غدوة وعشية كلما ختمها جمع بزاقه ثم تفل، فكأنما أنشط من عقال، فأعطوه شيئاً، فأتى النبي صلى الله عليه وسلم فذكره له، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "كل لعمرى من أكل برقية باطل، لقد أكلت برقية حق".

(۱۰) في "صحيح البخاري": "باب رزق الحكام والعاملين عليها، وكان شريح القاضي يأخذ على القضاء أجراً. وقالت عائشة رضي الله تعالىٰ عنها: يأكل الوصي بقدر عمالته. وأكل أبوبكر رضي الله عنه وعمر رضي الله عنه".

(۱۱) روى عبدالرزاق في "المصنف" (۱۵۲۸۲) عن الحكم: أن عمر بن الخطاب رضي الله عنه رزق شريحاً وسلمان بن ربيعة الباهلي على القضاء.

(۱۲) روى ابن أبي شيبة في "المصنف" (۲۲۲۲۸)، وابن المنذر في "الأوسط" (٦۵۳۳) عن نافع قال: كان يزيد بن ثابت يأخذ على القضاء أجراً.

(۱۳) روى ابن أبي شيبة في "المصنف" (۲۲۲۳۳) عن ابن أبي ليلىٰ قال: بلغنى أن علياً رضي الله عنه رزق شريحاً خمس مئة.

(۱۴) روى ابن سعد في "الطبقات الكبرى" (۳/۱۸٤) بإسناد صحيح عن ميمون الجزري قال: لما استخلف أبوبكر رضي الله عنه جعلوا له ألفين، فقال: زيدوني فإن لي عيالاً وقد شغلتموني عن التجارة، قال: فزادوه خمس مئة، قال: إما أن تكون ألفين فزادوه خمس مئة، أو كانت ألفين وخمس مئة فزادوه خمس مئة.

والتعليم يشبه بالخلافة والقضاء من حيث كونه عبادة نفعها متعدٍ.

(۱۵) روى مسلم (۲٤۰۵) عن عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه قال: إني عملت على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فعملني، وفي الحديث قصة.

والتعليم كعمل العامل في كونهما عبادة نافعة للغير.

(۱۶) روی أبوداود (۲۸۷۴) عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أن رجلاً أتی النبي صلی الله علیه وسلم فقال: إني فقیر لیس لي شيء ولي یتیم، قال: فقال:"کل من مال یتیمک غیرمسرف ولا مبادر ولا متأثل".

وخدمة الیتیم کالتعلیم في تعدی النفع وعدم وجوبها علی العین .

وفي أکل الوصي من مال الیتیم بالمعروف أحادیث وآثار ذکرها المفسرون في تفسیر الآیة: ﴿ومن کان فقیراً فلیأکل بالمعروف﴾ (سورة النساء:٦).

(۱۷) روی أبوداود (۲۹٤۷) عن المستورد بن شداد قال: سمعت النبي صلی الله علیه وسلم یقول:"من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجة، فإن لم یکن خادم فلیکتسب خادماً، فإن لم یکن له مسکن فلیکتسب مسکناً".

أی یجوز للوالي أن یأخذ من بیت المال قدر کفایته من النفقة والکسوة لنفسه، ولمن یلزمه نفقته، ویتخذ لنفسه منه مسکناً وخادماً.

(۱۸) روی الخطیب فی "التاریخ " (۸۱/۲) بإسناده عن الحسن البصري أن عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ وعثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کانا یرزقان المؤذنین والأئمة والمعلمین والقضاة .

(۱۹) روی البیهقي في "معرفة السنن والآثار"(٤٣٠٣/٣٨٢/٥) بإسناده عن إبراهیم بن سعد عن أبیه: أن عمررضي الله تعالیٰ عنه کتب إلی بعض عماله: أن أعط الناس علی تعلیم القرآن، فکتب إلیه إنک کتبت إليّ أن أعط الناس علی تعلیم القرآن فتعلمه من لیس فیه رغبة إلا فی الجعل، فکتب إلیه أن أعطهم علی المروءة والصحابة .

وللاستزادة انظر : (تکملة عمدة الرعایة حاشیة شرح الوقایة :۳۰۱/۳، رقم الحاشیة: ٦۔).

عدمِ جواز کے دلائل کا جائزہ:

(۱) آیتِ کریمہ: ﴿ولاتشتروا بآیاتي ثمناً قلیلاً﴾ کا جواب:

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے: " لا تأخذوا علی تحریف آیاتي مالاً من الناس"۔یعنی آیات کی تحریف کر کے اس پر لوگوں سے مال طلب مت کرو،اس میں تعلیمِ آیات پر اجرت لینے کے بارے میں ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے۔اوراس کی دلیل دوسری آیتِ کریمہ ہے: ﴿ فویل للذین یکتبون الکتٰب

بأيديهم ثم يقولون هذا من عند الله ليشتروا به ثمناً قليلاً ﴾ (البقرة:۷۹).

(۲) قال الله تعالیٰ: ﴿ إن كثيراً من الأحبار والرهبان ليأكلوا أموال الناس بالبٰطل ويصدون عن سبيل الله ﴾ (سورة التوبة:۳٤).

الجواب: اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ربا لینے پر ان کی مذمت فرمائی ہے نہ کہ تعلیم پر اجرت لینے کی، اوران کے اس فعل کی مذمت اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت ساری جگہ پر بیان فرمائی ہے جو مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔

(۳) حدیث شریف: "علمت ناساً من أهل الصفة الكتابة والقرآن فأهدى إليّ رجل منهم قوساً" کی تحقیق:

حدیثِ مذکورہ بالا تین صحابہ سے مروی ہے: (۱) حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ، (۲) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، (۳) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔

أما حديث عبادة بن الصامت رضي الله عنه: فأخرجه أحمد (۲۲٦۸۹)، وابن أبي شيبة (۲۱۲۳۷)، وأبوداود (۳٤۱٦)، وابن ماجه (۲۱۵۷)، والبيهقي في "السنن الكبرى" (۱۲۵/٦)، والحاكم (٤۱/۲) من طريق مغيرة بن زياد الموصلي، عن عبادة بن نسي، عن الأسود بن ثعلبة، عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه قال: علمت ناساً من أهل الصفة القرآن والكتابة، فأهدى إلي رجل منهم قوساً، فقلت: ليست بمال، وأرمي عنها في سبيل الله، فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عنها، فقال: "إن سرك أن تطوق بها طوقاً من نار فاقبلها".

قال الحاكم: "صحيح الإسناد" لكن تعقبه الذهبي بقوله: "مغيرة صالح الحديث وقد تركه ابن حبان".

قلت: إسناده ضعيف، الأسود بن ثعلبة مجهول، مغيرة بن زياد فيه كلام، وقد خالفه بشر بن عبد الله السلمي ـ وهو حسن الحديث ـ فرواه عن عبادة بن نسي، عن جنادة بن أبي أمية، عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه.

أخرجه أحمد (۲۲۷٦٦)، وأبوداود (۳٤۱۷)، والحاكم (۳۵٦/۳)، وقال: صحيح

الإسناد"، ووافقه الذهبي، وصححه أيضاً أحمد شاكر في تعليقاته على "مسند الإمام أحمد" (٢٢٦٦٥).

قلت: إسناده حسن؛ فإن رجاله كلهم ثقات معروفون غير بشرهذا ، وقد روى عنه جماعة ووثقه ابن حبان، وابن عساكر كما في تعليقات الشيخ أحمد شاكر على "مسند الإمام أحمد". وقال الحافظ فيه : صدوق".

وأما حديث أبى الدرداء : فأخرجه البيهقي فى "السنن الكبرى" (١٢٦/٦) من طريق عثمان بن سعيد الدارمي، عن عبدالرحمن بن يحيى بن إسماعيل بن عبيدالله: حدثنا الوليد بن مسلم حدثنا سعيد بن عبد العزيز، عن إسماعيل بن عبيد الله، عن أم الدرداء، عن أبى الدرداء أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من أخذ قوساً على تعليم القرآن قلده الله قوساً من نار".

قال التركماني: إسناده جيد .

وقال الحافظ فى "التخليص الحبير" (١٤/٤): "رواه الدارمي ـ يعني عثمان بن سعيد الدارمي، لا الدارمى المشهور صاحب السنن ـ بسند على شرط مسلم من حديث أبى الدرداء ، لكن شيخه عبد الرحمن بن يحيى بن إسماعيل لم يخرج له مسلم، وقال فيه أبوحاتم: ما به باس".

وأما حديث أبي بن كعب ﷺ:فأخرجه ابن ماجه (١٢٥٨)، والبيهقي فى "السنن الكبرى" (١٢٥/٦ـ ١٢٦) من طريق ثور بن يزيد: حدثنا خالد ابن معدان ـ وأسقط البيهقي منه خالد بن معدان ـ حدثني عبد الرحمن، عن عطية الكلاعي، عن أبي بن كعب ﷺ قال: علمت رجلاً القرآن فأهدى إليّ قوساً فذكرت ذلک لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقال:" إن أخذتها أخذت قوساً من نار" فرددتها.

قلت: إسناده ضعيف، وفيه ثلاث علل :

الأولىٰ: الانقطاع بين عطية وأبي بن كعب ﷺ؛قال العلاء فى "المراسيل": "عطية بن قيس عن أبي بن كعب ﷺ مرسل". ذكره البوصيري فى "الزوائد" (١٧/٣). وقال البيهقي

فی "السنن الکبری"(۱۲۵/٦):"منقطع".

الثانية:جهالة عبدالرحمن بن سلم ؛ قال الحافظ فی "التقريب ":"مجهول".

الثالثة : الاضطراب؛ قال الذهبي فی "الميزان (٥٦٧/٢) في حديثه هذا:" إسناده مضطرب". وقال المزي في" تهذيب الكمال"(١٤٨/١٧):" في إسناد حديثه اختلاف كثير". وأقره الحافظ فی "التهذيب"(١٧٠/٦) .

ولحديث أبيﷺ طرق أخرى ذكرها الشيخ شعيب الأرنؤوط في تعليقاته على" سنن ابن ماجه" (٢٨٧/٣-٢٨٨) فراجعها إن شئت.

والجواب عن حديث عبادة بن الصامتؓ:

(أ) هذا الحديث منسوخ بقول النبي صلى اللّٰه عليه وسلم:" إن أحق ما أخذتم عليه أجراً كتاب اللّٰه". (صحیح البخاری:٥٧٣٧).

وللاستزادة انظر : (معرفة السنن والآثار للامام البیہقیؒ:٣٨١/٥-٣٨٢،دارالکتب العلمية بيروت).

وهذا وارد في مثل الرقية وكذلك التعليم، دون القراء ة لإيصال الثواب.

والأحسن أن يقال: إن الناسخ هو: "تهادوا تحابوا " (أبويعلی: ٦١٤٨، بإسنادحسن) وكان النبي صلى اللّٰه عليه وسلم يقبل الهدية ويثيب عليها. (صحیح البخاری:٢٥٨٥).

وأخرج ابن حبان في صحيحه (١٦٨٠/٥٧٤/٤) عن أبي محذورة...أنه قال: فلما فرغ من التأذين دعاني وفأعطاني صرة فيها شيء من فضة... الخ .

قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده صحيح على شرطهما.

(ب) إذا لم تبلغ الرواية درجة الصحة وكانت مخالفة لأصول الدين فلا يعمل بها، وهذه الرواية كذلک؛ فإن المذكور فيها أن أحداً من أصحاب الصفة أهدى إلى عبادة بن الصامت ؓ شيئاً، وليس فيه أنه دفع الأجرة. والأصل أن الهدية لا بأس به بالاتفاق، لكن هذا الحديث ينهى عن ذلک أشد النهي .

(ج) لعل منعه صلى اللّٰه عليه وسلم عبادة بن الصامت ؓ عن قبول الهدية كان لأجل فقر المهدي وكونه مضطراً، فنبه النبي صلى اللّٰه عليه وسلم على أنه ينبغي أن يهدى إليه، لا

أن يؤخذ منه شيء .

(د) ليس في الرواية ذكر الأجرة قطعاً فلا يصح الاستدلال بها على عدم جواز أخذ الأجرة على الطاعات .

وللاستزادة انظر : (نصب الراية لأحاديث الهداية للامام جمال الدين الزيلعيؒ:٤/١٣٦ـ١٣٨،باب الاجارة الفاسدة،بيروت).

(۴) عن عثمان بن أبي العاص ﷺ قال :إن من آخر ما عهد إليّ رسول الله صلى الله عليه وسلم أن اتخذ مؤذناً لايأخذ على أذانه أجراً. (أخرجه أصحاب السنن الأربعة وحسنه الترمذي، وأخرجه الحاكم وصححه، والبيهقي في "السنن الكبرى"(١/٤٢٩)وأحمد في "مسنده"(١٦٢٧٠) والخزيمة في "صحيحه" (٤٢٣).

تمسك به من منع الاستئجار على الأذان ولادليل فيه لجواز أنه صلى الله عليه وسلم أمره بذلك أخذاً للأفضل كذا قاله الطيبي .(التعليق الصبيح :١/٢٩٩،لمولاناادريس الكاندهلوي).

وقال الشيخ الغورغشتوي في تعليقاته على مشكاة المصابيح(٦٩): هذا محمول على الاستحباب .

وقال الإمام الترمذيؒ : استحبوا للمؤذن أن يحتسب في أذانه. (جامع الترمذي :١/٥١).

(۵) ذكر ابن الجوزيؒ: من رواية ابن عباس ﷺ مرفوعاً:" لاتستأجروا المعلمين" وفي إسناده أحمد بن عبد الله الهروي، قال: وهو دجال يضع الحديث، وهذا من صنعه، ووافقه صاحب "التنقيح" على ذلك، والله أعلم. (نصب الراية لاحاديث الهداية:٤/١٣٨،باب الاجارة الفاسدة). واللہ ﷻ اعلم۔

عینِ مستاجرہ مشترکہ کے کرایہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی ٹیکسی دو آدمیوں نے خریدی اور ایک غائب ہوگیا اور حاضر نے ٹیکسی کی پوری رقم ادا کی غائب تین ماہ کے بعد واپس آیا اور نصف قیمت ادا کردی ۔اب غائب تین ماہ کی کمائی میں شریک ہے

یا نہیں؟ اور اگر حاضر نے اس کو چلایا تو تین ماہ کی تنخواہ شریک کے حصے سے وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: جب مشتری حاضر نے غائب کی طرف سے بطورِ وکالت قیمت ادا کر دی تو مبیع میں دونوں شریک ہوگئے، اور جب مبیع میں شریک ہوئے تو اس کے منافع میں بھی شریک ہوں گے۔ لہذا غائب تین ماہ کی کمائی میں شریک ہوگا۔ لیکن چونکہ شریک موجود نہیں اور اس کا وکیل بھی نہیں لہذا اس کے حصے کی تنخواہ وصول نہیں کر سکتا، کیونکہ عقد اجارہ میں جانبین کی رضامندی اور عقد کا پایا جانا ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے ہاں شریک کو چاہئے کہ چلانے والے کو اس کی محنت کا کچھ صلہ دیدے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ولو غاب أحد المشتريين فللحاضر دفع كل الثمن وقبضه وحبسه حتى ينقد شريكه...فصار كمعير الرهن وصاحب العلو والوكيل بالشراء إذا أدى الثمن من ماله.

(البحر الرائق:٦/١٧٥، كوئته).

دوسری جگہ مذکور ہے:

وكل واحد منهما قائم مقام صاحبه في التصرف فكان شراء أحدهما كشرائهما ...

(البحر الرائق:٥/١٧٠، كوئته).

قال في الهداية: الإجارة عقد يرد على المنافع بعوض. (الهداية:٣/٢٩٣، كتاب الاجارات).

وفي الفتاوى الهندية: أما تفسيرها شرعاً فهي عقد على المنافع بعوض. (الفتاوى الهندية:٤/٤٠٩).

احسن الفتاویٰ میں ایک تفصیلی سوال کے جواب میں مذکور ہے:

زید نے اپنے والد سے اجرت پر کام کرنا طے نہیں کیا تھا اس لیے اس کام کرنا تبرع ہے...البتہ والد کو چاہئے کہ زید کی محنت کے پیش نظر اس کی مناسب مدد کر دے۔ (احسن الفتاویٰ:٦/٣١٩)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بلا عقد کرایہ طلب کرنے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کی زمین پڑوسی ہونے اور بے تکلفی ہونے کے سبب مدتِ دراز تک استعمال کی عمر نے اس پر کوئی نکیر بھی نہیں کی اور نہ کوئی کرایہ کا معاملہ ہوا پھر عمر کے انتقال کے بعد بھی زید استعمال کرتا رہا لیکن کسی

نے کوئی اشکال ظاہر نہیں کیا اور نہ طلب کی، اب حال میں عمر کے بعض ورثاء نے کہا کہ یہ زمین بلا اجازت استعمال کی گئی لہذا گزشتہ سالوں کا کرایہ ادا کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا زید پر گزشتہ سالوں کا کرایہ ادا کرنا لازم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: زید نے عمر کی زمین بطورِ عاریت استعمال کی اور یہ عرفی اجازت تھی، اور فی الحال بعض ورثاء کا کرایہ طلب کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ بلا اجازت استعمال کی گئی ہے یہ بلا دلیل ہے۔ ولایثبت الحکم بہ یعنی اس بلا دلیل دعویٰ کا کوئی اعتبار نہیں۔

مزید براں کوئی عقدِ اجارہ نہیں ہوا تھا بنا بریں کرایہ کا مطالبہ بھی درست نہیں، اس لیے کہ کرایہ کی ادائیگی عقدِ اجارہ کا نتیجہ وثمرہ ہے اور یہاں عقدِ اجارہ ہوا ہی نہیں۔

دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

شرحِ مجلّہ میں ہے:

المادة : لايجوز لأحد أن يتصرف في مال الغير إلا باذنه...ثم الإذن قديكون صريحاً ... وقد يكون دلالةً... (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسي: ۱/ ۲۶۲، رشيديه).

وفي المحيط البرهاني: في عارية الواقعات : رجل أراد أن يستمد عن محبرة غيره فهذا على ثلاثة أوجة : الأول : أن يستاذنه وفي هذا الوجه له أن يفعل ذلك إلا أن ينهاه . والثاني : أن يعلمه وفي هذا الوجه له ذلك أيضاً اذا لم ينهه لأنه إذا لم ينهه فهو إذن له دلالة . والثالث: إذالم يستاذنه ولم يعلمه وإنه على وجهين : إن كان بينهما انبساط فله أن يفعل ذلك لمكان الإذن عرفاً، وإن لم يكن بينهما انبساط ليس له أن يفعل لأنه في الأذن عرفاً تودد. (المحيط البرهاني: ۶/ ۱۶۳، رشيدية).

عالمگیری میں ہے:

أما تفسيرها شرعاً فهو عقد على المنافع بعوض كذا في الهداية. (الفتاوى الهندية: ۴/ ۴۰۹).

وفي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: الإجارة في الشرع عبارة عن العقد على المنافع بعوض هو مال، فتمليك المنافع بعوض إجارة ،وبغير عوض إعارة. (الفقه الحنفي في ثوبه

الحدید: ٤/٣٣٩، دار القلم، دمش). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بینک کا کفیل بننے پر اجرت طلب کرنے کا حکم:

سوال: زید نے حسن سے مال منگوایا اور بینک درمیان میں کفیل اور ذمہ دار بن گیا۔ تو اب بینک اس کفالت کی اجرت طلب کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: شریعت مطہرہ میں عقدِ کفالت ایک احسان اور ابتدائی تبرع کا معاملہ ہے۔ اس پر اجرت لینا جائز اور درست نہیں ہے۔ ہاں کاغذات کی کتابت وغیرہ کی اجرت لینے کی گنجائش ہے۔ لہٰذا بصورتِ مسئولہ بینک کفالت پر اجرت طلب نہیں کرسکتا، لیکن کتابت وغیرہ کاغذی کاروائی پر اجرت لینا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں فتح القدیر میں ہے:

والكفالة عقد تبرع كالنذر لايقصد به سوى ثواب اللّٰه أو رفع الضيق عن الحبيب فلا يبالي بما التزم في ذلك... فكان مبناها التوسع. (فتح القدير: ٦ / ٢٩٨، مكتبه رشيديه).

قال في رد المحتار: في المجتبى عن الفضلي تحمل الشهادة فرض على الكفاية كأدائها والا لضاعت الحقوق وعلى هذا الكاتب إلا أنه يجوز له أخذ الأجرة على الكتابة دون الشهادة فيمن تعينت عليه بإجماع الفقهاء وكذا من لم تتعين عليه عندنا وهو قول الشافعي وفي قول يجوز لعدم تعينه عليه شلبي. (رد المحتار: ٥ / ٤٦٤، كتاب الشهادات).

وفي المبسوط للعلامة السرخسيؒ: لأن الكتابة عمل معلوم وهو يتحقق من المسلم والكافر ثم الاستيجار عليه متعارف وقيل الاستيجار على الكتابة كالاستيجار على الصياغة ... أو كالاستيجار على النقش وذلك جائز إذا كان معلوماً عند أهل الصنعة. (المبسوط: ١٦ / ٤٢). **واللہ ﷻ اعلم۔**

تاوان کی شرط کے ساتھ کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: آج کل بعض کمپنیاں لوگوں کو کرایہ پر برتن دیتی ہیں اور یہ شرط لگاتی ہیں کہ جتنے برتن ٹوٹ جائیں ان کا تاوان لیا جائے گا۔ شرعاً تاوان ہے یا نہیں؟ اگر تاوان کی شرط نہ لگائے تو چند ماہ میں کمپنی خسارہ میں

چلی جائیگی یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ برتن بے اختیار ٹوٹے یا قصداً۔ برائے کرم حکم شرعی سے مطلع فرما کر اجر عظیم کے مستحق ہوں؟

الجواب: اجارہ میں عین مستاجرہ پر قبضہ قبضۂ امانت ہوتا ہے، اور فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ امین پر ضمان کی شرط باطل ہے، البتہ بعض صورتوں میں فقہاء نے امین پر ضمان کی شرط کے جواز کا قول اختیار فرمایا ہے، مثلاً اجیر مشترک پر تاوان کے سلسلہ میں بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اموال کی حفاظت کی خاطر تاوان لگانا چاہئے، اور یہ سبب صورتِ مسئولہ میں بھی متحقق ہے، اس وجہ سے تاوان کی شرط کے جواز کے بارے میں مفتی حضرات کو غور کرنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

یفسد الإجارة الشروط لأنها بمنزلة البیع أی فكل ما أفسد البیع أفسدها وأراد بالشروط شروطاً لایقتضیها العقد. (تبیین الحقائق:۵/۱۲۱، ملتان).

الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید میں ہے:

العین المستاجرة أمانة فی ید المستاجر إن تلفت بغیر تفریط لم یضمنها...فإن شرط الموجرعلی المستاجر ضمان العین فالشرط فاسدلانه ینافی مقتضی العقد... (الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:۴/۳۶۱).

الدرالمختار میں ہے:

ولاتضمن بالهلاک من غیرتعد وشرط الضمان باطل کشرط عدمه فی الرهن خلافاً للجوهرة حیث جزم بصیرورتها مضمونة بشرط الضمان... (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۵/۶۵۹، سعید).

خلاصة الفتاویٰ میں ہے:

ولو دفع الثیاب إلی صاحب الحمام واستأجره وشرط علیه الضمان إذا تلف قال الفقیه أبوبکر: یضمن الحمامي إجماعاً وکان یقول : إنما لایجب الضمان عند أبي حنیفة إذا لم یشترط الضمان والفقیه أبوجعفر سوی بینهما وکان یقول بعدم الضمان قال الفقیه ابو اللیث وبه آخذ ونحن نفتي به. (خلاصة الفتاوی:۳/۱۳۷).

شرح عقود رسم المفتی میں ہے:

والعرف فی الشرع له اعتبار ❊ لذا علیه الحکم قد یدار

واعلـم أن اعتبـار العادة والعرف یرجع إلیه في مسائل کثیرة حتی جعلوا ذلک أصلاً ...ثم اعـلـم أن الـعـرف قسمان عام وخاص فالعام یثبت به الحکم العام ویصلح مخصصاً للقیاس والأثر... (شرح عقود رسم المفتی:۷۵،۸۱)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

شئی مستاجر کے چوری ہونے پر تاوان کا حکم:

سوال: اگر کرائے کی چیزیں گم ہو جائیں یا چوری ہو جائیں تو تاوان عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کرائے کی چیزیں مستاجر کے قبضہ میں بطورِ امانت ہوتی ہیں، لہذا اگر اس نے حفاظت میں کوئی کوتاہی و تقصیر نہیں کی تو تاوان نہیں آئے گا۔لیکن موجودہ دور میں عام طور پر مستاجرین کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے آئے دن اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور یہ بھی معلوم کرنا مشکل ترین ہے کہ اس نے تقصیر کی تھی یا نہیں، پھر اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ کمپنی کی اشیاء کو اجرت پر لے کر واپس کرنے میں بہت سستی کرتے ہیں، جس میں اس کمپنی کا نقصان ہوتا ہے، بنابریں جملہ عوارض کو مد نظر رکھتے ہوئے استحساناً تاوان کا حکم دیا جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے اور علمائے کرام کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔اور اس کی نظیر فقہاء کے کلام میں اجیر مشترک ہے کہ صاحبینؒ کے مذہب کے مطابق استحساناً اس پر تاوان لگانا جائز ہے۔"**صیانةً لأموال الناس**"۔

ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں ہے:

الـمـأجـور أمـانة فـی یـد الـمسـتـاجر إن کان عقد الإجارة صحیحاً أو لم یکن لایلزم الـضـمـان إذا تـلـف الـمـأجـور فـی یـد الـمسـتـاجـر ما لم یکن بتقصیره أو تعدیه أو مخالفته لمأذونیته. (شرح المجلة:۲/۷۰۳، المادة: ۶۰۰و۶۰۱)۔

وفـی الـدرالـمـخـتـار: ولایـضـمـن ما هلک فی یده وإن شرط علیه الضمان ...قوله ولایـضـمـن ...وفـی الـبـدائـع...وقالا: یضمن إلا من حرق غالب أو لصوص مکابرین وهو اسـتـحسـان ... وقـولـهـمـا قـول عـمـرؓ وعليؓ وبه یفتی احتشاماً لعمر وعلی وصیانة لأموال

الناس. (الدر المختار مع رد المحتار: ٦/ ٦٥، سعید).

وفي التبيين : لأن تضمين الأجير المشترک کان نوع استحسان عندهما صيانة لأموال الناس ... فيجب عليه الضمان بما يمكن التحرز عنه حتى لايتوانى في حفظها وفي حاشية التبيين : حتى لايقصر في حفظها أو لا يأخذ إلا بقدر ما يحفظه. (تبیین الحقائق: ٥/ ١٣٨، ط: ملتان).

وفي شرح عقود رسم المفتي: فقد ظهر لک أن جمود المفتي أو القاضي على ظاهر المنقول مع ترک العرف والقرائن الواضحة والجهل بأحوال الناس يلزم منه تضييع حقوق كثيرة وظلم خلق كثيرين. (شرح عقود رسم المفتی، ص ٨١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

اجیر خاص پر شرط عائد کرنے کا حکم:

سوال: زید ایک کمپنی کا مالک ہے اس نے عمر سے کہا تم میری کمپنی کا مال فروخت کرو گے تو تنخواہ کے علاوہ ۳ فیصد تم کو مزید دیا جائیگا، لیکن شرط یہ ہے کہ کسی دوسرے کا مال فروخت نہیں کرو گے۔ کیا یہ معاملہ بنگاہِ شریعت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ بالا معاملہ شریعتِ مطہرہ کی نگاہ میں جائز اور درست ہے، کیونکہ اس صورت میں عمر بحیثیتِ اجیر خاص ہوگا، لہذا یہ شرط جائز ہے، پھر تنخواہ کے علاوہ ۳ فیصد بحیثیتِ دلال اس کو ملے گا۔

ملاحظہ فرمائیں فتاوی الشامی میں ہے:

وفي الحاوي سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام. (فتاوی الشامی: ٦/ ٦٣).

صاحب ہدایہ نے ایک قانون اور ضابطہ کی بات بیان فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

إلاأن يكون متعارفاً لأن العرف قاضٍ على القياس ولو كان لا يقتضيه العقد ولا منفعة فيه لأحد لايفسده. (الهداية: ٣/ ٥٩).

نیز اجیر خاص پر شرط لگانے کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں۔ الدر المختار میں ہے:

بأن استأجره للرعي حيث يكون مشتركاً إلا إذا شرط أن لا يخدم غيره ولا يرعى لغيره فيكون خاصاً... وليس للخاص أن يعمل لغيره. (الدر المختار:٦/٦٩،سعيد).

فتاوی سراجیہ میں ہے:

وشرط أن لا يرعى مع غنمه غنماً آخر جاز. (الفتاوى السراجية،ص:٤٦٢).

امدادالفتاویٰ میں ہے:

جواجیر خاص ہواس کو جتنا وقت اس عمل کے لئے معین ہوسکتا ہے اس میں دوسرا کام کرنا بلا اذن جائز نہیں ہے اور اذن بھی صاحبِ عطایا وکیل مطلق صاحبِ عطا کا معتبر ہے۔ (امدادالفتاویٰ:۳/۳۸۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشین خراب ہونے پر دوبارہ ٹھیک کرنے کا حکم:

سوال: زید اپنی مشین ایک میکینک کی دکان پر لے گیا میکینک نے مشین ٹھیک کر لی اس کے بعد ایک دس سالہ بچہ آیا اور وہ اس مشین کو چلانے لگا اور مشین خراب ہوگئی۔ اب دوبارہ اسکی مرمت میکینک پر ہے یا نہیں؟ اور مرمت کرنے والا مزید اجرت کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور بچہ کے والد پر تاوان آئیگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب زید نے اپنی مشین میکینک کی دکان میں رکھی تو وہ مشین میکینک کی ضمانت میں داخل ہوگئی اور جب تک مرمت کر کے میکینک کی طرف سے تسلیم وسپردگی نہ پائی جائے اس وقت تک اسکی حفاظت اس کے ذمہ ضروری ہے، اب چونکہ اسکی طرف سے کوتاہی پائی گئی جس کے نتیجہ میں بچہ نے آ کر اس مشین کو خراب کر دیا تو اب اسپر دوبارہ اس مشین کی مرمت ضروری ہوگی اور وہ مزید اجرت امطالبہ بھی نہیں کرسکتا، ہاں اس بچہ کو ضامن بنا سکتا ہے اور اگر بچہ کے پاس فی الحال مال نہ ہوتو حالتِ یسر کا انتظار کیا جائیگا لیکن باپ پر تاوان نہیں آئیگا اور میکینک نے خود اسکو خراب کیا تو اس کے ذمہ مشین کا دوبارہ ٹھیک کرنا لازم ہوگا۔

ملاحظہ فرمائیں فتاویٰ شامی میں ہے:

اعلم أن الهلاک بفعل الأجير أولا والأول إما بالتعدی أو لا والثاني إما أن يكون الاحتراز عنه أولا ففي الأول بقسميه يضمن اتفاقاً وفي ثاني الثاني: لا يضمن اتفاقاً وفي أوله لا يضمن عند الإمام مطلقاً ويضمن عندهما مطلقاً، وفي البدائع: لا يضمن عنده ما هلک بغير صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة في يده وهو القياس وقالا: يضمن إلا من حرق غالب

أو لصوص مكابرين وهو استحسان وقولهما قول عمر وعلى وبه يفتى احتشاماً لعمر وعلى وصيانة لأموال الناس. والله اعلم. (فتاوى الشامى:٦/٦٥،سعيد).

وفى الدرالمختار: ثوب خاطه الخياط بأجر ففتقه رجل قبل أن يقبضه رب الثوب فلا أجر له لأن الخياطة مماله أثر فلا أجر قبل التسليم كما فى المبيع بل له تضمين الفاتق أى قيمة خياطه لا المسمى لأنه إنما لزم بالعقد ولا عقد بينه وبين الفاتق ولا يجبر على الإعادة لأنه التزم العمل ووفى به وإن كان الخياط هو الفاتق فعليه الإعادة كأنه لم يعمل فلم يوف ما التزمه من العمل فيجبر عليه لأن عقد الإجارة لازم وهل للخياط أجر التفصيل بلا خياطة الأصح لا. (الدر المختار مع رد المحتار :٦/١٥، وكذا فى المحيط البرهانى:٩/٢٣٨).

وفى المحيط البرهانى: وهذا لأنه لما خرج الخبز من التنور فقد أتم العمل لأنه عمله جعل الدقيق خبزاً ومتى أخرجه من التنور صار منتفعاً به انتفاع الخبز فيتم عمله وصار مسلماً لقيام يد المستاجر على الخبز..فلا يبرأ عن الضمان إلا بالتسليم. (المحيط البرهانى: ٩/١٣٩،و الدرالمختار :٦/١٤).

شرح المجلہ میں ہے:

إذا أتلف صبي مال غيره يلزم الضمان من ماله وإن لم يكن له مال ينتظر إلى حال يساره ولا يضمن وليه لأن الصغير وإن كان محجوراً عليه لذاته إلا أن الحجر عليه فى أقواله لا فى أفعاله فهو مواخذ بأفعاله فيضمن ما أتلفه من المال قال فى كتاب أحكام الصغار للأستروشنى: صبى بال على السطح فخرج البول من الميزاب وأصاب ثوب رجل فأفسده يغرم الصبى من ماله فإن لم يكن له مال يكون ديناً عليه يواخذ به إذا أيسر. (شرح المجلة :٣/٤٥٧). واللہ ﷻ اعلم۔

درختوں کو کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: اگر کوئی درختوں کو کرایہ پر دیدے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر نا جائز ہے تو اسکی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: درختوں کو اجارہ پر دینا ناجائز ہے اس لیے کہ اس میں استہلاکِ عین ہے جبکہ اجارہ کا مقصد عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا ہے۔

اس کے جواز کا ایک حیلہ علماء نے یوں بیان کیا ہے کہ پہلے مالک درختوں کو مساقات پر اس طور پر دے کہ ایک ہزار میں سے ایک حصہ مالک کا اور باقی تمام حصے مساقی کے اور اس کے بعد اسی شخص کو وہ زمین مثلی اجرت پر اتنا اضافہ کر کے دیدے جتنا عقدِ مساقات میں کم کیا تھا۔ شرط یہ ہے کہ زمین قابل زراعت ہو نیز یہ حیلہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب زمین اور درخت مال وقف یا مال یتیم میں سے نہ ہو، چنانچہ اگر کسی نے مال وقف یا مال یتیم میں یہ حیلہ جاری کردیا تو دونوں عقد باطل ہوجائیں گے۔ مساقات تو اس لئے کہ اس میں یتیم و وقف کا ضرر ہے اور اجارہ اس لئے کہ وہ مساقات کے بطلان کے بعد کیا گیا تو گویا ارض مشغولہ پر اجارہ منعقد ہوا اور یہ باطل ہے اور اس لئے حیلہ میں عقد مساقات کو مقدم کرنے کی شرط لگائی گئی ہے کہ اگر معاملہ بالعکس کردیا تو اجارہ زمین باطل ہوجائے گا۔ لكونها في الأرض المشغولة . (مستفاد از فتاویٰ عثمانی:۳/۳۷۹)۔

نیز اس کے جواز کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ زمین کو کرایہ پر دیدے اور درخت کے استعمال کی اجازت دیدے اور بعد میں مالک کے رجوع کرنے کے احتمال سے بچنے کے لئے اپنی اجازت سے عقد کے وقت اس قسم کے الفاظ کہے جائے۔ كلما رجعت في الإذن تكون مأذوناً.

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولا يجوز بيع المراعي ولا إجارتها... وأما الإجارة فلأنها عقدت على استهلاك عين مباح ولو عقدت على استهلاك عين مملوك بأن استاجر بقرة لشرب لبنها لا يجوز فهذا أولى. (الهداية:۳/٥٤).

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے:

درخت کا اجارہ درست نہیں ہے کیونکہ اجارہ منافع کا ہوتا ہے اعیان وزوائد کی بیع ہوتی ہے ...(فتاوی رشیدیہ ۵۴۶)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اجارہ میں شئی مستاجرہ سے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے کہ استہلاک عین زین میں کاشت کرنا اور اس سے غلہ حاصل کرنا تو اجارہ میں داخل ہے لیکن مالک زمین کے درختوں سے پھل حاصل کرنا یہ اجارہ میں داخل

نہیں بلکہ یہ تو بیع ہوگئی۔(فتاوی محمودیہ:۱۶/۵۵۹،وکذافی امدادالاحکام:۳/۵۷۵)۔

حیلہ کے دلائل کتب فقہ سے ملاحظہ ہو:

وأفاد فساد ما يقع كثيراً من أخذ كرم الوقف أواليتيم مساقاة، فيستأجر أرضه الخالية من الأشجار بمبلغ كثير ويساقي على أشجارها بسهم من ألف سهم فالحظ ظاهر في الإجارة لا في المساقاة فمفاده فساد المساقاة بالأولى . (بالأولى) ... ثم اعلم أنه حيث فسدت المساقاة بقيت الأرض مشغولة فيلزم فساد الإجاره أيضا كما قدمناه وإن كان الحظ والمصلحة فيها ظاهرين، فتنبه لهذه الدقيقة. وفي فتاوى الحانوتي: التنصيص في الإجاره على بياض الأرض لا يفيد الصحه حيث تقدم عقد الإجاره على عقد المساقاة، أما إذا تقدم عقد المساقاة بشروطه كانت الإجارة صحيحة كما صرح به في البزازية ...وهذا بالنسبة إلى الوقف وأما مساقاة المالك فلا ينظر فيها إلى المصلحة كما لو آجر بدون أجر المثل . (الدر المختار مع رد المحتار:٦ /٨-٩،سعيد).

وفي الدرالمختار: وإن استاجر الشجر إلى وقت الإدراك بطلت الإجارة ...والحيلة... أن يشترى. وفي الشامية: قوله (وأن يشترى الخ) هذه حيلة ثانية وبيانها أن المشترى إما أن يكون مما يوجد... أو لم يوجد منه شيء... أو يكون وجد بعضه دون بعض كثمر الأشجار المختلفة الأنواع... وفي الثالث يشترى الموجود من الثمر بكل الثمن ويحل له البائع ما سيوجد لأن استئجار الأرض لا يتاتى هنا لأن الأشجار باقية على مالك البايع . (الدرالمختارمعردالمحتار:٤/٥٥٨،سعيد).

قال الرافعي: (لأن استئجار الأرض ...) لا يدخل لعدم تاتي إجارة الأرض هنا فإنه لو قيل بصحتها لا يحل للمشترى ما سيوجد من الثمار فالعمدة في حله هو الاحلال . (التحرير المختار: ٤/١١٨،سعيد).

وفي الأشجار الموجود ويحل له البائع ما يوجد فإن خاف أن يرجع يقول: على أني متى رجعت في الإذن تكون مأذوناً في الترك. شمني ملخصاً.

وفي الشامية: (قوله وفي الاشجار الموجود) أي وفي ثمار الاشجار يشترى

الموجود منها . (فإن خاف الخ) .... وحاصله: أنه على قول محمد يمكن الرجوع هنا عن الإحلال بأن يقول: رجعت عن الإحلال المعلق وعن المنجز فيتعين حينئذ الاحتيال بالعاملة على الاشجار . (الدرالمختارمع ردالمحتار:٤/٥٥٨،سعيد).

قال الرافعي (فيتعين حينئذٍ الاحتيال...) وفي السندى بعد ذكره عن الرحمتي نحو ما ذكره المحشي ما نصه فالحيلة عند ذلك ان يقول على أني كلما رجعت في الإذن تكون أيها المشترى مأذوناً في الترك بإذن جديد فلا يصح له رجوع عن الإذن المعلق وابطال المنجز لمراعاة لفظه كلما كما حققه أهل الأصول. (التحرير المختار: ٤/١١٨،سعيد).

لیکن پہلے حیلے کا سمجھنا بھی مشکل ہے اور صعب العمل ہے نیز جو مالک درختوں کو کرایہ پر دیگا عام طور پر پھلوں کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہوگا، جبکہ اس صورت میں پھلوں کے ساتھ مالک کا تعلق ایک فی ہزار کے حساب سے ہوگا اس لیے دوسرا حیلہ آسان اور سہل العمل ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰه تعالیٰ:

﴿فابعثوا أحدكم بورقكم هذه إلى المدينة، فلينظر أيها أزكى طعاماً فليأتكم برزق منه﴾

(سورة الكهف).

وعن حكيم بن حزام رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم بعثه ليشترى له أضحية بدينار، فاشترى أضحية فأربح فيها ديناراً، فاشترى أخرى مكانها، فجاء بالأضحية والدينار إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: "ضح بالشاة وتصدق بالدينار".

(رواه الترمذی وابوداود).

باب الوكالة

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: وكلنى النبي صلى الله عليه وسلم بحفظ زكاة رمضان.

(رواه البخاری).

وعن على رضي الله عنه قال: أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أقوم على بدنه.

(رواه الشيخان).

وکالت کے احکام کا بیان

جانبین سے وکالہ کا حکم:

سوال: کیا ایک شخص بائع اور مشتری دونوں کی طرف سے وکیل بن سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اکثر فقہاء نے یہ اشکال کیا ہے کہ ایک ہی شخص بائع اور مشتری نہیں بن سکتا، لیکن بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ موکل کی اجازت سے ایک ہی شخص بائع اور مشتری دونوں کی طرف سے وکیل بن سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

قال في البزازية : الوكيل بالبيع لايملك شراء ه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً و بائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه أو أولاده الصغار أو ممن لاتقبل شهادته فباع منهم جاز. (البحر الرائق:۷/۱٦٦، کوئٹه).

ردالمحتار میں ہے:

وفي وكالة الطحاوي : لايجوز بيع الوكيل من نفسه أو ابن صغيرله أوعبد له غير مديون، وإن أمره الموكل بالبيع من هؤلاء أو أجاز له ما صنع جاز. (تكملة ردالمحتار:۷/۳۳۲،سعيد).

نیز وکیل دلال کی طرح ہے، صرف فرق یہ ہے کہ دلال اجرت لیتا ہے اور وکیل اجرت لیکر اور بلا اجرت دونوں طرح کام کرتا ہے۔ اور جب دلال جانبین سے اجرت لے کر کام کرسکتا ہے تو وکیل بلا اجرت جانبین سے بدرجہ

اولیٰ کر سکتا ہے۔

حاشیہ ہدایہ میں ہے:

السمسار وهي أن يوكل الرجل من الحاضر البادية فيبيع لهم ما يجلبونه.... (حاشية الهداية:۲/۲٦٦).

شامی میں ہے:

فتجب الدلالة على البائع أو المشترى أو عليهما بحسب العرف، جامع الفصولين. (ردالمحتار:٤/٥٦٠،سعيد) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل کا خود اپنے لیے خریدنے کا حکم:

سوال: اگر زید نے عمر کو وکیل بالبیع بنایا تو عمر وہ چیز خود اپنے لیے مثلی قیمت پر خرید سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: وکیل بالبیع کے خود اپنے لیے خریدنے کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ ہے کہ ناجائز ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ موکل کی اجازت سے جائز ہے، لہٰذا بصورتِ مسئولہ اگر موکل نے اجازت دی ہے تو وکیل خود اپنے لیے خرید سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی بزازیہ میں ہے:

الوكيل بالبيع لايملك شراءه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً وبائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه ...وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه أو أولاده الصغار أو ممن لايقبل له شهادته فباع منهم جاز. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/٤٧٥،الرابع فى البيع). **واللہ ﷻ اعلم۔**

متعینہ قیمت سے زائد پر فروخت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی کو وکیل بالبیع بنا کر قیمت بتادی گئی تو اگر وکیل اس کو زائد قیمت پر بیچنا چاہتا ہے تو فقہاء کہتے ہیں کہ زائد قیمت بھی موکل کی ہے، اس کی کوئی تدبیر ہے جس میں زائد قیمت وکیل کو مل جائے؟

الجواب: فقہاء کے ایک قول کے مطابق وکیل بالبیع موکل کی اجازت سے خود بھی خرید سکتا ہے، اس

قول کے پیشِ نظر صورتِ مسئولہ میں آسان تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے وکیل بالبیع مبیع کو متعینہ قیمت پر خود خرید لے، اور بائع کو بتلادے کہ میں نے خود خریدا، خریدنے پر وکیل مبیع کا مالک بن گیا، بعدازاں اس کو زائد قیمت پر کسی اور کو بیچ دے اب زائد پیسے اپنے لیے رکھنے کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی بزازیہ میں ہے:

الوكيل بالبيع لايملك شراء ه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً وبائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه ...وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه أو أولاده الصغار أو ممن لايقبل له شهادته فباع منهم جاز. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية:٥/٤٧٥،الرابع في البيع).

درمختار میں ہے:

لايعقد وكيل البيع والشراء مع من ترد شهادته له للتهمة وجوازه بمثل القيمة إلا من عبد ومكاتبه إلا إذا أطلق له الموكل كـ بع ممن شئت فيجوز بيعه لهم بمثل القيمة اتفاقاً ... وفي السراج : لو صرح بهم جاز إجماعاً إلا من نفسه وطفله وعبده غير المديون. وفي رد المحتار: قوله إلا من نفسه ، وفي السراج : لو أمره بالبيع من هؤلاء فإنه يجوز إجماعاً إلا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أو عبده ولا دين عليه فلا يجوز قطعاً وإن صرح به الموكل، الوكيل بالبيع لايملك شراء ه لنفسه.....(بزازية) كذا في البحر، ولايخفى ما بينهما من المخالفة ، وذكر مثل ما في السراج في النهاية عن المبسوط، ومثل مافي البزازية في الذخيرة عن الطحاوي وكأن في المسئلة قولين خلافاً لمن يدعي أنه لامخالفة بينهما. (الدر المختارمع ردالمحتار:٥/٥٢١،٥٢٢،سعيد۔ وكذا في البحرالرائق مع الحاشية منحة الخالق:٧/١٦٧،كوئته).

علامہ سید احمد طحطاویؒ فرماتے ہیں:

قوله إلا من نفسه أي وقد أمره بالبيع ممن لاتقبل شهادته له قال في السراج : لو أمره بالبيع من هؤلاء فإنه يجوز إجماعاً إلا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أوعبده ولادين عليه فلا يجوز قطعاً وإن صرح به الموكل، وهذا لاينافي ما في البزازية أنه يجوز لنفسه فإن محله إذا صرح له بالعقد من نفسه . (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار:٣/٢٧٦، كوئته).

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے:

...لایجوز للوکیل أن یبیع سلعة الموکل علی بیعها لنفسه...أما إذا أذنه الموکل بأن یبیع لنفسه أو لابنه الصغیر ففیه رأیان: أحدهما: أنه لایجوز، لأن العاقد في هذه الحالة یکون واحداً، ثانیهما: أنه یجوز ویظهر أن الذي یقول بعدم الجواز لعلة کون العاقد واحداً لایمنع أن یبیع الوکیل السلعة لاجنبي ثم یشتریها منه ثانیاً لأنه في هذه الحالة یکون البائع غیر المشتری. (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، مبحث الوکالة بالبیع و الشراء، ۳/۱۴۵). **واللہ ﷻ اعلم۔**

خلافِ شرع کام کی وکالت کا حکم:

سوال: مسلمان وکیل کے لیے جائز ہے کہ خلافِ شرع کام قبول کرے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے وکالت کا پیشہ فی نفسہ جائز ہے، لیکن خلافِ شرع امور میں وکالت جائز نہیں ہے، وکیل اور موکل دونوں مکلّف ہیں، شریعت کی پابندی دونوں پر لازم اور ضروری ہے۔ اورخلافِ شرع امور مثلاً جھوٹ، دھوکہ، خیانت، باطل حیلے وغیرہ سے بچنا حتی الامکان ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿**ولا تکن للخائنین خصیماً**﴾ (سورة النساء،الآیة:۱۰۵).

بخاری شریف میں ہے:

عن عروة عن زینب بنت أم سلمة عن أم سلمة عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم، قال: إنما أنا بشر وإنکم تختصمون ولعل بعضکم أن یکون ألحن بحجته من بعض فأقضي له علی نحو ما أسمع فمن قضیت له من أخیه شیئاً فلا یأخذ فإنما أقطع له قطعة من النار. (رواه البخاری:۲/۱۰۳۰).

شرح عنایہ میں ہے:

قال (کل عقد جاز أن یعقده الإنسان بنفسه الخ) هذه ضابطة یتبین بها مایجوز التوکیل به ومالا یجوز. (شرح العنایة بهامش فتح القدیر:۷/۵۰۱،کتاب الوکالة،دالفکر).

وإن علم من الموکل القصد إلی الإضرار بالمدعي لیشتغل الوکیل بالحیل والأباطیل والتلبیس لایقبل منه التوکیل. (فتاوی قاضیخان:۳/۷).

اعلاء السنن میں ہے:

والكلام فيما إذا كان الوكيل ألحن من الموكل وأبلغ وأهدى منه إلى وجوه الخصومات لا سيما إذا كان الموكل صالحاً يتقي عن استخراج الحيل والدعاوى الباطلة للغلبة والوكيل بضده، فلا بد أن في وكالته ضراراً بالآخر، فلايلزم إلا بالتزامه، ومن شاهد حال وكلاء الزمان في إحقاقهم الباطل، وإبطالهم الحق لم يشك قط في صحة قول أبي حنيفةؒ ... وأكثر ما يقع التاخير في معرفة الحق من الباطل إنما هو من تلبيسات الوكلاء وتحيلهم على الحق ولبسهم الباطل بالصواب والفقهيه من عرف حال زمانه . (اعلاء السنن:۱۵/ ۳۲۱، کتاب الوکالة، ادارة القرآن).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

...حاصل یہ ہے کہ پیشہ وکالت فی نفسہ جائز ٹھہرا مگر شرط یہ ہے کہ سچے مقدمات لیتا ہو۔(امداد الفتاویٰ: ۳۲۰/۳).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر سچے مقدمات لیتا ہو اور کسی خلافِ امر کا ارتکاب اس میں نہ کرنا پڑتا ہو تو پیشہ وکالت جائز ہے۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

جس وکالت میں معصیت پر اجر لیا جائے یعنی جھوٹے اور ناحق مقدمہ کی پیروی کی جاوے اور ظالم کی اعانت کی جاوے ایسی وکالت اور اس کی آمدنی ناجائز ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۴۵۲/۱۶،۴۵۳، جامعہ فاروقیہ).

آپ کے مسائل میں ہے:

وکیل اگر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر کے فیس لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ حلال نہیں ہوگی، اور اگر کسی مقدمہ کی صحیح پیروی کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی کمائی کو حرام کہا جائے۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل:۲۷۶/۸).

ہاں دفع ظلم کے لیے کچھ تدابیر اختیار کرنی پڑے تو اس کی گنجائش ہے۔

اعلاء السنن میں ہے:

ومعلوم أن الوكيل إنما يقصد عادة لاستخراج الحيل والدعوى الباطلة ليغلب وإن لم يكن الحق معه، وفي هذا إضرار بالآخر، فلا يلزم إلا بالتزامه إلا إذا كان معذوراً. (اعلاء

السنن: ۱۵/ ۳۲۱، باب الوکالة بالخصومة، ادارة القرآن).

الاشباہ والنظائر کے ایک قاعدے سے بھی استیناس لیا جا سکتا ہے:

إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما. (الاشباہ والنظائر: ۱/ ۲۶۱، تحت القاعدة الخامسة "الضرر يزال").

نیز دونوں فریق کے درمیان صلح صفائی وغیرہ کے لیے کچھ توریہ اور حیلہ وغیرہ اختیار کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

بخاری شریف میں ہے:

عن ابن شهاب أن حميد بن عبد الرحمن أخبره أن أمه أم كلثوم بن عقبة أخبرته أنها سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "ليس الكذاب الذي يصلح بين الناس فينمي خيراً أو يقول خيراً. (رواه البخاری: ۱/ ۳۷۱، باب ليس الكاذب الذی يصلح بين الناس). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل بالشراء کو کوئی چیز مفت ملنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے زید کو وکیل بنایا کہ میرے لیے بازار سے دنبہ یا بکری خرید لو اور اس کو ایک ہزار رینڈ دئے، لیکن بائع نے وکیل کو تعلقات کی وجہ سے بکری یا دنبہ مفت میں دیدیا، تو اب وکیل ایک ہزار رینڈ موکل کو واپس کریگا یا اپنے لیے رکھنے کی گنجائش ہے؟ اور یہ بتلایا گیا کہ اس کی قیمت ہزار رینڈ ہے۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ وکیل کے بائع کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے بائع نے ثمن واپس کیا تو یہ وکیل کے لیے ہدیہ ہو گیا، لہذا موکل کو واپس کرنا لازم اور ضروری نہیں اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاوی ولوالجیہ میں ہے:

رجل أمر رجلاً يشتري له جارية بألف درهم فاشتراها ثم أن البائع وهب للوكيل ألفاً فللوكيل أن يرجع على البائع بألف، لأنه لايمكن أن يجعل هذا حطاً عن الثمن، لأنه يفسد العقد فجعل هبة فيرجع. (الفتاوى الولوالجية: ۴/ ۳۵۳، فصل فيما يرجع الوكيل على الموكل).

البحر الرائق میں ہے:

وفي الواقعات الحسامية: ولو أمر رجلاً أن يشتري جارية بألف فاشتراها ثم أن البائع وهب الألف من الوكيل فللوكيل أن يرجع على الآمر. (البحر الرائق: ۷/ ۱۵۵، باب الوكالة بالبيع

والشراء، کوئٹه).

درمختار میں ہے:

ولو وهبه كل الثمن رجع بكله ولوبعضه رجع بالباقي لأنه حط. وفي الشامي: (قوله كل الثمن) أي جملة واحدة، قال في البحر: ولو وهبه خمس مائة ثم الخمسمائة الباقية لم يرجع الوكيل على الآمر إلا بالأخرى لأن الأولىٰ حط والثانية هبة. (الدر المختار مع فتاوى الشامي: ٥/٥١٦، باب الوكالة بالبيع والشراء، سعيد). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

وکیل اور دلال کے مابین فرق:

سوال: وکیل اور دلال میں کیا فرق ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ وکیل اور دلال کے درمیان فرق یہ ہے کہ دوسرے شخص کا سپرد کیا ہوا کام دلال اجرت پر کرتا ہے اور وکیل اجرت اور بلا اجرت دونوں طرح کرتا ہے۔

ملاحظہ ہو دستور العلماء میں ہے:

السمسار: من يعمل للغير بالأجر بيعاً أو شراء ويقال له في العرف الدلال.

(دستور العلماء: ٢/١٣٢).

والوكالة: ...وفي الشرع تفويض التصرف في أمرشرعي إلى غيره أي إقامة الغير مقام نفسه في التصرف ممن يملك التصرف. والوكيل: هو الذي فوض إليه التصرف بإقامة المفوض أي الموكل إياه مقام نفسه في التصرفات. (دستور العماء: ٣/٣٢١).

التعریفات الفقہیہ میں ہے:

الدلال هو السمسار أي الذي يدخل بين البائع والمشتري متوسطاً لإمضاء البيع.

(التعريفات الفقهية: ١/٢٩٣).

والوكالة، وهي شرعاً تفويض أحد أمره لآخر وإقامته مقامه ويقال لذلك الشخص موكل ولمن إقامه وكيل والأمر موكل به. (التعريفات الفقهية: ١/٥٤٦).

اسلامی فقہ میں ہے:

وکالت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک خاص دوسرے عام، خاص کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کسی سے کہا کہ آپ اتنے روپئے میں میرے لیے موٹر خرید دیجئے، یا فلاں مقدمہ کی پیروی کر دیجئے، اور عام کا مطلب یہ ہے کہ میرے فلاں کاروبار کی آپ پوری نگرانی کیجئے، یا میرے سارے مقدمات کی پیروی کیجئے، پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں، ایک با اجرت، دوسرے بے اجرت، دونوں کے احکام یکساں ہیں، صرف ایک معاملہ میں بے اجرت وکیل کی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے۔

با اجرت وکیل میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اجرت لے کر یا کمیشن پر کوئی کام کرتے ہیں، کسی حکومت کے تمام ملازمین اس کے وکیل ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اپنی حکومت کی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ آپ اپنے ذاتی ملازم سے کوئی کام کرائیں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر آپ کمیشن ایجنٹ مقرر کریں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائے گا، یعنی اس کو آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ (اسلامی فقہ: ۲/۶۴۷). واللہ ﷻ اعلم۔

موکل کا وکیل کو دوبارہ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: کیا موکل کے لیے جائز ہے کہ مبیع پر قبضہ کرنے اور ثمن ادا کرنے کے بعد دوبارہ مبیع وکیل کے ہاتھ بطورِ مرابحہ فروخت کر دے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ موکل نے مبیع پر قبضہ کر لیا اور ثمن بھی ادا کر دیا تو اب وکیل کے ہاتھ مرابحۃً فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وفسد شراء ما باع بنفسه أو بوكيله من الذي اشتراه ...بالأقل من قدر الثمن الأول قبل نقد كل الثمن الأول وفي ردالمحتار: قيد به لأن بعده لا فساد. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۵/۷۳، سعید).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله بالأقل من قدر الثمن الأول...وقيد بالأقل لأنه لو كان بمثله أو بأكثر منه جاز لأن الفضل في الأكثر يحصل للمشتري والمبيع داخل في ضمانه... وقيد بكونه قبل النقد لأنه إذا كان بعده لا فساد. (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار: ۳/۷۳، كوئته).

ہدایہ میں ہے:

ومن اشترى جارية بألف درهم حالة أو نسيئة ثم باعها من البائع بخمس مائة قبل أن ينقد الثمن الأول لايجوز البيع الثاني، وفي فتح القدير: بمثل الثمن أو أكثر جاز... وقيد بقوله قبل نقد الثمن لأن ما بعده يجوز بالإجماع. (الهداية مع فتح القدير: ٤٣٢/٦، دارالفكر).

واللہ ﷻ اعلم۔

وکالتِ عامہ اور خاصہ کا حکم:

سوال: کسی شخص نے کسی کو وکیل مقرر کیا کہ وہ مالِ تجارت خرید لے جب وہ چاہے، ایک خاص مقرر کردہ قیمت میں، اور سامان کی صفت، نوع وغیرہ بیان نہیں کیا، آپ رہنمائی فرمادے کہ یہ وکالتِ عامہ ہے یا وکالتِ خاصہ؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ سامان کے اعتبار سے وکالتِ عامہ ہے، لیکن قیمت مقرر کرنے کے اعتبار سے وکالتِ خاصہ ہے، وکالت میں تقیید کی مثال یوں ہے کہ آپ میرے لیے سامان فلان بازار سے خریدے جو بھی سامان خریدنا ہو۔

ملاحظہ ہو ردالمحتار میں ہے:

قوله وإن عمت بأن يقول ابتع لي مارأيت لأنه فوض الأمر إلى رأيه فأى شيء يشتريه يكون ممتثلاً، درر. (ردالمحتار: ٥١٥/٥، سعيد).

ہدایہ میں ہے:

...إلا أن يوكله وكالة عامة فيقول: ابتع لي مارأيت لأنه فوض الأمر إلى رأيه فأى شيء يشتريه يكون ممتثلاً والأصل فيه أن الجهالة اليسيرة تتحمل فى الوكالة كجهالة الوصف استحساناً لأن مبنى التوكيل على التوسعة لأنه استعانة. (الهداية: ١٨١/٣، باب الوكالة بالبيع والشراء).

وفي الدرالمختار: وبشراء دار أوعبد جاز إن سمى الموكل ثمناً يخصص نوعاً أولا.

(الدرالمختار: ٥١٥/٥، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل کا موکل کی رقم اپنے خرچ میں لانے کا حکم:

سوال: اگر کسی کا روپیہ بطورِ امانت ہو یا کسی کے پاس مسجد کا چندہ ہو، یا کسی کو وکیل بقضاء الدین بنایا گیا ہو یا وکیل بالشراء، اور وکیل وہ رقم اپنی ضرورت میں صرف کردے، پھر اس کے عوض دوسری رقم مالک کو دیدے یا مسجد کے چندہ میں رکھدے یا موکل کا دین ادا کردے تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ وکیل کا ایسا تصرف موکل کی اجازت سے جائز ہے بدون اجازت درست نہیں، کیونکہ وکیل کے پاس موکل کی رقم بطورِ امانت ہے اور امانت میں بلا اجازت تصرف کرنا جائز اور درست نہیں، اسی طرح وقف کے مال میں کسی طرح ایسا تصرف کرنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا تصرف کیا تو ضامن ہوگا، ہاں استحساناً اگر قاضی کی طرف مرافعہ مشکل ہو اور خرچ شدہ رقم کا بدل موکل کی متعین کردہ جگہ میں خرچ کرے تو فیما بینہ وبین اللہ وبال سے بچنے کی امید ہے۔ اور اگر کسی نے زید کو دس درہم کسی چیز کے خریدنے کے لیے دیے، یا اہل وعیال پر خرچ کرنے کے لیے دیے، یا قرض کی ادائیگی کے لیے دیے، اور اس نے اپنی رقم میں سے مذکورہ بالا کام انجام دیے، اور موکل کی رقم خود رکھ لی تو یہ جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

رجل جمع مالاً من الناس لينفقه في بناء المسجد وأنفق من تلك الدراهم في حاجة نفسه ثم رد بدلها في نفقة المسجد لايسعه أن يفعل ذلك وإذا فعل إن كان يعرف صاحب المال رد الضمان عليه أو يساله ليأذن له بإنفاق الضمان في المسجد، وإن لم يعرف صاحب المال يرفع الأمر إلى القاضي حتى يأمره بإنفاق ذلك في المسجد فإن لم يقدر على أن يرفع الأمر إلى القاضي، قالوا: نرجوا له في الاستحسان أن ينفق مثل ذلك من ماله في المسجد فيجوز ويخرج عن الوبال فيما بينه وبين الله تعالىٰ وفي القضاء يكون ضامناً فيكون ذلك ديناً عليه لصاحب المال، وهو نظير ما ذكر في الأصل الوكيل بقضاء الدين إذا صرف مال الموكل في حاجة نفسه ثم قضى بمال نفسه دين الموكل يكون متبرعاً في قضاء دين الموكل. (فتاوىٰ قاضيخان:۳/۲۹۹).

فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

الوكيل بالشراء أنفق الدراهم على نفسه ثم اشترى ما أمر بدراهم من عنده فالمشتري للوكيل لا للآمر في المختار وفي الأصل اشترى بدنانيرمن عنده ثم نقد دنانير الموكل فالشراء للوكيل ويضمن مال الموكل للتعدي، ولو اشترى ما أمره وسلمه إلى الموكل ثم أنفق دراهم الوكالة ونقد للبائع غيرها جاز،...وفي النوازل أعطاه ديناراً لقضاء دينه أو الإنفاق على عياله فأمسكها وصرف دينارنفسه جاز استحساناً وفي العيون أمره بصدقة ألف وأعطاه فأنفقه وتصدق بألف من عنده لايجوز ويضمن وإن باقية عنده وتصدق بألف من عنده جاز استحساناً. (الفتاوى البزازية:٥/٤٨٣).

وللاستزادة انظر: (الفتاوى الهندية:٣/٦٤٤ـ والفتاوى التاتارخانية:٥/٨٥٦). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل کو ثمن کا ضامن بنانے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے زید کو وکیل بالبیع بنایا، اور کہا کہ تم سامان کو اتنی قیمت میں فروخت کرو، لیکن یہ شرط لگائی کہ تم مجھے اس کی قیمت ادا کرو گے چاہے آپ مشتری سے وصول کرے یا نہ کرے، کیا وکیل اس کا ذمہ دار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسی شرط لگانا جائز اور درست نہیں۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

(قوله ومن باع لرجل ثوباً) أى باع ثوباً هو لرجل بطريق الوكالة عنه في بيعه (وضمن) الوكيل (له) أى للرجل المالك (الثمن أو مضارب ضمن ثمن متاع لرب المال فالضمان باطل لأن الكفالة) وهى الضمان (التزام المطالبة والمطالبة إليهما) أى إلى الوكيل والمضارب (فيصير كل منهما ضامناً لنفسه) فيصير مطالباً مطالباً وهذا لأن حقوق العقد ترجع إليهما. (فتح القدير:٧/٢١٨، دار الفكر).

درمختار میں ہے:

ولا تصح كفالة الوكيل بالثمن للموكل فيما لو وكل ببيعه لأن حق القبض له بالإصالة فيصير ضامناً لنفسه. وفي رد المحتار: (قوله ولاتصح كفالة الوكيل بالثمن) وكذا

عکسه،... (وقوله فيما لو وكله ببيعه) الأولىٰ أن يقول أى ثمن ما وكل ببيعه، قيدبه لأن الوكيل بقبض الثمن لوكفل به يصح كما فى البحر. (الدرالمختارمع ردالمحتار:۳۱۲/۵،سعید).

فتح القدیر میں ہے:

يجب أن يعلم أن الحقوق نوعان حق يكون للوكيل وحق يكون على الوكيل فالأول كقبض المبيع ومطالبة ثمن المشتري والمخاصمة فى الغيب والرجوع بثمن مستحق، ففي هذا النوع للوكيل ولاية هذه الأمورلكن لاتجب عليه، فإن امتنع لايجبره الموكل على هذه الأفعال، لأنه متبرع فى العمل بل يوكل الموكل بهذه الأفعال. (فتح القدير:۱٦/۸،دارالفکر).

واللہ ﷻ اعلم۔

وکالت کے معاہدہ پر فیس لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اسلامی بینک میں آ کر معاہدہ کے فارم بھر کر دستخط کیے اور وکالت کے فارم پر دستخط سے پہلے اس نے معاہدہ ختم کر دیا، اب بینک کے لیے اس آدمی سے فیس وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ بینک نے اس فیس کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ فیس لینا معروف یا مشروط یا موعود ہے، اور بینک کی کاغذی کاروائی کا معاوضہ ہے تو اس کا لینا اور دینا جائز اور درست ہے۔

فتاوی قاضیخان میں ہے:

ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس. (فتاویٰ قاضیخان علی هامش الهندية:۱٦٥/۲).

شرح عنایہ میں ہے:

والعرف ينفي النزاع ...فلم يبق من الموانع إلا القياس على ما لا عرف فيه بجامع كونه شرطاً والعرف قاضٍ عليه. (شرح العناية:٤٤٢/٦،دارالفکر).

شرحِ مجلّہ میں ہے:

نقل عن جامع الفصولين أنه لو ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكر الشرط على وجه العدة،

جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس. (شرح المجلة:۲/۶۱).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

معاہدہ کی پابندی فریقین پر ضروری ہے منحرف ہونے والے فریق کو ایفاء معاہدہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۶/۵۵۰). واللہ ﷻ اعلم۔

وکیل پر پابندی لگانے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے اپنے وکیل پر یہ شرط عائد کی کہ تم صرف میرا مال فروخت کرو گے تو کیا وکیل اپنا مال اس کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: وکیل بالبیع بمنزلہ اجیر مشترک ہے، اس لیے کہ سامان بیچنے پر عقد واقع ہوا ہے، لیکن جب موکل نے یہ شرط عائد کی کہ صرف میرا مال فروخت کرو گے تو اب اجیر خاص کی طرح ہو گیا، لہذا اب اجارہ کے وقت میں اپنا مال فروخت کرنا درست نہیں ہے، ہاں اگر اجیر نے اس شرط کو قبول نہیں کیا یا قبول کیا، لیکن جو اجارہ کا وقت ہے اس کے علاوہ اپنے گھر پر اپنی چیز بیچتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، یا وہ خود نہیں بیچتا بلکہ اس کا لڑکا یا بیوی بیچتی ہے تب بھی جائز ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

الأجير المشترك من يعمل لغير واحد... والأجير الخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل... وسمي الأجير خاصاً ووحده لأنه يختص بالواحد وليس له أن يعمل لغيره ولأن منافعه صارت مستحقة للغير والأجر مقابل بها فيستحقه ما لم يمنع مانع من العمل كالمرض والمطر... وإنما يكون أجيراً خاصاً إذا شرط عليه أن لا يرعى لغيره. (البحر الرائق:۲۶،۳۰،۳۱ كتاب الاجارة، كوئته).

درمختار میں ہے:

الأجراء على ضربين: مشترك وخاص، فالأول من يعمل لا لواحد كالخياط ونحوه أو يعمل له عملاً غير موقت... أو موقتاً بلا تخصيص... والثاني وهو الأجير الخاص ويسمى

أجير وحد وهو من يعمل لواحد عملاً موقتاً بالتخصيص ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة أوشهراً لرعي الغنم المسمى بأجر بخلاف ما لو آجر المدة بأن استاجره للرعي شهراً حيث يكون مشتركاً إلا إذا شرط أن لا يخدم غيره ولايرعى لغيره فيكون خاصاً. وفي ردالمحتار: اعلم أن الأجير للخدمة أو لرعي الغنم إنما يكون أجيراً خاصاً إذا شرط عليه أن لايخدم غيره أولا يرعى لغيره . (قوله وليس للخاص أن يعمل لغيره) بل ولايصلى النافلة ، قال في التتارخانية : وفي فتاوى الفضلي وإذا استاجر رجلاً يوماً يعمل كذا فعليه أن يعمل ذلک العمل إلى تمام المدة .(الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/٤ ٦،كتاب الاجارة،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وکیل بالبیع کا سامان بطورِ رہن رکھنے کا حکم:

سوال: زید نے عمرو کو وکیل بالبیع بنایا کچھ سامان کو بیچنے کے لیے، کیا عمرو کے لیے صحیح ہے کہ یہ کہدے کہ وہ اپنی فیس کے لیے سامان کو بیچنے تک رہن یا ضمانت کے طور پر رکھے گا؟

الجواب: وکیل بالبیع مبیع کو بیچنے تک اپنے پاس بطورِ ودیعت بالا جر رکھ سکتا ہے، رہن یا ضمانت کے طور پر نہیں۔یعنی دوعقد کرلیں، ایک یہ کہ فروخت تک اس کی یومیہ اجرت اتنی ہے اور دوسرا عقد یہ کہ بیع کے بعد مجھے قیمت کا اتنا فیصد ملے گا، دوعقد اس لیے الگ الگ کرے تا کہ صفقۃ فی صفقۃ کے وبال سے بچ جائے۔ پھر فروخت کرنے کے بعد جتنے دن چیز رکھی اتنے دن کا کرایہ وصول کرے اس لیے کہ وکیل بالبیع کے ذمہ یہ لازم نہیں کہ اس مبیع کو اپنی دکان پر رکھے ،لہذا اجرت لے سکتا ہے، ہاں اگر درمیان میں وہ چیز ہلاک ہوگئی تو اس پر ایک قول کے مطابق تاوان آئیگا۔

ملاحظہ ہو فتاوی ہندیہ میں ہے:

المودع إذا شرط الأجرة للمودع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه. (الفتاوى الهندية: ٣٤٢/٤).

بدائع الصنائع میں ہے:

المودع إذا شرط للمودع أجراً على حفظ الوديعة أن له الأجر لأن حفظ الوديعة

لیس بواجب علیه فجاز شرط الأجر. (بدائع الصنائع: ۱۵۱/۶،سعید).

درمختار میں ہے:

وهي (الوديعة) أمانة ، هذا حكمها مع وجوب الحفظ والأداء عند الطلب واستحباب قبولها، فلا تضمن بالهلاک إلا إذا كانت الوديعة بأجر...(الدرالمختار:۶۶۴/۵،سعید).

" الأشباه والنظائر" میں ہے:

وفي البزازية: لو جعل للكفيل أجراً لم يصح، وذكر الزيلعيؒ أن الوديعة بالأجر مضمونة ، وفي الصيرفية من أحكام الوديعة إذا استأجرالمودع المودع صح. (الاشباه والنظائر:۳۹۹/۲).

ومثله في تبيين الحقائق، وزاد بقوله: والمتاع في يد (أى الأجيرالمشترک) غيرمضمون بالهلاک...بخلاف الوديعة بأجر لأن الحفظ واجب عليه مقصوداً ببدل (فيضمن). (تبيين الحقائق:۱۳۵/۵،ملتان).

وكذا في مجمع الضمانات:۱۵۱/۱۔وشرح المجلة:۲۴۲/۳۔وفتاوی حقانیه:۳۹۹/۶).

دوسرا قول یہ ہے کہ مودع بالاجر پر ہلاک ہونے کی صورت میں تاوان نہیں آئیگا اور بعض علماء نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

ملاحظہ ہو ردالمحتار میں ہے:

وأما من جرى العرف بأنه يأخذ في مقابلة حفظه أجرة يضمن ،لأنه وديعة بأجرة لكن الفتوىٰ على عدمه، سائحاني. (ردالمحتار:۶۶۴/۵،کتاب الایداع ، سعید).

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

فإن شرط عليه الضمان إذا هلک يضمن في قولهم جميعاً، لأن الأجيرالمشترک إنما لايضمن عند أبي حنيفةؒ إذا لم يشترط عليه الضمان، أما إذا شرط يضمن، قال الفقيه أبوالليث، الشرط وعدم الشرط سواء، لأنه أمين ، واشتراط الضمان على الأمين باطل، وبه يفتىٰ. (خلاصة الفتاوىٰ:۱۳۷/۳).

امدادالاحکام میں ہے:

ودیعۃ بالاجر میں عدم ضمان پرفتویٰ ہے۔ (امدادالاحکام:۳/ ۶۳۷۔ وکذافی ایضاح النوادر،ص ۱۷۲).

حاصل یہ ہے کہ مودع بالاجر کے پاس اگرودیعت ہلاک ہوجائے تو تاوان آنے اور نہ آنے میں اختلاف ہے، اورفتاوی کا بھی اختلاف ہے جیسا کہ مذکور ہوا، بندہ فقیر کے خیال میں جب مالک نے ودیعت کی حفاظت کے لیے اجرت کا اہتمام کیا ہو، اور یہ بھی کہا کہ تم ذمہ دار ہو تو پھر تاوان کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب کہ سستی اور تکاسل عام ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مسلم کو وکیل بالبیع بنانے کا حکم:

سوال: اگرکسی شخص نے اپنے عیسائی ملازم کوشراب یاخنزیر کے گوشت کوفروخت کرنے کے لیے وکیل بنایا تو کیا یہ بیع ہوجائے گی یا نہیں؟ اور بیع ہوگئی تو اس سے حاصل شدہ قیمت کا کیا حکم ہے؟ اوراس طرح کرنا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام صاحبؒ کے نزدیک بیع صحیح ہے مگر مکروہِ تحریمی ہے اور ثمن واجب التصدق ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک بیع صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس طرح کرنا گناہ کا کام ہے اس سے بچنا چاہئے۔ ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

أمر المسلم ببيع خمر أو خنزير أو شرائهما أى وكل ذمياً أوأمر المحرم غيره أى غير المحرم ببيع صيده يعني صح ذلك عندالإمام مع أشد كراهة لأن العاقد يتصرف بأهليته وانتقال الملك إلى الآمر أمرحكمي، وقالا: لايصح، وهو الأظهر شرنبلالية عن البرهان، وفي ردالمحتار: قوله ببيع خمرأوخنزيرأى مملوكين له بأن أسلم عليهما ومات قبل أن يزيلهما وله وارث مسلم فيرثهما، قوله يعني صح ذلك. أى التوكيل وبيع الوكيل وشرائه، قوله أشد كراهة أى مع كراهة التحريم، فيجب عليه أن يخلل الخمر أو يريقها ويسيب الخنزير ولو وكله ببيعهما يجب عليه أن يتصدق بثمنهما نهر وغيره...قوله أمرحكمي أى يحكم الشرع بانتقال ماثبت للوكيل من الملك إليه فيثبت له كثبوت الملك الجبري له بموت مورثه. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۵/ ۸۳، باب البيع الفاسد، سعيد).

وكذا في حاشية الطحطاوي على الدرالمختار. وفيه أيضاً وأما في التوكيل بالبيع

فعليه أن يتصدق بثمهما أفاده الحموي، قوله وانتقال الملك إلى الآمر أمر حكمي فلا يمنع بسبب الإسلام بحر. (حاشية الطحطاوي على الدر المختار:۳/۷٦، كوئته.وكذا في المبسوط للامام السرخسیؒ:۱۳/۱۳۸،ادارة القرآن).

تبيين الحقائق میں ہے:

قال ولو أمر ذمياً بشراء خمر أوبيعها صح. وهذا عند أبي حنيفةؒ...لأن الوكيل أصل لنفس التصرف والموكل لحكم التصرف ألا ترى أنه يملك الخمر والخنزير بالإرث...ثم يتصدق بثمن الخمر إن باعها الوكيل له لتمكن الخبث فيه لقوله عليه السلام إن الذى حرم بيعها حرم شرائها وأكل ثمنها. (تبيين الحقائق:٤/٥٦،ملتان).

وفى الفتاوى الهندية: ولو وكل المسلم ذمياً ببيع الخمر أوشرائه جاز في قول أبي حنيفةؒ وقالا: لايجوز. (الفتاوى الهندية:۳/۱۱٥،فصل فى بيع المحرمات). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿وآخرون یضربون فی الأرض یبتغون من فضل اللّٰہ﴾

(سورة المزمل).

وروی عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما، أنہ کان سیدنا العباس بن عبد المطلب إذا دفع المال مضاربۃ اشترط علی صاحبہ أن لا یسلک بہ بحراً ولا ینزل بہ وادیاً ولا یشتری بہ دابۃ ذات کبد رطبۃ فإن فعل ذلک ضمن، فبلغ شرطہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فأجاز شرطہ.

(رواہ البیہقی فی الکبری، والطبرانی فی الاوسط).

باب المضاربۃ

وبعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والناس یتعاقدون المضاربۃ فلم ینکر علیہم.

(بدائع الصنائع).

مضاربت کے احکام کا بیان

مضاربت میں ملازم کی تنخواہ کا حکم:

گرامی قدر جناب معظم ومحترم حضرت مفتی صاحب، دامت برکاتہم العالیہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بعدہ؛ مقصدِ تحریر مندرجہ ذیل مسئلہ میں حکمِ شرعی معلوم کرنا ہے۔امید ہے کہ آنجناب تحریر فرما کر ممنون ومشکور ہوں گے۔

سوال: خالد اور راشد نے بطورِ مضاربت کے ایک تجارت کی خالد کی محنت اور راشد کا راس المال لگایا گیا اور ایک مزید مزدور اور ایک گاڑی خرید کر مختلف شہروں میں مال وغیرہ بیچنا شروع کر دیا گیا اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ؛

(۱) مذکورہ بالا صورت میں اس مزدور کی تنخواہ اور گاڑی کے مصارف کا ذمہ دار کون ہوگا؟

(۲) اگر بالفرض تجارت میں نفع نہ ہوا تو اس صورت میں ان دونوں کے اخراجات کون برداشت کریگا۔

مہربانی فرما کر جواب تحریر فرمائیں گے۔وجزاکم اللہ عنا خیرالجزاء فی الدارین.

الجواب: جاننا چاہئے کہ عقدِ مضاربت میں مضارب کی حیثیت ''جب اسے مالک نے اپنا مال سپرد کر دیا'' فقط امین کی ہے، اور جب اس مال میں تصرف شروع کرتا ہے تو وہ مالک کی طرف سے وکیل ہوتا ہے، اور جو بھی نفع حاصل ہوتا ہے اس میں وہ شریک ہوتا ہے، اس کے علاوہ کسی قسم کے نقصان کا ضامن ٹھہرانے کی شرط باطل ہے، چنانچہ اگر عقد کے وقت نفع کے ساتھ نقصان میں بھی شرکت کرائی گئی تو یہ شرط باطل ہے اور مضارب

نقصان میں شریک نہ ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیں:

وحكمها أنه أمين بعد دفع المال إليه ووكيل عند العمل وشريك عند الربح.

(البحر الرائق:٧/٢٦٤، كوئته).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

(وبطل الشرط) كشرط الخسران على المضارب. (ردالمحتار:٥/٦٤٨، سعيد).

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں خالد مضارب ہے اور راشد رب المال یعنی مالک ہے، کاروبار کو چلانے کے لیے جو گاڑی اور ملازم رکھا گیا ہے ان دونوں کے جملہ مصارف مالِ مضاربت سے ادا کیے جائیں گے، مضارب یعنی خالد پر شرعاً کوئی خرچ محنت کے سواء لازم نہیں ہے۔ چنانچہ اگر تجارت میں نفع ہوا تو سب سے پہلے اخراجات منہا کیے جائیں گے، بعد ازاں باقی ماندہ نفع دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ اور اگر تجارت میں نفع نہیں ہوا تو راس المال سے اخراجات ادا کیے جائیں گے، مضارب ان مصارف کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

البحر الرائق میں ہے:

وله الإبضاع والإيداع واستئجار العمال للأعمال واستئجار المنازل لحفظ الأموال واستئجار السفن والدواب وله أن يرهن ويرتهن لها. (البحر الرائق:٧/٢٦٤، كوئته).

نیز مذکور ہے:

(فإن ربح أخذ المالك ما أنفق من رأس المال أى ما أنفقه المضارب فإذا استوفى رأس ماله وفضل شيء اقتسماه، لأن ما أنفقه يجعل كالهالك وأشار المصنف إلى أن للمضارب أن ينفق على نفسه من مال المضاربة فى السفر قبل الربح وإلى أنه لو لم يظهر ربح لاشيء على المضارب. (البحر الرائق:٧/٢٧٠، كوئته).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وسبيل النفقة أن يحتسب من الربح إن كان وإن لم يكن فهي من رأس المال. (الفتاوى الهندية:٤/٣١٣).

شرح مجلّہ میں ہے:

على كل حال يكون الضرر والخسارة على رب المال وإذا شرط كونه مشتركاً عليه

وعلى المضارب فلا يعتبر ذلك الشرط، لأن هذا الشرط زائد لايوجب قطع الشركة فى الربح ولا الجهالة فيه فلا يكون مفسداً ويبطل الشرط . (شرح المجلة ـلمحمدخالد الاتاسى: ٣٦٤/٤، المادة : ١٤٢٨). واللہ ﷻ اعلم۔

مضاربت میں دفتری کاروائی کے مصارف کا حکم:

سوال: عقدِ مضاربت میں دفتری کاروائی کے مصارف کس کے ذمے لازم ہوں گے؟

الجواب: عقدِ مضاربت میں مضارب عملِ تجارت میں مالک کی طرف سے وکیل ہوتا ہے لہذا مضاربت کے جملہ مصارف واخراجات رأس المال سے ادا کیے جائیں گے، پھر اگر تجارت میں نفع ہوا تو سب سے پہلے رأس المال کی تکمیل کی جائے گی، پھر باقی ماندہ نفع دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائیگا۔ اور اگر تجارت میں نفع نہیں ہوا تو مضارب کے ذمہ کچھ لازم نہیں، لیکن مضارب کو عمل کا بدل بھی نہیں ملے گا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

(ويملك المضارب فى المطلقة) التي لم تقيد بمكان أو زمان أو نوع (البيع ... والشراء والتوكيل بهما والسفر براً وبحراً ...والإبضاع) أى دفع المال بضاعة ... (ويملك الإيداع والرهن والارتهان والإجارة والاستئجار). وفي ردالمحتار: (قوله والاستئجار) أى استئجار العمال للأعمال والمنازل لحفظ الأموال والسفن والدواب ... والأصل أن التصرفات فى المضاربة ثلاثة أقسام: قسم هو من باب المضاربة ، وتوابعها فيملكه من غير أن يقول له اعمل ما بدا لك كالتوكيل بالبيع والشراء والرهن والارتهان والاستئجار والإيداع والإبضاع والمسافرة. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦٤٨/٥، كتاب المضاربة، سعيد).

وفيه أيضاً: ويأخذ المالك قدرما أنفقه المضارب من رأس المال إن كان ثمة ربح فان استوفاه أو فضل شيء من الربح اقتسماه على الشرط لأن ما أنفقه يجعل كالهالك والهالك يصرف إلى الربح ، وإن لم يظهر ربح فلا شيء عليه أى المضارب . وفي رد المحتار: قوله ويأخذ أى من الربح ، قوله من رأس، وحاصل المسألة أنه لو دفع له ألفاً مثلاً

فأنفق المضارب من رأس المال مائة وربح مائة يأخذ المالك الربح بدل المائة التي أنفقها المضارب ليستوفى المالك جميع رأس ماله فلو كان الربح في هذه الصورة مائتين يأخذ مائة بدل النفقة ويقتسمان المائة الثانية. (الدر المختار مع رد المحتار:٥/٦٥٨،كتاب المضاربة، سعيد).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وللمضارب أن يعمل ما هو من عادات التجار وهو...واستئجار الأجراء لحفظ المال واستئجار الدواب للحمل واستئجار المكان والسفر. (فتاوىٰ قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية: ٣/١٦٦، فصل فيما يجوز للمضارب على المضاربة).

وللاستزادة انظر: (الفتاوى الهندية:٤/٣١٣،باب في نفقة المضارب۔والجوهرة النيرة:١/٣٥١۔وشرح المجلة: لمحمد خالد الاتاسي:٤/٣٦٣،المادة: ١٤٢٧). **واللہ ﷻ اعلم۔**

رب المال پر عمل کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: اگر ایک شخص نے دوسرے کو مال دیا اور عقدِ مضاربت کیا اس طور پر کہ جو نفع ہوگا وہ دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا جائے گا، لیکن یہ شرط لگائی کہ رب المال یعنی مالک بھی مضارب کے ساتھ کام کرے گا، تو ایسا عقدِ مضاربت درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو درست کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عقدِ مضاربت فاسد اور باطل ہے اس لیے کہ مالک پر عمل کی شرط لگانے سے عقدِ مضاربت باطل ہو جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

واشتراط عمل رب المال مع المضارب مفسد للعقد لأنه يمنع التخلية فيمنع الصحة. (الدر المختار مع رد المحتار:٥/٦٥٤،كتاب المضاربة،سعيد۔وشرح المجلة:٤/٣٣١،المادة:١٤١٠).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

المضاربة تفسد بأشياء...ومنها إذا شرط فى المضاربة عمل رب المال مع المضارب لأن ذلك يمنع التخلية بين المال والمضارب . (فتاوىٰ قاضيخان بهامش الهندية: ٣/١٦١،كتاب المضاربة).

وفی الفتاوی الهندية : فإن شرطا أن يعمل رب المال مع المضارب تفسد المضاربة سواء كان المالک عاقداً أو غير عاقد. (الفتاوی الهندية:٤/٢٨٦،کتاب المضاربة۔وبدائع الصنائع:٨٥،سعيد).

عقدِ مضاربت فاسد ہونے کے بعد اس کی تصحیح کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اس عقد کو عقدِ شرکت میں تبدیل کردے، اس طور پر کہ اگر رأس المال مثلاً دس ہزار رینڈ ہو تو رب المال اس میں سے کچھ مضارب کو بطورِ قرض دیدے، اور مضارب اس رقم کو رأس المال میں بطورِ شرکت جمع کردے جو نفع حاصل ہوگا وہ دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا، اور جب یہ عقد ختم ہوجائیگا تو رب المال اپنا قرض وصول کرلیگا۔

مجلّہ میں ہے:

لایشترط فی الشریکین شرکة عنان کون رأس مالهما متساوياً بل يجوز كون رأس مال أحدهما أزيد من رأس مال الآخر وكل واحد منهما لايكون مجبوراً على إدخال جميع نقده إلى رأس المال بل يجوز أن يعقد الشركة على مجموعه أو على مقدار منه فبهذه الجملة يجوز أن يكون لهما فضلة على رأس مالهما تصلح أن تكون رأس مال شركة كنقدهما مثلاً. (مجلة مع شرحها لمحمد خالد الاتاسی:٤/٢٩٢،المادة:١٣٦٥).

درمختار میں ہے:

وأما عنان... ولذا تصلح عاماً وخاصاً ومطلقاً ومؤقتاً ومع التفاضل في المال دون الربح وعكسه وببعض المال دون بعض. وفي ردالمحتار: قوله ومع التفاضل في المال دون الربح أي بأن يكون لأحدهما ألف وللآخر ألفان مثلاً واشترطا التساوي في الربح. (الدر المختار مع ردالمحتار:٤/٣١١،٣١٢،سعيد۔وبدائع الصنائع:٦/٦٢،سعيد).

وفي الفقه الحنفي وأدلته : شركة العنان لاتقتضي التساوي ، فيصح التفاضل بينهما بالمال ويصح التساوي في المال ويتفاضلان في الربح لأن الربح تارة يستحق بالمال وتارة بالعمل بدلالة المضاربة. (الفقه الحنفي و ادلته،ص١٠٤،بيروت).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

دو یا زیادہ افراد اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کا سرمایہ عمل، حقوق ونفع مساوی نہ ہوں، اس میں ہر

شریک دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے کفیل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر اگر زید اور عمل کر شرکت کریں اور زید ایک ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور عمر ڈیڑھ ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور منافع بھی اس تناسب سے طے کر لیں تو یہ شرکتِ عنان کہلائے گی۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۲۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالک کا بلاشرط عمل کرنے کا حکم:

سوال: اگر مالک پر عمل مشروط نہیں کیا گیا، لیکن وہ تبرعاً عمل کرتا ہے تو اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: عقدِ مضاربت میں مالک پر عمل مشروط نہیں ہے، اور دونوں کے درمیان تخلیہ ہے، اور مالک اجنبی کی طرح ہے، اگر وہ تبرعاً عمل کرتا ہے، یعنی مضارب کی مدد کرتا ہے تو یہ جائز اور درست ہے، اس کی وجہ سے عقدِ مضاربت فاسد نہیں ہوگا۔

ہدایہ میں ہے:

فإن دفع شيئاً من مال المضاربة إلى رب المال بضاعة فاشترى رب المال وباع فهو على المضاربة (أى لايفسد المضاربة)...لأن التخلية فيه قد تمت وصار التصرف حقاً للمضارب فيصلح رب المال وكيلاً عنه فى التصرف والإبضاع توكيل منه فلا يكون استرداداً بخلاف شرط العمل عليه فى الابتداء لأنه يمنع التخلية . (الهداية:۳/۲۶۸).

شرحِ عنایہ میں ہے:

إن الواجب هو التخلية وقد تمت فصار التصرف حقاً للمضارب، وله أن يوكل ورب المال صالح لذلک، والإبضاع توكيل لأنه استعانة ، ولما صح استعانة المضارب بالأجنبي فرب المال أولىٰ لكونه أشفق على المال فلايكون استرداداً ، بخلاف شرط العمل عليه ابتداء لأنه يمنع التخلية . فإن قيل: رب المال لايصلح وكيلاً لأن الوكيل من يعمل في مال غيره، ورب المال لايعمل في مال غيره بل في ماله. أجيب بأن رب المال بعد التخلية صار كالأجنبي عن المال فجاز توكيله. (شرح العناية بهامش فتح القدير:۸/٤٧٤،دار الفكر).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولم يشترط عمله ثم استعان به على العمل أو دفع المال بضاعة جاز لأن الاستعانة

لاتوجب خروج المال عن يده وسواء كان المالك عاقداً أوغيرعاقد. (بدائع الصنائع:٦/٨٥، سعيد). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

مالک کا اجیر بن کر عمل کرنے کا حکم:

سوال: عقدِ مضاربت منعقد ہونے کے بعد اگر مضارب نے رب المال کو تنخواہ دار ملازم رکھا تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مالک کو تنخواہ دار ملازم رکھنا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ سے عقدِ مضاربت فاسد ہوجائے گا، ہاں بطورِ معاون کام کرنے کی گنجائش ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وقد قالوا في المضارب إذا دفع المال إلى رب المال مضاربة بالثلث فالمضاربة الثانية فاسدة والمضاربة الأولىٰ على حالها جائزة والربح بين رب المال وبين المضارب على ما شرطا في المضاربة الأولى ولا أجر لرب المال...أما فساد المضاربة الثانية فلأن يد رب المال يد ملك ويد الملك مع يد المضارب لايجتمعان فلا تصلح المضاربة الثانية ويقيت المضاربة الأولىٰ على حالها...لأن رب المال يصيرمعيناً للمضارب والإعانة لاتوجب إخراج المال عن يده فيبقى العقد الأول ولا أجر لرب المال لأنه عمل في ملك نفسه فلا يستحق الأجر. (بدائع الصنائع:٦/٨٥، كتاب المضاربة،سعيد۔و كذا في شرح المجلة، لمحمدالاتاسي،٤/٣٣١، المادة: ١٤١٠). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

عقدِ مضاربت میں نفع متعین کرنے کا حکم:

سوال: حامد کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے، محمود نے اس کو بیس لاکھ رینڈ دیئے، کہ وہ اس رقم سے شرعی طریقہ پر تجارت کرے، اور یہ شرط لگائی کہ ایک سال میں چار لاکھ رینڈ سے زیادہ نفع ہوگا تو چار لاکھ سے اوپر مزید رقم مضارب اور رب المال کے درمیان ۵۰٪ کے حساب سے تقسیم ہوگی، مثلاً حامد اگر چھ لاکھ رینڈ نفع کمائے تو اسے ایک لاکھ ملیں گے، لیکن اگر صرف چار لاکھ کمائے گا تو اسے کچھ نہیں ملے گا، شیئرز کی خرید وفروخت

میں اگر نقصان ہو جائے تو مالک برداشت کریگا۔ اب اس کا کیا حکم ہے؟ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسئلہ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ تجارت میں جو بھی نفع ہوگا اس میں سے راس المال کا بیس فیصد رب المال کو ملے گا، اور بیس فیصد کے اوپر مزید جو بھی نفع ہو، اس میں مضارب اور مالک دونوں شریک ہوں گے، اور فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ تمام صورتیں جن میں ایک فریق کے لیے نفع کی کچھ مقدار متعین کی جائے، یا نفع کی کوئی خاص مقدار مستثنیٰ کرنے کے بعد تقسیم کی جائے یہ سب ناجائز ہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ متعین مقدار سے زیادہ نفع نہ ہو تو ایک فریق محروم ہوگا۔ نیز کسی ایک کے لیے راس المال کا فیصد متعین کرنا بھی ناجائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں ہدایہ میں ہے:

ومن شرطها: أن يكون الربح بينهما مشاعاً لايستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح، لأن شرط ذلک يقطع الشركة بينهما، ولا بد منها كما في عقد الشركة. وفي فتح القدير: لأن اشتراط دراهم مسماة لأحدهما يتمشى في صور متعددة مذكورة في معتبرات الفتاوى كالبدائع والذخيرة وغيرهما: منها أن شرطا أن يكون لأحدهما مائة درهم من الربح أو أقل أو أكثر والباقي للآخر، ومنها: أن شرطا لأحدهما نصف الربح أوثلثه إلا عشرة دراهم، ومنها: أن شرطا لأحدهما نصف الربح أو ثلثه ويزاد عشرة، وفي كل ذلک تفسد المضاربة بناء على أن كل واحد من الشروط المزبورة يقطع الشركة فى الربح لأنه ربما لايربح إلا القدر المسمى أو أقل كما صرحوا به. (الهداية مع فتح القدير: ٨/٤٤٨، ٤٤٩، كتاب المضاربة، دار الفكر).

شرح مجلّہ میں ہے:

الثاني أن يكون جزءاً شايعاً قل أوكثر كالنصف أو الثلث لأن الشركة فى الربح إنما تتحقق به حتى لوشرطا لأحدهما مائة من الربح مثلاً أومائة مع الثلث أو الثلث إلا مائة والباقي للآخر لم تجز المضاربة لأنه يؤدي إلى قطع الشركة فى الربح لجواز أن لايربح إلا ذلک القدر. زيلعي، وحاشية للشلبي. الثالث: أن يكون المشروط للمضارب مشروطاً من الربح حتى لوشرطا شيئاً من رأس المال أومنه ومن الربح فسدت المضاربة كما فى الهندية عن المحيط. (شرح المجلة لمحمد خالدالاتاسى: ٤/٣٣٣، تحت المادة: ١٤١١).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

المضاربة تفسد بأشياء منها إذا شرط لأحدهما من الربح ما يقطع الشركة نحو أن يجعل له دراهم مسماة مائة أو أقل أو أكثر فسدت. (فتاویٰ قاضیخان بهامش الهندية:۳/۱۶۱، كتاب المضاربة).

وللاستزادة انظر: (بدائع الصنائع: ۶/۸۶، سعید).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

آج کے دور میں شرکت کی ایک صورت یہ بھی چل نکلی ہے کہ ایک چلتی دکان یا فیکٹری وغیرہ کا مالک اپنے رشتہ داروں یا جاننے والوں سے کہتا ہے کہ تم کاروبار میں اتنی رقم شامل کرو تو ہر مہینہ تمہیں اتنا فیصد نفع ملے گا، وہ رقم شامل کرتا ہے اور ہر ماہ اس کو نفع کی مقررہ مقدار مل جاتی ہے اس کو عام طور پر لوگ جائز کاروبار سمجھتے ہیں، حالانکہ اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) کسی بھی کاروبار میں سرمایہ پر نفع متعین کر کے دینا یہ قرض دے کر سود وصول کرنے کے حکم میں داخل ہے جو صریح حرام ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام :۲/۲۵).

البتہ عقدِ مضاربت کی صحیح اور جائز صورت یہ ہے کہ حامد اور محمود کے درمیان نفع فیصد کے اعتبار سے طے کیا جائے، مثلاً جو بھی نفع ہو محمود ۸۰٪ فیصد اور حامد ۲۰٪ فیصد لے گا، تو یہ جائز اور درست ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اخراجات راس المال سے لینے کی شرط کا حکم:

سوال: عقدِ مضاربت میں مضارب نے یہ شرط لگائی کہ کھانا پینا اور گھر کے جملہ اخراجات راس المال سے وصول کریگا کیا ایسی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: عقدِ مضاربت میں اگر مضارب اپنے شہر میں رہ کر تجارت کرتا ہے تو اس صورت میں کھانا پینا اور گھر کے اخراجات راس المال سے وصول کرنا جائز اور درست نہیں ہے، اور اس قسم کی شرط لگانا مفسدِ عقد ہے۔ ہاں اگر دوسرے شہر میں تجارت کرتا ہے تو کھانے پینے اور رہائش کا ضروری خرچہ راس المال سے وصول کرسکتا ہے، مزید براں وصول کرنا درست نہیں ہے۔ پھر جب تجارت میں نفع حاصل ہوگا تو اولاً راس المال کی تکمیل کی جائیگی بعدازاں بقیہ نفع دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائیگا۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

الثالث: أن يكون المشروط للمضارب مشروطاً من الربح حتى لو شرطا شيئاً من رأس المال أو منه فسدت المضاربة. (شرح المجلة لمحمد الاتاسی:٤/٣٣٣،تحت المادة:١٤١١۔وكذا فی الفتاوی الهندية:٤/٢٨٧).

درمختار میں ہے:

وإذا سافر ولو يوماً فطعامه وشرابه وكسوته وركوبه وكل مايحتاجه عادة أی في عادة التجار بالمعروف في مالها وإن عمل فی المصر سواء ولد فيه أو اتخذه داراً فنفقته في ماله...ويأخذ المالک قدرما أنفقه المضارب من رأس المال إن كان ثمة ربح فإن استوفاه أو فضل شيء من الربح اقتسماه على الشرط لأن ما أنفقه يجعل كالهالک والهالک يصرف إلى الربح. وفی ردالمحتار: قوله ولو يوماً لأن العلة في وجوب النفقة حبس نفسه لأجلها فعلم أنه ليس المراد بالسفرالشرعي بل المراد أن لايمكنه المبيت في منزله، فإن أمكن أنه يعود إليه في ليلة فهو كالمصر لانفقة له. (الدرالمختار مع ردالمحتار:٥/٦٥٧،فصل فی المتفرقات،سعيد).

عالمگیری میں ہے:

إذا عمل المضارب فی المصر فليست نفقته فی المال وإن سافرفطعامه وشرابه وكسوته وركوبه معناه شراء وكراء في مال المضاربة فلو بقي شيء في يده بعد ما قدم مصره رده فی المضاربة ولوكان خروجه دون السفر إن كان بحيث يغدو ثم يروح فيبيت بأهله فهو بمنزلة السوقي فی المصر وإن كان بحيث لايبيت بأهله فنفقته في مال المضاربة كذا فی الهداية. والنفقة هي مايصرف إلى الحاجة الراتبة وهي الطعام والشراب والكسوة وفراش ينام عليه والركوب وعلف دابته كذا فی محيط السرخسی...وسبيل النفقة أن يحتسب من الربح إن كان وإن لم يكن فهي من رأس المال لأن النفقة جزء هالک والأصل فی الهلاک أن ينصرف أولاً إلى الربح كذا فی المحيط...فإن أنفق من مال المضاربة شيئاً على نفسه قبل أن يشترى به فإنه يستوفی رب المال رأس ماله بكماله كذا فی محيط

السرخسی . (الفتاوی الهندية:٤/٣١٢،باب فی نفقة المضارب).

وللاستزادة انظر: (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع:٦/١٠٥۔١٠٧،سعید)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مالک کے لیے ماہانہ متعین رقم طے کرنے کا حکم:

سوال: زید نے عمرو کو تجارت کے لیے ایک دکان فراہم کردی، اور کل سرمایہ بھی زید کا ہے، عمرو تجارت کرے گا، لیکن زید نے یہ شرط لگائی کہ نفع ہو یا نہ ہو ماہانہ دس ہزار رینڈ عمرو سے وصول کرے گا، یہ معاملہ کس عقد کے تحت آئیگا، اور کیا ایسا عقد شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: معاملہ مذکورہ بالا مضاربت کا معاملہ کہلاتا ہے، اور عقدِ مضاربت میں مضارب یا رب المال کے لیے ماہانہ رقم طے کرنا جائز اور درست نہیں، بلکہ یہ شرط مفسدِ عقد ہے، نیز یہ متعین رقم سود کے مشابہ ہونے کی وجہ سے اس کا وصول کرنا حرام ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ومن شرطها (المضاربة) أن يكون الربح بينهما مشاعاً لايستحق أحدهما دراهم مسماة من الربح لأن شرط ذلک يقطع الشركة بينهما ولا بد منها كما في عقد الشركة ، فإن شرط زيادة عشرة فله أجر مثله لفساده فلعله لايربح إلا هذا القدر فيقطع الشركة فى الربح . (الهداية:٣/٢٥٨،كتاب المضاربة).

شرح عنایہ میں ہے:

ومن شرط المضاربة أن يكون الربح بينهما مشاعاً ومعناه أن لا يستحق أحدهما دراهم من الربح مسماة ، لأن شرط ذلک ينافي الشركة المشروطة لجوازها والمنافی لشرط جواز الشيء مناف له وإذا ثبت أحد المتنافيين انتفى الآخر كما إذا ثبت الوجود انتفى العدم . (العناية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٨/٤٤٨،دار الفكر).

بدائع الصنائع میں ہے:

ومنها أن يكون المشروط لكل واحد منهما من المضارب ورب المال من الربح جزءاً شائعاً نصفاً أو ثلثاً أو ربعاً فإن شرطا عدداً مقدراً بأن شرطا أن يكون لأحدهما مائة

درهم من الربح أو أقل أو أكثر والباقي للآخر لايجوز والمضاربة فاسدة، لأن المضاربة نوع من الشركة وهي الشركة في الربح وهذا شرط يوجب قطع الشركة في الربح لجواز أن لايربح المضارب إلا هذا القدر المذكور فيكون ذلك لأحدهما دون الآخر فلا تتحقق الشركة فلايكون التصرف مضاربة . (بدائع الصنائع:٦/٨٥، كتاب المضاربة،سعيد).

وللاستزادة انظر: (الكفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير:٧/٤١٨، مكتبه رشيديه۔وتبيين الحقائق:٥/٥٤، ملتان۔والاختيار لتعليل المختار:٣/٢١۔الجوهرة النيرة:١/٣٥١۔والدر المختار مع ردالمحتار:٥/٦٤٨۔والفتاوى الهندية:٤/٢٨٧۔والبحر الرائق:٧/٢٦٤، كوئته۔والفتاوى السراجية،ص٥٣١۔وامدادالفتاوى:٣/٤٢۔واحسن الفتاوى :٧/٢٤٥۔وجدید معاملات کے شرعی احکام:٢/٢٥). واللہ ﷻ اعلم۔

مضاربت میں منافع کی جہالت کا حکم:

سوال: خالد نے بکر کو کچھ رقم دی اور کہا کہ اس رقم سے کاروبار کرو، تمہارے لیے کچھ کردوں گا، صراحۃً کوئی تعیین نہیں کی نہ فیصد کے اعتبار سے اور نہ عدد کے اعتبار سے، اب اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: یہ عقدِ مضاربت کا معاملہ ہے لیکن منافع کی جہالت کی وجہ سے عقد فاسد ہوگیا، اور مضاربتِ فاسدہ میں مضارب کو اجرتِ مثل ملے گی۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

يشترط في المضاربة كشركة العقد كون رأس المال معلوماً وتعيين حصة العاقدين من الربح جزءاً شايعاً كالنصف والثلث...وقول هذه المادة: وتعيين حصة العاقدين من الربح الخ، يتضمن اشتراط ثلاثة أمور: الأول؛ أن يكون نصيب كل منهما من الربح معلوماً حتى لوكان مجهولاً بأن شرط للمضارب جزءاً أو شيئاً أو ردد بين النصف والثلث مثلاً تكون فاسدة ، لأن الربح هو المعقود عليه و جهالته توجب فسادالعقد. (شرح المجلة، لمحمد خالد الاتاسي: ٤/٣٣٢، المادة:١٤١١).

ہدایہ میں ہے:

وکل شرط یوجب جهالة فی الربح یفسده لاختلال مقصوده . (الهداية:۲۵۸/۳،کتاب المضاربة۔وکذا فی الدرالمختارمع ردالمحتار:۶٤۸/۵،سعید).

کفایہ شرح ہدایہ میں ہے:

الربح هو المعقود علیه وجهالة المعقود علیه توجب فساد العقد . (الكفاية فی شرح الهداية علی هامش فتح القدير:۴۲۰/۷، مكتبه رشيديه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مضاربتِ فاسدہ کا حکم:

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وإذا عمل المضارب فی المضاربة الفاسدة وربح كان كل الربح لرب المال وللمضارب أجر المثل تاماً لأن المضاربة إذا فسدت تبقى إجارة وفى الإجارة الفاسدة إذا عمل الأجير كان له أجر مثله تاماً. (فتاوی قاضیخان علی هامش الهندية:۱٦۲/۳).

بدائع الصنائع میں ہے:

وأما حكم المضاربة الفاسدة...ولايستحق النفقة ولاالربح المسمى وإنماله أجرمثل عمله سواء كان فی المضاربة ربح أولم يكن لأن المضاربة الفاسدة في معنى الإجارة الفاسدة والأجير...إنما يستحق أجرالمثل. (بدائع الصنائع:۱۰۸/٦،سعيد).

درمختار میں ہے:

إجارة فاسدة إن فسدت فلا ربح للمضارب حينئذٍ بل له أجرمثل عمله مطلقاً ربح أو لا بلا زيادة على المشروط خلافاً لمحمد والثلاثة . و في رد المحتار: قوله مطلقاً هو ظاهر الرواية ، قهستاني .قوله ربح أولا وعن أبي يوسفؒ إذا لم يربح لا أجر له وهوالصحيح لئلا تربو الفاسدة على الصحيحة سائحاني ومثله في حاشية ط عن العيني، قوله خلافاً لمحمد، فيه إشعار بأن الخلاف فيما إذا ربح وأما إذا لم يربح فأجرالمثل بالغاً مابلغ لأنه لايمكن تقدير بنصف الربح المعدوم كما فی الفصولين لكن فی الواقعات ماقاله أبويوسفؒ مخصوص بما إذا ربح وما قاله محمد إن له أجرالمثل بالغاً ما بلغ فيما هو أعم ، قهستاني.

(الدر المختار مع رد المحتار: ٥/٦٤٦، سعید).

شرح مجلّہ میں ہے:

استحقاق رب المال للربح بماله فيكون جميع الربح له في المضاربة الفاسدة والمضارب بمنزلة أجيره يأخذ أجر المثل لكن لايتجاوز المقدار المشروط حين العقد ولايستحق أجر المثل إن لم يكن ربح. اعتباراً بالمضاربة الصحيحة لأنهما رضيا أن يكون للعامل جزء من الربح لوحصل وبالحرمان إن لم يحصل ولو أوجبنا عليه أجراً عند عدم الربح أو زيادة على المسمى إذاربح، لربت الفاسدة على الصحيحة .وهذا قول أبي يوسفؒ وهو الصحيح كما في رد المحتار عن السايحاني ومثله في الطحطاوي عن العيني . وفي حاشية أبي السعود عن ابن الفرس: وعند محمدؒ وهوظاهر الرواية ، أنه يجب أجر المثل مطلقاً ربح أولم يربح زاد على المسمى أو لا هذا مانقله في الشرنبلالية عن التبيين وشرح المجمع والخلاصة، لأنه لايستحق المسمى لعدم الصحة ولم يرض بالعمل مجاناً ، وأن أجر الأجير يجب بتسليم المنافع أوبتسليم العمل وقد وجد تسليم كل منهما هنا زيلعي. وقيل الخلاف بينهما فيما إذاربح وأما إذا لم يربح فأجر المثل بالغاً مابلغ .وقد علمت أن الصحيح ما مشت عليه المجلة في هذه المادة . (شرح المجلة، لمحمدخالد الاتاسی:٤/٣٦٢، المادة:١٤٢٦).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اگر کسی شرط فاسد سے عقد مضاربہ فاسد ہوجائے تو معاملہ ختم کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس عقد سے حاصل ہونے والے کل منافع رب المال کے ہوں گے، مضارب کو اجرت مثل ملے گی، البتہ اس کی مقدار طے شدہ منافع سے زیادہ نہیں ہونی ہونا چاہئے، نیز اگر اس عقد میں نفع نہ بھی ہو تب بھی مضارب اجرت کا حقدار ہوگا۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۵۱).

خلاصہ یہ ہے کہ عقدِ مضاربت جب فاسد ہوجائے تو مضارب کو اجرتِ مثل ملنی چاہئے، امام محمدؒ کے قول کے مطابق جو کہ ظاہر الروایہ ہے، چاہے نفع ہو یا نہ ہو، جیسا کہ صاحبِ بدائعؒ اور قاضیخانؒ کی عبارات سے ظاہر ہے۔ البتہ شارحِ مجلّہ محمد خالد اتاسی نے فرمایا اس مادہ میں مجلّہ کا قول صحیح ہے یعنی ربح نہ ہونے پر اجیر کو کچھ نہیں ملے

گا۔وکذا في شرح المجلة لعلی حیدر:۳/۴۸۴، المادة:۱۴۲۶۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

مضارب کا اپنی کمپنی سے عقد کرنے کا حکم:

سوال: زید کو کسی نے ایک لاکھ رینڈ مضاربت پر دیے، اس نے لکڑی کا سامان خریدا، اب یہ سامان زید اپنی کمپنی کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر زید پوری کمپنی کا مالک ہے، تو اس کا اپنی کمپنی کو بیچنا خود اپنی ذات سے بیچنے کے مترادف ہے، اور فتاویٰ بزازیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ رب المال کی اجازت سے ایسا عقد جائز اور درست ہے، اور اگر زید کمپنی کا ایک فرد ہے تب بھی تہمت کا اندیشہ ہے اس لیے قیمتِ مثل میں فروخت کرنے کی اجازت ہے، اس سے کم قیمت میں فروخت کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں رب المال کا نقصان ہوگا اور مضارب ضرر رساں کام نہیں کرسکتا۔

ملاحظہ ہو فتاوی بزازیہ میں ہے:

الوكيل بالبيع لايملک شراء ه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً وبائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه...وإن أمره الموكل أن يبيعه من نفسه أوأولاده الصغارأو ممن لايقبل له شهادته فباع منهم جاز. (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة:۵/۴۷۵،الرابع فی البیع).

درمختار میں ہے:

لايعقد وكيل البيع والشراء مع من ترد شهادته له للتهمة وجوازه بمثل القيمة إلا من عبد ومكاتبه إلا إذا أطلق له الموكل كـ بع ممن شئت فيجوز بيعه لهم بمثل القيمة اتفاقاً ... وفي السراج: لو صرح بهم جاز إجماعاً إلا من نفسه وطفله وعبده غير المديون. وفي رد المحتار: قوله إلا من نفسه، وفي السراج: لو أمره بالبيع من هؤلاء فإنه يجوز إجماعاً إلا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أو عبده ولا دين عليه فلا يجوز قطعاً وإن صرح به الموكل، الوكيل بالبيع لايملک شراء ه لنفسه.....(بزازية) كذا في البحر، ولايخفى ما بينهما من المخالفة، وذكر مثل ما في السراج في النهاية عن المبسوط، ومثل مافي البزازية في الذخيرة عن الطحاوي وكأن في المسئلة قولين خلافاً لمن يدعي أنه لامخالفة بينهما. (الدر

المختارمع ردالمحتار:۵/۵۲۱،۵۲۲،سعید۔ وکذا فی البحرالرائق مع الحاشیة منحة الخالق:۷/۱۶۷،کوئٹه).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

إذا اشترى المضارب أو باع ممن لاتقبل شهادته بسبب القرابة أو الزوجية أو الملک كمكاتبه والعبد المديون فإن كان البيع والشراء بمثل القيمة جازعندهم جميعاً وإن كان مما لايتغابن الناس بمثله لايجوز عندهم جميعاً وإن كان مما يتغابن الناس في مثله لم يجز عند أبي حنيفةؒ وعندهما يجوز إلا من مكاتبه وعبده المديون هكذا في المحيط .

(الفتاوى الهندية:۴/۲۹۴).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وليس له أن يعمل بما فيه ضرر ولا ما لايعمله التجار. (فتاوى الشامي:۵/۶۴۹،سعيد).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

ایک قول کے مطابق رب المال کی اجازت سے مضارب اپنے نفس سے عقد کرسکتا ہے۔(احسن الفتاویٰ: ۷/۲۴۸). واللہ ﷻ اعلم۔

مضارب کے لیے عقدِ تولیہ کا حکم:

سوال: جب عقدِ مضاربت مطلق ہوتو مضارب کے لیے جائز ہے کہ بیع تولیہ کا عقد کرے؟

الجواب: مضاربتِ مطلقہ میں مضارب ایسا کام نہیں کرسکتا ہے، جس میں ضرراور نقصان ہواور تجار کے درمیان معروف نہ ہو،اس کے علاوہ تجارت سے متعلق ہر کام کرسکتا ہے،لہذا عقدِ تولیہ کرنے کی بھی اجازت ہوگی ، بلکہ بعض مرتبہ کسی خاص مصلحت کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے،مثلاً ممکن ہے کہ اس چیز کی ویلیوکم ہوگئی ہو،یا مشتری پراحسان کرنا چاہتا ہے، کیونکہ مشتری نے مضارب کوفائدہ پہونچایا ہے یا آئندہ پہونچادے،لیکن یہ عمل دائماًنہیں کرنا چاہئے،کبھی کبھی کسی مصلحت کی وجہ سے کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہومبسوط میں ہے:

قال رحمه الله تعالىٰ: وإذا دفع إلى رجل مالاً مضاربة ولم يقل اعمل فيه برأيک فله أن يشترى به مابدا له من أصناف التجارة ويبيع لأنه نائب عن صاحب المال فى التجارة.

(المبسوط للامام السرخسیؒ:۲۲/۳۸)۔

درمختار میں ہے:

(و يملك المضارب فى المطلقة) التي لم تقيد بمكان أو زمان أو نوع (البيع) ولو فاسداً (بنقد ونسيئة متعارفة والشراء والتوكيل بهما والسفر براً وبحراً)...ويملك الإيداع والرهن والارتهان والإجارة والاستئجار...لأن كل ذلك من صنيع التجار. وفي رد المحتار: وليس له أن يعمل بما فيه ضرر ولاما لايعمله التجار. (الدرالمختارمع رد المحتار:۵/۶۴۹،سعید)۔

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قال الصدرالشهيدؒ: التصرفات فى المضاربة ثلاثة أقسام: قسم هومن باب المضاربة وتوابعها فيملكها بمطلق الإيجاب وهو الإيداع والإبضاع والإجارة والاستئجار والرهن والارتهان وما أشبه ذلك الخ. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:۳/۳۶۴، کوئٹہ)۔

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وللمضارب أن يعمل ما هو من عادات التجارة وهو الاتضاع والإيداع واستئجار الأجراء لحفظ المال واستئجارالدواب للحمل،الخ. (فتاویٰ قاضیخان بهامش الهندية:۳/۱۶۶)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

رب المال کے لیے اپنے مکان کا کرایہ لینے کا حکم:

سوال: حامد نے محمود کو اپنی ایک دکان تجارت کے لیے فراہم کردی، اورکل سرمایہ بھی حامد کا ہے، محمود فقط تجارت کرتا ہے، حامد نے محمود سے کہا کہ میری دکان کا کرایہ ماہانہ دس ہزار رینڈ آپ سے وصول کروں گا، چاہے تجارت میں نفع ہو یا نقصان، کیا ایسا عقد درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ مضارب رب المال کے ساتھ عقد منعقد کرسکتا ہے، اوراجارہ بھی ایک عقد ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں رب المال کا مضارب سے ماہانہ دس ہزار رینڈ بطورِ کرایہ وصول کرنا درست ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ولو شرى من رب المال بألف عبداً شراه رب المال بنصفه رابح بنصفه وكذا عكسه لأنه وكيله ومنه علم جواز شراء المالك من المضارب وعكسه. وفي رد المحتار: قوله وكذا عكسه وهو ما لو كان البائع المضارب والمسألة بحالها بأن شرى رب المال بألف عبداً شراه المضارب بنصفه ورأس المال ألف فأنه يرابح بنصفه. (الدر المختار مع رد المحتار:٥/٦٥٩،سعيد).

(وكذا في البحر الرائق:٧/٢٧١،كوئته ـ والفتاوى الهندية:٤/٢٩٢ـ واحسن الفتاوىٰ:٧/٢٤٨).

واللہ ﷻ اعلم۔

محدود ذمہ داری کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص اپنی کمپنی کو (limited liability) محدود ذمہ داری میں رجسٹر کرنا چاہے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کمپنی کے شیئرز خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

(limited liability) محدود ذمہ داری کا مختصر تعارف:

محدود ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ حاملانِ حصص (Share Holders) کی ذمہ داریاں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائیگا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہوگیا تو حاملانِ حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۴۲)۔

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

''محدود ذمہ داری'' جدید قانونی اور معاشی اصطلاح کے مطابق ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں کسی کاروبار میں شریک یا شیئرز ہولڈر خود کو اس رقم سے زائد ذمہ داری اٹھانے سے محفوظ بناتا ہے جو رقم اس نے محدود ذمہ داری والی کمپنی یا شراکت (partnership) میں لگائی ہے، اگر کاروبار کو خسارہ ہوجاتا ہے تو ایک شیئرز ہولڈر زیادہ سے زیادہ جو نقصان اٹھائے گا وہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا اصل راس المال کھو بیٹھے گا، لیکن یہ خسارہ اس کے ذاتی اثاثوں تک نہیں پھیلے گا، اور اگر کمپنی کے اثاثے اس کی (قرضوں وغیرہ) کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے کافی نہیں ہیں، تو قرض خواہ شیئرز ہولڈرز کے ذاتی اثاثوں سے اپنے قابل وصول بقایاجات وصول کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۵/۱۷۵)۔ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں کمپنی اوراس کے حصہ دار عقدِ مضاربت میں رب المال اور مضارب کی طرح ہیں، کیونکہ کمپنی میں حصہ دار(Share Holders) کمپنی میں اپنا سرمایہ لگا کر نفع میں شریک ہوتے ہیں عمل نہیں کرتے ہیں، لہذا حاملانِ حصص رب المال کے حکم میں ہوں گے۔

(limited liability) محدود ذمہ داری کا حکم:

اکثر علماءِ عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے، وہ ''عبد ماذون فی التجارۃ'' ہے، یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ کی مملوک ہوتی ہے، اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہوسکتا ہے اور نہ مولیٰ سے، یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہوگیا، یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لیے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئرز ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہوجاتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی مولیٰ کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔ (اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ص۱۰۰، مکتبہ معارف القرآن کراچی).

غیر سودی بینکاری میں ہے:

استاذِ مکرم حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن بھی شیئرز کی خرید وفروخت کو ان شرائط کے ساتھ جائز سمجھتے تھے، پاکستان میں این آئی ٹی یونٹ تقریباً تمام تر اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ لگاتا ہے، اور یہ ساری کمپنیاں محدود ذمہ داری کی کمپنیاں ہوتی ہیں، ہمارے دار الافتاء میں حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ موجود ہے جس میں این آئی ٹی یونٹ میں سرمایہ لگانے کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور اس فتوے پر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب مدظلہم کے تائیدی دستخط بھی ثبت ہیں۔ (غیر سودی بینکاری، ص۳۵۶).

نیز مذکور ہے:

حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت کمپنی بینک کی ذمہ داری محدود (لمیٹڈ) ہونے سے بینک کے اندر رب المال اور مضارب کے جو تعلقات اور باہمی حقوق وفرائض ہیں، ان پر کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، رب المال پر جتنی ذمہ داری شریعت کی رو سے عائد ہوتی ہے، اتنی ہی عائد رہے گی، اور مضارب کی شریعت کی رو سے جتنی ذمہ داری بنتی

ہے، وہی باقی رہے گی، کیونکہ مضارب کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اس میں مضارب کی کسی تعدی کے بغیر حقیقی نقصان ہوجائے تو وہ رب المال پر پڑتا ہے، مضارب کا نقصان صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اس کی محنت بیکار گئی، بینک جب مضارب بنا، اور ڈپازیٹر رب المال قرار پائے تو اگر بینک کی کسی تعدی کے بغیر کوئی حقیقی نقصان ہوتا ہے تو ارباب الاموال اسے شرعی حکم کے طور پر برداشت کریں گے، اس وجہ سے نہیں کہ بینک کی ذمہ داری محدود ہے۔ (غیر سودی بینکاری، ص۳۵۲)۔

درمختار میں ہے:

وما هلک من مال المضاربة يصرف إلى الربح لأنه تبع فإن زاد الهالک على الربح لم يضمن ولوفاسدة من عمله لأنه أمين . وفي ردالمحتار: قوله ولوفاسدة أی سواء كانت المضاربة صحيحة أو فاسدة ، وسواء كان الهلاک من عمله أولا ، قوله من عمله يعنى المسلط عليه عندالتجار ، وأما التعدي فيظهر أنه يضمن . (الدر المختار مع ردالمحتار:۵/٦٥٦،سعيد).

مسئلہ بالا کے بارے میں حضرت مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ نے تفصیلی کلام فرمایا ہے اور اس پر وارد ہونے والے اشکالات کے جوابات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (اسلام اور جدید معیشت وتجارت، و اسلام اور جدید معاشی مسائل، وغیر سودی بینکاری)۔

اشکال اور جواب:۔

لیکن ایک اور اشکال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہوجائے تو مضاربت کے اصول کے تحت تمام ربح جو عقد کی ابتداء سے رب المال اور مضارب نے کمایا تھا، واپس کیا جائے گا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

إن قسم الربح وبقيت المضاربة ثم هلک المال أو بعضه ترادا الربح ليأخذ المالک رأس المال وما فضل بينهما وإن نقص لم يضمن . (الدر المختار:۵/٦٥٦،سعيد).

اس کا جواب یہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی اپنے شیئرز ہولڈرز کے ساتھ ہر سال نیا عقد کرلے، بعدازاں کمپنی کے دیوالیہ ہونے پر صرف نئے عقد کے بعد والا نفع دیون میں مضمون ہوگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وإن قسم الربح وفسخت المضاربة والمال في يد المضارب ثم عقداها فهلک المال لم يترادا وبقيت المضاربة لأنه عقد جديد وهي الحيلة النافعة للمضارب. وفي ردالمحتار: قوله النافعة للمضارب أی لو خاف أن يسترد منه رب المال الربح بعد القسمة بسبب هلاک ما بقي من رأس المال وعلم مما مر آنفاً أنه لايتوقف صحة الحيلة على أن يسلم المضارب رأس المال إلى رب المال وتقييد الزيلعي به اتفاقي كما نبه عليه أبو السعود. (الدر المختار مع ردالمحتار: ٦٥٦/٥،سعيد).

خلاصہ یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کو رجسٹر کرانا اور اس کے شیئرز خریدنا شرائطِ مذکورہ کے ساتھ جائز اور درست ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عامل کے لیے کچھ زیادہ متعین کرنے کا حکم:

سوال: اگر دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوں یعنی دونوں کا سرمایہ مشترک ہے، اور ان میں سے ایک کام کرتا ہے اور دوسرا کام نہیں کرتا، اور عامل کے لیے زیادہ حصہ مقرر کیا جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ معاملہ شرکت کا ہے یا مضاربت کا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ درحقیقت مضاربت کا ہے جس میں عامل کے لیے کچھ زیادہ مثلاً ۸۰ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً زید کے ایک لاکھ رینڈ اور عمر کے ایک لاکھ رینڈ ہیں، اور عمر کے لیے بوجہ عامل ہونے کے ۸۰ فیصد اور زید کے لیے ۲۰ فیصد مقرر ہوا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۵۰ فیصد منافع عمر کے اپنے مال کے ہیں، اور بقیہ ۵۰ فیصد میں سے ۳۰ فیصد عمر کو لاجل العمل اور زید کو ۲۰ فیصد لاجل المال ملیں گے، اور شرکت سے مراد شرکت فی الربح ہوگی جو مضاربت ہے۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ في الشركة: وفي النهر اعلم أنهما إذا شرطا العمل عليهما أن تساويا مالاً وتفاوتا ربحاً جاز عند علمائنا الثلاثة رحمهم الله تعالىٰ خلافاً لزفر رحمه الله تعالىٰ، والربح بينهما على ما شرطا وإن عمل أحدهما فقط، وإن شرطا ه على أحدهما، فإن شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز، ويكون مال الذي لا عمل له بضاعة عند العامل له ربحه وعليه وضيعته وإن شرطا الربح للعامل أكثر من رأس ماله جاز أيضاً

علی الشرط ویکون مال الدافع عند العامل مضاربة، ولو شرطا الربح للدافع أكثر من رأس ماله لایصح الشرط ویکون مال الدافع عند العامل بضاعة لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما أبداً هذا حاصل مافي العناية. مافي النهر، قلت:وحاصل ذلک كله أنه إذا تفاضلا في الربح فإن شرطا العمل عليهما سوية جاز ولو تبرع أحدهما بالعمل وكذا لو شرطا العمل على أحدهما وكان الربح للعامل بقدر رأس ماله أو أكثر ولوكان الأكثر لغيرالعامل أولأقلهما عملاً لايصح وله ربح ماله فقط ، وهذا إذا كان العمل مشروطاً. الخ. (ردالمحتار:۳۱۲/۴، کتاب الشرکة، سعید).

تقریرات الرافعی میں ہے:

قوله وإن شرطاه على أحدهما فإن شرطا الربح بينهما بقدرالخ) في الدرر من كتاب المضاربة مانصه : والثالث أي من شروط المضاربة تسليمه إلى المضارب حتى لايبقى لرب المال فيه يد لأن المال يكون أمانة عنده فلايتم إلا بالتسليم كالوديعة بخلاف الشركة لأن المال في المضاربة من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر فلا بد أن يخلص المال للعامل ليتمكن من التصرف فيه، وأما العمل في الشركة فمن الجانبين فلو شرط خلوص اليد لأحدهما لم تنعقد الشركة لانتفاء شرطها وهوالعمل منهما، فظاهر مافيها ينافي مانقله المحشي ويقال في دفع المنافاة إن شرط العمل منهما شرط لتحقيق الشركة وإذا شرط على أحدهما تكون مضاربة أوبضاعة على ماذكره المحشي تأمل، ثم أنه لاحاجة...إلى قوله وتخصيص العمل بأحدهما يخرج المسألة عن أن تكون من مفردات مسائل الشركة بل هي حينئذٍ بضاعة إن شرط العمل على أحدهما مع التساوي في الربح ومضاربة إن شرط الفضل للعامل. (التحريرالمختارعلى هامش ردالمحتار:۷۰/۴،سعيد).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

شرکت میں عمل من الجانبین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے اس لیے یہ شرکت نہیں مضاربت ہے، پھر اگر رب المال کی طرف سے مال لگانا درجہ شرط میں نہ ہو تو کوئی اشکال نہیں اور اگر مشروط ہو تو بھی مضاربت وشرکت میں ملایمت کی وجہ سے جائز ہے، چونکہ اس صورت میں مضاربت اصل ہے اور شرکت بالتبع ،اس لیے عمل من

الجانبین کی شرط مرتفع ہوگئی۔اسی طرح اشتراط العمل من الجانبین کے ساتھ تفاضل فی الربح بھی اسی لیے جائز ہے کہ یہ صورت اولیٰ کے برعکس اصل میں شرکت ہے اور مضاربت بالتبع اس لیے اشتراط العمل علی الجانبین مضر نہیں۔(جدید معاملات:۲/۳۱).

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۵/۴۷). واللہ ﷻ اعلم۔

کمپنی کو بطورِ مضاربت مال دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کمپنی کو کچھ رقم دی ٹینک خریدنے کے لیے،وہ کمپنی ٹینک خرید کر اپنے منیجر کے حوالہ کرتی ہے اور کمپنی کا منیجر اس ٹینک کو دوسرے ٹینکوں کے ساتھ اجرت پر دیتا ہے،پھر حاصل شدہ نفع آپس میں تقسیم کرتے ہیں،اس طور پر کہ تقریباً ۱۵ فیصد منیجر لیتا ہے اور ۵ فیصد کمپنی لیتی ہے،اور بقیہ نفع ٹینک کے مالکوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے،شرعاً اس عقد کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ عقدِ مضاربت کا ہے،اس طور پر کہ ٹینک کے مالکان حضرات رب المال کے حکم میں ہے،اور کمپنی،منیجر وغیرہ مضارب کے حکم میں ہیں،اور مالِ مضاربت کو دوسروں کے مال کے ساتھ ملا کر تجارت کرنا رب المال کی صراحۃً اجازت سے یا یہ کہنے سے کہ اپنی رائے پر عمل کرو جائز اور درست ہے،اور آپس میں نفع فیصد کے اعتبار سے متعین ہے،لہٰذا یہ عقدِ مضاربت صحیح اور درست ہے۔

عالمگیری میں ہے:

الأصل أن ما يفعله المضارب ثلاثة أنواع نوع يملكه بمطلق المضاربة وهومايكون من باب المضاربة وتوابعها ومن جملته التوكيل بالبيع والشراء للحاجة...ونوع لايملكه بمطلق العقد ويملكه إذا قيل له اعمل برأيک وهومايحتمل أن يلحق به فيلحق به عند وجود الدلالة وذلک مثل دفع المال مضاربة أوشركة إلى غيره وخلط مال المضاربة بماله أو بمال غيره . (الفتاوى الهندية:٤/ ٢٩١،باب فيمايملك المضاربمن التصرفات).

درمختار میں ہے:

ولايملک المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن. وفي ردالمحتار: قوله والخلط بمال نفسه أي أوغيره كما في البحرإلا أن تكون معاملة التجارفي تلک البلاد أن

المضاربين يخلطون، ولاينهونهم فإن غلب التعارف بينهم في مثله وجب أن لايضمن كما في التاتارخانية. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٥/٦٤٩، كتاب المضاربة، سعيد).

فتاویٰ قاضیخان میں ہے:

وللمضارب أن يعمل ما هو من عادات التجار وهو...واستئجار الأجراء لحفظ المال واستئجار الدواب للحمل واستئجار المكان والسفر. (فتاوىٰ قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية: ٣/١٦٦، فصل فيمايجوزللمضارب على المضاربة). (وكذا في البحرالرائق:٧/٢٦٤، كوئته).

شرح مجلّہ میں ہے:

الثاني أن يكون جزءاً شايعاً قل أوكثر كالنصف أوالثلث لأن الشركة فى الربح إنما تتحقق به حتى لوشرطا لأحدهما مائة من الربح مثلاً أومائة مع الثلث أوالثلث إلا مائة والباقي للآخر لم تجز المضاربة لأنه يؤدي إلى قطع الشركة فى الربح لجواز أن لايربح إلا ذلك القدر. زيلعى، وحاشية للشلبي. (شرح المجلة لمحمد خالدالاتاسى:٤/٣٣٣، تحت المادة:١٤١١).

مزید ملاحظہ ہو: (جدید معاملات کے شرعی احکام:۲/۲۳).

چونکہ آج کل مضاربت میں دوسرے اموال کے ساتھ مال ملانا معروف ہے، لہٰذا اجازت کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ شامی کی عبارت سے واضح ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مضاربت فسخ کرنے کا حکم:

سوال: زید اور عمرو نے ۲۰۰۲ء میں مضاربت شروع کی، زید (رب المال) کا حصہ ۲۵ فیصد اور عمرو (مضارب) کا حصہ ۷۵ فیصد قرار پایا، ۲۰۰۷ء میں مضارب نے رب المال کو صرف ۳۰۰۰ کا نفع دیا اور کہا کہ اپنا راس المال واپس لے لو، جب بقیہ منافع کا مطالبہ کیا گیا تو مضارب نے کہا کہ آہستہ آہستہ ادا کرتا رہوں گا۔

سوال یہ ہے کہ مضاربت ختم ہوئی یا نہیں اور بعد میں بقیہ منافع کا لینا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ رب المال کو اطلاع دے کر عقدِ مضاربت ختم کر سکتے ہیں، اور اگر مضارب کے پاس فی الحال رقم موجود نہ ہو تو بقیہ منافع کا بعد میں وصول کرنا بھی جائز ہے، لیکن اگر مضارب کے پاس

موجود ہے تو ٹال مٹول کرنا جائز نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غير لازم ولكل واحد منهما أعني رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه وهوعلم صاحبه لما ذكرنا في كتاب الشركة ويشترط أيضاً أن يكون رأس المال عيناً وقت الفسخ دراهم أو دنانيرحتى لونهى رب المال المضارب عن التصرف ورأس المال عروض وقت النهي لم يصح نهيه . (بدائع الصنائع: ۱۰۹/۶، سعید).

بدایۃ المجتہد میں ہے:

أجمع العلماء على أن اللزوم ليس من موجبات عقد القراض، وان لكل واحد منهما فسخه ما لم يشرع العامل في القراض، واختلفوا إذا شرع العامل، فقال مالك: هو لازم ... وقال الشافعي وأبوحنيفة : لكل واحد منهم الفسخ إذا شاء . (بداية المجتهد:۱۸۱/۲، القول فی احکام القراض، دارنشرالکتب).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

عقد مضاربت فریقین میں سے جو بھی چاہے اور جس طرح چاہے ختم کرسکتا ہے، مگر عقد فسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے ساتھی کو اس سے مطلع کردیا جائے، لیکن اس فسخ کا اطلاق اس وقت صحیح ہوگا جب مال نقدی کی شکل میں موجود ہو، اگر مال اثاثہ (عروض) کی صورت میں ہو تو پھر مضارب کو اثاثہ فروخت کرنے کا موقع دیا جائے گا تاکہ اصل نفع متعین ہو جائے جس کے لیے عقد ہوا تھا۔ (فتاویٰ حقانیہ:۳۵۴/۶).

مزید ملاحظہ ہو: (اسلامی فقہ:۳۹۷/۲). واللہ ﷻ اعلم۔

مضارب کے لیے تنخواہ مقرر کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص بطورِ مضاربت ایک دکان میں کام کرتا ہے، اس طرح کہ نفع میں سے ۲۵ فیصد اس کو ملتا ہے اور ۷۵ فیصد رب المال لیتا ہے، یا کسی کے ساتھ شریک ہے تو کیا شریک اور مضارب کو حصہ کے علاوہ تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یہاں تنخواہ دینے کا رواج ہے؟

الجواب: مضارب کوعمل کا بدل منافع میں سے فیصد کے اعتبار سے دیا جائے گا، لیکن ماہانہ متعین تنخواہ نہیں لے سکتا، ہاں مضارب اگر تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے کام کرتا ہے تو تنخواہ لے سکتا ہے، لیکن اگر تنخواہ کے ساتھ منافع میں سے کچھ کم کر کے دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ شریک اجیر بن سکتا ہے یا نہیں اس میں علماء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء کے یہاں یہ ناجائز ہے، البتہ حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحبؒ نے اجازت دی ہے۔

ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

لا أجر للشريک في العمل بالمشترک. (ردالمحتار: ٤/٣٢٦،سعيد).

النتف في الفتاویٰ میں ہے:

لو كان طعام بين رجلين فقال أحد هما لصاحبه: احمله إلى الموضع كذا، ولک في نصيبي من الأجر كذا، أوقال: اطحنه ولک في نصيبي كذا من الأجر، جاز ذلک في قول زفرؒ ومحمد بن صاحبؒ، ولايجوزفي قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ ومحمدؒ. (النتف في الفتاوی:ص٣٤٩، كتاب الاجارة، اجارة الشريك شريكه، سعيد).

مفتی رشید احمد صاحب فقہاء کی عبارات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

نصوصِ مذکورہ سے امورِ ذیل ثابت ہوئے:

(۱) شریک کو اجیر رکھنے کا عدم جواز کسی نصِ شرعی سے ثابت نہیں۔

(۲) حضرت امام صاحبؒ سے بھی اس بارہ میں کوئی روایت نہیں۔

(۳) امام محمدؒ کا قول ہے مگر آپ سے اس کی کوئی علت منقول نہیں۔

(۴) بعض مشائخ نے جو علل بیان فرمائی ہیں وہ دوسرے مشائخ کی نظر میں مخدوش ہیں۔

(۵) علامہ سعدیؒ نے اس کو اجارۃ المشاع کی طرح قرار دیا ہے۔

(۶) اجارۃ المشاع باجماع الائمۃ الاربعۃؒ جائز ہے، البتہ امام صاحبؒ غیر شریک کے لیے ناجائز فرماتے ہیں۔

(۷) ائمہ ثلاثہ اجارۃ المشاع کی طرح شریک کو اجیر رکھنے کے جواز پر متفق ہیں۔

(۸) قفیز الطحان کی حرمت نص شرعی سے ثابت ہونے کے باوجود بعض فقہاء نے بوجہ تعامل اس کے

جواز کا قول فرمایا ہے مگر دوسرے فقہاء نے اسے اس لیے قبول نہیں فرمایا کہ یہ تعامل ان کے بلاد سے خاص ہے اور تعامل خاص سے ترکِ نص شرعی جائز نہیں۔

(۹) ترکِ نص شرعی کے لیے تعامل عام شرط ہے مگر ترکِ نص مذہب کے لیے تعامل خاص بھی کافی ہے۔

(۱۰) مذہبِ حنفی ہونے کی حیثیت سے اقوال صاحبینؒ سے تعامل پر مبنی احکام مقدم ہیں۔

(۱۱) نص مذہب کو تو تعامل خاص سے بھی ترک کر دیا جاتا ہے اور کمپنی کے شرکاء کو اجیر رکھنے کا تو تعامل عام ہے، لہٰذا اس میں بطریق اولیٰ نص مذہب متروک ہوگی، بالخصوص جب کہ یہ نص امام بھی نہیں بلکہ قول محمدؒ ہے جس سے تعامل مقدم ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۳۲۸)۔

قال ابن عابدينؒ : فهذه النقول ونحوها دالة على اعتبار العرف الخاص وإن خالف المنصوص عليه في كتب المذهب مالم يخالف النص الشرعي...أقول: وبما قررناه تبين لک أن ما تقدم عن الأشباه من المذهب عدم اعتبار العرف الخاص إنما هو فيما إذا عارض النص الشرعي وأما العرف الخاص إذا عارض النص المذهبى المنقول عن صاحب المذهب فهو معتبر كما مشى عليه أصحاب المتون والشروح والفتاوى...ليس للمفتي ولا القاضي أن يحكما بظاهر الرواية ويتركا العرف . (رسائل ابن عابدين: ۲/۱۳۳)۔

وفيه أيضاً : فهذا كله وأمثاله دلائل واضحة على أن المفتي ليس له الجمود على المنقول في كتب ظاهر الرواية من غير مراعاة الزمان وأهله وإلا يضيع حقوقاً كثيرة ويكون ضرره أعظم من نفعه . (رسائل ابن عابدين: ۲/۱۳۱)۔

و فيه أيضاً : ولهذا ترى مشايخ المذهب خالفوا مانص عليه المجتهد في مواضع كثيرة بناها على ما كان في زمنه لعلمهم بأنه لو كان في زمنهم لقال بما قالوا به أخذاً من قواعد مذهبه. (رسائل ابن عابدين: ۲/۱۲۵، مكتبه محمدويه، كوئته)۔

العرف والعادۃ میں ہے:

بيع الثمار على الأشجار...وظاهر مذهب الحنفية بطلانه، وبه قال شمس الأئمة السرخسي، وأفتى الحلواني وأبوبكر بن الفضل من مشايخ المذهب بالجواز...والحلواني

وابن الفضل عدلا عن ظاهر المذهب للعرف، قال ابن الفضل: استحسن فيه لتعامل الناس، فإنهم تعاملوا ببيع ثمار الكرم بهذه الصفة، ولهم في ذلک عادة ظاهرة، وفي نزع الناس عن عاداتهم حرج، وكون هذا من بيع المعدوم المنهى عنه وتصريح ظاهر المذهب ببطلانه، لايمنع من صحة ما أفتوا به، لأن العرف كما علمنا يخصص الأدلة ويعدل به عن ظاهر المذهب. (العرف والعادة،ص۱۷۲،۱۷۳).

خلاصہ یہ ہے کہ معاملات میں لوگوں کی سہولت کی خاطر آسانی کا پہلو اختیار کرنا چاہئے، بشرطیکہ شریعت کی حدود سے متجاوز نہ ہو اور شریک کی تنخواہ پر چونکہ لوگوں کا تعامل بھی جاری ہے، لہذا بقولِ حضرت مفتی رشید صاحبؒ کے اس کی گنجائش ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تجارت میں نفع نہ ہو تو فسخ کرنے کا حکم:

سوال: دو آدمیوں کے درمیان عقدِ مضاربت کا معاملہ ہوا کہ ایک کا مال اور دوسرا عمل کرے گا، ایک زمین خریدی گئی ایک لاکھ رینڈ میں جس پر چند دکانیں بنانا ہے اور پھر اس سے جو نفع ہوگا وہ دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، تعمیر کا کام تقریباً ایک سال تک جاری رہے گا، اس معاہدہ کے تقریباً پانچ ماہ بعد رب المال اس کو فسخ کرنا چاہتا ہے، اتنی مدت میں راس المال سے تقریباً تیس ہزار رینڈ تعمیر کے کام میں خرچ ہوئے، اب سوال یہ ہے کہ اگر مضارب اس زمین کو اپنے لیے رکھ لے تو رب المال کو کتنا پیسہ واپس کرے گا، دوسرا سوال یہ ہے کہ اب تک کوئی نفع نہیں ہوا تو مضارب کو کیا ملے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عقدِ مضاربت میں رب المال اور مضارب دونوں کو اطلاع دیکر فسخ کرنے کا اختیار ہے، اور فسخ کرنے کی صورت میں مضارب کے ذمہ رب المال کو راس المال واپس کرنا ضروری ہے، لہذا صورتِ مسئولہ میں مضارب یا تو زمین کسی اور کو بیچ دے یا خود خرید لے اور راس المال واپس کردے، اور چونکہ اب تک کوئی نفع نہیں ہوا اس وجہ سے مضارب کو کچھ نہیں ملے گا۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غير لازم ولكل واحد منهما أعني رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه وهو علم صاحبه لما ذكرنا في كتاب الشركة

ويشترط أيضاً أن يكون رأس المال عيناً وقت الفسخ دراهم أودنانيرحتى لو نهى رب المال المضارب عن التصرف ورأس المال عروض وقت النهى لم يصح نهيه، وله أن يبيعها لأنه يحتاج إلى بيعها بالدراهم والدنانيرليظهرالربح فكان النهى والفسخ إبطالاً لحقه في التصرف فلايملك ذلك . (بدائع الصنائع:٦/١٠٩،سعيد).

وفيه أيضاً: والثاني مايستحقه المضارب بعمله في المضاربة الصحيحة هو الربح المسمى إن كان في المضاربة ربح...فإن لم يكن فيها ربح فلا شيء للمضارب لأن الشرط قد صح فلايستحق إلا ما شرط وهوالربح ولم يوجد. (بدائع الصنائع:٦/١٠٧،سعيد).

وفيه أيضاً : ويجوز شراء رب المال من المضارب وشراء المضارب من رب المال ، وإن لم يكن في المضاربة ربح في قول أصحابنا الثلاثة. (بدائع الصنائع:٦/١٠١،سعيد).

اسلامی فقہ میں ہے:

اگر مضاربت کا معاہدہ طے ہوگیا، اور مضارب نے اپنا کام ابھی شروع نہیں کیا تو تمام ائمہ متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس معاہدہ کے توڑنے کا اختیار ہے، لیکن اگر اس نے کام شروع کر دیا ہے، تو پھر معاہدہ فسخ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، اس بارے میں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اب کسی کو معاہدہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہے،...مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو ہر وقت یہ اختیار ہے کہ جب چاہیں وہ معاملہ فسخ کر دیں،...مگر فسخ کی اطلاع دینی ضروری ہے۔ (اسلامی فقہ:۲/۳۹۷).

ہاں اگر راس المال سے خریدی ہوئی زمین کی قیمت بڑھ گئی تو اس میں مضارب کا ربح ثابت ہوگیا، اب بیچنے کے بعد جو قیمت آئے گی اس میں سے راس المال علیحدہ کر کے نفع دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائیگا۔

درمختار میں ہے:

(ولا يعتق عليه) أي المضارب (إن كان في المال ربح)...(فإن فعل...وقع الشراء لنفسه) وإن لم يكن ربح كما ذكرنا (صح) [أي الشرء] للمضاربة ، فإن ظهرالربح بزيادة قيمته [أي العبد] بعد الشراء عتق عليه حظه، ولم يضمن نصيب المالك لعتقه لا بصنعه.

(الدرالمختار:٥/٦٥١،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مضارب پر نقصان کے تاوان کا حکم:

سوال: حامد اور محمود دونوں نے تجارت شروع کی، معاہدہ میں لکھا کہ ۵ لاکھ روپے راس المال کے طور پر محمود دیگا، اور حامد تجارت کریگا، حاصل شدہ نفع میں ہے سے ۷۵ فیصد محمود لے گا، اور ۲۵ فیصد نفع حامد کو ملے گا، اگر کوئی نقصان ہوگا تو فقط محمود برداشت کریگا، معاہدہ کے مطابق دو سال سے تجارت کر رہے تھے، کچھ عرصہ پہلے چند لوگوں نے حامد سے مال خریدا اور لاپتہ ہوگئے، اور رقم ادا نہیں کی، اب محمود حامد سے نقصان کا مطالبہ کرتا ہے، جب کہ معاہدہ میں اس کے خلاف مرقوم ہے، اور حامد پوری وسعت کے مطابق صحیح طریقہ پر تجارت کر رہا تھا، اس کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں تھی، اب شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: عقدِ مضاربت میں مضارب جو مال رب المال سے حاصل کرتا ہے اس میں وہ امین ہے، اور تصرف کے لحاظ سے وہ وکیل بھی ہے، یعنی سرمایہ لگانے والے کا وہ نمائندہ ہے، اور امین کی حیثیت سے سرمایہ کی حفاظت کرنا لازم اور ضروری ہے، لیکن اگر اتفاق سے اس سرمایہ میں نقصان آجائے یا ضائع ہوجائے تو مضارب اس کا ذمہ دار نہیں، لیکن اگر یہ ثبوت مل جائے کہ اس نے قصداً مال کو ضائع کیا ہے، تو پھر وہ ذمہ دار ہوگا، نیز رب المال کے شرائط کی مخالفت کی ہے تب بھی ذمہ دار ہوگا۔

مذکورہ بالا حکم شرعی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صورتِ مسئولہ کا حکم شرعی یہ ہے کہ نقصان کی تلافی اولاً حاصل شدہ نفع سے کی جائے گی، اور اگر نفع نہیں ہوا یا نقصان نفع سے زیادہ ہے اور حامد نے تجارت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو حامد نقصان کا ذمہ دار نہیں، بلکہ محمود نقصان برداشت کریگا۔

نیز اگر معاہدہ میں نقصان کی شرط مضارب پر عائد کی گئی ہوتی تو پھر بھی مضارب اس کا ذمہ دار نہیں، اور مضاربت بھی فاسد نہیں ہوتی، بلکہ شرط خود باطل ہوجاتی۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

(ویملک المضارب فی المطلقة) التي لم تقید بمکان أو زمان أو نوع (البیع)... (بنقد ونسیئة متعارفة). وفي ردالمحتار: قوله بنقد ونسیئة ولو اختلفا فیهما فالقول للمضارب فی المضاربة . (الدر المختار مع ردالمحتار:٥/٦٤٨، کتاب المضاربة،سعید).

ہدایہ میں ہے:

وما هلک من مال المضاربة فهو من الربح ، دون راس المال ، فإذا زاد الهالک

علی الربح فلا ضمان علی المضارب لأنه أمین . (الهداية :۲۶٦/۳).

(وكذا في الدرالمختار مع ردالمحتار:٦٥٦/٥،سعيد).

ہدایہ میں ہے:

وغير ذلک من الشروط الفاسدة لايفسدها ويبطل الشرط كشرط الوضيعة على المضارب. (الهداية:۲۵۸/۳۔و كذا في الدرالمختار:٦٤٨/٥).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

صورتِ مذکورہ میں عقدِ مضاربت صحیح ہے لیکن کل نقصان فقط روپیہ دینے والے کے ذمہ ہوگا، (مضارب) کام کرنے والے کے ذمہ اس میں سے کچھ نہ ہوگا۔

وفي ردالمحتار: قوله بطل الشرط كشرط الخسران على المضارب. (جدید معاملات کے شرعی احکام:۳۳۳/۲). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

اسلامی اصول پر نفع حاصل کرنے کا طریقہ:

سوال: اگر ایک بینک یا کمپنی اسلامی اصول کے مطابق لوگوں سے رقم لے کر اس رقم پر نفع حاصل کرے اور رقم والوں کو نفع دے تو اس کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب: کمپنی یا بینک لوگوں سے مضاربت کے طور پر رقم وصول کرے، رقم رکھوانے والے رب المال کی طرح ہوں گے، اور کمپنی یا بینک مضارب کی حیثیت سے موسوم ہوں گے بشرطیکہ وہ تجارت کریں، اور نفع ان کے درمیان خاص طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائیگا، مثلاً رب المال کے لیے ۴۰ فیصد اور مضارب (بینک) کے لیے ۶۰ فیصد، اور ظاہر بات ہے کہ لوگوں کی رقم جمع کرنے اور نکالنے کی تاریخ ایک نہیں ہوتی، تو اس میں ''الحساب الیومی'' روزانہ پیداوار پر مبنی حساب، (Daily Product Basis) کی بنیاد پر نفع تقسیم کیا جائے، جس شخص کی رقم بینک میں جتنے دن رہی اتنے دنوں کے حساب سے منافع کا اوسط دے دیا جائے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر ولامضاربة بدونها . (الهداية:

۳/۲۵۷، کتاب المضاربة).

البتہ نفع حاصل کرنے میں شرکت اور مضاربت کے حسبِ ذیل بنیادی اصول کی رعایت بہت ضروری ہے۔

(۱) سرمایہ کے تناسب سے نفع مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہوگا اس کا فیصد مقرر کیا جائے۔

(۲) نفع کا جو تناسب بھی چاہیں باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں، نفع کی تقسیم بقدرِ سرمایہ ضروری نہیں، البتہ جس شریک نے کام نہ کرنے کی شرط لگائی ہو اس کا نفع اس کے سرمایہ کے تناسب سے زائد نہیں ہوسکتا۔

(۳) نفع میں تو مختلف شرکاء کے لیے مختلف شرحیں طے کی جاسکتی ہیں، لیکن نقصان میں اس طرح کرنا جائز نہیں، نقصان بہرحال سرمایہ کے بقدر ہوگا، جس کو فقہاء یوں تعبیر فرماتے ہیں:

"الربح علی ما اصطلحوا علیه، والوضیعة بقدر رأس المال".

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (اسلام اور جدید معیشت وتجارت۔ واسلامی فقہ، جلد دوم۔ واسلام اور جدید معاشی مسائل، جلدِ پنجم)۔

اشکال اور جواب:

"الحساب الیومی" پر ایک اشکال ہوتا ہے کہ اس طریقہ پر نفع کی تقسیم، تقسیم قریبی ہے نہ کہ سرمایہ کے حقیقی نفع کی تقسیم، اور اس میں اندیشہ یہ ہے کہ زید کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ عمر کے پاس چلا جائے؟

الجواب: اس کا جواب یہ ہے کہ شرکت میں شرکاء کے اموال مشاع طور پر مخلوط ہوتے ہیں، لہٰذا نفع تقسیم کرتے وقت حقیقی نفع نہیں دیکھا جاتا بلکہ مجموعی سرمایہ سے جو مجموعی نفع ہوا ہو وہ تقسیم کیا جاتا ہے، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ زید کے سرمایہ سے بالکل ہی نفع نہ ہوا ہو اور نفع فقط عمر کے سرمایہ سے ہوا ہو، لہٰذا شرعاً حقیقی تقسیم مطلوب نہیں بلکہ تقریبی کافی ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معیشت وتجارت از حضرت مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مضاربت کو وقت کے ساتھ مقید کرنے کا حکم:

سوال: عقدِ مضابت میں اگر کسی نے یہ کہا کہ آپ کا اختیار ہے جتنی مدت تک کے لیے رقم لگائے، لیکن کم از کم ۵ سال کی مدت، اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ سال ہونا ضروری ہے، کیا ایسی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عقدِ مضاربت کو وقت کے ساتھ مقید کرنا اور یہ شرط لگانا جائز اور درست ہے، البتہ فقہاء کے کلام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقل مدت کی شرط صحیح نہیں ہے، اس سے پہلے بھی فسخ کرنے کا اختیار ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وإن وقت للمضاربة وقتاً بعينه يتقيد به حتى يبطل العقد بمضيه. (الفتاوى الهندية: ٤/ ٢٩٨).

(وكذا في شرح المجلة: ٤/ ٣٥٥، المادة: ١٤٢٠).

اسلامی فقہ میں ہے:

وقت کی تعیین کی صورت میں اس مدت کے ختم ہوتے ہی دونوں میں سے ہر ایک کو معاملہ ختم کر دینے کا اختیار ہے۔ (اسلامی فقہ: ۲/ ۳۹۷).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

حنفی اور حنبلی مکاتبِ فکر کے مطابق مضاربہ کو ایک خاص مدت کے اندر محدود کیا جا سکتا ہے، مثلاً ایک سال، چھ ماہ وغیرہ، جس کے بعد مضاربہ بغیر کسی نوٹس کے ختم ہو جائے گا،... کیا فریقین کی طرف سے مضاربہ کی کم از کم مدت بھی طے کی جا سکتی ہے جس سے پہلے مضاربہ کو ختم نہ کیا جا سکے؟ ایک ضابطہ عموماً یہاں ذکر کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوئی مدت متعین نہیں کی جا سکتی، اور ہر فریق کو جب وہ چاہے معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے۔

فریقین کا مضاربہ ختم کرنے کا یہ غیر محدود اختیار موجودہ حالات میں بعض مشکلات پیدا کر سکتا ہے، اس لیے کہ آج کل اکثر کاروباری مہمیں اپنے ثمرات دکھانے کے لیے کچھ وقت کی محتاج ہوتی ہیں، انہیں پیچیدہ اور مستقل مزاجی والی کوششیں درکار ہوتی ہیں، اس لیے اگر رب المال کاروباری مہم کے بالکل شروع ہی میں مضاربہ ختم کر دیتا ہے تو یہ بات اس منصوبے کے لیے بڑی مشکل کا باعث ہوگی، خاص طور پر مضارب کے لیے شدید دھچکا ہوگا جو کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود کچھ نہیں کما سکے گا، اس لیے اگر عقدِ مضاربہ میں داخل ہوتے وقت ہی

فریقین اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ کوئی فریق بھی ایک معینہ مدت کے اندر چند مخصوص حالات کے علاوہ مضاربہ کو ختم نہیں کرے گا، تو یہ بات بظاہر شریعت کے کسی اصول کے خلاف معلوم نہیں ہوتی، بالخصوص اس حدیث کی روشنی میں، جس میں یہ آیا ہے:

المسلمون على شروطهم إلا شرطاً أحل حراماً أوحرم حلالاً ". (رواه الترمذي وصححه، برقم:١٣٥٢، في باب ما يذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس).

مسلمانوں کے درمیان طے شدہ شرطوں کو برقرار رکھا جائے گا، سوائے ان شرطوں کے جو کسی حرام کی اجازت دیدیں یا کسی حلال کو حرام کردیں۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴۶/۵، ۴۷، بعنوان ''مضاربہ کو ختم کرنا'')۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مضاربت سے متعلق چند مسائل:

مضاربت کے چند مسائل دریافت کرنے کی جرءت کر رہا ہوں جواب سے نوازدیجئے؟

سوال: (۱) اگر رب المال مضارب پر یہ شرط لگادے کہ نقد میں کاروبار کریں تو کیا وہ ادھار میں کاروبار کرسکتا ہے؟

الجواب: نہیں کرسکتا ہے۔

مبسوط میں ہے:

ولو دفعه إليه مضاربة على أن يشتري بالنقد و يبيع فليس له أن يشتري إلا بالنقد لأن هذا تقييد مفيد في حق رب المال. (المبسوط للامام السرخسیؒ: ٤٤/٢٢، باب مايجوز للمضارب ومالايجوز). **واللہ ﷻ اعلم۔**

سوال: (۲) کیا غیر مسلم کے ساتھ عقد مضاربت ہوسکتا ہے؟

الجواب: یہ معاملہ ہے اور معاملہ کے لیے اتحادِ ملت ضروری نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی معاملات فرمائے ہیں۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وإسلامه ليس بشرط أصلاً فتجوز الإجارة والاستئجار من المسلم والذمي والحربي المستأمن لأن هذا من عقود المعاوضات فيملكه المسلم والكافر جميعاً كالبياعات. الخ.

(بدائع الصنائع: ٤/١٧٦، كتاب الاجارة، سعيد). واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال: (۳) میں نے ایک مضارب کو ایک لاکھ رینڈ برائے تجارت دیدیے، لیکن وہ خود بھی تاجر ہے اور دوسرے لوگوں سے بھی مال بطورِ مضاربت لیتا ہے کیا یہ درست ہے، یعنی مال کا ملانا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: مالک یعنی رب المال کی اجازت سے ملاسکتا ہے اگر اجازت صراحۃً نہ ہو تو عرفی اجازت بھی کافی ہے، کیونکہ عرف اسی پر جاری ہے۔

درمختار میں ہے:

ولايملك المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن. وفي ردالمحتار: قوله والخلط بمال نفسه أى أوغيره كما في البحر إلا أن تكون معاملة التجار في تلك البلاد أن المضاربين يخلطون، ولاينهونهم فإن غلب التعارف بينهم في مثله وجب أن لايضمن كما في التاتارخانية. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ٥/٦٤٩، كتاب المضاربة، سعيد). واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال: (۴) میں لینس میں رہتا ہوں اور کاروبار کی جگہ جوہانسبرگ میں ہے، اور میں زید کی طرف سے مضارب ہوں لینس سے جوہانسبرگ تک تقریباً ۲۵/۲۳ کیلو میٹر ہے مجھے روزانہ جانا پڑتا ہے کیا میں کار کا خرچہ لے سکتا ہوں؟

الجواب: جب مضارب اپنے شہر سے باہر مضاربت کے کام کے لیے جارہا ہو تو خرچہ اور کھانا پینا عرف اور عادت کے موافق لے سکتا ہے۔

فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر رات کو گھر پہنچ سکتا ہے تو نفقہ وغیرہ مالِ مضاربت میں سے لازم نہیں ہوگا، اور اگر سفر ایسا ہے کہ رات کے وقت گھر پہنچنا مشکل ہے تو نفقہ وغیرہ اخراجات مالِ مضاربت میں سے لے سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو: (بدائع الصنائع: ٦/ ۱۰۶،۵، سعید۔ والفتاوی الہندیۃ: ۳۱۲/۴۔ وفتاوی الشامی: ۵/ ۶۵۷)۔

لیکن اس کا مدار عرف پر ہے، اور ہمارے عرف میں عام طور دوپہر کا کھانا مالک کے ذمہ ہوتا ہے، جب کہ شہر سے باہر کام کے لیے جائیں، اگرچہ رات کے وقت واپس گھر آجاتے ہیں، نیز تجارت کے لیے اپنی کار وغیرہ استعمال کرتے ہیں تو پٹرول وغیرہ بھی مالِ تجارت میں سے ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سی جگہوں پر تو مالک خود کمپنی کی گاڑی دیتا ہے۔ لہذا ان مسائل کا مدار عرف پر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ٹیلیفون کمپنی کے ساتھ مضاربت کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:۔
ایک آدمی کو حکومت کی طرف سے ٹیلیفون کمپنی چلانے کے لیے لائسنس ملا ہے، اس کی فیس تقریباً ۲۰،۰۰۰ ڈالر ادا کیے، اس آدمی نے لائسنس کے حصول کے لیے بہت کوشش کی اور پیسہ بھی صرف کیا، اور تجارت چلانے کے لیے ایک کمپنی شروع کی، لیکن مشینیں وغیرہ خریدنے کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہے، اگر یہ شخص دس آدمیوں سے کہدے کہ تم میں سے ہر ایک مجھے ۵۰۰۰ ڈالر دیدے اس شرط پر اس تجارت سے جتنا بھی فائدہ ہوگا اس کا متعین فیصد تم کو ادا کروں گا، اور ایک سال کے بعد راس المال مع نفع ادا کر دیا جائیگا، اور یہ شرط بھی لگائی کہ دس آدمیوں میں سے تجارت میں کسی کا بھی دخل نہیں ہوگا، اور یہ شخص اپنی مرضی کے مطابق تجارت کرے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک سال کے لیے اس کمپنی میں پیسہ لگائے، اور ایک سال کے بعد راس المال مع منافع واپس لے؟

اور کیا یہ راس المال مضمون ہوگا یا نہیں؟ کیا ایسا عقد جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ (الف) یہ معاملہ مضاربت کا ہے، اور یہ جائز ہے، مضاربت کا مطلب یہ ہے ایک شخص کی طرف سے مال اور دوسرا عمل کریگا، نفع شرط کے مطابق فیصد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائیگا، ہاں کسی کے لیے رقم معین کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح راس المال کا فیصد لینا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سود کے حکم میں ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

المضاربة... شرعاً عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب. وفي رد المحتار: قوله من جانب المضارب قيد به لأنه لو اشترط رب المال أن يعمل مع المضارب فسدت . (الدر المختار مع رد المحتار: ٥/٦٤٥، كتاب المضاربة، سعيد).

وفيه أيضاً: ومن شروطها: كون نصيب المضارب من الربح حتى لو شرط له من رأس المال أو منه ومن الربح فسدت، وفي الجلالية: كل شرط يوجب جهالة في الربح أو يقطع الشركة فيه يفسدها وإلا بطل الشرط وصح العقد اعتباراً بالوكالة...(ويملك المضارب

فـي الـمطلقة) التي لم تقيد بمكان أو زمان أو نوع (البيع)...(بنقد ونسيئة متعارفة والشراء والتوكيل بهما والسفر براً وبحراً). (الدرالمختار:٥/٦٤٨،سعيد).

(ب)ایک سال کے لیے مضاربت جائز ہے۔اس کو مضاربتِ موقتہ کہتے ہیں،اس کی تفصیل پیچھے گزرچکی ہے۔

(ج)راس المال مضمون نہیں ہوگا، بلکہ مضارب اس میں امین کی حیثیت سے کام کریگا، جب تک تعدی نہ پائی جائے،اگر مضارب کی تعدی کے بغیر کوئی نقصان ہوجائے تو سب سے پہلے نفع سے تلافی کی جائیگی، پھر اگر نفع کافی نہ ہو تو راس المال سے تلافی کی جائیگی۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله بطل الشرط كشرط الخسران على المضارب. (فتاوی الشامی:٥/٦٤٨،سعید).

وفـي الـدرالـمختار: وما هلك من مال المضاربة يصرف إلى الربح لأنه تبع فإن زاد الهـالك عـلـى الـربـح لم يضمن ولو فاسدة من عمله لأنه أمين، وفي رد المحتار: قوله ولو فـاسدة أي سواء كانت المضاربة صحيحة أوفاسدة، وسواء كان الهلاك من عمله أولا، ح (قـولـه مـن عـمله) يعني المسلط عليه عند التجار، وأما التعدي فيظهر أنه يضمن سائحاني.

(الدرالمختارمع ردالمحتار:٥/٦٥٦،سعید). **واللہ ﷻ اعلم۔**

رب المال کا اپنے بیٹے کو عقدِ مضاربت میں شامل کرنے کا حکم:

سوال: زید نے عمر کو بطورِ مضاربت ایک لاکھ رینڈ دئے اور آپس میں یہ طے پایا کہ نفع میں ۳۰ فیصد رب المال کا ہوگا اور ۶۰ فیصد مضارب کا ہوگا اور مضارب کے ساتھ رب المال کا بیٹا بطورِ مینجر کام کریگا اور اس کے لئے ۱۰ فیصد نفع ہوگا۔کیا یہ طریقہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ باعتبارِ فیصد نفع کا تعین صحیح اور درست ہے۔نیز رب المال کا اپنے بیٹے کو مینجر بنانا بھی صحیح ہے اور اسکو بھی نفع میں سے ۱۰ فیصد دیا جائیگا کیونکہ عقدِ مضاربت میں رب المال کا بیٹا ایک اجنبی کی حیثیت سے ہوگا اور اجنبی کے لئے کام کا عوض نفع میں سے کچھ حصہ متعین کرنا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں ہے:

وتعيين حصة العاقدين من الربح...أن يكون جزءً شايعاً قل أو كثر كالنصف أو الثلث لأن الشركة في الربح إنما تتحقق به. (شرح المجلة: ٤/٣٣٣، وكذا في الهداية: ٣/٢٥٨، و ٢٦٤).

الفتاوی الہندیہ میں ہے:

ولو اشترط أن يعمل عبد رب المال مع المضارب...ولو كان عبد رب المال عليه دين فاشترط له أجر عشرة دراهم كل شهر أو اشترط ذلك لمكاتبه أو لابنه جاز. (الفتاوى الهندية: ٤/٢٨٨).

وكذا لو كان مكاتب المضارب لكن بشرط أن يشترط عمله فيهما وكان المشروط للمكاتب له لا لمولاه وإن لم يشترط عمله لا يجوز وعلى هذا غيره من الأجانب فتصح المضاربة... والمرأة والولد كالأجانب هنا كذا في النهاية. (فتاوى الشامي: ٥/٦٥٣، وكذا في البحر: ٧/٢٦٧، و المبسوط للسرخسي: ٢٢/ ٢٨، و الفتاوى الهندية: ٤/٢٨٩). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿قال لقد ظلمک بسؤال نعجتک إلی نعاجه وإن کثیراً من الخلطاء لیبغی بعضهم علی بعض﴾

(سورة صٓ).

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم:

"یقول اللّٰہ تبارک وتعالیٰ: "أنا ثالث الشریکین مالم یخن أحدهما صاحبه، فإذا خانه خرجت من بینهما".

(رواه ابوداود، والحاکم فی المستدرک).

کتاب الشرکة

عن السائب بن یزید المخزومی أنه کان شریک النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قبل البعثة، فجاء یوم الفتح، فقال: مرحباً بأخي وشریکي".

(رواه احمد وابوداود).

شرکت سے متعلق احکام کا بیان

بلا عمل اجرت میں شریک ہونے کا حکم:

سوال: زید ایک درزی ہے جو پورے شہر میں مشہور ہے، وہ ایک دکان پر کبھی کبھی بیٹھتا ہے اور وہ دکان اس کی نگرانی میں چلتی ہے، اس دکان پر تین آدمی سلائی کا کام کرتے ہیں، زید کچھ نہیں کرتا دو تین گھنٹوں کے لیے آتا ہے لیکن جو اجرت ملتی ہے اس میں برابر شریک ہوتا ہے، کیا زید کے لیے بغیر کام کیے اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ بالا معاملہ فقہاء کی اصطلاح میں شرکتِ صنائع سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ استحساناً جائز ہے اگرچہ ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے یہ عقدِ اجارہ ہے، لیکن حقیقت میں یہ عقدِ شرکت ہے، اور اس کو شرکتِ تقبل، شرکتِ اعمال اور شرکتِ ابدان سے بھی موسوم کرتے ہیں، یعنی شہرت اور وجاہت کی بنا پر لوگوں سے عمل قبول کرے، اور حاصل شدہ اجرت آپس میں تقسیم کی جائے، اس اعتبار سے صورتِ مسئولہ میں زید کا بغیر کام کیے ہوئے اجرت میں شریک ہونا جائز اور درست ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وإما تقبل وتسمى شركة صنائع وأعمال وأبدان. وفي رد المحتار: والمراد عقد الشركة على التقبل والعمل...وفي البحر: لو اشتركا على أن يتقبل أحدهما المتاع ويعمل الآخر ...جاز كذا في القنية ... وفي النهر: أن المشترك فيه إنما هو العمل، ولذا قالوا: من صور هذه الشركة أن يجلس آخر على دكانه فيطرح عليه العمل بالنصف، والقياس أن

لاتجوز لأن من أحدهما العمل ومن الآخر الحانوت ، واستحسن جوازها، لأن التقبل من صاحب الحانوت عمل. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٤/٣٢٢،مطلب فی شرکة التقبل،سعید).

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو أن رجلاً أجلس في دكانه رجلاً يطرح عليه العمل بالنصف فالقياس أن لاتجوز هذه الشركة لأنها شركة العروض لأن من أحدهما العمل ومن الآخر الحانوت والحانوت من العروض وشركة العروض غير جائزة وفي الاستحسان جائزة، لأن هذه شركة الأعمال لأنها شركة التقبل وتقبل العمل من صاحب الحانوت عمل وشركة الأعمال جائزة بلا خلاف بين أصحابنا لأن مبناها على الوكالة والوكالة على هذا الوجه جائزة بأن يوكل خياط أو قصار وكيلاً يتقبل له عمل الخياطة والقصارة وكذا يجوز لكل صانع يعمل بأجر أن يوكل وكيلاً يتقبل العمل. (بدائع الصنائع:٦/٦٤،کتاب الشرکة،سعید).

وللاستزادة انظر: (النتف فی الفتاوی،ص٣٢٥،بیروت۔تبیین الحقائق:٥/١٤٧،باب فسخ الاجارة، ملتان۔وحاشیة الشلبی علی التبیین:٣/٣٢١، ملتان).

اگر دکان اس شخص کی نہیں ہے، لیکن شہر میں مشہور ہونے کی وجہ سے لوگ اس کے پاس کام لے کر آتے ہیں، یعنی اپنی شہرت سے عمل قبول کرتا ہے اور دوسرا کام کرتا ہے، اور اجرت میں دونوں شریک ہیں، تب بھی تعامل کی وجہ سے جائز ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ اکمل الدین بابرتیؒ فرماتے ہیں:

شركة الصنائع وهي شركة التقبل، لأن شركة التقبل أن يكون ضمان العمل عليهما وأحدهما يتولى القبول من الناس والآخر يتولى العمل لحذاقته، وهو متعارف فوجب القول بجوازها للتعامل بها، قال صلى الله عليه وسلم:"مارآه المسلمون حسناً فهوعند الله حسن". (العنایة فی شرح الهدایة،علی هامش تکملة فتح القدیر:٩/١٥٠،دارالفکر).

اشکال اور جواب:

اکثر فقہاء نے صاحبِ ہدایہ پر یہ اشکال کیا ہے کہ شرکتِ صنائع کو صاحبِ ہدایہ نے کس طرح شرکتِ وجوہ فرمایا حالانکہ شرکتِ وجوہ الگ عقد ہے؟ اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: صاحبِ ہدایہ کے نزدیک بھی مذکورہ معاملہ شرکتِ تقبل ہی کے قبیل سے ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

" **فهذا بوجاهته يقبل وهذا بحذاقته يعمل**". (الهداية:۳/۳۱۷،مسائل منثورة،كتاب الاجارات).

شرکتِ وجوہ کا اطلاق شاید دو وجوہات سے کیا ہے:

(۱) اس عقد میں وجاہت کو بڑا دخل ہے، بلکہ اسی پر موقوف ہے، نیز وجاہت وشہرت عمل کے لیے سبب کا درجہ رکھتی ہے، اور اس جیسے معاملات میں شرکت مقصود ہوتی ہے۔

(۲) یہ معاملہ شرکتِ وجوہ کے مشابہ ہے، اس حیثیت سے کہ اس میں شہرت ووجاہت سے نفع اٹھایا جاتا ہے۔

اس کی تائید ہدایہ کے بعض نسخوں کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

" **لأن هذه كشركة الوجوه في الحقيقة**".

جیسا کہ " **بدرالمنتقى على هامش المجمع** : (۲/۴۰۳) میں مرقوم ہے۔

ملاحظہ ہو شرح وقایہ میں ہے:

ففي الهداية حمله على شركة الوجوه وفيه نظر لأنه شركة الصنائع والتقبل، فكأنه صاحب الهداية أطلق شركة الوجوه عليه لأن أحدهما يقبل العمل بوجاهته وهذا العقد غير جائز قياساً...وجائز استحساناً ووجهه أن تخصيص قبول العمل بأحدهما لايدل على نفيه من الآخر فإذا عقدت شركة الصنائع ويقبل أحدهما العمل ويعمل الآخر فيجوزفكذا ههنا والحاجة ماسة بمثل هذا العقد فجوزناه. (شرح الوقاية:۳/۳۱۳).

تبيين الحقائق میں ہے:

وقول صاحب الهداية هذه شركة الوجوه في الحقيقة فهذا بوجاهته يقبل وهذا بحذاقته يعمل فيه نوع إشكال، فإن تفسيرشركة الوجوه أن يشتركا على أن يشتريا شيئاً بوجوههما ويبيعا وليس في هذه بيع ولا شراء فكيف يتصور أن تكون شركة الوجوه وإنما هي شركة الصنائع على مابينا. (تبيين الحقائق:۵/۱۴۷،باب فسخ الاجارة،ملتان).

وقال في مجمع الأنهرشرح ملتقى الأبحر جواباً عما أشكل عليه العلامة الزيلعي في

شرح الکنز :

لكن يمكن التوفيق بأن مراد صاحب الهداية بشركة الوجوه ليس ماهو المصطلح عليه المارفي كتاب الشركة بل مراده بها ههنا ما وقع فيه تقبل العمل بالوجاهة يرشدك إليه قوله: هذا بوجاهته يقبل وهذا بحذاقته يعمل ويمكن بوجه آخر أنه أطلق عليه شركة الوجوه تغليباً لجهة الوجاهة على العمل لكونها سبباً تأمل. (مجمع الانهر شرح ملتقى الابحر:۲/۴۰۲ـ وكذا فى حاشية ابن عابدين :۶/۹۰،مسائل شتى، سعيد ـ ونتائج الافكار:۹/۱۵۱،دار الفكر).

وفي بدر المنتقى في شرح الملتقى على هامش المجمع: قوله (صح) هذا الفعل استحساناً لأنه شركة الصنائع وفي بعض نسخ الهداية أنه كشركة الوجوه (قلت) وحينئذٍ فيسقط نظر الزيلعي والعيني فتأمل . (بدر المنتقى على هامش المجمع:۲/۴۰۳).

وللاستزادة انظر: (البناية شرح الهداية:۳/۶۹۳ـ نتائج الافكار:۹/۱۵۱،دار الفكر ـ ودرر الحكام شرح غرر الاحكام :۲/۲۴۰ـ والكفاية شرح الهداية على هامش فتح القدير:۸/۹۰،مكتبه رشيدية). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ترکہ میں ایک وارث کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک شخص کا انتقال ہوگیا، ترکہ تقسیم نہیں ہوا تھا، مرحوم کے دو بیٹوں نے والد کے کاروبار کو جاری رکھا اور خوب نفع کمایا، اب دس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ترکہ تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا تمام ورثاء نفع میں شریک ہوں گے یا فقط مرحوم کے انتقال کے وقت جو کچھ موجود تھا اسی کی تقسیم کی جائیگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مرحوم کے مال میں تقسیم سے پہلے جو کچھ نفع ہوا ہو سب ورثا کل مال میں شریک ہوں گے، اگر چہ بقیہ ورثاء مالِ مشترک کی تجارت میں شریک نہ تھے، لیکن نفع میں شریک ہوں گے، اور کل مال مع نفع تمام ورثاء کے درمیان شرعی طریقہ پر تقسیم کیا جائیگا۔ ہاں اگر کام کرنے والے کو اس کے حصہ سے کچھ زیادہ دے دیا جائے تو مناسب ہے، لیکن شرعاً لازم نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں الاشباہ والنظائر میں ہے:

إذا عمل أحد الشريكين دون الآخر بعذر أو بغيره فالربح بينهما قوله إذا عمل أحد الشريكين... الخ. إنما كان الربح بينهما، لأن استحقاق الربح بحكم الشرط في العقد لا

العمل، كما فى البزازية في آخر فصل ما يكون للشريک، وقوله بعذرلا يصح تعلقه بالفعل المذكور كما هوظاهر وليس ثم غيره يصح تعلقه به، وحينئذٍ فالصواب أن يقول كما فى البزازية ، ويستوى أن يمتنع الآخر بعذر أو بغيرعذر، لأن العقد لايرتفع بمجرد امتناعه.
(الاشباه والنظائرمع غمز عيون البصائر:۲/۹۷).

عبارتِ بالاکا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شریک کام نہ کرے پھر بھی اس کو مشترک مال میں سے پورا حصہ ملے گا، خواہ وہ شریک کام سے معذور ہو یا معذور نہ ہو۔

وللاستزادة انظر : (المجلة وشرحها لمحمدخالد الاتاسي: المادة : ۱۳۹۲، ۸۳).

یاد رہے اس شرکت کو فقہاء شرکتِ املاک سے تعبیر کرتے ہیں۔

تبیین الحقائق میں ہے:

شركة الملک أن يملک اثنان عيناً إرثاً أو شراء...وكل أجنبي في قسط صاحبه أى كل واحد منهما أجنبي في نصيب صاحبه حتى لايجوز له أن يتصرف فيه إلا بإذنه كما لغيره من الأجانب. (تبيين الحقائق شرح الكنزالدقائق:۳/۳۱۳).

شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فشركة الملک أن يشترک رجلان في ملک مال وذلک نوعان ثابت بغير فعلهما كالميراث، وثابت بفعلهما وذلک بقبول الشراء أو الصدقة أو الوصية والحكم واحد وهو أن ما يتولد من الزيادة يكون مشتركاً بينهما بقدرالملک وكل واحد منهما بمنزلة الأجنبي فى التصرف في نصيب صاحبه . (المبسوط للسرخسي :۱۱/۱۵۱).

اشکال اور جواب:

اشکال: بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نفع صرف تصرف کرنے والوں اور عمل کرنے والوں کے ساتھ خاص ہوگا، دوسرے وارثوں کو اس نفع میں سے کچھ نہیں ملے گا، اور دلیل میں عالمگیری کی درجِ ذیل عبارت پیش کرتے ہیں:

لو تصرف أحد الورثة فى التركة المشتركة و ربح فالربح للمتصرف وحده، كذا فى الفتاوى الغياثية . (الفتاوى الهندية:۲/۳٤٦). اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب: عبارتِ مذکورہ بالا دیگر کتبِ فقہیہ کی عبارات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تصرف کر کے مشترک رقم میں سے کچھ رقم لے لی پھر اس میں تصرف کیا تو وہ نفع اس کا ہوگا۔ فتاویٰ محمودیہ میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، ملاحظہ ہو: (۲۰/۳۰۹، مع التعلیقات)۔

یا اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اکابرؒ نے اس پر فتویٰ نہیں دیا۔ بلکہ اکابرؒ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو کفایت المفتی میں ہے:

عمرو نے مالِ مشترک میں تجارت وغیرہ کر کے جو نفع حاصل کیا ہے اور مال بڑھایا ہے، وہ سب ورثاء پر بھی تقسیم کیا جائیگا صرف عمرو کا ترکہ نہیں سمجھا جائے گا۔ **وعمله وتصرفه يكون تبرعاً ووجهه أنه شريك في بعضه وعامل بنت أخيه في بعضه وهي في عياله ، وليس ههنا عقد ولا غصب** ۔(کفایت المفتی: ۸/۲۶۹، کتاب الفرائض)۔

نیز اسی قسم کا جواب دوسری جگہ بھی مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۸/۲۷۴، کتاب الفرائض)۔

فتاویٰ دار العلوم میں ہے:

جواب: جب زید وعمرو دونوں مشتری اس جائداد مذکور کے ہیں تو دونوں شریک نصف نصف کے ہیں، اور ان کے بعد ان کے ورثاء قائم مقام ان کے ہوں گے، لہذا ورثاء کا مطالبہ شرعاً صحیح اور حق ہے، **في رد المحتار: قوله ولزمه نصف الثمن بناء على أن مطلق الشركة يقتضي التسوية** ۔(فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۱/۵۹۷، کتاب الشرکۃ)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام: ۳/۳۱۹-۳۲۲)۔

اگر ہم یہ کہیں کہ وارث کا تصرف، اجنبی کے مال میں تصرف کی طرح ہے، اور یہ ناجائز ہے۔ تو اس کا جواب بھی یہی ہوگا کہ اجنبی کے مال میں تصرف کر کے جو نفع کمایا وہ فقہاء کے ہاں واجب التصدق ہے اور جب مالک معلوم ہو تو مالک کو پہنچادے، اور ورثاء معلوم ہے، لہذا شرعی حصوں کے مطابق نفع بھی اصل مال کے ساتھ تقسیم ہوگا۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

وفي القهستاني: وله أن يؤديه إلى المالك ويحل له التناول لزوال الخبث. (فتاوى الشامي: ٦/١٨٩، كتاب الغصب، سعيد)۔

امداد الاحکام میں ہے:

سوال: وراثت کا روپیہ قبل تقسیم ہونے کے کسی شریک نے بلا اطلاع دوسرے شریک کے کسی کو مضاربت پر دے دیا اور مضارب نے اس میں کچھ تصرف کیا، مال خرید کر بیچا اور نفع بھی ہوگیا تو یہ مضاربت صحیح ہوئی یا نہیں اور جو نفع ہوا ہے مضارب اس میں سے نصف نفع مقررہ لینے کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب: جس شریک نے مضاربت پر روپیہ دیا ہے نفع مقررہ اس کی ملک تو ہوگیا اس میں فقط اپنے حصہ وراثت کے مطابق اس حلال ہے اور باقی نفع خبیث ہے، اس لیے دوسرے ورثاء کو بقدر ان کے حصص دے دے۔ (امداد الاحکام: ۳/۳۱۹، کتاب الشرکۃ والمضاربۃ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اپنا حصہ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: دو بھائیوں کا ایک مکان ہے اس کی قیمت دو ملین ہے، ایک بھائی کے پاس مکان ہے وہ کرایہ چاہتا ہے، مکان کو فروخت کرنا نہیں چاہتا، لیکن دوسرے کے پاس مکان نہیں ہے، وہ مکان فروخت کرنا چاہتا ہے اب کس کی بات مانی جائے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر دونوں میں ابتدا سے شرکت یا وراثت تھی تو ہر ایک اپنا حصہ بغیر دوسرے کی اجازت کے بیچ سکتا ہے، لیکن اگر بیع میں دوسرے شریک کو ضرر ہو یا بائع مشتری کو ضرر ہو تو پھر اپنا حصہ فروخت نہیں کرسکتا، جیسے عمارت یا درخت یا فصل کی بیع دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر بیچنا جائز نہیں ہے۔

بنابریں صورتِ مسئولہ میں بھی فروخت نہ کرنے والی بات مانی جائے گی، اور مکان کو ایک شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کرسکتا، کیونکہ مکان عمارت پر مشتمل ہے۔

ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں ہے:

الشریک مخیر إن شاء باع حصته من شریکه وإن شاء باعها من أجنبي بدون إذن شریکه... لکن في صور خلط الأموال واختلاطها التي بيناها في الأصل الأول لایسوغ لأحد الشریکین في الأموال المخلوطة أو المختلط أن یبیع حصته من آخر بدون إذن شریکه.

أما لو باعها بإذن شریکه أو باعها من شریکه جاز کما في الملتقی وغیره، والفرق أن

الشركة إذا كانت بينهما من الابتداء بأن اشتريا حنطة أو ورثاها كانت كل حبة مشتركة بينهما فبيع كل منهما نصيبه شائعاً جائز من الشريک والأجنبي بخلاف ما إذا كان بالخلط أو الاختلاط، لأن كل حبة مملوكة لأحدهما بجميع أجزائها ليس للآخر فيها شركة فإذا باع نصيبه من غير إذن الشريک لايقدر على تسليمه إلا مخلوطاً بنصيب الشريک فيتوقف على إذنه بخلاف بيعه من الشريک للقدرة على التسليم (مجمع الأنهر) قلت: ومثل الخلط والاختلاط بيع ما فيه ضرر على الشريک أو البائع أو المشتري كبيع الحصة الشائعة من البناء أو الغرس أو الزرع بدون الأرض وقد استوفينا الكلام على ذلک في شرح المادة: ٢١٥. ومثله لو باع أحد الشريكين بيتاً معيناً باع من دار مشتركة أو باع نصيبه من بيت معين منها فالبيع لايجوز (درمختار) وذلک لتضرر الشريک الآخر عند القسمة إذ لو صح البيع في نصيب البائع لتعين نصيبه فيه.

فإذا وقعت القسمة للدار كان ذلک ضرراً على الشريک إذ لاسبيل إلى جمع نصيب الشريک فيه لأن نصفه للمشتري ولاجمع نصيب البائع فيه لفوات ذلک ببيعه النصف وإذا سلم الأمر من ذلک انتفى ذلک وسهل طريق القسمة (خيرية من البيوع).

(شرح المجلة لسليم رستم باز اللبناني، ص:٢٠٩).

وللاستزادة انظر: (شرح المجلةلمحمدخالدالاتاسی:٢/ ١٠٨-١١٥،المادة: ٢١٥). **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر شرعی شیئرز کی بیع پر نفع کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ۲۰۰۴ء میں اولیس انویسمنٹ میں ۲۰،۰۰۰ رینڈ کے حصص خریدے جب کہ وہ شرعی قانون کے ماتحت تھا، اب اس شخص کے کہنے کے مطابق شرعی قانون پر نہیں ہے، تو شریک نے اپنے حصص بیچ ڈالے اور کل رقم ۴۷،۰۰۰ وصول ہوئی، یعنی راس المال پر نفع حاصل ہوا، کیا اس سے جو نفع ملا ہے اس کو استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: کمپنی جب تک شرعی قانون کے مطابق تجارت کرتی تھی اس وقت تک کا نفع حلال اور جائز ہے، لیکن جب سے غیر شرعی قانون پر تجارت شروع کی، اس وقت سے نفع بلانیتِ ثواب صدقہ کردیا جائے۔

فقہی مقالات میں ہے:

شیئرز کی خرید وفروخت کے جواز کے لیے چار شرطیں ہیں:

(۱) اصل کاروبار حلال ہو۔

(۲) اگر کمپنی کچھ سودی لین دین کرتی ہے تو اس کی سالانہ میٹینگ میں آواز اٹھائی جائے۔

(۳) جب منافع تقسیم ہو اس وقت جتنا نفع کا جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہو، اس کو صدقہ کردے۔ (فقہی مقالات: ۱/۱۵۱)۔

وللاستزادۃ انظر: (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/۱۶۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کمپنی کے شیئرز کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک کمپنی بڑے پیمانہ پر شیئرز کی تجارت کرتی ہے، اور چونکہ شیئرز میں بہت زیادہ منافع ہیں اس لیے لوگ اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیتے ہیں، لیکن اس میں کچھ شرائط لگائی گئی ہیں جن کی وجہ سے بعض علماء اس کے جواز میں تامل فرماتے ہیں۔ شرائط ملاحظہ ہو:۔

(۱) تین سال تک کسی اور کو نہیں بیچ سکتے ہیں۔

(۲) افریقی کو جن میں ہندوستانی بھی شامل ہیں، فقط ان کو فروخت کر سکتے ہیں، کسی اور کو نہیں۔

ان شرائط کی وجہ سے بعض علماء فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے لہٰذا یہ ناجائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر یہ کمپنی تجارت کرتی ہے اور کمپنی سودی بھی نہیں ہے، اور یہ معاملہ بھی سودی نہ ہو تو ان شرائط کی وجہ سے معاملہ ناجائز نہیں ہوگا، کیونکہ پہلی شرط کا تقاضا معاملہ کی توقیت ہے یعنی تین سال تک اس کو بیچ نہیں سکتے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین سال تک شرکت ہے اور معاملہ موقت ہے، اس کے بعد اگر چاہے تو بیچ دے اور اگر چاہے تو شرکت باقی رکھے یا ختم کردے۔

اور دوسری شرط صرف افریقیوں یا ہندوستانی کو فروخت کرنے میں متعاقدین کا فائدہ ملحوظ نہیں بلکہ قومی مفاد ملحوظ ہے، نیز یہ شرط مفضی الی النزاع نہیں، اس لیے اس کی بھی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولو كان لايقتضيه العقد ولامنفعة فيه لأحد لايفسده وهو الظاهر من المذهب كشرط أن يبيع المشترى الدابة المبيعة لأنه انعدمت المطالبة فلا يودى إلى الربا ولا إلى المنازعة .

(الهداية:۳/۵۹،باب البيع الفاسد).

شرح مجلّہ میں ہے:

وحاصل ما ذكره الفقهاء فى البيع مع الشرط أن الشرط الذي يقترن به البيع إما أن يقتضيه العقد وإما أن لايقتضيه العقد لكن يلايمه وإماان لايقتضيه العقد ولايلايمه لكن قد جرى العرف باشتراطه ، وإما أن لايقتضيه العقد ولايلايمه ولا جرى العرف باشتراطه لكن لامنفعة فيه لأحد، فالبيع في هذه الوجوه الأربعة صحيح ، والشرط معتبر فى الوجوه الثلاثة الأولىٰ منها، ويلغو فى الوجه الرابع . (شرح المجلةلمحمدالاتاسى:۲/۵۹).

وفيه أيضاً : البيع بشرط ليس فيه نفع لأحد المتعاقدين يصح والشرط لغو، مثلاً بيع الحيوان على أن لايبيعه المشتري لآخر أوعلى شرط أن يرسله فى المرعى صحيح ، والشرط لغو. (شرح المجلة:۲/٦٥،المادة:۱۸۹).

شرکتِ موقتہ کا حکم:

قال فى الهندية: وإن وقتا هل يتوقت بالوقت المذكور، روى بشر عن أبي يوسفؒ عن أبي حنيفةؒ أنه يتوقت والطحاوي ضعف هذه الرواية، وصححها غيره من المشايخ ، وهو الصحيح. (الفتاوى الهندية:۲/۳۰۲).

وفى الهداية : المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين ومراده الشركة فى الربح...إن وقت للمضاربة وقتاً بعينه يبطل العقد بمضيه ، لأنه توكيل فيتوقت بما وقته والتوقيت مفيد، فإنه تقييد بالزمان فصار كالتقييد بالنوع والمكان.

(الهداية:۳/۲٦۱،۲۵۷).

فتاویٰ شامی میں ہے:

وإن وقتا لذلک وقتاً بأن قال: ما اشتريت اليوم فهو بيننا صح التوقيت، فما اشتراه بعد اليوم يكون للمشتري خاصة وكذا لووقت المضاربة لأنها والشركة توكيل ، والوكالة

مما یتوقت . (فتاوی الشامی:٤/٣١٢،سعید).

خلاصہ یہ ہے کہ پہلی شرط مفسدِ عقد نہیں ہے اس وجہ سے کہ متعاقدین کا فائدہ نہیں ہے بلکہ اس سے قومی مفاد وابستہ ہے،اور یہ فقہاء کی بیان کردہ شروطِ فاسدہ میں داخل نہیں ہے۔اور دوسری شرط درحقیقت شرط نہیں ہے، بلکہ شرکتِ موقتہ ہے اور فقہاء کے ہاں شرکتِ موقتہ جائز ہے۔لہذا یہ بیع وشرط نہیں ہے جس کی ممانعت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

ایک مشترک کمپنی کے مزدوروں کا حکم:

سوال: ایک مشترک کمپنی ہے جس کے کئی شرکاء ہیں،ان شرکاء میں سے ایک گرجا اور اس کے متعلقین میں سے ہے،اور اس کے مختلف شعبے ہیں،ایک شعبہ کا کام یہ ہے کہ وہ مزدوروں کے تمام انتظامات کرتے ہیں، مثلاً کھانا، پینا،اور سونا وغیرہ، پھر انہیں مزدوروں کو کچھ پیسہ کے بدلے میں دوسری کمپنیوں کی ملازمت پر لگاتے ہیں،اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کمپنی کے اس شعبہ کے ساتھ معاملہ کرنا اور ان مزدوروں کو ملازمت پر رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ کمپنی کا تعلق گرجا والوں سے ہے،لیکن جہاں مزدور کام کرتے ہیں وہاں عبادت وغیرہ نہیں کرتے صرف کام کرتے ہیں۔بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ کفار کو اجرت پر لینا اور کام کروانا جائز اور درست ہے،اس لیے وہ آپ کے یہاں عبادت نہیں کریں گے،اور یہ معصیت پر تعاون بھی نہیں ہے، کیونکہ آپ اپنے کام کی اجرت دیں گے نہ کہ کسی اور چیز کی،اس لیے ایسی کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ہاں اگر اس کمپنی کی مسلمانوں کے خلاف کوئی خفیہ سازش ہو تو اس سے بچنا چاہئے۔

ملاحظہ فرمائیں بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها استأجر النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وأبوبكرؓ رجلاً من بني الديل وهو من بني عبدبن عدى هادياً خريتاً ، الخريت الماهر بالهداية قد غمس حِلْفاً في آل العاص بن وائل السهمي وهوعلى دين كفارقريش فأَمِنَاه فدفعا إليه راحلتيهما وواعداه غار ثور...الخ. (صحيح البخارى، برقم ٢٢٦٣، باب هجرة النبى صلى الله عليه وسلم واصحابه الى المدينة).

عالمگیری میں ہے:

لابأس بأن يكون بين المسلم والذمي معاملة إذا كان مما لابد منه كذا في السراجية.

(الفتاوى الهندية، ٥/٣٤٨، كتاب الكراهية، باب في اهل الذمة).

بدائع الصنائع میں ہے:

وإسلامه ليس بشرط أصلاً فتجوز الإجارة والاستئجار من المسلم والذمي والحربي المستامن لأن هذا من عقود المعاوضات فيملكه المسلم والكافر جميعاً كالبياعات. الخ.

(بدائع الصنائع: ٤/١٧٦، كتاب الاجارة، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

سوال: غیر مسلم سے کفن سلوانا کیسا ہے؟

الجواب: درست ہے جیسے اور معاملات درست ہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۹/۵۸۷، جامعہ فاروقیہ).

واللہ ﷻ اعلم۔

کمپنی کے مخلوط کاروبار میں حصہ لینے کا حکم:

سوال: اگر ایک کمپنی حرام اور حلال مخلوط کاروبار کرتی ہے تو اس کے ساتھ معاملہ کرنے یا اس میں حصہ لینے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: کمپنی کے حصص کا کاروبار مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے:۔

(۱) کمپنی کا مرکزی کاروبار شریعت کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً سود کی بنیاد پر تمویلی خدمات فراہم کرنا، یعنی بینک، انشورنس کمپنیوں کے حصص، یا ایسی کمپنیوں کے حصص جو کسی اور ناجائز کاروبار میں ملوث ہو، جیسے وہ کمپنیاں جو شراب، خنزیر، حرام گوشت تیار کرتی یا بیچتی ہیں، یا وہ جوا، نائٹ کلب کی سرگرمیوں اور فحاشی وغیرہ میں ملوث ہیں۔ تو پھر ان کمپنیوں میں حصہ لینا اور ان کے ساتھ معاملہ کرنا ناجائز ہے۔

(۲) اگر کمپنی کا مرکزی کاروبار حلال ہے مثلاً آٹوموبائل، ٹیکسٹائل وغیرہ کا کاروبار، لیکن وہ کمپنی اپنا زائد از ضرورت سرمایہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے یا سودی قرضے لیتی ہے تو شیئر ہولڈر پر لازم ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردے، جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس عام میں اس طرح کی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائے۔

(۳) اگر کمپنی کی آمدن میں سودی کھاتوں سے حاصل ہونے والی کچھ آمدن بھی شامل ہے تو شیئر ہولڈر کو ادا کیے گئے منافع میں سے اس تناسب سے نفع کا حصہ خیرات کر دیا جائے اور شیئر ہولڈر خود اس کا فائدہ نہ اٹھائے، مثلاً اگر کمپنی کے کل منافع میں سے پانچ فیصد اسے سودی کھاتوں سے حاصل ہوا ہے تو نفع کا پانچ فیصد خیرات کر دیا جائے۔

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۵/۱۶۴).

امداد الفتاویٰ میں ہے:

سوال: عموماً سب کمپنیاں سود لیتی بھی ہیں، اور دیتی بھی ہیں، اس صورت میں ہر شریک کے حصہ میں سودی روپیہ بھی آتا ہے تو شریک کو کمپنی سے اپنے حصے کا منافع لینا جس میں سودی رقم بھی شاید مخلوط ہو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:...وفي المبسوط: يكره للمسلم أن يدفع إلى النصراني مالاً مضاربة وهو جائز في القضاء. (ص۱۲۵ ج۲۲) وفيه أيضاً: وأبوحنيفةؒ يقول: الذي ولي الصفقة هو الوكيل والخمر مال متقوم في حقه يملك أن يشتريها لنفسه فيملك أن يشتريها لغيره وهذا لأن الممتنع ههنا بسبب الإسلام هو العقد على الخمر لا الملك فالمسلم من أهل أن يملك الخمر، ألا ترى أنه لو تخمر عصير المسلم يبقى ملكاً له ثم إذا تخلل جازله بيعه وأكله إذا مات قريبه عن خمر يملكها بالإرث فإن اعتبرنا جانب العقد فالعاقد من أهله وهوفي حقوق العقد كالعاقد لنفسه وإن اعتبرنا جانب الملك فالمسلم من أهل ملك الخمر فيصح التوكيل. (ص۲۱٦ ج۱۲).

فإن قيل ذكر في الهندية في باب المضاربة بين أهل الإسلام وأهل الكفر إذا دفع المسلم إلى النصراني مالاً مضاربة بالنصف فهوجائز إلا أنه مكروه فإن اتجر في الخمر والخنزير فربح جازعلى المضاربة في قول أبي حنيفةؒ وينبغي للمسلم أن يتصدق بحصته من الربح وعندهما يجوزعلى المضاربة، وإن أربى فاشترى درهمين بدرهم كان البيع فاسداً ولكن لايصير ضامناً لمال المضاربة والربح بينهما على الشرط. (ص٤٠٢ ج٥).

قلنا قوله ينبغي للمسلم أن يتصدق بحصته محمول على الورع كما هوالظاهر وإن

حمل على الوجوب فهو إذاكان قد اتجر فى الخمر والخنزير ولم يتجر في غيرهما وإلا فحمله على ما سيجيئ فى المخلوط. وقوله في صورة إرباء الوكيل كان البيع فاسداً لايضرنا فإن الوكيل بالبيع كالعاقد لنفسه وفساد البيع في حق الذمي لايستلزم حرمة الربح على المسلم فإن تبدل الملک يدفع خبث الفساد وأما على قول من جوز الربا بين المسلم والكافر في دار الحرب فالأمر أوسع .

پس صورتِ مذکورہ میں مال مستفاد میں حرمت نہ ہوگی، جب کہ کمپنی قائم کرنے والے کافر ہوں، البتہ کفار کی کمپنیوں میں شرکت خود مکروہ ہے، جیسا کہ مبسوط کے قول سے معلوم ہوا، اگر مسلمانوں کی کمپنیاں بھی سودی لین دین کرتی ہوں جیسا کہ آج کل غالب یہی ہے تو کفار کی کمپنیوں کی شرکت مسلم کمپنیوں کی شرکت سے اہون ہے۔

ولنذكر بعد ذلک حكم المال المختلط بالحرام والحلال ،قال قاضيخانؒ:... فإذا خلط الوكيل دراهم الربا بعضها ببعض الدراهم التي أخذها من حلال يجوز أخذ الربح منها لكون الخلط مستهلكاً عند الإمام لاسيما إذ كان الوكيل كافراً لاسيما والتقسيم مطهرعندنا كما إذا بال البقر فى الحنطة وقت الدياسة فاقتسمها الملاک حل لكل واحد أكلها مع التيقن بكون الحنطة مختلطة بالطاهر والنجس ولكن القسمة أورثت احتمالاً في حصة كل واحد من الشركاء فحكمنا بطهارة نصيب كل واحد منهم فكذا ههنا إذا أربى الوكيل بالتجارة وخلط الدراهم بعضها ببعض ثم قسمها على الشركاء يحكم بحل نصيب كل واحد منهم، والله أعلم .

وأخرج البيهقي في سننه في باب كراهية مبايعة من أكثر ماله من الربا أو ثمن المحرم من طريق شعبة عن مزاحم عن ربيع بن عبد الله أنه سمع رجلاً سأل ابن عمر أن لي جاراً يأكل الربا أو قال خبيث الكسب وربما دعاني لطعامه أفأجيبه ، قال : نعم .

ومن طريق مسعرعن جواب التيمي عن الحارث بن سويد قال جاء رجل إلى عبد الله يعني ابن مسعودؓ فقال: إن لي جاراً لا اعلم له شيئاً إلا خبيثاً أوحراماً وأنه يدعوني فأحرج أن آتيه أوأتحرج أن لاآتيه؟ فقال: ائته أو أجبه فإنما وزره عليه، قال البيهقي:جواب التيمى

غير قوي وهذا إذا لم يعلم أن الذي قدم إليه حرام، فإذا علم حراماً لم يأكله. (ص۳۳۵ ج۲).

قلت: جواب التيمي وثقه ابن حبان ويعقوب بن سفيان كما في التهذيب. (ص ۱۲۱ و ۱۲۲ ج۲). ماخوذ از (امداد الفتاویٰ: ۴۹۶/۳۔۴۹۸، کتاب الشرکۃ).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث: ۴۵/۱۶). واللہ ﷻ اعلم۔

اسلامی طریقہ پر شرکت کے بنیادی اصول:

سوال: محترم ومکرم جناب مفتی صاحب۔

اسلامی طریقہ پر تجارت کرنے کے لیے معاہدہ کی تفصیل حسبِ ذیل ملاحظہ ہو:

دو شریک اسلامی طریقہ پر تجارت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کیا معاہدہ کرنا چاہئے، جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ: ایک شریک صرف مال دیتا ہے اور دوسرا شریک پیسہ کے ساتھ کام بھی کرتا ہے، پہلا شریک سالانہ منافع چاہتا ہے اور دوسرا منافع کے ساتھ عمل کی اجرت بھی چاہتا ہے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ امورِ ذیل کس طرح انجام دیے جائیں:

(۱) شریکین میں سے ہر ایک جسمانی طور پر کام کرنے والا، اور نہ کام کرنے والا دونوں سرمایہ کتنا لگائیں؟

(۲) صرف ایک شریک کے ذمہ عمل کی شرط لگانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) نفع ونقصان کی تقسیم، نفع کو دوبارہ شرکت میں لگانے کا حکم اور تفصیل بیان کریں؟

(۴) شرکتِ موقتہ کا کیا حکم ہے؟

(۵) ملک کے قانون کے مطابق ٹیکس، اور اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے کی تفصیل کیا ہے؟

(۶) شریکین کی تنخواہ، شریکین میں سے کسی کا اپنی ضرورت کے لیے پیسے لینا؟

(۷) شریکین کا کسی سے قرض کا معاہدہ کرنا، یعنی اگر تجارت کے لیے قرض لے تو کس کی طرف سے شمار ہوگا؟

(۸) منافع تقسیم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

(۹) کمپنی کا اثاثہ، سرمایہ کس طرح تقسیم ہوگا؟

(۱۰) شریکین میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو شرکت باقی رہتی ہے یا نہیں؟

الجواب: (۱) شرکاء کو اختیار ہے کہ آپس میں رضامندی کے ساتھ جو شریک جتنا سرمایہ چاہے لگا سکتا ہے، کوئی متعین حصہ کسی پر لازم اور ضروری نہیں ہے۔ (الهداية: ۲/ ۶۳۰).

(۲) صرف ایک شریک کے ذمہ عمل کی شرط لگانا جائز ہے، لیکن یہ مشارکہ اور مضاربہ کا اجتماع ہے، (اس کی تفصیل اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/ ۴۷، میں دیکھی جا سکتی ہے، اور یہ مسئلہ مختصراً کتاب المضاربۃ کے تحت گزر چکا ہے) ہاں اس سے نفع کی تقسیم میں فرق ہوگا، جیسا کہ آئندہ تفصیل بیان کی جائے گی۔

(۳) منافع تقسیم کرنے کے بنیادی اصول:۔

(الف) شرکت صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ نفع کا تناسب فیصد کے اعتبار سے طے کیا جائے، کہ ہر ایک کو کتنا فیصد نفع ملے گا، مثلاً ہر ایک کو ۵۰ فیصد یا ایک شریک کو ۴۰ فیصد دوسرے کو ۶۰ فیصد وغیرہ۔

☆ ہاں کسی کے لیے متعینہ رقم طے کرنا کہ فلاں کو ماہانہ ہزار رینڈ ملیں گے جائز اور درست نہیں ہے۔

☆ اسی طرح سرمایہ کے اعتبار سے فیصد مقرر کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ مثلاً کسی کا سرمایہ ایک لاکھ رینڈ ہے تو اس کو سرمایہ کا ۲۰ فیصد ۲۰ ہزار رینڈ دیے جائیں یہ جائز نہیں ہے۔

قال في البدائع: ومنها أن يكون الربح معلوم القدر، فإن كان مجهولاً تفسد الشركة، لأن الربح هو المعقود عليه، وجهالته توجب فساد العقد... ومنها أن يكون الربح جزءاً مشاعاً في الجملة لامعيناً، فإن عينا عشرة أومائة كانت الشركة فاسدة، لأن العقد يقتضي تحقق الشركة في الربح، والتعيين يقطع الشركة لجواز أن لايحصل من الربح إلا القدر المعين لأحدهما... الخ. (بدائع الصنائع: ۶/ ۵۹، سعيد۔ وكذا في الهداية: ۲/ ۶۳۲۔ والفتاوى الهندية: ۲/ ۳۰۲).

(ب) اگر دو شریک یہ طے کر لیں کہ جتنا فیصد سرمایہ جس شریک نے لگایا ہے اس کا نفع اتنا ہی ہوگا، تو یہ جائز ہے، چاہے سرمایہ نصف نصف ہو یا ایک کا کم اور دوسرے کا زیادہ ہو۔ اور چاہے دونوں شریک نے کام کرنا طے کیا ہو، یا صرف ایک شریک کے لیے عمل طے پایا ہو۔

قال في البدائع: فنقول: إذا شرطا الربح على قدر المالين متساوياً أو متفاضلاً فلاشك أنه يجوز، ويكون الربح بينهما على الشرط سواء شرطا العمل عليهما أو على أحدهما. (بدائع الصنائع: ۶/ ۶۲، سعيد).

(ج) جو شریک عمل بھی کرتا ہے اس کے لیے سرمایہ کے تناسب سے زائد نفع مقرر کرنا درست ہے، چاہے

دوسرا شریک عمل کرے یا نہ کرے۔ مثلاً حامد اور محمود دونوں نے ایک ایک لاکھ رینڈ لگائے، اور محمود پر عمل کی شرط بھی لگائی ہے تو محمود کے لیے ۷۰ فیصد نفع مقرر کرنا جائز اور درست ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وإن كان المالان متساويين فشرطا لأحدهما فضلاً على ربح ينظر: إن شرط العمل عليهما جميعاً جاز والربح بينهما على الشرط في قول أصحابنا الثلاثة...وإن كان المالان متفاضلين وشرط التساوي في الربح فهو على هذا الخلاف أن ذلک جائز عند أصحابنا الثلاثة، وكان زيادة الربح لأحدهما على قدر رأس ماله بعمله وأنه جائز. (بدائع الصنائع: ۶/۶۲، ۶۳، سعید۔ والفتاوی الهندية: ۲/ ۳۲۰).

(د) شرکاء میں سے جو شریک کام نہ کرے اس کے لیے اس کے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ مقرر کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز اور درست نہیں۔ مثلاً حامد اور محمود دونوں نے ایک ایک لاکھ رینڈ لگائے اور عمل کی شرط فقط محمود پر لگائی تو حامد کے لیے ۵۰ فیصد سے زیادہ نفع متعین کرنا جائز نہیں ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وإن كان المالان متساويين ...شرطا العمل على أحدهما...وإن شرطاه على أقلهما ربحاً لم يجز، لأن الذي شرطا له الزيادة ليس له في الزيادة مال ولاعمل و لاضمان... (بدائع الصنائع: ۶/ ۶۳، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/ ۴۷، مشارکہ اور مضاربہ کا اجتماع).

(ھ) اگر ایک شریک نے مال زیادہ لگایا اور عمل کی شرط بھی اسی پر لگائی گئی ہو تو نفع نصف نصف تقسیم کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً حامد نے ایک لاکھ رینڈ لگائے اور محمود نے ڈیڑھ لاکھ لگائے اور عمل کی شرط بھی محمود پر لگائی تو اب دونوں کے درمیان ۵۰ فیصد نفع کی تقسیم جائز نہیں ہوگی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

وإن كان المالان متفاضلين وشرطا التساوى في الربح...شرطا العمل على أحدهما...وإن شرطاه على صاحب الأكثر لم يجز، لأن زيادة الربح في حق صاحب الأقل لايقابلها مال ولاعمل ولاضمان. (بدائع الصنائع: ۶/ ۶۳، سعید).

☆ شرکت میں نقصان کا تاوان:

فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر شرکت کے کاروبار میں نقصان ہو جائے تو ہر شریک پر نقصان کا تاوان اس کے سرمایہ کے تناسب سے ہوگا۔ مثلاً حامد اور محمود دونوں شریک ہیں، حامد نے ۶۰ فیصد اور محمود نے ۴۰ فیصد لگائے، اگر بالفرض ہزار رینڈ کا نقصان ہوا تو حامد ۶۰۰ برداشت کرے گا اور محمود ۴۰۰ برداشت کرے گا۔

مصنف عبدالرزاق کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

عن الشعبيّ عن عليﷺ في المضاربة: الوضيعة على المال والربح على ما اصطلحوا عليه، وأما الثوريّ فذكره... عن عليﷺ في المضاربة أو الشريكين. (مصنف عبدالرزاق: ۲۴۸/۸، المجلس العلمی).

بدائع الصنائع میں ہے:

والوضيعة على قدر المالين متساوياً ومتفاضلاً، لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال، فيتقدر بقدر المال. (بدائع الصنائع: ۶۲/۶، سعید).

☆ نفع دوبارہ تجارت میں لگانے کا حکم:

اگر شریکین منافعہ تقسیم نہ کریں، بلکہ منافعہ کو دوبارہ تجارت میں لگادیں تو یہ جائز اور درست ہے، اور اسی کے حساب سے دونوں کا سرمایہ شمار ہوگا۔ مثلاً حامد اور محمود نے ایک ایک لاکھ رینڈ تجارت میں لگائے، نصف فیصد کی شرط پر اور ۵۰ ہزار کا نفع ہوا اور تقسیم کرنے کی بجائے اس ۵۰ ہزار کو تجارت میں لگادیا تو اب دونوں کا سرمایہ ایک لاکھ پچیس ہزار ہو گیا۔

(۴) شرکتِ موقتہ کا حکم:

شریکین کے لیے جائز ہے کہ آپس میں رضامندی سے شرکت کی جو مدت چاہیں طے کر سکتے ہیں، مثلاً دو سال، تین سال وغیرہ۔

قال في الشامية نقلاً عن الخانية: وإن وقتا لذلك (أى للشركة) وقتاً بأن قال: ماشتريت اليوم فهو بيننا صح التوقيت، فما اشتراه بعد اليوم يكون للمشتري خاصة، وكذا لو وقت المضاربة لأنها والشركة توكيل، والوكالة مما يتوقت. (فتاوى الشامي: ۳۱۲/۴، سعید).

مزید ملاحظہ ہو (والفتاویٰ الہندیۃ: ۳۰۲/۲۔ واسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴۶/۵، مضاربہ کو ختم کرنا).

(۵) مشترکہ کمپنی یا تجارت پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے، ہر شخص پر اس کے حصہ کی مقدار کے مطابق زکوٰۃ لازم ہوگی۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا جلد سوم، کتاب الزکوٰۃ)۔

(۶) شریک کے لیے تنخواہ مقرر کرنے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، اس کی تفصیل باب المضاربہ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ کے نزدیک جائز ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ: ۷/۳۲۱-۳۲۸)۔

(۷) اگر کوئی شریک مشترکہ تجارت کے لیے قرض لے، اور آپس میں یہ معاہدہ بھی ہو کہ بوقتِ ضرورت قرض لیا جاسکتا ہے، تو اس کی ادائیگی، دونوں پر لازم ہے۔

بدائع الصنائع میں ہے:

ولو استقرض مالاً لزمهما جميعاً، لأنه تملك مال بالعقد، فكان كالصرف، فيثبت في حقه وحق شريكه.... (بدائع الصنائع: ۶/۷۲، سعید)۔

(۸) منافع تقسیم کرنے کا طریقہ (۳) کے تحت مفصل مذکور ہوا۔

(۹) اثاثہ کے تصفیہ، تقسیم کرنے کا طریقہ:

جب شرکت ختم ہوگئی، وقت مکمل ہوگیا یا کسی اور وجہ سے فسخ کردی تو اب دو صورتیں ہیں:

(الف) اموال نقد کی شکل میں ہے، سب سے پہلے نفع شرط کے مطابق تقسیم کرلے پھر سرمایہ اپنے حصوں کے مطابق تقسیم کرلے۔

(ب) اموال نقد کی شکل میں نہیں بلکہ سامان کی شکل میں ہے، تو سامان کی بازاری قیمت لگا کر دونوں شریک اگر راضی ہو تو سامان بیچ کر نقد تقسیم کرلے، نفع کی تقسیم کے بعد لگائے ہوئے تناسب سے سرمایہ تقسیم کرلے۔

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

ہر شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی وقت دوسرے شریک کو نوٹس دے کر مشارکہ ختم کردے، ایسے نوٹس کے ذریعہ مشارکہ ختم تصور کیا جائے گا۔

اس صورت میں اگر مشارکہ کے سارے اثاثے نقد شکل میں ہیں تو انہیں شرکاء کے درمیان ان کے حصوں

کے مطابق تقسیم کرلیا جائے گا، لیکن اگر اثاثہ جات سیال شکل میں نہیں ہیں تو شرکاء دو باتوں میں سے کسی پر اتفاق کر سکتے ہیں، یا تو اثاثہ جات کی تنضیض کرلیں (یعنی بیچ کر نقد میں تبدیل کرلیں) یا انہیں اسی حالت میں تقسیم کرلیں۔ اگر اس معاملہ پر شرکاء کے درمیان اختلاف موجود ہو یعنی بعض تنضیض (Liquidation) چاہتے ہوں اور بعض خود اثاثہ جات کو غیر نقد شکل میں تقسیم کرنا چاہتے ہوں تو مؤخر الذکر (اثاثہ جات کی اسی حالت میں تقسیم) کو ترجیح دی جائے گی، اس لیے کہ مشارکہ کے اختتام کے بعد تمام اثاثہ جات حصہ داروں کی مشترکہ ملکیت ہیں، اور کسی چیز پر مشترکہ ملکیت رکھنے والوں میں سے ہر ایک کو تقسیم یا اپنا حصہ الگ کرنے کے مطالبے کا حق حاصل ہوتا ہے اور کوئی بھی اسے تنضیض (Liquidation) پر مجبور نہیں کر سکتا، تاہم اگر اثاثہ جات ایسے ہیں کہ انہیں تقسیم کر کے ان کے حصے الگ الگ نہیں کیے جا سکتے، جیسے مشینری تو ان اثاثہ جات کو بیچ کر وصول ہونے والی رقم کو تقسیم کرلیا جائے گا۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/ ۳۸، مشارکہ ختم کرنا)۔

(۱۰) شریکین میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو شرکت ختم ہو جاتی ہے، اگر فریقین چاہیں تو دوبارہ تجدید کی ضرورت ہوگی۔

ہدایہ میں ہے:

وإذا مات أحد الشريكين... بطلت الشركة . (الهداية: ٢/ ٦٣٥).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

اگر مشارکہ کی مدت کے دوران شرکاء میں سے کسی کا انتقال ہو جاتا ہے تو مرنے والے کے ساتھ مشارکہ کا معاہدہ ختم ہو جائے گا، اس صورت میں اس کے وارثوں کو اختیار ہوگا، چاہیں تو مرنے والے کا حصہ واپس لے لیں اور اگر چاہیں تو مشارکہ کے اس معاہدہ کو جاری رکھیں۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/ ۳۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اینٹیں بنانے میں شرکت کا حکم:

سوال: فقہاء نے لکھا ہے کہ احتطاب میں شرکت درست نہیں بلکہ جو جمع کرے وہی مالک ہے اگر ایسا ہے تو احتطاب اور اینٹ بنانے میں کیا فرق ہے؟ کیا اینٹیں بنانے میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: احتطاب میں شرکت جائز نہیں ہے، کیونکہ مباح چیز کے حاصل کرنے میں شرکت درست نہیں، اور اینٹ بنانے میں شرکت کا حکم یہ ہے کہ اگر مٹی مملوک ہے تو شرکت جائز اور درست ہے، لیکن اگر مٹی مباح اور غیر مملوک ہے، تو پھر احتطاب کی طرح ہے کوئی فرق نہیں ہے، یعنی جس نے جو کام کیا وہ اس کا مالک ہے،

اوراگر دونوں نے ساتھ میں کام کیا اور ہر ایک کا کام معلوم نہیں ہے تو نصف نصف ملے گا۔
درمختار میں ہے:

لا تصح شركة في احتطاب...إلى قوله وطبخ آجر من طين مباح لتضمنها الوكالة والتوكيل في أخذ المباح لايصح (وماحصله أحدهما فله وما حصلاه معاً فلهما نصفين إن لم يعلم مالكل. قوله من طين مباح فإن كان الطين أو النورة أوسهلة الزجاج مملوكاً فاشتركا على أن يشتريا ذلک ويطبخاه ويبيعاه جاز، وهو كشركة الوجوه ،كذا في الخلاصة معزياً إلى الشافي، وتبعه البزازي والعيني والمذكور في الفتح أن هذا من شركة الصنائع والأول أظهر، نهر. (الدر المختار مع ردالمحتار:٤/٣٢٥،فصل فی الشركة الفاسدة، سعيد).

وكذا فی حاشية الطحطاوی علی الدر المختار:٢/٥٢٣، كوئته).
عالمگیری میں ہے:

وكذا إذا اشتركا على أن يبنيا من طين غير مملوک أويطبخا آجراً كذا في فتح القدير فإن كان الطين أو النورة أوسهلة الزجاج مملوكاً واشتركا على أن يشتريا ويطبخا ويبيعا جاز وهي شركة الوجوه كذا في الخلاصة. (الفتاوی الهندية:٢/٣٣٢).

البتہ اگر کسی صنعت وکاریگری میں شرکت کریں یعنی ایسے عمل میں جو بلافن جانے ہوئے انجام نہ پاتا ہو تو پھر یہ شرکت محقق ابن ہمامؒ کے قول کے مطابق شرکت صنائع میں داخل ہو کر جائز ہونی چاہئے ،مثلاً اینٹیں بنانا بھی مہارت کا کام ہے، بغیر سیکھے ہوئے ہر انسان انجام نہیں دے سکتا ہے۔
نیز ابن ماجہ شریف کی روایت سے بھی محقق ابن ہمامؒ کے قول کی تائید معلوم ہوتی ہے:
ملاحظہ فرمائیں ابن ماجہ شریف میں ہے:

حدثنا أبوالسائب سلم بن جنادة ثنا أبو داود الحفری عن سفيان عن أبي إسحاق عن أبي عبيدة عن عبد الله قال: اشتركت أنا وسعد وعمار يوم بدر فيما نصيب فلم أجئ أنا ولا عمار بشيء وجاء سعد برجلين. (رواه ابن ماجه،ص١٦٥، باب الشركة والمضاربة).

حضرت مولانا عبدالغنی مجددی اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

قوله اشتركت أنا وسعد وعمار الخ : صورة هذه الشركة شركة التقبل وسمى شركة

الصنائع والأعمال والأبدان وهي أن يتفقا صانعان على أن يتقبلا الأعمال التي يمكن استحقاقها، ومنه تعليم الكتابة والقرآن والفقه على المفتى به، ويكون الكسب بينهما على ما شرطا مطلقاً في الأصح لأنه ليس بربح بل عمل فصح تقويمه كما في الدرالمختار الظاهر أن هذه ليست بشركة فاسدة كاحتشاش واصطياد وسائر المباحات لأن المقاتلة من جملة الصنائع ولهذا ترى الناس يأخذون فنونها وقواعدها من أساتذة هذا الفن. (حاشية ابن ماجه،ص١٦٥، باب الشركة والمضاربة).

محیط برہانی میں مذکور ہے:

في "فتاویٰ أبي الليث": رجلان اشتركا لحفظ الصبيان وتعليم القرآن، فعلى ما أخبرنا في "الفتویٰ":... تجوز هذه الشركة. (المحيط البرهاني:٦/٤١١،الفصل السادس فی الشركة بالاعمال،مكتبه رشيديه۔وفتاوى النوازل:٢٢٤، كتاب الشركة،ط:آرام باغ كراچی). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شرکتِ مفاوضہ کی شرائط اور حکم:

سوال: شرکتِ مفاوضہ کی کیا شرائط ہیں، اور اگر شرائط مفقود ہو جائیں تو شرکت کیسے باقی رہے گی؟

الجواب: مفاوضہ کے معنی ایک دوسرے کے سپرد کرنے کے ہیں، اس شرکت کو مفاوضہ اس لیے کہتے ہیں کہ ایک شریک دوسرے کو اپنا مال سپرد کر دیتا ہے، اس میں سرمایہ کا ہونا بھی ضروری ہے، اور نفع میں بھی برابری شرط ہے، اس شرکت کے لیے حسبِ ذیل باتیں ضروری ہیں:۔

(۱) ابتداء سے آخر تک دونوں کا سرمایہ برابر ہونا ضروری ہے۔

(۲) دونوں کا نفع میں برابر کے حصہ دار ہونا۔

(۳) ہر شریک کو مال کے خریدنے بیچنے اور تصرف کرنے اور قرض دینے کا اختیار ہوگا۔

(۴) اگر کوئی شریک اپنی ذاتی ضرورت کے لیے کوئی چیز خریدے تو اس میں دوسرے شریک کو کچھ کہنے کا حق نہیں، لیکن اگر یہ چیزیں اس نے ادھار لی ہیں، تو دوکاندار کو دوسرے شرکاء سے بھی تقاضے کا حق ہے۔

(۵) اس شرکت میں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل، امین اور کفیل ہوتے ہیں۔

(۶) یہ شرکت صرف مسلمان بالغوں میں ہی ہو سکتی ہے، ہاں صاحبین رحمہما اللہ مسلم اور غیر مسلم دونوں میں صحیح

سمجھتے ہیں۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما بيان شرائط جواز هذه الأنواع فلجوازها شرائط بعضها يعم الأنواع كلها وبعضها يخص البعض دون البعض:

وأما شرائط العامة فأنواع : منها؛ أهلية الوكالة لأن الوكالة لازمة فى الكل .

ومنها؛ أن يكون الربح معلوم القدر.

ومنها؛ أن يكون الربح جزءاً شائعاً فى الجملة لا معيناً .

وأما الذي يخص البعض دون البعض فيختلف ، أما الشركة بالأموال فلها شروط :

منها؛ أن يكون رأس المال من الأثمان المطلقة وهي التي لاتتعين بالتعيين فى المفاوضات على كل حال وهي الدراهم والدنانيرعناناً كانت الشركة أو مفاوضة عند عامة العلماء.

ومنها؛ أن يكون رأس مال الشركة عيناً حاضراً لا ديناً ولا مالاً غائباً فإن كان لاتجوزعناناً كانت أو مفاوضة لأن المقصود من الشركة الربح وذلك بواسطة التصرف ولايكمن فى الدين ولا المال الغائب فلا يحصل المقصود.

ومنها؛ ما هو مختص بالمفاوضة وهوأن يكون لكل من الشريكين أهلية الكفالة بأن يكونا حرين عاقلين .

ومنها؛ المساواة في رأس المال قدراً وهي شرط صحة المفاوضة بلا خلاف .

ومنها؛ أن لايكون لأحد المتفاوضين ما تصح فيه الشركة ولا يدخل فى الشركة .

ومنها؛ المساواة فى الربح فى المفاوضة فإن شرطا التفاضل فى الربح لم تكن مفاوضة لعدم المساواة .

ومنها؛ العموم فى المفاوضة وهو أن يكون في جميع التجارات ولايختص أحدهما بتجارة دون شريكه لما فى الاختصاص من إبطال معنى المفاوضة وهو المساواة .

ومنها؛ لفظ المفاوضة في شركة المفاوضة ،كذا روى الحسن عن أبي حنيفةؒ أنه

لاتصح شركة المفاوضة إلا بلفظ المفاوضة وهو قول أبي يوسفؒ ومحمدؒ . (بدائع الصنائع:٦/٥٨ـ ٦١،کتاب الشرکة، سعید).

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

لاتصح شركة المفاوضة فى الأموال حتى يكون كل واحد من الشريكين من أهل الكفالة نحو أن يكونا حرين، عاقلين بالغين متفقين فى الدين...الخ. (الفتاوی السراجية،ص:٣٦٨ـو كذا فى الفتاوى الهندية: ٢/٣٠٧، باب ٢).

مذکورہ بالا شرائطِ مفاوضہ میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو شرکتِ مفاوضہ شرکتِ عنان میں تبدیل ہو جائیگی۔

ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں ہے:

إذا فقد شرط من الشروط المذكورة في هذا الفصل على الوجه المار تنقلب المفاوضة عناناً، مثلاً إذا دخل إلى يد واحد من المفاوضين في شركة الأموال مال بالإرث أو بطريق الهبة ، فإذاكان يصلح رأس مال للشركة كالنقود تنقلب المفاوضة عناناً لكن إذا كان الزائد على رأس المال لايصح رأس المال كالعروض والعقار فلايضر بالمفاوضة.

(شرح المجلة لمحمدخالدالاتاسی،٤/ ٢٩٠،المادة:١٣٦٢).

شرح مجلّہ میں ہے:

وفي الهندية عن السراجية: لو استفاد أحد المتفاوضين مالايجوزعليه عقد الشركة بإرث أو هبة أو وصية أو نحو ذلك ووصل إليه ، بطلت المفاوضة وصارت شركتهما عناناً. (شرح المجلةللاتاسی:٤/٢٨٧).

درمختار میں ہے:

وكل موضع لم تصح المفاوضة لفقد شرطها ولايشترط ذلك فى العنان كان عناناً كما مر لاستجماع شرائطه. وفي رد المحتار: قوله لاستجماع شرائطه أى شرائط العنان.

(الدرالمختارمع ردالمحتار:٤/٤٩٩،سعید).

وللاستزادة انظر : (البحرالرائق:٥/١٧١،کوئٹہ۔فتح القدير:٦/١٦٤،دارالفكر۔والفتاوى الهندية: ٢/٣١١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

سامان میں شرکت کا حکم:

سوال: اگر شریکین نقد کی بجائے سامان میں شرکت کرلیں، مثلاً زید کے پاس کپڑے ہیں اور عمر کے پاس کتابیں ہیں، اور آپس میں نصف ربح کی شرط پر شرکت منعقد کرلیں تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: فقہاء فرماتے ہیں کہ شرکتِ مفاوضہ اور شرکتِ عنان کے لیے شریکین جو مال جمع کریں گے وہ نقد کے قبیل سے ہوگا، مثلاً سونا چاندی، یا فلوس رائجہ وغیرہ میں سے کسی کا ہونا ضروری ہے، سامان میں شرکت صحیح اور درست نہیں ہوگی۔

شرحِ مجلّہ میں ہے:

كون رأس المال من قبيل النقود شرط لصحة شركة الأموال سواء كانت مفاوضة أو عناناً فلا تجوز بالعروض والمكيل والموزون عندنا، لأنه يودي إلى ربح مالم يضمن لأنه إذا باع كل واحد منهما رأس ماله وتفاضل الثمنان، فما يستحقه أحدهما من الزيادة في مال صاحبه ربح مالم يملك ومالم يضمن. (شرح المجلة، للاتاسي، ٤/٢٦١، المادة:١٣٣٨).

لیکن حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے امداد الاحکام میں شرکت فی العروض کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، پس ابتلائے عام کی وجہ سے اس مسئلہ میں دیگر ائمہ کے قول پر فتویٰ دے کر شرکت مذکورہ اور شرکت فی العروض کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ (امداد الاحکام:۳/۴۴۵).

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں ذکر فرمایا ہے کہ عروض میں شرکت کے بارے میں اگرچہ فقہاء کرام کا اختلاف ہے، لیکن موجودہ زمانے کی ضروریات اور ابتلائے عام کی وجہ سے امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس سے عصر جدید کی مشکلات اور پریشانیوں کے حل کرنے میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ (شرکت اور مضاربت عصر حاضر میں، ص۲۵۴، ادارۃ المعارف کراچی).

مزید ملاحظہ ہو: (امداد الفتاویٰ:۳/۴۹۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زوجین کی شرکت کا حکم:

سوال: ما رأيكم في الزوجة والزوج عقدا شركة بالتراضي عند عقد الزواج على أن

ما حصلا وما سيحصلان فى المستقبل من جميع أنواع المال ونماءه فهو بينهما نصفان هل يجوز هذه الشركة أم لا؟

الجواب: الشركة فيما عندهما من الأمتعة الموجودة تصح بحيلة وتدبير ذكرها الفقهاء الكرام وهو أن يبيع كل واحد منهما نصف ماله بنصف مال الآخر وإن تفاوت قيمتهما حتي يصير المال بينهما نصفين فيكون رأس المال والربح والوضيعة بينهما نصفين كما يفهم من رد المحتار: للعلامة الشامى: (۵۰۳/٤،سعيد).

لكن يتحقق شركة المفاوضة بشرائط يشكل تحققها في أكثر المواقع فإن لها شرائط (١) كونهما حرين عاقلين. (٢) المساواة في قدر رأس المال قدراً. (٣) دخول جميع ما يصح فيه الشركة من الأموال فى الشركة. (۴) المساواة فى الربح. (۵) العموم أى كونها في جميع التجارات (٦) استعمال لفظ المفاوضة. هذا محصل ما فى البدائع: (۹۲/٦،سعيد).

ثم قلما توجد هذه الشرائط فلو عقدا شركة المفاوضة ولم توجد الشرائط تصير الشركة شركة عنان كما فى المجلة: إذا فقد شرط من شروط المفاوضة تنقلب المفاوضة عناناً. مجله. ومعين القضاة والمفتين: (ص۱۰۱).

وإذا انعقدت الشركة عناناً فلها صور أربع:

(١) الشركة مع تساوى المال وعمل كل واحد مع تقسيم الربح متساوياً.

(٢) تقسيم الربح متفاوتاً مع عملهما كثلثي الربح لأحدهما وهذا أيضاً يصح.

(٣) أن يعمل أحدهما دون الآخر وشرطا الحصة الزائدة للعامل فهذا أيضاً صحيح قال ملك العلماء فى بدائع الصنائع: (۹۵/٦،سعيد) وإن شرطا العمل على الذي شرطا له فضل الربح جاز والربح بينهما على الشرط فيستحق ربح رأس ماله بماله والفضل بعمله وإن شرطا على أقلهما ربحاً لم يجز لأن الذي شرطا له الزيادة ليس له فى الزيادة مال ولا عمل ولا ضمان.

(۴) أن يعمل أحدهما وشرطا الحصة الزائدة لغير العامل فهذا لايصح كماصرحت به عبارة الكاساني. ثم الشركة فيما سيحصلان من المال مما لايكون من التجارة السابقة

كالمال الموهوب أو الموروث لايدخل في الشركة السابقة إلا بعقد جديد مثلاً انعقدت بينهما شركة بحيث أن لكل واحد منهما عشرة آلاف دولار والربح متساوٍثم حصل للزوجة خمسة آلاف دولار من وراثة أبيها و أرادت إلحاقها في التجارة المشتركة فلها أن تقول برضاء الزوج وقبوله أن لي ثلاثة أخماس من الربح ولك خمسان من الربح ويمكن أن تقول: إني ألحق مالي بالتجارة على أن لي النصف حسب ماسبق ولك النصف .

كما في الفتاوى الهندية: ولو شرطا العمل عليهما جميعاً صحت الشركة وإن قل رأس مال أحدهما وكثر مال الآخر واشترطا الربح بينهما على السواء أو على التفاضل فإن الربح بينهما على الشرط .(الفتاوى الهندية:۲/ ۳۲۰).

نعم لو تعاهدا في بدء التجارة أن كل ماتحصله فهو بيننا كماقلنا وتعاهدنا ثم ما حصله كل واحد منهما وأدخله في التجارة حسبما قالا وقررا يكون صحيحاً كبيع التعاطي، ويكون الربح بينهما كماقرر عند أول العقد . واللہ ﷻ اعلم۔

ایک شریک پرتاوان ڈالنے کا حکم:

سوال: چندافراد نے شرکت کی ہےاوراس میں کچھ نقصان ہواتو صرف عمل کرنے والا ضامن ہوگایا سب پرتقسیم ہوگا؟

الجواب: فقہاء نے فرمایا کہ نفع میں تو کمی بیشی کی شرط جائز ہے،لیکن نقصان ہوتو تاوان سب شرکاءپر مشترکہ طورپر برابر تقسیم ہوگا۔مثلاً پانچ افراد میں سے ہرایک نے ۱۰۰۰ ریند جمع کیےاورشرکت منعقدکی اوراتفاقاً ۱۰۰۰ ریندکا نقصان ہواتو صرف ایک شخص کوذمہ دارٹھہرانادرست نہیں ، بلکہ ہرایک شریک ۲۰۰ ریندکا ذمہ دارہوگا۔

ملاحظہ ہوفتاویٰ شامی میں ہے:

مطلب اشتراط الربح متفاوتاً صحيح، بخلاف اشتراط الخسران، قال: فماكان من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما، وماكان من وضيعة أو تبعة فكذلك، والخلاف أن اشتراط الوضيعة بخلاف قدر رأس المال باطل واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحيح.

(فتاوی الشامی:٤/٣٠٥،سعید). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایک شریک کا ضرورت کی اشیاء مہیا کرنے کا حکم:

سوال: چند افراد نے شرکت کی نیت سے سوسو رینڈ جمع کیے، مگر ایک شخص نے ۸۰ رینڈ کا خرچہ کر کے ضرورت کی اشیاء مہیا کردی اور ۲۰ رینڈ نقد دے دیے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص کی شرکت صحیح ہے یا پورے سو رینڈ نقد دینا ضروری ہے؟

الجواب: فقہاء فرماتے ہیں کہ شرکت منعقد ہونے کے لیے راس المال کا نقد ہونا ضروری ہے، لہذا جس شریک نے خرچہ کیا اور ضرورت کی اشیاء مہیا کردی اس کی شرکت صحیح نہیں ہوئی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولاينعقد الشركة إلا بالدراهم والدنانير والفلوس النافقة...إلى قوله إن العروض لاتصح رأس مال الشركة . (الهداية:٢/٦٢٧).

مبسوط میں ہے:

لايصح أن يكون رأس مال أحدهما دراهم ورأس مال الآخر عروضاً في مفاوضة ولاعنان . (المبسوط للامام السرخسیؒ:١١/١٦١۔ وكذا فی الفتاوى الهندية:٢/٣٠٦).

البتہ علامہ شامیؒ نے عروض میں شرکت کی صحت کی یہ شکل بیان فرمائی ہے کہ شخص مذکور جس نے اشیاء مہیا کی ہے وہ اپنے سامان کے کچھ حصص دوسرے شرکاء کو فروخت کردے پھر شرکت منعقد کرلے تو درست اور جائز ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

(وصحت بعرض) هو المتاع غير النقدين (إن باع كل منهما نصف عرضه بنصف عرض الآخر ثم عقداها) مفاوضة أوعناناً وهذه حيلة لصحتها بالعروض،(قوله إن باع كل منهما)لأنه بالبيع صار بينهما شركة ملك حتى لايجوزلأحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر ثم بالعقد بعده صارت شركة عقد فيجوزلكل منهما التصرف زيلعي. (قوله بنصف عرض الآخر) وكذا لو باعه بالدراهم ثم عقد الشركة فى العرض الذي باعه جاز أيضاً

زیلعي، وبحر، وقوله الذي باعه يعني الذي باع نصفه بالدراهم. (فتاوى الشامي:٤/ ٣١٠،سعيد).

لیکن فی زماننا ابتلائے عام کی وجہ سے حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے مذہبِ مالکیہ پر فتویٰ دینے کی گنجائش نکالی ہے، ملاحظہ ہو: (امداد الفتاویٰ:۳/ ۴۹۵۔ وامداد الاحکام:۳/ ۴۴۵)۔

قدرے تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بلا عقد بیوی کا شوہر کی معاونت کرنے کا حکم:

سوال: اگر بیوی شوہر کے ساتھ کام کرے اور ان دونوں کی محنت سے بہت سا مال جمع ہو جائے، لیکن کوئی عقد نہ کیا ہو تو اس صورت میں بیوی کو کیا ملے گا؟ نیز اگر کل سرمایہ شوہر کا ہو اور بیوی نے صرف معاونت کی ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر بیوی شوہر کے ساتھ کام کرے، لیکن ان دونوں کے درمیان شراکت یا ملازمت وغیرہ کا کوئی عقد نہ ہو اور ان دونوں کی محنت سے بہت سارا مال جمع ہو جائے تو اس مال کے بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ تمام مال شوہر کی ملکیت ہوگا، اور بیوی تبرعاً کام کرنے والی کہلائیگی۔

لیکن دیگر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ کل مال میں بیوی کا نصف حصہ ہوگا، کیونکہ یہاں اگر چہ عقد نہیں ہے، لیکن بیوی کا مسلسل شوہر کے ساتھ کام کرنا اور محنت کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نصف مال میں اس کا بھی حصہ ہوگا، لہذا اس کو حصہ دینا چاہئے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، ہاں شرکتِ مفاوضہ نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کے منعقد ہونے کے لیے مفاوضہ کا عقد کرنا ضروری ہے، جو یہاں مفقود ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

(قوله وماحصلاه معا فلهما نصفين...الخ) يعني ثم خلطاه وباعاه، فيقسم الثمن على كيل أو وزن ما لكل منهما وإن لم يكن وزنياً ولا كيلياً قسم على قيمة ما كان لكل منهما، وإن لم يعرف مقدار ما كان لكل منهما صدق كل واحد منهما إلى النصف لأنهما استويا في الاكتساب وكأن المكتسب في أيديهما، فالظاهر أنه بينهما نصفان، والظاهر يشهد له في ذلك، فيقبل قوله ولايصدق على الزيادة على النصف إلا ببينة، لأنه يدعي خلاف الظاهر. فتح. تنبيه: يوخذ من هذا ما أفتى به في الخيرية في زوج امرأة وابنها اجتمعا في دار واحدة

وأخذ كل منهما يكتسب على حدة ويجمعان كسبهما ولايعلم التفاوت ولا التساوى ولا التمييز، فأجاب بأنه بينهما سوية، وكذا لو اجتمع إخوة يعملون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية، ولو اختلفوا فى العمل والرأي. وقدمنا أن هذا ليس شركة مفاوضة مالم يصرحا بلفظها أو بمقتضياتها مع استيفاء شروطها، ثم هذا في غير الابن مع أبيه، لما فى القنية: الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء فالكسب كله للأب، إن كان الابن في عياله لكونه معيناً له ألاترى لوغرس شجرة تكون للأب ثم ذكرخلافاً فى المرأة مع زوجها إذا اجتمع بعملهما أموال كثيرة، فقيل هي للزوج وتكون المرأة معينة له، إلا إذا كان لها كسب على حدة فهو لها، وقيل بينهما نصفان. (فتاوى الشامی:٤/٣٢٥،فصل فی الشركة الفاسدة،سعید).

درمختار میں ہے:

تقبل ثلاثة عملاً بلا عقد شركة فعمله أحدهم فله ثلث الأجر ولا شيء للآخرين.

وفي رد المحتار: قوله ولاشيء للآخرين، لأنهم لما لم يكونوا شركاء كان على كل منهم ثلث العمل، لأن المستحق على كل منهم ثلثه بثلث الأجر، فإذا عمل أحدهم الكل صار متطوعاً فى الثلثين فلايستحق الأجر، ح عن البحر. وقال ابن وهبان: هذا فى القضاء، أما فى الديانة فينبغي أن يوفيه بقية الأجرة لأن الظاهر من حال العامل أنه إنما عمل الجميع على الظن أن يعطيه جميع الأجرة فلا ينبغي أن يخيب ظنه. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٤/٣٢٩،سعید).

دررالحکام فی شرح مجلۃ الاحکام میں ہے:

وأما ديانة فيجب على المستاجر أن يدفع بقية الأجرة للعامل لأن الظاهر من حالة العامل أنه قد قام بجميع العمل على أمل أن يدفع الأجرة فلا يليق أن يخيب ظنه وأمله هذا ولاسيما أن الغالب الفقر في أحوال العمال. [طحطاوى]. (دررالحكام فى شرح مجلة الاحكام:٣/٣٦٥).

وكذا فى شرح منظومة ابن وهبان:١/٢٤٠فصل من كتاب الشركة،الوقف المدنى).

درمختار میں ہے:

وقال أبويوسفؒ : إذا كان الصانع معاملاً به فله الأجر، وإلا فلا، وقيل أى وقال محمدؒ إن كان الصانع معروفاً بهذه الصنعة بالأجر وقيام حاله بها أى بهذه الصنعة كان بيمين القول قوله بشهادة الظاهر وإلا فلا، وبه يفتىٰ. وفي رد المحتار: قوله بشهادة الظاهر لأنه لما فتح الدكان لأجله جرى ذلک مجرى التنصيص عليه اعتباراً لظاهر المعتاد، زيلعي.

(الدر المختار مع رد المحتار:٦/ ٧٥، كتاب الاجارة، سعيد).

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کے عمل کے نتیجہ میں بہت سارا مال حاصل ہوگیا تو ان اموال میں میاں بیوی دونوں شریک ہوں گے اور نصف نصف ملے گا، اور یہ معاملہ شرکت الصنائع کی طرح ہوگا۔ اور اگر سرمایہ اور کل پونجی شوہر کی تھی اور بیوی صرف معاونت کرتی تھی تب بھی ابن وہبان اور شارحِ مجلّہ کے قول کے مطابق اجرت کی مستحق ہوگی، مثلاً کوئی شخص دھوبی کے پاس یا رنگریز کے پاس کپڑا لے جاتا ہے اور خاموشی سے رکھ دیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہاں اجرت لازم ہوگی کیونکہ دکان کا مقصد ہی کمائی ہے اور اجرت متعین ہوتی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشترک چیز کی قیمت لگانے کی مؤنت کا حکم:

سوال: چھ اشخاص ایک زمین میں شریک ہیں، ان میں سے ایک شرکت سے نکلنا چاہتا ہے، اب زمین کی قیمت لگانے کی ضرورت پیش آئیگی، تاکہ اس شریک کے حصہ کے مطابق اس کو رقم دیدی جائے، تو اس زمین کی قیمت لگانے کا خرچ کون برداشت کریگا، یعنی قیمت لگانے کی مؤنت سب شرکاء پر برابر تقسیم ہوگی یا وہ ایک شریک پر ہوگی؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زمین کی قیمت لگانے کی مؤنت میں سب شرکاء برابر شریک ہوں گے، کیونکہ اس میں سب کا فائدہ ہے ہر ایک کو زمین کی قیمت معلوم ہوگی، اور جس طرح قاسم کی اجرت سب شرکاء پر برابر لازم ہوتی ہے، اسی طرح قیمت لگانے کا خرچ بھی سب شرکاء پر برابر لازم ہوگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

(فإن لم يفعل نصب قاسماً يقسم بالأجر) معناه بأجر على المتقاسمين، لأن النفع لهم على الخصوص، ويقدر أجر مثله كي لايتحكم بالزيادة، والأفضل أن يرزقه من بيت المال لأنه أرفق بالناس وأبعد عن التهمة. (الهداية:٤/ ٤١١، كتاب القسمة).

مجمع الانہر میں ہے:

فإن لم ينصب ينصب قاسماً يقسم بين الناس بأجر على المتقاسمين، لأن النفع لهم على الخصوص... يقدر أى أجر المثل له أى للقاسم القاضي لئلا يطمع في أموالهم ويتحكم بالزيادة ثم أن الأجرهو أجر المثل وليس له قدرمعين وقيل يقدر الأجر بربع العشر كالزكاة، لأنها عمل العامة فأشبه الزكاة كما في شرح الوقاية لابن الشيخ وهو أى أجر المثل على عدد الرؤوس أى رؤوس المتقاسمين عند الإمام،لأن تمييز الأقل من الأكثر كتمييز الأكثر من الأقل في المشقة وعندهما على قدر السهام لأنه مؤنة الملك فيقدر بقدره وبه قال الشافعي وأحمد وأصبغ المالكي. (مجمع الانهر:۲/۴۸۸). واللہ ﷻ اعلم۔

ہوٹل چلانے کی کمپنی میں حصہ لینے کا حکم:

سوال: ایک کمپنی ہے جو ہوٹلوں کے بنانے اور چلانے کے کاروبار میں مشغول ہے، بعض ہوٹلیں شراب بیچنے یا دوسری خرابیوں میں ملوث ہیں، لیکن تقریباً نوے فیصد یا اس سے زیادہ آمدنی کمروں کے کرایہ وغیرہ کی ہے، کمپنی مقروض بھی نہیں ہے، نیز اگر شیئر ہولڈر دوسرے کو اس کمپنی میں حصہ لینے کی ترغیب دے تو اس کو بطورِ کمیشن فیصد کے اعتبار سے کچھ ملتا ہے۔ کیا ایسی کمپنی میں حصہ لینے کی گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مذکورہ کمپنی کی غالب آمدنی حلال ذرائع سے ہے اس وجہ سے اس میں حصہ لینے کی گنجائش ہے، ہاں سالانہ اجلاس میں خرابیوں کے بارے میں آواز اٹھانی چاہئے۔

ملاحظہ ہو اسلام اور جدید معاشی مسائل میں ہے:

کمپنی کے حصص کا کاروبار مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ قابل قبول ہے:۔

(۱) کمپنی کا مرکزی کاروبار شریعت کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً سود کی بنیاد پر تمویلی خدمات فراہم کرنا، یعنی بینک، انشورنس کمپنیوں کے حصص، یا ایسی کمپنیوں کے حصص جو کسی اور ناجائز کاروبار میں ملوث ہو، جیسے وہ کمپنیاں جو شراب، خنزیر، حرام گوشت تیار کرتی یا بیچتی ہیں، یا وہ جوا، نائٹ کلب کی سرگرمیوں اور فحاشی وغیرہ میں ملوث ہیں۔ تو پھر ان کمپنیوں میں حصہ لینا اور ان کے ساتھ معاملہ کرنا ناجائز ہے۔

(۲) اگر کمپنی کا مرکزی کاروبار حلال ہے مثلاً آٹوموبائل، ٹیکسٹائل وغیرہ کا کاروبار، لیکن وہ کمپنی اپنا زائد از ضرورت سرمایہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے یا سودی قرضے لیتی ہے تو شیئر ہولڈر پر لازم ہے کہ وہ اس طرح کے معاملات کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردے، جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس عام

میں اس طرح کی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائے۔

(۳) اگر کمپنی کی آمدن میں سودی کھاتوں سے حاصل ہونے والی کچھ آمدن بھی شامل ہے تو شیئر ہولڈر کو ادا کیے گئے منافع میں سے اس تناسب سے نفع کا حصہ خیرات کر دیا جائے اور شیئر ہولڈر خود اس کا فائدہ نہ اٹھائے، مثلاً اگر کمپنی کے کل منافع میں سے پانچ فیصد اسے سودی کھاتوں سے حاصل ہوا ہے تو نفع کا پانچ فیصد خیرات کر دیا جائے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل:۵/۱۶۴). واللہ ﷻ اعلم۔

سرکہ بنانے میں مسلمان کی شرکت کا حکم:

سوال: ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم سرکہ بنانے کی ایک فیکٹری میں شریک ہیں، سرکہ بنانے کے لیے انگور وغیرہ کے عصیر کو شراب کے مرحلہ سے گزارنا پڑتا ہے، غیر مسلم کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن مسلمان پریشان ہے کہ کیا میرے لیے یہ کاروبار جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جب شراب مقصود نہیں بلکہ سرکہ بنانا مقصود ہے تو اس کاروبار میں مسلمان کی شرکت جائز ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ کسی طرح شراب کو سرکہ بنانے سے پہلے پینے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

ملاحظہ ہو عالمگیری میں ہے:

ولو أمسک الخمر في بيته للتخليل جاز ولا يأثم. (الفتاوى الهندية:۵/۳۷۳،كتاب الكراهية،فى المتفرقات).

ہدایہ میں ہے:

والمسلم يحمي خمر نفسه للتخليل. (الهداية:۱/۱۹۸،كتاب الزكوٰة،باب فيمن يمرعلى العاشر).

بنایہ میں ہے:

وللمسلم ولاية خمور نفسه حتى أن الذمي إذا سلم وله خمور كان له حفظها أو يحفظها غيره لتخللها أو يتخلل بنفسها. (البناية فى شرح الهداية:الجزء الثانى،ص۱۲۲۲).

فتح القدیر میں ہے:

قوله تبعاً للخمر دون العكس لأنها "أي الخمر" مالية لأنها قبل التخمرمال وبعده كذلک بتقدير التخلل. (فتح القدير:۲/۲۳۰،باب فيمن يمر على العاشر، دارالفكر).

محیط برہانی میں ہے:

ان الخمر كما يكون للشرب، وإنه معصية في حق المسلم، يكون للتخليل، وإنه مباح للكل. (المحيط البرهاني:٩/ ١٩٠،الاستئجار على المعاصي).

اور درمیان میں اس کا خمر بننا ضمناً اور تبعاً ہے مقصود نہیں، **كثير من الأشياء تثبت ضمناً لاتثبت قصداً۔**

اگر کوئی مسجد میں اعتکاف کرتا ہے تو مسجد میں سوتا ہے، لیکن یہ سونا قصداً نہیں مقصود عبادت ہے لہذا مکروہ نہیں ہے بلکہ ثواب ملے گا، فقہاء نے قاعدہ ذکر فرمایا ہے: **يغتفر في التابع مالايغتفر في غيرها.**

(قواعد الفقه،ص ١٤٢).

شرحِ مجلّہ میں ہے:

اگر کسی نے قسم کھائی کہ اون نہیں خریدوں گا اور دنبہ خریدا تو حانث نہیں ہوگا، کیونکہ اون کی خرید تبعاً ہے۔ (شرح المجلۃ:۱/۱۳۲).

یا یہ قسم کھائی کہ اینٹیں اور لکڑیاں نہیں خریدوں گا اور مکان خریدا تو قسم نہیں ٹوٹی کیونکہ اینٹیں اور لکڑیاں تبعاً آ گئیں۔ (شرح المجلۃ:۱/۱۳۲).

محمد خالد اتاسی نے مجلّہ کی شرح میں اس قاعدہ کی متعدد مثالیں تحریر فرمائی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شرکت سے متعلق چند مسائل:

ایک شخص نے اپنی تمام جائیداد و تجارات کو اپنے چار فرزندوں سے زبانی طور پر فروخت کی بعد ازاں ان چار بیٹوں نے ان تجارات و جائیداد کو حاصل کر کے اور اس پر قبضہ پانے کے بعد ایک تجارتی شرکت جاری کی، نیز اس تجارتی شرکت کو باقاعدہ چلانے کی غرض سے انہوں نے ایک معاہدۂ شرکت مرتب کیا جو آنحضور کی خدمتِ اعلیٰ میں مع استفتاء ہذا کے ارسال ہے، اب دریافت طلب امور حسبِ ذیل ہیں، امید ہے کہ حضرت والا مفصل اور مدلل جوابات تحریر فرما کر رہین منت کریں گے۔

سوال (۱): ملفوف کردہ دستاویز (معاہدہ نامہ) شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

سوال (۲): اگر کوئی معاہد اس معاہدہ کے خلاف عمل کرے تو ایسی مخالفت از روئے شریعت مخالفت کہلائیگی یا نہیں؟

سوال (۳): اگر معاہدہ نامہ میں شرکتِ تجارت کا سرمایہ یعنی اس کی مقدار متعین طور پر مذکور نہ ہو مگر کسی خاص وجہ سے اس کی متعین مقدار سالانہ گوشوارے میں مذکور ہو تو شرکت معتبر ہوگی یا نہیں؟

سوال (۴): اگر کوئی شریک معاہدہ کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دے جب کہ معاہدۂ شرکت میں بذاتِ خود عمل کرنا مشروط ہو، اور کہیں چلا جائے اور ۱۵ سال تک اسی طرح غائب رہے تو شرعاً ایسا غائب شریک تجارت میں شریک سمجھا جائیگا یا نہیں؟ اور اس کی وجہ سے اس کی شرکت ختم ہو جاتی ہے یا نہیں؟

سوال (۵): اگر کسی شریک کے مستعفی ہونے کے بعد باقی شرکاء ان کے استعفاء کا جواب نہ دیں، تو ایسا استعفاء شرعاً معتبر ہے یا نہیں؟

سوال (۶): معاہدۂ شرکت میں یہ بھی مرقوم ہے کہ اگر کسی شریک نے تحریراً شرکت سے الگ ہونے کا استعفاء دیا تو استعفاء کی تاریخ کے چھ ماہ بعد اس کی شرکت از خود ختم ہو جائیگی، آیا اس کے مطابق شرکت ختم ہوگی یا نہیں؟

سوال (۷): اگر کسی شریک کے اس طور پر مستعفی ہونے کے باوجود بھی شرکاء نفع میں سے تقسیم کے وقت اس کا حصہ دیتے رہیں، تو اس کی شرکت باقی رہتی ہے یا ختم سمجھی جائیگی؟

سوال (۸): اگر کسی شریک نے استعفاء تحریر کیا اور کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہوا بعد میں اتفاقاً کہیں سے یہ تحریر دستیاب ہوگئی جب کسی نے پیش نہیں کی تو اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

سوال (۹): اگر کوئی شریک معاہدہ نامہ کے مخصوص دفعہ کے خلاف اپنا استعفاء باقی شرکاء کو پیش کرے تو یہ معتبر ہے یا نہیں؟

سوال (۱۰): ایک شریک کے انتقال پر مرحوم کی اولاد کو شریکِ تجارت کرنے کی مجلس منعقد کرنا جس میں اور بعض ورثاء کی رضامندی ہو اور بعض ورثاء کا سکوت ہو، اس کی وجہ سے تمام ورثاء شریکِ تجارت سمجھیں جائیں گے یا نہیں؟ (اس کے علاوہ معاہدہ نامہ اور دفعات وغیرہ کو بسببِ طوالت حذف کر دیا گیا ہے)۔

یہ استفتاء جنوبی افریقہ کے ایک خاندان کی طرف سے مختلف دارالافتاؤں میں بھیجا گیا، ہمارے پاس بھی یہ سوالات آئے تھے، یہی سوالات دارالعلوم کراچی میں ارسال کیے گئے تھے، وہاں سے بھی جوابات آئے تھے اور پھر یہ جوابات فتاویٰ عثمانی میں بھی چھپ گئے، یہ سوالات ہمارے پاس بھی آئے تھے، دارالعلوم کراچی کے جوابات چونکہ جامع اور مختصر تھے، ہمارے دارالافتاء نے انہی جوابات کو مینارۂ نور سمجھا۔

الجواب (۱): صورتِ مسئولہ میں شرکت درست ہوگئی، اگر چہ حنفی مسلک میں شرکت بالعروض درست نہیں ہوتی، لیکن چونکہ صورتِ مسئولہ میں شخص مذکور کے صاحبزادوں نے تمام جائیدادیں اپنے والد سے مشترک طور پر خرید لیں، اس لیے ان کے درمیان شرکۃ الملک متحقق ہوگئی اور شرکۃ الملک کے تحقق کے بعد شرکۃ العقد عروض میں بھی درست ہے۔

لما في الهندية: والحيلة في جواز الشركة في العروض وكل ما يتعين بالتعيين أن يبيع كل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتى يصير مال كل واحد منهما نصفين، وتحصل شركة ملك بينهما، ثم يعقدان بعد ذلك عقد الشركة فيجوز بلاخلاف كذا في البدائع. (الفتاوی الهندية:۲/۳۰۷،باب اول ،فصل ۳).

لہٰذا صحتِ شرکت میں عروض کی وجہ سے اشکال نہ رہا۔

جہاں تک اس معاہدۂ شرکت کا تعلق ہے جو ضمیمہ کی دستاویز میں قلمبند ہے سو اس کی اکثر شرائط درست ہیں، لیکن اس میں بعض شرطیں فاسد بھی ہیں، مثلاً وہ شرط جو معاہدہ نامہ میں مذکور ہے، کہ کوئی شریک بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کوئی الگ تجارت نہیں کر سکے گا، یہ شرکت عنان کے مقتضا کے خلاف ہے، اور شرکتِ مفاوضہ کی شرائط یہاں موجود نہیں، لہٰذا یہ شرط فاسد ہے، لیکن شرکت میں اگر کوئی شرط فاسد لگادی جائے تو اس سے شرکت باطل نہیں ہوتی، بلکہ صرف وہ شرط فاسد ہو جاتی ہے اور اس پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔

لما في ردالمحتار: لأن الشركة لاتفسد بالشروط الفاسدة. (فتاوی الشامی:۴/۳۱۶، ط: سعید).

ایک اور شرطِ فاسد معاہدے میں مذکور ہے کہ کسی ایک شریک کی وفات کی صورت میں ۳۰ جون سے وفات تک جتنے ماہ گزرے ہیں، ہر ماہ کے مقابلہ میں ان کی اولاد کو پچیس پونڈ ماہانہ مع ان کے تجارتی حصے کی قیمت ادا کیا جائیگا، انگریزی معاہدہ نامہ میں یہ صراحت ہے کہ یہ پچیس پونڈ ماہانہ کی رقم اس نفع کے قائم مقام سمجھی جائیگی جو ۳۰ جون کے بعد وفات کی تاریخ تک مرحوم کے حصے میں آئی ہو۔

اسی قسم کی ایک اور شرطِ فاسد یہ ہے کہ اگر کوئی شریک ۳۱ دسمبر کو شرکت ختم کردے تو وہ اتنی رقم کا حقدار ہوگا جو ۳۰ جون کو اس کے حصے میں تھی مع ایک سو پچاس پونڈ کے جو ۳۰ جون سے ۳۱ دسمبر تک اس کے حصے کا نفع سمجھا جائیگا، یہ شرط بھی مذکورہ بالا وجہ کی بنا پر فاسد ہے، اگر اس طرح کسی ایک شریک کے لیے کوئی متعین رقم بطورِ نفع

اصل شرکت ہی میں مقرر کرلی جاتی تو اس سے شرکت ہی فاسد ہوجاتی۔

لما فی الدرالمختار: وتفسد باشتراط دراهم مسماة من الربح لأحدهما لقطع الشركة لا لأنه شرط، لعدم فسادها بالشروط. (الدرالمختار مع فتاوی الشامی:٤/٣١٦،سعید).

لیکن چونکہ اسی معاہدہ نامہ کی دفعہ ۵ میں شرکاء کے درمیان نفع کی تقسیم کا عام طریقہ شریعت کے مطابق ہے اوراس میں کسی بھی فریق کے لیے کوئی معین رقم مقرر کرنے کے بجائے نفع ونقصان میں برابر کی شرکت طے کی گئی ہے،اوراصل شرکت کا معاہدہ اسی دفعہ پر مبنی ہے،اور دفعہ ۱۱و۱۲میں جوطریق کار مقرر کیا گیا ہے وہ دفعہ ۵ سے متعارض ہے،اورصرف فسخ شرکت کے وقت حساب کا ایک طریقہ طے کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے، بلکہ انگریزی متن میں معین رقم کو نفع کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے،جس کے معنی یہ ہیں کہ نفع تو وہی ہوگا جو دفعہ ۵ کے تحت مقرر ہوگا لیکن یہ معین رقم اس کے قائم مقام سمجھی جائیگی اس لیے اس شرط فاسد کی وجہ سے اصل عقد شرکت باطل نہ ہوگا،البتہ یہ شرط باطل ہوجائیگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاہدۂ شرکت کی وہ دستاویز جو استفتاء کے ساتھ منسلک ہے اس حد تک تو شرعاً معتبر ہے کہ اس کی بنیاد پر شرکت درست ہوگئی،لیکن اس میں جو شرائط فاسدہ مذکور ہیں جن کا ذکراوپر ہوا،وہ شرائط شرعاً واجب العمل نہیں ہیں۔

الجواب (۲): معاہدہ کی وہ شرائط جو شرعاً معتبر ہیں ان کی مخالفت کسی بھی شریک کے لیے جائز نہیں۔

لأن المسلمين على شروطهم إلا شرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً. (صحیح البخاری).

الجواب (۳): اگر یہ بات متعین طور پر معلوم ہو یا کسی جگہ لکھی ہوئی محفوظ تھی کہ چاروں بھائیوں نے اپنے والد سے جو جائیدادیں خریدی ہیں،وہ کیا کیا ہیں؟ اور کہاں کہاں ہیں؟ تو پھر معاہدہ نامہ شرکت میں ان کی جزوی تفصیلات اور مقدار بیان کرنا شرکت کی صحت کے لیے ضروری نہیں تھا،اس کے دو سبب ہیں:۔

(الف) پہلا سبب یہ ہے کہ سرمایہ شرکت کی مقدار کا تعین عقد کے وقت عقد کی صحت کے لیے ضروری نہیں ہوتا۔

لما فی البدائع: وأما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد فليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا وعند الشافعيؒ شرط...ولنا أن الجهالة لاتمنع جواز العقد لعينها، بل لافضائها إلى المنازعة وجهالة رأس المال وقت العقد لاتفضي إلى المنازعة، لأنه يعلم

مقداره ظاهراً وغالباً لأن الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء فيعلم مقدارها فلايؤدي إلى جهالة مقدار الربح وقت القسمة. (بدائع الصنائع:٦/٦٣،سعيد).

(ب)دوسری وجہ یہ ہے کہ صورتِ مسئولہ میں چاروں بھائیوں کے درمیان عقد شرکتِ عنان سے پہلے شرکتِ ملک قائم ہو چکی تھی جیسا کہ سوال (ا) کے جواب میں لکھا گیا ہے،اور سب کے حصے بھی برابر تھے،اور نفع بھی،اس لیے مقدار معلوم نہ ہونے سے جہالت مفضی الی المنازعہ کا کوئی اندیشہ نہیں تھا شرکت فی العروض کا جو حیلہ سوال (ا) کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے اس کے سلسلے میں علامہ ابن ہمام تحریر فرماتے ہیں:۔

وهذا لأن المانع من كون رأس مال الشركة عروضاً كل من أمرين: لزوم ربح مالم يضمن، وجهالة رأس مال كل منهما عند القسمة، وكل منهما منتف، فيكون كل ما ربحه أحدهما ما هومضمون عليه، ولاتحصل جهالة في رأس مال كل منهما، لأنه لايحتاج إلى تعرف رأس مال كل منهما عند القسمة حتى يكون ذلك بالحذر فتقع الجهالة لأنهما مستويان في المال شريكان فيه فبالضرورة يكون كل مايحصل من الثمن بينهما نصفان.

(فتح القدير:٥/٣٩٦).

الجواب (۴): محض کام چھوڑ دینے اور غائب ہو جانے سے شرکت ختم نہیں ہوتی۔

لما في الهندية: وإن عمل أحدهما ولم يعمل الآخر بعذرأو بغيرعذر صار كعملهما معاً، كذا في المضمرات. (الفتاوى الهندية:٢/٣٢٠،كتاب الشركة، باب ٣،فصل ٢).

اگر دوسرے شرکاء اس کے کام چھوڑ دینے کی صورت میں اس کے ساتھ شرکت پسند نہیں کرتے تھے تو ان کو اس کے ساتھ صراحۃً شرکت فسخ کر دینی چاہئے تھی۔

الجواب (۵): یک طرفہ طور پر شرکت فسخ کرنے کے لیے شرعاً ضروری نہیں کہ فریق ثانی فسخ کو قبول کرے۔

لما في الدر المختار: وتبطل أيضاً بإنكارها وبقوله لا أعمل معك وبفسخ أحدهما.

(شامی:٤/٣٢٧،سعيد).

اور جو معاہدہ شرکت صورت مسئولہ میں لکھا گیا ہے اس میں بھی استعفاء کے مؤثر ہونے کو دوسرے شرکاء کی قبولیت پر موقوف نہیں رکھا گیا،لہذا جب کسی شریک نے معاہدہ کے مطابق استعفاء دیا تو اس کی شرکت معاہدہ میں مذکورہ

مدت سے ختم سمجھی جائیگی، خواہ دوسرے شرکاء نے استعفاء قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

الجواب (٦): شرکت ختم ہوجائیگی۔دلیل (۵) میں گزر چکی۔

الجواب (۷): اوپر گزر چکا کہ معاہدہ کے مطابق استعفاء دیدینے سے مستعفی شریک کی شرکت ختم ہوگئی، اب اس کو دوبارہ شریک قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ از سر نو عقد شرکت کیا جائے، لہذا اگر اس کے بعد دوسرے شرکاء نے اس شخص کے ساتھ واضح طور پر دوبارہ تحریری یا زبانی عقد شرکت قائم کرلیا ہو اور اس کی بنا پر وہ اسے چوتھا حصہ دیتے رہے ہوں تب تو وہ دوبارہ شریک سمجھا جائیگا ورنہ نہیں، اس کے برعکس اگر کوئی نیا عقد شرکت نہیں ہوا اور اسے دوسرے شرکاء محض چوتھا حصہ دیتے رہے تو اس میں کئی احتمالات ہیں، ایک یہ ہے کہ شرکاء اسے تبرعاً یہ رقم دیتے رہے ہوں دوسرے یہ کہ شرکت کے فسخ کی بنا پر مستعفی شریک کے جس حصے کی ادائیگی دوسرے شرکاء پر واجب تھی یہ رقم اس کے حصے کے طور پر دیتے رہے ہوں، لہذا جب تک فریقین کے درمیان نئے عقد شرکت کا صریح معاہدہ نہ ہوا ہو ان احتمالات کی موجودگی میں محض چوتھے حصے کی ادائیگی کو عقد شرکت نہیں کہا جاسکتا، لأن الشركة لا تثبت بالاحتمال۔

الجواب (۸): شرعاً بھی شرکت کے فسخ کے لیے یہ ضروری ہے کہ فسخ کرنے والا دوسرے شرکاء کو اپنے فسخ کی اطلاع دے، اس کے اطلاع دئے بغیر شرکت فسخ نہیں ہوتی۔

لما في الدر المختار: وتبطل أيضاً بإنكارها...وبفسخ أحدهما...ويتوقف على علم الآخر لأنه عزل قصدي، وفي رد المحتار: قوله لأنه عزل قصدي لأنه نوع حجر فيشترط علمه دفعاً للضرر عنه، فتح. (الدر المختار مع رد المحتار: ٤/ ٣٢٧، سعید).

اور منسلکہ معاہدے میں بھی استعفاء کے لیے دوسرے شرکاء پر پیش کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہذا اگر کسی شریک نے استعفاء لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا اور کسی دوسرے شریک کو پیش نہیں کیا تو اس سے شرکت فسخ نہیں سمجھی جائیگی، ہاں جب کبھی وہ شریک از خود وہ استعفاء نکال کر دوسرے شرکاء کو پیش کردے تو پیش کرنے کی تاریخ سے چھ ماہ بعد حسب معاہدہ شرکت فسخ ہوگی۔

الجواب (۹): یہ سوال واضح نہیں، معاہدہ نامے کی مخصوص دفعہ کے خلاف استعفاء پیش کرنے کی کیا شکل ہے؟ وضاحت سے لکھا جائے تو جواب ممکن ہوگا۔

الجواب (۱۰): یہ جزئیہ صراحۃً نظر سے نہیں گزرا، لیکن متعدد دوسرے جزئیات پر قیاس سے یہ ظاہر

ہوتا ہے کہ صورتِ مسئولہ میں مرحوم شریک کی اولاد کو شریک کاروبار تصور کیا جائیگا، اصل یہ ہے کہ مرحوم کی وفات پر ان کے ساتھ شرکت ختم ہوگئی اب ان کے دوسرے شرکاء پر لازم ہوگیا کہ مرحوم کا حصہ ان کے ورثاء کو ادا کردیں، اوراگرانہیں شریکِ کاروبار رکھنا چاہیں تو تمام شرکاء کی رضامندی لازمی ہوگی۔

لما في الدر المختار: لايملك الشريك الشركة إلا بإذن شريكه، جوهرة.

(الدر المختار: ٤/٣١٧، سعيد).

اب یہ رضامندی عام حالات میں صریح الفاظ کے ساتھ ہونی چاہئے، **لأن الساكت لاينسب إليه قول**۔ (شامي: ٣/٦٢، سعيد۔ والاشباه: ٢/٣٨٢، القاعدة الثانية عشر، ادارة القرآن).

لیکن جب دوشریکوں نے اسی غرض کے لیے مجلس منعقد کیا اوراس میں مرحوم کی اولاد کو شریک بنانیکا فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ تمام شرکاء کی طرف سے کیا گیا، اس وقت ایک شریک موجود ہونے کے باوجود خاموش رہا، اوراس پر اس نے اعتراض نہیں کیا اس کے بعد مرحوم کی اولاد شریک کاروبار کی حیثیت سے مدت تک تصرف کرتی رہی پھر بھی اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تو یہ مجموعی طرز عمل رضامندی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

نظيره ما في الأشباه: سكوته عند بيع زوجته أو قريبه عقاراً إقرار بأنه ليس له، على ما أفتى به مشايخ سمرقند... وفيه بعد ذلك رآه يبيع أرضاً أو داراً فتصرف فيه المشتري زماناً وهو ساكت يسقط دعواه.

اس کے تحت علامہ حمویؒ لکھتے ہیں:

فيه عما قبله زيادة تصرف المشتري بعد الشراء زماناً وهوساكت فهو قيد في الأجنبي لا في الزوجة والقريب كما يفهمه إطلاقه. (شرح الاشباه والنظائر: ١/٣٨٧، القاعدة الثانية عشر، ادارة القرآن).

مسائل مذکورہ بالا مع معاہدۂ شرکت ودفعات، فتاویٰ عثمانی، جلدسوم، ازص۵۷تاص۷۱پر تفصیل کے ساتھ مرقوم ہیں، وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات ہمیں چنددارالافتاؤں سے موصول ہوئے، مثلاً دارالافتاء دارالعلوم کراچی دار الافتاء دارالعلوم دیوبند، اورراندیر سے حضرت مفتی سیدعبدالرحیم صاحبؒ کے جوابات، ہم نے ان سب کے ساتھ اتفاق ظاہرکیا، البتہ صرف دارالافتاء دارالعلوم کراچی کے جوابات ہدیۂ ناظرین کیے گئے، بقیہ کوبسببِ طوالت چھوڑ دیا گیا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن جابر بن عبد اللہ ﷺ قال:
قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بالشفعة فی کل مالم یقسم ، فإذا وقعت الحدود
وصرفت الطرق ، فلا شفعة".

(رواہ البخاری).

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :
"الجار أحق بشعفة جاره، ینتظر بها وإن کان غائباً ، إذا کان
طریقهما واحداً".

(اخرجہ اصحاب السنن).

حق شفعہ کے احکام کا بیان

ایک زمین میں تین شریک ہوں تو شفعہ کا حکم:

سوال: ایک زمین میں تین بھائی شریک ہیں، ابوبکر، عمران، اورصفوان، ان میں سے ابوبکر نے اپنا حصہ عمران کے ہاتھ فروخت کر دیا، کیا صفوان شفعہ کا دعویٰ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اوراگر کرسکتا ہے تو کتنے حصے پر؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صفوان شفعہ کا دعویٰ کرسکتا ہے، جتنا حصہ ابوبکر کا تھا صفوان اس کا نصف حصہ لے سکتا ہے، اور باقی نصف حصہ عمر کے پاس رہے گا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

ويملك بالأخذ بالتراضي أوبقضاء القاضي بقدر رؤوس الشفعاء لاالملك .وفي فتاوى الشامي: (قوله بقدر رؤوس الشفعاء)...وشمل ما لو كان المشتري أحدهم وطلب معهم فيحسب واحداً منهم ويقسم المبيع بينهم كما في الوهبانية وشروحها. (الدرالمختارمع ردالمحتار:٦/٢١٩، كتاب الشفعة، سعيد).

دررالحکام میں ہے:

صورته دار بين ثلاثة وللدارجارملاصق فإذا بيعت الدار واشتراها أحدالشركاء تثبت الشفعة للمشتري سواء اشترى إصالة أو وكالة...وتثبت أيضاً للشريك الآخر وفائدته أنها لاتثبت للجار لأن الشريك مقدم عليه. (دررالحكام شرح غررالاحكام:٢/٢١٤).

درمختار میں ہے:

وتثبت لمن شرى إصالة أوو كالة أواشترى له بالوكالة، وفائدته أنه لوكان المشتري أوالموكل بالشراء شريكاً وللدار شريک آخر فلهما الشفعة، وقال الشامي:وفي القنية: اشترى الجار داراً ولها جارآخر فطلب الشفعة وكذا المشتري فهي بينهما نصفين لأنهما شفيعان، قال ابن الشحنة:...وعلى هذا لوجاء ثالث قسمت أثلاثاً أو رابع فأرباعاً.

(الدرالمختارمع فتاوی الشامی:٦/٢٣٩،کتاب الشفعة، سعید).

وللاستزادة انظر: (دررالحکام شرح مجلة الاحکام:٢/٦٧٨، المادة:١٠٠٨. وامداد الفتاویٰ: ٣/٤٣١) . **واللہ ﷻ اعلم۔**

وقف کی زمین میں شفعہ کا حکم:

سوال: اگرکوئی زمین مدرسہ کے پڑوس میں فروخت ہورہی ہے،تو کیا مہتمم مدرسہ اس زمین میں شفعہ کا دعویٰ کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب: وقف کی زمین میں شفعہ کا حق نہیں،اورنہ واقف یامتولی وقف کی زمین کے لیے شفعہ کرسکتے ہیں،حقِ شفعہ ثابت ہونے کے لیے زمین کا مالک ہونا ضروری ہےاوروقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

(ولاشفعة في الوقف) ولا له ، نوازل (ولابجواره) وفی الشامية: قوله ولاشفعة فی الوقف ، ای اذا بيع قال فی التجريد : مالايجوز بيعه من العقار كالاوقاف لا شفعة فی شيء من ذلک عند من يرى جواز بيع الوقف...وقوله ولا له أی لا لقيمه ولا للموقوف عليه لعدم الملک. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ٦/٢٢٣،کتاب الشفعة، سعید).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله ولا له أي إذا بيعت داربجنب دار الوقف فلاشفعة للواقف ولا يأخذها المتولي ولاالموقوف عليه أفاده في الهندية. (حاشية الطحطاوی علی الدرالمختار:٤/١٢١). **واللہ ﷻ اعلم۔**

ایک مکان کے دو پڑوسی ہوتو شفعہ کا حکم:

سوال: اگرایک مکان کے دوپڑوسی ہیں، اور مالکِ مکان نے ایک پڑوسی کومکان فروخت کیاتو دوسراپڑوسی شفعہ کادعویٰ کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب: اگردوپڑوسی شفعہ کادعویٰ کریں تومکان کومشتری اوردوشفیعوں کے درمیان تین حصے کردیا جائیگا،اوراگرایک پڑوسی ہوتومکان کے دوحصے کردئے جائیں گے۔

ملاحظہ ہوہندیہ میں ہے:

ولو أن رجلاً اشترى داراً وهوشفيعها ثم جاء ه شفيع مثله قضى القاضي بنصفها.

(الفتاوى الهندية:٥/١٧٨).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله ثم لجارملاصق، ولومتعدداً، والملاصق من جانب واحد ولوبشبر كالملاصق من ثلاثة جوانب فهما سواء. (فتاوى الشامي:٦/٢٢١،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مصادر و مراجع
فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلدِ پنجم

القرآن الکریم تنزیل من رب العلمین

الف

إکمال المعلم بفوائدمسلم ابوالفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض الریاض

اتحاف الخیرۃ المھرۃ العلامۃ البوصیری الریاض

اسلامی فقہ مولانا مجیب اللہ ندوی لاہور

امداد الفتاح شرح نور الإیضاح العلامۃ حسن بن عمار الشرنبلالی بیروت

آپ کے مسائل اوران کاحل مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ شہادت ۱۴۲۱ مکتبہ لدھیانوی

الأبواب والتراجم حضرت شیخ محمد زکریاؒ سعید کمپنی

الاختیار لتعلیل المختار عبد اللہ بن محمود الموصلی بیروت

الاستذکار ابن عبد البر

آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کراچی

إعانۃ الطالبین ابوبکر عثمان بن محمد التوفیقیۃ

ابوداود الحافظ سلیمان بن اشعث ابو داود السجستانیؒ و ۲۰۲ ت ۲۷۵ کتب خانہ مرکز علم کراچی

احسن الفتاویٰ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب ایچ ایم سعید کمپنی

اوجز المسالک شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مکتبہ امدادیہ ملتان

الاصابة فی تمییز الصحابه للحافظ ابن حجرؒ

امدادالفتاویٰ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مکتبہ دارالعلوم کراچی

احیاء علوم الدین للامام ابی حامد محمد بن محمد الغزالی ت۵۰۵ دار الفکر

ابن ماجه ابو عبد الله محمد بن یزید بن ماجه القزوینیؒ و ۲۰۹ ت۲۷۳ قدیمی کتب خانه

امدادالاحکام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ومفتی عبدالکریم گمتھلویؒ مکتبۂ دارالعلوم کراچی

اعلاء السنن مولانا ظفر احمد العثمانی التهانویؒ ادارة القرآن کراچی

الأشباه و النظائر زین الدین بن ابراهیم ابن نجیم الحنفی ت۹۷۰ ادارة القرآن کراچی

امداد المفتین حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ و۱۳۱۴ھ ت۱۳۹۶ھ دار الاشاعت

انجاح الحاجة حاشیة ابن ماجه الشیخ عبد الغنی المجددی الدهلوی ۱۲۹۵ قدیمی کتب خانه

احکام القرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ

اہم فقہی فیصلے قاضی مجاہدالاسلام قاسمی ادارة القرآن

ایضاح المسائل مفتی شبیر صاحب مرادآبادی

ایضاح النوادر مفتی شبیر صاحب مرادآبادی مکتبہ علمیہ سہارنپور

اشعة اللمعات للشیخ عبد الحق الدهلوی مجددیة

احکام القرآن ابوبکر جصاص الرازی سهیل

احکام القرآن للعلامه ظفر احمد العثمانی ادارة القرآن

اصول الشاشی للشیخ نظام الدین الشاشی

اسلام اور جدید معاشی مسائل مفتی محمد تقی عثمانی ادارہ اسلامیات

اسلام اور جدید معیشت وتجارت مفتی محمد تقی عثمانی مکتبہ معارف القرآن کراچی

اسلامی بینکاری اور متفقہ فتوے کا تجزیہ مفتی ثاقب الدین میمن اسلامک پبلشرز

الأموال ابوعبیده قاسم بن سلام بیروت

الأموال ابن زنجویه

أحکام الترکات والمواریث للشیخ محمد ابی زهره

اصلاح الرسوم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

اشرف الأحکام حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

أدب المفتی المستفتی ابوعمرو عثمان بن عبدالرحمن ابن صلاح

أصول الكرخيؒ الامام ابو الحسن الكرخيؒ

انسائیکلوپیڈیا برطانیکا

باء

البناية شرح الهداية العلامه بدرالدين العينىؒ فيصل آباد

البخارى ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخارىؒ و ۱۹۴ ت ۲۵۶ فيصل پبليكيشنز،ديوبند

البحر المحيط ابوحيان الاندلسى دار الفكر

بذل المجهود المحدث خليل احمد السهارنفورىؒ ت ۱۳۴۶ ندوة العلماء لكهنؤ

بہشتی زیور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دارالاشاعت

بیان القرآن حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

بداية المجتهد ابو الوليد محمد بن احمد القرطبى دار نشر الكتب

البحر الرائق للشيخ زين الدين ابن نجيم مصرى المكتبة الماجدية

بلوغ المرام الحافظ ابن حجر العسقلانىؒ بيروت

بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع علاء الدين أبوبكر بن مسعود الكاسانى ت ۵۸۷ سعيد كمپنى

بريقة محمودية فى شرح طريقة المحمدية عبد الغنى بن اسماعيل النابلسى

بوادر النوادر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اداره اسلاميات

بغية الالمعى فى تخريج الزيلعى الشيخ محمد عوامة

بيوع العينة والآجال استاذة مدرسة عائشة الصديقةؓ كراچى

بحوث فى قضايا فقهية معاصرة المفتى محمد تقى العثمانى

"البلاغ" دارالعلوم كراچى

پاء

پراویڈنٹ فنڈ پرزکوٰۃ اور سود کا مسئلہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ

تاء

تفسير القرطبى محمد بن احمد الانصارى القرطبىؒ دار الكتب العلمية

تهذيب التهذيب ابو الفضل احمد بن على بن حجر العسقلانىؒ ت ۸۵۲ دار الكتب العلمية بيروت

تحفة الأحوذی　ابو العلی محمد بن عبد الرحمن المبارکفوریؒ و۱۲۸۳ ت۱۲۵۳　دار الفکر
الترمذی　ابو عیسی محمد بن عیسی بن سورة الترمزیؒ و۲۰۹ ت۲۷۹　فیصل پبلیکیشنز، دیوبند
التعلیقات علی الترمذی و ابی داؤد و ابن ماجه و صحیح ابن خزیمه　ناصر الدین الألبانی　المکتب الاسلامی
التعلیق الممجد　العلامة عبد الحی اللکنوی بتحقیق الدکتور تقی الدین ندوی　دمشق
تهذیب الکمال　الحافظ جمال الدین ابو الحجاج یوسف المزّی و۶۵۴ ت۷۴۲ھـ　مؤسسة الرسالة
تقریب التهذیب　احمد بن علی بن حجر العسقلانی و۷۷۳ ت۸۵۲　دار نشر الکتب الاسلامیة
تحریر تقریب التهذیب　الدکتور بشار عواد معروف والشیخ شعیب الأرنؤوط　موسسة الرسالة بیروت
التصحیح والترجیح　العلامه قاسم بن قطلوبغا　بیروت
التفسیر المنار　السید محمد رشید رضا
تنویر الابصار　العلامة شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ ۹۳۹ ت۱۰۰۴　سعید کمپنی
التفسیر المظهری　القاضی محمد ثناء الله البانی بتیؒ ت۱۲۲۵　بلوچستان بک ڈپو
التمهید　ابو عمر یوسف بن عبد الله بن عبد البر النمری و۳۶۸ ت۴۶۳　مکتبة المؤید
تفسیر عثمانی　شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ　مدینہ منورہ
تفسیر السمرقندی　للفقیه ابی اللیث السمرقندی
الترغیب و الترهیب　الحافظ ذکی الدین عبد العلیم بن عبد القوی المنذری ت۶۵۶ھـ　دار احیاء التراث
تکملة فتح الملهم　مفتی محمد تقی عثمانی صاحب　مکتبة دار العلوم کراچی
التعلیقات علی نصب الرایة　للشیخ محمد عوامة　المکتبة المکیة
التعلیقات علی ابن ماجه　الدکتور بشار عواد معروف　دار الجیل بیروت
تنقیح الفتاوی الحامدیة　للسید محمد امین ابن عابدین الشامی　دار الاشاعة العربیة
تالیفاتِ رشیدیہ　حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ م۱۳۲۳ھ　ادارہ اسلامیات لاہور
تذکرة الموضاعات　أبو الفضل محمد بن طاهر بن علی المقدسی ت۵۰۷　میر محمد کتب خانه کراچی
تبیین الحقائق　للعلامه فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی　مکتبه امدادیه ملتان
تذکرة الرشید　حضرت مولانا محمد عاشق الٰہیؒ　مکتبه عاشقیة
التعلیقات علی المصنف　الشیخ محمد عوامه حفظه الله و رعاه　المجلس العلمی
تقریرات الرافعی (التحریر المختار)　للعلامة عبد القادر الرافعی　سعید کمپنی
تفسیر ابن کثیر　للحافظ اسماعیل ابن کثیر القرشی الدمشقی ت۷۷۴　دار السلام

التحریر فی اصول الفقه للعلامه الشیخ ابن همام دار الکتب العلمیة بیروت
تحفة الفقهاء علاء الدین السمرقندی
التقریر و التحبیر للشیخ ابن امیر الحاج الحلبی بیروت
التعلیقات علی المستدرک للشیخ صالح اللحام
التعلیقات علی مسند الامام احمد للشیخ شعیب الارنؤوط القاهرة
التعلیقات علی سنن ابن ماجه للشیخ محمد فؤاد عبد الباقی
التلخیص الحبیر الحافظ ابن حجر العسقلانی
تلخیص الحاکم الامام شمس الدین الذهبی
تقریر ترمذی مولانا محمد تقی عثمانی
التعریفات سید شریف جرجانی
التعاریف للشیخ عبدالرؤف المناویؒ
تصویر کے شرعی احکام مفتی محمد شفیع صاحبؒ
تکمله رد المحتار للشیخ محمد علاء الدینؒ
تعلیقاتِ فتاویٰ محمودیہ زیرنگرانی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ
التعلیقات علی بلوغ المرام صفی الرحمن المبارکفوری بیروت
تفسیر الماوردی (النکت و العیون) ابو الحسن علی بن محمد الماوردی البصری بیروت
التحریر و التنویر للعلامة محمد طاهر بن عاشور
التعریفات الفقهیة للسید المفتی عمیم الاحسان دارالکتب العلمیة بیروت
تکملة عمدة الرعایة مولانا فتح محمد صاحب لکھنویؒ
تکملة البحر الرائق للعلامة محمد بن حسین بن علی الطوریؒ

جیم

جواہر الفقہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب و۱۳۱۴،ت۱۳۹۶، مکتبہ دارالعلوم کراچی
الجامع الصغیر جلال الدین بن أبی بکر السیوطی و ۸۴۹ ت ۹۱۱ دار الکتب العلمیة بیروت
الجوهر النقی علی هامش السنن الکبری علاء الدین بن علی بن عثمان ابن الترکمانی ت ۷۴۵ دار المعرفة
جامع الأحادیث جلال الدین عبد الرحمن السیوطی م ۹۱۱ھ دار الفکر

جامع المسانيد | محمدبن محمود الخوارزمي | مكة المكرمة

الجوهرة النيرة | أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي م ۸۰۰ هـ | مكتبة امدادية

جدید فقہی مسائل | مولانا خالد سیف اللہ رحمانی | کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

جدید فقہی مباحث | قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

جواہر الفتاویٰ | مفتی عبدالسلام چاٹگامی، | اسلامی کتب خانہ کراچی،

الجهاد في الاسلام | دكتور محمد سعيد رمضان البوطي

جامع الرموز | شمس الدين محمد الخراساني القهستاني | المطبعة الكريمة

جامع احكام الصغار على هامش الفصولين | للعلامه الاستروشني | اسلامي كتب خانه

جامع الاصول في احاديث الرسول | مجد الدين ابوالسعادات ابن الاثير ۶۰۶م | دار البيان

جامع الفصولين | للشيخ بدرالدين محمود بن اسرائيل ابن قاضي سماونه ۸۲۳ م

جامع العلوم والحكم | ابن رجب حنبلي ۷۹۵ م

جامع بيان العلم وفضله | ابن عبد البر المالكيؒ

جمهرة القواعد الفقهية | للشيخ على احمد الندوي

جدید معاملات کے شرعی احکام (فقہ المعاملات) | مفتی احسان اللہ شائق | دارالاشاعت

حاء

حاشیۂ مؤطا امام مالک | مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی | آرام باغ کراچی

حجۃ اللہ البالغہ | شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حاشية الدسوقي | شمس الدين محمد عرفه الدسوقي | دار الفكر

حاشية تبيين الحقائق | شيخ شهاب الدين شلبي | امداديه

حلية الأولياء | الحافظ أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصفهاني ت ۴۳۰ | دار الفكر

حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح | العلامه السيد أحمد الطحطاوي | مير محمد كتب خانه كراچي

حاشية مشكوٰة المصابيح | مولانا احمد علی سہارنپوریؒ | قدیمی کتب خانہ

حاشية الشرنبلالي على درر الحكام | العلامه الشرنبلالي الحنفي و ۹۹۴، ت ۱۰۶۹،

حاشية الهداية | العلامه عبدالحيي اللكنوي و ۱۲۶۴، ت ۱۳۰۴،

حاشية صحيح البخاري | للشيخ احمد على السهارنفوري

حاشية السندی علی ابن ماجه محمد بن عبد الهادی السندی

حاشية الترمذی للشيخ المحدث احمد علی السهارنفوری

حاشية فيض القدير (ضبط وتصحيح) احمد عبد السلام بيروت

حاشیہ فتاویٰ عثمانی مولانا محمد زبیر حق نواز مکتبہ معارف القرآن کراچی

الحلال والحرام فی الاسلام الدکتور یوسف القرضاوی

حلال وحرام مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

حاشية الطحطاوی علی الدر المختار العلامه السید أحمد الطحطاوی و ۱۲۳۱ مکتبة العربية کوئٹه

حاشية سنن الدارمی فواز احمد وخالد السبع العلمی قدیمی کتب خانه

حاشية شرح القواعد الفقهية للشيخ مصطفی بن الشيخ احمد زرقا بيروت

حاشية فتح القدير للشيخ سعد الله الجلبی دار الفكر

حاشية الروض عبد الرحمن الحنبلی

حاشية سنن ابن ماجه للشيخ عبدالغنی المجددیؒ

حاشية نظام الفتاویٰ مرتب مفتی عبدالقیوم قاسمی

حقوق اوران کی خرید وفروخت مولانا عمر عابدین قاسمی

حلال حرام کے احکام (عطرہدایہ) حضرت مولانا فتح محمد صاحب

خاء

خلاصة الفتاوی للشيخ طاهربن عبد الرشيد البخاری مکتبه رشيديه کوئٹه

خزانة المفتين للشيخ حسين بن محمد کراچی

خزانة الفقه الفقيه ابو الليث السمرقندیؒ

خلاصة البدرالمنير سراج الدين ابن الملقن الشافعیؒ ۸۰۴م

دال

الدرّ المنثور عبد الرحمن جلال الدّين السيوطیؒ و ۸۴۹ ت ۹۱۱ دار الفكر

الدر المختار للعلامه علاء الدين محمد بن علی الحصكفیؒ و ۱۰۲۵ ت ۱۰۸۸ ایچ ایم سعید کمپنی

درر الحكام فی شرح غرر الأحكام القاضی ملا خسرو معارف نظارت جليلة

الدراية فی تخريج احاديث الهداية للحافظ ابن حجر العسقلانیؒ

الدر المنتقی علی هامش مجمع الانهر لعلاء الدین الحصکفی الدمشقی
دستور العلماء قاضی عبد رب النبی بن عبد رب الرسول احمد نگری لبنان بیروت
درس ترمذی مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کراچی
دین کی باتیں (خلاصہ بہشتی زیور) مولانا اشرف علی تھانوی
درر الحکام شرح مجلة الاحکام للشیخ علی حیدر بیروت
درس الہدایہ حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ

ذال

الذخیرة شهاب الدین احمد بن ادریس القرافی بیروت

راء

روح المعانی شهاب الدین السید محمود الآلوسی البغدادیؒ ت ۱۲۷۰ التراث القاهرة
رد المحتار المعروف بالشامی خاتمة المحققین محمد امین (ابن عابدین) ت ۱۲۵۲ ایچ ایم سعید کمپنی
رسائل ابن عابدین العلامه الشامیؒ سهیل اکیڈمی
رسم المفتی العلامه الشامیؒ
رسائل ابن نجیم زید الدین ابن نجیم المصریؒ
رمز الحقائق شرح کنز الدقائق العلامه بدر الدین العینیؒ بیروت

زاء

زاد المعاد فی هدی خیر العباد شمس الدین أبو عبد الله الزرعی و ۶۹۱ ت ۷۵۱ مؤسسه الرسالة

سین

سلسلة الاحادیث الضعیفة للشیخ محمد ناصر الدین الالبانیؒ المکتب الاسلامی
السنن الکبری أحمد بن شعیب النسائی
سیر اعلام النبلاء شمس الدین محمد بن أحمد بن عثمان الذهبی و ۶۸۱ ت ۷۴۸ مؤسسة الرسالة
سنن الدارمی عبد الله بن عبد الرحمن الدارمی السمرقندی و ۱۸۱ ت ۲۵۵ قدیمی کتب خانه
سنن الدارقطنی الحافظ علی بن أبی بکر الدارقطنی و ۳۰۶ ت ۳۸۵ مکتبة المتبنی القاهرة

السنن الصغری الامام البیهقی
سنن سعید بن منصور سعید بن منصور الخراسانی ت۲۲۷ الدار السلفیة الهند
سنن الکبری الحافظ ابو بکر احمد بن الحسین بن علی البیهقی دار المعرفة
السعایة للشیخ عبد الحي اللکنوی سهیل اکیڈمی
سبل السلام محمد بن اسماعیل الصنعانی

شین

شرح صحیح البخاری للشیخ ابی الحسن علی بن خلف ابن بطال البکری القرطبی مکتبة الرشد الریاض
شرح السنة الامام الحسین مسعود البغوی المکتب الاسلامی دمشق بیروت
شرح النقایة للشیخ علی بن محمد سلطان القاری الحنفی ت۱۰۱۴ سعید کمپنی
شرح المجلة للشیخ محمد خالد الاتاسی مکتبه رشیدیه
شرح المجلة للشیخ سلیم رستم باز اللبنانی
شرح وقایه عبید الله بن مسعود بن تاج الشریعة مطبع مجیدی
شرح عقود رسم المفتی فقیه العصر ابن عابدین الشامی مکتبه اسعدی
شعب الایمان الامام ابو بکر احمد بن الحسین البیهقی و ۳۸۴ت۴۵۸ الدار السلفیة الهند
شرح معانی الآثار ابو جعفر احمد بن محمد بن سلمة بن سلامة الطحاویؒ ایچ ایم سعید کمپنی
شرح مشکل الآثار ابو جعفر احمد بن محمد بن سلمة بن سلامة الطحاویؒ بتعلیق شعیب الارناؤط
شرح صحیح مسلم للنووی ابو زکریا یحیی بن شرف الدین النووی و ۶۳۱ت۶۷۲ دار احیاء التراث
الشرح الکبیر للشیخ ابن قدامه المقدسی بیروت
شرح ریاض الصالحین للشیخ محمدبن صالح العثیمین
شرح السیرالکبیر شمس الائمه ابوبکر محمد بن ابی سهل السرخسیؒ
شرح الهدایة للشیخ سعد اللّٰه سعدی جلبی دارالفکر
الشرح الکبیر علی هامش الدسوقی ابو البرکات السید احمد الدردیر المالکی
شرح النقایة للشیخ مولوی الیاس سعید
شرح منظومة ابن وهبان العلامه ابراهیم بن محمد ابوالولید الحلبی الحنفی ابن الشحنةؒ
شرح المنار لابن ملکؒ

شرح المهذب للعلامه النووی دار الفکر
شرکت اور مضاربت عصر حاضر میں مولانا محمد عمران اشرف عثمانی ادارۃ المعارف کراچی
شرح الاربعین عطیه بن محمد سالم
شرح القواعد الفقهية للشيخ احمد بن محمد زرقا

صاد

صحیح ابن حبان محمد بن حبان بن احمد ابو حاتم التمیمی موسسة الرسالة بیروت
صحیح ابن خزیمه ابوبکر محمدبن اسحاق ابن خزیمه

طاء

طبقات الشافعية الكبرى الامام السبكی الشافعیؒ

عين

عرف الشذی علیٰ هامش سنن الترمذی المحدث الکبیر انور شاه الکشمیری فیصل دیوبند دهلی
عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
عصر حاضر کے فقہی مسائل مولانا بدر الحسن القاسمی حیدرآباد
عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اور ان کا حل مرتب مولانا موسیٰ کرماڈی
عون المعبود محمد شمس الحق العظیم آبادی دار الکتب العلمية
العناية شرح الهداية أكمل الدين محمد بن محمود البابرتیؒ ت ۷۸۶
عمدة القاری فی شرح البخاری بدر الدین محمد محمود بن احمد العینیؒ دار الحدیث ملتان
عزیز الفتاویٰ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ
العرف والعادة فی رأي الفقهاء الدكتور احمد فهمي ابوسنه

غين

غمز عيون البصائر للشيخ احمد بن محمد الحموی ادارة القرآن
غنية ذوی الاحكام العلامه الشرنبلالی
غیر سودی بینکاری مفتی محمد تقی عثمانی مکتبہ معارف القرآن کراچی
غرر کی صورتیں ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی ادارۃ المعارف کراچی

فاء

فتح باب العناية للشيخ الملا على القارئؒ دار احياء التراث العربى

فتح القدير العلامه محمد بن على الشوكانى

فتاویٰ حقانیہ مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ دارالعلوم حقانیہ

فتاویٰ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی و۱۲۹۶ھ ت ۱۳۷۷ھ مکتبۂ دینیہ دیوبند

فتح البارى شرح صحيح البخارى للشيخ ابن رجب الحنبلى دار ابن جوزى

الفتاوى السراجية ابو محمد سراج الدين على بن عثمان آرام باغ كراچى و زمزم

فتاویٰ خلیلیہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ

فتاویٰ عثمانی مفتی تقی عثمانی صاحب کراچی

فتاویٰ محمودیہ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کتب خانہ مظہری کراچی

فتح البارى فى شرح البخارى للحافظ ابن حجر عسقلانیؒ و۷۷۳ت ۸۵۲ دار نشر الكتب الاسلامية

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (کبیر) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کتب خانہ امدادیہ دیوبند

فتح الملهم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مکتبہ دارالعلوم کراچی

فيض القدير للحافظ محمد عبد الرؤف المناویؒ دار الفكر

الفتاوى الهندية للشيخ نظام الدين وجماعة من علماء الهند الاعلام بلوچستان بک ڈپو

فتاوى ابن تيميه الشيخ احمد بن تيميه دار العربية بيروت

فتاویٰ رحیمیہ مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ مکتبہ رحیمیہ

فتح القدير كمال الدين محمد بن عبد الواحد السيواسى ابن الهمام ت ۶۸۱ دار الفكر

فیض الباری حضرت مولانا انور شاہ کشمیری ت ۱۳۵۲ مطبعہ حجازی القاہرۃ

فتاویٰ رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ت ۱۳۲۳ مکتبۂ رحمانیہ لاہور

فتاوى قاضيخان فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندى الفرغانى ت ۲۹۵ بلوچستان بک ڈپو

الفقه الاسلامى و أدلته الدكتور وهبة الزحيلى دار الفكر

فتاوى تاتارخانية عالم بن علاء الانصارى الاندربتى الدهلوى ت ۸۷۶ ادارة القرآن

فتاوى اللكهنوى أبو الحسنات عبد الحى اللكهنوى و۱۲۶۴ ت ۱۳۰۴ دار ابن حزم كراچى

فتاوى بزازيه الحافظ الدين محمد بن محمد بن شهاب البزاز الكردى ۸۲۷ بوچستان بک ڈپو

الفقه على المذاهب الأربعة للشيخ عبد الرحمن الجزائرى دار الفكر
فتاویٰ فریدیہ حضرت مفتی فرید صاحبؒ اکوڑہ خٹک
الفتاوى الولوالجية ظهير الدين عبد الرشيد بن ابى حنيفة الولوالجى دار الكتب العلمية
الفقه الحنفى و ادلته الشيخ اسعد محمد سعيد الصاغرجى دار الكلم الطيب دمشق
الفقه الحنفى فى ثوبه الجديد عبد الحميد محمود طهماز دار القلم دمشق
فتح المعين محمد ابوالسعود المصرى
فتاویٰ دارالعلوم زکریا حضرت مفتی رضاء الحق صاحب زمزم پبلشرز
فتاوى علماء البلد الحرام مرتبه: خالد بن عبدالرحمن
فتاوى الشبكة الفقيه عبدالله
فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء مرتبه شيخ احمد بن عبد الرزاق الدويش
فتاویٰ بینات مجلس دعوت وتحقیق اسلامی مکتبہ بینات کراچی
فتح المنان (المسند الجامع) ابوعاصم نبيل بن هاشم الغمرى
فقہ حنفی کے اصول وضوابط افادات حکیم الامت مرتب مولانا محمد زید ندوی
فقہی مقالات مفتی محمد تقی عثمانی
الفتاوى الغياثية داود بن يوسف الخطيب
فتاوى معاصرة للشيخ يوسف قرضاوى
فقه المعاملات للشيخ الصابونى
فقه السنه السيد سابق
الفرقان ماہنامہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
الفاروق زیر نگرانی مولانا سلیم اللہ صاحب

قاف

القاموس الوحيد مولانا وحید الزمان کیرانوی حسینیہ دیوبند
قواعد الفقه مولانا عميم الاحسان دار الكتاب ديوبند
القاموس الفقهى سعدى ابوجيب دارالفكر دمشق
قاموس الفقه مولاناخالد سيف الله

القبس شرح موطا　الحافظ ابوبکر ابن عربی المالکی ۵۴۳ م
القول الراجح　افادات مفتی غلام قادر نعمانی

کاف

کنز العمّال　علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الهندی ت ۹۷۵　مؤسسة الرسالة
کفایت المفتی　مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دھلویؒ　دار الاشاعت کراچی
کشف الخفاء　للشیخ اسماعیل بن محمد العجلونی ت ۱۱۶۲　دار احیاء التراث بیروت
کشاف القناع عن متن الاقناع　منصور بن یونس بن ادریس البهوتی　دار الفکر
کتاب الفتاوی　مولانا خالد سیف اللّٰہ رحمانی　زمزم
کنز الدقائق　ابو البرکات النسفی　امدادیة ملتان
کشف الاسرار　عبد العزیز البخاری
الکفایة فی شرح الهدایة　العلامه الخوارزمیؒ
کتاب الام　حضرت امام شافعیؒ
کریڈٹ کارڈ کے شرعی احکام　مولانا محمد اسامہ
گلستان　شیخ سعدیؒ

لام

لسان العرب　للعلامه ابن منظورؒ و ۶۳۰ ت ۷۱۱　مکتبة دار الباز مکة المکرمة
لامع الدراری　افادات حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی　سعید کمپنی
لسان المیزان　ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی ت ۸۵۲　اداره　تالیفات اشرفیه ملتان
لغات الحدیث　حضرت مولانا وحید الزمان

میم

مشکاة المصابیح　ابو عبد الله محمد بن عبد الله الخطیب الطبریزیؒ　قدیمی کتب خانه کراچی
مرقاة شرح مشکوٰة　للشیخ الملا علی القاریؒ　مکته امدادیه ملتان
مسلم　ابو الحسن مسلم بن حجاج القشیریؒ و ۲۰۶ ت ۲۶۱　مکتبة الاشرفیة دیوبند
مختصر القدوری　ابو الحسن احمد بن محمد البغدادی　سعید

المحیط البرهانی محمود صدر الشریعة ابن مازة البخاری الریاض
منحة الخالق حاشیة البحر الرائق العلامه الشامی کوئٹه
منظومه ابن وهبان للشیخ عبد الوهاب بن احمد بن وهبان الدمشقی م ۷۶۸هـ الوقف المدنی دیوبند
منتخبات نظام الفتاوی مفتی نظام الدین اعظمی
مغنی المحتاج محمد بن محمد الخطیب الشربینی التوفیقیة
معرفة السنن والآثار الإمام البیهقی جامع الحدیث
مطالب اولی النهی فی شرح غایة المنتهی مصطفی السیوطی الرحیبانی موقع الإسلام
المستدرک ابو عبد الله محمد بن عبد الله الحاکم ت۴۰۵ دار الباز للنشر والتوزیع۔ مکة المکرمة
مجمع الزوائد الحافظ نور الدین علی بن أبی بکر الهیثمیؒ ت۸۰۷ دار الفکر
مجمع الضمانات العلامة ابی محمد بن غانم بن محمد البغدادی ت ۱۰۳۰ دار السلام بیروت لبنان
مسند امام احمد بن حنبل الامام احمد بن حنبل الشیبانیؒ و۱۶۴ ت ۲۴۱ دار الفکر
معارف القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ت۱۳۹۶ ادارۃ المعارف کراچی
مصنف ابن ابی شیبة الحافظ ابو بکر عبد الله بن محمد بن أبی شیبة العبسی ت۲۳۵ ادارة القرآن کراچی
المجموع شرح المهذب ابو زکریا یحی بن شرف الدین النووی و ۶۳۱ ت۶۷۲ دار الفکر
میزان الاعتدال الحافظ محمد بن أحمد بن عثمان الذهبی ت۷۴۸ دار الفکر العربی
المعجم الکبیر الحافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی و ۲۶۰ت ۳۶۰ مکتبه ابن تیمیه
مجموعة الفتاویٰ مولانا عبد الحی اللکنوی میر محمد کتب خانه
المحلیٰ ابو محمد علی بن احمد سعید بن حزم الاندلسی دار الباز مکة المکرمه
مسند ابی عوانه ابو عوانه یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی دار المعرفة
المغنی عن حمل الأسفار الامام زین الدین أبو الفضل عبد الرحیم العراقی ت۸۰۶ دار الفکر
مسند أبی داؤد أبو داود سلیمان بن داود الفارسی الطیالسی ت۲۰۴ دار المعرفة
المعجم الأوسط أبو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی ت۳۶۰ مکتبة المعارف
مسند أبی یعلی شیخ الاسلام أبو یعلی أحمد بن علی الموصلی و ۲۱۰ ت۳۰۷ مؤسسة علوم القرآن
المعجم الصغیر ابو القاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی و ۲۶۰ت ۳۶۰ المکتب الاسلامی
المبسوط شمس الائمة ابو بکر محمد احمد السرخسی دار المعرفة بیروت
مصنف عبد الرزاق أبو بکر عبد الرزاق بن همام الصنعانی و۱۲۶ ت ۲۱۱ ادارة القرآن کراچی

مؤطا امام مالک الامام مالک بن انسؒ
المغنی ابن قدامة الحنبلی دار الکتب العلمیة
معارف السنن العلامه السید محمد یوسف البنوریؒ
مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر عبد الله بن شیخ محمد دامادافندی دار إحیاء التراث
مسند حمیدی ابوبکر عبد الله بن الزبیر الحمیدی سملک ڈابھیل الهند
ماهنامه البینات ۱۳۸۷ھ ازحضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ
المقالات الفقهیة مفتی رفیع عثمانی صاحب مکتبہ دارالعلوم کراچی
مجلة المجمع الفقهی الاسلامی رابطة العلم الاسلامی مکة المکرمة
المعجم الوسیط ابراهیم مصطفی مع اخوانه
الموضوعات علامه ابن الجوزی
مسند عبد ابن حمید عبد بن حمید بن نصر
مجموعہ قوانین اسلامی قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
المفهم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم الامام القرطبی بیروت
مختصر تفسیر ابن کثیر محمد علی صابونی
مجلة البحوث الاسلامیة مکة المکرمة
الموسوعة الفقهیه الکویتیة مع التلیقات وزارة الاوقاف بالکویت
المفردات فی غرائب القرآن الامام راغب الاصفهانی
الموفقات الامام الشاطبی
مسند الامام ابی حنیفة الامام ابوحنیفهؒ
مدارک التنزیل ابوالبرکات النسفی
المدونة الکبری الامام مالک بن انسؒ
المغرب ناصر الدین المطرزی
معین الحکام فیما یترددبین الخصمین من الاحکام العلامه الطرابلسیؒ دارالفکر
مشکل الآثار الامام الطحاویؒ
مرعاة المفاتیح شرح مشکاة المصابیح عبدالسلام المبارکفوری
مجلّہ فقہ اسلامی قاضی مجاہد الاسلام اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

المعاییر الشرعیة　　هیئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالیة الاسلامیة ، ١٤٢٤/٥ھ /٢٠٠٣/٤م

المصباح المنیر　　احمد بن محمد المقری　　بیروت

مطالب اولی النهی　　مصطفی السیوطی الحنبلی　　دمشق

المعیار المعرب　　احمد بن یحیی الونشریسي ۹۱۴م　　بیروت

مالی معاملات پر غرر کے اثرات　　مولانا اعجاز احمد صمدانی　　ادارۃ المعارف کراچی

مقدمة التصحیح والترجیح　　العلامه قاسم بن قطلوبغاؒ

مجلة الاحکام العدلیة　　جماعة من علماء الدولة العثمانیة

مجالس حکیم الامت　　مرتب مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

مجالس مفتی اعظم　　مرتب مفتی عبد الرؤف سکھروی

المقاصد الحسنة　　العلامه السخاویؒ

متن المنار فی اصول الفقه　　ابوالبرکات النسفیؒ ۷۱۰م

محمود الفتاویٰ　　مفتی احمد خانپوری

مسند الربیع　　الربیع بن حبیب الازدی البصری　　بیروت

معجم المصطلحات والالفاظ الفقهیة　　محمد عبدالرحمن عبدالمنعم　　بیروت

معجم لغة الفقهاء　　الشیخ محمد رواس وشیخ حامد صادق　　ادارة القرآن کراچی

المدخل الفقهی العام　　الشیخ مصطفی زرقا

نون

نصب الرایه　　جمال الدین ابو محمد عبد الله بن یوسف الزیلعي الحنفی　　المکتبه المکیة ١٥٦

نیل الاوطار　　شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانیؒ　　ادارة القرآن کراچی

نهایة المحتاج الی شرح المنهاج　　شمس الدین محمد بن أبی العباس　　دار الفکر

النسائی　　ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائیؒ و۲۱۵ ت۳۰۳　　قدیمی کتب خانه

نظام الفتاوی　　مفتی نظام الدین اعظمی

النهر الفائق　　سراج الدین المصری　　قدیمی

نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے　　قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

نتائج الافکار　　شمس الدین قاضی زاده آفندی　　دار الفکر

نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف　العلامہ الشامیؒ

نفع المفتی و السائل　　مولانا عبد الحیی اللکنویؒ

النتف فی الفتاویٰ　شیخ الاسلام قاضی القضاۃ ابو الحسن السغدی ۴۶۱ م　دار الکتب العلمیۃ بیروت

النافع الکبیر　　العلامہ اللکنویؒ

هاء

الھدایۃ　ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ و ۵۱۱ ت ۵۹۳　مکتبۃ شرکۃ علمیۃ

ہاؤس فائننسنگ کا شرعی طریقہ　مولانا مفتی تقی عثمانی۔